# ہماری قومی جِدّوجُہد

اوّل - دوم - سوم - چہارم

عاشق حسین بٹالوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میں اِن چند اوراق کو، بہ ہزار محبت و شفقت اپنے چھوٹے بھائی
اعجاز حُسین بٹالوی، بیرسٹرایٹ لاء لاہور کے نام منسوب کرتا ہوں
جن کی کوشش و کاوش کے بغیر اس کتاب کی اشاعت محال تھی۔

تم جو اپنے شریکِ حال رہے
گردشِ آسماں سے کچھ نہ ہوا

# ہماری قومی جدّوجہد

عاشق حسین بٹالوی



سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

954.91 Batalvi, Ashiq Hussain
Hamari Qaumi Jidd-o Jahad/
Ashiq Hussain Batalvi.- Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2008.
843pp.
1. History - Pakistan. I. Title.



2008
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔



ISBN-10: 969-35-2159-5
ISBN-13: 978-969-35-2159-7

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), P.O. Box 997 Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

# ترتیب

## حصہ اول

### مئی 1938ء سے دسمبر 1938ء تک



## حصہ دوم

### جنوری 1939ء سے دسمبر 1939ء تک

## حصہ چہارم

جلد اول

# ہماری قومی جدّوجہد

مئی ۱۹۳۸ سے دسمبر ۱۹۳۸ تک

# مقدمہ

میں نے اپنی کتاب "اقبال کے آخری دو سال[۱]" کے مقدمے میں لکھا تھا کہ

"مسلم لیگ کی تحریک تین ادوار میں سے گزری ہے۔ پہلا دور مئی ۱۹۳۶ء سے شروع ہو کر اقبال کی وفات یعنی اپریل ۱۹۳۸ء میں ختم ہو گیا۔ دوسرا دور اقبال کی وفات کے بعد شروع ہوا اور سر سکندر حیات خان کے انتقال یعنی دسمبر ۱۹۴۲ء میں ختم ہو گیا۔ اور تیسرا دور جنوری ۱۹۴۳ء سے شروع ہو کر اگست ۱۹۴۷ء تک قائم رہا۔ میری پختہ رائے ہے کہ جب تک ان تینوں ادوار کی مفصل تاریخ نہ سمجھ لی جائے، ہندوستان کی تقسیم کا مسئلہ سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ پہلے دور کی تاریخ تو میں نے اپنے ناچیز فہم کے مطابق مرتب کر دی ہے، اگر زندگی نے وفا کی اور معاش کی مجبوریوں نے دم لینے کی مہلت دی تو شاید دوسرے اور تیسرے دور کی تاریخ بھی اسی طرح مرتب ہو جائے۔"

خدا کا شکر ہے کہ زندگی نے تو افتاں و خیزاں وفا کی۔ اگرچہ معاش کی مجبوریوں اور پریشانیوں میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ تاہم جو کام شروع کیا تھا اس کا سلسلہ حسب استطاعت جاری رہا۔ اس میں میری کوششوں کو اتنا دخل نہیں، جتنا خدائے تعالیٰ کے فضل و کرم کو ہے۔ چنانچہ اب مئی ۱۹۳۸ء سے دسمبر ۱۹۳۸ء تک کی روداد پیش کر رہا ہوں۔

ابتدا میں ارادہ یہ تھا کہ مئی ۱۹۳۸ء سے دسمبر ۱۹۴۲ء تک کے پورے دور کی تاریخ ایک

---

۱۔ اقبال کے آخری دو سال، اقبال اکیڈمی کراچی نے ۱۹۶۱ء میں شائع کی تھی۔

پیش آ جائے۔ تو ایسا کوئی شخص (اِلّا ماشاءاللہ) موجود نہیں جس سے بالمشافہ جا کر استفسار کیا جا سکے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو شخص بھی پچاس ساٹھ سال بعد اس موضوع پر قلم اٹھائے گا وہ مواد کہاں سے لائے گا؟ اگر ہم اپنی معلومات کو سمیٹے ہوئے قبر میں لے جائیں گے تو کل اس کے لئے وہ ماٰخذ کیا کام دے سکیں گے جو بیشتر جعل و سخن طرازی کا ہدف بن چکے ہیں۔ اور اصلیت پر تو بر تو پردے ڈال دیئے گئے ہیں۔ جب یہ سوچتا ہوں کہ زندگی کا کچھ اعتبار نہیں اور قوائے عمل میں تحمل شدائد اور صرف محنت کی جو صلاحیت ہے وہ کل باقی نہیں رہے گی تو پریشان ہو جاتا ہوں۔ اور چاہتا ہوں کہ جو کچھ لکھنا ہے اسے جلد لکھ ڈالنا چاہئے۔ میری زندگی کی اکثر چیزیں صرف خدا کی رحمت سے پوری ہوئیں۔ امید ہے اس بارے میں بھی خدا کی مدد یاوری کرے گی۔

میں نے قومی جدوجہد کا یہ تمام دور صرف اپنی آنکھوں ہی سے نہیں دیکھا بلکہ اس دور کے واقعات کی تشکیل میں عملاً حصہ بھی لیا ہے۔ میری حیثیت محض اس تماشائی کی نہ تھی جو ساحل بحر پر کھڑا ہو کر جہازوں اور کشتیوں کے چلنے کا نظارہ کرتا ہے. بلکہ اس تیراک کی سی تھی جسے کنار عافیت تک پہنچنے کے لئے برسوں سمندر کی طغیانیوں کا شکار رہنا پڑا۔ نظیری نے اسی حقیقت کو کس خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے۔

بزیرِ شاخِ گل افعی گزیدہ بلبل را
نواگرانِ نخوردہ گزند راچہ خبر

آج اس عہد رفتہ پر نظر ڈالتا ہوں تو ماضی کی دھند آہستہ آہستہ چھٹنے لگتی ہے۔ لیکن دھند چھٹنے کے بعد واقعات جس شکل و صورت میں نمودار ہوتے ہیں وہ اس شکل و صورت سے قدرے مختلف ہیں جس کو میں نے اٹھائیس برس پیشتر دیکھا تھا۔ وجہ یہ ہے کہ کھیل کا میدان ہو یا جنگ کا ہنگامہ. تھیٹر کا سٹیج ہو یا معرکۂ کارزار۔ جو لوگ عملاً ان معرکوں میں حصہ لیتے ہیں وہ اپنے کام کے حسن و قبح اور عیب و ثواب کو اس طرح نہیں پرکھ سکتے جس طرح تماشائی پرکھتے ہیں۔ ایکٹر ہو یا سپاہی اپنا کام کرتے وقت فرض کی ادائیگی میں اس درجہ منہمک ہوتا ہے کہ اسے اپنے قول و فعل پر تنقیدی نظر ڈالنے کی مہلت نہیں ملتی۔ معرکہ ختم ہو جانے پر البتہ وہ سوچتا ہے کہ کہاں کہاں غلطی ہوئی. کہاں کہاں لغزش کی. اور کہاں کہاں موقع محل کے مطابق قدم اٹھایا۔

تاریخ نویسی کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ واقعات بیان کرنے میں پوری دیانت برتی جائے۔ البتہ واقعات کی تاویل و تعبیر اور ان سے نتائج اخذ کرنے کا حق ہر شخص کو حاصل ہے۔ مؤرخ کو

چاہئے کہ واقعات جس ترتیب سے رونما ہوئے ہیں ان کو اسی ترتیب سے بلا کم و کاست اور بے رو رعایت بیان کر دے۔ یہ کام پڑھنے والوں کا ہے کہ اپنے فہم و ادراک اور صلاحیت فکر کے مطابق ان واقعات کی تاویل کریں۔ تاریخ تو تاریخ، کلام الٰہی اور اقوال پیغمبرؐ میں بھی تاویل و تعبیر کا دروازہ کھلا ہے۔

بلا شبہ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں نے تمام واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان کی تشکیل و تعمیر میں عملاً شرکت کی۔ اور اس دور کے اکابر اور دیگر سیاسی رہنماؤں کے شانہ بشانہ کام بھی کیا۔ اس لئے میں واقعات کی نگارش میں حد درجہ احتیاط کرتا ہوں۔ ایسی احتیاط، جو شاید ان اصحاب کے لئے ممکن نہ ہو، جو محض شنید پر اعتبار کر کے تاریخ نگاری کا بار گراں اٹھانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن مجھے اس فائدے کے ساتھ یہ اندیشہ بھی ہر وقت دامن گیر رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ حقیقت نگاری کے ساتھ میرے دلی جذبات بھی سواد تحریر میں داخل ہو جائیں۔

بات یہ ہے کہ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کا دور میری "آپ بیتی" کا ایک ٹکڑا بن کر رہ گیا ہے اور یوں اس ٹکڑے نے گویا ایک طرح میرے "میموئرز" کی صورت بھی اختیار کر لی ہے۔ سفر کی روداد سناتے وقت جہاں ہم راستے کی کلفتوں، راحتوں اور مشکلوں کا حال بیان کرتے ہیں، وہاں ہمرہان سفر کا ذکر کئے بغیر بھی چارہ نہیں کہ کس کس نے اثنائے سفر میں حق رفاقت ادا کیا۔ کس کس نے اذیت پہنچائی۔ اور کس کس نے میر کارواں سے کٹ کر اپنی راہ الگ بنائی۔ کوشش تو ہر چند میں نے یہی کی ہے کہ اس روداد میں میری پسند و ناپسند کا معاملہ بار نہ پا سکے۔ لیکن اس غیر جانب دارانہ انداز تحریر کے باوجود ان تاثرات سے دل و دماغ کو پاک کرنا آسان نہیں جو چشم دید واقعات کے دوران عموماً رد عمل کے طور پر پیدا ہوا کرتے ہیں۔ قرب مکانی و قرب زمانی کے طفیل بلاشبہ ہمارا مشاہدہ دوسروں کی بہ نسبت صحیح اور صائب ہوتا ہے۔ لیکن اسی قرب کی وجہ سے ایک مخصوص انداز فکر بھی پیدا ہو جاتا ہے جو لامحالہ دیکھنے والے کی زندگی کا ایک جزو بن کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ انہی اسباب کی بناء پر میرا بھی ایک انداز تحریر پیدا ہو چکا ہے جسے میں بالکل طبعی اور فطری ہونے کے علاوہ ہر اعتبار سے جائز بھی سمجھتا ہوں۔

جو لوگ یہ کتاب پڑھنا چاہتے ہیں پہلے ان کے لئے لازم ہے کہ واقعات کا تسلسل قائم رکھنے کی غرض سے اپریل ۱۹۳۶ء سے اپریل ۱۹۳۸ء تک کے واقعات کا بھی مطالعہ کریں۔ اس کے بغیر زیر نظر کتاب کا پوری طرح سمجھنا محال ہے۔ میں نے ان دو برسوں کی سیاسی روداد کو

"اقبال کے آخری دو سال" میں بہت تفصیل سے بیان کیا ہے جس کا پڑھنا ہر اعتبار سے ضروری ہے۔ تاہم مختصر طور پر اپریل ۱۹۳۶ء سے اپریل ۱۹۳۸ء تک کے دور کا خلاصہ نیچے درج کرتا ہوں۔

(۱) ۱۲۔ اپریل ۱۹۳۶ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ بمبئی میں ایک قرار داد منظور ہوئی تھی کہ مسٹر جناح کو اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات لڑنے کے لئے اپنی صدارت میں ایک مرکزی الیکشن بورڈ کا قیام عمل میں لائیں، جس کے ارکان کی تعداد کم از کم پینتیس ہو۔ اور اس بورڈ کو اختیار حاصل ہو کہ ہر صوبے کے مقامی حالات کے پیش نظر مختلف صوبوں میں پراونشل الیکشن بورڈ قائم کر کے ان کا الحاق مرکزی بورڈ سے کرے۔

(۲) مجوزہ الیکشن بورڈ کی تشکیل کے لئے مسٹر جناح ۲۹ اپریل ۱۹۳۶ء کو لاہور تشریف لائے۔ سر فضل حسین نے، جو اس وقت یونینسٹ پارٹی کے لیڈر تھے، تعاون کرنے سے انکار کیا۔ اس پر یکم مئی ۱۹۳۶ء کو مسٹر جناح، علامہ اقبال سے ان کے دولت کدے پر جا کر ملے، اور علامہ مرحوم نے تعاون ہی نہیں بلکہ امداد و اعانت کا وعدہ کیا۔

(۳) ۱۲۔ مئی ۱۹۳۶ء کو پنجاب پراونشل مسلم لیگ کی از سر نو تشکیل ہوئی جس میں علامہ اقبال کو صدر، ملک برکت علی اور خلیفہ شجاع الدین کو نائب صدر، غلام رسول خاں بیرسٹرایٹ لاء کو سیکرٹری، اور میاں عبدالمجید بیرسٹرایٹ لاء اور عاشق حسین بٹالوی کو جائنٹ سیکرٹری منتخب کیا گیا۔

(۴) ۲۱۔ مئی ۱۹۳۶ء کو مسٹر جناح نے سری نگر (کشمیر) سے مرکزی الیکشن بورڈ کے اراکین کے ناموں کا اعلان کر دیا۔ بورڈ کے تمام ممبروں کی تعداد چھپن تھی جن میں ہندوستان کے ہر صوبے کے آدمی شامل تھے۔ پنجاب سے گیارہ اصحاب نامزد کئے گئے تھے۔

(۵) ۹۔ جولائی ۱۹۳۶ء کو سر فضل حسین کا لاہور میں انتقال ہو گیا تو سر سکندر حیات خاں، ریزرو بنک آف انڈیا کی ڈپٹی گورنری کے عہدے سے مستعفی ہو کر لاہور تشریف لے آئے اور یونینسٹ پارٹی نے انہیں اپنا لیڈر منتخب کر لیا۔

(۶) جنوری ۱۹۳۷ء میں پنجاب اسمبلی کے انتخابات ہوئے تو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر صرف دو امیدوار کامیاب ہوئے۔ ایک ملک برکت علی، دوسرے راجہ غضنفر علی خاں۔ راجہ صاحب فوراً لیگ سے مستعفی ہو کر یونینسٹ پارٹی میں شریک ہو گئے۔ اور سر سکندر نے انہیں پانچ سو روپے ماہوار پر پارلیمنٹری سیکرٹری کا عہدہ عطا کر دیا۔

(۷) ہندوستان کی تمام صوبائی اسمبلیوں کے مسلمان ممبروں کی مجموعی تعداد پان سو تھی جن میں

ہی جلد میں قلم بند کی جائے گی۔ لیکن جب لکھنے بیٹھا اور کام کی وسعت و طوالت کا صحیح اندازہ ہوا تو میں نے فیصلہ کیا کہ بجائے اس کے کہ ساڑھے چار سال کے واقعات کو ایک ہی جلد میں بیان کیا جائے، مناسب یہ ہو گا کہ ہر سال کی روداد الگ الگ کتابی صورت میں شائع ہوتی رہے۔ اس طرح ایک فائدہ یہ پیش نظر تھا کہ لکھنے کا قرض ساتھ ساتھ اترتا رہے گا اور پڑھنے والوں کا ردعمل اور اخبارات و جرائد کے تاثرات بھی معلوم ہوتے رہیں گے۔ دوسرا فائدہ یہ ہو گا کہ اگر ہم اس انتظار میں بیٹھ رہے کہ جب تک پوری تاریخ مکمل نہ ہو اسے شائع نہ کیا جائے، تو خدا جانے اس کام کی تکمیل میں کتنی مدت لگ جائے۔ اور یہ بھی نہیں معلوم کہ اس غیر معین مدت میں کیا کیا حوادث رونما ہوں۔ زندگی برق رفتاری سے گزر رہی ہے۔ لہٰذا جو کچھ لکھا جا چکا ہے، اسے بلا تامل مطبع کے حوالے کر دینا چاہئے تاکہ مزید التوا نہ ہونے پائے۔

انگلستان میں بھی دور حاضر کی سیاسی تاریخ آج کل اسی طریقے سے لکھی جا رہی ہے۔ چنانچہ گزشتہ عالمگیر جنگ کی تاریخ قلم بند کرنے کے لئے جو بورڈ برطانوی حکومت نے مقرر کیا تھا وہ بالاقساط یہ کام انجام دے رہا ہے اور یہ قسطیں بالترتیب طبع ہو رہی ہیں۔ اسی سلسلے میں یہ عرض کرنا دلچسپی کا موجب ہو گا کہ اب تک صرف ۱۹۴۲ء کی تاریخ شائع ہو سکی ہے۔ جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کام کی اہمیت کے پیش نظر یہ بورڈ جنگ کے واقعات اور نشیب و فراز کو کس شرح و بسط سے بیان کر رہا ہے۔

میرے پاس کوئی بورڈ نہیں۔ میں تو تنہا کام کر رہا ہوں۔ اور ایک معاون تک میسر نہیں۔ کیفیت یہ ہے کہ خود ہی پہلے دریافت کرنا پڑتا ہے کہ کون کون سا مواد، پیش نظر مقصد کے لئے ضروری ہے۔ پھر خود ہی اس کی تلاش میں کتب خانوں اور لائبریریوں کو کھنگالنا پڑتا ہے۔ اور اگر حسن اتفاق سے مطلوبہ چیزیں دستیاب ہو جائیں تو خود ہی ان کا اردو میں ترجمہ کرتا ہوں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ معمولی سے واقعہ کی تصدیق کے لئے پانچ سات سو صفحے کی کتاب کا ایک ایک لفظ پڑھنا پڑتا ہے۔ اور کتاب ختم کرنے پر پتا چلتا ہے کہ اس واقعہ کا ذکر مصنف نے عمداً یا سہواً نہیں کیا۔ اور یہ تمام ورق گردانی رائیگاں گئی۔ لیکن راستے کی ان جملہ مشکلات سے قطع نظر، سب سے بڑی مشکل یہ پیش آ رہی ہے کہ جس دور کی تاریخ میں لکھ رہا ہوں اس دور کی دستاویزیں مسودے، مکاتیب، اخباری بیان، سب کچھ غائب ہو چکا ہے۔ کوئی چیز بھی تو نہیں ملتی۔ تحریک پاکستان کے تمام قابل ذکر اکابر بھی ایک ایک کر کے دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ چنانچہ اس وقت قحط الرجال کا یہ عالم ہے کہ اگر کسی بات کی تصدیق یا تردید کے لئے چشم دید شواہد کی ضرورت

(ب) یہ معاہدہ قبول کرنے کے بعد آئندہ صوبائی اسمبلی کے عام اور ضمنی انتخابات میں وہ متعدد فریق جو موجودہ یونینسٹ پارٹی کے اجزائے ترکیبی ہیں متحدہ طور پر ایک دوسرے کے امیدواروں کی حمایت کریں گے۔

(ج) یہ کہ اسمبلی کے وہ مسلمان ارکان جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے ہیں یا اب لیگ کی رکنیت قبول کرتے ہیں. اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی متصور ہوں گے۔ ایسی مسلم لیگ پارٹی کو اجازت ہوگی کہ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کی سیاسی پالیسی اور پروگرام کے بنیادی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی دوسری پارٹی سے تعاون یا اتحاد کرے اس قسم کا تعاون انتخابات کے ماقبل یا مابعد ہر دو صورتوں میں کیا جاسکتا ہے۔ نیز پنجاب کی موجودہ کولیشن اپنا موجودہ نام یونینسٹ پارٹی برقرار رکھے گی۔

(د) مذکورہ بالا معاہدے کو مدنظر رکھتے ہوئے پراونشل پارلیمنٹری بورڈ کی تشکیل از سرنو عمل میں لائی جائے گی۔

(۱۱) اس پیکٹ کے باوجود. سرسکندر حیات خان اور ان کی جماعت کے آدمیوں نے مسلم لیگ کے قرطاس رکنیت پر دستخط نہ کئے۔ اور نہ پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی قائم کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کی باہمی کشمکش بدستور جاری رہی۔

(۱۲) آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری نواب زادہ لیاقت علی خاں نے یکایک ۵ اپریل ۱۹۳۶ء کو پنجاب پراونشل مسلم لیگ کا الحاق مرکزی لیگ سے منقطع کر دیا تاکہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل میں سرسکندر کے آدمیوں کو شامل کرنے کا راستہ صاف کیا جاسکے۔ علامہ اقبال اور پنجاب صوبہ مسلم لیگ کے تمام کارکنوں کو اس سے سخت صدمہ ہوا۔

(۱۳) ۱۸-۱۹ اپریل ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس خصوصی مسجد شہید گنج کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے کلکتہ میں منعقد ہوا جہاں مسٹر جناح نے پرانی مسلم لیگ کا الحاق منقطع کر کے پنجاب میں ایک نئی پراونشل مسلم لیگ قائم کرنے کی غرض سے پینتیس آدمیوں کی آرگنائزنگ کمیٹی مقرر کر دی۔ جس میں پچیس آدمی سرسکندر حیات خاں کے اور صرف دس آدمی علامہ اقبال کی پارٹی کے تھے۔ یہ آرگنائزنگ کمیٹی ذیل کے اصحاب پر مشتمل تھی۔

۱۔ سرسکندر حیات خاں ـــــ صدر

۲۔ نواب ممدوٹ (نواب سرشاہنواز خاں)

سے صرف پچیس نشستوں پر کانگرس قبضہ کر سکی۔ اور ان پچیس سے پندرہ نشستیں صوبہ سرحد میں شامل تھیں۔ گویا صوبہ سرحد کو چھوڑ کر باقی پورے برعظیم میں کانگرس کو صرف دس مسلمان اپنے حامی و مددگار مل سکے۔ یوپی. سی پی. بنگال. سندھ. اڑیسہ اور آسام میں ایک مسلمان بھی کانگرس کے ٹکٹ پر منتخب نہ ہو سکا۔

(۸) اس کے باوجود کانگرس نے دعویٰ کیا کہ وہی مسلمانوں کی نمائندگی کی اہل ہے۔ چنانچہ جب وزارت سازی کا وقت آیا تو مولانا ابوالکلام آزاد نے کانگرس کے نقیب کی حیثیت سے مسلمانوں کو یہ شرط پیش کی کہ اگر مسلم لیگ کو توڑ کر صوبائی اسمبلیوں کے تمام مسلمان ممبر غیر مشروط طور پر کانگرس میں جذب ہو جائیں اور کانگرس کی رکنیت کے فارموں پر دستخط کر کے اپنی جداگانہ حیثیت کو ختم کر دیں تو کانگرس کسی مسلمان کو وزارت میں شامل کرنے پر آمادہ ہو سکتی ہے۔

(۹) کانگرس کی یہ شرط مسلم لیگ ہی کے لئے نہیں بلکہ جداگانہ انتخاب کے اصول اور مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے لئے پیام مرگ تھی۔ چنانچہ مسٹر جناح نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر کانگرس نے اعلان کیا کہ وہ مسٹر جناح سے کوئی مفاہمت کرنے کو تیار نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس مسلم رابطہ عوام (مسلم ماس کانٹکٹ) کی تحریک جاری کر کے براہ راست مسلمانوں کو ورغلا کر اور بہکا کر اپنے حلقے میں کھینچ کر لے آئے گی تاکہ مسلم لیگ کا وجود خود بخود ختم ہو جائے۔ چنانچہ کانگرس کی اس تحریک سے ہندوستان بھر کے مسلمانوں میں صرف خوف و ہراس ہی کا ردعمل طاری نہیں ہوا. بلکہ حفاظت خود اختیاری کے تحت وہ اپنی جداگانہ تنظیم میں بھی مصروف ہو گئے۔

(۱۰) ۱۴۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا تو مسٹر جناح اور سر سکندر حیات خاں کے درمیان ایک مفاہمت ہوئی. جس نے آگے چل کر سکندر جناح پیکٹ کا نام اختیار کر لیا۔ اس پیکٹ کی رو سے طے ہوا تھا کہ

(الف) سر سکندر حیات خاں واپس پنجاب جا کر اپنی پارٹی کا ایک خاص اجلاس منعقد کریں گے. جس میں پارٹی کے تمام مسلمان ممبروں کو جو ابھی تک مسلم لیگ کے ممبر نہیں بنے ہدایت کریں گے کہ وہ سب مسلم لیگ کے حلف نامے پر دستخط کر کے لیگ میں شامل ہو جائیں۔ اندریں حالات وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی اور صوبائی بورڈوں کے قواعد و ضوابط کی پابندی کریں گے۔ لیکن یہ معاہدہ یونینسٹ پارٹی کی موجودہ کولیشن پر اثر انداز نہیں ہو گا۔

۳۔ ملک خضر حیات ٹوانہ۔ وزیر بلدیات

۴۔ میاں عبدالحی۔ وزیر تعلیم

۵۔ خان بہادر نواب سعادت علی خاں۔ یونینسٹ ایم۔ ایل۔ اے

۶۔ خان بہادر میاں احمد یار خاں دولتانہ۔ چیف پارلیمنٹری سیکرٹری

۷۔ سید افضال علی حسنی۔ یونینسٹ ایم۔ ایل۔ اے

۸۔ خان بہادر میاں مشتاق احمد گورمانی۔ پارلیمنٹری پرائیویٹ سیکرٹری

۹۔ میر مقبول محمود۔ پارلیمنٹری سیکرٹری

۱۰۔ سید امجد علی۔ پارلیمنٹری سیکرٹری

۱۱۔ میاں غیاث الدین۔ ایم۔ ایل۔ اے (مرکزی اسمبلی)

۱۲۔ نواب زادہ خورشید علی خاں۔ ممبر کونسل آف سٹیٹ

۱۳۔ نواب سر محمد حیات خان نون۔ یونینسٹ ایم۔ ایل۔ اے

۱۴۔ راجہ فتح خاں۔ یونینسٹ ایم۔ ایل۔ اے

۱۵۔ خان بہادر نواب مظفر خاں۔ یونینسٹ ایم۔ ایل۔ اے

۱۶۔ خان بہادر نواب فضل علی۔ یونینسٹ ایم۔ ایل۔ اے

۱۷۔ راجہ غضنفر علی خاں۔ پارلیمنٹری سیکرٹری

۱۸۔ کیپٹن سر شیر محمد خان۔ ایم۔ ایل۔ اے (مرکزی اسمبلی)

۱۹۔ خان بہادر شیخ کرامت علی۔ یونینسٹ ایم۔ ایل۔ اے

۲۰۔ چودھری محمد یٰسین۔ یونینسٹ ایم۔ ایل۔ اے

۲۱۔ شیخ محمد صادق۔ بیرسٹرایٹ لاء۔ امرتسر

۲۲۔ مولانا غلام رسول مہر۔ ایڈیٹر روزنامہ "انقلاب"

۲۳۔ شیخ فیض محمد۔ پارلیمنٹری سیکرٹری

۲۴۔ خان بہادر مولوی غلام محی الدین قصوری۔ یونینسٹ ایم۔ ایل۔ اے

۲۵۔ خان بہادر چودھری ریاست علی۔ یونینسٹ ایم۔ ایل۔ اے

۲۶۔ علامہ اقبال

۲۷۔ ملک زمان مہدی خاں

۲۸۔ خلیفہ شجاع الدین

۲۹۔ غلام رسول خاں

۳۰۔ ملک برکت علی

۳۱۔ پیر تاج الدین

۳۲۔ مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش۔ ایڈیٹر روزنامہ "احسان"

۳۳۔ مولانا ظفر علی خاں

۳۴۔ میاں عبدالعزیز بیرسٹرایٹ لاء

۳۵۔ عاشق حسین بٹالوی

(۱۴) اس واقعہ سے حد درجہ مایوس اور افسردہ خاطر ہو کر ملک برکت علی. خلیفہ شجاع الدین. ملک زمان مہدی خاں. پیر تاج الدین اور عاشق حسین بٹالوی ۱۹ اپریل کی شام کو کلکتہ سے واپس لاہور روانہ ہوئے اور جب ۲۱ اپریل کو صبح نو بجے لاہور کے ریلوے سٹیشن پر اترے تو پہلی خبر یہ ملی کہ اسی روز صبح پانچ بجے علامہ اقبال کا انتقال ہو گیا ہے۔

امید ہے کہ سطور بالا کے مطالعہ سے ایک ہلکا سا خاکہ ذہن میں پیدا ہو گیا ہو گا جس کی مدد سے غالباً اس کتاب کی تفہیم نسبتاً آسان ہو جائے گی۔

موجودہ کتاب کی تیاری کے لئے جس قدر مواد میسر آ سکا تمام تر انگریزی میں تھا۔ چنانچہ اس سارے مواد کے ایک ایک لفظ کا مجھے اردو میں ترجمہ کرنا پڑا۔ اس طول امل کی وجہ صرف یہ تھی کہ اردو کا حق، میرے نزدیک. بہرصورت مقدم ہے۔ اور اسی حق کی پذیرائی کرنے اور اسے پاکستان کی قومی اور لسانی زندگی میں اولین درجہ دلوانے کے لئے میں نے یہ کتاب اردو میں لکھی ہے۔ ورنہ انگریزی میں لکھتا تو میری محنت میں بے حد کمی ہو جاتی۔

آئندہ کا حال تو عالم الغیب کو معلوم ہے۔ لیکن اگر میرے حالات سازگار ہو گئے اور معاش کی پریشانیوں سے کسی قدر نجات ملی تو ارادہ ہے کہ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۷ء تک کے دور کی قومی جدوجہد کی تاریخ اسی طرح سال بہ سال بالاقساط چھپتی رہے گی۔ کام مشکل بھی ہے اور حد درجہ محنت طلب بھی۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ اگر اب نہ ہوا تو کبھی نہ ہو سکے گا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ حیات مستعار کی کتنی گھڑیاں باقی ہیں۔ اور وقت آخر کب آ جائے۔ لیکن اگر مرنے سے پہلے میں نے یہ مہم بفضل ایزدی پوری کر لی تو وہ قرض اپنے سر سے اتار سکوں گا جو قوم کے ایک ادنےٰ خادم کی حیثیت سے مدت سے میرے ذمے واجب الادا چلا آ رہا ہے۔

افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں میموئرز لکھنے کا رواج بالکل نہیں۔ تاریخ انسان ہی کے

کارناموں کے مجموعہ کا نام ہے۔ ان کارناموں میں فتح مندیوں اور کشور کشائیوں کے درخشاں ابواب کے پہلو بہ پہلو حسرتوں اور ناکامیوں کی اندوہناک داستانیں بھی ہوتی ہیں۔ میرے نزدیک ہر شخص کا فرض ہے کہ مرنے سے پہلے اپنی زندگی کا قرض بہ طریق احسن چکا جائے۔ اور اس کی بہترین صورت یہی ہے کہ ہم نے رنج و غم، عیش و مسرت، دل گرفتگی و پریشانی اور نصرت و کامرانی کی صورت میں زندگی سے جو کچھ حاصل کیا تھا اسے جیتے جی میموئرز کی صورت میں لوٹا دیا جائے، قبل اس کے کہ ہمارے اعضاء و جوارح ہم پر شہادت دیں۔ ہم خود اپنے شاہد کیوں نہ بن جائیں۔ ا۔

کسی قوم کی تاریخ بنی بنائی آسمان سے نازل نہیں ہوئی۔ افراد و اشخاص کے میموئرز ہی بڑی حد تک تاریخ کا مسالہ اور مواد مہیا کرتے ہیں۔ اور انہی میموئرز کی مدد سے مورخ اپنی عمارت استوار کرتا ہے۔ میں نے انگلستان کے طویل قیام میں جس چیز کو اپنے کام کے لئے سب سے زیادہ مفید پایا وہ یہی میموئرز تھے۔ سیاسی، معاشرتی، ادبی، قانونی اور صنعتی زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو ہو گا جس پر لوگوں نے اپنے میموئرز نہ لکھے ہوں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس ملک کی ہمہ گیر زندگی کا ایک ایک گوشہ، ضبط تحریر میں آکر، محفوظ ہو چکا ہے۔ اور مورخ کو اپنی کاوش و جستجو کے سلسلہ میں تہ در تہ زمین کو کھودنا نہیں پڑتا۔

مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ اگر علامہ اقبال، قائداعظم جناح، خواجہ ناظم الدین، حسین شہید سہروردی، مولوی فضل الحق، سر فضل حسین، ملک برکت علی، سر سکندر حیات، صاحب زادہ سر عبدالقیوم، مولانا شوکت علی وغیرہ اپنے اپنے میموئرز لکھ جاتے تو آج ہمارے پاس ایسا گراں قدر تاریخی ذخیرہ جمع ہوتا جس سے ایک طرف مستند اور چشم دید حالات معلوم کرنے میں کسی قسم کے اشتباہ کی گنجائش باقی نہ رہتی اور دوسری طرف یہ فائدہ ہوتا کہ مرنے کے بعد غلط اور بے بنیاد باتیں ان بزرگوں کے ساتھ منسوب کرنے سے لوگ حذر کرتے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ اس ضمن میں اوروں کی رائے کیا ہے۔ لیکن میرے خیال کے مطابق چودھری ظفراللہ خاں اور ملک خضرحیات ٹوانہ اس وقت دو اصحاب ہمارے ملک میں ایسے موجود ہیں جنہیں اپنے میموئرز لکھ ڈالنا چاہئیں۔ چودھری صاحب نے بڑی متنوع، ہمہ گیر اور بھرپور زندگی بسر کی ہے۔ خدا نے انہیں ایک دقیقہ رس ذہن اور بے مثال نطق کے علاوہ ایسی صلاحیت بھی

ا۔ بل الانسان علی نفسہٖ بصیرۃ ولو القی معاذیرہ

عطاکی ہے جس کے طفیل انہیں بیک وقت بادشاہوں اور درویشوں دونوں کا قرب حاصل رہا ہے۔ چودھری صاحب نے انگریزی حکومت کے زمانے میں بھی انتہائی عروج پایا اور پاکستان بننے کے بعد بھی انہیں اعلیٰ سے اعلیٰ مناصب حاصل ہوئے۔ اس لحاظ سے میں انہیں گویا "مخضرمین[1]" میں شمار کرتا ہوں۔

ملک خضر حیات ٹوانہ کی شخصیت بڑی متنازع بن کر رہ گئی ہے۔ لوگوں کو اب تک تصویر کا صرف ایک رخ معلوم ہو سکا ہے۔ دوسرا رخ کسی نے دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ حالانکہ ملک صاحب کی دیانت و امانت اور عزم و حوصلہ کا اعتراف ان کے دشمن بھی کرتے ہیں۔ ان کا دامن روپے پیسے کے داغ اور اقربانوازی و خویش پروری کے دھبے سے ہمیشہ پاک رہا۔ سیاست کوئی صحیفۂ آسمانی نہیں، جس سے اختلاف کا کسی کو یارا نہ ہو۔ ملک صاحب کا اپنا انداز فکر اور اپنا نقطہ نظر تھا۔ ہو سکتا ہے کہ مجھے یا کسی اور کو اس سے اتفاق نہ ہو۔ لیکن ملک صاحب کو یقیناً یہ حق حاصل ہے کہ اپنا زاویہ نگاہ دنیا کے سامنے پیش کریں۔ میری حتمی رائے ہے کہ جب تک ملک خضر حیات ٹوانہ کے میموئرز چھپ کر ہمارے سامنے نہیں آتے ہم ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۷ء تک کے سیاسی مدوجزر سے کلیتہً آگاہ نہیں ہو سکتے۔

اس کتاب کی تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں جن چند عزیز دوستوں نے میری مدد کی ان میں الطاف گوہر سیکرٹری انفرمیشن و براڈ کاسٹنگ حکومت پاکستان اور روزنامہ "نوائے وقت" کے فاضل مدیر مولانا مجید نظامی کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ گوہر صاحب نے اپنی بے شمار سرکاری اور دفتری مصروفیتوں کے باوجود کتاب کا مسودہ پڑھا اور مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے مستفید فرمایا۔

نظامی صاحب کو میں لندن میں بیٹھ کر آئے دن تکلیف دیتا رہا کہ لاہور سے فلاں فلاں دستاویزیں اور کتابیں تلاش کر کے بھیجئے جواب میں انہوں نے کبھی مایوس نہیں کیا۔ اور ہمیشہ خندہ پیشانی سے یہ تمام زحمت گوارا فرمائی۔ برطانیہ کے وزیر مستعمرات مسٹر آرتھر باٹملے کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے میری درخواست پر فلسطین کا وہ میمورنڈم تلاش کر کے بھیجا جس کا ترجمہ اس کتاب کے آٹھویں باب میں درج کیا گیا ہے۔

---

[1] عرب کے ان شعراء کو جنھوں نے جاہلیت اور اسلام کے دونوں زمانے دیکھے۔ اصطلاحاً "مخضرمین" کہتے ہیں۔

میری غریب الوطنی کا زمانہ جو فروری ۱۹۵۳ء میں شروع ہوا تھا، بدستور قائم ہے۔ اور "اقبال کے آخری دو سال" کی طرح یہ کتاب بھی لندن ہی میں بیٹھ کر لکھی گئی۔ لندن کو لائبریریوں اور کتب خانوں کا شہر کہا جائے تو کچھ مبالغہ نہ ہو گا۔ چنانچہ میرے وقت کا بیشتر حصہ بھی برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری ہی میں گزرتا ہے۔ لیکن سامان نوشت و خواندگی اس فراوانی کے باوجود افسردگی اور بے دلی کے اس المناک احساس سے جو وطن سے مستقل محرومی کے باعث ہر وقت ذہن پر طاری رہتا ہے مجھے کبھی نجات نہ مل سکی۔ صبر نہ سہی مجبوری سہی۔ اس کے سوا کر بھی کیا سکتا ہوں۔

دریں کتاب پریشاں نہ بینی از ترتیب ۔۔۔ عجب مدار کہ چوں حال من پریشان ست
ہزار شکر کہ بایک جہاں پریشانی ۔۔۔ چو تار طرہ دلدار عنبر افشان ست

۱، لزکورٹ لندن ۔۔۔ عاشق حسین بٹالوی
۲۸۔ جون ۱۹۷۵ء

(۱)

## آر گنائزنگ کمیٹی کی ابتدا

کلکتہ کے اجلاس سے واپس آکر میں نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ سیاست کو خیر باد کہہ دوں گا۔ مسلسل دو سال مسلم لیگ کی تشکیل و تعمیر پر محنت کی تھی لیکن انجام مایوس کن ہوا تھا۔ اس کے علاوہ پنجاب میں لیگ کو نئے سرے سے منظم کرنے کے لئے جو پینتیس آدمیوں کی آرگنائزنگ کمیٹی قائم کی گئی تھی، اس میں پچیس ممبر یونینسٹ پارٹی کے تھے اور مجھے یقین تھا کہ ان لوگوں کی موجودگی پیہم رخنہ اندازیوں کا باعث ہوگی اور اس طرح کوئی مفید کام نہیں ہو سکے گا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ علامہ اقبال کی وفات کے بعد اب پنجاب میں کوئی ایسی عظیم المرتبت شخصیت نہیں تھی جس سے یونینسٹ پارٹی کے لوگ مرعوب ہو سکتے یا جس سے مسلم لیگ کے کاموں میں ہم کو مدد ملتی۔

میں نے جب ملک برکت علی اور غلام رسول خاں کے سامنے اپنا ارادہ ظاہر کیا تو غلام رسول خاں نے صرف اتنا کہا کہ حالات واقعی مایوس کن ہیں لیکن چند روز اور انتظار کر لینا چاہئے. اگر صورت بہتر نہ ہوئی تو ہم سب اکٹھے آرگنائزنگ کمیٹی سے مستعفی ہوں گے۔ البتہ ملک صاحب میرے استعفے کے قطعی خلاف تھے۔ ان کی رائے تھی کہ کمیٹی میں اگرچہ ہماری تعداد صرف نو رہ گئی ہے لیکن اس قلت کے باوجود ہم بہت کچھ کر سکیں گے۔ عوام میں ہمارے کام کو جس قدر مقبولیت حاصل ہوئی تھی اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ لیگ کی جو ابتدائی اور ضلع وار شاخیں ہم نے قائم کی تھیں وہ ہر جگہ کام کر رہی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ہم آرگنائزنگ کمیٹی میں رہ کر یونینسٹ پارٹی کے ارادوں کی مزاحمت بہتر طریق پر کر سکیں گے۔ اگر ہم نے ابھی سے استعفا دے دیا تو ایک طرف اسے ہماری شکست کا اعتراف تسلیم کیا جائے گا اور دوسری طرف یونینسٹ پارٹی کو اپنے کام میں کھلی چھٹی مل جائے گی۔ لہٰذا میں نے مجبوراً مستعفی ہونے کا خیال ترک کر

دیا۔

سکندر جناح پیکٹ میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ:

"آئندہ مجلس قانون ساز کے عام اور ضمنی انتخابات میں وہ گروپ جن پر موجودہ یونینسٹ پارٹی مشتمل ہے، متحدہ طور پر ایک دوسرے کے امیدواروں کی حمایت کریں گے۔"

یہ شق حد درجہ مبہم اور غیر واضح تھی۔ بادی النظر میں اس کا مفہوم یہ تھا کہ یونینسٹ پارٹی آئندہ دو گروہوں پر مشتمل ہوگی، یعنی مسلم لیگ کا گروپ اور چودھری چھوٹورام کا گروپ۔ چھوٹورام کا گروپ جن امیدواروں کو کھڑا کرے گا مسلم لیگ پارٹی ان کی مدد کرے گی۔ اسی طرح مسلم لیگی امیدواروں کو چودھری چھوٹورام کے گروپ کی حمایت حاصل ہوگی۔ مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں کے حلقہ ہائے انتخاب سے امیدوار کھڑے کرنے کی ذمے داری کلیتہً مسلم لیگ پر ہوگی۔

عجیب اتفاق ہے کہ سکندر جناح پیکٹ کے بعد پنجاب میں ایک موقع بھی ایسا نہیں آیا تھا کہ مذکورہ بالا شق کی آزمائش ہو سکتی۔ البتہ کلکتہ سے واپس آنے کے بعد یکے بعد دیگرے تین ضمنی انتخاب آ گئے، پہلا انتخاب تحصیل اوکاڑہ ضلع منٹگمری میں ہوا، جہاں مقابلہ میاں جعفر علی اور خان صاحب میاں چراغ دین کے درمیان تھا۔ سر سکندر نے دونوں امیدواروں کو یونینسٹ تسلیم کر لیا۔ اور کہہ دیا کہ دونوں میں جو جیت جائے گا یونینسٹ پارٹی اسے اپنا نمائندہ تسلیم کرلے گی۔ میاں جعفر علی کامیاب ہو گئے تو انہیں اسمبلی کی یونینسٹ پارٹی میں شامل کر لیا گیا۔

دوسرا مقابلہ تحصیل بھلوال ضلع شاہ پور میں ہوا۔ یہاں سر سکندر نے ایک امیدوار کو یونینسٹ پارٹی کا ٹکٹ عطا کیا اور مدمقابل نے انڈی پنڈنٹ کی حیثیت سے مقابلہ کیا۔ جب انڈی پنڈنٹ امیدوار کامیاب ہو گیا تو اسے بھی یونینسٹ پارٹی میں شامل کر لیا گیا۔

پنجاب میں مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ بدستور قائم تھا، جس کے سیکرٹری غلام رسول خاں اور صدر میاں عبدالعزیز بیرسٹرایٹ لاء تھے۔ سکندر جناح پیکٹ کے تحت مسلمانوں کے حلقہ ہائے انتخاب سے امیدوار کھڑے کرنے کا کام اسی بورڈ کے ذمے تھا، لیکن سر سکندر نے تحصیل اوکاڑہ اور تحصیل بھلوال کے دونوں انتخابات میں مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ سے رسماً بھی استفسار کرنا گوارا نہ کیا اور سب کچھ ہم سے بالا بالا، اپنی مرضی اور صوابدید سے کیا۔

تحصیل اوکاڑہ کے ضمنی انتخاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے سول اینڈ ملٹری گزٹ کے نام

نگار نے اپنے ۴ مئی کے پرچے پر لکھا تھا کہ:

"ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو اس ضمنی انتخاب کو چنداں سیاسی اہمیت حاصل نہیں۔ دونوں امیدواروں نے اپنے یونینسٹ ہونے کا اقرار کر لیا ہے اور یونینسٹ پارٹی کے صدر دفتر نے اس اقرار کو تسلیم کر لیا ہے۔ اب ان امیدواروں میں سے اگر ایک کامیاب ہو جائے اور دوسرے کو شکست ہو تو اس سے اسمبلی میں یونینسٹ پارٹی کی مجموعی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا"۔

"البتہ ایک اور نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو اس ضمنی انتخاب سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ بعض ایسے انتخابی حلقے بھی ہیں جہاں کوئی امیدوار یونینسٹ ٹکٹ کے بغیر الیکشن لڑنا پسند نہیں کرتا۔ ایسے حلقوں میں اگر متصادم امیدوار آپس میں مفاہمت نہ کر سکیں اور یونینسٹ پارٹی ان میں سے کسی کو بھی مسترد کرنا گوارا نہ کرے تو پارٹی نہایت آسان راستہ اختیار کرتی ہے۔ یعنی یہ امر ووٹروں پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ جس کو چاہیں منتخب کر لیں۔ کامیاب امیدوار بہرصورت یونینسٹ پارٹی کا ممبر متصور ہو گا"۔

تیسرا ضمنی انتخاب امرتسر کے شہری حلقے سے ہو رہا تھا۔ ۱۹۳۷ء کے عام انتخابات میں امرتسر سے ڈاکٹر سیف الدین کچلو کامیاب ہوئے تھے۔ لیکن ان کے خلاف عذر داری منظور ہو گئی تھی۔ اور انتخاب ناجائز قرار دے دیا گیا تھا۔ اب امرتسر کے ضمنی انتخاب میں شیخ محمد صادق کھڑے ہوئے تھے جو اس سے قبل ۱۹۳۷ء میں یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑ کر شکست کھا چکے تھے۔

شیخ محمد صادق اگر مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہونا چاہتے تھے تو ان کا فرض تھا کہ ٹکٹ کے لئے باقاعدہ پنجاب مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کو درخواست دیتے لیکن انہوں نے اس قسم کی کوئی درخواست نہ دی اور اس کی بجائے امرتسر میں دھڑا دھڑ پوسٹر لگانا شروع کر دیئے کہ میں مسلم لیگی امیدوار ہوں۔ جب یہ شکایت ہمارے پاس پہنچی تو غلام رسول خاں اور ملک برکت علی نے ضابطے کی پابندی کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک اخباری بیان میں اعلان کیا کہ شیخ محمد صادق نے تو مسلم لیگ کے ٹکٹ کے لئے درخواست تک نہیں دی۔ انہیں کیوں کر مسلم لیگی امیدوار قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس پر شیخ محمد صادق کی آنکھیں کھلیں اور وہ بھاگے بھاگے سر سکندر کے پاس گئے۔

سر سکندر بجائے خود کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اوکاڑہ اور بھلوال کے دیہاتی حلقوں میں توانہیں مسلم لیگ کے نام سے فائدہ اٹھانے کی قطعاً ضرورت نہ تھی لیکن یہ امرتسر کے شہری مسلمانوں کا حلقہ تھا جو گزشتہ انتخاب میں بیک آواز یونینسٹ پارٹی کو مردود قرار دے چکا تھا۔ سر سکندر ہوشیار آدمی تھے۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ پنجاب مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ، ازروئے آئین ایک خود مختار ادارہ ہے۔ لہٰذا شیخ محمد صادق کو اگر کامیاب کرانا منظور ہے تو اس بورڈ کے سامنے دست سوال دراز کئے بغیر چارہ نہ ہو گا۔

یکایک ٦ رمئی کو نواب شاہ نواز خاں والئی ممدوٹ نے آرگنائزنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کو اپنے ہاں چائے پر مدعو کیا۔ یہ دعوت نامہ صرف ایک روز پہلے یعنی ۵۔ مئی کو جاری کیا گیا تھا جس میں لکھا تھا کہ سر سکندر حیات خاں کی درخواست پر کمیٹی کے جملہ ممبروں کو مدعو کیا جا رہا ہے۔ اس دعوت کے علاوہ اور کچھ درج نہیں تھا۔ یہ بھی ظاہر نہیں کیا گیا تھا کہ سر سکندر کا اس دعوت سے مقصد کیا ہے اور کس موضوع پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

ملک برکت علی، میاں عبدالعزیز، غلام رسول خاں، خلیفہ شجاع الدین، پیر تاج الدین اور راقم السطور نواب صاحب کے دولت کدے پر حاضر ہوئے۔ سر سکندر حیات خاں بھی تشریف لائے تھے۔ ان کی پارٹی کے کم سے کم بارہ، چودہ آدمی موجود تھے۔ شیخ محمد صادق کو بھی ہم نے وہاں دیکھا۔ لیکن وہ دوسرے کمرے میں الگ بیٹھے تھے، چائے میں شریک نہیں ہوئے۔ جب چائے ختم ہو چکی تو سر سکندر نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ شیخ محمد صادق کو امرتسر کے ضمنی انتخاب میں مسلم لیگ کا ٹکٹ دیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر آرگنائزنگ کمیٹی نے حامی بھر لی تو ٹکٹ کا حصول نسبتاً آسان ہو جائے گا۔ لیکن جب بحث شروع ہوئی اور ملک برکت علی اور غلام رسول خاں نے آئین و ضوابط کا مسودہ پیش کیا تو سر سکندر کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، کیونکہ ضمنی انتخاب میں کسی امیدوار کو مسلم لیگ کا ٹکٹ دینا یا نہ دینا کلیتہً پنجاب پارلیمنٹری بورڈ کے اختیار میں تھا جو صوبہ مسلم لیگ سے بالکل علیحدہ، ایک خود مختار اور قائم بالذات ادارہ تھا۔

سر سکندر نے بورڈ کی اس خود مختارانہ حیثیت کو بخوشی تسلیم کر لیا اور ساتھ ہی شیخ محمد صادق کی درخواست اور فیس کے پچاس روپے غلام رسول خاں کے حوالے کر دیئے کہ مہربانی فرما کر بورڈ کا اجلاس بہت جلد منعقد کر کے یہ درخواست برائے منظوری پیش کر دی جائے۔ غلام رسول خاں نے وعدہ کیا کہ تعمیل ارشاد میں حتی الامکان بہت جلد اجلاس بلایا جائے گا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ شیخ محمد صادق نے باضابطہ لیگ کے حلف نامے پر دستخط کر کے ٹکٹ کے لئے درخواست دی تھی۔

غلام رسول خاں نے سر سکندر کے کہنے کے مطابق ۱۰ ر مئی کو پنجاب مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کا اجلاس طلب کیا۔ لیگ کے حلف نامے کی ایک اہم شق یہ بھی تھی کہ اگر مسلم لیگ نے کسی امیدوار کو اپنا ٹکٹ دینے سے انکار کر دیا تو شخص مذکورہ آئندہ انتخاب میں نہ تو انڈی پنڈنٹ امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونے کا مجاز ہو گا اور نہ کسی اور پارٹی کے ٹکٹ پر کھڑا ہو سکے گا۔ ۹ ر مئی کو شیخ محمد صادق نے یکایک غلام رسول خاں کو ایک خط لکھا کہ وہ حلف نامے کی اس شق کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں، وہ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ انہیں اس شق سے مستثنیٰ قرار دے کر فوراً مسلم لیگ کا ٹکٹ عطا کر دیا جائے۔

جب بورڈ کے اجلاس میں غلام رسول خاں نے شیخ محمد صادق کی درخواست اور یہ خط پیش کیا تو تمام ممبروں نے بالاتفاق فیصلہ کیا کہ امیدوار چونکہ مکمل حلف نامے کی پابندی کرنے سے انکار کرتا ہے۔ لہٰذا اس کی درخواست پر غور نہیں کیا جا سکتا۔

شیخ محمد صادق کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انہوں نے غلام رسول خاں کو پھر خط لکھا کہ وہ بلا استثنا حلف نامے کی تمام شرائط کی پابندی کا عہد کرتے ہیں، اس لئے ان کی درخواست پر دوبارہ غور کیا جائے۔ غلام رسول خاں نے ۱۵۔ مئی کو بورڈ کا نیا اجلاس طلب کیا جہاں شیخ محمد صادق کی درخواست اور تازہ خط پیش ہوا۔ بحث کا ابھی آغاز نہیں ہوا تھا کہ بورڈ کے ایک ممبر نے اپنی جیب سے ایک مطبوعہ پوسٹر نکال کر دکھایا جو صرف ایک روز قبل شیخ محمد صادق نے امرتسر شہر کی دیواروں پر چسپاں کیا تھا اور جس میں انہوں نے پوری تحدی سے اعلان کیا تھا کہ مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ انہیں ٹکٹ دے یا نہ دے وہ ہر صورت میں انتخاب میں کھڑے ہوں گے۔

اس پوسٹر کو دیکھ کر بورڈ نے شیخ محمد صادق کو جو باہر کمپاؤنڈ میں کھڑے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے، اپنے روبرو طلب کیا۔ شیخ صاحب نے تسلیم کیا کہ پوسٹر انہوں نے چھپوایا اور دیواروں پر چسپاں کروایا تھا۔ جب انہیں بتایا گیا کہ یہ عہد شکنی ہے جسے حلف نامے کی جملہ شرائط کی صریح خلاف ورزی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور بورڈ، محض اس عذر کی بناء پر ان کی درخواست کو مسترد کر دینے کا مجاز ہے، تو شیخ صاحب نے معذرت کی اور کہا کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کریں گے۔

بورڈ کے اس اجلاس میں چودہ ممبر موجود تھے۔ میاں عبدالعزیز بیرسٹر ایٹ لاء نے صدارت فرمائی۔ بحث و تمحیص کے بعد صدر نے فیصلہ کیا کہ چونکہ پنجاب میں اس وقت کوئی پراونشل مسلم لیگ موجود نہیں، لہٰذا مسلم لیگ کے ٹکٹ پر الیکشن نہیں لڑا جا سکتا۔ تاہم شیخ محمد صادق کو الیکشن سے محروم کرنا بھی ہمیں گوارا نہیں، اس لئے انہیں اختیار دیا جاتا ہے کہ چاہیں تو انڈی پنڈنٹ

امیدوار کی حیثیت سے انتخاب میں حصہ لے سکتے ہیں۔

اس فیصلے کی بورڈ کے سات ممبروں نے حمایت کی اور تین نے مخالفت کی اور تین ممبر غیر جانب دار رہے۔ شیخ محمد صادق کو اسی وقت بلا کر اطلاع کر دی گئی۔ انہوں نے قطعاً پروانہ کی اور انڈی پنڈنٹ امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہونے کا اعلان کر دیا۔

بورڈ کے اس فیصلے سے یونینسٹ پارٹی کے حلقے میں ایک طوفان بپا ہو گیا۔ اور پارٹی کے ریذیڈنٹ سیکرٹری سید افضال علی حسنی ایم۔ ایل۔ اے نے ایک سب و ستم سے بھرا ہوا بیان سول اینڈ ملٹری گزٹ میں چھپوایا، جس میں انہوں نے خصوصیت سے ملک برکت علی کے خلاف حد درجہ قابل اعتراض باتیں کہیں۔

جواب میں ملک صاحب نے شیخ محمد صادق اور مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کی باہمی کشمکش کا سارا پس منظر بے نقاب کرتے ہوئے ۱۹ر مئی ۱۹۳۸ء کے سول اینڈ ملٹری گزٹ میں بیان شائع کرایا جس میں انہوں نے بورڈ کے فیصلے کی وضاحت کرتے ہوئے سید افضال علی حسنی کے ایک ایک اعتراض کا جواب دیا۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی پوچھا کہ اوکاڑہ اور بھلوال کے انتخابات میں کیوں یونینسٹ پارٹی کا ٹکٹ چلایا گیا تھا اور مسلم لیگ کو کیوں طاق نسیاں پر رکھ دیا گیا تھا اور اب امرتسر شہر کے الیکشن میں کیوں مسلم لیگ کا دامن پکڑ کر ٹکٹ کے لئے بار بار درخواست کی جا رہی ہے؟

بیان کے آخر میں ملک صاحب نے اپنی فصیح و بلیغ انگریزی میں فرمایا کہ:

> "امر واقع یہ ہے کہ یونینسٹ پارٹی کے لوگ مسلم لیگ کو ایک کھلونا سمجھ کر اس سے کھیل رہے ہیں اور لیگ کے وقار اور مقبولیت سے فائدہ اٹھا کر اپنی چندروزہ عمر کو دراز کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ لیکن پبلک بھی آہستہ آہستہ بیدار ہو رہی ہے اور عنقریب ان لوگوں کو ایسا سبق سکھائے گی جسے وہ کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔
>
> اگر سید افضال علی حسنی اور ان کی پارٹی اور ان کے وزیر اعظم، لیگ کے ایسے ہی وفادار اور خیر خواہ ہیں تو کیوں یونینسٹ پارٹی کا ڈھونگ ختم کر کے اپنے آپ کو مسلم لیگ پارٹی سے موسوم نہیں کرتے، تاکہ یہ پارٹی ان تمام گروہوں سے جن کے اغراض و مقاصد مسلم لیگ سے متفق ہیں، تعاون کر سکے۔ یہ یاد رکھئے یونین ازم اور لیگ ازم دو مختلف و متضاد نظریئے ہیں۔ یونینسٹ پارٹی کے لوگ بغلیں بجا رہے ہیں کہ وہ جناح کو

فریب دینے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اگر جھوٹی خوشی حاصل کرنے کا یہی ایک طریقہ باقی رہ گیا ہے تو بیشک یہ لوگ بغلیں بجاتے رہیں. لیکن انہیں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ جناح کی فوج ظفر موج کے سپاہی ہنوز پنجاب میں موجود ہیں جن سے دو دو ہاتھ کئے بغیر انہیں چھٹکارا نہیں ہو گا۔ یہ فوج انہیں اس وقت تک چین کا سانس نہیں لینے دے گی جب تک یونینسٹ پارٹی اپنی جداگانہ ہستی کو ختم کر کے مسلم لیگ میں شامل نہیں ہو جاتی[۱]"۔

---

۱۔ شیخ محمد صادق مرحوم کے صاحبزادے، شیخ مسعود صادق وزیر خزانہ مغربی پاکستان نے پاکستان کی قومی اسمبلی کے ایک ممبر سید علی اصغر شاہ کے بعض اعتراضوں کا جواب دیتے ہوئے ۲۹ جولائی ۱۹۶۳ء کو اپنے ایک اخباری بیان میں کہا تھا۔

> "سید علی اصغر شاہ نے میرے والد پر الزام لگایا ہے کہ وہ مسلم لیگ کے مفاد کا خیال نہیں رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں میں ان کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب پنجاب میں یونینسٹ حکومت تھی اس وقت، میرے والد مرحوم اور ملک برکت علی ہی اسمبلی میں مسلم لیگ کی نمائندگی کرتے تھے"۔ (روزنامہ نوائے وقت مورخہ ۳۰ جولائی ۱۹۶۳ء)

شیخ مسعود صادق کے اس دعوے میں کہاں تک اور کتنی صداقت ہے اس کا فیصلہ کرنے کے لئے اوپر کا متن پڑھ لینا کافی ہے۔ اس سلسلے میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ شیخ محمد صادق اس ضمنی انتخاب میں انڈی پنڈنٹ امیدوار کی حیثیت سے کامیاب یقیناً ہوئے تھے لیکن ان کے خلاف انتخابی عذر داری منظور ہو گئی اور انہیں رکنیت سے برطرف کر دیا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے تازیست اسمبلی کا رخ نہیں کیا البتہ ان کے بڑے بھائی شیخ صادق حسن امرتسر کے تیسرے ضمنی انتخاب میں، جو ستمبر ۱۹۳۹ء میں ہوا تھا کامیاب ہو کر آ گئے تھے۔

تعجب ہے کہ آج لوگ کس کس بہانے سے اپنے آپ کو ملک برکت علی سے وابستہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حالانکہ ملک صاحب کی زندگی میں جو سلوک ان لوگوں نے ان سے کیا تھا اس پر پردہ ہی پڑا رہے تو اچھا ہے۔

آرگنائزنگ کمیٹی کے اس ابتدائی جھگڑے ہی سے ہم نے ہوا کا رخ پہچان لیا تھا اور صاف نظر آنے لگا تھا کہ دونوں فریقوں میں فکر و عمل کی وحدت کا پیدا ہونا اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ سر سکندر حیات خاں کمیٹی کے صدر تھے اور انہوں نے پراصرار درخواست کی تھی کہ غلام رسول خاں بدستور آرگنائزنگ کمیٹی کے سیکرٹری کا کام کرتے رہیں۔ غلام رسول خاں نے بھی مجبوراً یہ درخواست قبول کر لی تھی۔

پنجاب میں مسلم لیگ کا کام بالکل بند ہو چکا تھا اور جتنی شاخیں ہم نے گزشتہ سال بھر میں قائم کی تھیں تمام معطل اور بے کار پڑی تھیں۔ ان شاخوں کے عہدے دار آئے دن خط لکھ لکھ کر یا خود لاہور آکر ہم سے آئندہ طرز عمل کے بارے میں پوچھتے تھے لیکن ہم انہیں سوائے اس کے اور کیا جواب دے سکتے تھے کہ آئینی حیثیت سے تو ان شاخوں کا اب کوئی وجود نہیں۔ البتہ انہیں چاہئے کہ اپنے اپنے حلقے میں لیگ کا کام جاری رکھیں۔ عنقریب پراونشل مسلم لیگ بن جائے گی تو انہیں از سر نو ملحق کر لیا جائے گا۔

غلام رسول خاں نے دو ایک دفعہ سر سکندر سے کہا بھی کہ صوبے میں لیگ کی سرگرمیاں بالکل ٹھنڈی پڑ گئی ہیں، اغیار اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، اگر آپ اجازت دیں تو ہمارے آدمی دورے کا پروگرام شروع کریں تاکہ صوبے میں لیگ کا پروپیگنڈا بھی ساتھ ساتھ ہوتا رہے۔ مقصد صرف یہ تھا کہ خدا جانے آرگنائزنگ کمیٹی کو نئی صوبہ لیگ کی تشکیل میں کتنا وقت لگ جائے گا اس دوران میں قومی کام جاری رہنا ضروری ہے۔ لیکن سر سکندر نے اس تجویز سے چنداں دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔

سرگودھا کے مشہور ایڈووکیٹ، شیخ عبدالغنی نے جو سات سال تک پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر بھی رہ چکے تھے، سکندر جناح پیکٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے ایک انگریزی مضمون میں لکھا تھا کہ :

> ”اس پیکٹ کے بعد یونینسٹ پارٹی نے فریب کاری کا جو نیا چولا پہنا ہے، اس سے پارٹی کی پالیسی اور پروگرام میں قطعاً کوئی فرق نہیں آنے پائے گا۔ حالات و واقعات من و عن اسی روش پر جاری رہیں گے جس پر آج تک رہے ہیں۔ ہاں ایک نمایاں فرق ضرور ہو گا، وہ یہ کہ مسلمانوں کے اخباروں اور جلسوں میں اس پارٹی کے خلاف جو پروپیگنڈا کیا جا رہا تھا وہ تمام بند ہو جائے گا اور اس نئے لیبل کے طفیل یونینسٹ پارٹی کو ان

حلقوں میں بھی پناہ مل جائے گی۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ:
ان حلقوں سے باقاعدہ امداد واعانت میسر آنا شروع ہو جائے گی جو پہلے اس کے بدترین مخالف تھے"۔

آگے چل کر شیخ صاحب نے لکھا تھا کہ:
"جب ہمارے صوبے میں مسلم لیگ کی تازہ سرگرمیاں شروع ہوئی تھیں تو ان کا سب سے حوصلہ افزا پہلو یہ تھا کہ لیگ کے کارکنوں نے عوام کے ساتھ رابطہ استوار کرنے اور ان کی حالت سدھارنے کو لیگ کے پروگرام کی اوّلین شق قرار دیا تھا۔ اب یہی شق اس گروہ کو جو لیگ پر قابض ہو چکا ہے، اپنے مقاصد کے لئے سب سے زیادہ مہلک نظر آئے گی لہٰذا رابطہ عوام کی تحریک کا ختم ہو جانا یقینی ہے"۔
ظاہر ہے کہ جب عوام کے سامنے کوئی نصب العین، کوئی پروگرام اور کام کرنے کا کوئی محرک نہیں رہے گا تو لیگ کی تحریک کے آہستہ آہستہ مٹ جانے میں کیا شک باقی ہے۔ یونینسٹ پارٹی کا مقصد بھی یہی ہے کہ عوام بے خبر، جاہل اور پس ماندہ رہیں۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ کانگرس مسلمان عوام میں زور شور سے پراپیگنڈا کر کے انہیں گمراہ کر سکے گی۔ کاش مسلم لیگ اس وقت اپنی جداگانہ اور خود مختار حیثیت کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جائے۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکی تو پھر سمجھ لیجئے کہ مسلمانان پنجاب کے مٹ جانے میں کوئی شبہ باقی نہیں![1]

شیخ عبدالغنی نے یہ الفاظ سکندر جناح پیکٹ کے چند ہی روز بعد کہے تھے۔ اس وقت تو حالت یقیناً اتنی مایوس کن نہیں تھی کیونکہ پنجاب میں مسلم لیگ کی جداگانہ ہستی برقرار تھی اور ہم لوگ کھلے بندوں لیگ کا پروپیگنڈا کر سکتے تھے۔ لیکن آرگنائزنگ کمیٹی قائم ہو جانے کے بعد شیخ صاحب کے الفاظ کی صداقت آشکارا ہو گئی تھی۔ اب پنجاب میں مسلم لیگ کی تنظیم، ترتیب اور تعمیر کا سارا کام یونینسٹ پارٹی کے سپرد تھا۔ اور اس پارٹی کی انتہائی کوشش تھی کہ لیگ کا گلا اس طرح گھونٹ کر رکھ دیا جائے کہ اس کی آواز بھی نہ نکل سکے۔
۶ر مئی کے بعد آئندہ تین ماہ تک آرگنائزنگ کمیٹی کا کوئی اجلاس نہ ہوا۔ پھر ایک روز

---

۱۔ ہفتہ وار نیو ٹائمز لاہور - مورخہ ۹ نومبر ۱۹۳۷ء

یکایک اطلاع ملی کہ ۷ اگست ۱۹۳۸ء کو آرگنائزنگ کمیٹی کا اجلاس سر سکندر حیات خاں کے مکان پر ہو گا۔ جہاں میر مقبول محمود نئی پراونشل مسلم لیگ کے دستور کا مسودہ پیش کریں گے۔ میر صاحب ایک کاغذ پر چند نوٹ لکھ کر لائے تھے جن کی مدد سے انہوں نے نئی لیگ کے دستور کا خاکہ پیش کیا۔ آخر میں ان سے درخواست کی گئی کہ جلد از جلد مکمل مسودہ قلم بند کر کے پیش کریں۔

اس اجلاس میں سر سکندر نے مسلم لیگ کے دستور پر بحث کرنے کی بجائے اپنے زرعی بلوں پر تبادلہ خیال کرنا زیادہ ضروری خیال کیا۔ چنانچہ وہ خاصی دیر تک مولانا غلام رسول مہر اور مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش کو اس قسم کی ہدایات دینے میں مصروف رہے کہ ان بلوں کی حمایت میں اخباری پراپیگنڈے کی مہم کو کیوں کر تیز کیا جائے۔

پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی میں حکومت نے پانچ بل پیش کئے تھے جنہیں کانگرسی اور مہا سبھائی ہندو کالے بل اور یونینسٹ ممبر سنہرے بل کہتے تھے۔ ایک بل کا مفہوم یہ تھا کہ پنجاب کے تمام اضلاع میں قرضہ مصالحتی بورڈ قائم کئے جائیں تاکہ زراعت پیشہ لوگوں پر ساہوکاروں نے جو سود در سود کے ہتھکنڈوں سے قرض کا بار گراں لاد رکھا تھا اسے دیوانی عدالتوں کے توسل کے بغیر صاف کیا جائے۔ دوسرے بل کا مفہوم یہ تھا کہ غیر زراعت پیشہ طبقے کے لوگوں نے جس زرعی اراضی پر بے نامی قبضہ کر رکھا تھا اس کو ناجائز قرار دے کر اراضی کو اصل مالک یا اس کے ورثاء کے حوالے کر دیا جائے۔

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ قانون انتقال اراضی کی رو سے کوئی غیر زراعت پیشہ شخص کسی زراعت پیشہ شخص سے زمین نہیں خرید سکتا تھا اس سلسلے میں حکومت کو شکایات موصول ہوئیں کہ قانون انتقال اراضی کی پابندیوں سے بچنے کے لئے بہت سے غیر زراعت پیشہ لوگوں نے بے نامی طریق سے زرعی اراضی پر قبضہ کر رکھا ہے یعنی سرکاری کاغذات میں تو کسی فرضی زراعت پیشہ شخص کا نام بطور خریدار کے درج ہے لیکن اصل خریدار کوئی غیر زراعت پیشہ ہے۔ حکومت نے ایک خاص بل وضع کر کے ان تمام بے نامی قبضوں کو منسوخ کر دیا۔

تیسرے بل کا مقصد یہ تھا کہ اگر جون ۱۹۰۱ء سے قبل کوئی اراضی رہن رکھی گئی تھی اور وہ رہن بدستور قائم ہے تو اراضی مرہونہ کو بغیر کسی رقم کی ادائیگی کے واگزار کر دیا جائے گا۔ حکومت کا اندازہ تھا کہ اس طرح سات لاکھ چھپن ہزار ایک سو اکتیس ایکڑ رہن شدہ اراضی واگزار ہو کر اصل مالکوں کو واپس مل جائے گی۔

چوتھے بل کا مفہوم یہ تھا کہ اگر زراعت پیشہ طبقے کے کسی فرد کے خلاف دیوانی عدالت سے قرضے کی وصولی کی ڈگری صادر ہو جائے تو عدالت مذکور کو اجرائے ڈگری کے سلسلے میں آفیشل ریسیور مقرر کرنے کا اختیار نہیں ہو گا۔ پانچویں بل کا مقصد یہ تھا کہ ساہو کاروں کو باقاعدہ لائسنس لینا پڑے گا اور کوئی شخص بغیر لائسنس کے ساہو کارا نہیں کر سکے گا۔ اگر کسی شخص نے اپنے کاروبار میں بد دیانتی کا ارتکاب کیا تو اس کا لائسنس ضبط کر لیا جائے گا اور جب تک لائسنس بحال نہ ہو جائے گا وہ شخص قرضے کی وصولی کے لئے کسی قسم کی عدالتی کارروائی کرنے کا مجاز نہیں ہو گا۔

ان بلوں کے خلاف پنجاب کے ہندو بہت واویلا کر رہے تھے اور انہیں کالے بل کہہ کہہ کر اپنے غم و غصہ کا اظہار کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ یہ ایجی ٹیشن وسیع ہونے لگی اور آخر کار راجہ نرندر ناتھ نے بطور احتجاج اسمبلی کی رکنیت سے استعفا دے دیا۔

راجہ نرندر ناتھ کی پارٹی، جس کا نام نیشنل پروگریسو پارٹی تھا، سر سکندر کی وزارت میں شریک تھی اور کابینہ میں وزیر خزانہ سر منوہر لال اس پارٹی کی نمائندگی کرتے تھے۔ ۱۳- ستمبر ۱۹۳۸ء کو راجہ نرندر ناتھ اور ان کی پارٹی کے دو بڑے اہم ممبروں، رائے بہادر بندا سرن اور رائے بہادر گوپال داس کے مشترکہ دستخطوں سے اخبارات میں ایک بیان شائع ہوا کہ نیشنل پروگریسو پارٹی آئندہ وزارتی پارٹی سے بالکل علیحدہ ہو جائے گی۔ اس بیان میں سر سکندر حیات خاں کے خلاف الزام لگایا گیا تھا کہ انہوں نے ترتیب وزارت کے وقت نیشنل پروگریسو پارٹی کے لیڈر یعنی راجہ نرندر ناتھ سے جو عہد و پیمان کئے تھے ان کی صریح خلاف ورزی کی گئی ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ سر سکندر نے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ قانون انتقال اراضی کے دائرے کو وسیع نہیں کیا جائے گا لیکن اب بے نامی قبضوں کو منسوخ کر کے انہوں نے وعدہ خلافی کی ہے۔

راجہ نرندر ناتھ کے مستعفی ہونے اور نیشنل پروگریسو پارٹی کے وزارتی گروپ سے علیحدہ ہو جانے کے باوجود سر منوہر لال بدستور کابینہ میں شریک رہے اور جب ان سے پوچھا گیا کہ جس پارٹی کی آپ نمائندگی فرماتے تھے وہ تو حزب مخالف میں شامل ہو گئی ہے۔ اب آپ کابینہ میں کس کے نمائندے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ مجھ کو اقتصادیات اور مالیات کے ایک ماہر یعنی "اکسپرٹ" کی حیثیت سے وزیر خزانہ بنایا گیا تھا اور جب تک میری یہ حیثیت برقرار ہے میں وزارت سے علیحدہ نہیں ہوں گا۔

۲۱ر اکتوبر ۱۹۳۸ء کو سر سکندر حیات خاں کے مکان پر آرگنائزنگ کمیٹی کا تیسرا اجلاس

ہوا، جہاں صوبہ مسلم لیگ کے دستور کا مسودہ منظور کیا گیا۔ اس کے بعد سر سکندر نے غلام رسول خاں سے درخواست کی کہ مسلم لیگ کی تمام شاخوں کو لکھ دیا جائے کہ وہ جدید دستور کے مطابق اپنی اپنی تنظیم کریں۔

پنجاب کے تمام اضلاع میں چونکہ شاخیں پہلے سے موجود تھیں اس لئے ان کو فرداً فرداً خطوط لکھ دیئے گئے اور ہر شاخ کو نئے دستور کا مسودہ بھی بھیج دیا گیا۔ غلام رسول خاں کے ان خطوں سے ہر جگہ جوش و مسرت کی لہر دوڑ گئی اور جملہ شاخوں نے اپنے اپنے ہاں نئے سرے سے تنظیم کر کے باقاعدہ عہدے داروں کا انتخاب شروع کر دیا۔

اس واقعہ کو ابھی مشکل سے ایک مہینہ گزرا تھا کہ لیگ کی شاخوں کے شکایتی خطوط ہمارے پاس آنا شروع ہو گئے کہ سر سکندر حیات خاں کے ایما پر ہر ضلع اور ہر تحصیل میں وہاں کے نمبردار، ذیلدار، آنریری مجسٹریٹ اور سب رجسٹرار وغیرہ مل کر متوازی لیگیں قائم کر رہے ہیں اور کھلے بندوں کہہ رہے ہیں کہ لیگ کی اصل شاخیں تو یہ ہیں۔

ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ جھگڑا کس نے شروع کیا ہے۔ غلام رسول خاں اور ملک برکت علی نے دو ایک مرتبہ سر سکندر کو ٹیلی فون کر کے حقیقت دریافت کرنا چاہی لیکن وہ لاہور سے باہر گئے ہوئے تھے اور ملاقات نہ ہو سکی۔ اب ہوا یوں کہ لیگ کی بعض شاخوں کے عہدے دار خود چل کر لاہور آئے اور انہوں نے بتایا کہ ۲۳- نومبر ۱۹۳۸ء سے نواب زادہ خورشید علی خاں نے تمام اضلاع کے سرکاری آدمیوں کو خط لکھنا شروع کر دیئے ہیں کہ غلام رسول خاں کی ہدایت کی پرواہ مت کرو اور اپنے آدمیوں کی مدد سے ہر ضلع میں لیگ کی شاخیں قائم کرو۔ چنانچہ ان لوگوں نے اس قسم کے چند خطوط ہمیں بھی دکھائے۔

غلام رسول خاں غصہ ور طبیعت کے آدمی تھے۔ انہوں نے جب یہ منافقت آمیز کھیل دیکھا کہ ایک طرف سر سکندر حیات خاں باصرار انہیں آرگنائزنگ کمیٹی کا سیکرٹری مقرر کر کے لیگ کی تنظیم و ترتیب کا ذمے دار بناتے ہیں اور دوسری طرف بالا بالا نواب زادہ خورشید علی خاں سے کہتے ہیں کہ ذیلداروں، نمبرداروں اور آنریری مجسٹریٹوں کو لکھو کہ اپنے اپنے ضلعے میں متوازی لیگیں قائم کریں تو انہوں نے اسی وقت آرگنائزنگ کمیٹی کے سیکرٹری کے عہدے سے استعفا دے دیا اور بطور احتجاج سر سکندر حیات خاں کو ایک طویل خط لکھ کر ان سے اس قابل اعتراض رویئے کی وضاحت طلب کی۔

اب صاف نظر آ گیا تھا کہ ہم زیادہ دیر سر سکندر حیات خاں کے ساتھ نہیں چل سکیں

گے۔ سارے پنجاب میں الجھن ہی نہیں بلکہ فساد پیدا کر دیا گیا تھا۔ ہر ضلع میں متوازی لیگیں قائم کی جا رہی تھیں۔ ایک طرف پرانی لیگیں تھیں جن میں عوام کے مخلص اور آزمودہ کار نمائندے منتخب ہو کر آئے تھے اور دوسری طرف سرکاری لیگیں تھیں جن کے عہدے داروں کو لوگوں نے منتخب نہیں کیا تھا بلکہ پنجاب کے وزیر اعظم نے لاہور میں بیٹھے بیٹھے نامزد کر دیا تھا۔

غلام رسول خاں کا خیال تھا کہ ہمیں آرگنائزنگ کمیٹی سے مستعفی ہو جانا چاہئے۔ میں اس بارے میں ان سے متفق تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں تو مدت سے چاہتا تھا کہ اس کام سے پیچھا چھڑاؤں لیکن ملک برکت علی اس تجویز کے خلاف تھے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ استعفاء دینے سے پہلے مسٹر جناح کو اطلاع کرنا ضروری ہے کہ ہم یہ قدم اٹھانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

ملک صاحب نے ذیل کا خط مرتب کیا جس پر ان کے علاوہ غلام رسول خاں، پیر تاج الدین، میاں عبدالعزیز بیرسٹرایٹ لاء، خلیفہ شجاع الدین اور راقم التحریر نے بھی دستخط کئے۔ یہ خط یکم دسمبر ۱۹۳۸ء کو مسٹر جناح کی خدمت میں بھیجا گیا۔

"ڈیئر مسٹر جناح۔

ہمارے خیال میں یہ ضروری ہے کہ آپ کو آگاہ کر دیا جائے کہ اس صوبے میں کیا کچھ ہو رہا ہے اور یہ بھی بتایا جائے کہ کلکتہ سے واپس آنے کے بعد لیگ نے اب تک کتنی ترقی کی ہے۔

اپریل ۱۹۳۸ء میں آپ نے کلکتہ میں پنجاب کے لئے ایک آرگنائزنگ کمیٹی بنائی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ اس صوبے میں لیگ کی ابتدائی شاخیں قائم کرنے کے بعد ایک ایسی صوبائی لیگ تشکیل کی جائے جو اس جمہوری دستور کے عین مطابق ہو جسے اجلاس لکھنؤ کے موقعے پر منظور کیا گیا تھا۔

اس آرگنائزنگ کمیٹی میں آپ نے سر سکندر کو بہت بڑی اکثریت عطا کی تھی۔ اس طرح آپ کا خیال تھا کہ وہ خوش ہو جائیں گے اور بغیر کسی حیل و حجت یا رنجش کے کھلے دل سے لیگ سے تعاون کریں گے۔ ہم لوگ سر سکندر کی اس غیر معمولی اکثریت کو قبول کرنے پر قطعی رضامندہ نہ تھے۔ لیکن محض آپ کی خوشنودی کی خاطر سے ہم نے اس حب تلخ کو نگلنا بھی گوارا کر لیا۔

اس کے باوجود آج تک پنجاب میں لیگ کی ترقی و تنظیم یا پروپیگنڈا کے لئے کچھ بھی نہیں ہوا۔ اسکے برعکس یہ کہنا بجا ہو گا کہ لیگ کو موت کے گھاٹ اتارنے اور اس کی جملہ سرگرمیوں کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔ صرف یونینسٹ پارٹی کا پروپیگنڈا ہو رہا ہے، یا پھر زمیندارہ لیگ کی شاخیں جا بجا قائم کی جا رہی ہیں۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ سر سکندر مسلم لیگ کی ترقی و تنظیم کے خیال سے ڈرتے ہیں۔ چنانچہ اب تک ایک شاخ بھی تو کہیں قائم نہیں ہوئی۔ پرانی صوبہ لیگ بالکل معطل اور بے کار پڑی ہے اور لیگ کا سارا جوش و خروش ٹھنڈا ہو چکا ہے۔ یہاں تک کہ اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی بھی نہیں بنائی گئی۔

اس تمام کارروائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ لیگ کا وقار بالکل زائل ہو گیا ہے اور عوام کا اعتماد آہستہ آہستہ اٹھتا جا رہا ہے۔ ایک طرف تو یہ حالت ہے کہ صوبے کی مسلمان آبادی کی انتہائی خواہش ہے کہ پنجاب میں جلد از جلد لیگ کی ایک زبردست شاخ قائم ہو اور دوسری طرف صوبائی لیگ بالکل معطل، مردہ اور بے جان ہو چکی ہے۔ اس طرز عمل سے عوام میں ایک خوفناک انتشار پیدا ہو گیا ہے اور اب وہ کھلم کھلا سکندر جناح پیکٹ کی مذمت کر رہے ہیں۔

امر واقع یہ ہے کہ یونینسٹ پارٹی کے کارکن اور گماشتے. بیّن الفاظ میں یہ کہتے ہیں کہ مسٹر جناح یونینسٹ پارٹی کے آگے جھک گئے ہیں یونینسٹ پارٹی مسٹر جناح کے سامنے نہیں جھکی۔ وہ تو اس قسم کا دعویٰ کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتے کہ یہ پیکٹ گویا سر سکندر کی ایک شاطرانہ چال تھی جس سے انہوں نے لیگ کی امداد و اعانت بھی حاصل کر لی اور ملک برکت علی سمیت تمام لیگی ممبروں کے ووٹوں پر بھی قبضہ کر لیا اور ساتھ ہی صوبے بھر میں لیگ کی جملہ سرگرمیوں کو ختم کر کے رکھ دیا۔ اگر چندے یہی کیفیت رہی تو سمجھ لیجئے کہ پنجاب میں مسلم لیگ کو موت کی نیند سلا دیا جائے گا۔

ہم اپنے دامن پر مسلم لیگ کے خون کا دھبّہ نہیں لگانا چاہتے اور پنجاب میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ذمہ داری اپنی گردن پر لینے کو قطعاً تیار نہیں۔ ہم نے محض آپ کی درخواست پر آرگنائزنگ کمیٹی کی شرکت قبول کر لی تھی حالانکہ ہم جانتے تھے کہ اس میں سر سکندر کو غیر معمولی اکثریت عطا کی جا رہی ہے۔ اب ہم مجبوراً آرگنائزنگ کمیٹی سے مستعفی ہونا ہی قرینِ دانش سمجھتے ہیں۔ لیکن ہم نے مناسب خیال کیا کہ باضابطہ استعفاء دینے سے قبل آپ کو حالات سے باخبر کر دیا جائے۔

خدا گواہ ہے ہمارے پیش نظر صرف مسلم لیگ کی فلاح و بہبود اور قومی تنظیم ہے۔ کسی قسم کی دنیوی منفعت کا لالچ دامن گیر نہیں۔ ہم نے لیگ میں اس لئے شرکت نہیں کی تھی کہ اس طرح ہماری وزارت کے مضبوط و مستحکم ہونے کا امکان ہے۔ اگر سر سکندر لیگ کا کام جاری رکھتے اور قومی تنظیم کے ساتھ ساتھ انہیں کسی نوع کے دنیاوی فوائد بھی حاصل ہو جاتے تو ہمیں حاشا و کلا کوئی اعتراض نہ تھا۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ سر سکندر اس وہم میں مبتلا ہیں کہ اگر لیگ کو فروغ حاصل ہوا تو ان کی وزارت ختم ہو جائے گی۔ اس وہم کی بناء پر انہوں نے لیگ پر قبضہ کر کے اسے جان سے مار دیا ہے۔

ہم اس قومی خود کشی سے اپنے دامن کو داغ دار نہیں کرنا چاہتے۔ ہم جانتے ہیں کہ کل کو اگر سر سکندر نے یہ محسوس کیا کہ کانگرس کے دامن میں پناہ لینے سے ان کی وزارت محفوظ رہ سکتی ہے تو وہ سندھ کے بیوداہ، خاں بہادر اللہ بخش کی طرح یہ قدم اٹھانے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ ہمارا فرض ہے کہ آپ کو حالات سے مطلع کر دیا جائے اور ساتھ ہی یہ بھی عرض کیا جائے کہ یا تو موجودہ آرگنائزنگ کمیٹی کو توڑ کر پنجاب کی اس پرانی لیگ کا الحاق منظور فرمالیجئے جس کی شاخیں صوبے کے طول و عرض میں قائم ہیں یا پھر ہمیں اجازت مرحمت فرمائیے کہ ہم آرگنائزنگ کمیٹی سے مستعفی ہو کر اپنے خیال کے مطابق مسلمانوں کی بری بھلی خدمت جیسی ہم سے ہو سکتی ہے کریں۔

ہم یقیناً لیگ کی رکنیت ترک نہیں کریں گے لیکن یہ تو نہیں ہو سکتا کہ لیگ کو ہماری آنکھوں کے سامنے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے اور ہم خاموش بلکہ بے بسی سے یہ تماشا دیکھتے رہیں۔ سر سکندر غالباً یہ سمجھتے ہیں کہ لے دے کہ ان کا صرف یہ کام ہے کہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں جا کر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاسوں میں شرکت کریں اور آپ سے ربط و ضبط بڑھا کر اپنے وقار میں اضافہ فرمائیں اور جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے، لیگ کا سر کچلتے رہیں۔

ہم نے ہمیشہ خلوص دل سے آپ کے احکام کی تعمیل کی ہے۔ لیکن اب پانی سر سے گزر رہا ہے۔ اس لئے مجبوراً یہ عریضۂ نیاز بھیجنے کی جرأت کی ہے۔ گذارش ہے کہ اگر آپ پنجاب کی سابقہ مسلم لیگ کا الحاق منظور نہیں کر سکتے تو مہربانی فرما کر ہمیں آرگنائزنگ کمیٹی سے مستعفی ہونے کی اجازت دے دیجئے۔

اگر آپ کے خیال میں لیگ کی ترقی و تنظیم کے لئے سر سکندر موزوں ترین آدمی ہیں تو بخوشی یہ کام ان کے سپرد کر دیجئے، لیکن ہم اس سلسلے میں کسی قسم کی ذمے داری اٹھانے کو تیار نہیں، زیادہ نیاز"

اس عریضے کے جواب میں مسٹر جناح نے لکھا کہ استعفاء مت دو۔ چند ہفتوں کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس پٹنے میں ہو رہا ہے۔ وہاں بالمشافہ گفتگو ہو گی تو جملہ معلومات پر غور کر کے کوئی حل تلاش کر لیا جائے گا۔

(۲)

# فوجی بھرتی کا مسئلہ

۱۹۳۸ء میں دوسری عالمگیر جنگ کے بادل یورپ کے مطلع سیاست پر چھانا شروع ہو گئے تھے۔ مارچ کے مہینے میں ہٹلر نے آسٹریا کا پورا ملک ہضم کر لیا تھا اور اب اس کی نظریں چیکوسلواکیہ کی طرف اٹھنے لگی تھیں۔ انگلستان اور فرانس دونوں تذبذب کا شکار ہو رہے تھے کہ ہٹلر کی جوع الارض پوری کرنے کے لئے چیکوسلواکیہ کی قربانی بھی گوارا کر ہی لینا چاہئے۔ انگلستان کے وزیر اعظم چیمبرلین کی اس گومگو اور کمزور پالیسی کے باوجود اہل بصیرت کو صاف نظر آ رہا تھا کہ جنگ چھڑنے میں اب زیادہ سے زیادہ ایک برس اور لگے گا۔

ان حالات میں حکومت ہند بھی پریشان تھی کہ اگر یورپ میں جنگ شروع ہو گئی تو ہندوستان میں فوجی بھرتی کا کام وسیع پیمانے پر جاری کرنا پڑے گا۔ ہندوستانی فوج میں سب سے بڑا عنصر اہل پنجاب کا تھا اور ایک اندازے کے مطابق نصف سے زیادہ فوج پنجابی سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ سر سکندر حیات خان خود فوجی آدمی تھے۔ اور پہلی جنگ عظیم میں باقاعدہ فوج میں شرکت بھی کر چکے تھے۔ سیاسی عقائد سے قطع نظر وہ ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے جس میں ابتداء سے فوجی روایات چلی آتی تھیں۔ ان کے رفیق کار ملک خضر حیات خاں ٹوانہ بھی فوجی آدمی تھے جن کے والد میجر جنرل سر عمر حیات ٹوانہ کو کون نہیں جانتا جو "انڈین آرمی" کے ابوالاباء سمجھے جاتے تھے۔

اس خیال سے کہ کل کو اگر بھرتی شروع کرنی پڑی تو کسی قسم کی رکاوٹ حائل نہ ہو، سر سکندر نے حکومت ہند کو تحریک کی کہ ایک ایسا قانون منظور کیا جانا چاہئے جس کی رو سے بھرتی کی مخالفت کرنے والے کو دو سال تک کی سزائے قید دی جا سکے۔ چنانچہ ۱۵ اگست ۱۹۳۸ء کو حکومت ہند کے ڈیفنس سیکرٹری سی۔ ایم۔ جی۔ اگلوی[۱] نے اس مضمون کا مسودہ قانون مرکزی اسمبلی

---

۱۔ C.M.G Ogilvie

میں پیش کر دیا اور تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"............ فوجی بھرتی کی مخالفت کرنے والوں نے اپنی تمام سرگرمیوں کو پنجاب پر مرکوز کر دیا ہے۔ اس کی وجہ بالکل عیاں ہے جو اس ایوان کے معزز ممبروں سے مخفی نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں بھرتی کا سب سے بڑا مرکز پنجاب کا صوبہ ہے اور اگر یہ مسموم پراپیگنڈا وہاں جاری رہا تو ہندوستان کی فوج کو سخت نقصان پہنچے گا۔ چند مہینے ہوئے حکومت پنجاب نے اس امر کے متعلق ایک مراسلہ بھیجا تھا چنانچہ ہم بڑے غور سے بتدریج اس تحریک کا مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ اور اب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ حکومت پنجاب نے جن خدشات کا اظہار کیا تھا وہ بالکل درست ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ جس قدر رنگروٹ ہمیں اس وقت درکار ہیں ان کے مہیا کرنے میں کوئی خاص دقت پیش نہیں آرہی لیکن یہ خطرہ ضرور لاحق ہے کہ اگر اس پراپیگنڈے کا بروقت سدباب نہ کیا گیا تو کل کو جب فوج میں اضافہ کرنے کی حاجت محسوس ہو گی تو اس پراپیگنڈے کے مضر اثرات بڑے خطرناک ثابت ہوں گے۔

بھرتی کی مخالفت کرنے والوں کا زیادہ زور پنجاب کے مرکزی اضلاع میں ہے لیکن مغربی اور مشرقی حصے بھی ان لوگوں کے شر سے محفوظ نہیں رہے۔ اس وقت تک صوبے کے مختلف مقامات پر ۲۸۰ جلسے منعقد ہو چکے ہیں جن میں شدت سے بھرتی کی مخالفت کی گئی ہے۔ تقریریں کرنے اور شورش پھیلانے والوں کی بیشتر تعداد بیرون پنجاب سے آتی ہے۔

اگرچہ ہندوستان کے اور صوبوں میں بھی اس قسم کی تحریک موجود ہے لیکن جتنا زور پنجاب پر صرف ہو رہا ہے اور کہیں نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت پنجاب اور حکومت ہند اس صورت حال سے سخت متفکر ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ پراپیگنڈا کرنے والے لوگ خوب جانتے ہیں کہ ان کی اس تحریک کے فوری نتائج ان کے حسب منشاء رونما نہیں ہوں گے کیونکہ پنجابی فطری طور پر بہادر اور وفاشعار انسان ہیں۔ وہ فوجی ملازمت کے دلدادہ ہونے کے علاوہ اپنے صوبے کی فوجی روایات کو بڑے فخر کی

نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ با ایں ہمہ یہ قطعاً گوارا نہیں کیا جا سکتا کہ صوبے کے سادہ اور ناخواندہ دیہاتیوں میں اس قسم کا شرانگیزاور زہر آلود پروپیگنڈا بغیر کسی روک ٹوک کے جاری رکھا جائے۔ پنجاب کے سادہ اور صاف دل باشندے خود اس پراپیگنڈے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر یہ قانون منظور ہو گیا تو پنجاب کی ننانوے فی صد دیہاتی آبادی اس کو خوش آمدید کہے گی۔ "

حقیقت یہ ہے کہ بھرتی کی مخالفت کرنے اور فوج میں باغیانہ خیالات پھیلانے کے خلاف تعزیرات ہند میں متعدد دفعات موجود تھیں مثلاً دفعہ نمبر ۵۰۳، دفعہ نمبر ۵۰۵، دفعہ نمبر ۵۰۸، دفعہ نمبر ۱۳۱، دفعہ نمبر ۱۳۲، دفعہ نمبر ۱۰۹۔ لیکن حکومت ہند کے ڈیفنس سیکرٹری نے یہ نیا مسودہ قانون پیش کر کے گویا قانون فوجداری میں ترمیم کی تحریک پیش کی تھی۔ اس قسم کی ایک ترمیم ۱۹۳۵ء میں بھی حکومت نے پیش کی تھی جس کی مسٹر جناح نے سخت مخالفت کی تھی اور کانگرس پارٹی اور انڈی پنڈنٹ پارٹی کی مشترکہ مخالفت سے وہ ترمیم منظور نہیں ہو سکی تھی۔

مسٹر اگلوی کے اس بل پر ایوان میں مسلسل دس روز بحث ہوتی رہی اور بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب سے مانٹیگو چیمسفرڈ اصلاحات رائج ہوئی تھیں ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں اس سے زیادہ پرخروش بحث کسی مسودہ قانون پر نہیں ہوئی تھی۔ کانگرس پارٹی کے تمام بڑے بڑے ارکان نے شدومد سے اس کی مخالفت کی۔ کانگرس پارٹی کے لیڈر بھولا بھائی ڈیسائی، ڈپٹی لیڈر ستیہ مورتی اور سیکرٹری آصف علی نے بڑی زور دار تقریریں کیں۔ ان کے علاوہ این۔ وی۔ گیڈگل، اکھل چندر دت، شام لال، سنت سنگھ، گووند دیش مکھ وغیرہ نے بھی کانگرس کی طرف سے خوب خوب داد خطابت دی۔ سب سے گھٹیا تقریر عبدالقیوم خاں کی تھی جو ان دنوں کانگرس کے بڑے پرجوش ممبر تھے۔ ان کی تقریر میں سوائے مغلظات کے اور کچھ نہ تھا جس پر ایوان کے صدر سر عبدالرحیم نے انہیں بار بار ٹوکا۔ حکومت ہند کے فارن سیکرٹری سر آبرے منکاف[1] کو عبدالقیوم خاں کی تقریر کے متعلق کہنا پڑا کہ:۔

"میں پچھلے چھ سال سے اس ایوان کا ممبر ہوں، لیکن شومئ قسمت سے جس قسم کی گالیوں سے بھری ہوئی تقریر میں نے مسٹر عبدالقیوم کی سنی ہے، اس کی مثال میں نے چھ سال میں نہیں دیکھی۔ وہ تو اس ایوان کے

---

1۔ Sir Aubrey Metcalf

معزز ممبروں کو اس حد تک مشتعل کر رہے تھے کہ انہیں اٹھ کر ان بنچوں پر جہاں ہم لوگ بیٹھے ہیں حملہ کر دینا چاہئے ۔ میں اس ایوان کو بتا دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ جس مقرر کا انحصار دلائل و شواہد کی بجائے محض مغلظات پر ہو وہ ہمیشہ اپنا دعویٰ ہار جاتا ہے"۔

ستیہ مورتی مدراس کے رہنے والے تھے اور بڑی فصیح انگریزی بولتے تھے۔ لیکن ان کی تقریر میں الفاظ کا تلاطم زیادہ اور دلائل و براہین کا توازن کم ہوتا تھا۔ اس مسودہ قانون کے خلاف تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا:۔

"میرا یہ جائز اور فطری حق ہے کہ اپنے اہل وطن کو خواہ وہ بڑی، بحری اور فضائی فوج کے سپاہی ہیں سمجھاؤں کہ دیکھنا آئندہ برطانیہ جس جنگ میں ملوث ہو گا تم اس میں قطعاً حصہ نہ لینا۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ برطانیہ کی خارجہ پالیسی کیا ہے اور وہ کس طرف رخ کرنے اور کیا گل کھلانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ برطانیہ آج اس سال خوردہ بڑھیا کی طرح ہے جو ہمت ہار بیٹھی ہے۔ جس کی کوئی خارجہ پالیسی نہیں اور جو اپنی سلطنت (ایمپائر) پر بیٹھی ٹسوے بہا رہی ہے جو یورپ کے ہر ڈکٹیٹر سے لرزاں و ترساں ہے اور جو ہندوستان کو اپنی اغراض مشئومہ کے لئے استعمال کرنا چاہتی ہے۔ آپ لوگ خوب جانتے ہیں کہ آپ کے ہاتھ میں واقعات کی باگ نہیں رہی۔ آپ کی ہمت کا دیوالہ نکل چکا ہے اور آپ اس فریب میں مبتلا ہیں کہ اس قسم کے بے سود قوانین وضع کر کے اپنی اس بوسیدہ سلطنت کو جس کی دیواریں ہل رہی اور چھتیں گر رہی ہیں، قائم رکھ سکیں گے ــــــ میں پوچھتا ہوں کہ اگر آج "برٹش ایمپائر" مٹ جائے تو دنیا کو کیا نقصان ہو گا؟ یہ برطانوی ایمپائر اس وقت دنیا کی ترقی اور امن کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ جس کے ختم ہوتے ہی چاروں طرف خوش حالی، مسرت اور امن کی ہوائیں چلنا شروع ہو جائیں گی۔

میں اپنے دوست، ڈیفنس سیکرٹری کو دوستانہ طور پر یاد دلانا چاہتا ہوں کہ انگریز قوم ان تمام خوبیوں اور خصوصیتوں سے محروم ہو چکی ہے جو کسی

زمانے میں اس کا طرۂ امتیاز تھیں۔ اور اس محرومی کی وجہ سراسر برطانوی ایمپائر کی چکی کا بوجھل پتھر ہے جو انگریزوں نے اپنی گردن میں لٹکا رکھا ہے۔ میرے دوست کو یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ برطانوی ایمپائر کی موت، ہندوستان اور برطانیہ اور ساری دنیا کی سب سے بڑی خدمت ہو گی"۔

بھولا بھائی ڈیسائی نے ایک طویل تقریر کے دوران میں کہا:

"ہمیں عوام کے خیالات و عقائد کے دھارے کا رخ بدل دینے کی جو طاقت حاصل ہے، آپ کو اس کا اعتراف ہے اور ساتھ ہی آپ اس طاقت سے خوف زدہ بھی ہیں، یہی وجہ ہے کہ آپ اس چیز کو جرم قرار دینا چاہتے ہیں۔ بے شک اسے جرم قرار دے دیجئے لیکن ہم تو اس کو اپنے لئے ایک بہت بڑا اعزاز سمجھتے ہیں۔

بلاشبہ ایک زمانہ ایسا گذرا ہے جب ملک کی آزادی کا نعرہ لگانا بھی جرم خیال کیا جاتا تھا۔ خوش قسمتی سے گزشتہ ربع صدی میں یہ نعرہ جرم نہیں رہا۔ اس لئے نہیں کہ آپ نے اسے جرائم کی فہرست سے خارج کر دینا گوارا کیا، بلکہ اس لئے کہ آپ میں اتنی جرأت نہیں کہ ہمارے مطالبہ آزادی کی مزاحمت کر سکیں۔ میرے نزدیک سب سے اہم اور مقدم وجہ یہی ہے جس کی بنا پر میں اس مسودۂ قانون کی مخالفت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ یہ مخالفت سراسر حب وطن اور صداقت پر مبنی ہے اور خواہ اس ایوان کے تمام ممبر میرا ساتھ چھوڑ دیں اور میں اس معرکے میں تنہا رہ جاؤں پھر بھی اس بل کی مخالفت جاری رکھوں گا۔ مجھے یقیناً یہ حق حاصل ہے کہ اپنے اہل وطن کو ایسے کام سے مجتنب رہنے کا مشورہ دوں جسے نہ کرنے کی انہیں پوری آزادی حاصل ہے۔

آپ میرے کسی ہم وطن کو ہرگز مجبور نہیں کر سکتے کہ آپ کے پچیس روپوں کی خاطر ایک ایسی جنگ میں کود کر سر کٹوا دے جس کو وہ حق بجانب نہیں سمجھتا۔ میری اس بات پر اعتبار کیجئے گا کہ ۱۹۳۸ء کا ہندوستان ۱۹۱۴ء کا ہندوستان نہیں ہے۔ اب وہ قطعی مختلف ہے۔ سوال یہ ہے کہ

ہم کیوں آپ کی مدد کریں؟ اور کیوں آپ کی کامیابی کے لئے کوشاں ہوں؟ کیا آپ ہمیں یقین دلا سکتے ہیں کہ یہ آنے والی جنگ کسی لحاظ سے بھی ہندوستان کے لئے مفید ہو سکتی ہے؟ کیا اس جنگ سے آپ کا یہ مقصد نہیں کہ ہم اپنے آدمی، اپنا روپیہ اور اپنے قومی وسائل آپ کی ایمپائر کو قائم و دائم رکھنے کے لئے قربان کر دیں؟

میں اس ایوان کے ممبروں سے درخواست کرتا ہوں کہ حکومت اور اس کے حامی اس بل کی تائید میں جو عذر چاہیں تراش لیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو شخص بھی اس بل کی حمایت میں ووٹ دے گا وہ ہندوستان سے غداری کا مرتکب ہو گا"۔

بھولا بھائی، ستیہ مورتی اور آصف علی نے اپنی تقریروں کے دوران میں بار بار ۱۹۲۱ء کے مقدمہ کراچی کا بھی ذکر کیا، جس میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا حسین احمد اور پیر غلام مجدد کو اس جرم میں دو دو سال قید بامشقت کی سزا ہوئی تھی کہ انہوں نے تحریک خلافت میں فوج کی ملازمت کو حرام قرار دیا تھا اور ہندوستانیوں سے اپیل کی تھی کہ انگریزی فوج میں بھرتی نہ ہوں۔ اسیران کراچی کی یہ اپیل جمعیت العلماء ہند کے مشہور فتوے کی بناء پر تھی جس کی رو سے فوج کی ملازمت کو حرام قرار دیا گیا تھا۔

عجیب اتفاق ہے کہ جب مقدمہ کراچی کے پورے سترہ سال بعد ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں فوجی بھرتی کے اس تازہ بل پر بحث ہو رہی تھی تو مولانا شوکت علی اسمبلی کی مسلم لیگ پارلیمنٹری پارٹی کے رکن تھے اور ایوان میں موجود تھے۔ چنانچہ کانگرس کے مقررین اپنے جوش خطابت میں بار بار مولانا کی طرف استہزا بھری نظروں سے دیکھتے تھے۔ ستیہ مورتی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ جمعیت العلماء کے صدر اور سیکرٹری نے ان کو تار بھیجے ہیں کہ اس بل کی مخالفت کرو اور اسے مسترد کرا دو۔

اسی موضوع پر آصف علی کی تقریر کا ایک ٹکڑا ملاحظہ فرمائیے:۔

"میں اپنے دوستوں کو یقین دلاتا ہوں کہ کانگرس کے تمام مسلمان ممبر محض اپنے عقائد کی بناء پر اس بل کی مخالفت کر رہے ہیں۔ ہمارے سامنے ایک مقصد تو یہ ہے کہ شہری آزادی کو کسی قسم کا گزند نہیں پہنچنا چاہئے اور دوسرا مقصد وہ ہے جس کا ذکر میں نے اگلے دن اپنی تقریر میں کیا تھا۔

جہاں تک شہری آزادی کا سوال ہے میرے معزز دوست ستیہ مورتی نے اپنی تقریر میں ان بہت سے تاروں اور پیغامات کا بھی ذکر کیا تھا جو انہیں جمعیت العلماء اور دیگر اسلامی انجمنوں کی طرف سے موصول ہوئے ہیں۔ یہ تمام پیغامات میرے پاس موجود ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا کچھ زیادہ مدت نہیں گذری، اسی جمعیت العلماء کا فتویٰ ، ہندوستان کے ہر مسلمان کے لئے واجب التعمیل سمجھا جاتا تھا۔ میں تو اب بھی جمعیت العلماء کو علمائے ہند کی نمائندہ جماعت سمجھتا اور اس کی آواز پر عمل کرنا اپنا فرض خیال کرتا ہوں۔ مسلم لیگ والوں کو اختیار ہے کہ چاہیں تو ان علماء کی نمائندہ حیثیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیں"۔

اب آیئے بھولا بھائی ڈیسائی، ستیہ مورتی اور کانگرس کے دوسرے بلند آہنگ لیڈروں کی زندگی کا ایک اور پہلو بھی ملاحظہ کریں جو انہوں نے نہایت ہوشیاری سے عوام تو عوام، خواص کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھا ہوا تھا۔ عین جس وقت مرکزی اسمبلی میں فوجی بھرتی کے مسئلہ پر زور شور سے بحث ہو رہی تھی، برطانوی حکومت نے چھ آدمیوں کی ایک کمیٹی مقرر کی کہ ہندوستان جا کر وہاں کی فوج کا معائنہ کرے اور اسے جدید طریقوں پر منظم و مرتب کرنے کی ایک جامع سکیم تیار کرے۔ اس کمیٹی کے صدر لارڈ چیٹفیلڈ تھے جو انگلستان کے امیر البحر تھے۔ ممبروں میں لیفٹنٹ جنرل سر برٹرم سرگی سن بروک، سر ارنسٹ سٹرومنگر، ایئر مارشل کورٹنی، میجر جنرل آکنلک تھے اور سیکرٹری ایس۔ کے۔ براؤن تھے<sup></sup>۔ یہ کمیٹی نومبر ۱۹۳۸ء میں بمبئی پہنچی۔ کانگرس اور مسلم لیگ دونوں نے اس کمیٹی کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا تھا۔

لارڈ چیٹفیلڈ نے ۱۹۴۷ء میں اپنی خود نوشت سوانح عمری شائع کی تھی جس میں وہ لکھتے ہیں کہ جب وہ بمبئی وارد ہوئے تو بمبئی کے گورنر نے بصیغہ راز ان سے کہا کہ کانگرس نے اگرچہ آپ کا بائیکاٹ کر رکھا ہے، لیکن صوبے کے دو بڑے وزیر آپ سے در پردہ ملنا چاہتے ہیں۔ لارڈ چیٹفیلڈ نے بخوشی ملنے پر رضامندی کا اظہار کیا تو دونوں کانگرسی وزیر گورنمنٹ ہاؤس میں لارڈ چیٹفیلڈ سے جا کر ملے۔ لارڈ چیٹفیلڈ نے ان وزیروں کے نام نہیں لکھے لیکن اشارے کنائے سے بتا دیا ہے کہ

---

1 Lord Chatfield : Lieutenant General Sir Bertram Sergison Brook : Sir Ernest Sorohmenger : Air Marshal Courtney : Major General Auchinleck : S.K . Browwn.

ایک تو احاطہ بمبئی کے وزیر اعظم بی۔ جی کھیر اور دوسرے ہوم منسٹر کے ایم منشی تھے۔ ان دونوں وزیروں نے لارڈ چیٹفیلڈ سے شکایت کی کہ یہ کیا اندھیر ہے کہ آپ ہندوستانی فوج میں مسلمانوں کو اس کثرت سے بھرتی کر رہے ہیں، کیا ہندو مر گئے ہیں؟

اسی سلسلے میں آگے چل کر لارڈ چیٹفیلڈ لکھتے ہیں کہ:۔

"ہندوستان میں فوجی بھرتی جس اصول پر جاری ہے وہ ایک خاصی مدت سے رنجش اور نزاع کا باعث بنا ہوا ہے۔ کانگرس پارٹی کو سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ بھرتی زیادہ تر شمالی ہند سے ہوتی ہے اور جنوبی ہند کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اس کے جواب میں برطانوی حکمران یہ کہتے ہیں کہ جس علاقے سے بہترین سپاہی مہیا ہوں گے وہیں سے بھرتی کئے جائیں گے۔ اس میں کسی کی بے جا طرف داری یا دل آزاری مقصود نہیں۔

اس طرح فوجی اور سیاسی مفاد کا آپس میں ایک دوسرے سے تصادم ہو رہا ہے۔ کیونکہ شمالی ہند کی بیشتر آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے اور ہندوستان کی فوج میں بھی ان کی خاصی بڑی تعداد شامل ہے۔ جب بمبئی کے دو کانگرسی وزیر مجھ سے ملنے آئے تو انہوں نے بار بار یہی شکایت میرے سامنے پیش کی۔ ان کے علاوہ جتنے ہندو مجھ سے ملے انہوں نے بھی یہی کہا کہ فوج میں ہندوؤں کی بھرتی زیادہ ہونی چاہئے۔

دقت یہ تھی کہ جن امور کی تحقیقات کے لئے مجھے برطانوی حکومت نے باضابطہ ہندوستان بھیجا تھا، ان میں فرقہ وارانہ نمائندگی کا مسئلہ شامل نہیں تھا۔ ہمارے پاس اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ اس معاملہ کی اچھی چھان پھٹک کرتے۔ یہ مسئلہ اب سیاسی نوعیت اختیار کر چکا ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک اس موضوع پر طرفین کی شہادتیں مہیا نہ کی جاتیں۔ ہم کسی قطعی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر تھے۔ ادھر جو سرکاری افسر حالات و کوائف سے واقف تھے وہ ہمارے روبرو پیش ہو کر شہادت دینے کو آمادہ نہ تھے۔

یہ سارا جھگڑا ہندوستان کے اندرونی استحکام پر اثر انداز ہو رہا ہے کیونکہ اس ملک کی سیاست پر ہندو حاوی ہیں اور بحالات موجودہ فوج میں غالباً مسلمانوں کا عنصر زیادہ ہے"[1]۔

---

1. "It Might Happen Again" By Lord Chatfield (Page 152)

غور فرمایئے کہ ایک طرف بھولا بھائی ڈیسائی اور ستیہ مورتی فوجی بھرتی کی مخالفت میں دھواں دھار تقریریں کر رہے ہیں۔ دوسری طرف بی جی کھیر اور کے۔ ایم منشی، لارڈ چیمسفیلڈ کے سامنے آنسو بہار ہے ہیں کہ یہ ظلم ہے کہ ملک میں تو ہندوؤں کی اکثریت ہے اور فوج میں مسلمان زیادہ ہیں۔ اب اس مسئلہ کا ایک تیسرا پہلو بھی ملاحظہ فرمایئے۔ ہندو سبھا کے صدر ڈاکٹر مونجے نے صوبجات متوسط میں ایک مقام ناسک پر ہندو نوجوانوں کو فوجی تربیت دینے کے لئے ایک ملٹری کالج کھول رکھا تھا۔ جس کی پشت پر ہندوستان کے بعض بڑے بڑے ہندو والیان ریاست اور ہندو لیڈر تھے۔ ڈاکٹر مونجے کھلم کھلا کہتے تھے کہ ہندوستانی فوج میں مسلمان زیادہ ہیں، لہٰذا اس کمی کو پورا کرنے اور ہندو نوجوانوں کو اچھے سپاہی بنانے کے لئے سنڈھرسٹ کی قسم کا ایک پرائیویٹ کالج قائم کرنا ضروری ہے۔ کانگرس کے تمام لیڈر ڈاکٹر مونجے کے اس ارادے کے دل سے حامی تھے، اور انہوں نے کبھی بھولے سے بھی سوال نہیں کیا تھا کہ یہ ہندو نوجوان جو لیفٹننٹ اور کپتان کی وردی پہنے پھرتے ہیں، آخر کس غنیم کے خلاف صف آراء ہوں گے؟ صرف یہی نہیں، عین اس وقت جب فوجی بھرتی کے خلاف مرکزی اسمبلی میں یہ بحث ہو رہی تھی کونسل آف سٹیٹ میں آنریبل پی۔ این سپرو نے کھڑے ہو کر کہا۔

"ہم لوگ بھی جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے رہنے والے ہیں، اپنے ملک کے دفاع کے لئے اتنے ہی بے تاب ہیں جتنے کہ پنجابی۔ کیا وجہ ہے کہ ہمیں صرف ایک صوبے کا دست نگر بنا کر رکھ دیا گیا ہے؟ میں ہرگز اس بات کا حامی نہیں کہ فوج میں اہل پنجاب کے تفوق کو ایک مستقل اور دائمی صورت دے دی جائے۔ اگر آپ بھرتی کے میدان کو وسیع کر دیں اور پنجاب کے علاوہ اور صوبوں سے بھی رنگروٹ بھرتی کریں تو ہندوستان سے بہت سپاہی آپ کو مل جائیں گے"۔

کمانڈر انچیف نے پی۔ این۔ سپرو کی تقریر کے جواب میں صرف اتنا کہا کہ حکومت کی پالیسی یہ نہیں کہ فوجی بھرتی صوبہ وار کی جائے بلکہ دیکھا صرف یہ جاتا ہے کہ بہترین سپاہی کن اقوام سے میسر آ سکتے ہیں۔ تجربے نے ہمیں بتا دیا ہے کہ بعض اقوام اس اعتبار سے دوسری قوموں سے کہیں زیادہ صلاحیت کی مالک ہیں۔ لہٰذا زیادہ تر انہی کے آدمیوں کو فوج میں بھرتی کیا جاتا ہے۔ الگ الگ صوبوں کا خیال نہیں رکھا جاتا۔

جب فوجی بھرتی کے خلاف مرکزی اسمبلی کے ایوان میں کانگریسی لیڈروں کی آتش بیانی ختم ہو گئی تو مسلم لیگ پارٹی کی طرف سے میر غلام بھیک نیرنگ، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خاں اور مسٹر جناح نے تقریریں کیں اور اس بل کی حمایت کی۔ مولانا شوکت علی نے خصوصیت سے اس اعتراض کا جواب دیا کہ ۱۹۲۱ء میں انہوں نے فوجی بھرتی کی مخالفت کی تھی، تو آج اس کی حمایت کیوں کر رہے ہیں۔ عبدالقیوم خاں نے چونکہ اپنی تقریر میں بار بار مولانا شوکت علی پر حملے کئے تھے اس لئے مولانا نے اپنی تقریر ختم کرنے سے پہلے طنز و مزاح کے دو ایک وار عبدالقیوم خاں پر بھی کر دیئے۔ جن لوگوں کو مولانائے مرحوم سے شرف نیاز حاصل رہا ہے وہ جانتے ہیں کہ مرحوم اس قسم کے طرز تکلم کے بادشاہ تھے۔ انہوں نے فرمایا:۔

"میرے نوجوان دوست مسٹر عبدالقیوم نے اپنی تقریر میں بار بار میرا ذکر بھی کیا ہے۔ جناب والا! میرے دل میں مسٹر عبدالقیوم کی محبت ہے کیونکہ وہ میرے مرحوم بھائی مولانا محمد علی کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ تحریک خلافت میں انہوں نے ایک نوجوان رضاکار کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ آج وہ مخالف کیمپ میں شامل ہیں اور بڑھ بڑھ کر باتیں بنا رہے ہیں۔

ان کی یہ لن ترانیاں سن کر مجھے ایک بھولی بسری کہانی یاد آ گئی جو میرے بچپن میں میری انا سنایا کرتی تھی۔ وہ کہانی یہ ہے کہ ایک موٹا تازہ ہٹا کٹا اور تنو مند آدمی حد درجہ کاہل اور سست تھا۔ ایک روز وہ کسی رئیس کے پاس نوکری کے لئے گیا تو رئیس نے پوچھا:

"تمہارا نام کیا ہے"؟

"میرا نام ہے شکر پارہ!"

"تم کھاتے کتنا ہو؟"

"من دس بارہ!"

"پانی کتنا پیتے ہو؟"

"مٹکا سارا!"

"کام کتنا کرتے ہو؟"

"میں ہوں ننھا بے چارہ۔"

"یہی کچھ حال مسٹر عبدالقیوم کا ہے۔ جب ان سے جنگ میں لڑنے کو کہا

جاتا ہے تو بڑی معصومیت سے جواب دیتے ہیں. کیا کروں میں تو عدم تشدد کا قائل ہوں"۔

اسمبلی کے ایوان میں سب کی نظریں مسٹر جناح کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اس لئے کہ کانگرس اور حکومت کے درمیان مسلم لیگ پارٹی ایک فیصلہ کن عنصر کی حیثیت رکھتی تھی۔ میں یہاں مسٹر جناح کی پوری تقریر کا ترجمہ درج کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس واقعہ کے سال بھر بعد دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی اور جنگ کے دوران میں بعض بڑے پُر پیچ مسائل پیدا ہونے لگے۔ مسلم لیگ اور پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات خاں کے درمیان جس قدر تلخی اور غلط فہمی پیدا ہوئی اس کی ایک بہت بڑی وجہ یہی جنگی امداد کا سوال تھا۔

## مسٹر جناح کی تقریر

جناب والا! بحث میں اس قدر گرمی پیدا کر دی گئی ہے اور جذبات کو اس قدر برافروختہ کیا گیا ہے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ ایسے تکدّر آمیز ماحول میں کسی معقول اور سنجیدہ انداز میں بات کرنا بے حد دشوار ہو گیا ہے۔ تاہم اپنی پارٹی کا نُقطۂ نگاہ واضح کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ میں اپنی معروضات آپ کے سامنے پیش کر دوں۔ آپ جس قدر بحث میں زیادہ حدّت اور جذباتی خروش پیدا کرتے چلے جائیں گے اُسی نسبت سے دلیل اور عقل سے بات کرنا مشکل ہو جائے گا۔

اس سلسلے میں مجھے انتہائی افسوس کے ساتھ ایک اور بات بھی کہنا ہے. میری مراد ان حد درجہ قابل اعتراض الفاظ سے ہے جو حزبِ مخالف کے لیڈر نے اپنی تقریر میں استعمال کئے ہیں۔ اگر یہی الفاظ کسی پچھلی بنچ پر بیٹھنے والے ایک معمولی اور غیر معروف ممبر کی زبان سے نکلتے تو مجھے چنداں رنج نہ ہوتا۔ لیکن حزبِ مخالف کے لیڈر نے جو کچھ فرمایا ہے اُس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اس بل کی تائید کرتا ہے اُسے اپنے اِس فعل پر شرم کرنا چاہئے۔

جناب والا! حزبِ مخالف کے لیڈر جیسی ذِمّے دار ہستی کی زبان سے یہ الفاظ سُن کر حیرت ہی نہیں افسوس بھی ہوتا ہے۔ پھر انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ جو شخص اِس بل کی حمایت کرے گا وہ آزادیٔ وطن کا دشمن اور ملک کا غدّار ہے۔ آخر میں انہوں نے اپنی تقریر کو ختم کرتے وقت جس قسم کی دھمکیوں سے ہمیں مرعُوب کرنے کی کوشش کی ہے وہ بھی اُن کے شایانِ شان نہیں۔

## قابلِ اعتراض رویہ

اُنہوں نے ہماری طرف اشارہ کر کے کہا ہے کہ "یہ مسلم لیگ والے آج کانگرس اور حکومت کے درمیان ایک ترازو بن کر بیٹھے ہوئے ہیں وہ وقت عنقریب آنے والا ہے جب یہ بیچ سلنب ہو جائے گی"۔ وہ جس قسم کے ماحول کا تصور کئے بیٹھے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک سنگ دل اور بر اکثریت کے زور سے ہمیں کچل کر رکھ دیا جائے گا اور ہم سر اُٹھانے کے قابل نہیں رہیں گے اور اپنے خیالات و عقائد کے اظہار کی آرزو تک سے بھی محروم ہو جائیں گے۔

جنابِ والا! میں پوچھتا ہوں کہ کیا اِسی کا نام جمہوریت ہے؟ میں قطعاً اِس طرزِ عمل کو پسند نہیں کرتا۔ اور نہ حزبِ مخالف کے لیڈر سے یہ کہنا مناسب سمجھتا ہوں کہ وہ اپنی حیثیت اور اِس کے تقاضوں پر دوبارہ غور کریں۔ اُن کا یہ طرزِ کلام اُن کے منصب کے شایانِ شان نہیں۔

اُنہوں نے ہمارے مُتعلق اور بھی بہت سی افسوس ناک باتیں کی ہیں جنہیں سرِدست میں نظر انداز کرنا ہی مناسب سمجھتا ہوں۔ بااِیں ہمہ میں ایوان کو اور اپنے اُن دوستوں کو بھی جو ہمارے دائیں ہاتھ کی جانب بیٹھے ہیں اور جن سے آج ہمیں مسئلہ زیرِ بحث پر اختلاف ہے یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں اُس کے پیچھے صرف ہندوستان کی فلاح و بہبود کا جذبہ کار فرما ہے۔

لہٰذا ہمیں ٹھنڈے دل سے اِس مسئلہ پر دوبارہ غور کرنا چاہئے۔ جنابِ والا! اِس بِل پر جو بحث ابھی ہو چکی ہے اُس میں دُنیا بھر کی باتیں داخل کر دی گئی ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ پیرو سے جاو تک ہر موضوع پر کچھ نہ کچھ کہا گیا ہے۔ ضرورت اِس بات کی ہے کہ غیر مُتعلقہ اُمور سے قطع نظر کر کے اور جذبات کی گرم جوشی سے الگ ہو کر پہلے ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ جس قسم کے حالات اِس وقت طاری ہیں، کیا ان کی روشنی میں اس بِل کی ضرورت ہے بھی یا نہیں؟

جنابِ والا! آگے بڑھنے سے قبل میں یہ نکتہ صاف کرنا چاہتا ہوں کہ اگر پنجاب کی حکومت کو اپنے صوبے کے لئے یہ قانون درکار ہے تو کیا اُسے اختیار ہے کہ خود یہ قانون وضع کر سکے؟ میں نے حزبِ مخالف کے لیڈر اور حکومت کے آنریبل لاء ممبر کی تقریریں بڑے غور سے سنی ہیں۔ جب میں آنریبل لاء ممبر کی تقریر سُن رہا تھا تو مجھے واقعی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ موجودہ صورتِ حال کا صحیح تجزیہ کر رہے ہیں۔ اِس کے برعکس جب حزبِ مخالف کے لیڈر نے تقریر کی ___ اگر میں غلط کہہ رہا ہوں تو وہ اصلاح کر سکتے ہیں ___ تو میں نے دیکھا کہ وہ فیڈرل فہرست نمبر ا کے اندراج نمبر

۴۲ کو بالکل نظرانداز کر گئے ہیں۔ اب اگر آپ فہرست نمبر ا کے اندراج نمبر ۴۲ کو بھی ملحوظِ خاطر رکھیں تو میں حد درجہ ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ حزبِ مخالف کے لیڈر کے تمام دلائل کا قلعہ دھڑام سے زمین پر آگرتا ہے۔

صورتِ حال یہ ہے کہ فیڈرل فہرست میں جو اندراج نمبر ا ہے وہ اِس ایوان میں پڑھ کر سُنایا جاچکا ہے۔ میں اُسے دوبارہ پڑھنا بے کار سمجھتا ہوں۔ البتہ اگر آپ اندراج نمبر ا کو اندراج نمبر ۴۲ کے ہمراہ شامل کریں تو موجودہ بِل اُن کے تحت آتا ہے۔ اب آیئے فہرست نمبر ۲ یعنی صوبائی فہرست کی جانب۔ اِس میں لے دے کے صرف اندراج نمبر ے ۳ ہے لیکن جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں موجودہ بِل کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اِن کے بعد فہرست نمبر ۳ میں اندراج نمبر ا آتا ہے۔ موجودہ بِل اِس فہرست اور اندراج سے خارج معلوم ہوتا ہے کیونکہ جو اُمور اِس فہرست سے خارج ہیں وہ موجودہ بِل پر حاوی نہیں ہو سکتے۔ جنابِ والا! میں آپ کی اجازت سے اِس فہرست کے اندراج نمبر ا کا متن پڑھ کر سنانا چاہتا ہوں۔

## دوسرا سوال

مُتعلّقہ متن یہ ہے "قانونِ فوجداری جس میں وہ تمام اُمور شامل ہیں جو بوقت اس ایکٹ کے پاس ہونے کے تعزیراتِ ہند میں شامل ہیں، لیکن جن سے اُن جُملہ جرائم کو خارج کیا گیا ہے جن کا تعلق اُن قوانین سے ہے جو ایسے اُمور سے واسطہ رکھتے ہیں جن کی تخصیص فہرست نمبر ا اور فہرست نمبر ۲ میں کی گئی ہے اور اس سے ملک مُعظّم کی بحری، بّری اور فضائی فوج بھی خارج ہے۔ در آں حالیکہ اِس کو سول حُکاّم کی اِمداد کے لئے استعمال کیا گیا ہو"۔

میں اِس سلسلے میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی دفعہ نمبر ۱۰۰ کا بھی حوالہ دینا چاہتا ہوں جس کا اطلاق مسئلۂ زیرِ بحث پر ہو سکتا ہے۔ دفعہ نمبر ۱۰۰ کی ذیلی دفعہ نمبر ا کو بشمول فہرست ہائے نمبر ا، نمبر ۲ اور نمبر ۳ پڑھنا چاہئے۔ ذیلی دفعہ نمبر ا کہتی ہے "بلا لحاظ اِن اُمور کے جن کا ذکر معاً بعد دو ذیلی دفعات میں کیا گیا ہے۔ یہ اختیار فیڈرل مجلسِ قانون ساز کو ہے اور صوبائی مجلسِ قانون ساز کو نہیں کہ وہ اِن اُمور کے بارے میں قوانین وضع کر سکے جن کی تخصیص اِس ایکٹ کے گوشوارہ نمبر ے کی فہرست نمبر ا میں کی گئی ہے"۔

ظاہر ہے کہ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اِس ایکٹ کے مختلف حصّوں اور اِن فہرستوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنی رائے ظاہر کر دے۔ اِس دُنیا میں کوئی چیز قطعی اور یقینی

نہیں۔ میری کسی بات کو آئندہ پیش آنے والے حالات و واقعات کے لئے بطور سند یا بطور دلیل یا بطورِ حُجّت استعمال نہیں کیا جاسکے گا۔ تاہم جہاں تک میں غور کر سکا ہوں میں اِس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ صوبائی حکومت اِس نوع کا قانون وضع کرنے کی مجاز نہیں۔ اگر میری یہ رائے دُرست ہے تو دوسرا سوال جو ہمارے سامنے آتا ہے یہ ہے کہ لاء ممبر نے حکومتِ ہند کی نمائندگی کرتے ہوئے حتمی طور پر کہا ہے کہ حکومتِ پنجاب نے اِس قسم کے قانون کی خواہش ظاہر کی ہے اور یہ کہ حکومتِ ہند نے اِس خواہش پر غور و فکر کر کے اور تمام مواد کی چھان پھٹک کرنے کے بعد حکومتِ پنجاب سے اِتّفاق کیا ہے کہ واقعی ایسے قانون کی ضرورت ہے۔

## ردِّ عمل

اب میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اِس سارے معاملے میں میرا ذاتی ردِّ عمل کیا ہے۔ سب سے پہلے میں نے اِس بات پر غور کیا ہے کہ آیا اِس قانون کی ضرورت ہے بھی یا نہیں اور کیا اسمبلی کو اِس قسم کا قانون وضع بھی کرنا چاہئے یا نہیں؟ بلاشُبہ اِس قانون سے حکومت کے اختیارات میں مزید اضافہ ہونے کا امکان ہے۔ بلاشُبہ اِس قانون سے ایسے افعال بھی جُرم کی تعریف میں آ جائیں گے جن کو پہلے جُرم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ہم یقیناً اِس بِل کو محض اِس لئے منظور کرنے پر تیّار نہیں کہ حکومت کا دعویٰ ہے کہ اُسے اِس قانون کی ضرورت ہے۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ جب آنریبل ممبر نے جو اِس بل کے انچارج ہیں ایوان میں تقریر کی تھی تو میرا پہلا ردِّ عمل یہ تھا کہ اُنہوں نے بل کی ضرورت بیان کرتے ہوئے کوئی معقول وجہ پیش نہیں کی۔ مجھے یہ کہنے میں بھی کوئی تکلّف نہیں کہ حکومت کی طرف سے جو تقریریں کی گئی ہیں، اُنہیں سُن سُن کر مجھے کچھ ہنسی آ رہی تھی۔ کیوں؟ اِس کی وجہ خود مجھے معلوم نہیں۔ میں یہ بھی سمجھنے سے معذور ہوں کہ ابتداء ہی میں سارے معاملے کو اِس انداز سے کیوں نہ پیش کیا گیا جس طرح پیش کیا جانا چاہئے تھا۔ بعد کو میں نے پورے معاملہ پر غور کیا اور دوسری تقریریں بھی سنیں۔ بالخصوص آنریبل ہوم ممبر کی تقریر کو میں نے بڑے غور سے سُنا لیکن معاف فرمایئے گا ـــــ میں حاشا و کلّا اِس ایوان میں کسی شخص کو ناراض کرنا نہیں چاہتا اور نہ کسی کے جذبات کو خفیف سے خفیف ٹھیس پہنچانا گوارا کرتا ہوں ـــــ لیکن یقین کیجئے کہ ہوم ممبر کی تقریر سُن کر بھی میں اِس امر کا قائل نہیں ہو سکا کہ اِس قسم کے قانون کی، بحالاتِ موجودہ، واقعی کوئی ضرورت ہے۔

البتہ جب میں نے وہ تقریریں سُنیں جو اِس طرف کی بنچوں پر بیٹھنے والوں نے کیں، تو جس

قدر شکوک میرے دل میں موجود تھے، آناً فاناً رفع ہو گئے۔ بلاشبہ آپ لوگوں نے اعلان کر دیا ہے ـــ غلط یا صحیح، اُس کا مُحاکمہ کرنا میرا کام نہیں ـــ کہ آپ فوجی بھرتی کے خلاف شدّ و مد سے مُہم جاری کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ آپ نے صاف صاف اِس بات کا اعلان کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ آپ نے کہا ہے کہ یہ آپ کی پالیسی ہے کہ آپ بھرتی ہونے والے رنگروٹوں میں نافرمانی اور بغاوت پھیلانے کا عزم رکھتے ہیں"۔

مسٹر ستیہ مورتی: "کسی نے یہ نہیں کہا"

مسٹر جناح: "مجھے معلوم ہے کہ کانگرسی بنچوں پر بیٹھنے والے آنریبل ممبروں نے جو تقریریں کی ہیں وہ ایک دوسرے سے مُتضاد و مُختلف ہیں۔ میں ایک یا دو تقریروں کا حوالہ نہیں دے رہا۔ معاف فرمایئے گا میں تو مجموعی طور پر تمام تقریروں کا لُبّ لُباب بیان کر رہا ہوں۔ ایک ممبر نے کہا ہے کہ وہ تو امن پرستی[1] کے قائل ہیں۔ ہر ملک میں اِس قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں جو امن پرستی کے دعوے دار ہیں۔ بعض اُن میں سے بیوقوف ہوتے ہیں اور بعض مکّار۔ میں اِس ممبر سے در گذر کرتا ہوں، اُنہیں اپنے عقیدے پر قائم رہنے کا حق حاصل ہے۔

## مکمل امن

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں تمام دنیا میں مکمل امن و امان دیکھنا چاہتا ہوں۔ کہیں بھی جنگ نہیں ہونی چاہئے۔ دنیا بھر میں امن اور خوش حالی کا دور دورہ ہونا چاہئے۔ اگر ہر قسم کی جنگیں بند کر دی جائیں تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔ مجھے ان ممبروں سے کوئی غرض نہیں جو اصولاً جنگ کے خلاف ہیں۔ میرے لئے یہ سوال قطعاً قابل اعتناء نہیں کہ آیا مجھے ہر نوع کی جنگ کی خلاف ورزی کا عقیدہ قبول کرنا چاہئے یا نہیں۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ اگر کبھی مجھ پر آفت آئی تو میں اپنی جان بچانے کی کوشش ضرور کروں گا۔ میں کسی کو تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ میں تو بہت اچھا آدمی بننے کی آرزو رکھتا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا میں ہر شخص شریف اور بے ضرر ہے اور کوئی شخص مجھے دکھ نہیں دینا چاہتا۔ اندریں حالات۔ سوال یہ نہیں کہ ہر قسم کی جنگ کی بندش کا عقیدہ بہتر ہے یا ضرورت کے وقت جنگ سے گریز کرنے کا خیال مناسب ہے؟ بلکہ سوال یہ ہے کہ عملی انسانوں کی حیثیت سے ہم اپنی حفاظت کرنا چاہتے ہیں یا نہیں؟ میرا جواب یہ ہے کہ میں تو اپنی حفاظت کرنا چاہتا ہوں۔ یہ میرا پہلا نکتہ ہے۔ میرے معزز دوست مسٹر

---

1- Pacifism

ستیہ مورتی نے کہا ہے کہ جب تک ان کے چھ نکات تسلیم نہیں کئے جائیں گے وہ اس بل کی حمایت نہیں کریں گے "۔

ایک ممبر:۔۔۔ "آپ کے اکیس نکات کہاں گئے؟"

مسٹر جناح:۔۔۔ مسٹر ستیہ مورتی نے گھٹاتے گھٹاتے ان کی تعداد چھ کر دی ہے۔ لیکن باقی ممبر اس پر خوش نہیں وہ کہتے ہیں کہ نکات کی تعداد چھ سے زیادہ ہونی چاہئے۔ مسٹر ستیہ مورتی نہیں مانتے۔ بہرحال میں ایک ایک کر کے ان چھ نکات پر بحث کروں گا۔

سوال یہ ہے کہ کیا واقعی اس بل کی ضرورت ہے؟ اس بات کا خیال نہ کیجئے کہ کانگرس پارٹی نے جو کچھ کہا ہے اس کی تاویل میں صحیح کرتا ہوں یا آپ؟ واقعہ یہ ہے کہ میرے اندازے کے مطابق اس بل کا تعلق دو امور سے ہے۔ پہلے امر کی وضاحت بل میں اس طرح کی گئی ہے کہ "جو شخص عمداً اور جان بوجھ کر پبلک کو یا کسی شخص کو ملک معظم کی بحری، بری اور فضائی فوج میں بھرتی ہونے سے منع کرتا ہے۔ یا منع کرنے کی کوشش کرتا ہے.........."

اس کا مطلب ہے فوجی بھرتی میں مداخلت کرنا۔

بل کا دوسرا حصہ اس امر سے تعلق رکھتا ہے کہ "کسی شخص کو فوج میں بھرتی ہونے سے منع کرنے یا منع کرنے کی کوشش کئے بغیر پبلک کو یا کسی شخص کو جو فوج میں پہلے سے بھرتی ہو چکا ہے، کسی ایسے فعل کے ارتکاب کی ترغیب دینا جو غدر اور حکم عدولی کے تحت قابل تعزیر جرم قرار دیا گیا ہو.........."

## قصہ مختصر

مختصر الفاظ میں یوں بیان کرنا چاہئے کہ اس مسودۂ قانون کا تعلق ایک ایسی تحریک اور شورش سے ہے جس کے دو مقاصد ہیں۔ اول یہ کہ فوجی بھرتی میں رکاوٹ پیدا کی جائے۔ دوم یہ کہ فوج میں بھرتی شدہ سپاہیوں کو غدر اور حکم عدولی اور نافرمانی پر ابھارا جائے۔ جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں اس بل کے صرف یہی دو پہلو ہیں۔

اب میں اس ایوان کے ممبروں سے پوچھتا ہوں کہ جن حالات میں ہم اس وقت زندگی بسر کر رہے ہیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے اہل وطن سے یہ کہوں کہ فوج میں بھرتی ہونے سے انکار کرو اور اگر بھرتی ہو چکے ہو تو بغاوت کر دو۔

کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں فوج کے ایک سپاہی سے لے کر بڑے افسروں تک ہر شخص کو حکم عدولی، نافرمانی اور غدر کا سبق پڑھاؤں؟

جس قسم کے حالات و واقعات کے اندر ہم اس وقت گھرے ہوئے ہیں کیا ان کی موجودگی میں آپ چاہتے ہیں کہ میں اس ایوان سے ہندوستان کی فوج کے نام یہی پیغام بھیجوں ؟

جناب والا ! میں اس فعل کا ارتکاب کرنے سے معذور ہوں۔ میں اس ایوان کے ممبروں سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ فوجی سپاہیوں کے نام، جو آپ کی بات کو کان دھر کر سننے اور اسے جلد مان لینے کا ارادہ رکھتے ہیں، یہی مشورہ دیں گے؟ کیا آپ نے سوچ سمجھ لیا ہے کہ ان لوگوں کا حشر کیا ہو گا؟ پھر سوال یہ بھی ہے کہ کیا اس ایوان میں بیٹھ کر فوج کے نام یہ پیغام بھیج دینا ہی کافی ہو گا یا آگے چل کر ہم اس پیغام کو عملی جامہ بھی پہنائیں گے اور اس مکار حکومت کے خلاف ایک منظم تحریک جاری کریں گے؟ اس کے ساتھ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم اس وقت اس قسم کی تحریک جاری کرنے کے قابل بھی ہیں؟

ابھی تین روز ہوئے مجھے ایک شخص کا خط موصول ہوا ہے جو قید کاٹ کر رہا ہوا ہے۔ اس نے اپنی ایک دلدوز داستان غم لکھی ہے کہ وہ کس طرح شورش انگیز تقریریں سن سن کر جذبات کی رو میں بہہ گیا اور نوکری چھوڑ کر جیل چلا گیا اور اب وہ اور اس کا پورا خاندان فاقوں سے مر رہا ہے۔ میں یہ خط اپنے کانگرسی دوستوں کو دکھا سکتا ہوں. وہ چاہیں تو واقعات کی تصدیق کر سکتے ہیں۔

کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں اس قسم کے سادہ دل انسانوں کو آگ کی بھٹی میں جھونک دوں ؟ آخر اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کیا ہو گا کہ بہت سے لوگ روٹی سے محروم ہو جائیں گے اور بہت سے لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ کیا آپ اس طریقے سے اس مشین کے ٹکڑے کر سکیں گے ؟

## راستے اور بھی ہیں

میں جانتا ہوں کہ بحالات موجودہ اس مشین کو توڑنا ممکن نہیں. پھر کیوں نہ آپ کو میں دیانت و امانت سے مشورہ دوں کہ آیئے ہم حصول مقصد کے لئے اور ذرائع اختیار کریں ؟ اگر ہم زیادہ قابل عمل پروگرام اختیار کر سکیں تو ہمیں حصول مقصد میں نسبتاً آسانی ہو گی۔ یاد رکھئے میں انقلاب سے نہیں ڈرتا۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہر محکوم ملک کو آزادی کے لئے بغاوت کرنے کا حق حاصل ہے. لیکن اگر ہم نے فوج میں بغاوت پھیلادی تو اس سے نقصان ہمیں کو ہو گا. ہمارے دشمن کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ بالفاظ دیگر یوں کہنا چاہئے کہ ہم برائے شگون کے لئے اپنی ناک کیوں کٹوائیں۔ صرف یہی وجہ ہے جس نے مجھے اس بل کی حمایت پر مجبور کیا ہے۔

میرے معزز دوست، ستیہ مورتی اور دیگر معزز دوستوں نے اپنی تقریروں میں حکومت کے خلاف ایک فرد قرار داد جرم مرتب کر ڈالی ہے۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ موجودہ بل کا قطعاً کوئی تعلق فرقہ وارانہ مسئلہ سے نہیں اور نہ میں اس بحث میں فرقہ پرستی کا کوئی شائبہ داخل کرنا چاہتا ہوں۔ یوں بھی یاد رکھنے کے قابل بات یہ ہے کہ اس مسودۂ قانون کا اثر کسی ایک خاص فرقے پر نہیں پڑ سکتا۔ تاہم اگر میں کانگرسی ممبروں کی تقریروں کا اس نقطۂ نگاہ سے تجزیہ کروں تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے خاص طور پر مسلمانوں کو اپنے جوش بیان کا ہدف بنایا ہے۔ کہیں تو انہوں نے مسلمانوں کے جذبات سے اپیل کی ہے، کہیں انہیں ڈرانے دھمکانے اور طعن و تشنیع سے مرعوب کرنے کی کوشش کی ہے اور کہیں مسلم لیگ کے ممبروں کو ڈانٹ ڈپٹ بھی پلائی گئی ہے۔

## فلسطین اور وزیرستان

مسٹر گیڈگل اور بعض دوسرے معزز ممبروں نے فلسطین اور وزیرستان کا بھی ذکر کیا ہے جہاں تک فلسطین اور وزیرستان کا تعلق ہے میں ان ممبروں سے کلیتہً متفق ہوں۔ لیکن انشراح صدر کے ساتھ سن لیجئے کہ فلسطین اور وزیرستان کے باوجود ہم حکومت کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ اگر آپ فلسطین اور وزیرستان کو بحث میں لاتے ہیں تو کانگرس سے کہیں زیادہ مسلمانوں کو حکومت سے شکایت ہے، ہم کو ہندوستان سے اتنی ہی محبت ہے جتنی آپ کو ہے۔ اسی طرح ہمیں دنیا کے تمام مسلمانوں کے ساتھ بھی ہمدردی اور محبت ہے۔ ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ حکومت نے فلسطین اور وزیرستان میں جو پالیسی اختیار کر رکھی ہے وہ حد درجہ بے انصافی اور ظلم پر مبنی ہے۔ لیکن میں بتانا یہ چاہتا ہوں کہ ہمیں آپ کی بہ نسبت حکومت کے خلاف کہیں زیادہ شکایات ہیں۔ پھر اس مشہور مقولے کے مطابق سوال کیا جا سکتا ہے کہ آخر اس بل کی حمایت ہم کیوں کر رہے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب دو آفتوں سے سابقہ پڑے تو کم تر آفت کو قبول کر لینا چاہئے۔ ہم بھی یہی کچھ کر رہے ہیں۔

حکومت کے خلاف فرد قرار داد جرم پیش کرتے وقت مسٹر ستیہ مورتی نے کہا تھا کہ وہ کبھی اس بل کو منظور نہیں ہونے دیں گے۔ ہاں! اگر حکومت ابھی اس ایوان میں یہ وعدہ کرے کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کو منسوخ کر کے کانگرس کے حسب منشا آئین مرتب کرے گی تو وہ بل کی تائید پر آمادہ ہو جائیں گے۔ مسٹر ستیہ مورتی کی بعض باتوں سے مجھے اتفاق ہے اس لئے میں ان کی تقریر کا وہ دلچسپ حصہ آپ کو پڑھ کر سناتا ہوں۔

## زبردست حربہ

مسٹر ستیہ مورتی نے پہلی شرط یہ پیش کی ہے کہ "گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں ضروری ترمیم کر کے ڈیفنس کا محکمہ کسی ذمے دار وزیر کے سپرد کر دیا جائے جو تمام ملک کے دفاع کا نگران ہو"۔

یہ گویا بھرتی کی حمایت کرنے کی پہلی شرط ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا آپ ایک مکھی مارنے کے لئے پورا توپ خانہ استعمال کریں گے؟ کیا آپ اس خیال میں مگن ہیں کہ اس بل کو مسترد کر کے آپ حکومت کو اپنی شرط ماننے پر مجبور کر سکیں گے؟ کیا آپ کے خیال میں یہ حربہ اتنا زبردست ہے کہ حکومت اپنی جگہ سے ہل جائے گی؟ کیا واقعی آپ سنجیدگی سے اس دلیل کو صحیح سمجھتے ہیں؟"

مسٹر ستیہ مورتی:۔ "یقیناً!"

مسٹر جناح: یعنی اس بل کو مسترد کر کے اور غدر اور حکم عدولی کی حمایت کر کے؟ بہر حال مسٹر ستیہ مورتی کی دوسری شرط یہ ہے کہ حکومت مکمل طور پر گورا فوج کو ہندوستان سے نکال دے۔

میں پوچھتا ہوں کہ کیا مسٹر ستیہ مورتی کی یہ شرط بجائے خود ایک معنوی تضاد نہیں؟ ہم یقیناً یہ چاہتے ہیں کہ انگریزی فوج ہندوستان سے نکل جائے بلکہ ہم تو ابتداء سے اس پالیسی کی تائید اور حمایت کرتے آرہے ہیں۔ ہندوستان میں برطانوی فوج کے وجود کو ہم کبھی گوارا نہیں کر سکتے اور ہماری خواہش ہے کہ ہندوستان کی فوج صرف ہندوستان کے فرزندوں پر مشتمل ہو۔ یہ خیال بالکل درست اور صائب ہے. لیکن ایک ہی سانس میں دو متضاد باتیں آپ کیوں کہتے ہیں؟ ایک طرف آپ ہندوستان میں صرف ہندوستانی فوج رکھنے کے قائل ہیں اور دوسری طرف یہ چاہتے ہیں کہ ملک کے بہترین جوان فوج میں بھرتی نہ ہونے پائیں۔ جن لوگوں کو آپ بھرتی سے روکنا چاہتے ہیں ظاہر ہے وہ آپ کی نگاہ میں ملک کے بہترین جوان ہی ہوں گے۔ اگر آپ اس مہم میں کامیاب ہو جائیں اور ملک کے بہترین جوان آپ کا کہنا مان کر بھرتی ہونے سے انکار کر دیں تو اس صورت میں جو لوگ بھرتی کے لئے آگے آئیں گے۔ وہ یقیناً بدترین قسم کے لوگ یعنی کرائے کے ٹٹو ہوں گے۔

## تضاد

جواب دیجئے کہ ایک ہی سانس میں دو متضاد باتیں کہہ کر آپ اپنے آپ کو اضحوکہ کیوں بنا

رہے ہیں؟ بجا کہ فوج کے بارے میں ہم سخت مضطرب ہیں اور اس اضطراب کی معقول وجوہ بھی ہیں۔ لیکن کام کرنے کا یہ ڈھنگ نہیں کہ دھونس جمائی جائے کہ میری فلاں فلاں شرط مانو ورنہ میں اس بل کی مخالفت کروں گا۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں اس بل کو ہرگز پسند نہیں کرتا اور اسے ٹھکرا دینا چاہتا ہوں لیکن مسئلہ زیر بحث یہ نہیں۔

مسٹر ستیہ مورتی کی تیسری شرط یہ ہے کہ "فوج کو ہندوستانی بنانے کی سکیم فوراً قبول کی جائے اور آئندہ بیس سال کے اندر ہندوستان کی فوج کے تمام افسر ہندوستانیوں پر مشتمل ہونے چاہئیں"۔

میں اس بارے میں مسٹر ستیہ مورتی کے ایک ایک لفظ کی تائید کرتا ہوں۔ آپ کو کیا معلوم کہ میں کب سے چلا رہا ہوں کہ فوج کو ہندوستانی بناؤ۔ پہلی گول میز کانفرنس کی ڈیفنس کمیٹی میں میں نے یہی تجویز پیش کی تھی کہ ہندوستانی فوج کے عہدوں پر بتدریج ہندوستانیوں کا تقرر شروع کر دینا چاہئے۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ گول میز کانفرنس کے ایک بھی ہندوستانی مندوب نے میری تجویز کی حمایت نہیں کی تھی۔

اس وقت جو تجویز میں نے پیش کی تھی وہ بہت نرم تھی اور اگر اس پر عملدر آمد شروع ہو جاتا تو ایک اندازے کے مطابق چالیس اور دوسرے اندازے کے مطابق پچاس سال میں کہیں جاکر فوج کے تمام اعلیٰ عہدوں پر ہندوستانی متمکن ہو سکتے تھے۔ اگر آپ گول میز کانفرنس کی روئداد ملاحظہ فرمائیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ مجھے اس تجویز کی حمایت میں تن تنہا لڑنا پڑا تھا۔ کوئی شخص میری مدد کو آگے نہ آیا۔

## چوتھا نکتہ

مسٹر ستیہ مورتی کی چوتھی شرط یہ ہے کہ "ہمارے ہندوستانی افسروں کی حوصلہ افزائی کی جائے اور ان سے بہتر سلوک ہونا چاہئے"۔

لیکن اس ضمن میں قابل غور نکتہ یہ ہے کہ آپ توانہیں حکم عدولی، نافرمانی اور بغاوت کا سبق دینے کے درپے ہیں۔ اس بل کا مقصد بھی یہی ہے کہ بغاوت اور حکم عدولی کا سبق دینے والوں کو سزا ملنی چاہئے۔ اگر آپ اس قسم کا سبق دینے سے اجتناب کریں گے تو یقیناً یہ مسودہ قانون بالکل بے جان اور بے کار ہو کر رہ جائے گا۔ اس لئے جب حکومت سے آپ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ہمارے ہندوستانی افسروں کی حوصلہ افزائی کرو اور ان سے اچھی طرح پیش آؤ تو یاد

رکھئے کہ اس شرط کی تعمیل ہمارے اپنے طرز عمل پر منحصر ہے۔

مسٹر ستیہ مورتی کی پانچویں شرط یہ ہے کہ آٹھ یونٹ کی سکیم کو منسوخ کر کے ہندوستانی اور انگریز افسروں کا درجہ بالکل مساوی کر دیا جائے اور ہندوستانی افسروں کو محض نسلی تعصب کی بناء پر ذمے داری کے عہدوں سے محروم نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ اگر کوئی ہندوستانی افسر انگریز افسروں سے سنئیر ہے تو انگریز افسروں کو بلاچون وچرا اس ہندوستانی کے تحت کام کرنا چاہئے"۔

میرے نزدیک یہ کوئی نئی شرط نہیں اور میں جزواً وکلاً اس کی تائید کرتا ہوں۔

چھٹی شرط مسٹر ستیہ مورتی نے یہ پیش کی ہے کہ "ملک معظم کی حکومت کو صاف طور پر واضح کر دیا جائے کہ ہندوستان کے باشندے اس قسم کی کسی جنگ میں ہرگز حصہ نہیں لیں گے جو ہندوستان کی مرضی کے بغیر اور اس کے مفاد کے خلاف شروع کی جائے گی"۔

میں اس باب میں مسٹر ستیہ مورتی سے بالکل متفق ہوں۔ حکومت کا ادعا یہ ہے کہ ہندوستانی فوج کا اصل مقصد ہندوستان کی حفاظت ہے۔ اس دعوے کا بھی ایک چھپا ہوا پہلو ایسا ہے جسے حکومت اپنی اغراض کی خاطر استعمال کر سکتی ہے۔ میں اس کمزور پہلو کو بالکل بند کر دینے کی غرض سے ایک قدم آگے جا کر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہندوستانی فوج کو صرف اس کام کے لئے استعمال کرنے کی اجازت دی جا سکتی ہے جو اول و آخر ہندوستان کی بہتری سے وابستہ ہے۔ اگر آپ ہماری فوج کو کسی ایسی جنگ یا ابتلاء میں استعمال کریں گے جس کی زد براہ راست ہندوستان کے مفاد پر پڑتی ہے تو ہم آپ کی مدد اور آپ سے تعاون کرنے کو آمادہ نہیں۔

## کمزور پہلو

جیسا کہ میں نے کہا ہے۔ موجودہ آئین کو دیکھتے ہوئے معاملۂ معلومہ کا ایک کمزور پہلو ایسا ہے جس سے حکومت بآسانی فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ہم فوج پر اختیار حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کمزور پہلو کا ازالہ کیوں کر ہونا چاہئے۔ میرے دوست مسٹر ستیہ مورتی اور غالباً کسی اور صاحب نے بھی یہ کہا ہے کہ ۱۹۳۸ء کا ہندوستان ۱۹۱۴ء کے ہندوستان سے مختلف ہے۔ یہ بالکل درست ہے۔ اب یوں معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کے بادل آسمان پر چھا رہے ہیں، ایک طرف بھرتی کی تجویزیں پیش ہو رہی ہیں تو دوسری طرف فوج کو ورغلانے اور بغاوت پھیلانے کی بھی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ سوچنا یہ ہے کہ ان حالات میں فوج کے متعلق ہمارا فیصلہ کیا ہونا چاہئے۔ قبل اس کے کہ میں اس موضوع پر کچھ عرض کروں، ایک بات سن لیجئے انگریز چاہے

کتنا کند ذہن اور غبی ہو اتنی سُوجھ بُوجھ ضرور رکھتا ہے کہ ہندوستان کی موجودہ فضااور اس کی رائے عامہ کو اچھی طرح پہچان سکے۔

میں دوبارہ درخواست کرتا ہوں کہ حصول مقصد کی راہیں اور بھی ہیں۔ آپ نے کیوں ان کو نظرانداز کر دیا ہے۔ اور کیوں ساری توجہ صرف ایک ہی جانب خرچ کر رہے ہیں؟ مدت سے یہ شور ہمارے کانوں میں گونج رہا ہے کہ جنگ چھڑنے والی ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ واقعی جنگ ہوگی بھی یا محض شور و غوغا ہے۔ مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کم از کم کچھ دیر تک تو جنگ چھڑنے کا امکان نہیں۔ اگر خطرے کی گھنٹی بجی اور ہم نے اس وقت صحیح طرز عمل اختیار کیا تو یقین کیجئے کہ حکومت کے لئے انتہائی مشکل ہو گا کہ ہماری خواہشات کو ٹھکرا کر ہماری فوج کو اپنی اغراض کے لئے استعمال کرے۔ آپ کیوں اس وہم میں مبتلا ہیں کہ وقت آنے پر آپ اس قسم کا طرز عمل اختیار نہیں کر سکیں گے؟ کون سی رکاوٹ آپ کے راستے میں حائل ہے؟ آپ عملی سیاست دانوں کی حیثیت سے غور فرمائیے کہ بالفرض کل جنگ چھڑ جائے تو کیا حکومت ایک آرڈیننس پاس کر کے اپنا یہی مقصد پورا نہیں کر سکتی؟ تب آپ کیا کریں گے؟ کیا ڈر کر چھپ جائیں گے؟ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ ایک یا دو سال کے لئے جیل جانا پڑے گا۔

## مثال

اس سلسلے میں ہم نے ایک ترمیم پیش کی ہے۔ حکومت ہماری مرضی کے خلاف یونہی دھاندلی نہیں مچا سکتی۔ میں اپنے مدعاو مقصود کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ مرحلے تین ہیں۔ پہلا مرحلہ ہے بھرتی۔ دوسرا مرحلہ ہے فوجیوں کو حکم عدولی اور بغاوت کی ترغیب دینا جس کو میں قطعاً گوارا نہیں کرتا اور تیسرا مرحلہ اس وقت پیش آ سکے گا جب جنگ چھڑے گی۔ میں نے اس ایوان میں نیشنلسٹ[1] پارٹی کے لیڈر کی تقریر کو بڑے غور سے سنا ہے مجھے ان کے دلائل سے اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن اس بات کا اعتراف کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے نہایت وقار اور ذمے داری سے کہا ہے۔

مسٹر اینے نے اپنی تقریر میں یہ بھی فرمایا ہے کہ حکومت نے یہ بل پیش ہی اس واسطے کیا ہے

---

1 ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں کانگرس پارٹی کے علاوہ ایک نیشنلسٹ پارٹی بھی تھی جس کے کل گیارہ ممبر تھے جو سب کے سب ہندو تھے۔ مسٹر اینے اس پارٹی کے لیڈر تھے

کہ جنگ سامنے نظر آ رہی ہے۔ میری گزارش ہے کہ جب پچھلی جنگ عظیم شروع ہوئی تھی تو ہمارے ملک ہی میں نہیں بلکہ دوسرے ممالک میں بھی قسم قسم کے ہنگامی آرڈیننس پاس ہو گئے تھے۔ اب کی اگر جنگ شروع ہوئی تو کیا آپ کے خیال میں حکومت یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہے گی؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ حکومت کے سکرٹریٹ میں غالباً بعض آرڈی ننسوں کے مسودے تیار بھی کر لئے گئے ہیں جن کی خلاف ورزی کرنے کی پاداش میں ایک دو بلکہ پانچ سال تک کی سزا مل سکے گی۔ بایں ہمہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم نے صحیح طرز عمل اختیار کیا تو یہ آرڈیننس ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے بخدا نے چاہا تو ان آرڈی ننسوں کے باوجود ہم حکومت کی ساری مشین کو معطل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں"۔

ایک ممبر: "کیونکر معطل کر سکیں گے آپ؟"

مسٹر جناح: "وقت آنے دو، سب کچھ کر کے دکھادوں گا۔ مسٹر ستیہ مورتی کے چھ نکات پر جو کچھ مجھے کہنا تھا کہہ دیا ہے۔ اب میں اصل مسودۂ قانون پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ مسٹر ستیہ مورتی نے بالکل درست فرمایا ہے کہ ہم حکومت پنجاب کی خاطر اس بچے کو اپنی گود میں کیوں اٹھائے پھریں میں اس بارے میں تیقن سے نہیں کہہ سکتا کہ آیا پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کو بحالاتِ موجودہ اس قسم کا قانون پاس کرنے کا اختیار ہے یا نہیں، لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ اسے ایسا اختیار ہے تو بھی میری ذاتی رائے ہے کہ اس قانون کا نفاذ پنجاب ہی میں نہیں بلکہ ہندوستان کے کسی صوبے میں بھی نہیں ہونا چاہئے۔ بدیں وجہ ہم نے بڑے غور و خوض کے بعد ایک ترمیم پیش کر دی ہے اور اگر یہ ترمیم منظور نہ ہوئی تو ہم کبھی اس بل کی حمایت نہیں کریں گے"۔

مسٹر ڈی کے لہری چودھری: "کیا یہ ترمیم حکومت کے مشورے سے پیش کی گئی ہے؟"

مسٹر جناح:۔ "قطعاً نہیں، آپ کے اس قسم کے اتہامات کو میں بالکل درخورِ اعتناء نہیں سمجھتا، لیکن اتنا بتا دینا ضروری خیال کرتا ہوں کہ جب تک ہماری ترمیم منظور نہ ہو گی ہم بل کی تائید نہیں کریں گے۔ کیا آپ واقعی اس خیال کے حامی ہیں کہ ہر صوبے کی حکومت کو الگ الگ اپنے گھر کا فیصلہ کرنا چاہئے؟ اگر صوبائی خود مختاری کے نظریئے میں واقعی کوئی جان ہے تو ہمیں یہ بچہ حکومت پنجاب کو لوٹا دینا چاہئے کہ سنبھالو اپنے ننھے کو، ہم باز آئے۔ اگر آپ کے گھر کے حالات اچھے نہیں اور آپ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اس قسم کے قانون کے محتاج ہیں تو بڑی خوشی سے یہ بل پاس کر لیجئے۔

یہ میری دلیل کا ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس بل کے تحت کسی شخص پر اس وقت تک مقدمہ نہیں چلایا جا سکے گا. جب تک کہ صوبے کی مقامی حکومت سے اجازت نہ حاصل کر لی جائے۔

## سزا کی میعاد

اب رہا یہ سوال کہ اس جرم کی سزا کیا ہو؟ میری رائے میں ایک سال کی قید کافی ہے. اس سے زیادہ ہرگز نہیں ہونی چاہئے۔ جملہ پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں نے اور میری پارٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ جس قسم کے حالات اس وقت ملک میں طاری ہیں ان کی موجودگی میں کسی منظم تحریک کا چلانا یا ایسی شورش بپا کرنا جس سے فوجی بھرتی میں رکاوٹ پیدا ہو یا فوج کو حکم عدولی اور بغاوت کی ترغیب دی جائے نہ صرف ملکی مفاد کے منافی ہے بلکہ مجموعی طور پر ملک کے لئے سخت نقصان رساں ہے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس قسم کی تحریک جاری کرنے کی دھمکیاں ابھی سے دی جا رہی ہیں۔

جناب والا! میں ان دھمکیوں کا حامی نہیں اور نہ ان کی تائید کرنے کو تیار ہوں۔ مجھے امید ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب میرے دوست جن سے میں اس وقت اختلاف کر رہا ہوں یہ حقیقت سمجھنے پر مجبور ہوں گے کہ ہم حب وطن کے اسی جذبے کے تحت یہ قدم اٹھا رہے ہیں جس کے وہ مدعی ہیں اور یہ قدم ہم نے سراسر ہندوستان کی بہتری کے لئے اٹھایا ہے"۔

---

مسٹر جناح کا بڑے سے بڑا اور سخت گیر نقاد بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ وہ ایک حقیقت پسند انسان تھے۔ انہوں نے فوجی بھرتی کی حمایت میں یہ تقریر کر کے اپنی حقیقت پسندی کا ثبوت دیا اور مسلمانوں کو سمجھایا کہ سیاسیات کے مدّو جذر کا صرف سیاسی نقطہ نظر سے مطالعہ کرنا سیکھیں اور پیشہ ور مولویوں کے فتوے کی پروا نہ کریں۔

جہاں تک ملکی سیاست کا تعلق ہے ہندوستان کے پیشہ ور مولویوں نے کتاب و سنت کو ایک مذاق بنا کر رکھ دیا تھا۔ جب کانگرس نے ترک موالات کا ریزولیوشن پاس کیا تو جمعیت العلماء نے بھی قرآن و حدیث کی بناء پر ترکِ موالات کا فتویٰ دے دیا۔ پھر حالات بدلے اور سی۔ آر۔ داس اور موتی لال نہرو نے سوراج پارٹی قائم کر کے کونسلوں کے مقاطعہ کی شرط اٹھا دی تو ان ہی پیشہ ور مولویوں نے جھٹ پہلا فتویٰ منسوخ کر کے کونسلوں میں داخلے کو جائز قرار

دینے کی غرض سے نیا فتویٰ داغ دیا۔ ۱۹۲۹ء میں ان ہی مولویوں کو کانگرس سے کچھ ذاتی پرخاش ہوئی تو جھٹ آغا خاں اور سر محمد شفیع کی قیادت قبول کر کے جداگانہ انتخاب کی حمایت اور نہرو رپورٹ کی مخالفت کا نیا فتویٰ صادر کر دیا۔

واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان پر انگریز مسلط تھے اور ہندوستان کے لئے ہر قسم کا آئین برطانیہ کی پارلیمنٹ سے منظور ہو کر آتا تھا۔ پارلیمنٹری نظام ایک ایسا گورکھ دھندا ہے جسے اچھی طرح سمجھنے کے لئے انگریزی زبان، انگریزی قانون، انگریزی روایات، انگریزی تاریخ، انگریزی سلطنت اور انگریزی کانسٹی ٹیوشن پر مکمل عبور درکار ہے۔ ہندوستان کے پیشہ ور مولویوں کو اس پورے نظام کی الف بے سے بھی شناسائی نہ تھی۔

برطانیہ کا ارادہ تھا کہ ہندوستان میں بتدریج "پارلیمنٹری جمہوریت" کی طرز کا آئین نافذ کیا جائے گا۔ یہ آئین سراسر برطانیہ کی سرزمین سے پیدا ہوا تھا۔ ہندوستان اس سے قطعاً ناآشنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے پیشہ ور مولوی جن کا مبلغ علم درس نظامی تک محدود تھا، اس طرز حکومت کے مبادی بھی سمجھنے سے معذور تھے وہ صرف رفع یدین ــــ آمین بالجہر اور حیات و وفات مسیح پر بحث کر سکتے تھے یا پھر ان کے نطق کی روانی اور قلم کی معجز نگاری کے لئے اس قسم کے موضوع موجود تھے کہ اجماع و قیاس حجت شرعی ہے یا نہیں؟ وضع و لباس میں کفار کے ساتھ تشبہ شرعاً ممنوع ہے یا نہیں؟ معجزہ دلیل نبوت ہے یا نہیں؟ طیور منخنقہ کا گوشت حلال ہے یا حرام؟ ابلیس کا وجود خارج عن الانسان ہے یا اس سے مراد انسان کا نفسِ امارہ ہے؟ معراج اور شق صدر رؤیا میں ہوئے یا بیداری میں؟ حشر و نشر، حساب و کتاب، میزان، صراط وغیرہ مجاز پر محمول ہیں یا حقیقت پر؟ روزوں کے بدلے فدیہ دینے کی رعایت صرف عمر رسیدہ لوگوں کے لئے ہے یا ہر شخص کے لئے جس کو روزہ شاق ہو؟ مسئلہ رویت اللہ بالابصار سے کفر عاید ہوتا ہے یا نہیں۔ صفات باری تعالیٰ عین ذات ہیں یا غیر ذات؟

کوئی مانے یا نہ مانے حقیقت یہ ہے کہ جناح مسلمانوں کا سب سے پہلا "سیکولر" لیڈر تھا جس نے ہماری سیاست کو پیشہ ور مولویوں کے پنجے سے نجات دلائی اور ہم کو کانسٹی ٹیوشن، فیڈریشن، وحدانی حکومت، قانون، آئین، پارلیمنٹری جمہوریت اور اکثریت و اقلیت کے مسائل پر دور حاضرہ کے جدید تقاضوں سے غور کرنا سکھایا۔ سرسید مرحوم بھی "سیکولر" لیڈر تھے۔ لیکن جب ان پر مولویوں نے کفر کا فتویٰ لگا کر انہیں واجب القتل قرار دے دیا تو اس غریب کو اپنی جان بچانے اور مولویوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے انہی کے ہتھیار استعمال کرنا پڑے۔

جناح کفر کے فتوؤں سے بے نیاز ہی نہیں، بالا تھا۔ وہ اور ہی قسم کی مٹی کا بنا ہوا انسان تھا اس نے مولویوں کے اکھاڑے میں آنے سے انکار کیا۔ اس کے برعکس مولویوں کو اپنے اکھاڑے میں اترنے پر مجبور کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے پیشہ ور مولوی جن میں بڑے بڑے تھانوی، بڑے بڑے بدایونی، بڑے بڑے عثمانی، بڑے بڑے ندوی اور بڑے بڑے مدنی شامل تھے۔ اس کا بال بیکا نہ کر سکے۔ کفر کا فتویٰ تو کیا لگتا، انجام کار دنیا نے دیکھ لیا کہ بڑے بڑے حاملان شرع متین، بڑے بڑے مدعیان زہد و ورع، بڑے بڑے اہل جبّہ و عمامہ اور بڑے بڑے زبدة العارفین و قدوة السالکین کو گردن جھکا کر جناح کے پیچھے چلنا پڑا۔
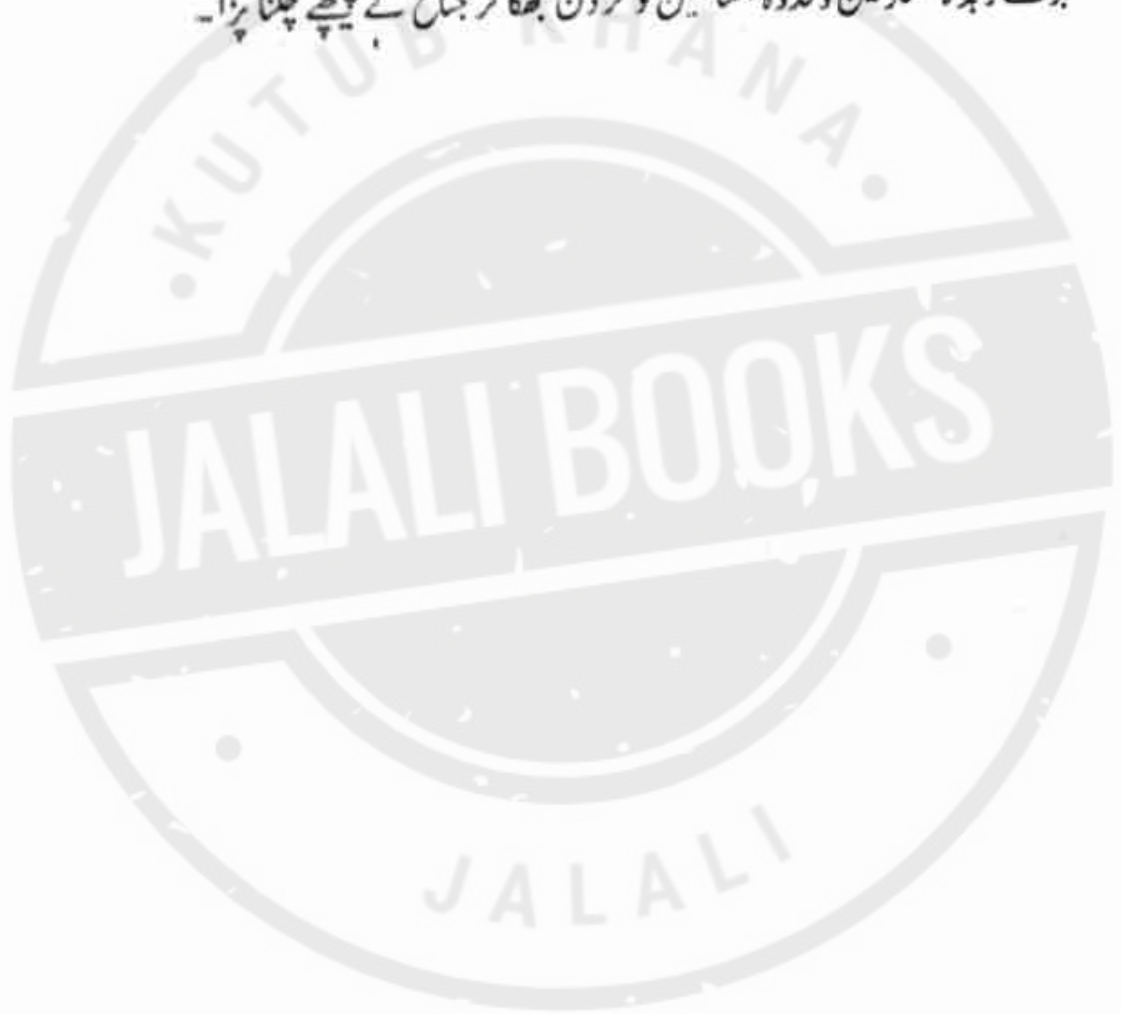
(۳)

# جناح اور گاندھی کی خط و کتابت

آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس لکھنؤ جو اکتوبر ۱۹۳۷ء میں منعقد ہوا تھا مسلمانانِ ہند کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اجلاس میں مسلمانوں کو واضح طور پر محسوس ہوا تھا کہ ہندوستان کے افق پر کس قسم کے خطرات کی گھٹائیں چھا رہی ہیں اور ان کا مقابلہ کیوں کر کیا جائے گا۔ اس اجلاس کے بعد مسلمانوں کی قومی تنظیم کا پروگرام پوری سرگرمی سے شروع ہوا تھا۔ قائداعظم نے جو خطبۂ صدارت اس اجلاس میں پڑھا تھا وہ اپنے مطالب و معانی اور حقائق و معارف کے اعتبار سے اس قابل ہے کہ آج بھی اس کا مطالعہ کیا جائے تو ذہن و فکر میں روشنی اور جسم میں خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے۔

اجلاس لکھنؤ کے بعد جب ہندوستان کی فضا میں تموج پیدا ہوا اور مسلمانوں نے اپنی قومی تنظیم شروع کی تو کانگرسی لیڈروں کو بھی ہوش آیا کہ مسلمانوں کو ختم کر کے اور بلا شرکت غیرے کانگرسی راج قائم کرنا آسان نہیں۔ چنانچہ مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو نے قائداعظم کو خطوط لکھے اور ایک حد درجہ مضحکہ انگیز انداز میں اس تجاہل عارفانہ کا اظہار کیا کہ آخر مسلمانوں کو کانگرس سے شکایت کیا ہے۔ یہ مراسلت خاصی دیر تک جاری رہی لیکن پوری خط و کتابت پہلی بار جون ۱۹۳۸ء میں اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔ مہاتما گاندھی نے ابتداء کرتے ہوئے ذیل کا خط قائداعظم کو لکھا۔

”شو گاؤں ۔ وردھا

۱۹۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء

پیارے دوست! (ڈیئر فرینڈ) آپ نے لکھنؤ میں جو تقریر کی تھی میں نے غور سے اس کا مطالعہ کیا ہے اور مجھے یہ معلوم کر کے سخت تکلیف

ہوئی کہ آپ کو میرے طرز عمل کے متعلق چند غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ میں نے آپ کو جو خط لکھا تھا وہ سراسر اس پرائیویٹ پیغام کا جواب تھا جو آپ نے مجھ کو بھیجا تھا۔ میرا خط جو میرے جذبات کی شدت کا صحیح ترجمان تھا بالکل نجی حیثیت رکھتا تھا۔ آپ نے جس طرح اسے استعمال کیا ہے کیا آپ اس میں حق بجانب ہیں؟

آپ کی تقریر پڑھنے کے بعد میں نے محسوس کیا ہے کہ یہ تقریر نہیں بلکہ اعلان جنگ ہے. میرا خیال تھا کہ آپ مجھ پر رحم فرمائیں گے اور کم سے کم میرے بارے میں تو کچھ نہیں کہیں گے. تاکہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک پل کا کام دیتا رہوں۔ افسوس ہے کہ آپ کو یہ پل قائم رکھنا بھی منظور نہیں۔ لڑائی کے لئے ہمیشہ دو فریقوں کی ضرورت ہوتی ہے. میں تو لڑنے کو تیار نہیں ہوں. خواہ میں صلح و صفائی کرانے میں ناکام رہوں۔

میرا یہ خط بغرض اشاعت نہیں. بجز اس کے کہ آپ کسی وجہ سے اس کی اشاعت ضروری خیال کریں۔ یہ چند الفاظ میرے دکھے ہوئے دل کی پکار ہیں جنہیں میں خلوص دل سے حوالہ قلم کر رہا ہوں۔

آپ کا مخلص
ایم۔ کے۔ گاندھی

---

## جناح

بمبئی ۵۔ نومبر ۱۹۳۷ء

ڈیئر مسٹر گاندھی میں جب یہاں واپس پہنچا تو آپ کا خط مورخہ ۱۹۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء مجھے ملا. جہاں تک اس خط کی اشاعت کا تعلق ہے جو آپ نے گزشتہ مئی میں مجھ کو تیتھل سے بھیجا تھا. میں سمجھتا ہوں کہ میں اسے شائع کرنے میں بالکل حق بجانب تھا. لیکن آپ کے خط کا مفہوم اس سے کسی قدر مختلف ہے جو میں سمجھ سکا ہوں۔ آپ کو یقیناً اس بات کا اختیار تھا کہ عوام کے سامنے اپنی صفائی پیش کرتے. اگر خط کی اشاعت منظور نہ ہو

تو مکتوب نگار عموماً اس امر کا اشارہ کر دیا کرتا ہے۔ آپ کے خط میں قطعاً اس قسم کا کوئی اشارہ نہیں تھا اور میرا پیغام بھی تو پرائیویٹ نہ تھا۔

اب بھی آپ نے مکمل کر نہیں بتایا کہ میں نے آپ کے طرز عمل یا آپ کے خط کے مندرجات کے متعلق کس غلط فہمی سے کام لیا ہے. آپ نے لکھا ہے تو صرف یہ کہ "مجھے یہ معلوم کر کے سخت تکلیف ہوئی ہے کہ آپ کو میرے طرز عمل کے متعلق چند غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔"

مجھے سخت افسوس ہے کہ آپ میری لکھنؤ والی تقریر کو اعلان جنگ کہتے ہیں، حالانکہ اس تقریر کا مقصد سراسر اپنی مدافعت اور حفاظت ہے۔ مہربانی فرما کر ایک مرتبہ پھر اس کا مطالعہ کیجئے اور اسے سمجھنے کی کوشش فرمائیے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آپ گزشتہ بارہ مہینے کے حالات و واقعات کی رفتار سے بے خبر ہیں۔ باقی رہا یہ امر کہ آپ کو ایک پل اور پیغام بر صلح کی حیثیت سے قائم رکھا جائے. میں پوچھتا ہوں کہ گزشتہ اتنے مہینوں سے آپ نے جو مکمل سکوت اختیار کر رکھا ہے. کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ آپ کلیتہً کانگرسی لیڈروں کے ہم نوا اور ان سے متفق و ہم خیال ہیں، ہر چند کہ آپ کانگرس کے چونی کے ممبر بھی نہیں؟

آخر میں مجھے افسوس کے ساتھ عرض کرنا ہے کہ آپ کے اس خط میں مجھے کوئی واضح اور تعمیری تجویز نظر نہیں آتی سوائے اس کے کہ آپ نے یہ خط خلوص دل اور دکھے ہوئے دل سے لکھا ہے۔ جواب میں میری گزارش بھی یہی ہے۔

آپ کا مخلص

ایم۔ اے۔ جناح

---

## گاندھی

وردھا۔ ۳۔ فروری ۱۹۳۸ء

ڈیئر مسٹر جناح، پنڈت جواہر لال نہرو نے کل مجھ سے ذکر کیا کہ آپ نے

مولانا[۱] صاحب سے شکایت کی ہے کہ میں نے آپ کے ۵۔ نومبر کے اس خط کا جواب نہیں دیا جو آپ نے میرے ۱۹۔ اکتوبر کے مکتوب کے جواب میں تحریر فرمایا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ کا خط مجھے کلکتہ میں ملا تھا جبکہ میں ڈاکٹروں کی رائے میں سخت بیمار تھا اور خط بھی پہنچنے کے تین دن بعد مجھے دکھایا گیا۔ میرے نزدیک وہ خط جواب طلب نہیں تھا ورنہ میں بیماری کی حالت میں بھی ضرور جواب بھیجتا۔

وہی خط اب دوبارہ میں نے پڑھا ہے۔ میری اب بھی یہی رائے ہیں کہ جواب میں کوئی مفید بات کہنے کے قابل نہیں ہوں۔ یوں اس خیال سے مجھے خوشی ہے کہ آپ کو میرے جواب کا انتظار رہا سو عرض کرتا ہوں۔

مسٹر کھیر[۲] نے مجھ سے حتمی طور پر کہا تھا کہ آپ کا پیغام پرائیویٹ ہے اور انہوں نے تنہائی میں مجھ کو وہ پیغام دیا تھا۔ میں بھی آپ کو زبانی جواب بھیج سکتا تھا لیکن محض اس لئے کہ اپنے قلب کی صحیح کیفیت بیان کر سکوں میں نے وہ مختصر سا خط آپ کو لکھا۔ چھپانے کی کچھ ضرورت نہ تھی، لیکن مجھے اب بھی یہ عرض کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ آپ نے جس طرح اس خط کو استعمال کیا ہے اس سے مجھے ایک تکلیف دہ حیرت ہوئی ہے۔

آپ میری خاموشی کی شکایت کرتے ہیں حالانکہ اس کی وجہ من و عن میرے خط میں موجود ہے۔ یقین کیجئے گا کہ جس دن میں دونوں قوموں میں اتحاد کرانے کے قابل ہوا مجھے دنیا کی کوئی طاقت اس کام سے نہیں روک سکے گی۔

آپ کو اس بات سے انکار ہے کہ آپ کی تقریر اعلان جنگ تھی، لیکن آپ کے بعد کے بیانات تو میرے خیال کی تصدیق کرتے ہیں۔ جو چیز محسوس کی جا سکتی ہے میں اسے کیوں کر ثابت کر سکتا ہوں۔ آپ کی تقریروں میں مجھے وہ پرانا قوم پرست (نیشنلسٹ جناح) نظر نہیں آتا۔ میں جب ۱۹۱۵ء

---

۱۔ مولانا ابو الکلام آزاد

۲۔ بی جی کھیر وزیر اعظم صوبہ بمبئی

میں جنوبی افریقہ سے اپنی مرضی سے اختیار کی ہوئی جلاوطنی کا زمانہ ختم کر کے واپس ہندوستان آیا تھاتو ہر شخص کی زبان پر آپ ہی کا نام تھااور لوگ کہتے تھے کہ آپ زبردست قوم پرست، محب وطن اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی امید گاہ ہیں۔ کیا آپ وہی مسٹر جناح ہیں؟ اگر اپنی حال کی تقریروں کے باوجود آپ اصرار کرتے ہیں کہ آپ وہی مسٹر جناح ہیں تو مجھے آپ کے الفاظ پر اعتماد کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

آخر میں آپ فرماتے ہیں کہ میں کوئی تجویز پیش کروں، میں سوائے اس کے اور کیا تجویز پیش کر سکتا ہوں کہ گھٹنے ٹیک کر آپ سے التجا کروں کہ جو کچھ میں نے آپ کو سمجھ رکھا تھا وہی کچھ بن کر دکھایئے۔ بااین ہمہ دونوں قوموں میں اتحاد پیدا کرنے کی کوئی تجویز آپ ہی کی طرف سے پیش ہونی چاہئے۔

میں پھر عرض کروں کہ یہ خط آپ کے مطالعہ کے لئے ہے اشاعت کے لئے نہیں، یہ ایک دوست کے دل کی پکار ہے دشمن کی للکار ہرگز نہیں۔

آپ کا مخلص

ایم۔ کے۔ گاندھی

---

نئی دہلی ۱۵۔ فروری ۱۹۳۸ء

ڈیئر مسٹر گاندھی۔ آپ کا خط مورخہ ۳۔ فروری ۱۹۳۸ء بمبئی سے ہوتا ہوا مجھ کو یہاں ملا۔ میں نے آپ کے جواب نہ بھیجنے کی مولانا صاحب سے شکایت نہیں کی تھی، یوں ہی ضمناً اس بات کا ذکر آ گیا تھا، کیونکہ وہ اس امر کے خواہش مند تھے کہ ہم دونوں کی جلد ملاقات ہونی چاہئے۔ بہر حال مجھے آپ کے خط سے بہت خوشی ہوئی۔

جیسا کہ میں اپنے گزشتہ خط میں لکھ چکا ہوں، مسٹر کھیر کے ہاتھ جو پیغام میں نے آپ کو بھیجا تھا وہ پرائیویٹ نہ تھا۔ جب مسٹر کھیر آپ سے ملنے وردھا جا رہے تھے تو میں نے ان سے کہا تھا کہ سوائے آپ کے اور کسی سے اس کا ذکر نہ کریں اور اگر آپ اس معاملے کو سلجھانے پر آمادہ ہو گئے تو گویا نصف سے زیادہ جنگ اسی وقت فتح ہو جائے گی۔

مسٹر کھیر واپس بمبئی آئے تو انہوں نے مجھ کو بتایا کہ آپ کے لئے جواب دینا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ آپ پر یہ پابندی ہے کہ معاملہ زیر بحث کے متعلق نہ کسی سے مشورہ کریں اور نہ اس کا اظہار ہی کسی سے کیا جائے۔ میں نے یہ سن کر کہا کہ آپ پر قطعاً ایسی کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی اور نہ اس معاملے کو صیغہ راز میں رکھنا ضروری ہے۔ آپ اور مسٹر کھیر جب چاہیں سر جوڑ کر مشورہ کر سکتے ہیں اور پھر مجھے اطلاع دیں کہ کیا اس نازک موقع پر آپ اپنے اس زبردست اثر و رسوخ کو کام میں لا کر جو آپ کو کانگرس میں حاصل ہے، یہ مسئلہ حل کرنے پر آمادہ ہیں؟

اس واقعہ کے بعد مسٹر کھیر دوبارہ آپ سے منتھل جا کر ملے۔ یہ معاملہ اب دو افراد کے درمیان کوئی باہمی راز نہ رہا تھا چنانچہ جب مسٹر کھیر نے آپ کا تحریری جواب لا کر مجھے دیا تو میں نے اسے اخبارات میں شائع کرانے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میرے اور بابو راجندر پرشاد اور پنڈت جواہر لال نہرو کے درمیان اخباروں میں بحث چل رہی تھی اور میرے خلاف یہ اتہام لگایا جا رہا تھا کہ میں ہندو مسلم اتحاد کے راستے میں روڑے اٹکا رہا ہوں۔ اسی بحث کے سلسلے میں آپ کے جواب کی اشاعت ضروری تھی۔

آپ کے خط پر بصیغۂ راز (کانفیڈنشل) درج نہیں تھا۔ لہذا مجھے اس کے شائع کرانے میں کوئی تامل نہ ہوا۔ بہر کیف اگر میں نے یہ لکھ بھی دیا کہ میں نے خود آپ سے درخواست کی تھی اور اس درخواست کا آپ نے یہ جواب دیا تو اس میں خرابی ہی کیا ہے اور آپ کیوں اس پر اتنا مضطرب ہو رہے ہیں؟

آپ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ کی خاموشی کی شکایت کی۔ یہ بالکل صحیح ہے لیکن خود ہی آگے چل کر آپ لکھتے ہیں "یقین کیجئے گا۔ جس دن میں دونوں قوموں میں اتحاد کرانے کے قابل ہوا مجھے دنیا کی کوئی طاقت اس کام سے نہیں روک سکے گی"۔

کیا میں ان الفاظ سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہوں کہ آپ کے نزدیک ابھی وہ دن نہیں آیا۔ آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ میری اجلاس لکھنؤ کی تقریر اور بعد کے بیانات اعلان جنگ ہیں۔ میں دوبارہ یہ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ یہ تقریریں اعلان جنگ ہرگز نہیں بلکہ سراسر اپنی مدافعت اور حفاظت

کے لئے کی گئی ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اس بات کی خبر نہیں کہ صبح و شام میرے خلاف کانگرسی اخباروں میں کس شدت سے پراپیگنڈا کیا جا رہا ہے۔ ان اخباروں نے میرے متعلق ہر قسم کی بہتان طرازی، دشنام گوئی، غلط بیانی اور یاوہ گوئی کو اپنا شعار بنا رکھا ہے۔ اگر آپ کو یہ باتیں معلوم ہوتیں تو آپ میری شکایت نہ کرتے۔

آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب ۱۹۱۵ء میں آپ جنوبی افریقہ سے واپس آئے تھے تو ہر شخص کی زبان پر میرا نام تھا اور لوگ میرے متعلق کہتے تھے کہ میں زبردست قوم پرست، محبِ وطن اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی امید گاہ ہوں۔ پھر آپ مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا آپ وہی مسٹر جناح ہیں؟" اور آگے چل کر آپ کہتے ہیں کہ "اگر اپنی موجودہ تقریروں کے باوجود آپ اصرار کرتے ہیں کہ آپ وہی مسٹر جناح ہیں تو مجھے آپ کے الفاظ پر اعتماد کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں"۔

پھر آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ آپ کو میری تقریروں میں وہ پرانا نیشنلسٹ جناح نظر نہیں آتا۔

میں پوچھتا ہوں کہ کیا آپ میرے بارے میں یہ سب کچھ لکھنے میں حق بجانب ہیں؟ میں اس بات کا ذکر چھیڑنا بے سود سمجھتا ہوں کہ لوگ ۱۹۱۵ء میں آپ کے متعلق کیا کہتے تھے اور اب ان کی رائے کیا ہے، قوم پرستی (نیشنلزم) کسی شخص کی جاگیر یا اجارہ نہیں، بلکہ آج کل کے زمانے میں تو قوم پرستی کی تعریف بھی بڑی مشکل ہو گئی ہے، بہرحال میں اس بحث کو طول دینا پسند نہیں کرتا۔

اپنا خط ختم کرنے سے پہلے آپ نے لکھا ہے کہ "آخر میں آپ فرماتے ہیں کہ میں کوئی تجویز پیش کروں۔ میں سوائے اس کے اور کیا تجویز پیش کر سکتا ہوں کہ گھٹنے ٹیک کر آپ سے التجا کروں کہ جو کچھ میں نے آپ کو سمجھ رکھا تھا وہی کچھ بن کر دکھایئے با ایں ہمہ دونوں قوموں میں اتحاد پیدا کرنے کی کوئی تجویز آپ ہی کی طرف سے پیش ہونی چاہئے"۔

کیا یہ بہتر نہ تھا کہ آپ التجا کرنے کی تکلیف گوارا نہ فرماتے اور گھٹنے ٹیک کر مجھ کو اس بات کی نصیحت نہ کرتے کہ اپنے آپ کو وہ کچھ بن کر دکھاؤں جو آپ نے مجھے سمجھ رکھا تھا؟

جہاں تک ایسی تجاویز کی ترتیب و تشکیل کا تعلق ہے جنہیں بنائے اتحاد قرار دیا جا سکے، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ محض خط و کتابت سے یہ کام ہو سکتا ہے؟ میں یہ بھی باور کرنے کو تیار نہیں کہ آپ ان تمام قضیوں اور جھگڑوں سے بے خبر ہیں جنہوں نے اس وقت دونوں قوموں میں اختلاف پیدا کر رکھا ہے۔ ان مابہ النزاع امور سے آپ یقیناً اسی طرح آگاہ ہیں جس طرح میں باخبر

ہوں۔ میرے نزدیک یہ فرض آپ کا ہے کہ حالات کو سدھارنے کی کوئی تجویز پیش کریں۔

اگر آپ خلوص دل سے اس کام پر آمادہ ہو جائیں اور عزم کر لیں کہ جھگڑوں کے نمٹانے کا وقت آ پہنچا ہے اور اس کے ساتھ ہی اپنی زبردست شخصیت اور اثر و رسوخ کو کام میں لانے سے بھی بخل نہ کریں تو یقین کیجئے گا کہ میں بھی اپنی ناچیز کوششوں میں رتی برابر کمی روا نہ رکھوں گا۔

آپ کا مخلص

ایم۔ اے۔ جناح

---

## گاندھی

شو گاؤں۔ وردھا

۲۴۔ فروری ۱۹۳۸ء

ڈیئر مسٹر جناح۔ آپ کے خط کا شکریہ۔ میں نے آپ کا مکتوب جواہر لال کو بھی پڑھ کر سنا دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے دونوں خطوں کا تشفی بخش جواب دینا ممکن نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ ہماری بالمشافہ ملاقات ہو۔ اب یہ کہنا مشکل ہے کہ ابتدائی ملاقات آپ اور جواہر لال کے درمیان ہو یا آپ اور سبھاش بوس کے درمیان، کیونکہ جواہر لال کی جگہ سبھاش کانگرس کے صدر منتخب ہو گئے ہیں۔

اگر آپ کا خیال ہے کہ پہلے ہم دونوں کا آپس میں ملنا ضروری ہے تو پھر میری گزارش ہے کہ آپ ۱۰۔ مارچ سے قبل جب چاہیں کسی روز شو گاؤں تشریف لے آئیں کیونکہ بشرط صحت میرا ارادہ ۱۰۔ مارچ کے بعد بنگال جانے کا ہے۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں پہلے ہندو، مسلم مسئلہ کے متعلق ڈاکٹر انصاری مرحوم کی رائے پر عمل کیا کرتا تھا۔ اب وہ نہیں ہیں تو ان کی جگہ مولانا ابو الکلام آزاد میری رہنمائی کرتے ہیں۔ اندریں حالات میرا مشورہ یہ ہے کہ پہلے آپ اور مولانا صاحب ایک دوسرے سے تبادلہ خیال کریں۔ میری خدمات تو بہر صورت حاضر ہیں۔

آپ کا مخلص

ایم۔ کے۔ گاندھی

---

# جناح

نئی دہلی ۳- مارچ ۱۹۳۸ء

ڈیئر مسٹر گاندھی۔ آپ کا خط محررہ ۲۴- فروری ۱۹۳۸ء موصول ہوا. جواب دینے میں جو تاخیر ہوئی اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ وجہ صرف یہ تھی کہ میری طبیعت کئی روز سے ناساز ہے۔ آپ کا خط پڑھ کر مجھے تعجب ہوا کہ اس میں کہیں بھی اشتراک و تعاون اور معاملہ فہمی کی جھلک نظر نہیں آتی۔ پہلی بات تو یہ محسوس ہوتی ہے کہ آپ کو اب تک اس امر کا احساس نہیں ہو سکا کہ پانی سر سے گزر رہا ہے اور حالات کے سلجھانے کی گھڑی آپہنچی ہے۔ دوسری بات یہ کہ آپ پوری تن دہی اور خلوص عمل سے جھگڑوں کے نمٹانے پر آمادہ معلوم نہیں ہوتے اور تیسری یہ کہ آپ کے طور طریق بدستور وہی پرانے ہیں اور ذہنیت میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

آپ فرماتے ہیں کہ اب چونکہ ڈاکٹر انصاری موجود نہیں لہٰذا مولانا ابوالکلام آزاد آپ کی رہنمائی کریں گے۔ اگر آپ نے یہ انداز فکر اختیار کیا تو سمجھ لیجئے کہ آپ دوبارہ اسی خوفناک غلطی کا ارتکاب کریں گے جو آپ نے ماضی میں کی تھی، جب ہندو، مسلم قضیے کے تصفیے کے لئے آپ نے ڈاکٹر انصاری کے خیالات کی آڑ لے کر صاف کہہ دیا تھا کہ میں تو مسلمانوں کو سب کچھ دینے کو تیار ہوں لیکن کیا کروں ڈاکٹر انصاری نہیں مانتے۔

آپ کو یاد ہو گا کہ گول میز کانفرنس میں شریک ہونے سے قبل آپ نے یہی عذر پیش کیا تھا اور گول میز کانفرنس میں بھی آپ کا طرز عمل اسی قسم کا تھا۔ آپ نے وہاں یہ کہا تھا کہ میں تو کانگرس کے نمائندے کی حیثیت سے مسلمانوں کے مطالبات ماننے کو تیار ہوں لیکن کیا کیا جائے ہندو نہیں مانتے۔ اگر مسلمانوں کے مطالبات کو ہندو تسلیم کر لیں تو مجھے بھی مان لینے میں کوئی تامل نہ ہو گا۔

اب حالات نے ہمیں ایک ایسی جگہ لا کھڑا کیا ہے کہ آپ کو یہ بات بلاشک وشبہ تسلیم کر لینی چاہئے کہ آل انڈیا مسلم لیگ مسلمانانِ ہند کی تنہا نمائندہ جماعت ہے. اور دوسری طرف آپ کانگرس اور ملک کے تمام دیگر ہندوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ باہمی افہام و تفہیم اور گفت و شنید کی یہی ایک بنیاد ہے جس پر ہم آئندہ کوئی عمارت کھڑی کر سکیں گے۔

مجھے یقیناً آپ سے مل کر خوشی ہو گی۔ اسی طرح پنڈت جواہرلال نہرو اور مسٹر بوس سے ملنا بھی میرے لئے موجب مسرت ہو گا لیکن آپ جانتے ہیں کہ انجام کار کچھ بھی ہو. ان دونوں کو آپ ہی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ اس لئے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہم دونوں ایک دوسرے سے مل کر گفتگو کر لیں۔

باقی رہا ملاقات کا وقت اور مقام مجھے افسوس ہے کہ میں ۱۰ مارچ سے پہلے شوگاؤں نہیں آ سکتا۔ مجھے بمبئی پہنچنا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے مختلف مقامات پر اپنا دورہ بھی مقرر کر رکھا ہے۔ بہر حال ہم خط و کتابت سے وقت اور مقام کا تعین کر سکتے ہیں۔

آپ کا مخلص

ایم۔ اے۔ جناح

---

## گاندھی

شوگاؤں۔ وردھا

۸۔ مارچ ۱۹۳۸ء

ڈیئر مسٹر جناح۔ آپ کے خط کا شکریہ۔ امید ہے آپ کی طبیعت اب بالکل ٹھیک ہو گی اور مزاج کی ناسازی رفع ہو چکی ہو گی۔

آپ کے خط نے ماضی کی بہت سی یادیں پھر سے زندہ کر دیں۔ بہر حال میں اس موقع پر ان ما بہ النزاع امور پر بحث کرنے سے گریز کرتا ہوں جن کی طرف آپ نے اپنے خط میں اشارہ کیا ہے۔ سردست صرف اتنا عرض کرنا کافی ہو گا کہ میں آپ سے ملاقات کرنے کو ہر وقت حاضر ہوں۔ اگر آپ شوگاؤں آنے سے معذور ہیں تو میں بشرط صحت بخوشی بمبئی آکر آپ سے ملنے کو تیار ہوں۔

میرا موجودہ پروگرام یہ ہے کہ پہلے مجھے بنگال جانا ہے اور وہاں سے فارغ ہو کر اڑیسہ جاؤں گا۔ یہ سارا مہینہ اسی دورے میں ختم ہو جائے گا۔ اس لئے جلد سے جلد اگر ملاقات ہو بھی تو اپریل میں ہو سکے گی۔

آپ کے خط میں دو باتیں جواب طلب ہیں۔ پہلی یہ کہ آپ مجھ سے دریافت فرماتے ہیں کہ کیا مجھے کوئی روشنی نظر آئی؟ حد درجہ افسوس کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ مجھے کہیں کوئی روشنی نظر نہیں آئی اگر آتی تو مجھے اپنے مکان کی چھت پر کھڑے ہو کر باآواز بلند اعلان کرنے میں بھی تامل نہ تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مصالحت و مفاہمت کی گفتگو میں شریک ہونے ہی سے انکار کر دوں۔ اگر موجودہ مشکلات کا کوئی خفیف سے خفیف حل بھی نظر آئے تو میں اس کا خیر مقدم کرنے کو تیار ہوں۔

آپ فرماتے ہیں کہ مجھے کانگرس اور ملک کے تمام دیگر ہندوؤں کی نمائندگی کا فرض ادا کرنا چاہئے۔ افسوس ہے کہ میں اپنے آپ کو اس ذمے داری کے قابل نہیں پاتا جن معنوں میں آپ

نمائندگی کا لفظ استعمال کرتے ہیں ان کے مطابق تو میں نہ کانگرس کا نمائندہ ہوں نہ ہندوؤں کا. بااین ہمہ مجھے یہ عرض کرنے سے انکار نہیں کہ ہندو قوم میں جو تھوڑا بہت اثر و رسوخ مجھے حاصل ہے. میں اس کا آخری شمہ بھی فرقہ وارانہ مفاہمت کی خاطر استعمال کرنے سے دریغ نہیں کروں گا۔

آپ کا مخلص
ایم۔ کے۔ گاندھی

---

## جناح

نئی دہلی ۱۷۔ مارچ ۱۹۳۸ء

ڈیئر مسٹر گاندھی۔ آپ کا خط محررہ ۸۔ مارچ ملا۔ شکریہ قبول فرمایئے۔ میں نے اپنے خط میں جن امور کی طرف آپ کو توجہ دلائی تھی ان پر بحث کرنے کو آپ آمادہ نہیں اور میرے دو سوالوں کا جواب جو آپ نے دیا ہے وہ بھی تسلی بخش نہیں۔ اندریں حالات میں سوائے اس کے کہ اپنی مجبوری کا اظہار کروں اور کیا کر سکتا ہوں۔

بااین ہمہ آپ لکھتے ہیں کہ موجودہ مشکلات کا اگر کوئی خفیف سے خفیف حل بھی نظر آئے تو آپ اس کا خیر مقدم کرنے کو تیار ہیں۔ گزارش یہ ہے کہ میں اپریل کی کسی تاریخ کو بمبئی میں آپ سے ملاقات کرنے کو بخوشی حاضر ہوں۔

آپ کا مخلص
ایم۔ اے۔ جناح

---

## گاندھی

کلکتہ ۲۴۔ مارچ ۱۹۳۸ء

ڈیئر مسٹر جناح۔ آپ کے خط کا بہت بہت شکریہ. جوں ہی میں شوگاؤں پہنچا اپنی اولین فرصت میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی کوشش کروں گا۔

آپ کا مخلص
ایم۔ کے۔ گاندھی

---

## جناح

نئی دہلی ۲۶۔ مارچ ۱۹۳۸ء

ڈیئر مسٹر گاندھی۔ آپ کے خط مورخہ ۲۴۔ مارچ ۱۹۳۸ء کا شکریہ۔ میں ۲۵۔ اپریل کے لگ بھگ کلکتہ سے واپس بمبئی پہنچ جاؤں گا اور پھر آپ جب چاہیں بمبئی تشریف لا سکتے ہیں۔ آپ سے مل کر مجھے خوشی ہوگی۔

آپ کا مخلص
ایم۔ کے۔ جناح

---

## گاندھی
## تار

۱۵۔ اپریل ۱۹۳۸ء

اگر آپ بمبئی واپس جاتے ہوئے ایک روز کے لئے وردھا بھی ٹھہر جائیں تو میں بمبئی کے سفر کی زحمت سے بچ جاؤں گا۔ مجھے بحدِ امکان مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ بہرحال میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا مولانا آزاد میرے ہمراہ آپ کی ملاقات کو آ سکتے ہیں؟ مہربانی فرما کر جواب بذریعہ تار وردھا بھیجئے جہاں میں کل پہنچ جاؤں گا۔

آپ کا مخلص
ایم۔ کے۔ گاندھی

---

## جناح
## تار

کلکتہ ۱۶۔ اپریل ۱۹۳۸ء

سخت افسوس ہے کہ اپنا پروگرام تبدیل کرنے سے معذور ہوں۔ میں آپ سے بمبئی میں ۲۵۔ اپریل یا اس کے بعد کسی تاریخ کو مل سکوں گا۔ تنہا آپ سے ملاقات ہو تو بہتر ہے۔

ایم۔ اے۔ جناح

---

## گاندھی
### تار

وردھا ۱۸۔ اپریل ۱۹۳۸ء

شکریہ۔ ۲۵۔ اپریل کو سوموار ہے، اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو میں ۲۸۔ اپریل کو بمبئی آ جاؤں۔

گاندھی

---

## جناح
### تار

کلکتہ ۱۹۔ اپریل ۱۹۳۸ء

شکریہ۔ میں بڑی خوشی سے ۲۸۔ اپریل کو اپنے مکان پر آپ سے ملنے کو حاضر ہوں۔ اصفہانی کلکتہ کی معرفت تار دے کر وقت معین کر لیجئے۔

جناح

---

## گاندھی
### تار

وردھا ۲۰۔ اپریل ۱۹۳۸ء

اگر تکلیف نہ ہو تو میں ساڑھے گیارہ بجے آپ کے مکان پر پہنچ جاؤں گا۔

گاندھی

(۴)

# جناح اور نہرو کی خط و کتابت

گزشتہ باب میں جناح اور گاندھی کی خط و کتابت درج کی گئی ہے۔ عجیب بات ہے کہ اُس زمانے میں مسٹر جناح اور پنڈت نہرو کے درمیان بھی مراسلت کا سلسلہ جاری تھا۔ اِس خط و کتابت کا مکمّل ترجمہ بھی ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

نہرو

لکھنؤ ۱۸۔ جنوری ۱۹۳۸ء

ڈیئر مسٹر جناح۔ حال ہی میں آپ نے اخباروں کو جو بیان دیا ہے میں نے اُس کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ افسوس ہے کہ ایک ہی چیز کے بارے میں ہمارا زاویہ ایک دوسرے سے مختلف ہے اور آپ کا جو نقطۂ نگاہ ہے وہ میرے نزدیک تسلّی بخش نہیں، تاہم اِس بارے میں مجھے آپ سے اتّفاق ہے کہ اخباری بیانات کے ذریعہ سے کوئی باہمی سمجھوتہ نہیں کیا جا سکتا اِسی لئے میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ مسئلہ زیرِ نظر پر کسی قسم کا بیان اخبارات کو ہرگز نہیں دوں گا۔ لیکن آپ کی کلکتہ کی تقریر پڑھ کر جس میں آپ نے میرا بھی ذکر کیا ہے اور ایک نوع کا "چیلنج" مجھے دیا ہے میں نے ضروری خیال کیا کہ ایک اخباری بیان شائع کر کے جُملہ غلط فہمیوں کو رفع کرنے کی کوشش کروں، اِسی غرض سے وہ بیان دیا گیا تھا۔

آپ کو غالبًا معلوم ہو گا کہ چند مہینے ہوئے اِسی موضوع پر میرے اور نواب اسمٰعیل خاں کے درمیان مراسلت ہوئی تھی کیونکہ میں یہ معلوم کرنے کو بے تاب تھا کہ آخر ان تمام جھگڑوں کی بُنیاد کیا ہے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ میں اب تک حقیقت سے واقف نہیں ہو سکا اور آپ کا آخری بیان بھی اِس بارے میں کچھ رہنمائی نہیں کرتا۔ اگر آپ مہربانی فرما کر اِس مسئلے پر روشنی ڈالیں اور بتائیں کہ اس باہمی نزاع کا سبب کیا ہے تو میں یقیناً آپ کا ممنون

ہوں گا۔ اِس طرح معاملات سمجھنے میں آسانی ہوگی، اور غیر ضروری بحث مُباحثہ سے بچ کر ہم اصل حقیقت سے نبرد آزما ہونے کو تیار ہو جائیں گے۔

میں اپنے گزشتہ بیان میں کہہ چکا ہوں کہ ہم خود اِس بات کے لئے مُضطرب ہیں کہ حتی الامکان تمام غلط فہمیوں کو رفع کر کے جُملہ مسائل کا حل تلاش کیا جائے تاکہ ہماری پبلک زندگی صحیح خطوط کے مطابق مرتّب ہو سکے اور ہندوستان کے باشندوں میں اتحاد اور ترقی کی روح جاری ہو۔

میں آج لاہور جا رہا ہوں، وہاں سے صوبہ سرحد جاؤں گا اور قریباً دس دن کی غیر حاضری کے بعد واپس الٰہ آباد پہنچوں گا۔ مہربانی فرما کر الٰہ آباد ہی کے پتے سے جواب ارسال فرمایئے گا۔

مخلص

جواہرلال نہرو

---

## جناح

بمبئی ۲۵۔ جنوری ۱۹۳۸ء

ڈیئر مسٹر نہرو۔ آپ کا خط مُحرّرہ ۱۸۔ جنوری ۱۹۳۸ء موصول ہوا اور میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اُس کا سمجھنا میرے لئے سخت دُشوار ہے، میں حیران ہوں کہ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ آپ کے خط سے قطعاً عیاں نہیں ہوتا کہ آپ کے پیشِ نظر کوئی سنجیدہ اور ٹھوس تجویز بھی ہے، بجُزاِس کے کہ آپ فرماتے ہیں کہ "ایک ہی چیز کے بارے میں ہمارا زاویہ ایک دوسرے سے مختلف ہے"۔ اور اِس سے آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے کہ "آپ کا جو نقطۂ نگاہ ہے وہ میرے نزدیک تسلّی بخش نہیں"۔ آپ نے میری کلکتہ کی تقریر کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ "جس میں آپ نے میرا بھی ذکر کیا ہے اور ایک نوع کا چیلنج مجھے دیا ہے، میں نے ضروری خیال کیا کہ ایک اخباری بیان شائع کروں"۔

لیکن یہ سب کچھ لکھنے کے باوجود آپ نے بتایا تک نہیں کہ میں نے تقریر میں کیا کہا تھا اور وہ چیلنج کیا تھا جس کے جواب میں آپ اخباری بیان دینے پر مجبور ہو گئے تھے۔

مجھے اِس بارے میں قطعاً کچھ معلوم نہیں کہ آپ نواب اسمٰعیل خاں کے ساتھ خط وکتابت کرتے رہے ہیں جیسا کہ آپ نے اپنے خط میں لکھا ہے۔ آخر میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ

میں آپ کو اِس بات سے آگاہ کروں کہ " وہ کون سے مابہ النزاع اُمور ہیں جن پر غور کرنا چاہئے " ۔

میں خوش ہوں کہ آپ کو میری اِس رائے سے اِتفاق ہے کہ اخباروں کو بیان دے کر ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکیں گے۔ اور نہ یہ طرزِ عمل ہی چنداں موزوں ہے لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا آپ کا خیال ہے کہ ہم بذریعہ خط و کتابت اِن ہی اُمور پر بحث کر سکیں گے؟ اِن کا تصفیہ تو جانے دیجئے وہ بہت دُور کی بات ہے میں تو اس خط و کتابت کو بھی مناسب نہیں سمجھتا۔

میں آپ کی اِطلاع کے لئے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مسٹر گاندھی نے مجھ کو ۱۹۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو خط لکھا تھا جس کا جواب میں نے ۵۔ نومبر ۱۹۳۷ء کو بھیج دیا تھا۔ تاحال اُن کی طرف سے کوئی مزید خبر نہیں ملی۔ آپ نے اپنے خط کے آخری پیراگراف سے پہلے جن جذبات کا اظہار کیا ہے، میری طرف سے بھی وہی جذبات قبول کیجئے۔

مخلص

ایم۔ اے۔ جناح

---

نہرو

وردھا۔ ۴۔ فروری ۱۹۳۸ء

ڈیئر مسٹر جناح۔ آپ کا ۲۵ جنوری کا لکھا ہوا خط یکم فروری کو آلہ آباد پہنچا لیکن میں اُس وقت وہاں سے روانہ ہو چکا تھا چنانچہ وہی خط مجھے کل یہاں وردھا میں ملا۔ مجھے افسوس ہے کہ میرا خط سمجھنے میں آپ کو دِقت پیش آئی۔ میں تو صرف یہ دریافت کرنا چاہتا تھا کہ وہ کون سے اِختلافی اُمور ہیں جو ہمارے درمیان باعثِ نزاع ہیں۔ آپ نے چونکہ بار بار کانگرس کی پالیسی پر اعتراض کئے ہیں، لہٰذا اِس سے یہی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ ہمارے درمیان بعض اِختلافی اُمور موجود ہیں، اگر اُنہیں ضبطِ تحریر میں لا کر ہمیں مُطلع کیا جائے تو اُن پر غور و فکر کرنا نسبتاً آسان ہو جائے گا۔ بہت ممکن ہے کہ اُن میں سے بعض صرف غلط فہمی کا نتیجہ ہوں۔ اِس صورت میں غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جا سکتا ہے یہ بھی ممکن ہے۔ کہ بعض اِختلاف کسی قدر اُصولی اور بُنیادی نوعیت کے ہوں ہم ان کا حل دریافت کرنے کی بھی سعی کریں گے، کم سے کم اتنا تو معلوم ہو جائے کہ فریقین اپنے اپنے عقیدے کے مطابق کہاں کھڑے ہیں۔ جب آراء کا باہمی اختلاف ہو تو مخالف رائے پر غور کرنے سے پہلے اُس کی وضاحت کرنا ضروری ہوتا ہے۔ میں یہاں چند چھوٹی چھوٹی باتوں کا جن سے حال ہی میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں، ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ مثلاً آپ نے ایک

تقریر میں کہا ہے کہ کسی نے آپ کو بتایا ہے کہ ایک شخص نے کانگرس کو پانچ لاکھ روپے کا چیک عطا کیا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ بات بے بنیاد ہے۔ پانچ لاکھ تو بہت بڑی رقم ہے، میری معلومات کے مطابق کسی نے پانچ ہزار کا چیک بھی کانگرس کو نہیں دیا۔

اسی تقریر یا کسی دوسری تقریر میں آپ نے ترک موالات کی تحریک کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی تو اس تحریک میں بند کر دی گئی تھی اور وہاں کے بہت سے مسلمان طلبا نے تعلیم بھی ترک کر دی تھی لیکن بنارس یونیورسٹی پر کوئی گزند نہ آئی اور نہ وہاں کے کسی طالب علم نے ترکِ موالات میں حصّہ لیا۔

حقیقت اِس کے برعکس ہے۔ بنارس یونیورسٹی کے بہت سے طلباء ترکِ موالات میں شریک ہوئے تھے چنانچہ ایک غیر سرکاری یونیورسٹی کاشی وِدّیا پیٹھ اور اُس کے ساتھ گاندھی آشرم وہاں قائم کئے گئے تھے۔ یہ دونوں ادارے بدستور چل رہے ہیں۔ بعینہٖ جامعہ ملیہ، علی گڑھ میں قائم ہوئی تھی جو آج دہلی میں خوش اُسلوبی سے کام کر رہی ہے۔

آپ نے اپنی تقریروں میں بھی کہا ہے کہ کانگرس اُردو کو مٹانے اور ملک پر ہندی، ہندوستانی مُسلّط کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ میرے نزدیک اِس بارے میں آپ کی معلومات درست نہیں، کم از کم مجھے کانگرس کی ایسی کسی کوشش کا علم نہیں جس سے اُردو کو نقصان پہنچانا مقصود ہو۔ کچھ مُدّت ہوئی میں نے زبان کے مسئلہ پر ایک رسالہ لکھا تھا جو میرے خیال میں کانگرس کے نقطۂ نگاہ کی ترجمانی کرتا ہے۔ گاندھی جی نے اس کو پسند کیا تھا اور بھی بہت سے آدمیوں نے جن کا کوئی تعلّق کانگرس سے نہیں اور جو اُردو کی ترقّی و ترویج کے حامی ہیں، اُس رسالے کو بہ نظر اِستحسان دیکھا تھا۔ ان لوگوں میں مولوی عبدالحق سیکرٹری انجمن ترقّی اُردو حیدر آباد بھی شامل ہیں۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ رسالہ آپ کی نظر سے گزرا ہے یا نہیں۔ بہرحال میں الٰہ آباد اپنے دفتر کو لکھ رہا ہوں کہ اس کا ایک نسخہ آپ کو بھی بھیج دیا جائے۔ پڑھنے کے بعد اگر آپ محسوس کریں کہ میرے پیش کردہ دلائل یا اخذ کردہ نتائج سے آپ کو اتفاق نہیں تو براہِ کرم اپنی رائے سے ضرور مطلع کیجئے گا۔

میں یہ بھی عرض کر دوں کہ مدراس کی کانگرسی وزارت اپنے ہاں کے سرکاری مدرسوں میں ہندوستانی رائج کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اِس غرض کے لئے اُنھوں نے جامعہ ملیہ سے خاص درسی کتابیں لکھوائی ہیں۔ یہ ریڈریں اور کتابیں دو قسم کے رسم الخط میں لکھی جائیں گی یعنی

دیوناگری اور اُردو، لیکن زبان دونوں کی ایک ہوگی۔ ہر طالب علم کی مرضی ہوگی، کہ جو رسم الخط چاہے اختیار کرے۔

میرا مقصد صرف یہ ہے کہ میں بتاؤں کہ بعض اوقات غلط فہمیاں کیوں کر پیدا ہوتی ہیں لیکن اس قسم کی غلط فہمیوں سے قطع نظر بعض اہم بنیادی مسائل بھی ہیں جن کی ہمیں وضاحت کرنا چاہئے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کانگرس کی اُن قرار دادوں سے باخبر ہوں گے جن کا تعلق فرقہ وارانہ مسائل، بنیادی حُقوق اور اقلیتوں کے تحفظ سے ہے اگر آپ پسند فرمائیں تو میں یہ قرار دادیں آپ کو بھجوا سکتا ہوں۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء کے آخر میں کانگرس کی مجلس عاملہ نے اسی موضوع پر ایک بڑی جامع قرار داد منظور کی تھی جس میں مذکورہ بالا قرار دادوں کا بیشتر حصہ شامل کر لیا گیا تھا۔ جہاں تک کمیونل ایوارڈ کا تعلق ہے، کانگرس اِس بارے میں اپنا نقطۂ نگاہ متعدد بار واضح کر چکی ہے۔

ہو سکتا ہے کہ ان جُملہ قرار دادوں میں کانگرس نے جس پالیسی کا اعلان کیا ہے وہ نامکمل رہ گئی ہو یا غلط ہو۔ اِس صورت میں ہم بخوشی ایسی تجاویز پر غور کرنے کو تیار ہیں جن سے اِس پالیسی کی تکمیل یا تصحیح ہو سکے۔ میں نہیں سمجھتا کہ مذہب یا کلچر کی حفاظت کے لئے کانگرس اِس سے زیادہ بھی کچھ کر سکتی ہے۔ جہاں تک سیاسی یعنی فرقہ وارانہ اُمور کا تعلق ہے کانگرس بحالات موجودہ کمیونل ایوارڈ کی پابند ہے۔ اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ یہ ایوارڈ اطمینان بخش نہیں۔ تاہم جب تک مُتعلقہ فریقین باہمی رضامندی سے کوئی مُتبادل فیصلہ نہ کریں یہ ایوارڈ برقرار رہے گا۔

وسیع الاثر سیاسی اُمور کے بارے میں کانگرس گزشتہ کئی سال سے بعض اُصولوں پر عمل پیرا ہے۔ اگرچہ وقتاً فوقتاً اُن اُصولوں میں بعض نہایت معمولی ترمیمیں بھی کی جاتی رہی ہیں۔ مجالسِ قانون ساز کے اندر اور باہر کانگرس جس پروگرام کی آج کل پابندی کر رہی ہے اُس کی وضاحت ہم نے گزشتہ سال وردھا میں ورکنگ کمیٹی کی ایک نہایت مُفصل اور جامع قرار داد میں کر دی تھی۔

نواب اسمٰعیل خاں اور چودھری خلیق الزّماں سے یہ سُن کر مجھے بہت خوشی ہوئی تھی کہ یوپی کی مسلم لیگ یا مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ نے ہمارا یہ پروگرام منظور کر لیا ہے۔ اِس پروگرام میں جو چیزیں شامل ہیں اُن میں ایک تو حُصول آزادی کا مطمحِ نظر ہے۔ دوسری چیز مجلس دستور ساز (کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی) کے قیام کا مطالبہ ہے۔ تیسری چیز موجودہ آئین (کانسٹی ٹیوشن) اور فیڈریشن کے بارے میں ہمارا عام رویہ۔ چوتھی چیز مجالس قانون ساز کے اندر اور باہر ہمارا طرز عمل اور پانچویں زرعی اصلاحات اور مزدوروں کی فلاح و بہبود سے متعلق ہماری پالیسی ہے۔

اندریں حالات میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے درمیان صرف بنیادی اُمور ہی نہیں بلکہ جزئیات تک میں بھی اتفاق ہے۔ جب ہم خیالی اور اتفاق کی یہ کیفیت ہو تو پھر موجودہ چپقلش اور باہمی رنجش کو دیکھ کر حیرت ہی نہیں بلکہ تکلیف ہونی لازمی ہے۔ چنانچہ میں نے بہت کوشش کی کہ یہ معلوم کروں کہ آخر اِس چپقلش کی وجہ کیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب حقیقی رنجش کی وجہ تک معلوم نہ ہو تو پھر میں کوئی مستقل یا عارضی تجویز پیش کرنے کی جُرأت کیسے کر سکتا ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ آپ کی جو تقریریں اخباروں میں چھپتی ہیں اُن میں جگہ جگہ یہ نظر آتا ہے کہ کانگرس اِس ملک میں ہندو راج قائم کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مجھے قطعی معلوم نہیں کہ یہ کوشش کہاں ہو رہی ہے اور کون کر رہا ہے۔ اگر کانگرسی وزیروں یا لیڈروں میں سے کسی نے کوئی غلطی کی ہے تو ہمیں فوراً اُس کی اطلاع ملنا چاہئے۔

آپ کی کلکتہ والی تقریر کی رپورٹ اخباروں میں شائع ہوئی تھی اور یقین ہے کہ آپ کے مطالعہ سے بھی گزری ہو گی۔ اِس لئے اُس کا اقتباس یہاں درج کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ نے اُس تقریر میں فرمایا ہے کہ آپ کی لڑائی کانگرس سے نہیں بلکہ کانگرسی لیڈروں سے ہے جو ہندوؤں کو گمراہ کر رہے ہیں۔ آپ نے یہ بھی کہا ہے کہ آپ کانگرس ہائی کمان کے ہوش و حواس دُرست کرنا چاہتے ہیں۔ کیا مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت ہے کہ جن لوگوں کو کانگرس کی پالیسی وضع کرنے یا اُس کی رہنمائی کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ وہ سوائے برطانوی امپیریلزم کے اور کسی سے لڑنا نہیں چاہتے؟ بفرض محال اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ہم دوسروں کو گمراہ کرنے میں مصروف ہیں یا لوگوں سے اچھا سلوک نہیں کرتے تو ہمیں یقیناً یہ حق حاصل ہے کہ اپنے معترضوں سے پوچھیں کہ ہم سے کون سی خطا سرزد ہوئی ہے۔

آپ نے کلکتہ والی تقریر میں یہ بھی کہا ہے کہ "مدّت ہوئی بلکہ مہینوں ہوئے میں نے پنڈت جواہرلال نہرو کو چیلنج دیا تھا جسے اب پھر دُہراتا ہوں کہ وہ آئیں اور میرے ساتھ بیٹھ کر ایک ایسا پروگرام وضع کریں جس سے عوام کی مصیبتیں رفع ہوں"۔ میں نے اپنے گزشتہ خط میں آپ کے اِسی چیلنج کی طرف اشارہ کیا تھا اگر آپ نے مہینوں پہلے بھی کوئی چیلنج مجھے دیا تھا تو اس کا حال مجھ کو معلوم نہیں۔

میں نے پہلے بھی لکھا تھا اب پھر عرض کرتا ہوں کہ بالمشافہ گفتگو بہرصورت فائدہ مند ہوتی ہے اور آپ سے بالمشافہ گفتگو کرنے کو ہم ہروقت حاضر ہیں۔ کچھ دیر ہوئی آپ مولانا ابوالکلام آزاد سے ملے تھے جن کا شمار ہمارے سب سے معزز رہنماؤں میں ہوتا ہے اور جن سے بہتر کوئی شخص

اقلیتوں کے بارے میں کانگرس کی پالیسی یا عمومی مسائل کے متعلق کانگرس کا نقطۂ نگاہ بیان نہیں کر سکتا۔ اگر ضرورت ہو تو ہم میں سے ہر شخص ملاقات کو آمادہ ہے۔ لیکن میں اتنا عرض کر دوں کہ جب تک پہلے سے امور کا تعین نہ کر لیا جائے بالشافہ گفتگو سے بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اُمور مُعین کرنے میں خط و کتابت سے بہت کچھ مدد مل سکے گی۔ بلکہ بعض اوقات خط و کتابت ملاقات سے بھی زیادہ مفید ہوتی ہے کیونکہ اس میں زیرِ بحث اُمور سے ادھر اُدھر بھٹکنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ بنابریں مجھے اُمید ہے کہ آپ ہمیں متنازع اُمور سے مُطلع فرمائیں گے اور ساتھ ہی یہ بھی بتائیں گے کہ اُن کا حل آپ کے نزدیک کیا ہے۔

آپ نے سخت لہجہ اور زور دار الفاظ میں کانگرس پر اعتراض کئے ہیں۔ ظاہر ہے یہ آپ کا حق ہے اور کوئی شخص آپ کو منع نہیں کر سکتا لیکن اگر آپ پبلک طور پر اِن اعتراضات کی نوعیت بتانا پسند نہیں کرتے تو کم سے کم ہمیں پرائیویٹ طریق ہی سے بتا دیجئے کہ آپ کو اصل شکایت کیا ہے۔

میں نے مسٹر گاندھی سے آپ کے خط کے متعلق جو آپ نے انہیں ۸۔ نومبر ۱۹۳۷ء کو لکھا تھا، پوچھا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ انہیں وہ خط کلکتہ میں مل گیا تھا جبکہ وہ بسترِ علالت پر دراز تھے۔ علاوہ ازیں چونکہ اس خط میں کوئی جواب طلب بات نہ تھی اِس لئے اُنہوں نے جواب دینا ضروری خیال نہیں کیا۔ دراصل آپ نے وہ خط گاندھی جی کے خط کے جواب میں لکھا تھا اور بات بظاہر وہیں ختم ہو گئی۔ اُنہوں نے ازراہ کرم اپنا خط اور آپ کا جواب مجھ کو بھی دکھائے تھے اور میرا خیال بھی یہی ہے کہ آپ کا خط جواب طلب نہ تھا۔ بہر حال مجھے معلوم ہوا ہے کہ اُنہوں نے کل ایک خط آپ کی خدمت میں بھیج دیا ہے۔

مخلص

جواہر لال نہرو

---

جناح

نئی دہلی ۱۷۔ فروری ۱۹۳۸ء

ڈیئر مسٹر نہرو۔ آپ کا خط محررہ ۴۔ فروری ملا۔ اب آپ نے میرے خلاف مزید شکوے شکایتوں اور رنجشوں کا دفتر کھول دیا ہے جس کی نوعیت بہت ہی معمولی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ صرف اُن ہی اخبارات پر اعتماد کرتے ہیں جنہوں نے مجھے بُرا بھلا کہنے اور میرے متعلق غلط فہمیاں پھیلانے کی قسم کھا رکھی ہے۔ بہر حال میں خوش ہوں کہ آپ کو محسوس تو ہوا کہ غلط فہمیاں کیوں کر پیدا ہوتی ہیں۔ آپ لکھتے ہیں کہ "بعض بنیادی مسائل بھی ہیں جن کی ہمیں وضاحت کرنا چاہئے"۔

اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ جن متعدد اُمور کا ذکر آپ نے اپنے مکتوب میں اُٹھایا ہے، اُن پر خط و کتابت کے ذریعہ سے بحث کرنا بے سود ہے۔ نواب اسمٰعیل خاں یا چودھری خلیق الزماں یا کسی اور شخص کے ساتھ اگر آپ کی کچھ باتیں ہوئی ہیں تو مہربانی فرما کر اُن کا حوالہ نہ دیجئے کیونکہ اس طرح حوالہ در حوالہ کا سلسلہ چل نکلے گا تو بات کبھی ختم نہیں ہوگی۔

میری کلکتہ کی تقریر میں چیلنج کا جو لفظ آیا ہے وہ بظاہر اخباری نامہ نگار کی اختراع معلوم ہوتی ہے کیونکہ تقریر کا سیاق و سباق صاف بتا رہا ہے کہ وہ میری طرف سے دعوت تھی، چیلنج نہ تھا۔ بہر حال ان اُمور پر خطوں میں بحث کرنا لاحاصل ہے۔ آپ نے جو یہ اُصول بیان کیا ہے کہ "اگر پبلک طور پر اِن اعتراضات کی نوعیت بتانا پسند نہیں کرتے تو کم سے کم ہمیں پرائیویٹ طریق ہی سے بتا دیجئے کہ آپ کو اصل شکایت کیا ہے"۔ مجھے اِس سے اتفاق نہیں، میں اِن اُمور میں پبلک اور پرائیویٹ کے امتیاز کا قائل نہیں ہوں۔ میں اس ہر بات کا ثبوت مہیا کرنے کو تیار ہوں جو میں نے پبلک میں کہی ہے بشرطیکہ اخباروں میں اُس کی دُرست روئداد چھپی ہو۔

ہندو مسلم اتحاد کے متعلق آپ نے اُن ہی خیالات کا اظہار کیا ہے جو پہلے اپنے خطوں میں آپ بیان کر چکے ہیں یعنی یہ کہ میں جملہ اختلافی اُمور قلم بند کر کے آپ کو بھیجوں اور پھر خط و کتابت کے ذریعہ سے اُن پر بحث کی جائے۔ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ یہ طرزِ عمل حد درجہ ناپسندیدہ اور غیر موزوں ہے۔

میں آپ کی اس تجویز کا خیر مقدم کرتا ہوں کہ "اگر ضرورت ہو تو ہم میں سے ہر شخص ملاقات کو آمادہ ہے"۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اِس قسم کی ضرورت کا وقت آ پہنچا ہے اور آپ میں سے ہر شخص اس کام پر آمادہ ہے تو میں بخوشی آپ سے ملنے اور گفت و شنید کے لئے تیار ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ دوسروں کو نصیحت کرنے اور ان پر اپنے عقائد مسلط کرنے کے انداز میں بات کرنا پسند کرتے ہیں۔ میں اِس کے برعکس صرف آپس میں گفتگو کرنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ رہی یہ بات کہ مابہ النزاع اُمور کیا ہیں، یقیناً ان سے آپ بے خبر نہیں ہیں اور نہ آپ کو بے خبر ہونا چاہئے۔ مجھے مسٹر گاندھی کا خط موصول ہوا ہے جس کا جواب میں نے بھیج دیا ہے اُس جواب کی ایک نقل آپ کو بھی ارسال کر رہا ہوں۔

مخلص

ایم۔ اے۔ جناح

نہرو

بمبئی ۲۵ فروری ۱۹۳۸ء

ڈیئر مسٹر جناح۔ آپ کا خط محررہ ۱۷۔ فروری مجھے ہری پورہ میں ملا۔ میرا ہرگز یہ منشا نہیں تھا کہ آپ کے خلاف شکوہ و شکایت یا رنجشوں کا دفتر کھولوں۔ میں نے یہ دریافت کرنے کے لئے کہ آخر آپ کس بات کی شکایت کر رہے ہیں، اخبارات میں آپ کی تقریروں کا مطالعہ کیا تھا۔ (جو عموماً نیوز ایجنسیوں کے ذریعے اخبارات کے پاس پہنچتی ہیں) اور اس سلسلہ میں بعض ایسے اُمور نظر آئے جن پر آپ خصوصیت سے بہت زور دے رہے ہیں۔

مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی ہے کہ اخباروں میں جو کچھ شائع ہوا ہے وہ صحیح نہیں اور یہ کہ غلط باتیں آپ سے منسوب کی گئی ہیں لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ غلط بیانیاں کہاں کہاں ہوئی ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ نے اخبارات کے ذریعے سے اُن غلط بیانیوں کی تردید بھی نہیں کی۔ کیا میں یہ عرض کرنے میں حق بجانب ہوں کہ مہربانی فرما کر اُن غلطیوں کی تصحیح فرما دیجئے تاکہ عام پبلک غلط باتیں پڑھ پڑھ کر گمراہ نہ ہونے پائے؟ اس سلسلے میں اگر آپ ایک واضح اور مُصدقہ بیان شائع کر دیں تو ہمیں یہ سمجھنے میں بہت آسانی ہوگی کہ آپ کا اصل مُدعا مقصود کیا ہے اور کس چیز کو آپ قابل اعتراض سمجھتے ہیں؟

آپ فرماتے ہیں کہ میں نے نواب اسمٰعیل خاں یا چودھری خلیق الزمان کے ساتھ اگر کوئی گفتگو کی ہے تو اُس کا حوالہ اپنے خطوں میں ہرگز نہ دوں، مجھے یہ قطعاً معلوم نہیں تھا کہ ان دونوں کا نقطۂ نگاہ آپ سے مختلف ہے۔ میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ آپ کی توجہ اس طرف مُنعطف کراؤں کہ میں نے بارہا یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسلم لیگ کی سیاسی اور فرقہ وارانہ پالیسی کیا ہے اور کانگرس سے اُس کا اختلاف کہاں اور کیوں کر پیدا ہوتا ہے۔

آپ کو یاد ہوگا پچھلے سال آپ نے فرمایا تھا کہ سیاسی امور میں بھی مسلم لیگ کی پالیسی کانگرس سے قطعی مختلف ہے لیکن اس کے بعد لیگ نے اپنے مطمع نظر اور اقتصادی نقطۂ نگاہ میں جو تبدیلی پیدا کر لی ہے اس نے تو لیگ اور کانگرس کو نسبتاً ایک دوسرے سے زیادہ قریب کر دیا ہے۔ میں معلوم کرنے کا سخت خواہش مند ہوں کہ اس تبدیلی کا اصل مفہوم کیا ہے۔ جب تک اس کی وضاحت نہ ہو جائے موجودہ صورتِ حال کا سمجھنا ہمارے لئے مشکل ہے۔

آپ نے لکھا ہے کہ آپ کو میرے اس اُصول سے اتفاق نہیں کہ "اگر آپ پبلک طور پر ان

اعتراضات کی نوعیت بتانا پسند نہیں کرتے تو کم سے کم ہمیں پرائیویٹ طریق ہی سے بتا دیجئے کہ آپ کو اصل شکایت کیا ہے"۔

اس کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ آپ پبلک اور پرائیویٹ میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھتے اور ہر اُس بات کا ثبوت مہیا کرنے کو تیار ہیں جو آپ نے پبلک میں کہی ہے. بشرطیکہ اخباروں میں اُس کی روئداد درست چھپی ہے۔

اگر آپ میری عبارت کو دوبارہ پڑھنے کی تکلیف گوارا فرمائیں تو آپ دیکھیں گے کہ میں نے کہیں بھی اس قسم کا اصول وضع نہیں کیا بلکہ میں تو اسے ترجیح دیتا ہوں کہ جو اعتراض آپ نے کانگرس پر کئے ہیں ان کی تفصیل اور ماہیت آپ ایک پبلک بیان کے ذریعہ سے بتائیں لیکن جیسا کہ آپ نے اپنے خط میں لکھا ہے آپ اخبارات کو اس قسم کا بیان دینے پر تیار نہیں، اندریں حالات کیا آپ کے خیال میں ہمیں اس بات کا حق نہیں کہ آپ سے عرض کریں کہ کم سے کم پرائیویٹ طریق ہی سے ہم کو اپنی شکایت کی نوعیت بتا دیجئے۔

اگر آپ نے کانگرس پر اعتراض نہیں کیا اور اخباروں میں جو کچھ چھپتا رہا ہے وہ بالکل غلط ہے تو پھر نوعیت معلوم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا صرف اتنا کافی ہو گا کہ اس ضمن میں اخباری پراپیگنڈے کی تردید کر دی جائے لیکن اگر کانگرس پر واقعی اعتراض کئے گئے ہیں، جیسا کہ بادی النظر میں عیاں ہے تو پھر میں آپ سے عرض کروں گا کہ پبلک یا پرائیویٹ طریقوں سے جو آپ کو پسند ہو اس کے مطابق ان اعتراضات کا ثبوت بہم پہنچایئے. ذاتی طور پر میں پبلک طریقے کو ترجیح دیتا ہوں۔

مجھے اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ میں بنیادی جھگڑے کی علت سمجھنے میں معذور ہوں اسی لئے بار بار آپ سے عرض کرتا ہوں کہ اس کی وضاحت فرمایئے۔ اس ضمن میں اب تک آپ نے کچھ نہیں کیا۔ بے شک ہم بوقت ضرورت آپ سے ملنے کو تیار ہیں، ہمارے صدر مسٹر سوبھاش چندر بوس یا مولانا آزاد یا میں یا ورکنگ کمیٹی کا کوئی اور ممبر کسی مناسب موقع پر آپ سے ملاقات کر لے گا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ بوقت ملاقات ہم بحث کس چیز پر کریں گے؟ ذمے دار افراد جو اداروں اور جماعتوں کی نمائندگی کرتے ہیں محض قیاسی یا فرضی باتوں پر گفت و شنید نہیں کیا کرتے۔ ملاقات سے پہلے یہ معلوم ہو جانا چاہئے کہ متنازع یا زیر بحث آنے والے معاملات کیا ہیں ورنہ حقیقت ہماری آنکھوں سے اوجھل رہے گی۔ آپ کو ۱۹۳۵ء کا واقعہ یاد ہو گا جب دہلی میں

آپ اور بابو راجندر پرشاد کے درمیان اس بات پر حجت آرائی ہوتی رہی تھی کہ واقعات کیا تھے اور بحث کیا ہوئی تھی۔ میں نہیں چاہتا کہ اس قسم کی صورت حال دوبارہ پیدا ہو اور ہم آپس ہی میں لڑنے جھگڑنے لگیں۔

اسی لئے میں عرض کرتا ہوں کہ بہتر یہی ہو گا کہ پہلے سے ان امور کا تعین کر لیا جائے. جن پر آگے چل کر ہمارے درمیان گفتگو ہو گی. یہ طرز عمل اس لئے بھی ضروری ہے کہ ہم کو ہمیشہ اپنے شرکاء کار سے ایسی ہر بات کے متعلق مشورہ کرنا پڑے گا جس کا تعلق کانگرس کی پالیسی سے ہے. لہٰذا اس میں ہرگز کوئی قباحت نہیں کہ خط و کتابت سے تنقیح طلب امور کا تعین کر لیا جائے۔ افراد یا جماعتوں کے درمیان جب گفتگو ہوتی ہے تو عموماً یہی قاعدہ برتا جاتا ہے. اندریں حالات میں آپ سے ملتجی ہوں کہ ان امور پر روشنی ڈالئے۔

مخلص

جواہر لال نہرو

## جناح

نئی دہلی ۳۔ مارچ ۱۹۳۸ء

ڈیئر مسٹر نہرو۔ آپ کا خط محررہ ۲۵۔ فروری ملا۔ افسوس ہے کہ آپ بدستور اسی روش پر قائم ہیں اور بلا ضرورت اس قسم کی غیر متعلقہ اور پیش پا افتادہ باتوں پر بحث شروع کر دیتے ہیں جن کا اصل معاملے سے کوئی تعلق نہیں اور جس کے بارے میں آپ نے سب سے پہلا خط لکھا تھا یعنی ہندو. مسلم اتحاد جیسے اہم ترین مقصد کے حصول کے لئے کیا ذرائع اختیار کرنا چاہئیں۔

اس خط کے آخر میں آپ اصرار فرماتے ہیں کہ میں تمام اختلافی اور نزاعی امور کی فہرست مرتب کر کے آپ کے ملاحظہ کے لئے بھیجوں اور بعد کو ہم ان کے تصفیے کے لئے خط و کتابت جاری رکھیں۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ یہ طریق کار عام طور پر دو سالسٹر اختیار کیا کرتے ہیں جنہیں اپنے اپنے مؤکل کے متعلق ایک دوسرے کو خطوط لکھنا پڑتے ہیں۔ اہم قومی مسائل طے کرنے کا یہ قاعدہ نہیں۔

آپ کے یہ الفاظ پڑھ کر کہ "مجھے اس بات کا اعتراف کرنا ہے کہ مجھے یہ قطعی معلوم نہیں کہ جھگڑے کے اسباب کیا ہیں۔" آپ کی بے خبری اور لاعلمی پر سخت حیرت ہوئی۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۵ء تک مسلسل دس سال ملک کے چوٹی کے لیڈر اس جھگڑے کو رفع کرنے کی کوشش کرتے

رہے ہیں اور اب تک کوئی تصفیہ نہیں ہو سکا۔ میری درخواست ہے کہ مہربانی فرمائیں اس معاملے پر اچھی طرح غور کیجئے اور اپنے آپ کو فریب نفس کے موجودہ خول سے نکالئے۔ اگر آپ صدق دل سے کوشش کریں گے تو بہت جلد آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ جھگڑے کے اسباب کیا ہیں کیونکہ اخباروں اور پبلک جلسوں میں بارہا ان پر بحث مباحثہ ہو چکا ہے۔"

مخلص

ایم۔ اے۔ جناح

---

نہرو

الہ آباد ۸۔ مارچ ۱۹۳۸ء

ڈیئر مسٹر جناح۔ آپ کا خط محررہ ۳۔ مارچ ملا۔ شکریہ۔ ہم ایک ہی بات کو بار بار دہرائے جا رہے ہیں۔ میں ہر دفعہ یہ عرض کرتا ہوں کہ مہربانی فرما کر بتائیے کہ لڑائی جھگڑے اور اختلاف کے اسباب کیا ہیں اور آپ ہر بار یہی جواب دیتے ہیں کہ خطوں میں اس موضوع پر بحث کرنا بے کار ہے۔ ساتھ ہی آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ جملہ اختلافی امور پر پبلک جلسوں اور اخباروں میں پہلے بھی اور حال میں بھی خاصی بحث ہو چکی ہے۔ میں اخبارات کا بغور مطالعہ کرتا ہوں اور آپ کی پبلک تقریروں کی روئداد بھی میری نظر سے گزرتی رہی ہے۔ چنانچہ میں نے متنازع امور کے سمجھنے کی کوشش کی تھی اور اسی سلسلے میں وہ متعدد اعتراضات بھی قلم بند کئے تھے جو اخباری رپورٹ کے مطابق آپ نے کانگرس پر کئے تھے۔ جواب میں آپ نے لکھا تھا کہ اخبارات میں جو باتیں آپ سے منسوب کی گئی ہیں غلط ہیں لیکن آپ نے یہ بھی تو نہیں بتایا کہ صحیح رپورٹ میں کیا درج ہونا چاہئے تھا۔ پھر آپ فرماتے ہیں کہ یہ معمولی اور پیش پا افتادہ مسائل ہیں لیکن اصل اور اہم مسئلہ کیا ہے۔ اس بارے میں آپ بدستور خاموش ہیں۔

امید ہے اس ضمن میں آپ میری مشکلات کا صحیح اندازہ کر سکیں گے اور یہ بھی امید ہے کہ آپ مجھ پر غیر متعلقہ امور داخل کرنے کا الزام بھی نہیں لگائیں گے جیسا کہ آپ نے پچھلے خط میں کیا ہے۔

یقین کیجئے میرا ہرگز یہ ارادہ نہیں کہ آپ کے بارے میں کسی غلط بیانی یا بہتان طرازی کا مرتکب ہوں۔ نہ میرا یہ مقصد ہے کہ پیش پا افتادہ امور کو جن کا حقیقی مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں خواہ مخواہ اپنے خطوں میں داخل کروں لیکن میں پوچھتا ہوں کہ حقیقی مسئلہ ہے کیا؟

ہو سکتا ہے کہ میں اپنی کُند ذہنی کے باعث یا کسی اور سبب سے معاملہ کی تہہ تک نہیں پہنچ سکا۔ اس صورت میں تو آپ کا فرض ہے کہ مجھ کو حقیقت سے آگاہ فرمائیں، کچھ نہیں تو کم سے کم اپنے کسی تازہ بیان ہی کی طرف اشارہ کر دیجئے جو آپ نے اخبارات کو دیا ہے یا کسی پبلک تقریر ہی کا حوالہ دے دیجئے۔ ممکن ہے اس سے میری مشکل رفع ہو سکے۔ میں آپ کا ممنون ہوں گا۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں خط و کتابت کے ذریعہ سے معاملات پر بحث نہیں کرنا چاہتا۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ مابہ النزاع امور کی حقیقت کو سمجھوں۔ قومی معاملات پر جب بحث کی جاتی ہے تو تنقیح طلب امور کو اسی طرح مرتب کیا جاتا ہے۔ قومی اور بین الاقوامی حلقوں میں بھی آج کل معاملات کی ترتیب و تدوین کا عموماً یہی طریقہ ہے۔

یہ جو آپ نے فرمایا ہے کہ ۱۹۲۵ء سے بدستور ان ہی معاملات پر بحث مباحثہ جاری ہے بالکل درست۔ تو کیا اندریں حالات آپ کے نزدیک معاملے کی نزاکت اور قدامت اس امر کی متقاضی نہیں کہ ہم اس پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے اس کے مالہ و ماعلیہ اور اس کی تفصیلات کو بخوبی ذہن نشین کر لیں؟ علاوہ ازیں گزشتہ چند سال میں ایسے بہت سے واقعات رونما ہو چکے ہیں جنہوں نے صورت حال کو بدل دیا ہے۔ مثلاً فرقہ وارانہ فیصلہ (کمیونل ایوارڈ)۔ کیا آپ اس امر پر بحث کرنا چاہتے ہیں۔ کہ باہمی رضامندی سے کوئی ایسا متفق علیہ حل تلاش کیا جائے جو اس ایوارڈ کا بدل ہو سکے؟

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کانگرس تمام رنجشیں اور غلط فہمیاں دور کرنے کو بے تاب ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وسیع قومی مفاد کا یہی تقاضا ہے۔ ہم خود محسوس کرتے ہیں کہ اس قسم کی غلط فہمیاں کانگرس کے روزمرہ کاموں میں حائل ہو رہی ہیں۔ کانگرس نے اکثر اس معاملے پر غور و فکر کیا ہے اور بعض ایسی تجویزیں اور قرار دادیں بھی منظور کی ہیں جو اس مسئلہ کے حل کرنے میں معاون ہو سکتی ہے۔ میں ان تجویزوں اور قرار دادوں کی صحت و عدم صحت کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کیونکہ اس طرح دونوں طرف سے حامی اور مخالف دلائل پیش کئے جانے کا احتمال ہے لیکن یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ہم نے وہی کیا جس کو ہم اپنے فہم کے مطابق درست اور مفید سمجھتے تھے۔ اگر ہمیں حسب توقع کامیابی نہ ہو سکی تو اسے ہماری بدقسمتی پر محمول کرنا چاہئے۔ تاہم بہتر نتائج حاصل کرنے کے لئے ہم دوبارہ کوشش کرنے کو تیار ہیں۔ اس مسئلہ کے متعدد پہلو جو میری سمجھ میں آئے ہیں یہ ہیں:۔

۱۔ فرقہ وارانہ فیصلہ (کمیونل ایوارڈ) جس میں جداگانہ انتخاب اور نشستوں کا تحفظ شامل

ہے۔

۲۔ مذہبی آزادی۔

۳۔ کلچر کی حفاظت۔

بظاہر یہی تینوں بڑے عنوان ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض اور چھوٹے چھوٹے عنوان بھی ہوں۔ لیکن چونکہ آپ بڑے اور اہم مسائل پر غور کرنا چاہتے ہیں اس لئے میں چھوٹے چھوٹے عنوانوں کو سردست نظر انداز کئے دیتا ہوں۔

جہاں تک فرقہ وارانہ فیصلے کا تعلق ہے۔ کانگرس کا رویہ بالکل واضح ہے۔ اگر اس پر آپ بحث کرنا چاہتے ہیں تو مطلع فرمائیے گا۔ رہا مذہبی آزادی اور کلچر کی حفاظت کا مسئلہ، کانگرس اس بارے میں مکمل یقین دلا چکی ہے اور ہر قسم کی مزید ضمانت دینے کو بھی تیار ہے۔ آپ نے وقتاً فوقتاً اپنی تقریروں میں جن مسائل کا ذکر کیا ہے ان میں ایک اردو زبان بھی ہے میں نے اس ضمن میں اپنا ایک رسالہ آپ کی خدمت میں ارسال کیا تھا اور خط بھی لکھا تھا۔ مجھے امید ہے کہ آپ کو میرے خیالات سے اتفاق ہو گا۔

کیا ہمیں بوقت ملاقات ان ہی مسائل پر گفتگو کرنا ہو گی یا اور مسائل بھی ہیں جن کا ذکر میں نہیں کر سکا؟ تاہم اس ساری گفت و شنید میں یہ نکتہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ہماری بحث کا حقیقی پس منظر سیاسی اور اقتصادی ہو گا. یعنی حصول آزادی کی جدوجہد، امپیریلزم کی مخالفت. ضرورت کے وقت ڈائرکٹ ایکشن اختیار کرنا، جنگ کی مخالفت. عوام کی لوٹ کھسوٹ کا انسداد کرنے کی تدابیر. زراعت پیشہ اور مزدوری پیشہ لوگوں کی مشکلات کا حل وغیرہ وغیرہ۔

مسلم لیگ نے حال ہی میں اپنی پالیسی میں، جو تبدیلیاں کی ہیں ان کے پیش نظر میں یہ کہنے میں غالباً حق بجانب ہوں کہ جہاں تک امپیریلزم کی مخالفت کرنے کا سوال ہے. ہم میں اور آپ میں چنداں اختلاف نہیں۔

معاف فرمائیے گا کہ مجھے بار بار اپنے خطوں میں وہی باتیں دُہرانا پڑتی ہیں۔ میں چاہتا صرف یہ ہوں کہ آپ کو میرا اور میرے کانگرسی رفیقوں کا نقطہ نگاہ سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔ میرا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ لمبے چوڑے خط لکھ لکھ کر اپنا اور آپ کا وقت ضائع کروں۔ میرے دل و دماغ کچھ اس قسم کے بنے ہوئے ہیں کہ جب تک کسی کام کی حقیقت کو اچھی طرح نہ سمجھوں۔ میں اسے اختیار نہیں کر سکتا۔ حقیقی اور اصلی مسائل سے چشم پوشی کرنا اور مبہم باتوں کے پیچھے لگے رہنا اچھے نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔ سخت حیرت ہے کہ میرے بار بار عرض کرنے کے باوجود بھی آپ نہیں

بتاتے کہ وہ کون سے مسائل ہیں جن پر ہمیں بالمشافہ گفتگو کرنا ہوگی۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ گاندھی جی نے آپ کو لکھ دیا ہے کہ وہ آپ سے ملنے کو تیار ہیں. میں اب کانگرس کا صدر نہیں رہا۔ اس لئے میری نمائندہ حیثیت بھی وہ نہیں جو پہلے تھی۔ پھر بھی اگر اس گتھی کے سلجھانے میں مجھ سے کچھ بن پڑے گا تو میری خدمات ہر وقت کانگرس کے لئے حاضر ہیں، اور میں اس سلسلے میں آپ سے ملنے اور زبانی گفتگو کرنے کو ہمیشہ تیار ہوں۔

مخلص

جواہر لال نہرو

---

## جناح

نئی دہلی ۱۷۔ مارچ ۱۹۳۸ء

ڈیئر پنڈت نہرو۔ آپ کا خط محررہ ۸۔ مارچ ۱۹۳۸ء ملا۔ پہلے خط میں جو آپ نے ۱۸۔ جنوری کو لکھا تھا مجھ سے پوچھا تھا کہ وہ کون سے اختلافی امور ہیں جو ہندو مسلم اتحاد کے راستے میں حائل ہیں۔ جب میں نے جواب دیا کہ ان امور پر خطوں یا اخباروں میں بحث کرنا مناسب نہیں تو آپ نے اپنے ۴۔ فروری کے مکتوب میں ایک طویل فہرست ان شکایات کی مرتب کر ڈالی جو آپ کے خیال میں میں نے کانگرس کے خلاف کی ہیں اور جن کا ان مسائل سے چنداں تعلق نہیں جو فوری طور پر ہماری توجہ کے محتاج ہیں۔ آپ بدستور اسی خیال کے پیچھے پڑے رہے اور اب بھی آپ بار بار ان ہی مسائل کو بیچ میں لا رہے ہیں. حالانکہ موجودہ معاملے سے ان کا کچھ واسطہ نہیں اور جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں میں ان پر بحث کرنا بھی نہیں چاہتا۔

میرا خیال ہے کہ ہم نے مراسلت کا آغاز اس بات سے کیا تھا کہ مسلمانوں کے مذہب. کلچر. زبان. شخصی قوانین (پرسنل لاز) قومی زندگی ملک کی حکومت اور نظم و نسق میں ان کے حقوق کیوں کر محفوظ کئے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں متعدد تجویزیں پیش کی جا چکی ہیں جو مسلمانوں کے نزدیک تسلی بخش ثابت ہو سکتی ہیں اور جن سے ان کے اندر ایک گونہ اطمینان پیدا ہونے کے علاوہ یہ بھی ہو گا کہ وہ اکثریت پر اعتماد کر سکیں گے. مجھے آپ کے خط میں یہ پڑھ کر حیرت ہوئی کہ

> "حقیقی مسئلہ ہے کیا؟ ہو سکتا ہے کہ اپنی کند ذہنی کے باعث یا کسی اور سبب سے میں معاملے کی تہ تک نہیں پہنچ سکا۔ اس صورت میں تو آپ کا فرض ہے کہ مجھ کو حقیقت سے آگاہ فرمائیں۔ کچھ نہیں تو کم سے کم اپنے کسی تازہ بیان ہی کی طرف اشارہ کر دیجئے جو آپ نے اخبارات کو دیا ہے یا

کسی پبلک تقریر ہی کا حوالہ دے دیجئے, ممکن ہے اسی سے میری مشکل رفع ہو سکے, میں آپ کا ممنون ہوں گا"۔

میرا خیال ہے آپ نے "چودہ نکات" کا لفظ تو سنا ہو گا۔

آگے چل کر آپ لکھتے ہیں کہ "علاوہ ازیں گزشتہ چند سال میں ایسے بہت سے واقعات رونما ہو چکے ہیں جنہوں نے صورت حال کو بدل دیا ہے"۔ بالکل درست! مجھے آپ سے اتفاق ہے۔ ابھی پچھلے دنوں اخبارات میں بہت سی تجویزیں اور مشورے پیش کئے گئے ہیں۔ مثلاً روزنامہ سٹیٹس مین مورخہ ۱۲۔ فروری ۱۹۳۸ء میں ایک مضمون بعنوان "مسلمانوں کی آنکھوں سے"[1] شائع ہوا ہے (اس کا ایک نسخہ ملفوف ہے) اس کے علاوہ نیو ٹائمز[2] مورخہ یکم مارچ ۱۹۳۸ء میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کا موضوع آپ کی وہ تقریر ہے جو حال ہی میں آپ نے کانگرس کے ہری پورہ کے سالانہ اجلاس میں کی تھی اور جس میں یہ الفاظ آپ سے منسوب کئے گئے ہیں کہ "میں نے اس نام نہاد فرقہ وارانہ مسئلہ کا خوردبین سے معائنہ کیا ہے لیکن جب ہے ہی کچھ نہیں تو نظر خاک آئے گا"۔

نیو ٹائمز کے اس مضمون میں جو یکم مارچ ۱۹۳۸ء کو شائع ہوا تھا, متعدد تجاویز پیش کی گئی ہیں (ایک نسخہ ملفوف کر رہا ہوں) اس کے علاوہ آپ نے مسٹر اینے کا وہ انٹرویو بھی ملاحظہ کیا ہو گا۔ جس میں انہوں نے مسلم لیگ کے چند مطالبات کا ذکر کرتے ہوئے کانگرس کو متنبہ کیا ہے کہ ہرگز انہیں قبول نہ کیا جائے۔

یہ سب کچھ آپ کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے کہ متعدد تجویزیں پیش کی جاچکی ہیں یا پیش کی جانے والی ہیں یا پیش کئے جانے کی توقع ہے, ان تمام تجویزوں کا جائزہ لینا چاہئے۔ آخر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہر قوم پرست شخص کا خواہ کسی فرقے اور کسی پارٹی سے تعلق رکھتا ہو فرض ہے کہ صورت حال کا مطالعہ کرے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک معاہدہ کرائے تاکہ متحدہ محاذ قائم کیا جا سکے۔ یہ آپ کا بھی ویسا ہی فرض ہے جیسا میرا, قطع نظر اس سے کہ ہم ذاتی طور پر کس

---

۱۔ 1 Through Muslim Eyes

۲۔ نیو ٹائمز انگریزی کا ایک ہفتہ وار اخبار تھا جسے ملک برکت علی مرحوم نے مسلم لیگ کا پروپیگنڈا کرنے کے لئے اکتوبر ۱۹۳۶ء میں لاہور سے جاری کرایا تھا۔ اخبار کا تمام خرچ ملک صاحب خود برداشت کرتے تھے۔

قوم کے افراد اور کس پارٹی کے رکن ہیں۔

لیکن اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اس قسم کی تمام تجویزوں کو جمع کر کے ایک سائل کی طرح آپ اور آپ کے رفیقوں کی خدمت میں بغرض ملاحظہ پیش کروں تو معاف کیجئے گا یہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا اور نہ میں ان جملہ امور کی وضاحت کے لئے آپ سے مزید خط و کتابت جاری رکھنے کو تیار ہوں۔ اور اگر آپ نے بدستور اس بات پر اصرار کیا جیسا کہ آپ کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ:۔

"میرے دل و دماغ کچھ اس قسم کے ہیں کہ جب تک کسی کام کی حقیقت کو اچھی طرح نہ سمجھ لوں میں اسے اختیار نہیں کر سکتا۔ حقیقی اور اصلی مسائل سے چشم پوشی کرنا اور مبہم باتوں کے پیچھے لگے رہنا اچھے نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔ سخت حیرت ہے کہ میرے بار بار عرض کرنے کے باوجود بھی آپ نہیں بتاتے کہ وہ کون سے مسائل ہیں جن پر ہمیں بالمشافہ گفتگو کرنا ہوگی"۔

تو معاف کیجئے گا یہ انداز بیان نہ تو مناسب ہے نہ درست۔ پھر بھی میری گزارش ہے کہ کانگرس سے کہئے کہ وہ باضابطہ مجھ سے خط و کتابت کرے۔ میں اس صورت میں یہ معاملہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے سامنے پیش کر دوں گا کیونکہ آپ خود فرماتے ہیں کہ:

"میں اب کانگرس کا صدر نہیں ہوں اس لئے میری نمائندہ حیثیت بھی وہ نہیں جو پہلے تھی تاہم اگر اس گتھی کے سلجھانے میں مجھ سے کچھ بن پڑے گا تو میری خدمات ہر وقت کانگرس کے لئے حاضر ہیں اور میں اس سلسلے میں آپ سے ملنے اور زبانی گفتگو کرنے کو ہمیشہ تیار ہوں"۔

جہاں تک آپ سے ملنے اور معاملات پر گفتگو کرنے کا تعلق ہے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میں بخوشی حاضر ہوں۔

مخلص

ایم۔ اے۔ جناح

---

کلکتہ ۶۔ اپریل ۱۹۳۸ء

ڈیئر مسٹر جناح۔ آپ کا خط محررہ ۱۷۔ مارچ کماؤں میں ملا جہاں میں چند روز آرام

کرنے کے لئے چلا گیا تھا۔ وہاں سے کلکتہ آیا اور آج واپس الہ آباد جا رہا ہوں۔ امید ہے کہ اپریل کا بیشتر حصہ وہیں ٹھہروں گا۔ اگر آپ بھی الہ آباد تشریف لا سکیں تو ملاقات ہو جائے گی اور اگر آپ لکھنؤ جانا پسند کریں تو میں وہاں حاضر ہو جاؤں گا۔

میں خوش ہوں کہ آپ نے اپنے اس خط میں بعض ایسے امور کی نشان دہی کی ہے جو آپکے ذہن میں موجود ہیں، اخبارات کے تراشے جو آپ نے بھیجے ہیں ان کے مطالعہ سے بھی ان امور کا پتا چلتا ہے اور گمان غالب ہے کہ یہ تراشے آپ کے نقطہ نگاہ کی بھی ترجمانی کرتے ہیں، سچ پوچھئے تو اس فہرست کو دیکھ کر مجھے تعجب ہوا کیونکہ مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ آپ ان مسائل پر ہم سے گفتگو کرنے کے خواہش مند ہیں۔ اس لئے کہ ان میں سے چند ایک کا تصفیہ تو کانگرس بہت پہلے سے کر چکی ہے اور جو باقی رہ گئے ہیں وہ بمشکل کسی قسم کی بحث کے متحمل ہو سکتے ہیں۔

میں آپ کے خط اور مرسلہ اخباری تراشوں سے یہ اندازہ کر سکا ہوں کہ آپ ذیل کی باتوں پر مذاکرات کرنا چاہتے ہیں۔

۱۔ چودہ نکات جنہیں مسلم لیگ نے ۱۹۲۹ء میں مرتب کیا تھا۔

۲۔ کانگرس فرقہ وارانہ فیصلے (کمیونل ایوارڈ) کی مخالفت ترک کر دے اور اس ایوارڈ کو قوم پرستی کے منافی قرار نہ دے۔

۳۔ دستور میں مسلمانوں کے لئے سرکاری ملازمتوں کا ایک حصہ آئینی طور پر مخصوص کر دیا جائے۔

۴۔ مسلمانوں کے "پرسنل لاء" اور کلچر کا آئینی طور پر تحفظ کیا جائے۔

۵۔ کانگرس کو چاہئے کہ مسجد شہید گنج کی تحریک میں حصہ لے اور اپنے اخلاقی اثر و رسوخ سے کام لے کر یہ مسجد مسلمانوں کو واپس دلوائے۔

۶۔ اذان دینے اور جملہ مذہبی فرائض ادا کرنے میں مسلمانوں کے راستے میں کوئی خلل نہیں پڑنا چاہئے۔

۷۔ مسلمانوں کو گائے ذبح کرنے کی پوری آزادی ہونی چاہئے۔

۸۔ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں کی جغرافیائی حدود میں ایسا کوئی ردو بدل نہ کیا جائے جس سے اکثریت کو ضعف پہنچے۔

۹۔ بندے ماترم کا ترانہ ہرگز نہ گایا جائے۔

۱۰۔ مسلمان چاہتے ہیں کہ اردو کو ہندوستان کی قومی زبان قرار دیا جائے اور اس امر کی آئینی ضمانت درکار ہے کہ اردو کو آئندہ کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

۱۱۔ حکومت خود اختیاری کے اداروں (لوکل باڈیز) میں مسلمانوں کی نمائندگی اسی اصول کے تحت ہونی چاہئے جو کمیونل ایوارڈ میں موجود ہے یعنی جداگانہ انتخاب اور آبادی کے اصول کے مطابق۔

۱۲۔ کانگرس کا ترنگا جھنڈا بدل دیا جائے ورنہ مسلم لیگ کے پرچم کو بھی ترنگے جھنڈے کے برابر اہمیت دی جائے۔

۱۳۔ مسلم لیگ کو مسلمانان ہند کی نمائندہ جماعت تسلیم کیا جائے۔

۱۴۔ صوبوں میں مشترکہ وزارتیں (کولیشن) قائم کی جائیں۔

مزید بر آں یہ امر بھی واضح کیا گیا ہے کہ ۱۹۳۵ء میں آپ اور بابو راجندر پرشاد کے درمیان جو فارمولا مرتب ہوا تھا اب اس سے مسلمانوں کی تشفی نہیں ہو سکتی۔ اور ان ہی خطوط پر اگر کوئی اور فارمولا بنا دیا گیا تو وہ بھی مسلمانوں کے نزدیک تسلی بخش نہیں ہو گا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ مذکورہ بالا فہرست مکمل نہیں بلکہ اس میں مزید "مطالبات" کا بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ جب تک ان غیر محدود مطالبات کا مجھ کو علم نہ ہو جائے میں ان کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن متذکرہ صدر فہرست میں جو نکات پیش کئے گئے ہیں ان کے متعلق کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ یہ بتا سکوں کہ کانگرس کا رویہ کیا ہے۔ قبل اس کے کہ ان کے بارے میں کچھ عرض کیا جائے یہ ضروری ہے کہ ہم ایک آزاد و خود مختار ہندوستان کے سیاسی اور اقتصادی پس منظر کو سامنے رکھیں کیونکہ بالآخر یہی ہمارا مطمح نظر ہے اور اسی کے لئے تمام تر جدوجہد جاری ہے۔ آزاد ہندوستان میں ان جملہ امور میں سے بیشتر اپنی اہمیت کھو بیٹھیں گے۔ بحالات موجودہ ہم ان پر یا تو آزاد ہندوستان کے پس منظر میں گفتگو کر سکتے ہیں یا موجودہ دور غلامی کو سامنے رکھ کر بات کی جا سکتی ہے۔ کانگرس فطری طور پر آزاد ہندوستان کے پس منظر ہی کو سامنے رکھتی ہے اگرچہ کبھی کبھی اسے موجودہ عارضی اور عبوری دور کے ساتھ مفاہمت کرنا پڑتی ہے۔ اندریں حالات کانگرس کو موجودہ آئین میں کسی قسم کی ترمیم کرانے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس کا تنہا مقصد یہ ہے کہ اس آئین کو دریا برد کر دیا جائے۔ اور اس کی جگہ ہندوستان کے باشندے ایک دستور ساز اسمبلی (کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی) کے ذریعہ سے اپنا آئین خود وضع کریں۔

ایک اور مسئلہ روز بروز اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ یعنی موجودہ بین الاقوامی کش مکش جس کا نتیجہ ممکن ہے جنگ کی صورت میں ظاہر ہو اور جو ہندوستان اور ہماری آزادی کی جدوجہد پر بھی یقیناً اثر انداز ہو گا لہٰذا اس صورت حال کو سب سے مقدم درجہ عطا کرنا چاہئے کیونکہ اگر ہمارے

پاؤں تلے سے زمین ہی نکل گئی تو ہماری بحثیں اور کوششیں لاحاصل ثابت ہوں گی۔ اس ضمن میں کانگرس کئی بار اپنی پالیسی کا اعلان کر چکی ہے کہ وہ برطانیہ کی کسی جنگ میں حصہ لینے کو تیار نہیں۔ اندریں حالات ہماری بنیادی پالیسی امن قائم رکھنا اور اپنے ملک کی آزادی حاصل کرنا ہے۔ کانگرس اس پالیسی کی خاطر سے مسلم لیگ اور دوسری جماعتوں اور افراد کے ساتھ تعاون کرنے کو ہر وقت تیار ہے۔

آپ نے اپنے خط میں جن امور کا ذکر کیا ہے اور اخبارات کے جو تراشے ارسال فرمائے ہیں میں نے بخوشی ان پر غور کیا ہے۔ ان میں ایک مسئلہ بھی ایسا نہیں جس کا تعلق عوام کے اقتصادی حالات سے ہو یا جس کا اثر موجودہ دور کے ہمہ گیر اور اہم ترین مسئلے یعنی افلاس اور بے کاری پر پڑتا ہو۔ ہمارے لئے ہندوستان میں یہی سب سے بڑے مسائل ہیں اور جب تک ان کا کوئی حل دریافت نہ کیا جائے ہماری تمام کوششیں بے سود ہیں۔ سرکاری ملازمتوں کا معاملہ بے شک ضروری ہے لیکن کتنے آدمیوں کا تعلق سرکاری ملازمت سے ہے؟ ہمارے ملک کی بیشتر آبادی کاشت کاروں، مزدوروں، کاریگروں اور چھوٹے چھوٹے دکان داروں پر مشتمل ہے۔ جن معاملات کا ذکر آپ نے کیا ہے ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں جس سے ان لوگوں کی حالت سدھرنے کی توقع ہو سکتی ہے حالانکہ ان ہی کی فلاح اور بہبود ہمارا اوّلین مقصد ہونا چاہئے۔

بیشتر مطالبات ایسے ہیں جنہیں پورا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ موجودہ آئین میں تبدیلیاں کی جائیں۔ ہم ایسی تبدیلیاں کرنے کے مجاز نہیں۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اس قسم کی تبدیلیاں ضروری ہیں تو بھی ہم اس کے لئے تیار نہیں کیونکہ ہم تو سرے سے اس آئین کو ختم کرنے اور اس کی جگہ آزاد ہندوستان کا آئین بنانے کے حامی ہیں۔

آئینی تحفظات جو آپ مانگتے ہیں ان کے لئے بھی موجودہ دستور میں تغیر و تبدل کرنا ضروری ہے جو ہم نہیں کر سکتے۔ ہمارے اختیار میں تو صرف یہ ہے کہ اس بات کا وعدہ کریں کہ آئندہ آزاد ہندوستان کا جو دستور وضع ہو گا اس میں بعض تحفظات شامل کر دیئے جائیں گے۔ ہماری قرار داد کراچی میں جہاں بنیادی حقوق کا ذکر موجود ہے۔ وہاں یہ درج ہے کہ اقلیتوں کا مذہب، زبان، کلچر اور دیگر حقوق محفوظ ہوں گے۔ ہم یہ کر سکتے ہیں کہ ان حقوق کو کانسٹی ٹیوشن کا ایک جزو بنا دیا جائے۔

اب میں ان امور کی طرف آتا ہوں جن کا ذکر آپ کے خط میں ہے۔

۱۔ جہاں تک چودہ نکات کا تعلق ہے اب وہ قصۂ پارینہ بن چکے ہیں۔ ان میں سے اکثر نکات فرقہ وارانہ فیصلہ (کمیونل ایوارڈ) نے طے کر دیئے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جنہیں کانگرس

تسلیم کرنے کو تیار ہے. بعض ایسے ہیں جن کے لئے موجودہ آئین میں تبدیلی کرنا ضروری ہے اور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں یہ تبدیلی ہمارے اختیار میں نہیں تاہم فرقہ وارانہ فیصلے اور آئین میں تبدیلی سے قطع نظر دو ایک باتیں ایسی ہیں جو بحث طلب ہونے کے علاوہ اختلاف رائے کا موجب بن سکتی ہیں۔

۲۔ فرقہ وارانہ فیصلے سے متعلق کانگرس اپنی پالیسی کا اعلان کر چکی ہے کہ جملہ فریقین کی مرضی کے بغیر اس فیصلے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ کانگرس کی اس پالیسی کو کیوں کر قابل اعتراض قرار دیا جا سکتا ہے اور اگر یہ تقاضا کیا جائے کہ ہم اس فیصلے کو قوم پرستی کے منافی قرار نہ دیں تو معاف کیجئے یہ ہم سے نہیں ہو سکتا۔ قطع نظر اس سے کہ اس فیصلے کی رُو سے مختلف فریقوں کو کیا کچھ حاصل ہوتا ہے. اس کی تمام تر ساخت اور بنیاد ایسی ہے جو قوم پرستی کے منافی اور متحدہ قومیت کی تعمیر کے راستے میں حائل ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس فیصلے نے ہندوستان کے بعض حصوں میں یورپینوں کو ناواجب اور ضرورت سے کہیں زیادہ وغیرہ عطا کر دیا ہے۔ اگر ہم آزاد ہندوستان کی روشنی میں غور کریں تو یہ چیز ہمارے لئے ناقابل برداشت ہے. یہ صحیح ہے کہ ہمیں کبھی کبھی واقعات و حالات سے مجبور ہو کر عارضی طور پر بعض ایسی چیزیں قبول کرنا پڑتی ہیں جو صریحاً قوم پرستی کے منافی ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ فرقہ وارانہ فیصلہ جن امور پر حاوی ہے ان میں کوئی تسلی بخش اور مستقل تبدیلی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک جملہ فریقوں کی رضامندی حاصل نہ کر لی جائے۔ بس کانگرس کی بھی یہی پالیسی ہے۔

۳۔ یہ مسئلہ کہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے لئے ایک خاص حصہ آئینی طور پر محفوظ کر دیا جائے. اس امر کا متقاضی ہے کہ دوسرے گروہوں اور فرقوں کے لئے بھی اسی نوع کی تخصیص کی جائے۔ اگر اس اصول پر عمل کیا گیا تو نتیجہ یہ ہو گا کہ حکومت کا سارا ڈھانچہ مستقل طور پر علیحدہ علیحدہ رخنوں میں بٹ جائے گا اور اس طرح کام کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ بایں ہمہ یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ سرکاری ملازمتوں کی تقسیم منصفانہ طریق پر ہونی چاہئے اور کسی فرقے کو اس ضمن میں شکایت کی گنجائش نہ رہے۔ بہتر یہی ہو گا کہ اس کام میں باہمی مفاہمت اور روایت سے کام لیا جائے۔ کانگرس کو اس کا بخوبی احساس ہے اور وہ تمام گروہوں کی خواہشات کی مکمل پذیرائی کرنا چاہتی ہے تاکہ چودہ نکات کے نکتہ نمبر ۲ کے بموجب تمام اقلیتوں کو سرکاری عہدوں اور لوکل باڈیز کی ملازمتوں میں جائز اور ضروری حصہ مل سکے"۔

آج کی مملکت روز بروز ٹیکنیکل صورت اختیار کرتی جا رہی ہے جس کے مختلف محکموں میں جملہ فرائض سرانجام دینے کے لئے خاص علم اور تربیت کی ضرورت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اگر کوئی فرقہ اس ٹیکنیکل علم اور تربیت سے پوری طرح بہرہ مند نہیں تو اس کی یہ خامی رفع کرنے اور اس کی صلاحیتوں کو بلند کرنے کے لئے خاص کوشش کرنا ضروری ہے۔ میرا خیال ہے کہ ۱۹۳۳ء میں یا اس کے لگ بھگ الٰہ آباد میں جو اتحاد کانفرنس ہوئی تھی وہاں سرکاری ملازمتوں کے بارے میں باہمی مشورے سے ایک تسلی بخش حل تلاش کر لیا گیا تھا۔

۴۔ جہاں تک کلچر کی حفاظت کا تعلق ہے کانگرس بالکل آمادہ ہے کہ دستور کے بنیادی قوانین میں اس شق کا اندراج کیا جائے۔ علاوہ ازیں کانگرس اعلان کر چکی ہے کہ وہ کسی اقلیت کے پرسنل لاء میں کسی طرح بھی دخل انداز نہیں ہوگی۔

۵۔ میں اس تجویز سے بے حد حیران ہوں کہ مسجد شہید گنج کا جو قضیہ اس وقت چل رہا ہے اس کا تصفیہ کانگرس کرائے۔ اس جھگڑے کا فیصلہ عدالت میں ہونا چاہئے یا باہمی مصالحت سے۔ کانگرس ذاتی طور پر اس قسم کی باتوں میں مصالحت کے اصول کو ترجیح دیتی ہے۔ اگر فریقین مصالحت یا مفاہمت کی تحریک کریں تو کانگرس اس خدمت کے لئے آمادہ ہے۔ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی ہے کہ پنجاب کے وزیر اعظم نے بھی یہی مشورہ دیا ہے کہ فریقین کو باہمی مصالحت سے کام لینا چاہئے۔

۶۔ مذہبی رسوم ادا کرنے کا حق یقیناً تمام فرقوں کو ملنا چاہئے۔ کانگرس کی قرار داد اس بارے میں بالکل واضح ہے۔ پنجاب کے جس گاؤں میں جھگڑا چل رہا ہے اس کا حال مجھے بالکل معلوم نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ایسی بہت سی مثالیں جمع کی جا سکتی ہیں جہاں مذہبی رسوم کی ادائیگی کے سلسلے میں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں میں چھوٹے چھوٹے جھگڑے چلتے رہتے ہیں۔ ان کو سمجھ داری اور عقل مندی سے سلجھانے کی ضرورت ہے، لیکن جہاں تک اصول کا تعلق ہے وہ بالکل درست ہے اور اس کی پابندی لازم ہے۔

۷۔ گاؤ کشی کے متعلق گزارش ہے کہ بالکل غلط اور بے بنیاد پراپیگنڈا کیا جا رہا ہے کہ کانگرس ایک قانون بنا کر زبردستی اسے روکنا چاہتی ہے۔ کانگرس ہرگز اس قسم کا کوئی قانون بنانے کا ارادہ نہیں رکھتی اور نہ وہ مسلمانوں کے ایک تسلیم شدہ حق میں رخنہ ڈالنا پسند کرتی

ہے۔

۸۔ صوبوں کی حد بندی کا سوال ہنوز پیدا نہیں ہوا۔ مستقبل میں یہ مسئلہ کبھی رونما ہوا تو متعلقہ فریقوں کی رضامندی اور مفاہمت سے طے کیا جائے گا۔

۹۔ بندے ماترم کے گیت کے متعلق گزارش ہے کہ ورکنگ کمیٹی نے پچھلے اکتوبر میں ایک بیان شائع کیا تھا جس کی طرف آپ کی توجہ منعطف کرنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے تو یہ امر یاد رکھنا ضروری ہے کہ کانگرس نے اب تک کوئی قومی ترانہ باقاعدہ اور رسمی طور پر اختیار نہیں کیا۔ یہ صحیح ہے کہ گزشتہ تیس سال سے بندے ماترم کا گیت ہماری قومی جدوجہد سے وابستہ چلا آرہا ہے اور اس کے ساتھ بہت سی یادیں اور قربانیاں پیوست ہو گئی ہیں۔ مقبول عام گیت فرمائش سے نہیں لکھوائے جاتے نہ لوگوں پر خارجی دباؤ سے مسلط کئے جا سکتے ہیں۔ یہ تو خود بخود جذبات کی دنیا میں جنم لیتے ہیں۔ گزشتہ تیس، چالیس سال سے بندے ماترم کو قومی ترانہ سمجھا جارہا ہے جس میں ہندوستان کی مدح و ستائش کی گئی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اب تک کسی نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا، البتہ برطانوی حکومت کو اعتراض ضرور رہا ہے اور وہ بھی سراسر سیاسی نوعیت کا۔ بہرحال جب بعض اعتراض سننے میں آئے تو ورکنگ کمیٹی نے غور کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ قومی پلیٹ فارم پر اس گیت کے بعض ایسے ٹکڑے نہ گائے جائیں جن سے کچھ تمثیلی اشارے نکلتے ہیں۔ گیت کے دو بند جو ورکنگ کمیٹی کی اجازت سے بطور قومی ترانے کے آج کل پڑھے جاتے ہیں بالکل بے ضرر ہیں اور ان میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو کسی کے لئے باعث آزار ہو اور مجھے یہ سن کر تعجب ہوا ہے کہ اس ترمیم شدہ گیت پر بھی کچھ لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ یہ دونوں بند بعض لوگوں کو کم متاثر کرتے ہیں، بعض کو زیادہ۔ جو لوگ کسی اور گیت کو قومی ترانہ بنانا چاہتے ہیں بخوشی بنالیں، لیکن یہ چیز قومی تحریک کے لئے نقصان رساں اور لوگوں کے لئے تکلیف دہ ہے کہ عوام کو ایک ایسا ترانہ ترک کرنے پر مجبور کیا جائے جس کے ساتھ وہ عرصہ دراز سے وابستہ ہو چکے ہیں اور جسے وہ عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

۱۰۔ اردو اور ہندی کے متعلق میں پہلے بھی آپ کو لکھ چکا ہوں اور اس سلسلے میں اپنا ایک پمفلٹ بعنوان "زبان کا مسئلہ" بھی آپ کو بھیجا تھا۔ کانگرس زبان اور کلچر کے تحفظ کا یقین دلا چکی ہے، میری خواہش ہے کہ تمام بڑی بڑی صوبائی زبانوں کو فروغ دینا چاہئے لیکن ساتھ ہی ہندوستانی کو، جو اردو اور ہندی دونوں قسم کے رسم الخط میں لکھی جائے گی، ملک کی قومی زبان قرار دیا جائے، دونوں رسم الخط باضابطہ سرکاری طور پر تسلیم کئے جائیں گے اور یہ

لوگوں پر منحصر ہو گا کہ جو رسم الخط چاہیں اختیار کریں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ کانگرسی وزارتیں اسی پالیسی پر عمل کر رہی ہیں۔

۱۱۔ کانگرس کا مدت سے یہ خیال ہے کہ مخلوط انتخاب کو جداگانہ انتخاب پر ترجیح دینی چاہئے کیونکہ مخلوط انتخاب سے قومی اتحاد اور یگانگت بہتر طریق سے پیدا ہو سکتی ہے لیکن مخلوط انتخاب کو ان لوگوں پر جو اسے قبول کرنے کو تیار نہیں، زبردستی مسلط نہیں کیا جا سکتا۔

اندریں حالات یہ امر بالکل واضح ہے کہ مخلوط انتخاب جبھی رائج کیا جائے گا کہ متعلقہ افراد اس پر آمادہ ہوں۔ لوکل باڈیز کے بارے میں یہی پالیسی ہے جس پر آج کل کانگرسی وزارتیں عمل کر رہی ہیں۔ حال ہی میں بمبئی کی لیجسلیٹو اسمبلی میں ایک مسودۂ قانون پیش کیا گیا تھا کہ لوکل باڈیز میں جداگانہ انتخاب اسی وقت تک برقرار رہے گا جب تک لوگ اپنی خوشی سے خود بخود مخلوط انتخاب قبول کرنے پر تیار نہ ہو جائیں۔ یہ اصول چودہ نکات کے نمبر ۵ کے ساتھ بالکل مطابقت رکھتا ہے جس میں درج ہے کہ فرقہ وارانہ نمائندگی جداگانہ انتخاب کے موجودہ اصول پر اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ آئندہ کبھی کوئی فرقہ اپنی مرضی سے جداگانہ انتخاب کا طریق ترک کر کے مخلوط انتخاب منظور کرنے پر آمادہ نہ ہو۔

میرے لئے یہ امر موجب حیرت ہے کہ بمبئی اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی نے اس مسودۂ قانون کی ہر چند کہ اس میں طریقہ انتخاب کو ترک کرنے یا برقرار رکھنے کا اختیار دیا گیا ہے، مخالفت کی حالانکہ یہ بل مسلم لیگ کی پالیسی کے عین مطابق ہے۔

میں اس ضمن میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ۱۹۲۹ء میں جب مسلم لیگ نے چودہ نکات کی قرارداد منظور کی تھی تو اس میں درج تھا کہ مسلمان اس وقت تک مخلوط انتخاب ہرگز قبول نہیں کریں گے جب تک کہ عملاً سندھ کو علیحدہ صوبے کی شکل نہ دے دی جائے، صوبہ سرحد میں اصلاحات نافذ نہ کی جائیں اور بلوچستان کو دیگر صوبہ جات ہند کی سطح پر نہ لایا جائے۔ اس وقت سے اب تک جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ان کے مطابق سندھ ایک علیحدہ صوبے کی صورت اختیار کر چکا ہے، صوبہ سرحد میں بھی اصلاحات کا نفاذ ہو چکا ہے اور جہاں تک بلوچستان کو دیگر صوبہ جات ہند کی سطح پر لانے کا مسئلہ ہے، کانگرس اس کی حامی ہے۔

۱۲۔ کانگرس نے پہلی مرتبہ ۱۹۲۹ء میں ترنگے جھنڈے کو اپنا قومی پرچم قرار دیا تھا اور اس ضمن

میں مسلمانوں، سکھوں اور دوسری قوموں کے سربر آوردہ لیڈروں سے باقاعدہ مشورہ بھی کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کسی ملک اور اس کی قومی تحریک کی نشان دہی کے لئے ایک علیحدہ قومی پرچم کا ہونا لازمی ہے۔ اس قسم کا پرچم ملک اور اس کے اندر بسنے والے تمام فرقوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ کسی خاص فرقے کا پرچم پوری قوم کی نمائندگی کا دعویٰ کرنے سے قاصر ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ہمارا کوئی قومی پرچم اس وقت موجود نہیں تو کیا یہ ضروری نہیں کہ ہم اس قسم کا ایک پرچم وضع کریں؟

موجودہ پرچم کے تینوں رنگ ابتداء میں صرف اس خیال سے منتخب کئے گئے تھے کہ یہ رنگ ہندوستان کی تین بڑی قوموں کی نمائندگی کرتے ہیں، لیکن سچی بات یہ ہے کہ ہم پرچم کو فرقہ وارانہ نمائندگی کے جذبے سے آلودہ نہیں کرنا چاہتے۔ اگر محض آرٹ کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ذاتی طور پر میں زرد، سپید اور سبز رنگوں کے امتزاج کو نہایت حسین خیال کرتا ہوں اور میری رائے میں ہمارا موجودہ پرچم دنیا کا سب سے خوبصورت جھنڈا ہے۔

پچھلے کئی سال سے ہم یہ پرچم ہندوستان کے دور دراز گوشوں تک پہنچا چکے ہیں۔ اس کے ساتھ عوام کی امیدیں، آرزوئیں، اور امنگیں وابستہ ہو گئی ہیں، بے شمار لوگوں نے جن میں ہندو، مسلمان اور سکھ شامل ہیں اس پرچم کی حرمت اور حفاظت کی خاطر حکومت کی لاٹھیاں کھائیں، قید و بند کے شدائد برداشت کئے اور اپنی جانیں قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس جھنڈے سے ہمیں ایک زبردست جذباتی عقیدت پیدا ہو گئی ہے۔ بے شمار موقعوں پر مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور مسلم لیگ کے اکثر موجودہ لیڈر اس پرچم سے اپنی محبت و شیفتگی کا اظہار کر چکے ہیں اور انہوں نے اسے ہندوستان کے اتحاد کا مظہر قرار دیا تھا۔ کانگرسی حلقوں سے باہر بھی اس جھنڈے کا احترام کیا جا رہا ہے۔ یوں کہنا روا ہو گا کہ اب تو گویا اسے پوری ہندوستانی قوم کا پرچم قرار دیا جا رہا ہے۔ میں حیران ہوں کہ ان واقعات کی موجودگی میں کیونکر کوئی شخص اس جھنڈے پر اعتراض کر سکتا ہے۔

مختلف فرقوں کے جھنڈے ہرگز ایک قومی پرچم کی جگہ نہیں لے سکتے اگر یہ رسم چل نکلی تو بیک وقت بیسیوں فرقوں کے رنگ برنگ جھنڈے لہرانا شروع ہو جائیں گے اور یہ امر ہماری قومی وحدت کو پارہ پارہ کر دے گا۔ مذہبی تہواروں پر تو ہر فرقہ اپنا الگ جھنڈا کھڑا کرنے کا حق رکھتا ہے لیکن کسی قومی تقریب میں یا کسی ایسی پبلک عمارت پر جو تمام قوموں کے

مشترکہ استعمال کے لئے مخصوص ہو، فرقہ وارانہ پرچم کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔
میں یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ گزشتہ چند ماہ میں متعدد واقعات ایسے پیش آئے ہیں کہ مسلم لیگ کے رضا کاروں اور ممبروں نے ہمارے قومی پرچم کی توہین کی ہے جس سے ہمیں سخت رنج ہوا ہے لیکن محض اس خیال سے کہ کہیں فرقہ وارانہ کشیدگی نہ بھڑک اٹھے، ہم نے جوابی کارروائی سے در گزر کیا۔ ہم نے کانگریسی کارکنوں کو یہاں تک ہدایات جاری کر دی ہیں کہ اگر مسلم لیگ کے پرچم کی بے جا اور بے محل نمائش بھی کی جائے تو بھی صبر و ضبط اور تحمل سے کام لیں اور کچھ نہ کہیں۔

۱۳۔ رہی یہ بات کہ مسلم لیگ کو مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کیا جائے۔ میں صاف عرض کر دوں کہ میں اس مطالبے کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہوں۔ ظاہر ہے کہ مسلم لیگ ایک اہم فرقہ وارانہ جماعت ضرور ہے اور اس کی یہ حیثیت تسلیم کر کے ہی ہم آپ سے مراسلت کر رہے ہیں۔ اسی طرح اور بھی بہت سے ادارے اور افراد ہیں جن سے ہمیں وقتاً فوقتاً گفت و شنید کرنا پڑتی ہے۔ ہمارا یہ منصب نہیں کہ ان اداروں کی الگ الگ اہمیت اور حیثیت کا تعین کریں۔ کم سے کم ایک لاکھ مسلمان کانگرس کے ممبر بھی ہیں جن میں سے بہتوں نے ہمارے ساتھ قیدیں کاٹی ہیں اور جیل سے باہر بھی ہمارے کاموں میں شرکت کی ہے، ہمیں ان کی رفاقت اور دوستی کا فخر ہے۔ بہت سی انجمنیں ایسی بھی ہیں جن میں مسلم اور غیر مسلم یکساں کام کر رہے ہیں، مثلاً ٹریڈ یونین، کسان سبھا، قرضہ بورڈ، زمیندار ایسوسی ایشن، چیمبر آف کامرس، ایمپلائرز ایسوسی ایشن وغیرہ۔ بعض انجمنیں خالصتاً مسلمانوں کی ہیں جو ہماری توجہ کی مستحق ہیں مثلاً جمعیت العلماء، پرجا پارٹی، مجلس احرار وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ جس قدر اہم کوئی جماعت ہوگی اسی قدر زیادہ توجہ کی مستحق ٹھہرے گی، لیکن جماعت کی یہ اہمیت خود جماعت کی اندرونی طاقت سے پیدا ہوتی ہے محض دوسروں کے تسلیم کر لینے سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ دیگر جماعتوں کو خواہ ان کی عمریں نسبتاً کم ہیں یا ان کے ممبروں کی تعداد بھی نسبتاً تھوڑی ہے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

۱۴۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کولیشن یعنی مشترکہ وزارت سے آپ کی مراد کیا ہے؟ وزارت کے پیش نظر کسی واضح اور معین سیاسی اور اقتصادی پروگرام کا ہونا ضروری ہے، اس کے بغیر جو وزارت بھی بنے گی گویا بھان متی کا کنبہ ہو گا۔ اقتصادی اور سیاسی پروگرام کا اشتراک

ضروری ہے۔ آپ کو غالباً معلوم ہو گا کہ صوبہ سرحد میں وزارت کی تشکیل سے پہلے کانگرس نے فریق ثانی سے اس قسم کا اقتصادی اور سیاسی اشتراک حاصل کر لیا تھا جبھی وزارت مرتب کی تھی۔ بمبئی میں بھی کانگرس نے متعدد بار کوشش کی تھی کہ مشترکہ پروگرام کی بناء پر اس قسم کا تعاون حاصل ہو سکے۔ کانگرس محض اپنے خاص پروگرام کی تکمیل کے لئے اسمبلیوں میں شامل ہوئی ہے اور اسی پروگرام کی خاطر وہ دوسرے فریقوں سے تعاون کرنے کو بھی آمادہ ہے۔ قطع نظر اس سے کہ ان اسمبلیوں میں کانگرس کی اکثریت ہے یا اقلیت، اس نقطہ نگاہ کو سامنے رکھ کر میں مشترکہ وزارت کے وجود کو بھی برداشت کر سکتا ہوں لیکن اگر اس بنیادی حقیقت سے چشم پوشی کر لی جائے تو وزارت یا اسمبلی میں ہمارے لئے کوئی کشش باقی نہیں رہتی۔

جن امور کی نشان دہی آپ نے اپنے خط میں کی ہے اور جن کا ذکر اخبارات کے ان تراشوں میں بھی موجود ہے جو آپ نے ملفوف کر کے بھیجے ہیں، میں نے خاصی شرح و بسط سے بحث کی ہے۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ میں آپ سے خط و کتابت کرنے کے بعد آپ کے ذہن و فکر کو پہلے کی بہ نسبت بہتر طور سے سمجھنے لگا ہوں اور ان امور سے بھی آگاہی ہو گئی ہے جو اس وقت آپ کے اور آپ کے رفقاء کے پیش نظر ہیں، مجھے اس سے کلی اتفاق ہے کہ ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ متحدہ سعی و کوشش سے ہندوستان کی آزادی کے حصول کی کوشش کرے اور اس ملک کی زبوں حالی اور افلاس دور کرنے کی جدوجہد میں سرگرمی سے حصہ لے۔ جہاں تک میرا اور میرے دیگر ساتھیوں کا تعلق ہے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ کانگرس نے اس منزل کے حصول میں خاصی کاوش کی ہے۔ ہمارے لاکھوں ہم وطن ایسے ہیں جنہوں نے عقیدت و محبت سے کانگرس کی خاطر ہر قسم کی قربانیاں گوارا کیں اور یہ ان ہی قربانیوں کا نتیجہ ہے کہ آزادی کی منزل روز بروز قریب آ رہی ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ مسافت خاصی طویل اور پُر خطر ہے اور ہمیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔

ذاتی طور پر میں میثاق، پیکٹ یا معاہدے کی قسم کی چیز کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ ممکن ہے گاہے گاہے اس کی ضرورت محسوس ہو، لیکن جو چیز میرے نزدیک نسبتاً زیادہ اہم ہے، وہ یہ ہے کہ ہمارے درمیان ایک دوسرے کو سمجھنے اور پرکھنے کی بہتر صلاحیت ہونی چاہئے، تاکہ ہم زیادہ یکسوئی سے آپس میں اشتراک و تعاون کر سکیں۔ اس غرض کے لئے دو، ایک نہیں بلکہ لاکھوں انسانوں کا اشتراک و تعاون ضروری ہے حالانکہ انجام کار ہماری جدوجہد کا اثر لاکھوں، کروڑوں انسانوں پر پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ میرے تمام افکار کا مرکز ہندوستان کے وہ کروڑوں بے زبان

اور بدنصیب باشندے ہیں جو تن ڈھانکنے کو کپڑے اور پیٹ بھرنے کو روٹی کے محتاج ہیں۔ فرقہ وارانہ مسئلہ کو بھی میں اسی نقطہ نگاہ سے دیکھنا پسند کروں گا۔ ورنہ یہ مسئلہ میرے لئے کوئی جاذبیت اور اہمیت نہیں رکھتا۔

آپ نے میرے متعلق خیال کیا ہے کہ میں غالباً یہ چاہتا ہوں کہ آپ سائل کی طرح کانگرس کے سامنے اپنے مطالبات پیش کریں۔ میں نے ہرگز ایسا نہیں کہا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ نہ آپ سائل بن کر میرے سامنے درخواست پیش کر رہے ہیں اور نہ میں سائل کی حیثیت سے آپ کی خدمت میں معروضات پیش کر رہا ہوں۔ ہم تو زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ کی یہ بات بھی میری سمجھ میں نہیں آسکی کہ کانگرس کو چاہئے کہ باضابطہ سرکاری طور پر آپ سے مراسلت کرے۔ میں نے بھی تو مسلم لیگ سے باضابطہ اور سرکاری طور پر جواب طلب کرنے کی تحریک نہیں کی۔ معاف فرمایئے گا، جماعتیں اور ادارے اس طرح کام نہیں کیا کرتے۔ یہ ہمارے اپنے یا کانگرس کے وقار کا سوال نہیں اور نہ یہ مناسب ہے کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو ذاتی وقار کا مسئلہ بنالیا جائے۔ ہم تو اس مقصد کے حصول کی تگ و دو کر رہے ہیں جو ہمارے پیش نظر ہے۔

آپ کو یاد ہو گا کہ اس خط و کتابت کی ابتداء میری طرف سے ہوئی تھی اور میں نے ہی آپ کی خدمت میں پہلا خط لکھا تھا کہ براہ کرم ہمیں یہ تو بتایئے کہ اختلافی اور نزاعی امور ہیں کیا۔ میں نے اخبارات میں آپ کی بہت سی تقریریں پڑھی تھیں جن میں آپ نے کانگرس پر تابڑ توڑ حملے کئے تھے جو میرے نزدیک صحیح نہیں تھے۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ باہمی مراسلت سے اس قسم کی غلط فہمیوں کا ازالہ کروں تاکہ فضا صاف ہو سکے۔ بالخصوص اردو اخبارات میں اس کثرت سے کانگرس کے خلاف کذب و افتراء سے بھری ہوئی خبریں چھپتی ہیں کہ میں پڑھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ ایسی باتیں ہمارے ساتھ کیوں کر منسوب کی جاتی ہیں، جن کا وجود ہی نہیں۔ دو روز ہوئے یہاں کلکتہ میں مسلم لیگ کے سیکرٹری کی طرف سے ایک اشتہار شائع ہوا ہے جس میں یو۔ پی کی کانگرس وزارت کے خلاف متعدد الزامات عائد کر کے ان نام نہاد "جرائم" کی ایک فہرست درج کی گئی ہے حالانکہ میرے علم کے مطابق ان عائد کردہ الزامات میں رتی بھر صداقت بھی نہیں اور مجھے یقین ہے کہ اس اشتہار کا سارا مواد اردو اخباروں سے حاصل کیا گیا ہے۔

ہمارے خلاف آئے دن تحریر و تقریر کے حربے استعمال کر کے اس شدت سے پراپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ فرقہ وارانہ جذبات میں روز بروز تلخی پیدا ہوتی جارہی ہے۔ اس صورت حال نے مجھے

بلاشبہ پریشان کر دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں نے نواب اسمٰعیل خاں کو خط لکھ کر درخواست کی تھی کہ پبلک زندگی میں جو روز افزوں انحطاط پیدا ہو رہا ہے اس کی اصلاح کی کوشش کرنا چاہئے تاکہ ہمارے باہمی اتحاد اور تعاون کی صورت نکل آئے۔ افسوس کہ حالات میں کوئی خوشگوار تبدیلی نہیں ہوئی تاہم میں مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔

میں نے اس خط کے شروع میں بین الاقوامی صورت حال کی نزاکت کا بھی ذکر کیا تھا، جو کسی آنے والے خوفناک طوفان کی علامت ہے۔ میں اس سوچ میں غرق ہوں کہ اگر جنگ چھڑ گئی تو ہندوستان کا حشر کیا ہو گا۔ ہمارے باہمی اختلاف کی نوعیت خواہ کچھ ہو ہمارا فرض ہے کہ ایسے نازک وقت میں جبکہ پوری دنیا گویا آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر کھڑی ہے ہم اپنے وطن اور اہلِ وطن کو تباہی سے بچانے کی سرتوڑ کوشش کریں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے بار بار آپ کو اور بعض دوسرے احباب کو بھی لکھا ہے کہ ہمیں اپنی صفوں میں انتشار کی بجائے اتفاق پیدا کرنا چاہئے۔

میں یہاں ایک چھوٹی سی بات کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں نے ہری پورہ میں جو تقریر کی تھی اس کی صحیح رپورٹ اس اخبار میں شائع نہیں ہوئی جس کا تراشہ آپ نے ارسال فرمایا ہے اور جس کا ذکر آپ نے اپنے خط میں بھی کیا ہے۔

ہمارے درمیان جو خط و کتابت ہو رہی ہے اس کے بارے میں قسم قسم کی افواہیں عوام میں پھیل رہی ہیں اور بہت سے لوگوں نے مجھ سے استفسار بھی کیا ہے کہ آخر ہم دونوں کس موضوع پر ایک دوسرے کو خطوط بھیج رہے ہیں۔ ممکن ہے آپ کو بھی اس قسم کے استفسارات موصول ہوئے ہوں۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام خط و کتابت اخباروں میں شائع کر دی جائے تاکہ عوام بھی حقیقت حال سے آگاہ ہو سکیں۔ میرا خیال ہے آپ کو اس تجویز پر چنداں اعتراض نہ ہو گا۔

مخلص

جواہرلال نہرو

---

## جناح

بمبئی ۱۲۔ اپریل ۱۹۳۸ء

ڈیئر مسٹر نہرو۔ آپ کا ۶۔ اپریل کا مکتوب ملا۔ آپ نے یہ اطلاع دے کر مجھے بے حد ممنون فرمایا کہ عنقریب آپ واپس الٰہ آباد جانے والے ہیں اور غالباً اپریل کا بیشتر حصہ

وہیں گزاریں گے۔ آپ لکھتے ہیں کہ اگر ممکن ہو تو میں اس دوران میں الہ آباد آکر آپ سے ملوں اور اگر الہ آباد آنا ممکن نہ ہو تو پھر میں لکھنؤ حاضر ہو جاؤں تاکہ آپ بھی وہاں پہنچ سکیں۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ میں اپنی گوناگوں مصروفیتوں کی وجہ سے سردست الہ آباد یا لکھنؤ حاضر ہونے سے معذور ہوں۔ البتہ اپریل کے آخر میں بمبئی میں ہوں گا اگر ان دنوں آپ یہاں تشریف لا سکیں تو مجھے آپ کی ملاقات سے یقیناً مسرت ہوگی۔

رہا آپ کے خط کا باقی حصہ سو گزارش ہے کہ اسے پڑھ کر مجھے سخت کوفت اور تکلیف ہوئی ہے۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا آپ میرے خط کا صحیح مفہوم بھی اخذ نہیں کر سکے۔ آپ نے خود نہایت صفائی سے اعتراف کیا ہے کہ بین الاقوامی حالات کی نزاکت اور آنے والی جنگ کی ہولناکیوں نے آپ کے دل و دماغ کو ازحد متأثر کیا ہے اور غالباً ان ہی تاثرات کے تحت آپ نے ہندوستان کے اندرونی حالات سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔

افسوس ہے کہ آپ نے میرے الفاظ کو توڑ مروڑ کر یکسر نئے معنی پہنانے کی کوشش کی ہے۔ میں نے آپ کی درخواست پر جو صورت حال آپ کے سامنے پیش کی تھی اس کو بھی آپ نے اپنی عجیب و غریب تاویلوں سے کچھ کا کچھ بنا دیا ہے۔ اسکے علاوہ آپ نے خود ہی بعض مفروضے مرتب کئے ہیں اور انہیں میری تجاویز قرار دے کر خط کے ابتدائی حصے میں ان پر بحث شروع کر دی ہے۔ میں نے آپ کو اخبارات کے تراشے صرف اس لئے بھیجے تھے کہ بار بار آپ نے درخواست کی تھی کہ میں ایسی تحریروں یا تقریروں کا حوالہ دوں جس سے آپ معاملات کو بہتر طریق پر سمجھ سکیں۔ میں نے آپ کی اسی درخواست کو صحیح سمجھ کر وہ تراشے ارسال کئے تھے۔

مسلمانان ہند کو جن باتوں نے اس وقت مضطرب و پریشان کر رکھا ہے ان میں سے چند امور یہ بھی ہیں جن کا ذکر ان تراشوں میں کیا گیا ہے۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ ہر قوم پرست شخص کا فرض ہے کہ ایسے طریقے اختیار کرے جن سے ان شکایات کا ازالہ ہو سکے۔ رہی یہ بات کہ ازالہ کس طرح ہو؟ ملک کے کانسٹی ٹیوشن میں تبدیلیاں کرنے سے یا باہمی معاہدے سے یا کنونشن منعقد کرنے سے؟ اس کا فیصلہ ہم اکٹھے بیٹھ کر بحث و تمحیص سے کر سکتے ہیں۔

تاہم مجھے یہ دیکھ کر سخت رنج ہوا ہے کہ آپ نے اپنے خط میں بہت سے امور پر یک طرفہ فیصلہ صادر کر دیا ہے اور وہ بھی اس انداز سے کہ باہمی مشاورت کا دروازہ گویا بند کر کے رکھ دیا ہے۔ مثلاً آپ لکھتے ہیں کہ:

"اس فہرست کو دیکھ کر مجھے تعجب ہوا کیونکہ مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ آپ ان مسائل پر ہم سے گفتگو کرنے کے خواہش مند ہیں، اس لئے کہ

ان میں سے چند ایک کا تصفیہ تو کانگرس بہت پہلے سے کر چکی ہے اور جو باقی رہ گئے ہیں وہ بمشکل کسی قسم کے بحث کے متحمل ہو سکتے ہیں"۔

آپ کی عبارت اور آپ کے انداز تحریر سے پھر اس رعونت اور جنگ جوئی کا اظہار ہوتا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے گویا کانگرس ایک ہمہ گیر اور ہمہ اقتدار جماعت ہے۔ اس کا ثبوت آپ کے ان الفاظ سے ملتا ہے جن میں آپ نے نہایت سرپرستانہ اور مربیانہ انداز میں لکھا ہے کہ:

"ظاہر ہے کہ مسلم لیگ ایک اہم فرقہ وارانہ جماعت ضرور ہے اور ہم اس کی یہ حیثیت تسلیم کر کے ہی آپ سے مراسلت کر رہے ہیں۔ اسی طرح اور بھی بہت سے ادارے اور افراد ہیں جن سے ہمیں وقتاً فوقتاً گفت و شنید کرنا پڑتی ہے۔ ہمارا یہ منصب نہیں کہ ان اداروں کی الگ الگ اہمیت اور حیثیت کا تعین کریں"۔

اتنا کہہ کر آپ نے بعض اور انجمنوں کے نام بھی گنوا دیئے ہیں۔ میں یہاں آپ سے صاف صاف کہنا چاہتا ہوں کہ جب تک کانگرس مسلم لیگ کو اپنے مساوی اور ہم پلہ جماعت نہیں قرار دے گی اور اسی حیثیت سے اس کے ساتھ ہندو مسلم تصفیے کی بات چیت نہیں کرے گی، ہم اس وقت کا بے شک انتظار کریں گے، جب ہم محض اپنی طاقت کے بل پر مسلم لیگ کی اہمیت اور حیثیت کا تعین کروا سکیں۔

آپ کی ذہنیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے میرے لئے سخت مشکل ہے کہ آپ کو حقیقت حال سمجھا سکوں۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ میں خط و کتابت کے ذریعہ سے ان جملہ امور پر بحث کرنے کو تیار نہیں ہوں جن کا ذکر آپ نے کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ طریقہ موزوں نہیں۔

آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اردو کے اخبارات میں کانگرس کے متعلق بہت سی غلط اور جھوٹی باتیں شائع ہو رہی ہیں جس سے آپ سخت رنجیدہ ہیں۔ اس سلسلے میں آپ نے کسی گشتی مراسلے کا ذکر بھی کیا ہے جس میں یوپی کی حکومت پر بہت سے الزامات لگائے گئے ہیں۔ میں جب تک ان امور کی خود تحقیق نہ کر لوں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ لیکن اگر آپ الزام تراشی کرنا چاہتے ہیں تو میں ایسی بے شمار مثالیں پیش کر سکتا ہوں جہاں ہر روز کانگرسی اخبار اور کانگرسی کارکن، آل انڈیا مسلم لیگ اور اس کے لیڈروں اور کارکنوں کے خلاف بہتان اور اتہام کے طوفان اٹھا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ جتنی مثالیں آپ چاہیں میں پیش کرنے کو تیار ہوں جہاں کانگرسی اخبار اور کانگرسی لیڈر بنگال، سندھ، پنجاب اور آسام کی وزارتوں کے خلاف جن میں مسلمانوں کا عنصر زیادہ ہے، طرح طرح کی غلط بیانیاں اور افترا پردازیاں محض اس نیت سے پھیلا رہے ہیں کہ ان وزارتوں کو پاش

پاش کیا جائے لیکن ان باتوں سے کچھ حاصل نہیں اور نہ اس موضوع پر ہم یہ مراسلت کر رہے ہیں۔

جہاں تک آپ کی اس درخواست کا تعلق ہے کہ ہماری خط و کتابت اخباروں میں شائع کر دی جائے مجھے کوئی اعتراض نہیں، بشرطیکہ میری اور مسٹر گاندھی کی خط و کتابت بھی ایک ہی ساتھ اشاعت کے لئے دے دی جائے۔ مہربانی فرما کر مہاتما گاندھی سے اس کی اجازت لے لیجئے یا اگر آپ کہیں تو میں براہِ راست ان کو مطلع کر دوں کہ ہم اپنی خط و کتابت اخباروں میں شائع کر رہے ہیں لہٰذا انہیں اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔

مخلص

ایم۔ اے۔ جناح

---

نہرو

الہ آباد ۱۶۔ اپریل ۱۹۳۸ء

ڈیئر مسٹر جناح آپ کا خط محررہ ۱۲۔ اپریل موصول ہوا، مجھے سخت افسوس ہے کہ میری تحریر آپ کے لئے موجب تکلیف ثابت ہوئی۔ یہ صحیح ہے کہ ہم سیاسی امور کو مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہیں، یہی وجہ ہے کہ میں اپنا نقطۂ نگاہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں کہ آپ اس پر غور فرمائیں۔ یہ غرض قطعاً نہیں کہ آپ کو کسی قسم کی تکلیف پہنچے۔ اگر ایسا ہوا تو خود میرا مقصد فوت ہو جائے گا، یوں بھی اسے میری گستاخی تصور کیا جائے گا۔ بایں ہمہ میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ معاملہ زیر بحث پر صاف صاف اپنی رائے اور اپنا ردِ عمل آپ کے سامنے رکھ دوں۔ ہمارے نقطہ ہائے نگاہ میں اختلاف ہو تو ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم صفائی سے اپنے خیالات ایک دوسرے کے سامنے پیش کریں تو کسی حد تک اس باہمی اختلاف کے کم ہونے کا امکان ہے۔ میں نے نہایت خلوص سے یہی طرز عمل اختیار کیا ہے اور ایسی خفیف سے خفیف بات کہنے سے بھی گریز کیا ہے جس سے اصل مدعا و مقصود کو گزند پہنچے۔

میں نے اپنے گزشتہ مکتوب میں ایک ایک کر کے ان جملہ امور پر بحث کی تھی جن کا اخباری تراشہ آپ نے بھیجا تھا۔ آپ ہی نے چونکہ ان امور کی طرف میری توجہ دلائی تھی اس لئے میرا خیال تھا کہ یہی باتیں آپ کے ذہن میں ہوں گی۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں نے بار بار آپ سے عرض کیا تھا کہ اختلافی اور نزاعی امور سے مجھے آگاہ فرمایئے، چنانچہ جب یہ تراشہ ملا تو میں نے فقط اتنا عرض کیا کہ

ان مطالبات کے بارے میں کانگرس کا طرز عمل کیا ہے۔ سیاسی پالیسی ایک ایسی چیز ہے جس میں کوئی قطعی رائے نہیں دی جا سکتی۔ کانگرس اگر چاہے تو اپنی کسی پالیسی میں تبدیلی بھی کر سکتی ہے۔ میں تو صرف اتنا واضح کر سکتا ہوں کہ ماضی میں ہماری پالیسی کیا تھی اور اب کیا ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ میری عبارت سے رعونت اور جنگ جوئی کا اظہار ہوتا ہے۔ اور میں گویا کانگرس کو ایک ہمہ گیر اور ہمہ اقتدار جماعت سمجھتا ہوں۔ گزارش یہ ہے کہ کانگرس کے فکر و عمل کا احاطہ سینکڑوں چیزوں نے کر رکھا ہے اور اسے اپنی منزل مقصود تک پہنچنے میں آئندہ متعدد بار آزمائشوں اور تکلیفوں میں سے ہو کر گزرنا پڑے گا۔

آپ نے میرے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ میرے دل و دماغ کو بین الاقوامی حالات کی نزاکت اور آنے والی جنگ کی ہولناکیوں نے از حد متاثر کر رکھا ہے۔ اگر میرے دل و دماغ کی یہ کیفیت ہے اور مجھے اس سے انکار بھی نہیں، تو بتایئے کہ میں کیونکر اس طرف سے آنکھیں بند کر سکتا ہوں اور کیوں کر کانگرس کو ایک ہمہ گیر اور ہمہ اقتدار جماعت خیال کر سکتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب میں ایک کانگرسی کی حیثیت سے کانگرس کی پالیسیوں پر بحث کرتا ہوں تو صرف ان پالیسیوں کی وضاحت کر دیتا ہوں، میری ذاتی رائے اگر ان پالیسیوں سے مختلف بھی ہو تو میں اسے قطعاً زیر بحث نہیں لاتا۔

آپ فرماتے ہیں کہ مسلم لیگ اور اس کے بعض لیڈروں اور بنگال، پنجاب، سندھ اور آسام کی صوبائی حکومتوں کے متعلق کانگرسی اخباروں میں بہت سی غلط اور جھوٹی باتیں چھپتی رہتی ہیں۔ اس ضمن میں مجھے آپ سے کلی اتفاق ہے کہ جھوٹ، غلط بیانی اور بہتان تراشی کا یقیناً سدباب کرنا چاہئے خواہ وہ اردو اخباروں میں پائی جائے یا ہندی اور انگریزی اخباروں میں اور چاہے اس اخبار کا کوئی سیاسی مسلک کیوں نہ ہو۔

اس ضمن میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ کانگرس کا اپنا کوئی اخبار نہیں البتہ یہ صحیح ہے کہ بعض اخبار کانگرس کی حمایت ضرور کرتے ہیں۔ ہم ان اخبارات پر اثر انداز ہو سکیں یا نہ ہو سکیں لیکن یہ ہم ضرور چاہتے ہیں کہ اس قسم کی غلط بیانیاں، اتہام تراشیاں اور بہتان طرازیاں قطعی بند کر دینی چاہئیں۔ اس سلسلے میں میری گزارش ہے کہ آپ ایسے واقعات کی نشان دہی کیجئے تاکہ اس جانب ضروری قدم اٹھایا جا سکے۔

آپ نے میری اور اپنی اور مہاتما گاندھی کی خط و کتابت شائع کرنے کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے میں اس سلسلے میں آپ کے حسب خواہش مہاتما جی سے اجازت حاصل کرنے کے لئے ان کو

خط لکھ رہا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اپریل میں یا مئی میں بمبئی آنے سے معذور ہوں، جون کے اوائل میں میں یورپ روانہ ہو جاؤں گا بہرصورت اگر مجھے اس سے قبل بمبئی آنے کا اتفاق ہوا تو میں آپ کو ضرور مطلع کروں گا۔ شاید ہماری ملاقات ہو سکے۔ میرا خیال ہے آپ عنقریب مہاتما گاندھی سے مل رہے ہیں۔

مخلص

جواہر لال نہرو

---

نہرو اور جناح کی مندرجہ بالا خط و کتابت پڑھ لیجئے اور ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھئے کہ وہ زمانہ مسلم لیگ کی تحریک کا بالکل ابتدائی دور تھا۔ اجلاس لکھنؤ کو ہنوز صرف چار مہینے گزرے تھے۔ مسلم لیگ آہستہ آہستہ عوام کے دل و دماغ میں گھر کر رہی تھی اور کانگرسی لیڈر مسلمانوں کی اس عوامی طاقت سے پوری طرح باخبر نہیں ہوئے تھے جو آگے چل کر جناح کے جھنڈے کے نیچے ایک طوفان بن کر اٹھنے والی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ پنڈت نہرو بار بار اپنے خطوں میں لکھتے ہیں کہ کانگرس ہندوستان کی واحد نمائندہ قومی جماعت ہے۔

اب یہ جناح کا کام تھا کہ اس چیلنج کے جواب میں اس وقت کا انتظار کرے جب وہ محض اپنی اور اپنی قوم کی طاقت کی بناء پر مسلم لیگ کو مسلمانان ہند کی تنہا نمائندہ جماعت تسلیم کرا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ جناح نے اپنے آخری خط میں یہ فقرہ بھی لکھا ہے کہ:

> ”میں یہاں آپ سے صاف صاف کہنا چاہتا ہوں کہ جب تک کانگرس، مسلم لیگ کو اپنے مساوی اور ہم پلہ جماعت قرار نہیں دے گی اور اسی حیثیت سے اس کے ساتھ ہندو، مسلم تصفیے کی بات چیت نہیں کرے گی، ہم اس وقت کا بے شک انتظار کریں گے جب ہم محض اپنی ذاتی طاقت کے بل پر مسلم لیگ کی اہمیت اور حیثیت کا تعین کروا سکیں“۔

جناح کا یہ بلیغ اور معنی خیز فقرہ اور حقیقت کا یہ ناقابل تردید تجزیہ آگے چل کر ہندو، مسلم اتحاد ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی قسمت کا بھی فیصلہ کرنے والا تھا۔ افسوس ہے کہ کانگرس کے ہندو لیڈر خود فریبی، رعونت اور تکبر کے حصار میں بیٹھ کر حالات کا صحیح جائزہ لینے کی حس تمیزی سے محروم ہو چکے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ چند کرائے کے مسلمانوں کی آڑ لے کر وہ جناح کو شکست دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

مجھے یہاں مسلمانوں کی قومی تاریخ کا ایک مشہور واقعہ یاد آ گیا ہے جو اپنی نوعیت اور کیفیت کے اعتبار سے ہمارے ساتھ بہت کچھ مطابقت رکھتا ہے۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں ترکوں کو شکست ہوئی تھی اور ترکی سلطنت پارہ پارہ ہو گئی تھی، درہ دانیال اور دارالخلافہ استنبول پر فرانس، برطانیہ اور اٹلی کا قبضہ تھا۔ سمرنا پر یونانی فوجیں ڈیرہ ڈال چکی تھیں۔ ایشیائے کوچک اور اناطولیہ کے تمام اہم مقامات بھی غنیم کے قبضے میں تھے۔ خود سلطان اپنے محل میں ایک قیدی کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہا تھا۔ انگریزوں کے ایماء پر شیخ الاسلام نے مصطفیٰ کمال پاشا کو کافر اور باغی قرار دے کر قتل کا فتویٰ صادر کر دیا تھا۔

ان یاس انگیز حالات اور حد درجہ بے سروسامانی کے عالم میں ۲۳۔ اپریل ۱۹۲۰ء کو مصطفیٰ کمال پاشا نے سیواس کے مقام پر اپنے چند ساتھیوں کی ایک کانفرنس منعقد کی جسے مجلس کبیر ملی (گرینڈ نیشنل اسمبلی) کا نام دیا اور ببانگ دہل اعلان کیا کہ:

"مجلس کبیر ملی آج سے ترکیہ کی حکمران ہے اور آئندہ قوم کی جائز، صحیح اور مستند نمائندگی یہی مجلس کرے گی۔ حاکمیت کسی فرد واحد کی میراث نہیں۔ یہ پوری قوم کی ملکیت ہے۔ اور مجلس کبیر ملی چونکہ قوم کی نمائندہ ہے لہٰذا حکومت کے تمام اختیارات اس مجلس کے قبضے میں چلے گئے ہیں۔ جب تک قسطنطنیہ پر غنیم قابض ہے سلطان اور اس کی حکومت کے احکام ہرگز قوم کے لئے واجب التعمیل نہیں، آج سے اس قسم کے جملہ احکام کو خلاف قانون قرار دیا جاتا ہے۔ ترک قوم نے اپنے ملک کی آزادی حاصل کرنے کا عزم صمیم کر لیا۔ ہم باعزت اور آبرومندانہ صلح کے لئے ہر وقت آمادہ ہیں لیکن صلح کرنے کی مجاز صرف مجلس کبیر ملی ہے"۔

جب سیواس کے دور افتادہ مقام سے چند خستہ حال غربت زدہ بے سروسامان اور فاقہ کش انسانوں کے ایک گروہ نے اس عزم آہنیں کا اعلان کیا تو برطانیہ کے وزیر خارجہ لارڈ گرے نے حقارت اور تمسخر سے مصطفیٰ کمال پاشا کا مذاق اڑایا، جواب میں مصطفیٰ کمال نے کہا:

"ان فرعون صفت، متکبر انگریزوں کو میں ایسا سبق سکھانا چاہتا ہوں جس سے ان کے دماغ سے رعونت کا کیڑا نکل جائے اور انہیں یقین ہو جائے کہ ترک ہر لحاظ سے ان کے برابر ہیں، ہم اپنے خون کے آخری قطرے اور اپنی زندگی کی آخری رمق تک ان کا مقابلہ کریں گے اور جس

تہذیب پر ان انگریزوں کو بہت ناز ہے میں اس تہذیب کا بھانڈا خود ان ہی کے سر پر پھوڑوں گا۔ ا۔

تاریخ کا فیصلہ ہمارے سامنے ہے کہ مصطفیٰ کمال پاشا کا ایک ایک لفظ درست ثابت ہوا اور برطانیہ کے متکبر و مغرور وزیر اعظم لائڈ جارج کو بالآخر مصطفیٰ کمال کی طاقت کے سامنے جھکنا پڑا اور مجلس کبیر ملی کی آواز کو پوری ترک قوم کی جائز اور مستند آواز تسلیم کئے بغیر چارہ نہ رہا۔

جواہر لال اور گاندھی کے بارے میں بھی سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ یہ لوگ اس فریب میں مبتلا تھے کہ کانگرس ہندوستان کی تنہا نمائندہ جماعت ہے اور اس کی آواز پورے ہندوستان کی آواز ہے۔ ۱۹۳۱ء کی گول میز کانفرنس میں گاندھی نے یہی مطالبہ پیش کیا اور جگ ہنسائی کروائی۔ ۱۹۳۶ء کے الیکشن میں جواہر لال نے حد درجہ رعونت آمیز لہجے میں اعلان کیا کہ ہندوستان میں صرف دو فریق برسرپیکار ہیں، ایک ہے برطانوی حکومت اور دوسرا فریق ہے کانگرس، باقی جس قدر جماعتیں ہیں وہ ریت کے حقیر ذروں کی طرح اس آندھی میں اڑ جائیں گی۔

اس وقت بھی جناح نے للکار کر جواب دیا کہ ہندوستان میں دو نہیں تین فریق ہیں۔ یعنی برطانوی حکومت، کانگرس اور مسلمان، ہم نہ کانگرس کی حاشیہ برداری پر آمادہ ہیں اور نہ برطانوی حکومت کی کاسہ لیسی ہمارا شیوہ ہے۔ ہماری اپنی پالیسی ہے، اپنا پروگرام ہے، اپنا لائحہ عمل ہے۔

اس للکار پر کسی نے اعتبار کیا، کسی نے نہ کیا۔ بہرحال یہ مستقبل کا کام تھا کہ وہ جناح کے الفاظ کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کرے۔

---

1۔ Ataturk – By Irfan & Margarete Orga

(۵)

# پنجاب اور فوجی بھرتی

اس کتاب کے دوسرے باب میں فوجی بھرتی کے مسئلے پر مفصل بحث ہو چکی ہے اور یہ بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ سر سکندر حیات خان کی تحریک پر حکومت ہند نے فوجی بھرتی کی مخالفت کرنے والوں کی سزا کے لئے ایک خاص مسودۂ قانون مرکزی اسمبلی میں پیش کیا تھا جو مسلم لیگ پارٹی کی تائید و حمایت سے منظور ہوا تھا۔

۱۵۔ اگست ۱۹۳۸ء کو ڈیفنس سیکرٹری نے یہ مسودۂ قانون مرکزی اسمبلی میں پیش کیا اور ۲۵ اگست کو پاس ہو گیا۔ اس کے مہینہ بھر بعد ۲۷۔ ستمبر کو سر سکندر حیات خان نے پنجاب کے نئے گورنر سر ہنری کریک کے اعزاز میں شملہ میں ایک دعوت کی جہاں بہت سے سرکاری و غیر سرکاری اور انگریز اور دیسی مہمان مدعو تھے، دعوت کے اختتام پر سر سکندر نے نئے گورنر کا خیر مقدم کرنے کے بعد اپنی تقریر میں بین الاقوامی صورت حال کا بھی جائزہ لیا اور ہٹلر کے جارحانہ اقدام اور برطانیہ کے وزیر اعظم نیول چیمبرلین کی مصالحانہ کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ:

"آج دنیا کا امن و امان ایک سخت نازک مرحلے سے گزر رہا ہے، آئندہ چند ہفتوں میں تقدیر اپنا اہم فیصلہ صادر کرنے والی ہے۔ اگر خدا نخواستہ یہ فیصلہ ہمارے حسب منشاء نہ ہوا اور جنگ کی تباہ کاریاں دنیا پر مسلط ہو گئیں تو جناب والا! میں آپ کو اور آپ کے توسل سے ملک معظم کی حکومت کو یقین دلاتا ہوں کہ پنجاب اپنی قدیم روایات سے سر موانحراف نہیں کرے گا اور پوری وفاداری سے آپ کا ساتھ دے گا۔ (چیئرز) میں کامل وثوق سے عرض کرتا ہوں کہ پنجاب کی فوجی جماعتوں کا ایک

ایک شخص، بوقت ضرورت ملک معظم کے جھنڈے کے نیچے کھڑا ہو کر اپنے سر دھڑ کی بازی لگانے سے دریغ نہیں کرے گا۔ میں ضروری خیال کرتا ہوں کہ اس وقت اہل پنجاب کی طرف سے یہ اعلان بھی کر دوں کہ ہم اپنی دوستی، وفاداری اور اشتراک و تعاون کا ہاتھ برطانیہ عظمیٰ کی طرف آج بھی حسب دستور سابق، بڑھانے کو تیار ہیں ـــــ یہ ہاتھ ہم نے اس وقت بھی برطانیہ کے ہاتھ میں دیا تھا جب ہمیں اس کی رہنمائی اور امداد کی ضرورت تھی۔

"یہ وہی ہاتھ ہے جو گزشتہ عالمگیر جنگ کے دوران میں ہم نے آپ کے ہاتھ میں بخوشی دیا تھا۔ اس وقت ہمارا سیاسی شعور ہنوز پختہ نہیں ہوا تھا اور ہم گویا سیاسی تعلیم و تربیت کی ابتدائی منزلیں طے کر رہے تھے۔ آج صورت حال مختلف ہے اور خدا کے فضل سے پنجاب سیاسی شعور کی پختگی کی منزل پر پہنچ چکا ہے۔ اس لئے ہم ایک مخلص اور احسان مند دوست کی طرح اپنا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں دے رہے ہیں۔ اس میں کسی قسم کے جبرو اکراہ کو دخل نہیں کیونکہ اہل پنجاب کو یقین ہے کہ برطانیہ کے ساتھ اپنا تعلق قائم رکھنا ہمارے وطن کی بہبود کے لئے ضروری ہے۔ اسی سلسلے میں کسی تعلّی یا تفاخر کا اظہار کئے بغیر میں یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ ہاتھ تلوار چلانا بھی خوب جانتا ہے اور مجھے امید ہے کہ ہندوستان کے دوسرے صوبے بھی اس نازک موقع پر پنجاب کی پیروی سے دریغ نہیں کریں گے۔ (چیئرز)

"میرے بعض ہم وطن کبھی کبھی بڑے اصرار سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہندوستان کو جو آئینی مراعات اس وقت حاصل ہیں وہ محض ہندوستانیوں کی سیاسی جدوجہد کا نتیجہ ہیں، مجھے اس رائے سے اختلاف ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان جن مراعات سے اس وقت متمتع ہو رہا ہے، وہ ان سرفروش ہندوستانی سپاہیوں کی قربانی کا ثمر ہے جنہوں نے گزشتہ عالمگیر جنگ میں برطانوی سلطنت کے دور دراز مقامات پر غنیم سے دست و گریبان ہو کر اپنے سر کٹوائے تھے۔ بہرحال یہ

ایک متنازع فیہ مسئلہ ہے جس پر بحث کرنا سردست بے سود ہے۔

"میں اپنے اہل ملک سے درخواست کرتا ہوں کہ وقت کی نزاکت کا احساس کر کے پنجاب کے ساتھ اشتراک و تعاون کریں، نہ اس لئے کہ برطانیہ کو ہماری امداد کی ضرورت ہے بلکہ اس لئے کہ خود ہمارے وطن کی سُود بہبود کا یہی تقاضا ہے۔"

"بہت ممکن ہے کہ ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ یورپ یا کسی اور ملک کے میدان جنگ میں ہو۔ بہرحال کہیں بھی ہو اور کچھ بھی ہو میں جناب والا کو یقین دلاتا ہوں کہ پنجاب جس کو ہندوستان کے بازوئے شمشیرزن کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے دکھ درد میں آپ کا شریک حال رہے گا، ہمارے تمام وسائل و ذرائع اور ہمارے فوجی جوان آپ کی خدمت کے لئے ہر وقت حاضر ہیں اور یقین کیجئے کہ یہ پیش کش کسی کاروباری یا تاجرانہ ذہنیت کے تحت نہیں کی جا رہی، نہ اس میں لین دین کا کوئی عنصر شامل ہے بلکہ قطعی رضاکارانہ اور غیر مشروط ہے۔ ہمارے صوبے کی روایات ہی ایسی ہیں کہ ہم اپنے دوستوں کو بوقت ضرورت ہمیشہ کھلے دل سے امداد دیا کرتے ہیں اور اس امداد و اعانت کو مختلف شرائط سے محدود و مشروط کرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں [۱]۔" (چیئرز)

سرسکندر کی تقریر کے جواب میں سرہنری کریک نے بڑے شاندار الفاظ میں شکریے کا اظہار کیا اور یہ بھی کہا کہ مجھے امید ہے کہ سرسکندر حیات خاں جیسے مدبر وزیراعظم کی قیادت میں اہلِ پنجاب اسی فراخ دلی سے برطانیہ کی مدد کریں گے، جس طرح انہوں نے گزشتہ جنگ یورپ میں کی تھی۔

سرسکندر کی اس تقریر کی بازگشت ہندوستان کے ہر گوشے میں سنائی دی۔ اور کانگرسی لیڈروں نے بہت برہم ہو ہو کر سرسکندر کو برا بھلا کہا کہ یہ کون شخص ہے جو ہم سے بالا بالا آنے والی جنگ میں برطانیہ کو جانی و مالی امداد دینے کا وعدہ کر رہا ہے۔ مدراس کے مشہور کانگرسی لیڈر ستیہ مورتی کا لہجہ ہمیشہ تیز و تند اور تلخ ہوتا تھا۔ چنانچہ اس موقع پر جو اخباری بیان انہوں نے سرسکندر کے

---

۱۔ روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" لاہور مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۹۳۸ء

خلاف دیا اس میں ضرورت سے زیادہ تلخی تھی۔

مسلم لیگ کے بعض حلقوں میں بھی سر سکندر کی اس تقریر پر تعجب بلکہ کسی قدر غم و غصہ کا اظہار کیا گیا کہ انہوں نے بصورت جنگ برطانیہ کی غیر مشروط امداد کا وعدہ کر کے ہندوستان کے مسلمانوں کے مفاد کو نقصان پہنچایا ہے۔ چنانچہ یوپی کے ایک مسلم لیگی ممبر ظہیر الحسن لاری نے نوٹس دے دیا کہ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے آئندہ اجلاس میں سر سکندر کی اس تقریر کے خلاف مذمت کی قرارداد پیش کریں گے۔

سر سکندر کی اس تقریر پر غور کرنے یا اس کے حسن و قبح کا فیصلہ کرتے وقت دو ایک باتوں کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اول یہ کہ جیسا کہ میں اس کتاب کے دوسرے باب میں عرض کر چکا ہوں، فوجی بھرتی کے مسئلے نے بھی فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر لیا تھا۔ فوج میں شمالی ہند کے مسلمانوں کا عنصر زیادہ تھا جسے ہندو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ اور ہمیشہ اس کوشش میں رہتے تھے کہ اس عنصر کو کم کر کے ہندوؤں کو زیادہ تعداد میں فوج میں بھرتی کروایا جائے، دوم یہ کہ اس مسئلے نے فرقہ وارانہ رنگ کے علاوہ اقتصادی اور سیاسی پہلو بھی اختیار کر لیا تھا۔ پنجاب کے بیشتر دیہاتی مسلمان غریب تھے، جنہیں فوجی ملازمت نے ایک اچھی قسم کا روزگار مہیا کر رکھا تھا اور اس روزگار سے انہیں محروم کرنا کسی طرح جائز نہیں تھا۔ اندازہ یہ ہے کہ پنجاب کے فوجیوں کو تنخواہ اور پنشن سے جس قدر روپیہ وصول ہوتا تھا اس کی مجموعی رقم چار کروڑ روپے سالانہ تھی ا۔

---

ا۔ لندن کی گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کا مطالبہ تھا کہ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں انہیں ۳۳ فی صد نشستیں دی جائیں' سر محمد شفیع نے اس مطالبے کی حمایت میں جو دلائل پیش کئے تھے ان میں ایک دلیل یہ بھی تھی کہ اگرچہ مسلمانوں کی آبادی ہندوستان میں ۲۵ فیصد ہے لیکن ملک کے دفاع کی بیشتر ذمے داری ان ہی پر عائد ہوتی ہے کیونکہ فوج میں ان کا عنصر زیادہ ہے۔ گویا فوجی ملازمت مسلمانوں کا ایک قومی اعزاز خیال کیا جاتا تھا۔

ایک اور واقعہ ہے' اگرچہ بہت بعد کا ہے لیکن اس سلسلے میں اس کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ لارڈ مونٹ بیٹن کے پریس سیکرٹری' کیمبل جانسن نے اپنی کتاب Mission With Mountbatten کے صفحہ نمبر ۵۸ پر ۸۔اپریل ۱۹۴۷ء کی ڈائری کے تحت لکھا ہے۔

"آج سٹاف میٹنگ میں لیاقت علی خاں کا ایک خط پڑھ کر سنایا گیا جس میں یہ شکایت درج تھی کہ فوج میں مسلمانوں کی تعداد ناکافی ہے۔ نیز یہ کہ فوجوں کو بلا توقف دوبارہ مرتب کیا جائے تاکہ وقت آنے پر انہیں فوراً پاکستان اور ہندوستان میں تقسیم کیا جا سکے۔"

جنرل سر جارج بیرو نے ہندوستان کے ایک سابق کمانڈر انچیف، جنرل سر چارلس مونرو کی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ:

"ہندوستان کے حالات انگلستان سے بالکل مختلف ہیں، یورپین ممالک میں فوجی بھرتی کا یہ قاعدہ ہے کہ ساری قوم میں سے بلاتخصیص اچھے جوان بھرتی کر لئے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس ہندوستان میں قاعدہ یہ ہے کہ اس قسم کی بھرتی صرف ان اقوام میں سے کی جاتی ہے جو عام طور پر فوجی اقوام کہلاتی ہیں۔ یہ لوگ اگرچہ ذہنی اور تعلیمی اعتبار سے سول محکموں میں ملازمت کرنے والوں سے پست ہیں۔ لیکن اور باتوں میں اپنے آپ کو ان سے بہتر سمجھتے ہیں اور وکیلوں، منشیوں اور دفتروں کے کلرکوں کو کسی قدر حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں ـــــ غیر فوجی اقوام کے لوگ خاصے دولت مند اور خوشحال ہیں لیکن انہوں نے اب تک فوجی ملازمت کی صلاحیت کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا۔ تاہم اس بات کے خواہش مند بہت ہیں کہ اپنے بچوں کو فوج میں ملازم کرائیں تاکہ وہ بھی وردی پہن کر اور سینے پر فوجی تمغے سجا کر معاشرے میں اپنی برتری کا اظہار کر سکیں۔ ساہو کارے کا کام ترک کر کے فوجی زندگی کی مشقتوں کو اختیار کرنا آسان نہیں لیکن یہ سودا وہ صرف اس لئے کرنا چاہتے ہیں کہ عوام میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جائیں۔ مجھ سے ایک ہندو کلرک نے ایک دفعہ بڑی حسرت سے کہا تھا کہ میں اپنے بیٹے کو فوج میں بھرتی کروانا چاہتا ہوں جہاں وہ ترقی کرتا کرتا کسی روز کپتان بلکہ میجر بن جائے اور وردی پہن کر بہت سے تمغے اپنے سینے پر لگائے، خدا کرے وہ میری طرح دفتر کا بابو نہ بنے، ہم بابو لوگوں کو تو ہر روز افسروں کی جھڑکیاں اور گالیاں کھانی پڑتی ہیں۱۔"

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں ہندوستان نے ۶۸۳۰۰۰ فوجی رنگروٹ مہیا کئے تھے، جن میں سے ۳۵۰۰۰۰ جوان پنجاب سے بھرتی ہوئے تھے۔

سر جارج بیرو اپنی اسی کتاب میں لکھتے ہیں:

"پنجاب اور شمال مغربی صوبہ سرحد نے مل کر فوجی رنگروٹوں کی ساٹھ فی صد سے زیادہ تعداد مہیا کی تھی۔ یہ بالکل قدرتی اور فطری بات ہے کہ جنگ جو سپاہیوں کی بیشتر تعداد ان ہی دو صوبوں سے ہم کو میسر آ سکتی ہے۔ اس لئے کہ جو قومیں یہاں آباد ہیں وہ جسمانی طاقت و توانائی اور عسکری روایات کے لحاظ سے ہندوستان کے دیگر صوبوں کے باشندوں سے افضل ہیں۔ پنجاب اور صوبہ سرحد کی مجموعی آبادی دو کروڑ بیس لاکھ ہے لیکن ان دو صوبوں نے جتنے فوجی جوان گزشتہ جنگ عظیم میں بھرتی کرائے ان کی برابری باقی ہندوستان کی تیئس کروڑ آبادی بھی نہ کر سکی"۔

سر ہنری کریک کی دعوت سے ایک سال قبل جب وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو سرکاری دورے پر لاہور آئے تھے تو ان کے اعزاز میں سر سکندر حیات خان نے ۲۳۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو شالا مار باغ میں ایک بہت بڑی گارڈن پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ وہاں بھی وائسرائے کو ایڈریس پیش کرتے وقت بہت التزام سے پنجاب کی فوجی خدمات کی پیشکش کی گئی تھی اور عرض کیا گیا تھا کہ اگر یورپ میں جنگ چھڑ گئی تو پنجاب کی فوجی اقوام دل کھول کر برطانیہ کی مدد کریں گی۔

وائسرائے نے جواب میں شکریے کا اظہار کر کے کہا تھا۔

"پنجاب نے عسکری خدمات میں جو نام پیدا کیا ہے وہ واقعی قابل فخر ہے اور میں خوب جانتا ہوں کہ اس صوبے میں بہت سے خاندان ایسے ہیں جن کو یہ شان دار عسکری روایات ورثے میں ملی ہیں............ گزشتہ جنگ یورپ میں پنجاب نے چار لاکھ جوان بھرتی کرائے تھے جن میں سے ۰۰۰،۳۷ کو دوبارہ وطن کی سرزمین دیکھنا نصیب نہ ہوا"۔

حقیقت یہ ہے کہ دیگر سرکاری ملازمتوں کی طرح فوج کی ملازمت بھی حکومت کا ایک شعبہ تھا اور حکومت کے بیسیوں محکموں کی طرح فوج کا محکمہ بھی حکومت ہی کی تحویل میں تھا۔ رہی یہ بات کہ تمام سرکاری محکموں میں ملازمت کرنے پر کسی کو اعتراض نہیں تھا تو فوجی ملازمت کو خصوصیت سے ہدف اعتراض کیوں بنایا جاتا تھا۔ وجہ وہی ہے کہ جنوبی ہندوستان اور بنگال کے ہندوؤں کو شدید شکایت تھی کہ فوج میں پنجاب اور صوبہ سرحد کے مسلمانوں کا عنصر زیادہ ہے۔ میرے نزدیک سر سکندر کی شملہ والی تقریر اپنے موضوع یا نفس مضمون کے لحاظ سے چنداں قابل

اعتراض نہ تھی لیکن ان کے لب ولہجہ سے تملق اور سخن سازی کی بُو ضرور آتی تھی۔

بہر حال ۱۵۔ دسمبر ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس دہلی میں ہوا تو ظہیر الحسن لاری نے سر سکندر کے خلاف قرار داد پیش کرتے وقت دو اعتراض کئے، اول یہ کہ فلسطین کے بارے میں برطانوی حکومت کی پالیسی عالم اسلام کے خلاف ہے۔ دوم یہ کہ ہندوستان کے ان صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی اقلیت ہے گورنروں نے کانگرس سے مرعوب ہو کر مسلمانوں کے حقوق کو پامال کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اندریں حالات سر سکندر نے ۲۷۔ ستمبر کو شملہ میں جو تقریر کی تھی وہ مسلم لیگ کی پالیسی کے برعکس ہے اور مسلمانانِ ہند کے جذبات و خیالات کی نمائندگی بھی نہیں کرتی۔

سر سکندر نے جواب میں بڑی مدلل اور پرجوش تقریر کی اور فرمایا کہ:

الف:۔ جہاں تک فلسطین کا تعلق ہے، کاش ظہیر الحسن لاری میری ناچیز خدمات کا بھی سرسری سا ذکر کر دیتے۔ میں ایک بار نہیں متعدد بار اعلان کر چکا ہوں اور خود پنجاب اسمبلی کے ایوان میں کھڑا ہو کر اس بات کا اعادہ کر چکا ہوں کہ فلسطین کے بارے میں برطانوی حکومت کی پالیسی از سر تا پا غلط اور نقصان دہ ہے اور اگر کبھی حکومت نے ہندوستانی فوج کا ایک سپاہی بھی فلسطین بھیجا تو میں پنجاب کے منتخب نمائندے کی حیثیت سے علی الاعلان اس کی مخالفت کروں گا۔

ب:۔ میں فوج کے تمام چھوٹے بڑے عہدوں کو ہندوستانیوں کے حوالے کرنے کا پر زور حامی ہوں اور شروع سے کوشش کر رہا ہوں کہ فوج کو صحیح معنوں میں ہندوستانی بنایا جائے لیکن یہ میں ہرگز گوارا نہیں کرتا کہ پنجاب کو اس وقت فوج میں جو نمایاں مقام حاصل ہے اس سے ہمیں محروم کیا جائے۔

ج:۔ اگر برطانیہ کو اپنی امپیریل اغراض کے لئے ہندوستان میں گورا فوج رکھنے کی ضرورت ہے تو اس کی تنخواہ برطانوی خزانے سے ادا کی جائے۔

د:۔ میں اسلامی اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر فوج میں پنجابی مسلمانوں کو اکثریت حاصل رہی تو ان کے حقوق نسبتاً زیادہ محفوظ ہوں گے۔ کیا آپ پسند کرتے ہیں کہ کانگرس پورے ہندوستان کی اجارہ دار بن کر برطانوی حکومت سے اپنے حسب مطلب سودا چکائے؟ کانگرس کی یہ سودا بازی کی کوشش ایک "بلف" نہیں تو کیا ہے؟ کیا آپ پسند نہیں کرتے کہ برطانوی حکومت اپنی امداد و اعانت اور دستگیری کے لئے کانگرس کی نہیں بلکہ پنجاب کی فوجی اقوام کی دست نگر بنے؟ کیا آپ پسند نہیں کرتے کہ برطانوی حکومت کانگرس سے نہیں بلکہ پنجاب کی فوجی اقوام سے خوف زدہ ہو کہ اگر انہوں نے ہاتھ کھینچ لیا تو برطانیہ بے سہارا رہ جائے گا؟ یقین کیجئے گا

صرف پنجاب آئندہ ہندوستان کی حفاظت کا بار گراں اٹھا سکے گا۔ اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کو مطمئن رہنا چاہئے کہ پنجاب کی یہ عسکری برتری ان کے حقوق کی سب سے بڑی ضامن ہے اور اس برتری کو قائم رکھنا آپ کا فرض ہے۱۔"

سر سکندر حیات خاں نے یہ تقریر ایسے انداز سے کی تھی کہ بار بار لوگوں نے تحسین و آفرین سے تالیاں بجائیں۔ آخر میں مسٹر جناح نے سر سکندر کی تعریف کرتے ہوئے انہیں مسلم لیگ کا ایک زبردست ستون قرار دیا لیکن ساتھ یہ بھی فرمایا کہ مناسب یہ ہو گا کہ اہم اور دور رس نتائج پیدا کرنے والے موضوعوں پر اظہار خیال کرنے سے پہلے ہم آپس میں مشورہ کر لیا کریں تاکہ قومی یک جہتی قائم رہے پھر انہوں نے ظہیر الحسن لاری سے کہا کہ اپنی قرار داد واپس لے لیں، چنانچہ قرار داد واپس لے لی گئی۔

سر سکندر کی آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کی اس تقریر کی گونج ہندوستان کے دور دراز خطوں میں سنی گئی اور نہ صرف کانگرسی لیڈروں نے بلکہ عام ہندوؤں نے بھی سخت واویلا کیا کہ فوجی بھرتی میں پنجاب کو کیوں سبقت حاصل ہے۔ چنانچہ بمبئی کے مشہور قانون دان اور لبرل لیڈر سر چمن لال ستیلواد نے ایک رنج و غصہ سے بھرے ہوئے اخباری بیان میں کہا:۔

"تعجب ہے کہ سر سکندر حیات خاں ایسا بالا بلند حیثیت کا مالک شخص یہ دعویٰ کرنے سے دریغ نہیں کرتا کہ فوجی سپرٹ اور عسکری صلاحیت کا مالک صرف پنجاب ہے۔ اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہوا کہ باقی تمام صوبوں کے باشندوں میں نہ تو فوجی سپرٹ موجود ہے اور نہ عسکری صلاحیت"۔

راجپوتانے اور وسط ہند کے راجپوتوں کے متعلق کیا کہا جائے گا؟ جن کا شان دار ماضی ان کی فوجی کامرانیوں کا شاہد ہے اور جو بہادری اور دلیری میں ان نام نہاد فوجی اقوام میں سے کسی سے کم تر نہیں۔

مرہٹوں کے بارے میں کیا ارشاد ہو گا جن کی حکمرانی کا سکہ ایک زمانے میں کم و بیش، پورے ہندوستان میں چلتا تھا؟ کیا ان لوگوں کو بھی آپ فوجی ملازمت کے ناقابل قرار دیں گے؟

---

۱۔ روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" لاہور، مورخہ ۶ دسمبر ۱۹۳۸ء

حیدر علی، ٹیپو سلطان اور نواب ارکاٹ کی فوجیں جنوبی ہند ہی سے بھرتی کی گئی تھیں، بنگال بھی معرکہ آرائیوں میں کسی سے پیچھے نہیں رہا اور گزشتہ جنگِ عظیم میں بنگالیوں کی جو رجمنٹیں بھرتی کی گئی تھیں انہوں نے اپنی عسکری صلاحیت کا معقول ثبوت مہیا کیا ہے۔

اب آیئے ان مسلمانوں کی طرف جو پنجاب کے علاوہ دوسرے صوبوں میں آباد ہیں۔ احمد نگر اور بیجا پور کے بہمنی خاندان کے حکمرانوں کی زبردست فوجیں اپنے اپنے ملک کے مقامی باشندوں سے بھرتی کی گئی تھیں اور تاریخ شاہد ہے کہ ان فوجوں نے کس طرح شاہان مغلیہ کے دانت کھٹے کر دیئے تھے۔ کیا آپ ان مسلمانوں کو بھی فوجی ملازمت کے نااہل قرار دے دیں گے جو سوئے اتفاق سے پنجاب کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے رہنے والے ہیں؟

یہ فوجی اقوام کا ڈھونگ محض برطانوی حکومت کی اختراع ہے۔ مقصد اس کا صرف یہ تھا کہ اہل ہند کی کثیر آبادی کو فوجی ملازمت سے محروم رکھا جائے۔ اس پالیسی کی وجہ سے ایک نہایت غلط قسم کا چکر چل نکلا ہے۔ پہلے آپ ملک کی آبادی کے ایک خاص طبقے کو غیر عسکری قرار دے کر اسے فوج میں بھرتی کرنے سے انکار کرتے ہیں، جب وہ طبقہ فوجی تربیت اور عسکری ٹریننگ سے محروم رہنے کے باعث اپنی فوجی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے تو جھٹ آپ فتویٰ صادر کر دیتے ہیں کہ یہ لوگ فوجی خدمت کے اہل نہیں۔

حیرت ہے کہ سر سکندر جیسا شخص جو عموماً اپنی وسیع القلبی اور غیر فرقہ وارانہ پالیسی کی وجہ سے خاص شہرت رکھتا ہے، نہایت ذمے داری سے ایسی غیر منطقی دلیل پیش کرتا ہے، جس کا تمام تر مقصد یہ ہے کہ فوجی بھرتی میں ایک صوبے کی اجارہ داری کو بحال رکھا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ یہی ہو گا کہ موجودہ صورت حال کو ایک مستقل اور دائمی شکل دے کر دیگر اقوام کے ساتھ بے انصافی کی جائے گی اور انہیں فوجی ملازمت سے محروم رکھا جائے گا۔

پنجاب کے ساتھ جو ترجیحی اور امتیازی سلوک اس وقت کیا جا رہا ہے
اسے جلد ختم کرنا چاہئے تاکہ ہندوستان کی تمام اقوام کو فوج میں بھرتی ہونے
کے یکساں مواقع حاصل ہوں اور وہ بری، بحری اور ہوائی فوج میں ملازم ہو
کر اپنے ملک کے دفاع میں حصہ لے سکیں ا ۔

سر سکندر نے ۲۷۔ ستمبر ۱۹۳۸ء کو شملہ میں جو تقریر کی تھی اس سے چھ، سات مہینے قبل ہندوستان کے ان تمام صوبوں میں جہاں کانگرسی وزارتیں قائم تھیں، سکولوں اور کالجوں میں طلباء کے لئے ملٹری ٹریننگ کو لازمی قرار دیئے جانے کی ایک جامع سکیم مرتب کی گئی تھی اور کانگرس کے وزراء کو ہدایت کی گئی تھی کہ اپنے اپنے صوبے میں فوجی ٹریننگ کا معقول اور پختہ انتظام کریں۔

چنانچہ کانگرس کے ایماء پر بمبئی کے ایک شخص جی ایم جادیو نے جو برطانیہ، جرمنی اور فرانس میں ملٹری ٹریننگ کی تربیت حاصل کر چکا تھا، ایک سکیم مرتب کر کے کانگرسی لیڈروں اور کانگرسی وزیروں کے پاس بھیجی، جس کے شروع میں بطور تمہید درج تھا کہ:۔

"ہندوستانیوں کا فرض ہے کہ اپنے ملک کی حفاظت کرنا سیکھیں لہٰذا یہ ضروری ہے کہ باشندگان ہند کو ملٹری سائنس کے رموز سے آگاہ کیا جائے۔ اس غرض کے لئے آسان اور عام فہم زبان میں مفید کتابیں شائع کی جائیں گی۔ ہندوستان کے ہر مرد، ہر عورت اور ہر بچے کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ وہ اپنے ملک کا محافظ ہے، چنانچہ اسے جنگ کے اصولوں اور قاعدوں سے آگاہ ہونا ضروری ہے"۔

آگے چل کر اس مطبوعہ سکیم میں درج تھا۔

"ہر صوبے کے ثانوی مدارس کو ملٹری سکول بن جانا چاہئے، جہاں ہفتے میں کم سے کم چار گھنٹے ملٹری سائنس کی تعلیم دی جائے اور دو گھنٹے فوجی ڈرل سکھانے کے لئے خرچ کئے جائیں۔ ملٹری سائنس کوئی ایسا مشکل اور پیچیدہ مضمون نہیں بلکہ اسے نہایت دلچسپ اور دلکش بنایا جا سکتا ہے، تاریخ، جغرافیہ، ریاضی وغیرہ کی تعلیم کے دوران میں اگر ملٹری سائنس کے

---

ا۔ روزنامہ "سٹیٹس مین" مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۳۸ء

بھی جگہ جگہ حوالے دیئے جائیں تو ان جملہ مضامین کی دلچسپی میں بہت اضافہ ہو جائے گا"۔

"بہتر تو یہ ہو گا کہ پرائمری سکولوں ہی میں بچوں کے ذہن میں ملٹری سائنس کا شوق پیدا کیا جائے اس کام کے لئے خاص قسم کی باتصویر کتابیں تیار کی جائیں گی۔ ہر صوبے کی حکومت کا فرض ہے کہ اس قسم کی مفید اور دلچسپ تصویر دار کتابیں مرتب کرے جن کی قیمت دو دو آنے سے زیادہ نہ ہو"۔

اسی مطبوعہ سکیم میں ایک پیراگراف یہ بھی تھا۔

"ہماری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ ہندوستان کے قابل ترین نوجوانوں کو بری، بحری اور فضائی فوج میں بھرتی کرایا جائے جو گریجوایٹ درجہ اول میں امتحان پاس کر کے یونیورسٹی سے نکلتے ہیں، انہیں فوج کی ملازمت پر آمادہ کرنا چاہئے۔ حبِ وطن کا جذبہ بلاشبہ ضروری ہے لیکن تنہا حب وطن کافی نہیں اور نہ حبِ وطن سے پیٹ بھرا جا سکتا ہے۔ حکومت کا فرض ہے کہ ایسے قابل نوجوانوں کو معقول تنخواہیں عطا کرے اور جب یہ نوجوان عسکری تربیت حاصل کر کے فوجی افسر بن جائیں تو انہیں ملازمت اور تنخواہ اور رہائش کی جملہ آسائشیں میسر ہونی چاہئیں۔ عملی زندگی کے حقائق کا یہی تقاضا ہے [۱]۔"

اب حالات و واقعات کا تجزیہ کرنے کے بعد خود ہی فیصلہ کیجئے کہ عملاً سر سکندر حیات خاں کے خیالات اور کانگرسی وزیروں کے عقائد میں کیا فرق ہے؟ کانگرسی وزیر بھی فوجی بھرتی کے حامی ہیں اور یونیورسٹی کے بہترین تعلیم یافتہ نوجوانوں کو قسم قسم کی ترغیبات اور لالچ دے کر فوجی ملازمت پر آمادہ کرتے ہیں۔ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ تنہا حبِ وطن پیٹ بھرنے کے لئے کافی نہیں۔ تنخواہ بھی معقول ہونی چاہئے۔

سر سکندر بچارے نے تو جہلم، راولپنڈی، میانوالی، سرگودھا، اٹک وغیرہ کی ان فوجی اقوام ہی کی نمائندگی کی تھی جو بقول غالب ع

سو پشت سے ہے پیشۂ آباء سپہ گری

---

۱۔ روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" لاہور، مورخہ ۱۹ مئی ۱۹۳۸ء

لی گنہگار ہیں لیکن کانگرس تو گاندھی جی کے عدم تشدد کی پیروی کا اِدّعا کرنے کے باوجود پرائمری سکولوں تک کے بچوں کو فوج میں بھرتی کروانے کے لئے بے تاب تھی اور اس کام کے لئے سکیمیں مرتب کر کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھیج رہی تھی اس کے باوجود کانگرس کی بارگاہ سے سر سکندر کو غدار کا خطاب مل گیا اور کانگرسی لیڈر قوم پرست کے قوم پرست اور محبِ وطن کے محبِ وطن بنے رہے۔

بات یہ ہے کہ سر سکندر دو مختلف حیثیتوں کے مالک تھے۔ پنجاب کے وزیرِاعظم کی حیثیت سے وہ بلا امتیاز مذہب و ملت پنجاب کے تمام باشندوں کی نمائندگی کرتے تھے اور ان کا فرض منصبی تھا کہ حکومت ہند اور حکومت برطانیہ کے ساتھ اپنے تعلقات استوار رکھیں، پنجاب کے مسلمانوں کی ایک بیشتر تعداد فوج میں بھرتی ہونے کی خواہش مند ہی نہیں بلکہ اسے ایک اعزاز تصور کرتی تھی۔ سر سکندر کیوں کر ان لوگوں کی ترجمانی کے فرائض سے اغماض کر سکتے تھے؟

سر سکندر کی دوسری حیثیت، مسلم لیگ کے ایک بلند پایہ لیڈر کی تھی۔ مسلم لیگ میں شرکت کے بعد ان کے قول و فعل پر بہت سی پابندیاں عائد ہو گئی تھیں۔ اب انہیں مسٹر جناح کے نقشِ قدم پر چلنا اور آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کی طے شدہ پالیسی کی پیروی کرنا پڑتی تھی۔ ان حالات میں وہ کوئی ایسی بات کرنے کے مجاز نہ تھے جو مسلم لیگ کے مفاد کے خلاف ہو۔

آل انڈیا مسلم لیگ کونسل میں اکثریت ان مسلمانوں کی تھی جو اقلیت کے صوبوں سے تعلق رکھتے تھے اور مستقل طور پر صوبائی حکومتوں کی "اپوزیشن" میں تھے، سر سکندر کو پنجاب کے وزیرِاعظم کی حیثیت سے اپنے صوبے کے نظم و نسق کے سلسلے میں روزمرہ بیسیوں ایسے مسائل پیش آتے تھے جن کا اقلیت کے صوبوں کے مسلمان تصور بھی نہیں کر سکتے تھے ان مسائل کا تصفیہ کرتے وقت انہیں اپنے ہندو اور سکھ رفیقوں کے جذبات و احساسات کا بھی خیال رکھنا پڑتا تھا چنانچہ وہ کھلم کھلا ایک مسلم لیگی بننے سے ہمیشہ گریز کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ آگے چل کر ان کے اور آل انڈیا مسلم لیگ کے درمیان غلط فہمی، رنجش اور اختلاف کی خلیج پیدا ہونا شروع ہو گئی۔

ادھر ہم لوگ جو پنجاب مسلم لیگ سے وابستہ تھے اور جنہوں نے مئی ۱۹۳۶ء سے مسلم لیگ کا جھنڈا اٹھا رکھا تھا خود ایک مخمصے میں گرفتار تھے۔ ہم اپنے سیاسی اعمال کے حسن و قبح کے لئے صرف آل انڈیا مسلم لیگ کے سامنے جواب دہ تھے یونینسٹ پارٹی یا سر سکندر کی وزارت ہماری جائے پناہ نہ تھی، نہ ہمیں یونینسٹ پارٹی کی پالیسی اور قواعد و ضوابط کی پابندی منظور تھی بلکہ سچی بات یہ ہے کہ ہم تو یونینسٹ پارٹی کو سرے سے ختم کرنے کے درپے تھے، ان حالات میں سر سکندر کی

پالیسی سے ہمارا بار بار تصادم ناگزیر ہو گیا تھا۔

سر سکندر حیات خاں اپنے چند رفقاء سمیت ۱۴۔ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو سرکاری دورے پر قصور تشریف لے گئے تو شہر کے ٹاؤن ہال میں متعدد انجمنوں نے خوش آمدید کے ایڈرس پیش کئے۔ ان میں انجمن اسلامیہ، سٹی مسلم لیگ، ینگ مین مسلم ایسوسی ایشن، انجمن حنفیہ اسلامیہ اور انجمن اسلامیہ افغاناں شامل تھیں۔

ینگ مین مسلم ایسوسی ایشن نے اپنے ایڈرس میں ازراہِ حبِ قومی سر سکندر کو اس بات پر مبارک باد دی کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے ہیں اور ساتھ یہ بھی عرض کیا کہ اب یہ کہنا نامناسب نہ ہو گا کہ آپ کی وزارت مسلم لیگی وزارت ہے۔

سر سکندر، ایڈرس کا جواب دینے کے لئے کھڑے ہوئے تو سب سے پہلے انہوں نے اس اتہام کو رفع کرنے کی کوشش کی کہ میں مسلم لیگی وزارت کا سربراہ ہوں، چنانچہ انہوں نے بھرے جلسے میں اعلان کیا کہ میری وزارت ہرگز مسلم لیگی وزارت نہیں بلکہ یونینسٹ وزارت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میں مسلم لیگ کا ممبر ہوں لیکن میں نے لیگ کی رکنیت اس شرط پر قبول کی تھی کہ یونینسٹ پارٹی کی وزارت بدستور قائم رہے گی[۱]

غور فرمایئے کہ سر سکندر کے اس دو ٹوک اعلان کے بعد کہ وہ مسلم لیگی وزارت کا نام سننا بھی گوارا نہیں کرتے پنجاب کے کس مسلمان کو مسلم لیگ سے دلچسپی ہو سکتی تھی؟ سر سکندر صوبے کے وزیر اعظم تھے۔ ان کے اثر و رسوخ اور دبدبے کا اندازہ آج نہیں کیا جا سکتا۔ اس ہیبت کو وہی لوگ جانتے ہیں جنہوں نے وہ دور اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ عوام ہر بات میں ان کی تقلید اور پیروی کرنا باعث فخر سمجھتے تھے اور قربِ سلطانی کے خواہش مند جوق در جوق ان کے اشارے کے منتظر رہتے تھے۔

تاہم اس واقعہ کے چند روز بعد ملک برکت علی، غلام رسول خاں اور راقم التحریر نے ایک مشترکہ بیان اخباروں میں شائع کرایا کہ اگر سر سکندر اپنی وزارت کو مسلم لیگی وزارت کہنے سے شرمسار ہوتے ہیں تو انہیں کم سے کم مسلم لیگ کولیشن وزارت کہنے میں تو کوئی تامل نہیں کرنا چاہئے۔ جس پارٹی کے اکیاسی ارکان مسلم لیگ کے ممبر ہیں وہ پارٹی اگر چودھری چھوٹو رام کے دس ہندو اور سر سندر سنگھ مجیٹھیہ کے تیرہ سکھوں کے اشتراک سے وزارت بنائے گی تو اسے

---

۱۔ روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" لاہور، مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۸ء

لازماً مسلم لیگ کولیشن وزارت ہی کہنا چاہئے۔ لیکن بنیادی سوال اب بھی یہی ہے کہ کیا پنجاب اسمبلی کے اکیاسی مسلمان ممبر واقعی مسلم لیگی ہیں ا۔؟

جب پنجاب میں یہ کیفیت جاری تھی تو ہمارے پڑوسی صوبہ سندھ میں بھی ایک بحران طاری تھا جس کے نتائج مسلم اکثریت کے صوبوں کے لئے خاصی اہمیت رکھتے تھے۔ مارچ ۱۹۳۸ء میں سر غلام حسین ہدایت اللہ کی وزارت کی شکست کے بعد سندھ میں خان بہادر اللہ بخش نے وزارت قائم کر لی تھی جس میں یونائیٹڈ پارٹی کے اٹھارہ مسلمان، مہاسبھا کے گیارہ ہندو اور کانگرس کے دس ممبر شامل تھے۔ سندھ کی لیجسلیٹو اسمبلی کے کل ممبروں کی تعداد ساٹھ تھی جن میں سے پینتیس مسلمان تھے لیکن بدقسمتی سے یہ پینتیس مسلمان چار مختلف گروہوں میں تقسیم تھے اور ہر گروہ دوسرے گروہ کو گرانے کی فکر میں تھا۔

سر عبداللہ ہارون بڑے نیک نیت اور دردمند بزرگ تھے۔ وہ مسلسل چھ مہینے اس کوشش میں مصروف رہے کہ ان چاروں گروہوں میں اتحاد پیدا کر کے ایک مضبوط مسلم لیگ پارٹی کی بنیاد

---

ا۔ کوئی مانے یا نہ مانے حقیقت یہی ہے کہ سر سکندر حیات خان سمجھتے تھے کہ انہوں نے مسلم لیگ میں شریک ہو کر مسٹر جناح پر احسان کیا ہے۔ ان کو یہ زُعم تھا کہ اگر وہ مسلم لیگ میں شامل نہ ہوتے تو مسٹر جناح کی لیڈری کی عمارت کبھی استوار نہ ہو سکتی تھی چنانچہ انہوں نے ۱۸۔اپریل ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس خصوصی کے موقع پر کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

> "جب مسٹر جناح نے مسلم لیگ کی تنظیم کی تو ابتداء میں پنجاب اور بنگال نے ان کا ساتھ نہیں دیا تھا چنانچہ اسی بناء پر کہ مسلمانوں کی اکثریت کے دو صوبے لیگ سے علیحدہ ہیں' مسٹر جناح کی لیڈری کو اغیار نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ گویا ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی وحدت کو چیلنج تھا۔
>
> یہ کیفیت دیکھ کر میں نے مسٹر جناح کی پوری مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ میں نے شملہ اور لکھنؤ جا کر مسٹر جناح کو یقین دلایا کہ پنجاب اور بنگال آپ کے ساتھ ہیں اور کسی نوع کی غلط فہمی ان صوبوں کو لیگ سے علیحدہ نہیں کر سکتی۔"

(انڈین اینوئل رجسٹر ۱۹۳۸ء جلد اول۔ صفحہ نمبر ۳۸۶)

ڈالی جائے۔ ۱۹۳۷ء کے الیکشن میں سندھ میں کوئی مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ قائم نہیں ہو سکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب سر غلام حسین کی وزارت کو شکست ہوئی اور کانگرس نے آگے بڑھ کر خان بہادر اللہ بخش کا ہاتھ تھام لیا تو سندھ کے مسلمان بھی ہوش میں آئے اور انہوں نے اپنے قومی حفظ وبقاء کے لئے لیگ سے استمداد کی۔

سر عبداللہ ہارون کی مساعی سے خان بہادر اللہ بخش اپنے صوبے کی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی بنانے پر آمادہ ہو گئے تھے لیکن شرط یہ تھی کہ وہ بدستور وزیر اعظم رہیں گے۔ سر عبداللہ ہارون مان گئے۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں سندھ صوبہ مسلم لیگ کا ایک عظیم الشان اجلاس کراچی میں منعقد کیا جائے جس کی صدارت خود مسٹر جناح فرمائیں اور ہندوستان کے تمام بڑے بڑے مسلم لیگی لیڈر جمع ہوں اور تزک و احتشام سے مسلم لیگ پارلیمنٹری پارٹی کی بنیاد رکھی جائے۔

چنانچہ ۱۳-۱۲- اکتوبر ۱۹۳۸ء کو سندھ پراونشل مسلم لیگ کا اجلاس کراچی میں ہوا۔ مسٹر جناح کا بہت بڑا جلوس نکالا گیا جس میں سر سکندر حیات خاں، مولوی فضل الحق، مولانا شوکت علی، ملک برکت علی، مولانا ظفر علی خاں وغیرہ بھی شریک ہوئے۔ جب سندھ کے کانگرسیوں نے یہ نقشہ دیکھا کہ اللہ بخش ہمارے ہاتھ سے نکل کر مسلم لیگ میں جا رہا ہے تو وہ ٹپٹائے انہوں نے فوراً سردار ولبھ بھائی پٹیل، مولانا ابوالکلام آزاد اور کانگرس کے صدر سبھاش چندر بوس کو تار دیئے کہ خان بہادر اللہ بخش کی موجودہ وزارت کو قائم رکھنا چاہئے۔ چنانچہ سبھاش، پٹیل اور ابوالکلام آزاد نے جواب دیا کہ اللہ بخش کی مدد کرو۔

ادھر مسلم لیگ کے اجلاس کا آغاز بڑے شان دار طریقے سے ہوا اور سندھ کے مسلمانوں میں بھی اتحاد پیدا ہونے کی امیدیں روشن ہونے لگیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ اسمبلی کے تمام مسلمان ممبر مل کر ایک مسلم لیگ پارٹی قائم کریں۔ اللہ بخش اور ان کی وزارت کے تمام مسلمان ارکان اپنا اپنا استعفاء لکھ کر گورنر کے حوالے کر دیں۔ اس کے بعد مسلم لیگ پارٹی جس شخص کو بالاتفاق اپنا لیڈر منتخب کرے وہ صوبے کا وزیر اعظم بن جائے۔ اگر لیڈر کا انتخاب متفقہ طور پر نہ ہو سکے تو مسٹر جناح کو اختیار دیا جائے کہ وہ جس کو چاہیں لیڈر نامزد کریں۔

اس دوران میں غلط یا صحیح خان بہادر اللہ بخش کے کان میں یہ بھنک پڑ گئی کہ مسٹر جناح کا ارادہ ہے کہ سر غلام حسین ہدایت اللہ کو مسلم لیگ پارٹی کا لیڈر نامزد کیا جائے۔ اب نہیں کہا جا سکتا کہ اس افواہ میں کتنی صداقت تھی لیکن جوں ہی اللہ بخش کو یہ معلوم ہوا وہ بھری محفل سے اٹھ کر

چلے گئے اور جاتے ہی انہوں نے کانگرس سے گٹھ جوڑ کر کے اپنی وزارت جوں کی توں بحال رکھی۔ اس صورت حال سے سارا پروگرام درہم برہم ہو کر رہ گیا اور جن توقعات کی بناء پر صوبہ مسلم لیگ کا اجلاس منعقد کیا گیا تھا افسوس وہ پوری نہ ہو سکیں۔ مسٹر جناح نے ۱۳۔ اکتوبر کو ایک طویل بیان اخباروں کو دیا۔ شروع میں انہوں نے فرمایا کہ میں سندھ میں جہاں بھی گیا مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کی ایک زبردست خواہش پائی گئی اور ہر شخص نے میرے پاس آ کر یہی کہا کہ اس صوبے کے مسلمانوں کا باہمی نفاق ختم ہونا چاہئے تاکہ ایک مستقل اور پائدار وزارت کی بنیاد رکھی جائے۔ آگے چل کر انہوں نے کہا کہ:۔

میں نے اس خواہش کے جواب میں وزیر اعظم مسٹر اللہ بخش اور پیر الٰہی بخش سے گفت و شنید جاری رکھی۔ انہوں نے مجھ سے اتفاق کیا کہ مسلمانوں کی ایک متحدہ پارٹی کا قیام بے حد ضروری ہے اور اگر ایسی پارٹی وجود میں آ جائے تو اس سے بڑی خوش نصیبی اور کیا ہو گی۔ مسٹر اللہ بخش نے یہ بھی کہا کہ انہیں وزارت عظمیٰ یا کسی اور منصب کی خواہش نہیں۔

میرے اندازے کے مطابق وزیر اعظم اور پیر الٰہی بخش کے ساتھ آٹھ دس ممبروں سے زیادہ نہ تھے، دوسرے گروہوں کے لیڈروں نے بھی مجھے اشتراک و تعاون کا مکمل یقین دلایا، چنانچہ میں نے یہ تجویز پیش کی کہ یہ تمام لیڈر پہلے سر سکندر حیات خاں اور مسٹر فضل الحق سے مشورہ کریں اور پھر ہم سب یکجا ہو کر کسی قطعی نتیجے پر پہنچیں۔

اس تجویز کے مطابق میں نے اور بنگال و پنجاب کے وزراء اعظم نے یک جا ہو کر گزشتہ اتوار کی سہ پہر کو چاروں گروہوں کے لیڈروں سے ملاقات کی اور طویل بحث مباحثہ کے بعد ایک معاہدہ مرتب کیا گیا جس پر وزیر اعظم مسٹر اللہ بخش، پیر الٰہی بخش، سر غلام حسین ہدایت اللہ، میر بندے علی، مسٹر جی ایم سید اور مسٹر عبدالمجید نے اپنے اپنے دستخط ثبت کئے۔ اس معاہدے کی شرائط حسب ذیل ہیں۔

"یہ قرار پایا کہ سندھ لیجسلیٹو اسمبلی کے مسلمان ممبروں کی ایک مستقل پارٹی قائم کی جائے جس کا نام مسلم لیگ پارٹی ہو اور جو ممبر اس میں

شامل ہوں وہ مسلم لیگ کے ممبر قرار پائیں، انہیں مسلم لیگ کے عہد نامے پر دستخط کرنا اور لیگ کی پالیسی اور پروگرام کی پابندی کرنا ہو گا۔

نئی وزارت مرتب کرنے کے لئے ضروری ہے کہ موجودہ مسلمان وزراء بیک وقت اپنا اپنا استعفاء اس شرط کے ساتھ گورنر کو پیش کر دیں کہ مسلم لیگ پارٹی کا لیڈر اپنی نئی وزارت مرتب کرے۔

جن ممبروں نے مسلم لیگ پارٹی کی شرکت قبول کر لی ہے یا جو ممبر شرکت کے خواہاں ہیں، ان کا ایک جلسہ ۱۲۔ اکتوبر کو منعقد کیا جائے، جو ممبر اس وقت کراچی میں موجود نہیں ان کو اس جلسے میں شرکت کے لئے مدعو کیا جائے۔ کیونکہ کراچی میں اس وقت ستائیس ممبر موجود ہیں۔ یہ فرض وزیر اعظم مسٹر اللہ بخش اور سر غلام حسین ہدایت اللہ کا ہے کہ ان ممبروں کو جو اس وقت کراچی میں موجود نہیں، ۱۲۔ اکتوبر کے جلسے کے لئے مدعو کریں۔

مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر کا انتخاب متفقہ طور پر ہونا چاہئے بصورت اختلاف یہ اختیار مسٹر جناح کو دیا جاتا ہے کہ جس کو چاہیں لیڈر نامزد کر دیں۔ یہی اصول وزارت کے جملہ ارکان کے بارے میں برتا جائے گا یعنی ان کو بھی پارٹی متفقہ طور پر قبول کرے گی ورنہ وزارت کے مسلمان ارکان کو بھی مسٹر جناح نامزد کریں گے اور ان ہی کے نام پارٹی کا لیڈر گورنر کے سامنے پیش کرے گا۔

بیراج کی اراضی میں بندوبست کی تشخیص اور نَظر ثانی کے بارے میں جو اختلاف رائے پایا جاتا ہے اسے سر سکندر حیات خاں طے کریں۔ اور اپنے فیصلے سے مسلم لیگ پارٹی کو آگاہ کر دیں، ۱۲۔ اکتوبر کو جب پارٹی کا جلسہ ہو گا تو اس میں سر سکندر کا یہ فیصلہ پیش کیا جائے گا اور پارٹی اس فیصلے کی پابند ہو گی۔

اس معاہدے کے مطابق مسٹر اللہ بخش اور سر غلام حسین ہدایت اللہ کے مشترکہ دستخطوں سے ان ممبروں کو جو کراچی میں موجود نہیں تھے تار بھیج دیئے گئے کہ ۱۲۔ اکتوبر کے جلسے میں شریک ہوں، چنانچہ اس تاریخ کو

سوائے تین یا چار ممبروں کے باقی تمام ممبر شریک ہوئے اور جو ممبر غیر حاضر تھے انہوں نے اطلاع بھیج دی تھی کہ جو فیصلہ میں کروں گا وہ اسے قبول کر لیں گے۔

۱۲۔ اکتوبر کی صبح کو مجھے ایک قابل اعتماد ذریعہ سے یہ خبر ملی کہ سندھ اسمبلی کی کانگرس پارٹی کے لیڈر نے کانگرس پارلیمنٹری بورڈ کے صدر کو تار دیا ہے کہ سندھ میں مسلم لیگی وزارت کے قائم ہونے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔ لہٰذا موجودہ وزارت کے خلاف جو عدم اعتماد کی قرار داد پیش ہونے والی ہے، اس میں سندھ اسمبلی کے کانگرسی ممبروں کو ہدایت کی جائے کہ وہ اس قرار داد کے خلاف ووٹ دیں چنانچہ مسٹر پٹیل نے پارلیمنٹری بورڈ کے جملہ ممبروں سے بذریعہ تار استصواب کیا۔

جب ۱۲۔ اکتوبر کو گیارہ بجے ہمارا جلسہ ہوا تو ہمیں دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ مسٹر اللہ بخش اپنے عہد سے منحرف ہو گئے ہیں، انہوں نے نہایت دیدہ دلیری بلکہ ڈھٹائی سے یہ مطالبہ پیش کیا کہ وہ اور ان کے جملہ معاون اس شرط پر مسلم لیگ پارٹی میں شامل ہوں گے کہ انہیں قبل از وقت اس بات کا یقین دلایا جائے کہ پارٹی صرف ان ہی کو اپنا لیڈر منتخب کرے گی اور وہی آئندہ وزیراعظم رہیں گے۔

شرکائے جلسہ کی بہت بڑی اکثریت نے اس مطالبے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی کہ یہ مطالبہ بنیادی طور پر غلط ہے کیونکہ پارٹی قائم کرتے وقت کسی فرد کو یہ اختیار نہیں دیا جا سکتا کہ وہ گویا اپنے ہاتھ میں پستول تھام کر پارٹی میں شریک ہونے سے قبل ہی دھمکیاں دینا شروع کر دے کہ میری فلاں فلاں شرط مانو گے تو پارٹی کی شرکت قبول کروں گا۔

مسٹر اللہ بخش اور ان کے ساتھیوں کو جن کی تعداد چھ سات سے زیادہ نہ تھی، ہر ممکن طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی گئی کہ اس ہٹ دھرمی سے باز آ جائیں اور طے شدہ معاہدے کی پابندی کریں لیکن افسوس کہ کچھ اثر نہ ہوا۔ بالآخر کئی گھنٹے کی مسلسل بحث آرائی کے بعد مسٹر اللہ بخش اور ان کے ساتھی اُٹھ کر چلے گئے۔

اس دوران میں جلسہ جاری رہا اور جو لوگ مسلم لیگ پارٹی میں شرکت کے خواہاں تھے انہوں نے لیگ کے قرطاس رکنیت اور عہد نامے پر دستخط کر کے جملہ کاغذات میرے حوالے کر دیئے، چنانچہ ستائیس ممبر مسلم لیگ پارٹی میں شامل ہو گئے جنہوں نے لیگ کی پالیسی اور پروگرام کی پابندی کا وعدہ کر لیا ہے۔

مسٹر اللہ بخش کی اس ضد کے باوجود کہ جب تک انہیں پہلے سے یقین نہیں دلایا جائے گا کہ وہی پارٹی کے لیڈر منتخب کئے جائیں گے اور وہی وزارت عظمیٰ کے منصب پر بھی فائز رہیں گے خود ان کی پارٹی کے بعض ممبر ان سے کٹ کر مسلم لیگ پارٹی میں شریک ہو گئے ہیں۔

مسٹر اللہ بخش کے یوں اٹھ کر چلے جانے کے بعد شرکائے جلسہ نے ان کے رویئے کی سخت مذمت کی کہ انہوں نے صریح عہد شکنی کا ارتکاب کیا ہے، کیونکہ جس معاہدے پر انہوں نے سر سکندر حیات خاں اور مولوی فضل الحق کے سامنے دستخط کئے تھے اس کی خلاف ورزی کرنے کا انہیں کوئی حق نہیں تھا۔ اس کے باوجود محض اس خیال سے کہ مسلمانوں کے اتحاد کو نقصان نہ پہنچے اور میرے ان الفاظ کا احترام کرتے ہوئے جو میں نے مسلم لیگ کے اجلاس کے خطبۂ صدارت میں کہے تھے کہ ہر قیمت اور ہر شرط پر مسلمانوں کا اتحاد قائم رہنا چاہئے۔ شرکائے جلسہ اس بات پر بھی آمادہ ہو گئے کہ چلئے اگر مسٹر اللہ بخش مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر بننا اور صوبے کے وزیر اعظم رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہم بخوشی انہیں یہ منصب دینے کو تیار ہیں۔

اس فیصلے کے بعد قریباً آٹھ بجے شام سر عبداللہ ہارون یہ پیغام لے کر مسٹر اللہ بخش کے مکان پر گئے اور کہا کہ مسلم لیگ پارٹی انہیں اپنا لیڈر منتخب کرنے پر آمادہ ہے۔ مسٹر اللہ بخش نے جواب دیا کہ وہ صورت حال پر غور کر کے ۱۳۔ اکتوبر کی صبح کو ہمیں اطلاع دیں گے۔

اب یہ بات قطعی عیاں ہو چکی ہے اور اس کی تصدیق اخباری

رپورٹوں سے بھی ہو گئی ہے کہ مسٹر اللہ بخش صرف کانگرس ہائی کمان کی ہدایت حاصل کرنے کے لئے ہمارے ساتھ لیت و لعل کر رہے تھے، چنانچہ آج وہ کلیتہً کانگرس پارٹی کے قبضے میں چلے گئے ہیں۔

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اس سے یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ کانگرس کے سامنے تنہا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی قومی جمعیت کو تہس نہس کرے، ان میں اتفاق و اتحاد قائم نہ ہونے دے اور ان کی صفوں کو باہمی انتشار و افتراق سے درہم برہم کرتی رہے خواہ اس غرض کے لئے اسے ہندوستان کے امن و امان اور خوش حالی کو غارت کیوں نہ کرنا پڑے۔ سندھ کو سب سے بڑی ضرورت اس وقت یہ درپیش ہے کہ یہاں ایک پائدار وزارت قائم کی جائے، لیکن کانگرس کی یہ چالیں سندھ کو اس چیز سے محروم رکھنے کے لئے جاری ہیں۔ کانگرس کے بلند بانگ دعووں کے باوجود کہ وہ ہندوستان کی فلاح و بہبود کی خواہاں ہے، وہ عملاً ہندوستان کی بہتری کو اپنی ناپاک اغراض کی خاطر قربان کر رہی ہے۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے مجھے مسرت سے اس بات کا اعلان کرنا ہے کہ ہم نے اسمبلی میں ایک مسلم لیگ پارٹی قائم کر لی ہے جس میں سندھ اسمبلی کے مسلمان ممبروں کی بہت بڑی اکثریت شامل ہے اور ہم ایک ایسے پروگرام پر عمل پیرا ہونے کا عزم رکھتے ہیں جس سے سندھی عوام بالعموم اور سندھی مسلمان بالخصوص معاشرتی، سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی ترقی اور خوشحالی سے ہم کنار ہو سکیں۔

مسلم اکثریت کے باوجود ہماری یہ پارٹی اسمبلی کی ہر پارٹی کے ساتھ اشتراک و تعاون کرنے پر آمادہ ہے تاکہ سندھ کے باشندوں کی فلاح و بہبود کے پروگرام کو بروئے کار لایا جائے، لیکن یہ ہم کبھی گوارا نہیں کریں گے کہ مسٹر اللہ بخش کو اختیار دے دیا جائے کہ وہ محض اپنی خود سری اور ہٹ دھرمی سے ہم پر مسلط ہو جائیں" [۱]

---

[۱] روز نامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" لاہور مورخہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۸ء

جس روز مسٹر جناح کا یہ بیان اخباروں میں شائع ہوا، اسی روز ایسوسی ایٹیڈ پریس کی معرفت یہ بیان بھی اخبارات میں طبع ہو گیا کہ سردار پٹیل، مولانا ابوالکلام آزاد اور صدر کانگرس سبھاش چندر بوس نے سندھ اسمبلی کی کانگرس پارٹی کو تاکید کی ہے کہ مسلم لیگ کو ناکام بنانے کے لئے اللہ بخش کی مدد کرو۔

سندھ پراونشل مسلم لیگ کے اجلاس کی آخری نشست میں جو ۱۴۔ اکتوبر کی رات کو منعقد ہوئی تھی، مسٹر جناح نے ایک دھواں دھار اختتامی تقریر کی جس کا کچھ حصہ یہاں درج کرنا بے محل نہ ہو گا۔ انہوں نے فرمایا:۔

"ہندوستان کے سات صوبوں پر قبضہ کرنے کے بعد کانگرس، مسلمانوں کو اپنا غلام بنانے پر تلی ہوئی ہے! اس کی یہی وہ دیوانگی ہے جس کے خلاف میں ۱۹۳۶ء سے احتجاج کر رہا ہوں۔

"میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جب تک میرے جسم میں زندگی کی آخری رمق موجود ہے میں کانگرس کو اس مذموم کوشش میں کبھی کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ یہ بھی سن لیجئے کہ جب تک کانگرس ہمارے ساتھ ایک مساوی اور برابر کے فریق کی حیثیت سے گفت و شنید نہیں کرے گی، ملک میں امن و امان قائم نہیں ہو سکتا۔ یہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں بلکہ ہماری موت و زیست کا سوال ہے۔ اگر ابھی تک مسلمانوں کی آنکھیں نہیں کھلیں تو میں انہیں متنبہ کرتا ہوں کہ اس طوفان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھیں جو چاروں طرف سے بڑھتا چلا آ رہا ہے۔

مسلمانوں کا سیاسی شعور بلاشبہ زیادہ ہے اور ان میں معاملہ فہمی کی حس بھی کافی ہے، وہ بہادر اور دلیر بھی ہیں اگر وہ اپنے آپ کو اچھی طرح منظم کر لیں تو پھر کوئی حریف جماعت ہمارا مقابلہ نہیں کر سکے گی"۔

یہاں اصل موضوع سے ہٹ کر میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب جناح ڈنکے کی چوٹ اور بلا خوف و خطر یہ اعلان کر رہا تھا کہ جب تک میرے جسم میں زندگی کی آخری رمق موجود ہے میں ہندوستان کے مسلمانوں کو کانگرس کا غلام نہیں بننے دوں گا، اس وقت ہمارے علمائے کرام کیا کر رہے تھے؟

یہ علمائے کرام جن کے ترکش میں کفر سازی کے تیروں کے علاوہ کچھ نہیں تھا اور نہ اب

اس متاع فرومایہ کے سوا کچھ ان کے پاس ہے۔ "امام الہند" مولانا ابوالکلام آزاد کی قیادت میں مسلمانوں کو کانگرس کے غلام بنانے کی دھن میں شب و روز کام کر رہے تھے اس مہم میں دیوبندی اور بریلوی، سہارن پوری اور لاہوری، سرخ پوش اور احراری بھی شریک تھے۔

لیکن اس ضمن میں سب سے المناک واقعہ خود مسلمانوں کا باہمی انتشار اور ان کی ابن الوقتی ہے۔ مسٹر جناح کی کوشش سے سندھ اسمبلی میں جو مسلم لیگ پارٹی بنی تھی اس کے لیڈر سر غلام حسین ہدایت اللہ تھے۔ یہی حضرت پراونشل مسلم لیگ کے اجلاس میں سر عبداللہ ہارون کے پہلو بہ پہلو مصروف کار رہے۔ چند مہینے بعد جب مسلم لیگ پارٹی نے اللہ بخش کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد پیش کی تو عین بر سر اجلاس، سر غلام حسین اپنی پارٹی کی پشت پر لات رسید کر کے علی الاعلان اللہ بخش کے ساتھ جا ملے جس نے نہایت احسان مندی، اور خندہ پیشانی سے انہیں اپنی وزارت میں شامل کر لیا۔

کراچی کے اسی اجلاس مسلم لیگ میں ذیل کی قرارداد بھی منظور ہوئی تھی:۔

"سندھ پراونشل مسلم لیگ کے اس اجلاس کی رائے ہے کہ ہندوستان کے وسیع براعظم میں مستقل امن و امان قائم رکھنے، یہاں بسنے والی دو قوموں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے اپنے اپنے کلچر کو فروغ دینے، انہیں بغیر کسی رکاوٹ کے اپنی اپنی اقتصادی اور معاشرتی اصلاح کرنے اور انہیں سیاسی طور پر حق خود ارادی عطا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہندوستان میں دو مختلف فیڈریشن قائم کئے جائیں جن میں سے ایک فیڈریشن مسلمانوں کا ہو، اور دوسرا ہندوؤں کا"۔

"چنانچہ یہ اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ سے درخواست کرتا ہے کہ وہ ایک ایسے کانسٹی ٹیوشن کا خاکہ مرتب کرے جس کی رو سے مسلمانوں کی اکثریت کے صوبے، مسلم اکثریت رکھنے والی ریاستیں اور وہ علاقے جہاں مسلمانوں کی اکثریت آباد ہے، متحدہ طور پر ایک فیڈریشن کی صورت میں مکمل آزادی حاصل کر سکیں۔ اس فیڈریشن کو اس امر کی آزادی ہونی چاہئے کہ اگر ضروری محسوس ہو تو بیرون ہند کی کسی اسلامی مملکت کو بھی فیڈریشن میں شریک کر سکے۔ اس فیڈریشن میں غیر مسلم اقلیتوں کو اسی قسم کے تحفظات عطا کئے جائیں گے، جیسے ہندوستان کے غیر مسلم فیڈریشن میں مسلم اقلیتوں کو حاصل ہوں گے"۔

یہ قرار داد گویا پیش خیمہ تھی اس قرار داد پاکستان کا جو آگے چل کر مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں منظور ہوئی تاہم اکتوبر ۱۹۳۸ء ہی میں لوگوں نے محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاست گویا ایک نئے موڑ اور ایک نئے رخ پر آپہنچی ہے۔

(۶)

# آل انڈیا فیڈریشن کی مخالفت

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر ۱۹۳۷ء یا ۱۹۳۸ء یا پھر بعد آخر ۱۹۳۹ء کے اوائل میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے اس حصے کا بھی نفاذ ہو جاتا جس کا تعلق آل انڈیا فیڈریشن کے قیام سے تھا تو برعظیم ہند کی تقسیم کی نوبت نہ آتی اور ہندو اور مسلمان دونوں مل کر فیڈرل حکومت کا بارگراں اٹھانے پر آمادہ ہو جاتے۔ ان لوگوں کی یہ رائے بھی ہے کہ ستمبر ۱۹۳۹ء میں عالمگیر جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے صورت حال میں یکایک ایسا انقلاب آ گیا تھا کہ برطانوی حکومت کو مجبوراً فیڈریشن قائم کرنے کا خیال ترک کرنا پڑا۔

اگر اس خیال کو درست تسلیم کر لیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ برطانوی حکومت نے ۱۹۳۷ء کی صوبائی وزارتیں مرتب ہو جانے کے معاً بعد کیوں فیڈریشن کا ڈول نہ ڈالا؟ کیوں پونے تین سال شش و پنج میں گزار دیئے؟ اور کیوں حالات کو روز بروز بد سے بدتر ہوتے چلے جانے کا موقع دیا؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ جہاں تک ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں کا تعلق ہے ان میں سے کون سی جماعت فیڈریشن کی حامی، اور کون سی مخالف تھی؟ اور کیا مخالف جماعتوں کے علی الرغم فیڈریشن کی حامی جماعتیں مل کر فیڈریشن قائم کرنے کی استعداد نہ رکھتی تھیں؟

سب کو معلوم ہے کہ جب فروری ۱۹۳۵ء میں ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پر بحث ہوئی تو مسٹر جناح نے صوبائی خود مختاری کی حمایت کی تھی اور ایکٹ کے اس حصے کی سخت مخالفت کی تھی جس کا تعلق فیڈریشن سے تھا۔ مجوزہ فیڈریشن کی مخالفت کرتے ہوئے انہوں نے یہ قرار داد پیش کی تھی۔

"جہاں تک اس مرکزی حکومت کا تعلق ہے جسے آل انڈیا فیڈریشن کا نام دیا گیا ہے، اس ایوان کی قطعی رائے ہے کہ یہ فیڈریشن بالکل ناقص ہے

اور برطانوی ہندوستان کے باشندے اسے ہرگز قبول نہیں کر سکتے۔ لہٰذا یہ ایوان حکومت ہند سے درخواست کرتا ہے کہ وہ ملک معظم کی حکومت کو اس امر کا مشورہ دے کہ مجوزہ فیڈریشن کا خیال یک قلم ترک کر دیا جائے اور اس کے بجائے صرف برطانوی ہند میں مکمل ذمہ دارانہ حکومت قائم کرنے کی تجویز کو بہ روئے کار لایا جائے اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہندوستان کے اہل الرائے اصحاب سے جلد از جلد مشورہ کر کے پوری صورت حال پر نظر ثانی کی جائے"۔

کم و بیش یہی خیال کانگرس کا بھی تھا. کانگرس فیڈریشن کی اس لئے مخالف تھی کہ ہندوستانی ریاستوں کو شریک کرنے کے بعد فیڈرل حکومت. ترقی پسندی نہیں بلکہ رجعت پسندی کا اڈا بن جائے گی۔ مسٹر جناح بھی یہی چاہتے تھے کہ ریاستوں کو شریک نہ کیا جائے بلکہ برطانوی ہند کا الگ فیڈریشن قائم ہو اس بارے میں مسٹر جناح اور کانگرس کا نقطہ نگاہ بالکل یکساں تھا۔ لیکن مسٹر جناح نے اپنی مذکورہ بالا قرارداد میں "ذمہ دارانہ حکومت" کا لفظ استعمال کیا ہے فیڈریشن کی اصطلاح استعمال نہیں کی۔

۱۲-۱۱۔ اپریل ۱۹۳۶ء کو جب آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس سر وزیر حسن کے زیر صدارت بمبئی میں منعقد ہوا تو وہاں بھی آل انڈیا فیڈریشن کے خلاف ایک قرارداد منظور کی گئی تھی جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

"درحالیکہ مسلم لیگ فرقہ دارانہ فیصلے (کیمونل ایوارڈ) کو اس وقت تک کے لئے قبول کرتی ہے جب تک کہ متعلقہ فرقوں کے درمیان اس فیصلے کا کوئی بدل منظور نہیں کیا جاتا۔ لیگ پوری شدت سے اس آئین کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہے جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی صورت میں باشندگان ہند کی مرضی کے خلاف اور اس امر کے علی الرغم کہ ملک کی متفرق جماعتیں اور انجمنیں اس ایکٹ کے خلاف ناراضی کا اظہار کر چکی ہیں ہندوستان پر مسلط کیا جا رہا ہے۔

"لیگ کا خیال ہے کہ اس صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے جو اس وقت ہندوستان میں قائم ہے آئین کے اس جزو پر جس کا تعلق صوبائی نظم و نسق کے ساتھ ہے عمل درآمد کرنا مفید ہو گا ہرچند کہ اس جزو میں بعض

ایسے حد درجہ قابل اعتراض پہلو موجود ہیں، جنھوں نے وزارت اور مجلس قانون ساز کو حکومت اور نظم و نسق کے جملہ شعبوں کے حقیقی اختیارات سے محروم کر دیا ہے۔

لیگ کی یہ حتمی رائے ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء نے مرکز میں جس قسم کی رجعت پسندانہ حکومت قائم کرنے کے لئے ایک آل انڈیا فیڈریشن کا خاکہ پیش کیا ہے وہ بنیادی طور پر ناقص ہے۔ یہ مجوزہ فیڈریشن برطانوی ہند کے مفاد کے لئے حد درجہ مہلک، نقصان دہ اور رجعت پسندانہ ہے اور اس فیڈریشن کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہندوستان جس دیرینہ اور عزیز نصب العین یعنی مکمل ذمہ دارانہ حکومت کے لئے کوشاں ہے، اس کے راستے میں روڑے اٹکا کر اس کے حصول کو غیر معین عرصے کے لئے معرض التواء میں ڈال دیا جائے۔ لہٰذا لیگ اس فیڈریشن کو قبول کرنے کے لئے قطعاً تیار نہیں۔

"لیگ کی رائے میں برطانوی حکومت کا فرض ہے کہ فیڈریشن کی سکیم نافذ کرنے سے پہلے اپنی اولین فرصت میں اس سکیم کے تمام پہلوؤں پر نظرثانی کرے ورنہ لیگ کو یقین ہے کہ یہ سکیم ملک کے باشندوں کو امن و اطمینان سے بہرہ ور نہ کر سکے گی اور اگر اس کے برعکس حکومت نے اس سکیم کو زبردستی لوگوں پر مسلط کرنے کی کوشش کی تو اس کے نتائج بڑے خطرناک ثابت ہوں گے کیونکہ یہ سکیم ہر اعتبار سے ہندوستان اور اس کے باشندوں کے مفاد کے خلاف ہے"۔

۱۹۳۷ء میں جب کانگرس نے چھ صوبوں میں خالص ہندوانہ وزارتیں قائم کیں اور مسلم لیگ کو نظم و نسق کے دائرے سے بالکل خارج کر دیا تو حالات نے یکسر نئی صورت اختیار کر لی۔ اب مسلمانوں کو پہلی مرتبہ افق پر سیاہ بادل منڈلاتے ہوئے نظر آئے اور انھوں نے شدت سے محسوس کرنا شروع کیا کہ آئندہ فیڈریشن میں بھی وہ بالکل بے دست و پا ہو کر رہ جائیں گے۔ اس تلخ احساس کے بعد فیڈریشن کی مخالفت نے ایک نیا رنگ اور نئی صورت اختیار کر لی۔ الٰہ آباد یونیورسٹی کے تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر بینی پرشاد کی یہ عبارت میں پہلے بھی اپنی کتاب "اقبال کے آخری دو سال" میں نقل کر چکا ہوں:

"جب ۱۹۳۷ء میں کانگرس نے ہندو اکثریت کے بل پر خالص کانگرسی وزارتیں مرتب کیں اور اس کے ساتھ مسلم رابطہ عوام کی تحریک بھی جاری کر دی تو مسلمانوں کو صاف نظر آنے لگا تھا کہ آئندہ فیڈریشن میں بھی وہ بالکل بے دست وپا ہو کر رہ جائیں گے۔ ان اسباب نے مل کر مسلمان قوم میں ایک سخت ہیجان و اضطراب پیدا کر دیا تھا۔ یہ گویا مسلم لیگ کی آزمائش کی گھڑی تھی، لیگ نے کانگرس کے اس چیلنج کو جو اس کے نزدیک تکبر و غرور اور نشۂ اقتدار کا نتیجہ تھا بخوشی قبول کر لیا ——— مسلم لیگ نے مسلمانوں کو ایک پرچم کے نیچے جمع کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس نے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کا دعویٰ کیا اور کانگرس کو سراسر ایک ہندو نما جماعت قرار دیا[۱]"۔

اب ہم فیڈریشن کے صرف اس لئے مخالف نہ تھے کہ اس میں ریاستیں کیوں شریک کی گئی ہیں بلکہ ہماری مخالفت کی حقیقی اور بنیادی وجہ یہ تھی کہ فیڈرل اسمبلی میں کانگرس کو قطعی اکثریت حاصل ہونے کا امکان ہی نہیں بلکہ یقین تھا اور اس صورت میں کانگرس وہاں بھی ہمارے ساتھ وہی سلوک کرتی جو اس نے ہندوستان کے چھ صوبوں میں کیا تھا۔

مئی ۱۹۳۵ء سے مئی ۱۹۴۰ء تک لارڈ زٹلینڈ وزیر ہند تھے۔ اس سے قبل ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۲ء تک وہ بنگال کے گورنر بھی رہ چکے تھے[۲]۔ انہوں نے ۱۹۵۶ء میں اپنی خود نوشت سوانح عمری شائع کی تھی[۳]۔ جس کا ایک پورا باب اس موضوع پر قلم بند کیا گیا ہے کہ ہندوستان میں ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی رو سے فیڈریشن کیوں قائم نہ ہو سکا۔

لارڈ زٹلینڈ اور ہندوستان کے وائسرائے لارڈ لنلتھگو دوست بھی تھے اور مہینے میں دو بار نہایت باقاعدگی سے ایک دوسرے کو خط لکھ کر ہندوستان اور انگلستان کے حالات سے باخبر رکھتے تھے اس سلسلے میں لارڈ زٹلینڈ نے بعض ایسے واقعات کا انکشاف کیا ہے جو مصدقہ ہونے کے علاوہ

---

1- "India 's Hindu Muslim Question" by Beni Prasad

۲۔ بنگال کی گورنری کے زمانے میں ان کا نام لارڈ رانلڈ شے تھا۔

۳۔ اس سوانح عمری کا نام ایک فرانسیسی لفظ ہے جس کا تلفظ ایسے اے یے کیا جاتا ہے معنی ہیں، "کوشش کرو"۔ Essayez

اس پالیسی کی بھی وضاحت کرتے ہیں جن پر اس وقت برطانوی حکومت گامزن تھی۔ لہٰذا ہمیں صحیح حالات کی نشان دہی کرنے کے لئے لارڈ زٹلینڈ سے بہتر راہبر نہیں مل سکتا۔

۶۔ ستمبر ۱۹۳۷ء کو لارڈ زٹلینڈ ایک خط میں وائسرائے کو لکھتے ہیں:۔

"پچھلے چند ہفتوں سے میرا یہ احساس قوی ہوتا جا رہا ہے کہ فیڈریشن کی مخالفت کرنے میں کانگرس زیادہ مستعدی نہیں دکھائے گی بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ فیڈریشن کی سب سے زیادہ مخالفت مسلمان کریں گے۔ تھوڑا عرصہ ہوا ڈاکٹر مونجے نے کھلے بندوں ۱۹۳۵ء کے فیڈریشن کی حمایت کی تھی اور دلیل یہ پیش کی تھی کہ فیڈریشن قائم ہونے کی صورت میں ہندوؤں کو مرکز میں کامل اقتدار حاصل ہو جائے گا"۔

اس کے بعد لارڈ زٹلینڈ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:۔

"میرے خطوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہماری بدستور یہی کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طرح فیڈریشن قائم کیا جائے لیکن جب میں حیدر آباد (دکن) کے واقعات پر نظر ڈالتا تھا اور کٹر مہاسبھائی ہندوؤں کے لیڈر ڈاکٹر مونجے کے اخباری بیان، میرے مطالعہ سے گزرتے تھے تو میرا اشہبِ خیال، مجھے بیس سال قبل کے بنگال کی طرف لے جاتا تھا جہاں میں نے اسلام کی ہمہ گیر اور مرکزی قوت کو بچشم خود دیکھا تھا، چنانچہ اب رہ رہ کر میرا یقین پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ آئندہ ہندوستان کی مرکزی حکومت کی تشکیل میں فیصلہ کن عنصر آل انڈیا مسلم لیگ کا طرز عمل ثابت ہو گا"۔

لارڈ بریبون نے اگست ۱۹۳۸ء میں جناح اور پنجاب کے وزیر اعظم سکندر حیات خاں سے جو ملاقاتیں کی تھیں ان کی روئداد بھی مجھے معلوم تھی[۱]۔ جناح کے متعلق لارڈ بریبون نے لکھا تھا کہ فیڈریشن کے مسئلہ پر وہ خلاف معمول بہت طیش میں تھے اور اکثر مسلمانوں کی طرح وہ بھی یہی

---

۱۔ ۱۹۳۸ء کی گرمیوں میں ہندوستان کے وائسرائے لارڈ لنلتھگو چند ماہ کی رخصت لے کر انگلستان چلے گئے تو ان کی جگہ بنگال کے گورنر لارڈ بریبون نے قائم مقام وائسرائے کے فرائض ادا کئے تھے۔

سمجھتے تھے کہ آپ اور لنلتھگو کانگرس سے در پردہ ساز باز کرنے میں مصروف ہیں، جناح نے آخر میں یہ کہہ کر مجھے کسی قدر حیران بھی کر دیا کہ ہمیں چاہئے کہ مرکزی حکومت کی ہیئت میں کوئی رد و بدل نہ کریں بلکہ اسے بالکل اسی طرح رہنے دیں اور اگر ہم نے کانگرسی صوبوں میں مسلمانوں کو کانگرس کے مظالم سے بچانے میں مسلم لیگ کی مدد کی تو مسلمان مرکز میں ہماری حفاظت کریں گے۔

کم و بیش اس سے ملتی جلتی لیکن نسبتاً زیادہ متوازن رائے سکندر نے دی اگرچہ وہ بھی جناح کی طرح فیڈریشن کے سخت خلاف تھے، انہوں نے مستقبل کا ذکر کرتے ہوئے مجھ سے کہا کہ آپ لوگ کیوں فیڈریشن کے پیچھے دیوانے ہو رہے ہیں اس طرح تو آپ اپنے آپ کو بالکل کانگرس کی جھولی میں ڈال دیں گے اگر آپ نے مسلمانوں سے انصاف کیا تو مسلمان بھی آڑے وقتوں میں آپ کی مدد کرنے سے دریغ نہیں کریں گے۔

"ہندوستان کی سیاست کا یہ ایک ایسا عنصر تھا جس سے ہمارے نقاد اور معترض غالباً بے خبر تھے اور اگر انہیں خبر تھی بھی تو انہوں نے عمداً اس سے آنکھیں بند کر لی تھیں جہاں تک میری ذات کا سوال ہے، آئندہ اس موضوع پر وائسرائے کے ساتھ میری جس قدر خط و کتابت ہوئی اس میں سراسر یہی عنصر حاوی رہا۔ ہندوستانی ریاستوں میں روز بروز کانگرس کی شورش بڑھتی جا رہی تھی، مقصد صرف یہ تھا کہ فیڈرل اسمبلی میں جو ریاستی نمائندے آئیں، انہیں ریاستوں کے حکمران نامزد نہ کریں بلکہ عوام منتخب کریں۔ میں نے اپنے ۲۴۔ جنوری ۱۹۳۹ء کے مکتوب میں وائسرائے کی توجہ کو اس طرف منعطف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:۔

"ظاہر ہے کہ ریاستوں میں جو شورش کانگرس نے برپا کر رکھی ہے اسے مسلم لیگ انتہائی تشویش کی نگاہ سے دیکھ رہی ہے کیونکہ کانگرس کو جس قدر کامیابی اس شورش میں ہوگی اسی نسبت سے فیڈرل اسمبلی میں بھی

اس کا اقتدار اور غلبہ بڑھ جائے گا، یہ واقعہ میرے اس خیال کو تقویت بخشتا ہے جس کا اظہار میں نے اپنے پچھلے خط میں کیا تھا یعنی اگر فیڈریشن کے قیام کی نوبت آئی تو مسلم لیگ کی مخالفت ہمارے لئے کانگرس کی مزاحمت سے کہیں زیادہ پریشان کن ثابت ہوگی"۔

۲۷۔ جون ۱۹۳۹ء کو لارڈ زٹلینڈ، وائسرائے کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:۔

"اس وقت صورت حال یہ ہے کہ والیان ریاست ہمیں غالباً فیڈریشن کے قریب جانے کی بھی اجازت نہیں دیں گے، جب یہ کیفیت ہے تو پھر اس بات کی چنداں ضرورت نہیں کہ میں مسلمانوں کی مزاحمت کا بھی ذکر کروں لیکن اس ضمن میں اتنی گزارش ضرور کرنا چاہتا ہوں کہ ہم اس فیڈریشن کا کیوں کر تصور کر سکتے ہیں جس میں پنجاب اور بنگال شامل نہ ہوں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب میں نے یہ لکھا تھا کہ مسلمان کبھی فیڈریشن کو معرض عمل میں لانے نہیں دیں گے تو اس سے ایک مراد میری یہ تھی کہ مسلمانوں کی رائے عامہ حیدر آباد جیسی ریاست کو فیڈریشن کی شرکت سے باز رکھے گی اور دوسری مراد یہ تھی کہ مسلمانوں کی اکثریت کے صوبے یہ کہہ کر فیڈریشن میں شامل ہونے سے انکار کر دیں گے کہ مجوزہ فیڈریشن میں جو تحفظات مسلمانوں کو عطا کئے گئے ہیں وہ بالکل ناکافی اور غیر تسلی بخش ہیں۔ میں حیران ہوں کہ اگر پنجاب اور بنگال نے یہ رویہ اختیار کیا تو ہم انہیں کیوں کر فیڈریشن میں شریک ہونے پر مجبور کر سکتے ہیں"۔

وائسرائے لارڈ لنلتھگو نے ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے صدر سر عبدالرحیم سے بھی فیڈریشن کے مسئلہ پر گفتگو کی تھی۔ اس سلسلے میں وائسرائے نے جون ۱۹۳۹ء میں ایک خط میں لارڈ زٹلینڈ کو لکھا:

"مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ وہ (سر عبدالرحیم) خاصے کٹر قسم کے انسان ہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ ان سے گفتگو کرنے کے بعد مجھے پتا چلا کہ ان کے فرقہ وارانہ جذبے میں کس قدر جوش ہے، انہوں نے صاف صاف کہا کہ اگر ہم نے فیڈریشن قائم کرنے کی کوشش کی تو میں مسلمانوں کو

مشورہ دوں گا کہ فیڈرل اسمبلی میں اپنے نمائندے بھیجنے سے انکار کر دیں"۔

ایک اور خط میں لارڈ زٹلینڈ وائسرائے کو لکھتے ہیں:۔

"مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کی تمام اقلیتوں کے نزدیک بالعموم اور مسلمانوں کے نزدیک بالخصوص جمہوریت کا نعرہ اپنی تمام جاذبیت اور دلکشی کھو چکا ہے۔ایک وقت تھا جب دھواں دھار تقریریں کرنے اور اخباری مقالے لکھنے والے جمہوریت کا شور مچاتے تھے تو مسلمان بھی اس سے متاثر ہوتے تھے لیکن حقائق کی چٹان سے ٹکرا کر یہ نعرہ اپنی تمام کشش ضائع کر بیٹھا ہے۔ یہی وہ اسباب ہیں جو ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے فیڈریشن کے قیام کی راہ میں حائل ہیں، ہندوستان کے ۹ کروڑ مسلمانوں کے دلوں میں یہ خطرہ شدت سے جاگزیں ہو چکا ہے کہ فیڈریشن میں وہ مستقل طور پر ہندوؤں کے غلام بن جائیں گے۔ اس خطرے سے چشم پوشی کرنا محال ہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۳۷ء کی صوبائی وزارتیں بن جانے کے بعد مسلمانوں کو جو شکایات پیدا ہوئی تھیں ان سے نہ وائسرائے بے خبر تھا اور نہ وزیر ہند، دونوں اچھی طرح جانتے تھے کہ مسلمان ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی کارگزاری سے قطعاً مطمئن نہیں، صوبائی خود مختاری نے اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کی جداگانہ ہستی کو عملاً ختم کر کے رکھ دیا تھا اور اگر فیڈریشن قائم ہو جاتا تو مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں پر بھی مستقلاً کانگرس کا قبضہ ہو جانا یقینی تھا۔ اس لئے یہ کہنا کہ ہندوستان میں فیڈریشن صرف اس لئے قائم نہ ہو سکا کہ ستمبر ۱۹۳۹ء میں عالمگیر جنگ چھڑ گئی تھی، میرے نزدیک اصل واقعات سے اغماض کرنا ہے۔ لارڈ زٹلینڈ کے جو خطوط اوپر نقل کئے گئے ہیں وہ جنگ چھڑنے سے پہلے کے ہیں، ان خطوں سے عیاں ہے کہ برطانوی حکومت کو بخوبی احساس تھا کہ بحالات موجودہ مسلمانان ہند پر زبردستی فیڈریشن مسلط نہیں کیا جا سکتا اور نہ مسلمان بطیب خاطر فیڈریشن قبول کریں گے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر فیڈریشن قائم نہیں ہو سکتا تھا تو پھر ہندوستان کی حکومت کس نوع کی ہونی چاہئے تھی؟

مجوزہ فیڈریشن کی ہیئت ترکیبی تین عناصر پر مشتمل تھی، ہندو، مسلمان، ہندوستانی ریاستیں۔
لارڈ زٹلینڈ اپنی اسی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:۔

"گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نے فیڈریشن کی قسمت والیان ریاست کے ہاتھوں میں دے دی تھی۔ اگرچہ گول میز کانفرنس کے مباحثہ میں ان والیان ریاست کے نمائندوں نے بظاہر فیڈریشن کی حمایت کی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ مجوزہ فیڈریشن کے تحت ہندوستان کے جملہ مخالف و متصادم عناصر اپنے اپنے مذہبی، نسلی اور لسانی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر یک جا ہو جائیں گے لیکن جب اس وعدے کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آیا تو ان ہی والیان ریاست نے ایسی کڑی شرطیں پیش کیں جن پر عمل کرنا مشکل تھا"۔

یہ تو ہوا ریاستوں کا طرز عمل، لیکن اس سارے ڈرامے میں کانگرس کی روش کیا تھی؟ ظاہر ہے ابتداء میں کانگرس بھی فیڈریشن کی مخالف تھی۔ اور مخالفت کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کے فیڈریشن میں ریاستوں کو شریک کیوں کیا گیا ہے۔ لیکن جب ۱۹۳۷ء میں صوبائی خود مختاری کا نفاذ ہوا اور کانگرس کو چھ صوبوں میں کامل اقتدار حاصل ہو گیا اور ساتھ ہی صوبہ سرحد، سندھ اور آسام میں اس نے مسلمانوں کی وزارتیں بھی درہم برہم کر ڈالیں تو اسے پورے برعظیم میں اپنی حکومت قائم کرنے کا خواب دکھائی دینے لگا تھا اور اس قسم کا خواب دیکھنا اس وقت بعید از قیاس بھی نہیں تھا۔

پنڈت جواہرلال نہرو اگرچہ اب بھی گاہے گاہے انقلاب کا نعرہ لگاتے تھے لیکن جن لوگوں کو کانگرس کے اندرونی حالات کا علم تھا وہ جانتے تھے کہ یہ انقلابی نعرہ محض فریب نفس اور فریب خیال پر مبنی تھا۔ کانگرس کی اندرونی پالیسی اور نظم و نسق پر سردار پٹیل کا قبضہ تھا اور انہوں نے ہوا کا رُخ پہچان کر فیڈریشن کی مخالفت ترک کر دی تھی۔ اب انہیں رہ رہ کر خیال ہوتا تھا کہ اگر ریاستی نمائندے بھی فیڈرل اسمبلی میں کانگرس کی ہم نوائی پر آمادہ ہو جائیں تو پورا ہندوستان ان کے زیر نگیں ہو گا۔ چنانچہ انہوں نے نہایت ہوشیاری سے مختلف ریاستوں میں پرجا پارٹیاں بنوا کر والیان ریاست کے خلاف شورش پیدا کر دی، مقصد بظاہر یہ تھا کہ حکومت عوامی بنیادوں پر قائم ہونی چاہئے لیکن در پردہ غرض و غایت یہ تھی کہ والیان ریاست کو مجبور کیا جائے کہ فیڈرل اسمبلی میں عوام اپنے نمائندے منتخب کر کے بھیجیں۔

لارڈ زٹلینڈ، اس صورت حال پر بحث کرتے ہوئے اپنی سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ:۔ "والیانِ

ریاست نے جو روش اختیار کی (یعنی فیڈریشن کی مخالفت) ________
اس کی اہم وجہ یہ شورش تھی جو کانگرس نے ریاستوں میں شروع کرا دی تھی۔ اس شورش کی غرض و غایت یہ تھی کہ والیان ریاست کو مجبور کیا جائے کہ وہ فیڈرل اسمبلی میں خود اپنے نمائندے منتخب نہ کریں بلکہ عوام کو اختیار دیں کہ انہیں منتخب کر کے بھیجیں. کانگرس کو یقین تھا کہ ریاستوں کے جو نمائندے فیڈرل اسمبلی میں آئیں گے وہ والیان ریاست کی ہاں میں ہاں ملانے کی بجائے کانگرسی اکثریت کے بآسانی حامی ہو سکتے ہیں۔

"ظاہر ہے کانگرس کے ان ہتھکنڈوں کا اثر مسلمانوں پر پڑنا لازمی تھا چنانچہ انہیں اس خطرے کا جو روز بروز قوی ہوتا جارہا تھا یقین ہو گیا کہ مجوزہ فیڈریشن انجام کار ہندو راج بن کر رہے گا۔ ان ہی دنوں ہز اگزالٹڈ ہائنس نظام نے وائسرائے کو مطلع کر دیا کہ وہ پیش کردہ شرائط پر فیڈریشن میں شریک ہونے کو تیار نہیں ہیں"۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ مسلم لیگ نے کانگرس کی مخالفت میں اس حد تک غلو کیا کہ ریاستوں کی شورش میں عوام کا ساتھ دینے کی بجائے والیان ریاست کا ساتھ دینا گوارا کیا جو سراسر جمہوری اور عوامی روح کے خلاف تھا. یہ صحیح ہے کہ جمہوری اور عوامی روح کا تقاضا یہی تھا کہ اس جدوجہد میں عوام کا ساتھ دیا جاتا اور ریاستوں کے اس فرسودہ نظام کو جو شخصی استبداد پر قائم تھا ختم کرنے کی سعی کی جاتی. لیکن سوال یہ تھا کہ اس نام نہاد "عوامی تحریک" سے کانگرس کا مقصد کیا تھا؟ ظاہر ہے کانگرس کا مقصد وہی تھا جسے لارڈ زٹلینڈ نے واشگاف طور پر بیان کیا ہے یعنی فیڈرل اسمبلی میں ہندو راج قائم کرنے کی کوشش۔ مسلم لیگ اس کوشش میں کانگرس کی شریک و سہیم کیوں کر بن سکتی تھی؟

اگر کانگرسی لیڈروں میں تدبر کا مادہ ہوتا تو وہ اس قسم کے ہتھکنڈے اختیار کرنے کی بجائے براہ راست مسلم لیگ سے مفاہمت کرتے. مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرتے اور مسٹر جناح کی قیادت کو تسلیم کرتے لیکن انہوں نے مسلمانوں کو پس پشت ڈال کر ایک طرف برطانوی حکومت سے سمجھوتہ کر لیا تاکہ صوبائی حکومتوں سے بآسانی مسلمانوں کو خارج کیا جا سکے اور دوسری طرف والیان ریاست کو دھمکیاں دیں کہ اگر ہمارے حسب منشاء نمائندے منتخب کر کے فیڈرل اسمبلی میں نہیں بھیجو گے تو ہم تمہارا تختہ الٹ دیں گے. ان حالات میں مسلم لیگ نے جو کچھ کیا وہ حفاظت

خود اختیاری کے تقاضے کے عین مطابق تھا[1]۔

میں یہاں ایک واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ غلط فہمیاں کیوں کر پیدا ہوتی ہیں اور انہیں پھیلنے کا موقع کیوں کر دیا جاتا ہے۔ ۱۳۔ جنوری ۱۹۶۱ء کو لندن کی اوور سیز لیگ کے ہال میں قائداعظم کے یوم ولادت کی تقریب کے سلسلے میں ایک جلسہ ہوا جس کی صدارت پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر سجاد حیدر صاحب نے کی تھی، جلسے میں ایک صاحب مسٹر محمد نعمان نے بھی تقریر کی، نعمان صاحب کا دعویٰ ہے کہ وہ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۸ء تک قائداعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے، مسٹر نعمان نے اپنی تقریر میں بعض ایسی باتیں کہیں جن کا علم آج تک کسی شخص کو نہیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ وہ چونکہ قائداعظم کے سیکرٹری تھے، لہٰذا ان باتوں کا علم سوائے ان کی ذات گرامی کے اور کسی کو نہیں ہو سکتا۔

## ۱۳۔ جنوری کے اس جلسے کی مکمل روئداد

لندن کی پاکستان سوسائٹی نے باقاعدہ اپنے ششماہی بلٹن نمبر ۱۵ میں شائع کر دی ہے اس طرح گویا نعمان صاحب کی تقریر کو ایک قسم کی سرکاری حیثیت حاصل ہو گئی ہے اور کل کو اگر قائداعظم کے کسی سوانح نگار نے اس تقریر دل پذیر کا اقتباس اپنی کتاب میں درج کر دیا تو لوگ اسے حقیقت ثابتہ سمجھ کر قبول کرنے پر مجبور ہوں گے، نعمان صاحب کا ارشاد ہے:

---

[1]۔ میرے ایک مخدوم و مکرم دوست جن کے علم و فضل کا میں بڑا معترف ہوں اور جنھوں نے اپنی زندگی کے پچیس سال سیاسی سرگرمیوں میں گزارے ہیں، اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے ایک مکتوب گرامی میں مجھ کو لکھتے ہیں کہ:

"کم از کم میری رائے یہی ہے کہ مسٹر جناح انگریزوں کے ترک ہند کے باب میں غلط فہمیوں میں مبتلا تھے، وہ سمجھتے تھے کہ انگریز جائیں گے نہیں اور ریاستیں اس حکومت کا ساتھ دیں گی جو روساء کے معاملات میں کم سے کم مداخلت کرے گی۔ انگریز ریاستوں کے طرز عمل کی تائید کریں گے۔ لیکن یہ تصور غلط تھا اور غلط ثابت ہوا۔ یہ تصور خدمت عوام کے نقطہ نگاہ سے بھی غلط تھا۔ خدمت عوام کا تقاضا یہ تھا کہ رئیسوں کو نہیں، بلکہ ریاستوں کے عوام کو پیش نظر رکھا جاتا۔ ان کی بہبود کو مقدم سمجھا جاتا اور وہ رئیسوں کے تغلب و تصرف پر پابندیاں عائد کئے بغیر پوری نہ ہو سکتی تھیں۔ اس باب میں لیگ نے ابتداء سے جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ میرے نزدیک مناسب نہ تھا۔"

یہ صحیح ہے کہ خدمت عوام کا تقاضا یہی تھا کہ رئیسوں کو نہیں بلکہ ریاستوں کے عوام کو پیش نظر رکھا جاتا اور انہی کی بہبود کو مقدم سمجھا جاتا لیکن میدان جنگ کی طرح سیاست میں بھی کوئی قطعی اور غیر متبدل روش اختیار نہیں کی جا سکتی۔ دیکھا صرف یہ جاتا ہے کہ غنیم کون سی چال چل رہا ہے اور کدھر سے حملہ آور ہونا چاہتا ہے اور اس کا توڑ کیا ہونا چاہئے۔ اگر وقتی طور پر پیچھے ہٹ جانے میں مصلحت ہو تو ہم اس سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ کئی مرتبہ دشمن کی جمی ہوئی مضبوط صفوں میں انتشار پیدا کرنے کے لئے ہم مصنوعی طور پر میدان چھوڑ کر بھاگ اٹھتے ہیں، دشمن ہمارا تعاقب کرتا ہے اور یہ دیکھ کر کہ اس کی صفوں میں انتشار پیدا ہو

"مجھے ایک واقعہ یاد ہے مسٹر جناح نے جب مسلم لیگ کی تنظیم شروع کی تھی تو لیگ بالکل ابتدائی مراحل میں تھی اور سرمائے کی سخت قلت تھی۔ اس وقت ریاست حیدر آباد کے وزیر اعظم سر اکبر حیدری، قائداعظم کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اعلیٰ حضرت نظام، مسلم لیگ کی تنظیم کے لئے آپ کو پچیس لاکھ روپے کی رقم دینے کو تیار ہیں، بشرطیکہ آپ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے فیڈریشن کی مخالفت ترک کر دیں، لیکن قائداعظم نے حقارت سے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا اس کے بعد انہوں نے سر اکبر حیدری کی اس جسارت کو کبھی معاف نہ کیا۔"

چونکہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب نعمان صاحب قائداعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے اس لئے ظاہر ہے کہ ۱۹۳۷ء یا ۱۹۳۸ء ہی کا ذکر ہو سکتا ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ یعنی اکتوبر ۱۹۳۷ء تک قائداعظم کے پاس کوئی پرائیویٹ سیکرٹری نہیں تھا۔ نعمان صاحب کے سیکرٹری بننے کی کوئی قطعی تاریخ بھی ہمیں معلوم نہیں، اجلاس لکھنؤ کے وقت وہ غالباً علیگڑھ میں طالب علم تھے اس لئے اگر انہیں قائداعظم کے سیکرٹری بننے کا شرف حاصل ہوا تھا تو یقیناً اکتوبر ۱۹۳۷ء کے بعد ہی ہوا ہو گا۔

---

گیا ہے۔ ہم دل جمعی سے پلٹ کر پھر میدان میں ڈٹ جاتے ہیں۔ یہ سب جنگی چالیں ہیں جو وقتی تقاضوں کے تحت بدلتی رہتی ہیں۔

میں ماضی بعید کا ذکر نہیں کرتا۔ جو دور ہماری آنکھوں کے سامنے گزرا ہے اس کی ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ جب جرمنی میں ہٹلر کا عروج ہوا تو روس نے مغربی طاقتوں بالخصوص فرانس اور برطانیہ کو بار بار پکارا کہ آؤ ہم سب مل کر ایک "اجتماعی حفاظت" (Collective Security) کا پروگرام بنائیں۔ مقصد غالباً یہ تھا کہ روس کو چونکہ اپنے سر پر نازی جرمنی کا خطرہ منڈلاتا ہوا نظر آ رہا تھا لہٰذا اس خطرے سے بچنے کے لئے اس نے چاروں طرف ہاتھ پاؤں مارنا شروع کئے کہ جہاں سے بھی امداد مل سکتی ہے حاصل کی جائے لیکن برطانیہ میں روس اور اس کے "بالشوزم" کو شک و شبہ ہی نہیں بلکہ نفرت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ چنانچہ برطانیہ کی درپردہ شہ ہٹلر کو حاصل رہی کیونکہ برطانوی مدبروں کا خیال تھا کہ ہٹلر کی طاقت سے روس اور اس کے "بالشوزم" کی سرکوبی کرائی جا سکے گی۔ اس پالیسی نے ستمبر ۱۹۳۸ء میں میونک پیکٹ کروایا اور برطانیہ نے نہایت خیرہ چشمی سے چیکوسلواکیہ کا ایک بہت بڑا حصہ چپکے سے ہٹلر کے حوالے کر دیا اور یہ تمام سودا روس سے بالا بالا چکایا گیا۔ ادھر روس نے جب یہ نقشہ دیکھا تو خون کا گھونٹ پی کر خاموش ہو رہا حتیٰ کہ جب ۱۵ مارچ ۱۹۳۹ء کو ہٹلر کی فوجیں یلغار کرتی ہوئی پراگ میں داخل ہو گئیں اور پورے چیکوسلواکیہ پر اس نے قبضہ کر لیا تو اس وقت بھی برطانوی مدبروں نے اس فتنے کا سدباب کرنے کے لئے روس کے ساتھ مفاہمت کرنا گوارا نہ کیا اور بدستور اسے یورپ کی برادری سے خارج کئے رکھا۔

اس حادثے کے بعد سٹالن کو یقین ہو گیا کہ برطانیہ اور فرانس مل کر نہایت ہوشیاری بلکہ مکاری سے ہٹلر کو روس پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دے رہے ہیں۔ چنانچہ سٹالن نے اس نازک موقع پر اپنی حکمت عملی کے ترکش کا آخری تیر چلا دیا اور وہی کچھ

اجلاس لکھنؤ تک آل انڈیا مسلم لیگ کو چنداں اہمیت حاصل نہ تھی ۔ لیگ کے متعلق کانگرس اور برطانوی حکومت کے رویئے میں جو کچھ تبدیلی ہوئی وہ اکتوبر ۱۹۳۷ء کے بعد ہوئی۔

مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو نے بھی اجلاس لکھنؤ کے بعد قائداعظم سے خط و کتابت شروع کی تھی، یوں بھی یہ حقیقت ہے کہ قائداعظم نے مسلم لیگ کی تنظیم کا اصل کام اکتوبر ۱۹۳۷ء کے بعد شروع کیا تھا اس لئے اگر مسٹر نعمان کے الفاظ پر اعتماد کر لیا جائے تو یہ پچیس لاکھ کی پیشکش کا واقعہ بہرصورت اجلاس لکھنؤ کے بعد ہوا ہو گا۔

نعمان صاحب کے اس حیرت انگیز انکشاف سے دو نتائج بر آمد ہو سکتے ہیں۔

اول:۔ حضور نظام اور سر اکبر حیدری گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے فیڈریشن کے حامی تھے۔

دوم:۔ قائداعظم فیڈریشن کے سخت مخالف تھے اور نظام حیدر آباد اور سر اکبر حیدری کی کوشش تھی کہ قائداعظم کو کسی نہ کسی طرح فیڈریشن قبول کرنے پر رضامند کیا جائے اسی غرض کے لئے انہیں پچیس لاکھ کی رقم پیش کی گئی تھی۔

---

کیا جو حفاظت خود اختیاری کا فطری تقاضا تھا۔ اس نے ہٹلر سے اپنے تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر وہ مشہور معاہدہ کر لیا جس نے عالمگیر سیاست کا رخ ہی بدل ڈالا۔ نازیت اور اشتراکیت کا باہمی اختلاف ختم ہو گیا اور ہٹلر، روس سے مطمئن ہو کر فرانس پر پل پڑا۔ ۱۹۴۱ء میں جو کچھ ہوا وہ بھی عہد حاضر کی تاریخ کا ایک دلچسپ باب ہے، یعنی روس، برطانیہ اور امریکہ کا حلیف بن کر جرمنی کی بیخ کنی پر آمادہ ہو گیا۔

سیاسیات میں کوئی چیز حرف آخر نہیں، صرف تغیر پذیر حالات کے تحت پالیسی وضع کی جاتی ہے اور وقتاً فوقتاً اس پر نظر ثانی بھی ہوتی رہتی ہے۔

مسٹر جناح ہرگز والیان ریاست کے حامی نہ تھے۔ انہوں نے ابتداء میں فیڈریشن کی مخالفت ہی صرف اس لئے کی تھی کہ فیڈرل اسمبلی میں جو ریاستی نمائندے آئیں گے، انہیں رؤساء نامزد کریں گے اور اس طرح برطانوی ہند کی سیاست بھی ریاستوں کی رجعت پسندی سے ملوث ہو کر رہ جائے گی اور ہم مکمل ذمہ دارانہ " حکومت سے محروم ہو جائیں گے۔ انہوں نے گول میز کانفرنس میں بھی والیان ریاست کی مخالفت کی تھی۔ ۲ مارچ ۱۹۳۶ء کو انہوں نے لاہور آ کر اپنی ایک تقریر کے دوران میں کہا تھا:

> "............ میں نے گول میز کانفرنس میں والیان ریاست کو بھی ناراض کیا کیونکہ میں ان کی پس پردہ اور خفیہ کارروائیوں کو قطعاً پسند نہیں کرتا تھا اور میں نے ان کو بے نقاب کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔"

واقعہ یہ ہے کہ جب کانگرس نے مسلمانوں کی جداگانہ قومی ہستی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور وائسرائے اور

سر اکبر حیدر آبادی کا انتقال ہو چکا ہے. نظام کو زندہ در گور سمجھنا چاہیئے۔ قائداعظم بھی رحلت فرما چکے ہیں۔ اندریں حالات نعمان صاحب کی اس روایت کی تصدیق یا تردید کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں. اس وقت ہندوستان کے وائسرائے لارڈ لنلتھگو اور وزیر ہند لارڈ زٹلینڈ تھے۔ یہ دونوں بھی اس جہان فانی سے رخصت ہو چکے ہیں، البتہ لارڈ زٹلینڈ کی خود نوشت سوانح عمری جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں ہمارے پاس موجود ہے. لارڈ موصوف اس کتاب کے صفحہ ۲۴۵ پر لکھتے ہیں۔

"گول میز کانفرنس میں جن لوگوں نے بڑھ چڑھ کر فیڈریشن کی حمایت کی ان میں ریاست حیدر آباد کے وزیراعظم سر اکبر حیدری بھی تھے. جو ایک نہایت تجربہ کار، قابل، خوش اخلاق اور خوش اطوار انسان ہیں لیکن جب جنوری ۱۹۳۷ء میں وائسرائے نے اپنا ایک خاص نمائندہ والیان ریاست کے پاس بھیجا کہ فیڈریشن کے بارے میں ان کا عندیہ معلوم کیا جائے تو سر اکبر حیدری نے مخالفانہ رویئے کا اظہار کیا اور میں نے اسی وقت محسوس کر لیا تھا کہ ہوا کا رخ بدل گیا ہے. پندرہ روز کے بعد

---

گورنروں نے بھی مسلمانوں کی دادرسی کرنے کی بجائے کانگرس سے یگانگت پیدا کر لی تو ہمارے سامنے سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ اپنے قومی حفظ و بقاء کے لئے آئندہ ہندوستان میں فیڈریشن قائم نہ ہونے دیں۔ کانگرس در پردہ فیڈریشن کی حامی بن گئی تھی لہٰذا ہمیں غنیم کی ہر چال کا جواب نئے ڈھنگ سے سوچنا پڑا۔ اسی چیز نے ہمیں مجبور کیا کہ اس ایجی ٹیشن کی مخالفت کی جائے جو کانگرس نے ریاستوں میں محض اس لئے شروع کرا دی تھی کہ رؤساء پر دھونس جما کر اپنے حسب منشاء نمائندے منتخب کروائے جائیں اور انہیں فیڈرل اسمبلی میں لا کر ہندو راج کے منصوبے کو مضبوط بنایا جائے۔

رہی یہ بات کہ مسٹر جناح انگریزوں کے ترک ہند کے باب میں غلط فہمیوں میں مبتلا تھے اور سمجھتے تھے کہ انگریز جائیں گے نہیں، گزارش یہ ہے کہ ۱۹۳۸ء میں تو کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ نو سال کے بعد انگریز دامن جھاڑ کر ہندوستان سے رخصت ہو جائے گا۔ حتیٰ کہ ۱۹۴۵ء میں جب جنگ ختم ہوئی اس وقت بھی کیا کانگرس اور کیا لیگ عام تاثر یہی تھا کہ ہندوستان پر برطانوی قبضہ آئندہ دس بیس سال اور جاری رہے گا۔

البتہ اس بات کا اعتراف کرنے میں مجھے کوئی تامل نہیں کہ ریاستوں کے بارے میں ہم نے جو روش اختیار کی تھی. وہ محض ایک عارضی اور وقتی پالیسی تھی جسے کچھ عرصہ بعد خود بخود ترک کر دینا چاہئے تھا لیکن ہم نے اس کو اس قدر طول دیا کہ عواقب سے بے پروا ہو کر ۱۹۴۷ء تک بے دریغ اسی روش پر قائم رہے حتیٰ کہ اگست ۱۹۴۷ء میں جب تقسیم ہند کی نوبت آئی تو ہم نے پاکستان اور ہندوستان سے ریاستوں کے الحاق کا اختیار عوام کو نہیں بلکہ رؤساء کو دے دیا. محض اس خیال سے کہ ہم چونکہ رؤساء کے حامی ہیں. لہٰذا وہ اپنی ریاستوں کا الحاق پاکستان سے کریں گے۔ یہ ایک ایسی کوتاہ اندیشی اور کج نظری تھی جس کا بیسویں صدی کے جمہوری دور میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا جو المناک انجام ہوا وہ ہمارے سامنے ہے۔

جب وائسرائے کا خط آیا تو اس سے معلوم ہوا کہ حیدر آباد میں فیڈریشن کے خلاف وسیع پیمانے پر ایجی ٹیشن جاری ہے، میں نے فوراً وائسرائے کو جواب دیا کہ اکبر حیدری نے جو مخالفانہ رویہ اختیار کیا ہے اس کی وجہ بھی غالباً یہی ایجی ٹیشن ہے"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جنوری ۱۹۳۷ء ہی میں سر اکبر حیدری فیڈریشن کے خلاف ہو چکے تھے، ۱۴۔ مارچ ۱۹۳۸ء کو لارڈ زٹلینڈ نے وائسرائے کو لکھا:۔

"چند روز ہوئے میں نے نظام کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا خط دیکھا ہے۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ انہیں فیڈریشن میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی، جسے انہوں نے قطعی طور پر مسترد کر دیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ کسی شرط پر فیڈریشن میں شامل نہیں ہوں گے"۔

۱۶۔ مئی ۱۹۳۸ء کو لارڈ زٹلینڈ پھر وائسرائے کو لکھتے ہیں:۔

"حیدری نے جو خط گلینسی کو لکھا ہے وہ میں نے بڑی دلچسپی سے پڑھا لیکن مجھے حیرت بالکل نہیں ہوئی۔ میں تو قبل ازیں آپ کو اطلاع دے چکا ہوں کہ نظام نے ہمارے گلینسی کو ایک پرائیویٹ مکتوب میں لکھا ہے کہ وہ مجوزہ شرائط کے تحت فیڈریشن میں شریک ہونے پر ہرگز آمادہ نہیں۔ ہمارے گلینسی سے مراد ان کے ہم نام گلینسی نہیں جو آپ کے وہاں ہندوستان کی سول سروس کے ایک افسر ہیں"۔

اسی خط میں آگے چل کر لارڈ زٹلینڈ لکھتے ہیں:۔

"چند روز ہوئے مولانا حسرت موہانی مجھ سے ملنے آئے تھے۔ بڑے میاں خود ہی بولتے رہے، مجھے تو انہوں نے زبان کھولنے کا موقع بھی نہیں دیا۔ ملاقات بہرحال دلچسپ رہی ان کی رائے ہے کہ نظام کبھی فیڈریشن میں شریک نہیں ہوں گے بلکہ وہ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ نظام کسی ایسے دستور کو قبول نہیں کریں گے جس سے ہندوستان میں ہندو راج قائم ہونے کا احتمال ہو"۔

۱۶۔ جون ۱۹۳۸ء کو وائسرائے نے لارڈ زٹلینڈ کو ایک خط میں لکھا:۔

"گزشتہ چند روز کا سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ بمبئی میں والیان ریاست اور ان کے وزراء کا جلسہ ہوا تھا جس میں حیدر آباد کے وزیر اعظم

سرا کبر حیدری بھی شریک ہوئے تھے۔ وہاں ایک قرار داد کے ذریعہ سے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ مجوزہ فیڈریشن کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ریاستوں کے اس فیصلے نے برطانوی ہند کے فیڈریشن کو بھی معلق بلکہ غیر یقینی بنا دیا ہے"۔

اس واقعہ کے سال بھر بعد ۱۰ اگست ۱۹۳۹ء کو وائسرائے نے ایک خط لارڈ زٹلینڈ کو لکھا۔

"نظام تو گویا ہوا کے گھوڑے پر سوار ہے اور کوئی بات بھی ماننے کو تیار نہیں، مجھے یقین ہے کہ اس کے پیچھے جناح کا ہاتھ کام کر رہا ہے"۔

لارڈ زٹلینڈ نے ۱۹۔ اگست کو جواب میں لکھا۔

"آپ کے اس بیان نے مجھے فکر مند بنا دیا ہے کہ فیڈریشن کے بارے میں نظام کے فرقہ وارانہ جذبات کو برانگیختہ کرنے میں جناح کا ہاتھ ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے مولانا حسرت موہانی کی ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے آپ کو لکھا تھا کہ مولانا کی رائے ہے کہ نظام کبھی فیڈریشن قبول نہیں کریں گے وہ بات درست معلوم ہوتی ہے"۔

جہاں تک مسٹر نعمان کے دعویٰ کا تعلق ہے ہمارے پاس ایسی کوئی شہادت نہیں جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ سرا کبر حیدری نے پچیس لاکھ کی رقم قائداعظم کو پیش کی تھی کہ وہ فیڈریشن کی مخالفت ترک کر دیں۔ ہاں نعمان صاحب کے اس دعویٰ کی تردید میں لارڈ زٹلینڈ کی خود نوشت سوانح عمری کے محولہ بالا اقتباسات زبان حال سے پکار پکار کر شہادت دے رہے ہیں۔

لامحالہ یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس پچیس لاکھ کی پیشکش کے واقعہ کا علم سوائے نعمان صاحب کے اور کسی کو نہیں؟ اس وقت بیسوں نہیں سینکڑوں آدمی موجود ہیں جنہیں وقتاً فوقتاً قائداعظم سے ملنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ بعض ایسے بھی ہیں جو برسوں قائداعظم کی سیاسی زندگی میں ان کے شریک و سہیم رہے کیا ان افراد میں سے کوئی بھی موجود ہے جس سے قائداعظم نے پچیس لاکھ کے واقعہ کا ذکر کیا تھا؟ اگر نہیں کیا تو پھر کیا ہم یہ باور کر لیں کہ اس فرش زمیں کے اوپر اور اس سقف آسماں کے نیچے تنہا محمد نعمان صاحب ہی کی ایک ذات گرامی ہے جس سے قائداعظم اپنے دل کا راز بیان کیا کرتے تھے؟

اوپر جہاں اس چیز کا ذکر کیا گیا ہے کہ کانگرس در پردہ فیڈریشن کی حامی تھی اور چاہتی تھی کہ ریاستوں سے اپنے حسب منشاء نمائندے منتخب کرا کے مرکزی فیڈرل اسمبلی میں لائے تاکہ جلد

از جلد پورا ہندوستان اس کی زیرِ نگیں آ جائے۔ میں ضمناً ایک اہم واقعہ کا ذکر کرنا بھول گیا تھا جو یہاں درج کرتا ہوں۔

لارڈ لودین جنوری ۱۹۳۸ء میں ہندوستان گئے تھے اور وردھا جاکر گاندھی جی سے بھی ملے تھے۔ لارڈ موصوف کے متعلق اتنا عرض کر دینا کافی ہو گا کہ وہ گول میز کانفرنس کے تمام اجلاسوں میں برطانوی حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے شریک رہے تھے۔ ۱۹۳۱ء میں وزیر ہند کے انڈر سیکرٹری تھے پھر انہیں فرنچائز سب کمیٹی کا صدر بنا کر ہندوستان بھیجا گیا تھا اور یہ ان ہی کی سفارش کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان کی آبادی میں سے ۴۳ فیصد بالغ مردوں اور دس فیصد بالغ عورتوں کو حق رائے دہندگی عطا ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں لارڈ لودین کو امریکہ میں برطانیہ کا سفیر مقرر کیا گیا جہاں دسمبر ۱۹۴۰ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

لارڈ لودین ۲۵۔ جنوری ۱۹۳۸ء کو مہاتما گاندھی سے ملے، گاندھی جی نے ایک کاغذ پر یہ عبارت لکھ کر لارڈ موصوف کے حوالے کی کہ اِسے برطانوی مُدبّروں کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

"میری دلی خواہش ہے کہ کانگرس کو ہندوستان کی تمام قوموں کی واحد اور تنہا نمائندہ جماعت تسلیم کیا جائے، کیونکہ صرف کانگرس انگریزی حکومت کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور ہندوستان کی نیابت کرنے کا دعویٰ کر سکتی ہے، صرف یہی ایک پارٹی ہے جس نے روزِ اوّل سے ہندوستان کی تمام اقلیتوں کی نمائندگی کی ہے"۔

"اگر برطانوی حکومت کانگرس کی اس یگانہ حیثیت کو تسلیم کر لے تو حکومت کو اس پر بھی چنداں اعتراض نہیں ہونا چاہئے کہ جب تک کانگرس کی شرطیں نہ مان لی جائیں گی، فیڈریشن کا نفاذ ملتوی رکھا جائے گا، سب سے ضروری شرط یہ ہے کہ ریاستوں کے جتنے نمائندے فیڈرل اسمبلی میں شامل کئے جائیں اُنہیں رؤساء نامزد نہ کریں بلکہ عوام منتخب کر کے بھیجیں، اگر یہ شرط قبول کئے بغیر فیڈریشن نافذ کرنے کی کوشش کی گئی تو ملک بھر میں ایک خطرناک سیاسی بحران پیدا ہو جائے گا"۔

"کانگرس کی یہ شرطیں مان لینے کے بعد بھی ہم ۱۹۳۵ء کے

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی مخالفت جاری رکھیں گے کیونکہ حقیقی اور پائیدار امن جبھی ہو گا کہ موجودہ ایکٹ کی بجائے کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی اپنا دستور وضع کر کے ملک میں نافذ کرے، تاہم ایک مرتبہ کانگریس کا صحیح مقام اور اُس کی نمائندہ حیثیت کو برطانوی حکومت اچھی طرح تسلیم کر لے تو فی الجملہ باقی امور بآسانی طے ہو سکیں گے"۔

یہ تحریر لارڈلودین کے حوالے کر کے گاندھی جی نے زبانی کہا کہ

"میری رائے میں اگر وائسرائے لارڈ لنلتھگو کانگرس کے موجودہ صدر سبھاش چندر بوس سے گفتگو کر کے کانگرس کا یہ دعویٰ کہ وہی ہندوستان کی تنہا نمائندہ جماعت ہے، تسلیم کر لیں تو بہتر ہو گا، رہا فیڈریشن کا نفاذ، اِس کے متعلق میری تجویز ہے کہ جوں ہی والیانِ ریاست نے میری شرط قبول کر لی، فیڈریشن قائم کیا جا سکے گا[۱]"۔

اس سلسلے میں کانگرس کے صدر سبھاش چندر بوس کا بھی ایک بیان ملاحظہ فرمائیے کہ کانگرس مسلمانوں سے بے نیاز ہو کر فیڈریشن کے قیام کی خواہش مند تھی یا نہیں، ۲۶۔ دسمبر ۱۹۳۸ء کو یعنی مہاتما گاندھی کے مذکورہ بالا بیان سے سال بھر بعد سبھاش چندر بوس نے بمبئی کے اخبار نویسوں کے ایک اجتماع میں کہا کہ فیڈریشن کے متعلق کانگرس کی پالیسی عدم تعاون پر مبنی ہے لیکن یہ عدم تعاون کس مرحلے پر ہو گا، یعنی فیڈرل اسمبلی کے انتخابات کے وقت یا فیڈرل حکومت میں وزارتیں قبول کرتے وقت، اِس مسئلے کی تفصیلات بعد میں طے کی جائیں گی، بہرحال اِس قسم کے عدم تعاون کا یہ مطلب نہیں کہ فیڈرل اسمبلی کے انتخابات کا بائیکاٹ کیا جائے، دیکھا صرف یہ جائے گا کہ آیا انتخاب میں حصہ لینے سے کانگرس کی حیثیت مستحکم ہوتی ہے یا نہیں[۲]"۔

چودھری خلیق الزماں صاحب نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھا ہے[۳] کہ وہ اور

---

۱۔ Lord Lothian" (1960) by J.R.M Butler

۲۔ روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" مورخہ ۲۸ دسمبر ۱۹۳۸ء

۳۔ Pathway to Pakistan
سمجھ میں نہیں آتا کہ چودھری صاحب نے اپنی خود نوشت سوانح عمری کا یہ نام کیوں رکھا ہے، غالباً پاکستان کے لفظ سے اپنی ذات گرامی کی اہمیت میں اضافہ کرنا مقصود ہے۔

حکایت قدآں یار دلنواز کنیم     بایں فسانہ مگر عمر خود دراز کنیم

عبدالرحمٰن صدیقی مرحوم ۲۰ ۔ مارچ ۱۹۳۹ء کو لندن میں لارڈ زٹلینڈ سے ملے اور اُنہیں پہلی مرتبہ پاکستان کے تصور سے آشنا کیا۔ اس سلسلے میں چودھری صاحب نے برطانیہ کے ڈپٹی ہائی کمشنر متعینہ ڈھاکہ کے توسّل سے ایک خط بھی لندن کے کامن ویلتھ آفس سے منگوا کر اپنی کتاب میں شائع کیا ہے۔

اگر چودھری صاحب کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ لارڈ زٹلینڈ سے اپنی ملاقات کا حال بیان کریں تو لاریب یہ ملاقات ضرور ہوئی تھی۔ آخر مولانا حسرت موہانی بھی تو لندن آکر لارڈ زٹلینڈ سے ملے تھے اور بقول لارڈ موصوف کے جب مولانا کے دریائے تکلّم کی بے پناہ روانی شروع ہوئی تو لارڈ زٹلینڈ بچارے ہزار کوشش کے باوجود مولانا کی بات کاٹنے کی جرأت نہ کر سکے۔ پھر چودھری صاحب اور عبدالرحمٰن صدیقی بھی اگر وزیر ہند سے ملے تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔

آیئے دیکھیں کہ لارڈ زٹلینڈ خود اس بارے میں کیا کہتے ہیں. موصوف اپنی خودنوشت سوانح عمری کے صفحہ نمبر ۲۴۸ پر رقمطراز ہیں۔

"میں نے جب ۲۸۔ مارچ ۱۹۳۹ء کو وائسرائے کو خط لکھا تو دو ہندوستانی مسلمانوں یعنی مسٹر عبدالرحمٰن صدیقی اور مسٹر خلیق الزماں سے اپنی ملاقات کا حال بھی بیان کیا"۔

وائسرائے کے نام جو خط لکھا گیا تھا اس کا اقتباس یہ ہے۔

"کچھ دیر بیٹھے وہ یوں ہی مسئلہ فلسطین کے متعلق رسمی سی باتیں کرتے رہے. پھر اُنہوں نے وہ موضوع چھیڑ دیا جس پر وہ حقیقتاً مجھ سے گفتگو کرنے کے لئے آئے تھے. یعنی اگر ۱۹۳۵ء کے دستور کے مطابق ہندوستان میں فیڈریشن قائم ہوا تو مسلمانوں کا حشر کیا ہو گا. اس پر وہ کسی قدر جوش میں آکر کہنے لگے کہ اگر یہ سکیم نافذ ہوئی تو مسلمان کبھی اسے قبول نہیں کریں گے. میں نے جواب میں کہا کہ کیا فیڈریشن کے مقابلے میں کوئی متبادل سکیم آپ پیش کر سکتے ہیں"؟

"کہنے لگے کہ ہاں ہمارے پاس ایسی سکیم ہے اور وہ یہ کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں اور ریاستوں کو ملا کر ایک کی بجائے تین یا چار فیڈریشن بنا دیئے جائیں جن کو باہمی طور پر منسلک رکھنے کے لئے ایک مختصر سی مرکزی حکومت بھی ہو. مقصد اس تمام سکیم سے یہ تھا کہ مرکز میں مسلمانوں کو اتنا ہی اقتدار حاصل ہو جائے جتنا کہ ہندوؤں کو ہو گا"۔

جب اس سکیم کی تفصیلات پر بحث شروع ہوئی تو اُن کے خیالات میں بہت کچھ ابہام تھا. بہرحال جو نتیجہ اُن کی گفتگو سے اخذ کر سکا ہوں، وہ یہ ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں اور ریاستوں کا ایک فیڈریشن ہو، مشرق میں بنگال اور آسام کا ایک جداگانہ فیڈریشن ہو اگر ممکن ہو تو بہار اور اڑیسہ کو بھی اُس میں شامل کر دیا جائے. باقی ہندوستان کے صوبوں اور ریاستوں کو ملا کر بھی ایک یا ایک سے زیادہ فیڈریشن قائم کر دیئے جائیں۔

ظاہر ہے کہ اِس اسکیم کو بروئے کار لانے میں جو عملی مشکلات پیش آئیں گی اُن پر اِن اصحاب نے اچھی طرح غور نہیں کیا تاہم اِن کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہت سے مسلمان اِن ہی خطوط پر سوچ رہے ہیں۔ میں نے آپ کو پہلے بھی ایک خط میں لکھا تھا کہ کانگرس کو فیڈریشن میں لانا نسبتاً آسان ہو گا لیکن مسلمانوں کو فیڈریشن قبول کرنے پر آمادہ کرنا ہمارے لئے بہت مشکل ہو جائے گا۔

میری حتمی رائے ہے کہ جوں جوں وقت گزر رہا ہے اور وہ گھڑی قریب آ رہی ہے جب تمام سیاسی پارٹیاں اپنے اپنے پتے سامنے میز پر رکھ دیں گی، فیڈریشن کے قیام کا مسئلہ مشکل سے مشکل تر صورت اختیار کر جائے گا"۔

چودھری خلیق الزمان صاحب کا دعویٰ ہے کہ ان کی محولہ بالا ملاقات ہی سے گویا پاکستان کی بنیاد رکھی گئی۔ فرماتے ہیں کہ جس روز ہم انگلستان سے واپس بمبئی پہنچے۔

"اُسی شام رحمٰن اور میں مسٹر جناح سے ملے اور وزیر ہند لارڈ زٹلینڈ اور نائب وزیر ہند سے جو ملاقاتیں ہماری ہوئی تھیں ان کی روئداد سے مسٹر جناح کو مطلع کیا اور آخر میں ہم نے کہا کہ ہمارا تاثر یہ ہے کہ برطانوی حکومت انجام کار ہندوستان کو تقسیم کر کے رہے گی"۔

لارڈ زٹلینڈ نے چودھری صاحب اور عبدالرحمٰن صدّیقی سے ملاقات کرنے کے بعد جو مبہم سا خط وائسرائے کو لکھا تھا وہ اُوپر درج کیا جا چکا ہے کیا کوئی ذی ہوش انسان یہ خط پڑھ کر اِس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ لارڈ زٹلینڈ جیسا جہاں دیدہ اور گرم و سرد چشیدہ انسان محض چودھری صاحب سے گھنٹہ بھر باتیں کر کے تقسیم ہند پر آمادہ ہو گیا تھا؟

اگر چودھری صاحب کے نزدیک ذاتی "انا" کی تسکین کا یہی سامان رہ گیا ہے تو پھر ہم یہ کیوں باور نہ کر لیں کہ علامہ اقبال نے ۱۹۳۱ء ہی میں برطانوی مدبروں کو تقسیمِ ہند پر آمادہ کر لیا تھا. علامہ مرحوم نے ۲۱۔ جون ۱۹۳۷ء کو ایک خط میں مسٹر جناح کو لکھا تھا۔

"ہندوستان میں امن وامان برقرار رکھنے کا تنہا طریقہ یہ ہے کہ ملک کو مذہبی، نسلی اور لسانی اصولوں کے مطابق تقسیم کر دیا جائے۔ بہت سے برطانوی سیاست دان بھی اِس چیز کو محسوس کر رہے ہیں، مجھے یاد ہے کہ انگلستان میں لارڈ لودین نے مجھ سے کہا تھا کہ میری تجویز ہی ہندوستان کے تمام مصائب کا مداوا بن سکتی ہے"۔

کیا لارڈ لودین کا اقبال سے یہ کہہ دینا کہ "آپ کی تجویز ہندوستان کے مصائب کا بہترین مداوا ہے"۔ پاکستان کی بنیاد قرار دی جا سکتی ہے؟ خود چودھری صاحب کی ملاقات سے قبل اکتوبر ۱۹۳۸ء میں سندھ پراونشل مسلم لیگ کے اجلاس کراچی میں جو مسٹر جناح کے زیرِ صدارت منعقد ہوا تھا، ایک واضح اور دوٹوک قرار داد منظور ہوئی تھی کہ برِّعظیم ہند میں دو جداگانہ فیڈریشن قائم ہونے چاہئیں، ایک مسلمانوں کی اکثریت کے علاقوں کا فیڈریشن اور دوسرا ہندو اکثریت کے صوبوں کا فیڈریشن. لارڈ لنلتھگو تک ہی نہیں بلکہ وزیرِ ہند تک بھی اِس قرار داد کی گونج پہنچ چکی تھی. کیا اِس ریزولیوشن کو تقسیم ہند کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے؟

چودھری صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ لارڈ زٹیلنڈ کے خط میں وائسرائے کو پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ مسلمان ہندوستان کا بٹوارہ چاہتے ہیں۔ گزارش ہے کہ چودھری صاحب کا یہ خیال بھی فریبِ نفس سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ ہندوستان میں تین چار فیڈریشن بنا کر ایک کمزور سی مرکزی حکومت قائم کرنے کا تصور بہت پرانا تھا اور وائسرائے کے علاوہ ہندوستان کے بعض بڑے بڑے انگریز اہل کار بھی اِس سے واقف تھے۔

جب چودھری خلیق الزمان کی ملاقات لارڈ زٹیلنڈ سے ہوئی تھی ان ہی دنوں چار مختلف سکیمیں ہندوستان کے اخبارات میں شائع ہوئی تھیں جن کا نفسِ مضمون یہی تھا کہ برِّعظیم ہند میں ایک نہیں بلکہ تین چار مختلف فیڈریشن قائم کئے جائیں اور انہیں باہمی طور مُنسلک رکھنے کے لئے ایک ہلکی سی مرکزی حکومت کا وجود بھی ہونا چاہئے. ان چاروں سکیموں میں سے ایک سکیم حیدر آباد (دکن) کے ڈاکٹر سید عبداللطیف کی تھی۔ دوسری علیگڑھ کے دو پروفیسروں یعنی ڈاکٹر ظفر الحسن

اور ڈاکٹر افضال حسین قادری نے مُرتب کی تھی ۔ تیسری نواب سر شاہنواز خاں والئی ممدوٹ نے شائع کی تھی اور چوتھی کے مصنف سر سکندر حیات خاں تھے۔

چودھری صاحب نے تو لارڈ زٹیلینڈ سے صرف مبہم سی گفتگو کی تھی لیکن مذکورہ بالا چاروں سکیمیں اپنے اپنے مفہوم کے اعتبار سے نہایت مُفصّل اور جامع تھیں، اخباروں میں شائع ہوئیں، اہل الرائے اصحاب نے ان پر خوب بحث مباحثہ کیا اور ہر سکیم کے عیب و صواب کے مختلف پہلو بھی اچھی طرح پر کھے گئے کیا وائسرائے اور وزیر ہند ان سکیموں سے بے خبر رہ سکتے تھے؟

اگر چودھری خلیق الزماں اور عبدالرحمٰن صدیقی کی لارڈ زٹیلینڈ سے گھنٹے بھر کی ملاقات کو پاکستان کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے تو یہ شرف سر سکندر حیات خاں کی سکیم کے حصّے میں کیوں نہیں سکتا۔ کیونکہ دُنیوی وجاہت اور سیاسی اہمیت کے اعتبار سے چودھری خلیق الزّمان کو سر سکندر سے وہی نسبت تھی جو ذرّے کو آفتاب سے ہے۔ سر سکندر اُس صوبے کے وزیر اعظم تھے جو ہندوستان کا بازوئے شمشیر زن کہلاتا تھا۔ ان کی بالا بلند حیثیت کا یہ عالم تھا کہ جو لفظ اُن کی زبان سے سہواً نکل جاتا تھا وہ بھی لندن کے وائٹ ہال تک پہنچ جاتا تھا[1] اِس اختیار و اقتدار کے باوجود سر سکندر نے تو اپنی زندگی میں کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ اُن کی سکیم ہی برطانوی حکومت کو تقسیم ہند پر آمادہ کرے گی ہاں چودھری خلیق الزمان صاحب کو اپنے مُتعلق یہ حُسن ظن ضرور ہے۔

---

۱۔ سر سکندر نے ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو سندھ پراونشل مسلم لیگ کے اجلاس کراچی میں تقریر کرتے ہوئے کہیں جوش میں آ کر کہہ دیا کہ میں اپنے سینے پر گولی کھاؤں گا لیکن ہندوستانی فوج کا ایک سپاہی بھی فلسطین نہیں جانے دوں گا۔ وزیر ہند لارڈ زٹلینڈ نے سر سکندر کا یہ فقرہ بھی اپنی خود نوشت سوانح عمری میں نقل کر دیا ہے۔

(۷)

# کانگرس اور ہندوستان کی نمائندگی کا دعویٰ

۱۹۳۸ء میں کانگرس کے صدر سوبھاش چندر بوس تھے اور اُن کے اور مسٹر جناح کے درمیان بھی مختصر سی خط و کتابت ہوئی تھی ۵-۴۔ جون ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ نے ذیل کی تین قرار دادیں منظور کی تھیں:

قرار داد نمبر ۱:۔ "آل انڈیا مسلم لیگ کی ایگزیکٹو کونسل کی رائے میں آل انڈیا مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان ہندو مسلم تصفیے کے بارے میں صرف اِس بنیاد پر گفت و شنید ہو سکتی ہے کہ مسلم لیگ، مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔[۱]"

قرار داد نمبر ۲:۔ "ایگزیکٹو کونسل نے مسٹر گاندھی کے خط مورخہ ۲۲۔ مئی ۱۹۳۸ء پر غور کیا ہے اور اُس کی رائے ہے کہ کانگرس جس قسم کی کمیٹی کی تشکیل کرنا چاہتی ہے اُس میں کسی مسلمان کی شرکت مناسب نہیں"۔

قرار داد نمبر ۳:۔ "ایگزیکٹو کونسل یہ امر واضح کر دینا چاہتی ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی یہ طے شدہ پالیسی ہے کہ ہندوستان کی دیگر تمام اقلیتوں کے حقوق اور مفاد ایسے تسلی بخش طریقے سے محفوظ کیے جائیں کہ اِن اقلیتوں میں اطمینان پیدا ہو اور اُن کا اعتماد حاصل کیا جا سکے چنانچہ اس غرض کے لئے بوقتِ ضرورت آل انڈیا مسلم لیگ جملہ دیگر اقلیتوں کے نمائندوں سے مشورہ کرے گی"۔

جب اِن قرار دادوں کی نقول، کانگرس کے صدر سوبھاش چندر بوس کو بھیجی گئیں تو اُنھوں

---

۱۔ کانگرس کی مجلس عاملہ کا نام ورکنگ کمیٹی تھا لیکن مسٹر جناح کانگرس کی کسی اصطلاح کو مسلم لیگ میں رائج کرنا پسند نہیں فرماتے تھے، چنانچہ جب انھوں نے اپنی مجلس عاملہ مرتب کی تو ورکنگ کمیٹی کی بجائے اس کا نام ایگزیکٹو کونسل رکھا لیکن بعد کو آہستہ آہستہ یہ لفظ خود بخود ترک ہو گیا اور لیگ کی مجلس عاملہ بھی ورکنگ کمیٹی ہی کے نام سے موسوم ہو گئی۔

نے اپنی ورکنگ کمیٹی سے مشورہ کرنے کے بعد ۲۵۔ جولائی ۱۹۳۸ء کو مسٹر جناح کو لکھا۔

"لیگ کونسل کی پہلی قرار داد لیگ کی حیثیت اور منصب کو متعین کرتی ہے اگر اس قرار داد کا مفہوم یہ ہے کہ قبل اس کے کہ ہم ایک ایسی مشینری قائم کریں جو اُن نکات و شرائط کو طے کرے جن کی رُو سے فرقہ وارانہ مسئلے کا تصفیہ کیا جاسکے گا۔ کانگرس، مسلم لیگ کے اُس منصب کو تسلیم کرے جس کی وضاحت اِس قرار داد میں کی گئی ہے تو میری گزارش ہے کہ اِس کام میں چند مشکلات حائل ہیں۔

آپ لکھتے ہیں کہ مسلم لیگ مسلمانانِ ہند کی تنہا نمائندہ جماعت ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ورکنگ کمیٹی کو بہت سے تہدید آمیز خطوط موصول ہوچکے ہیں کہ لیگ کی اِس حیثیت کو تسلیم نہ کیا جائے۔ مسلم لیگ کے علاوہ مسلمانوں کی اور بھی انجمنیں اور جماعتیں ہیں جو لیگ سے بالکل علیحدہ رہ کر کام کر رہی ہیں۔ اُن میں سے بعض کانگرس کی پُرجوش حامی ہیں۔ اِس کے علاوہ خود کانگرس کے اندر بھی بہت سے مسلمان موجود ہیں جن میں سے بعض کا ملک بھر میں اثر و رُسوخ مُسلّم ہے۔ صوبہ سرحد کو دیکھ لیجئے جس میں بہت بڑی اکثریت مسلمانوں کی آباد ہے اور یہ صوبہ کانگرس کے ساتھ ہے۔

آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ اِن بیّن اور واضح حقائق کی موجودگی میں یہ ناممکن ہی نہیں بلکہ نامناسب بھی ہے کہ کانگرس اِس مطالبے کو تسلیم کر لے جو آپ نے قرار داد نمبر ا میں پیش کیا ہے۔

میں یہ بھی عرض کر دوں کہ جماعتوں اور اداروں کی اہمیت کا دارو مدار محض ان کے بلند بانگ دعاوی پر نہیں بلکہ اِس امر پر ہوتا ہے کہ کس جماعت نے کیا کارنامے انجام دیئے ہیں اور عوام کی کتنی خدمت کی ہے لہٰذا ورکنگ کمیٹی کو توقع ہے کہ لیگ کونسل اُس سے ایسی بات منوانے کی کوشش نہیں کرے گی جو بالکل ناممکن ہے۔

کیا آپ کے نزدیک یہ کافی نہیں کہ کانگرس شدّت سے اِس بات کی خواہش مند ہے کہ لیگ کے ساتھ نہایت دوستانہ تعلقات اُستوار کرے تاکہ ہندو مسلم تصفیے کا کوئی معقول اور آبرو مندانہ حل تلاش کیا جا

سکے؟

مناسب ہے کہ یہاں چند الفاظ میں کانگرس کا منصب اور حیثیت بھی واضح کر دی جائے۔ یہ صحیح ہے کہ کانگرس میں بہت بڑی اکثریت اور بیشتر تعداد ہندوؤں کی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مسلمان اور دیگر اقوام کے لوگ بھی خاصی تعداد میں شامل ہیں، کانگرس کی یہ بہت قدیم سے مسلسل روایت چلی آ رہی ہے کہ وہ اُن تمام قوموں، نسلوں اور فرقوں کی نمائندگی کرتی ہے، جنہوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا ہے۔ وقتاً فوقتاً بہت سے نامور مسلمان کانگرس کے صدر اور جنرل سیکرٹری رہ چکے ہیں جنہیں بیک وقت کانگرس اور ملک کا اعتماد حاصل رہا ہے۔

کانگرس کا اُصول یہ ہے کہ ہندو، مسلمان، سکھ، مسیحی غرض کہ جو شخص بھی کانگرس کا ممبر بنے وہ بلا رو رعایت اپنے ذاتی مذہب کا پیرو رہتا ہے لیکن باایں ہمہ کانگرس کی رُکنیت کے لئے مذہب کی کوئی قید یا پابندی یا شرط نہیں، صرف یہ قاعدہ پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ کانگرس میں شرکت کرنے والے افراد کانگرس کی پالیسی اور اصولوں کی پیروی کریں۔ یہی وجہ ہے کہ کانگرس کو کسی اعتبار سے بھی فرقہ پرست جماعت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس کے برعکس، حقیقت یہ ہے کہ کانگرس نے ہمیشہ فرقہ پرستی کے خلاف جنگ جاری رکھی ہے کیونکہ صحیح قومیت کے نشو و نما میں فرقہ پرستی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

ہر چند کہ کانگرس کا یہی دعویٰ ہے اور اُس نے حتی الامکان اس دعوے کو بروئے کار لانے میں کبھی کوتاہی نہیں کی بلکہ ہمیشہ اس سلسلہ میں کوشش جاری رکھی ہے۔ تاہم وہ اپنے اس دعوے کی تائید و تصدیق کے لئے لیگ کونسل کی کسی سند کی محتاج نہیں۔ کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کی خواہش ہے کہ آپ کی کونسل کے ساتھ ہماری مفاہمت ہو جائے تاکہ ہم مُتحد و مُتفق ہو کر اور کامل یکسوئی کے ساتھ مادرِ وطن کی آزادی کے حصول میں کوشاں ہوں۔

آپ کی کونسل کی قرار داد نمبر ۲ کے متعلق گزارش ہے کہ ورکنگ کمیٹی آپ کی خواہش کی تکمیل کرنے سے معذور ہے۔

رہی قرار داد نمبر ۳. اس کے متعلق گزارش ہے کہ ہم اُس کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکے۔ ورکنگ کمیٹی کا یہ خیال ہے کہ مسلم لیگ خالصتاً ایک فرقہ پرست جماعت ہے جس کی رُکنیت صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص ہے اور محض مسلمانوں کے مفاد کے لئے سرگرم عمل ہے۔

ورکنگ کمیٹی کا اب تک یہی خیال رہا ہے کہ مسلم لیگ صرف ہندو مسلم مسئلہ حل کرنے کے لئے کانگرس سے گفت و شنید کرنا چاہتی ہے۔ یہ خیال ہمیں کبھی نہیں ہوا کہ لیگ ایسے اُمور کے متعلق بھی مذاکرات کرنے کی خواہش مند ہے جن کا تعلق تمام اقلیتوں سے ہے۔

اس ضمن میں کانگرس کی پوزیشن یہ ہے کہ وہ از رُوئے آئین اور بلا امتیاز مذہب وملت تمام ہندوستان کی نمائندگی کرتی ہے۔

اس لئے اگر مسلمانوں کے علاوہ دیگر اقلیتوں کو کسی قسم کی شکایت ہے تو وہ براہ راست ہم سے بات کریں. ہم اُن کی شکایات کا ازالہ کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

مذکورہ بالا گزارشات کے پیش نظر مجھے اُمید ہے کہ اب ہم اپنے باہمی مذاکرات میں اگلا قدم اٹھائیں گے تاکہ مفاہمت کی صورت پیدا ہو سکے۔"

سوبھاش چندربوس کے اس خط کے جواب میں مسٹر جناح نے ۲۔ اگست ۱۹۳۸ء کو لکھا:۔

"لیگ کونسل کی حتمی اور قطعی رائے ہے کہ مسلم لیگ مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ سیاسی جماعت ہے۔ جب ۱۹۱۶ء میں بمقام لکھنؤ کانگرس اور لیگ کے درمیان میثاق مُرتب ہوا تھا تو لیگ کی یہ حیثیت تسلیم کرلی گئی تھی. اس وقت سے لے کر ۱۹۳۵ء تک جبکہ جناح اور راجندر پرشاد کے درمیان مذاکرات ہوئے تھے لیگ کی اس نمائندہ حیثیت کو کبھی محل نظر قرار نہیں دیا گیا لہٰذا یہ ہرگز خیال نہ کیجئے کہ آل انڈیا مسلم لیگ اپنی اس حیثیت کو تسلیم کرانے کے لئے کانگرس کے کسی رسمی سرٹیفکیٹ کی محتاج

ہے اور نہ بمبئی میں لیگ کی ایگزیکٹو کونسل نے اس غرض کے لئے قرار داد منظور کی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ جب پنڈت جواہرلال نہرو کانگرس کے صدر تھے تو انھوں نے یہ اعلان کر کے کہ ہندوستان میں صرف دو فریق موجود ہیں، ایک برطانوی حکومت اور دوسرا کانگرس، گویا مسلم لیگ کے وجود ہی سے انکار کر دیا تھا۔ اندریں حالات ایگزیکٹو کونسل کے لئے ضروری تھا کہ وہ کانگرس کو مطلع کر دے کہ دونوں جماعتوں میں مذاکرات شروع کرنے کی بنیاد کیا ہے۔

مزید بر آں تنہا یہ واقعہ کہ کانگرس نے ہندو مسلم مسئلہ کے تصفیے کے لئے مسلم لیگ ہی سے مفاہمت کی درخواست کی ہے اس بات کے ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ لیگ مسلمانان ہند کی تنہا نمائندہ جماعت ہے اور اس حیثیت سے وہی ہندوستان کے مسلمانوں کی ترجمانی کا استحقاق رکھتی ہے۔

ایگزیکٹو کونسل اس امر سے واقف ہے کہ شمال مغربی صوبہ سرحد میں کانگرس نے ایک کولیشن وزارت قائم کر رکھی ہے اور اس بات سے بھی آگاہ ہے کہ دیگر صوبوں کی کانگرس کمیٹیوں میں بعض مسلمان شامل ہیں لیکن اس کے باوجود ایگزیکٹو کونسل کی رائے ہے کہ کانگرسی مسلمان نہ تو ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندگی کر سکتے ہیں اور نہ ایسا کرنے کے مجاز ہیں وجہ یہ ہے کہ اُن کی تعداد بے انتہا قلیل ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ کانگرس میں شمولیت کرنے کے باعث وہ مسلمانوں کی نیابت اور ترجمانی کے حق سے محروم ہو گئے ہیں۔ اندریں حالات آپ کا یہ دعویٰ کہ کانگرس ہندوستان کی جملہ اقوام کی نمائندہ جماعت ہے اپنے اندر کوئی صداقت نہیں رکھتا۔

آپ نے اپنے خط میں بعض دیگر مسلم انجمنوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن اُن انجمنوں کے نام آپ نے نہیں بتائے۔ ایگزیکٹو کونسل کی رائے ہے کہ یہ ذکر آپ نہ چھیڑتے تو بہتر ہوتا اگر یہ تمام انجمنیں انفرادی یا مجموعی طور پر

مسلمانوں کی نمائندگی کی اہل ہوتیں تو کانگرس کے صدر اور مسٹر گاندھی ہندو مسلم تصفیے کے لئے مسلم لیگ سے مراسلت کی ابتداء نہ کرتے۔ بہرحال جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق ہے اُسے ہرگز یہ معلوم نہیں کہ ہندوستان میں اُس کے علاوہ کوئی اور اسلامی انجمن بھی ہے جس نے مسلمانانِ ہند کی نمائندگی کا دعویٰ کیا ہے۔ لہٰذا آپ نے دیگر اسلامی انجمنوں کا حوالہ دے کر خواہ مخواہ ایک افسوس ناک پہلو پیدا کر دیا ہے۔

ایگزیکٹو کونسل بھی آپ کی طرح اِس بات کی خواہش مند ہے کہ ہندو مسلم تصفیے کا حل تلاش کرے تاکہ جلد از جلد حصُولِ آزادی کی کوشش کی جائے۔ لیکن اِس ضمن میں جس قسم کے دور از کار دلائل آپ نے پیش کرنا شروع کر دیئے ہیں اُن کا مقصد سوائے اِس کے اور کچھ نہیں کہ اصل مسئلہ کو اُلجھا کر آئندہ گفت و شُنید میں خواہ مخواہ تعویق پیدا کی جائے۔

مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں ایگزیکٹو کونسل کو بدستور یہ توقع ہے کہ مسلم لیگ کی نمائندہ حیثیت کو معرضِ بحث میں نہیں لایا جائے گا بلکہ کانگرس اِسی اُصول کی بناء پر ایک کمیٹی کا تقرر کرے گی۔

جہاں تک دوسری قرار داد کا تعلق ہے ایگزیکٹو کونسل یہ واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اگر کانگرس نے کوئی کمیٹی مقرر کی اور اس میں اپنی طرف سے مسلمانوں کو بھی نامزد کیا تو یہ حرکت پسندیدہ خیال نہیں کی جائے گی۔ وجہ یہ ہے کہ کمیٹی محض اِس لئے مُقرر کی جا رہی ہے کہ ہندو مسلم تصفیے کا حل تلاش کیا جائے۔ اندریں حالات ایسے مسلمان ممبروں کا تقرر جنہیں کانگرس نامزد کرے گی، زیرِ بحث مقصد کے حصول کے قطعاً منافی ہے۔ کیونکہ کانگرس کے نامزد کئے ہوئے مسلمان ممبر ہندوؤں اور مسلمانوں میں سے کسی کی بھی نمائندگی نہیں کر سکیں گے اور اِس لحاظ سے اُن کی پوزیشن سخت مضحکہ خیز بن جائے گی۔ لہٰذا ایگزیکٹو کونسل آپ سے درخواست کرتی ہے کہ مسئلہ زیر بحث پر اُن حقائق کی روشنی میں غور فرمایئے۔

تیسری قرار داد کے مُتعلق گزارش ہے کہ آپ نے اپنے ایک مکتوب مُحررہ ۱۵۔ مئی ۱۹۳۸ء میں کانگرس کے ایک میمورنڈم کا حوالہ دیا تھا

جس میں ہندوستان کی دیگر اقلیتوں کا بھی ذکر کیا گیا تھا۔ مسلم لیگ اپنی
طے شدہ پالیسی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مناسب موقع و محل پر اُن اقلیتوں
سے مشورہ کرنے کو آمادہ ہے"۔

سوبھاش چندر بوس اور جناح کی خط و کتابت بھی بالآخر اِس چٹان کے ساتھ ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی کہ مسلم لیگ مسلمانانِ ہند کی تنہا نمائندہ جماعت ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ ۱۹۳۷ء سے یعنی جب سے کانگرس نے چھ صوبوں میں وزارتیں قائم کی تھیں اور اُس کے ساتھ مسلم رابطۂ عوام کی تحریک بھی جاری کر دی تھی. کانگرس بار بار یہ دعویٰ کر رہی تھی کہ وہ پورے ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور مسلمانوں کی جداگانہ قومی ہستی کا کوئی وجود نہیں۔ اُسی دعوے کو بروئے کار لانے کے لئے کانگرس نے ہزاروں سازشیں کر کے سندھ. آسام اور صوبہ سرحد کی وزارتیں تُڑوائیں. مسلمانوں میں باہمی اِنتشار پھیلایا اور پھر اپنے اصولوں سے منحرف ہو کر ان صوبوں میں کولیشن وزارتیں قائم کیں۔

اِسی دعوے کو بروئے کار لانے کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد کو آگے رکھ کر ڈھنڈورہ پیٹا گیا کہ جب اتنا بڑا عالم دین، اتنا بڑا انشا پرداز. اتنا بڑا عربی دان. کانگرس کی ورکنگ کمیٹی میں شامل ہے تو جناح کا مطالبہ کیوں کر قابلِ پذیرائی ہو سکتا ہے۔

اِسی دعوے کو بروئے کار لانے کے لئے کبھی جمعیت العلماء کے مولویوں. کبھی مجلسِ احرار کے بلند آہنگ خطیبوں اور کبھی سرحد کے سُرخ پوشوں کو آگے بڑھایا گیا. تاکہ جناح کے مطالبے کو مسترد کرایا جا سکے۔

واقعہ یہ ہے کہ جناح ابتداء سے یہ چاہتا تھا کہ ہندو مسلم تصفیے کی واحد صورت یہ ہے کہ مسلم لیگ کو مسلمانوں اور کانگرس کو ہندوؤں کی نمائندہ جماعت تسلیم کر کے آپس میں مفاہمت کی جائے. لیکن کانگرسی لیڈر اِس صورتِ حال کو سرے سے قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے. چنانچہ ۱۹۴۵ء تک وقتاً فوقتاً جتنے مُذاکرات گاندھی اور جناح میں ہوئے سب کے سب اِسی ایک ابتدائی مرحلے سے آگے نہ بڑھ سکے۔

۱۹۴۱ء میں جب سر تیج بہادر سپرو نے فرقہ وارانہ مفاہمت کے لئے گاندھی اور جناح کی ملاقات کرانے کی کوشش کی تو اُس وقت بھی مسٹر جناح نے ایک خط میں سپرو کو لکھا تھا کہ:

"میں ہمیشہ اِس بات پر آمادہ رہا ہوں اور اب بھی آمادہ ہوں کہ اگر
ہندو قوم کی طرف سے مسٹر گاندھی یا کوئی اور ہندو لیڈر مجھ سے بالمشافہ
ملاقات کریں تو میں ہندو مسلم تصفیے کے لئے ہر امکانی کوشش کرنے کو تیار

ہوں"۔

سرتیج بہادر سپرو کی یہ کوششیں ناکام ثابت ہوئیں تو اُنہیں نے اپنے اخباری بیان میں لکھا تھا کہ۔

"مسٹر گاندھی، جیسا کہ اُن کے مکتوب سے ظاہر ہوتا ہے، مسٹر جناح کی یہ شرط قبول کرنے پر تیار نہیں تھے چُنانچہ معاملہ وہیں ختم ہو گیا۔ اور مُذاکرات کو مزید طُول دینے کی ضرورت ہی نہ رہی"۔

اگست ١٩٣٨ء میں جب صوبجاتِ متوسّط (سی۔ پی) کے کانگرسی وزیرِ اعظم ڈاکٹر کھرے نے کانگرس ہائی کمان سے پوچھے بغیر وزارتِ عظمیٰ سے اِستعفاء دے دیا اور گورنر نے آئینی قواعد و ضوابط کے مطابق اِستعفاء منظور کر لیا تو گاندھی، پٹیل اور سوبھاش چندر بوس آگ بگولہ ہو گئے اور ڈاکٹر کھرے کو بطور سزا کانگرس سے نکال دیا گیا۔ اُس وقت گاندھی جی نے اپنے اخبار ہری جن میں لکھا تھا۔

"ہندوستان کے مختلف صوبوں کے گورنروں کو ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ صرف کانگرس ہندوستان کی نمائندہ جماعت ہے اور آج نہیں تو کل یہی جماعت ہندوستان میں برطانوی حکومت کی جانشین بنے گی"۔

سوال یہ نہیں کہ کیا کانگرس ہندوستان کی نمائندہ جماعت تھی یا نہیں؟ سوال یہ بھی نہیں کہ کیا برطانوی حکومت کی جانشینی کا حق کانگرس کو پہنچتا تھا یا نہیں؟ بلکہ سوال یہ ہے کہ کیا ہندوستان کے مسلمان اپنی تقدیر کانگرس کے حوالے کرنے کو آمادہ تھے؟ صرف اِسی ایک سوال کے جواب پر ہندوستان کے مستقبل کا انحصار تھا۔

رہے وہ گنتی کے چند مسلمان جو کانگرس میں شریک تھے اور جن کی آڑ لے کر کانگرس ہندوستان کی تمام قوموں کی نمائندگی کا دعویٰ کرتی تھی اِس بارے میں ایک انگریز اخبار نویس پیٹرک لیسی نے کیا خوب لکھا ہے۔

"کانگرس کا یہ دعویٰ قطعاً بے کار ہے کہ اس میں چند مسلمان بھی شریک ہیں۔ یا یہ کہ بعض مسلمان اس کے سالانہ اجلاسوں کی صدارت کر چکے ہیں۔ کیا بلجیم۔ بوہیمیا۔ برطانیہ۔ ڈنمارک۔ اور ہالینڈ کے بعض باشندے نازی نہیں تھے؟ اور کیا جرمنی نے ہر چند کہ اُس کی رائے اُن لوگوں کے بارے میں کیا ہے۔ اُن کی خدمات کو قبول نہیں کیا تھا؟ لیکن بایں ہمہ سوال یہ ہے کہ خود اُن جُملہ ممالک کی رائے اُن لوگوں کے

متعلق کیا تھی [1]؟"

۱۹۳۷ء کے صوبائی انتخابات کے وقت کانگرس نے جو مینی فیسٹو شائع کیا تھا اُس میں ایک جگہ لکھا تھا:

"کانگرس کے علاوہ ہندوستان میں جتنی پارٹیاں، جتنی جماعتیں اور جتنے فریق ہیں اُن میں سے ہر ایک شعوری یا غیر شعوری طور پر قوم کو ضعف و کمزوری پہنچانے کا باعث ہے اور اُن طاقتوں کا آلۂ کار ہے جو قوم کے خلاف بر سرِ پیکار ہیں"۔

پیٹرک لیسی، اپنی کتاب میں یہ فقرہ درج کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:۔

"صرف کانگرس کا نام بدل دیجئے تو آپ کو اِن الفاظ کے پیچھے ہٹلر اور گوئبلز گرجتے ہوئے سُنائی دیں گے۔ کانگرس کا یہ دعویٰ غلط اور گستاخانہ ہونے کے علاوہ بدتمیزی کا بھی ثبوت تھا"۔

میں یہاں ایک سال آگے جا کر ایک واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ جب ستمبر ۱۹۳۹ء میں عالمگیر جنگ چھڑ گئی اور کانگرس نے ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کا دعویٰ کر کے برطانوی حکومت سے سودا چکانے کی کوشش کی تو ذیل کے غیر مسلم اصحاب نے

سر چمن لال ستیلواد، سر کاؤس جی جہانگیر، وی این چند ورکر (لبرل پارٹی کے نمائندے)، وی، ڈی ساورکر (نمائندہ ہند و مہاسبھا)، این. سی کیلکر، جمناداس مہتہ (ڈیموکریٹک سوراجیہ پارٹی کے نمائندے)، بی آر امبیدکر (اچھوتوں کے نمائندے)۔

مشترکہ دستخطوں سے ۳۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو وائسرائے کو تار دیا جس کا متن حسب ذیل ہے:۔

"ہز ایکسی لنسی گورنر جنرل نے ہندوستان کے لیڈروں سے باہمی مشورہ کر کے جس طرح اہلِ ہند کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاکہ جنگ لڑنے کے لئے ہندوستان کا رضا کارانہ تعاون حاصل کیا جا سکے۔ ہم اُس کو بہ نظرِ تحسین دیکھتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ان باہمی مذاکرات کا

[1] "Fascist India" by Patrick Lacey 1946 Page: 32

مدعا یہ ہے کہ ہندوستان کے آئندہ سیاسی منصب کا تعین کیا جا سکے تاکہ وہ برطانوی کامن ویلتھ کے ایک ہمسر رُکن کی حیثیت حاصل کر سکے، بدیں وجہ ہم اُن جملہ مذاکرات کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں کرتے. لیکن اس کے ساتھ یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ از بسکہ مسئلہ زیرِ بحث کے تصفیے کے ساتھ ملک کے تمام طبقوں کا مفاد اور تمام جماعتوں کا براہِ راست تعلق ہے، لہٰذا انہیں بھی ان مشوروں میں شریک کرنا چاہئے۔

اب تک تو یہی معلوم ہو سکا ہے کہ گورنر جنرل نے مسٹر گاندھی کے ساتھ بطور کانگرس اور مسٹر جناح کے ساتھ بطور مسلم لیگ کے نمائندے کے گفت و شنید کی ہے اور ان دونوں اصحاب کے ساتھ آئندہ بھی اسی نوع کی گفت و شنید کا سلسلہ جاری رہے گا۔

مسٹر گاندھی کا ایک بیان ۲۹۔ ستمبر کے اخبارات میں شائع ہوا تھا جس میں موصوف نے لکھا ہے کہ میرا دعویٰ ہے کہ کانگرس تمام قوموں کی ایک ہمہ گیر اور نمائندہ جماعت ہے جو گزشتہ نصف صدی سے بلاامتیاز مذہب و ملت. ہندوستان کے عوام کی نمائندگی کر رہی ہے اور اس باب میں اس کا کوئی حریف اور مدِمقابل نہیں۔ میں اس دعوے سے کسی کی دل آزاری کرنا نہیں چاہتا لیکن امر واقعہ یہی ہے"۔

موجودہ لیڈروں کے قبضے میں جانے سے پیشتر کانگرس تمام ہندوستان کی نمائندہ جماعت تھی یا نہیں، اس پر بحث کرنا مقصود نہیں لیکن یہ دعویٰ کہ آج بھی کانگرس پورے ہندوستان کی نمائندہ جماعت ہے، ہرگز تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

یہ حقیقت ہے کہ مسٹر گاندھی اور کانگرس کے صدر وقتاً فوقتاً مسٹر جناح کے ساتھ اس غرض سے مراسلت اور گفت و شنید کرتے رہے ہیں کہ لیگ اور کانگرس میں کوئی مفاہمت ہو سکے، یہ واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مسٹر گاندھی اور اُن کے حامی خود اس دعوے کو درست تسلیم نہیں کرتے کہ کانگرس ایک ایسی ہمہ گیر جماعت ہے جو بلاامتیاز مذہب و ملت. ہندوستان کے عوام کی نمائندگی کرتی ہے، بہرحال

مسلم لیگ کے متعلق تو یہ بات بالکل عیاں اور واضح ہے کہ وہ ہرگز کانگرس کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت نہیں سمجھتی اور کانگرس کے اس قسم کے دعوے کو قطعی باطل قرار دیتی ہے۔

مسلمانوں سے قطع نظر ہم تو یہ اعلان کرنے کو بھی آمادہ ہیں کہ کانگرس ہندوستان کے تمام فرقوں اور سیاسی جماعتوں کی بھی نمائندہ نہیں، مثلاً ہندو مہاسبھا، اُچھوت، ڈیموکریٹک سوراجیہ پارٹی، لبرل، زمیندار، مزدور، اِن تمام جماعتوں کے ممبر کانگرس میں شامل نہیں اور نہ کانگرس کو اپنی ترجمانی یا نمائندگی کا حق دینے کو تیار ہیں۔

اور تو اور خود ہندوؤں کا ایک اچھا خاصا طبقہ کانگرس کے اِس دعوے کو تسلیم نہیں کرتا۔ مثلاً ہندو مہاسبھا والوں کو دیکھ لیجئے۔ یہ لوگ کانگرس میں شامل نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ کانگرس نے گزشتہ انتخابات میں اکثریت حاصل کر کے سات صوبوں میں اپنی وزارتیں قائم کر لی تھیں لیکن اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اِن صوبوں میں کانگرس کو ووٹروں کی اکثریت کی تائید و حمایت بھی میسّر تھی۔ مثلاً احاطہ بمبئی کو لے لیجئے۔ یہاں عام حلقہ ہائے انتخاب میں غیر کانگرسی اُمیدواروں کو ۱۰۵۳۵۰۹ ووٹ ملے اِس کے برعکس اِن ہی حلقوں سے کانگرسی اُمیدواروں نے ۱۴۸۳۱۸۹ ووٹ حاصل کئے۔ لیکن اِس کے ساتھ اگر مخصوص حلقہ ہائے انتخاب کے ان ووٹوں کو بھی شامل کیا جائے جو غیر کانگرسی اُمیدواروں کو حاصل ہوئے تھے تو یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ کانگرس کے ووٹر اقلیت میں تھے۔

مزید برآں ہم دعوی سے کہہ سکتے ہیں کہ کانگرسی اُمیدواروں نے مختلف حلقوں سے ووٹ حاصل کرنے کے لئے جو ہتھکنڈے اختیار کئے تھے۔ وہ سراسر غلط بیانی اور فریب پر مبنی تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ملک کی عام فضا نئے آئین کے خلاف تھی کیونکہ کہا یہ جاتا تھا کہ یہ آئین رجعت پسندانہ ہے اور عوام کی اُمنگوں کی ترجمانی نہیں کرتا چنانچہ کانگرس نے صورتِ حال کو بھانپ کر یہ نعرہ بلند کر دیا کہ وہ مجالس قانون

ساز میں جاکر اِس آئین کی دھجیاں اڑا دے گی. اِس نعرے کا طبعی اور لازمی اثر یہ ہوا کہ ووٹروں کی ایک اچھی خاصی تعداد کانگرس کے بھرّے میں آگئی لیکن اس کے برعکس غیر کانگرسی امیدواروں نے دیانت و صداقت اور خُلوص سے کام لے کر صاف صاف اعتراف کیا کہ اگرچہ موجودہ آئین چنداں تسلّی بخش نہیں، باایں ہمہ ملک کے مفاد کا تقاضا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اِس پر عمل کر کے بہترین نتائج حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔

لیکن انجام کار ہوا کیا؟ یہی کانگرسی ممبر جو نئے آئین کی دھجیاں اُڑانے کا بلند بانگ دعویٰ کر رہے تھے. مجالسِ قانون ساز کے اندر قدم رکھتے ہی سب شیخیاں اور تعلّیاں بُھول گئے اور آئین کے بڑے سرگرم اور پُرجوش حامی بن گئے یہاں تک کہ اِن لوگوں نے جذبۂ انتقام کے تحت اُن تمام قوانین کو اپنے دائیں بائیں بے دریغ استعمال کرنا شروع کر دیا جنھیں یہ جابرانہ اور متشدّدانہ قوانین کہتے ہوئے نہیں تھکتے تھے اور جنھیں بیک جنبشِ قلم منسوخ کرنے کا یہ دعویٰ کیا کرتے تھے۔

اِن وجوہ کی بنا پر ہم یہ اعلان کرنے میں حق بجانب ہیں کہ ووٹروں کی ایک اچھی خاصی معقول تعداد آج یہ محسوس کر رہی ہے کہ کانگرس نے فریب دے کر اُن سے ووٹ حاصل کئے تھے اور اب یہ فریب خوردہ لوگ کانگرس کی حمایت سے دست کش ہو گئے ہیں۔ اِس کے علاوہ خود کانگرسی لیڈر اپنی جماعت کے اندر روز بروز غیر مقبول ہوتے جا رہے ہیں۔ ثبوت میں فارورڈ بلاک اور راڈیکل گروپ (ایم۔ این رائے کی پارٹی) کے وجود پیش کئے جا سکتے ہیں۔ یہ ادارے اُن کانگرسیوں نے قائم کئے ہیں جو کانگرس کی موجودہ "لیڈرشپ" سے منحرف ہو کر اپنی الگ جماعتیں بنانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

کانگرس کا یہ نعرہ بھی انتہائی منافقانہ ہے کہ وہ جنگ میں اُس وقت تک برطانوی حکومت کی مدد کرنے سے معذور ہے جب تک یہ حتمی وعدہ نہ کیا جائے کہ ہندوستان میں ایک آزاد جمہوری حکومت قائم کی جائے گی۔ خودؔ اِن کانگرسی لیڈروں کا یہ عالم ہے کہ موجودہ آئین کے تحت جو تھوڑے

بہت جمہوری اختیارات انہیں حاصل ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے اُن اختیارات کو اس بے دردی، اور بے رحمی سے استعمال کیا ہے کہ آئندہ ہرگز توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ہندوستان میں کسی قسم کی جمہوریت قائم کرنے کی صلاحیت یا ارادہ رکھتے ہیں۔

کانگرسی حکومت کسی نوع کی مخالفت برداشت نہیں کر سکتی اور چاہتی ہے کہ مطلق العنان حکمرانوں کی طرح ہر مخالف کا سر کچل کر رکھ دیا جائے۔ ہندوستان کے آٹھ صوبوں میں عوام کو کانگرسی حکومتوں کا جو تجربہ دو سال میں ہوا ہے۔ اُس کی روشنی میں وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ کانگرس کے نزدیک جمہوریت سے مراد صرف یہ ہے کہ اخباروں کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ لوگوں کی شہری آزادی ختم کر دی جائے اور حزبِ مخالف کو اس طرح مٹایا جائے کہ وہ سر اُٹھانے کے قابل نہ رہے۔ مجالس قانون ساز میں اقلیتوں کی آواز کو قطعاً درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا اور کانگرسی لیڈر اور کانگرسی حکومتیں اس بات پر تُلی ہوئی ہیں کہ ملک کی تمام پارٹیوں کو نیست و نابود کر کے صرف ایک جماعت یعنی کانگرس کو باقی رکھا جائے۔ یہ جرمنی کے نازی اور اٹلی کے فاشی نظام کی بدترین مثال ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ کانگرس کے لیڈر اس قدر تنگ دل اور مُنتقم مزاج واقع ہوئے ہیں کہ وہ کسی حریف کو دیکھنا پسند نہیں کرتے اور نہ اپنے اقتدار میں کسی کو شریک کرنا انہیں منظور ہے۔"[1]

مسٹر جناح نے کانگرس کی فسطائیت۔ انتقام پسندی۔ اقلیت دشمنی۔ خودسری اور غیر نمائندہ حیثیت کے متعلق وقتاً فوقتاً جو کچھ کہا تھا۔ اُس کی تلخی کا اس تلخی سے کیا مقابلہ ہے جو مذکورہ بالا بیان میں ہندوستان کے سات ذمے دار غیر مسلم لیڈروں نے ظاہر کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جُوں جُوں کانگرس۔ ہندوستان کی مختارِ مطلق بننے کا دعویٰ کر رہی تھی۔ اسی نسبت سے مسلم لیگ میں بتدریج استحکام پیدا ہو رہا تھا۔ مسٹر جناح جانتے تھے کہ کانگرس کے ساتھ مساویانہ گفت و شنید کرنے کا صرف یہی ایک طریق ہے کہ لیگ کو اس قدر

---

1 "Fascist India" by Patrick Lacey 1940

مضبوط اور منظم کر دیا جائے کہ اُس کی آواز کو مسلمانانِ ہند کی مجموعی آواز تسلیم کئے بغیر چارہ نہ رہے۔

۱۸۔ اپریل ۱۹۳۸ء کو انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کلکتہ کے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا:

"مسلمانوں کو یہ حقیقت ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ فریقین میں اُس وقت تک آبرو مندانہ سمجھوتہ ہرگز نہیں ہو سکتا جب تک ایک فریق اپنے آپ کو دوسرے فریق سے برتر و بہتر سمجھتا ہے۔ مزید بر آں اگر ایسی صورت میں کوئی معاہدہ ہوا بھی اور مسلمان بدستور غیر منظم رہے تو آپ کے پاس کون سی طاقت ہے جس سے فریقِ ثانی کو اِس معاہدے پر عملدر آمد کے لئے مجبور کیا جا سکے گا؟

اگر اِس قسم کی کوئی اجتماعی طاقت آپ کے پاس نہیں تو یقین کیجئے گا کہ وہ معاہدہ کاغذ کے ایک پُرزے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا، جسے فریقِ مخالف جب چاہے اُٹھا کر ردّی کی ٹوکری میں پھینک سکتا ہے۔

اندریں حالات مسلمانوں سے میری صرف ایک درخواست ہے، خدارا اپنی ذات پر اعتماد کیجئے اور کسی دوسرے پر تکیہ لگا کر نہ بیٹھئے۔ بدقسمتی سے مسلمان اب تک اندازہ نہیں کر سکے کہ قدرت نے ان کو کتنی صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ اِن جُملہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا واحد طریقہ قومی تنظیم ہے۔

ہمیں اپنے آپ کو منظم کرنے کے لئے بہت محنت کرنا پڑے گی۔ مصائب کی آگ میں بھی کُودنا پڑے گا۔ ہمارے مخالف ہمیں اذیت پہنچانے کا ہر ممکن حربہ استعمال کریں گے، طعن و تشنیع کا ہدف بننے کے علاوہ ہمیں مالی و جانی نقصان بھی برداشت کرنا ہو گا لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر قوتِ ایمانی ہمارے اندر موجود ہے تو یہ آتشِ نمرود بالآخر گُل و گلزار بن کر رہے گی اور ہم اِس آزمائش کی بھٹی سے پہلے سے زیادہ قوی، مضبوط اور توانا بن کر باہر نکلیں گے[۱]۔"

---

۱۔ روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور۔ مورخہ ۱۹ اپریل ۱۹۳۸ء

جواہر لال نہرو اور سوبھاش چندر بوس بار بار اپنے خطوں میں لکھتے ہیں کہ صرف کانگرس ہندوستان کی نمائندگی کرنے کی اہل ہے اور اس ضمن میں مسلم لیگ کو نیچا دکھانے کے لئے وہ مسلمانوں کی اور بھی بہت سی جماعتوں اور انجمنوں کے نام لینے سے دریغ نہیں کرتے۔ اگر مسلم لیگ کو زک پہنچانے کی خاطر یہی طرزِ استدلال کافی سمجھا جاسکتا ہے تو پھر اُن سات ذِمّے دار غیر مسلم لیڈروں کا محولہ بالا بیان پڑھنے کے بعد کون ذی ہوش انسان کانگرس کو ہندوستان کی مختارِ مطلق جماعت تسلیم کرنے کی جُرأت کرے گا؟

حقیقت یہ ہے کہ کانگرسی لیڈروں کو جناح کے خلاف سب سے بڑا غصّہ یہی تھا کہ عین اُس وقت جب کانگرس۔ برطانوی حکومت سے سازباز کر کے پورے ہندوستان کا سودا چکانے والی تھی جناح نے مسلم لیگ کو منظم کر کے مسلمانوں کو الگ کر لیا اور یوں اُس نام نہاد "انڈین نیشنلزم" کے غبارے کی ہوا نکال کر رکھ دی جو ہندوستان کی نمائندگی کی فضاؤں میں پرواز کرتے والا تھا۔

اکتوبر ۱۹۳۷ء کے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ کے معاً بعد جبکہ ہمارا قافلہ ہنوز حرکت ہی میں آیا تھا اور منزلِ مقصود کے کنگرے بھی صاف نظر نہ آتے تھے۔ لندن کا ایک بلند پایہ رسالہ یہ لکھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

"گزشتہ مہینے کا اہم ترین واقعہ مسلمانوں کا وہ عظیم الشّان اجتماع ہے جو مسٹر جناح کے زیرِ صدارت اور مسلم لیگ کے زیرِ اہتمام لکھنؤ میں ہوا۔

اِس اجتماع نے یہ حقیقت الم نشرح کر دی ہے کہ کانگرس کا یہ ادّعا کہ وہی مسلمانوں کی رہنمائی اور نمائندگی کا فرض ادا کرنے کی اہل ہے مسلمانوں کو قبول نہیں۔ اُن کے لیڈروں میں دفعتہً ایک حرکتِ عمل پیدا ہو گئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کانگرس کے اِس دعوے سے ہراساں ہو کر لیگ میں شامل ہو گئے ہیں۔ یوں بھی تجربے نے اُنہیں یہ سبق سکھا دیا ہے کہ بہترین پالیسی یہی ہے کہ قوم کے مُتّحدہ محاذ اور قومی یک جہتی کو ترک نہیں کرنا چاہئے۔

مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ پنڈت نہرو کا یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ ہندوستان میں صرف دو فریق

ہیں' ایک برطانوی حکومت اور دوسرا کانگرس' مسٹر جناح نے پنڈت نہرو کے اس دعوے کا زبردست جواب دیا ہے۔ لاریب' آج ایک نیا فریق بھی میدان میں اتر آیا ہے یعنی آل انڈیا مسلم لیگ' اگر ہمیں واقعی سنجیدگی سے ہندوستان کے مسائل کا تصفیہ کرنا مقصود ہے تو اس نئے فریق کے وجود کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں یہ حقیقت تلخ ہے تو کیا اور ناگوار ہے تو کیا۔ بہرکیف اسے قبول کرنا ہی پڑے گا۔

اس صورت حال کو افسوس ناک کہنا بجا ہو گا لیکن اس سے زیادہ افسوس ناک طرز عمل یہ ہو گا کہ ہم شترمرغ کی طرح سر کو ریت میں چھپا کر حقائق کا معائنہ اور مقابلہ کرنے سے انکار کر دیں"۔ ۱۔

---

۱۔ "The Twentiet. Century" London November 1937

(۸)

# فلسطین اور ہم

آج عالمِ اسلام کے لئے بالعموم اور دُنیائے عرب کے لئے بالخصوص سب سے تکلیف دہ مسئلہ فلسطین کی اسرائیلی حکومت ہے۔ ہمارے عرب بھائی مدّت تک پاکستان سے خفا رہے۔ اُن کی خفگی بجا تھی یا بے جا میں اس سے بحث نہیں کرتا۔ یہ قصہ اب ماضی کے حوالے کر دینا چاہئے۔ یوں بھی عرب ممالک میں مسلم لیگ کی جدّ و جہد اور تحریک پاکستان کو کبھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھا گیا۔ کانگرس کا پراپیگنڈا اس قدر وسیع اور ہمہ گیر تھا کہ اُس کی سمیّت نے ہماری قومی تحریک کے بارے میں قسم قسم کی غلط باتیں اور غلط فہمیاں پھیلا دی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دُنیا کے بہت کم ملکوں بلکہ میں تو یہ کہنے کو بھی تیار ہوں کہ بہت کم افراد نے برِّ عظیم ہند کے مسلمانوں کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔

اُس کے باوجود ہماری کیفیت یہ رہی کہ عین جس وقت ہم لوگ اپنی موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھے اس وقت بھی ہم نے دُنیا بھر کے مسلمانوں کے غم کو اپنا غم اور اُن کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھا۔ افغانستان سے مراکش تک جہاں کہیں مصیبت آئی ہم نے اپنی بساط کے مطابق مدد کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ اس سلسلے میں ہندو اکثر ہمیں طعنہ دیتے تھے کہ ہمیں ہندوستان سے دلچسپی کم اور بیرونی ممالک کے مسلمانوں سے دلچسپی زیادہ ہے۔

۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم میں جب تُرکوں کو شکست ہوئی تو دُنیائے عرب کے تمام ممالک ایک ایک کر کے فرانس اور برطانیہ کے زیرِ اقتدار چلے گئے۔ اس اقتدار کے لئے ایک نئی سیاسی اصطلاح انتداب[۱] وضع کی گئی تھی۔ عرب ممالک میں سب سے تکلیف دہ مسئلہ فلسطین کا تھا کیونکہ برطانیہ اور امریکہ اِس خطّۂ ارض کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے پر تُلے ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں ہم سے جو کچھ ہو سکا اُس کا ایک نہایت ہلکا سا خاکہ درج کرتا ہوں۔

---

۱۔ انتداب۔ دراصل انگریزی کی ایک اصطلاح Mandate کا ترجمہ ہے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کی باضابطہ کاوش و کوشش کا ذکر کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان مسائل کا بھی مختصر سا حال بیان کر دوں جو اس ضمن میں ہمارے سب سے بڑے قومی شاعر اور مُفکر علاّمہ اقبال نے کی تھیں۔ افسوس ہے کہ لوگ نہیں جانتے کہ اقبال نے فلسطین کی خلش کو کس شدّت سے محسوس کیا تھا اور اپنی زندگی کے آخری چند برسوں میں کس جرأت، اِستقلال اور دردمندی سے اپنی تمام تر توجّہ فلسطین کی طرف منعطف کر دی تھی۔ انہوں نے ایک طرف دُنیا کے ہر خطّے کے مسلمانوں کو پکارا کہ متحد ہو کر فلسطین میں اسرائیلی حکومت کے قیام کی مخالفت کریں اور دوسری طرف برطانیہ کے سیاسی رہنماؤں کو بار بار مشورہ دیا کہ ہوش مندی سے کام لو اور عالمِ اسلام کے قلب میں ایک ناسور پیدا نہ کرو۔

۶۔ دسمبر ۱۹۳۱ء کو بیت المقدس میں عالمِ اسلامی کے نمائندوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں شرکت کے لئے دُنیا کے اکثر حصّوں سے لوگ گئے۔ علاّمہ اقبال گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں لندن گئے ہوئے تھے۔ کانفرنس کا اجلاس ختم کئے بغیر وہ فلسطین روانہ ہو گئے جہاں اُنہوں نے مسلمانوں کو اتفاق و اتحاد کی تلقین کی اور ساتھ ہی علی الاعلان کہا کہ فلسطین عربوں کا ملک ہے۔

ہم کسی صورت میں بھی اِسے صیہونیت کا مرکز بنا دینا گوارا نہیں کریں گے[۱]۔

علاّمہ مرحوم تیسری گول میز کانفرنس کے ممبر کی حیثیت سے ۷۔ نومبر ۱۹۳۲ء کو لندن تشریف لائے۔ ۲۴۔ نومبر کو اُن کے اعزاز میں نیشنل لیگ نے سینٹ جیمز سٹریٹ کی بنک بلڈنگ میں ایک استقبالیہ دیا جس میں گول میز کانفرنس کے بہت سے ہندوستانی ارکان کے علاوہ پارلیمینٹ کے بعض ممبر بھی شامل تھے۔ مکان کے دروازے پر جن لوگوں نے مہمانِ عزیز کا استقبال کیا اُن میں نیشنل لیگ کی صدر مس مارگریٹ فارکوہرسن، لارڈ ڈن گِگ، لارڈ لیمنگٹن اور سرہار کوٹ بٹلر شامل تھے۔

علاّمہ اقبال نے اس تقریب میں جو تقریر کی اُس میں انہوں نے فرمایا کہ برطانیہ کو چاہیے کہ عالم اسلام سے دوستانہ تعلقات اُستوار کرے اور یہ جبھی ممکن ہے کہ فلسطین سے برطانوی اقتدار کو ختم کر کے اُسے عربوں کے حوالہ کر دیا جائے۔

انگلستان کی نیشنل لیگ جس کی صدر مس مارگریٹ فارکوہرسن تھیں، اِس بات کی شدت سے حامی تھی کہ فلسطین خالصتاً عربوں کا ملک ہے اور اُسے عربوں ہی کے حوالہ کر دینا چاہئے۔ اس سلسلے میں نیشنل لیگ نے بڑی قابل قدر خدمات انجام دیں جن کا ہمیں تہ دل سے

---

۱۔ روزنامہ ٹائمز لندن مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۹۳۱ء

اعتراف ہے۔ مس فار کوہرسن مسئلہ فلسطین کے مُتعلق برابر علامہ اقبال سے نامہ و پیام جاری رکھتی تھیں اور علامہ بھی اِس درد مند خاتون کو ہمیشہ اپنے مشوروں سے مُستفیض فرماتے تھے۔

۲۳۔ نومبر ۱۹۳۳ء کو نیشنل لیگ کے اہتمام سے دارالعوام کے کمیٹی روم میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ لارڈ لیمنگٹن صدر جلسہ تھے۔ یہاں بھی یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ فلسطین کے عربوں کے حقوق محفوظ کرنے کی کیا تدبیریں اختیار کی جائیں۔ اِس اجلاس کی تیاری مُدّت سے ہو رہی تھی۔ چُنانچہ علامہ کو بھی اِطلاع دی جا چکی تھی۔ اُنھوں نے تار کے ذریعہ سے ذیل کا پیغام بھیجا جو لارڈ لیمنگٹن نے اجلاس میں پڑھ کر سنایا۔

"فلسطین کے مسئلہ نے مسلمانوں کو سخت مُضطرب اور پریشان کر رکھا ہے۔ اگر اِس قضیے کا فیصلہ ہمارے حسبِ منشاء نہ ہوا تو اندیشہ ہے کہ نتائج سخت ناگوار ہوں گے۔ آپ کی بروقت امداد کو میں بہ نظرِ تحسین دیکھتا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ (اگر آپ نے کوشش جاری رکھی تو) فلسطین میں یہودیوں کا داخلہ روک دیا جائے گا۔ اِس طرح آپ برطانیہ اور دُنیائے اسلام کے باہمی تصادم کو روک سکیں گے"۔

آخر کار وہی کچھ ہوا جس کا اندیشہ تھا، یعنی برطانیہ نے فلسطین کے مُتعلق جو رائل کمیشن مُقرر کیا تھا، اُس نے اپنی رپورٹ شائع کر دی کہ فلسطین کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ علامہ اِس تجویز سے سخت برافروختہ ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ تقسیم فلسطین کی تجویز، برطانوی حکومت کا ایک ایسا مکروہ اور قابلِ نفرت کارنامہ ہے جس کی مسلمان قیامت تک مذمّت کرتے رہیں گے۔ علامہ اُس وقت بیمار تھے، بلکہ یوں کہنا دُرست ہو گا کہ اُن کے مرض الموت کا آغاز ہو چکا تھا۔ لیکن اس حالت میں بھی وہ بدستور مس مارگریٹ فار کوہرسن کو خط لکھ لکھ کر فلسطین کے مُتعلق اپنے دردِ دل کا اظہار کرتے تھے۔

۲۰۔ جولائی ۱۹۳۷ء کو اپنے گرامی نامہ میں مس فار کوہرسن کو لکھتے ہیں۔

"میں بدستور علیل ہوں اِس لئے تفصیل سے آپ کو نہیں لکھ سکتا کہ رائل کمیشن کی رپورٹ نے میرے دل پر کیسا چرکا لگایا ہے۔ نہ یہ بتانے پر قادر ہوں کہ اِس رپورٹ سے ہندوستان کے مسلمان بالخصوص اور تمام ایشیا کے مسلمان بالعموم کس قدر رنج والم کا شکار ہوئے ہیں اور غم و غصّہ کے یہ جذبات آئندہ کیا رنگ اختیار کریں گے۔ نیشنل لیگ کو چاہئے کہ

بیک آواز اِس ظلم و طُغیان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرے اور برطانوی باشندگان کو سمجھائے کہ عربوں سے ناانصافی نہ کریں بلکہ اُن وعدوں کا ایفاء کریں جو گزشتہ جنگِ عظیم میں برطانیہ کے حکمرانوں نے برطانوی عوام کے نام پر عربوں سے کئے تھے۔ حقیقی طاقت کا سرچشمہ ہوش و خرد اور عقل مندی ہے اور جب طاقت کے نشے میں سرشار ہو کر انسان اپنے حواس کھو بیٹھتا ہے تو تباہی سے ہم کنار ہونے میں کوئی شُبہ باقی نہیں رہتا۔

ہمیں اِس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ فلسطین برطانیہ کی ملکیت نہیں، برطانیہ تو محض جمعیّت اقوام کے اِنتداب کے تحت فلسطین پر قابض ہے، ایشیا کے مسلمان اِس حقیقت سے بخوبی واقف ہوتے جا رہے ہیں کہ یہ جمعیّتِ اقوام دراصل ایک اینگلو فرانسیسی ادارہ ہے جس کا مقصد صرف اسلامی ممالک کے حصّے بخرے کر کے اُنہیں کمزور سے کمزور تر کر دینا ہے۔ فلسطین یہودیوں کا ملک بھی نہیں کیونکہ یہودی تو عربوں کی آمد سے بہت پہلے اپنی مرضی سے فلسطین چھوڑ کر چلے گئے تھے، یہ امر بھی ملحوظِ خاطر رکھنا چاہئے کہ صیہونیت کوئی مذہبی تحریک نہیں۔ اِس تحریک کے خدوخال سے قطع نظر کر کے صرف فلسطین کمیشن کی رپورٹ پر اگر ایک نظر ڈالی جائے تو بھی یہ صداقت الم نشرح ہو جاتی ہے۔

ایک غیر جانب دار شخص جب اِس رپورٹ کا مطالعہ کرتا ہے تو لازماً اِس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ صیہونیت کی تحریک کا ڈھونگ اِس لئے نہیں کھڑا کیا گیا تھا کہ یہودیوں کے لئے ایک قومی وطن درکار ہے بلکہ اِس تمام کاوش کی غرض و غایت یہ تھی کہ بحیرۂ روم میں برطانوی اِستعمار کے لئے ایک نیا اڈّا قائم کیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ اِس رپورٹ نے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح کر دی ہے کہ ارضِ مُقدّس کو بزور و جبر ہی نہیں بلکہ بہ حیلہ و فن برطانیہ کے ہاتھ فروخت کرنے کا ایک منصوبہ تیّار کیا گیا ہے اور یہ سب کچھ اس واسطے کیا گیا ہے کہ مستقل اِنتداب کی آڑ میں برطانوی شہنشاہیت کے خواب کی

حسب منشاء تعبیر رُونما ہو سکے۔ اس سودے کا معاوضہ یوں چکایا گیا ہے کہ عربوں کو کچھ روپیہ دے دیا گیا ہے اور ساتھ اُن کی فیاضی اور دریا دلی کے جذبات کو اُبھارنے کی بھی کوشش کی گئی ہے اور اُدھر یہودیوں کو بھی ایک قطعۂ اراضی عطا کر دیا گیا ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ برطانوی سیاست دان اور مُدبّر عقل سے کام لیں گے اور اِس پالیسی کو جو حقیقتاً عرب دُشمنی پر مبنی ہے۔ ترک کر کے عربوں کی سرزمین اُنہیں واپس کر دیں گے۔ مجھے یہ باور کرنے میں کوئی شُبہ نہیں کہ عرب انگریزوں سے مفاہمت کے مُتمنّی ہیں اور بوقت ضرورت وہ فرانس سے بھی کوئی معقول سمجھوتہ کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ اس کے برعکس اگر پراپیگنڈے کے زور سے برطانوی عوام کو گمراہ کر کے انہیں عربوں کے مخالف بنانے کی مُہم جاری رکھی گئی تو اِس پالیسی کے نتائج خوفناک ثابت ہوں گے"۔

علاّمہ اقبال تقسیم فلسطین کی تجویز سے اِس قدر پریشان تھے کہ جونہی رائل کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی۔ اُنھوں نے پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری غلام رسول خاں مرحوم کو حکم دیا کہ فوراً لاہور میں ایک جلسۂ عام منعقد کر کے اِس شرانگیز تجویز کے خلاف زور دار احتجاج کیا جائے۔ چنانچہ ۲۶۔ جولائی ۱۹۳۷ء کو موچی دروازہ کے باغ میں ملک برکت علی مرحوم کے زیرِ صدارت ایک بہت بڑا جلسہ ہوا۔

علاّمہ نے خصوصیت سے اِس جلسے کے لئے ایک معرکتہ الآرا بیان انگریزی میں لکھا تھا اور حکم دیا تھا کہ یہ بیان اور اس کا ترجمہ دونوں جلسے میں پڑھ کر سنائے جائیں۔ چنانچہ تعمیلِ ارشاد میں غلام رسول خاں مرحوم نے اُردو ترجمہ حاضرین کو پڑھ کر سنایا۔

میری ناچیز رائے میں علاّمہ کا یہ بیان اُن کی زندگی کے آخری سال کی اہم ترین تحریروں میں شمار ہوتا ہے جس کا مطالعہ ہر صاحب فکر انسان کو کرنا چاہئے۔ بیان خاصا طویل ہے جس کا مکمل ترجمہ یہاں درج کرنا ممکن نہیں صرف جستہ جستہ حصّے نقل کرتا ہوں[۱]۔

۱۔ "میں آپ لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ عربوں کے ساتھ جو ناانصافی کی گئی ہے، میں اُس کو اُسی شدّت سے محسوس کرتا ہوں جس سے وہ ہر شخص

---

۱۔ یہ مکمل بیان میری کتاب "اقبال کے آخری دو سال" میں درج ہے

محسوس کرتا ہے جسے مشرقِ قریب کے حالات کا تھوڑا بہت علم ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پانی ابھی سر سے گزرنے نہیں پایا اور انگریز قوم کو بیدار کر کے اِس بات پر آمادہ کیا جا سکتا ہے کہ اُن وعدوں کو پُورا کرے جو اُس نے انگلستان کے نام پر عربوں سے کئے تھے"۔

۲۔ "مشرقِ قریب کے مسلمانوں کے بارے میں برطانوی شہنشاہیت کے مذمُوم ارادوں کو جس بُری طرح رائل کمیشن نے اِس رپورٹ میں بے نقاب کیا ہے اُس کی مثال پہلے کبھی نظر نہیں آئی۔ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کی تجویز تو محض ایک بہانہ ہے۔ اصلیّت یہ ہے کہ مسلمانوں کی اس مُقدّس اور مذہبی سرزمین پر اپنا مستقل اِنتداب قائم رکھ کر برطانوی شہنشاہیت خود اپنے لئے ایک ٹھکانہ پیدا کر رہی ہے"۔

۳۔ "آج مسئلہ فلسطین کے بارے میں ایشیا کے تمام آزاد اسلامی ممالک کی غیرت و حمیّت کا امتحان ہے خواہ وہ ممالک عرب ہیں یا غیر عرب۔ منصبِ خلافت کی تنسیخ کے بعد عالمِ اسلام کے لئے یہ پہلا بین الاقوامی مسئلہ ہے جس کی نوعیّت بیک وقت مذہبی بھی ہے اور سیاسی بھی اور جس سے نبرد آزما ہونے کے لئے زمانے کی طاقتیں اور تاریخ کے تقاضے آزاد اسلامی ممالک کو پُکار رہے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ یہی مسئلہ آگے چل کر ایشیا کے آزاد اسلامی ممالک کو اِس اینگلو فرانسیسی ادارے سے جس کو غلطی سے جمعیّتِ اقوام کا نام دے دیا گیا ہے۔ اس قدر بدگمان و برگشتہ کر دے کہ وہ اپنے تحفظ کے لئے اقوام مشرق کی ایک علیحدہ جمعیت قائم کرنے کے امکانات پر غور کرنے کے لئے مجبور ہو جائیں۔"

اپنی وفات سے سال بھر پہلے یعنی ۷۔ اپریل ۱۹۳۷ء کو علاّمہ اقبال نے ایک مکتوبِ گرامی میں قائداعظم کو لکھا تھا۔

"فلسطین کے مسئلہ نے مسلمانوں کو سخت مضطرب اور پریشان کر رکھا ہے۔ مسلم لیگ کے لئے رابطۂ عوام کا یہ نادر موقع ہے۔ مجھے پُختہ اُمّید ہے کہ لیگ اِس موضوع پر ایک زبردست قرار داد منظور کرے گی اور لیڈروں کی ایک غیر رسمی کانفرنس منعقد کر کے کوئی ایسا واضح اور مُعیّن لائحۂ عمل تجویز کرے گی۔ جس میں عوام بڑی تعداد میں شامل ہوسکیں۔ اس طرح

لیگ کی مقبولیت میں بہت جلد اضافہ ہو جائے گا اور فلسطینی عربوں کو بھی مدد مل سکے گی۔ ذاتی طور پر میں کسی ایسے امر کے لئے جس کا اثر ہندوستان اور اسلام دونوں پر پڑتا ہو جیل جانے کو تیار ہوں، ایشیا کے دروازے پر مغربی اِستعمار کے ایک فوجی اڈّے کی تعمیر اسلام اور ہندوستان دونوں کے لئے خطرہ ہے۔"

یہ تو تھے علاّمہ اقبال کے ذاتی تاثرات جن کا اظہار اُنھوں نے بار بار اپنے مضامین و مکاتیب اور اپنی تقریروں میں کیا۔ اب میں اِس ضمن میں اُن مساعی کا بھی ذکر کرنا چاہتا ہوں جو آل انڈیا مسلم لیگ نے کی تھیں۔

۱۷۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو جب آل انڈیا مسلم لیگ کا پچیسواں سالانہ اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا تو ذیل کی قرار داد منظور کی گئی تھی۔

مسلمانانِ ہند کی جانب سے آل انڈیا مسلم لیگ اعلان کرتی ہے کہ فلسطین کے رائل کمیشن کی سفارشات اور اُن سے مُتعلّق وزیرِ مُستعمرات نے پارلیمنٹ میں جو بیان دیا ہے وہ مسلمانوں کے مذہبی احساسات سے متصادم و مخالف ہے اور لیگ اُس کو مدِّ نظر رکھ کر مطالبہ کرتی ہے کہ اِس پالیسی سے حکومت فوراً دست بردار ہو جائے۔

آل انڈیا مسلم لیگ حکومتِ ہند کو اِس بات کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ وہ جمعیتِ اقوام (لیگ آف نیشنز) کی اسمبلی کے ہندوستانی نمائندوں کو ہدایت کرے کہ وہ عربوں کے مذہبی اور شہری حُقوق کے تحفّظ کے پیشِ نظر فلسطین سے غیر ملکی اقتدار کے اٹھائے جانے کا مطالبہ کریں اور ہر اُس فیصلہ سے علیحدہ رہیں جس سے اس اقتدار کی بقاء کا احتمال ہو اور جو اعرابِ فلسطین کو اُس اُصولی حق سے محروم کر دے جس کی رُو سے وہ بین الملّی معاہدوں کے مطابق اپنے مقاصد اور ضروریات کے لئے بہترین طرزِ حکومت انتخاب کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔

اسلامی ممالک کے فرمانرواؤں سے آل انڈیا مسلم لیگ اپیل کرتی ہے کہ وہ اپنا زبردست اثر اور اپنی کوششیں جاری رکھیں کہ ارضِ مُقدس پر غیر مسلم تسلّط کی پامالی اور عربوں کو اِس برطانوی شہنشاہیت کی غلامی سے

بچائیں جسے یہودیوں کے روپے کی مدد حاصل ہے۔

اعلیٰ حضرت مُفتیٔ اعظم کے زیرِ قیادت جو اعلیٰ مسلم کونسل اور اعلیٰ عرب کمیٹی قائم ہیں، آل انڈیا مسلم لیگ اُن پر کامل اطمینان اور اعتماد کا اظہار کرتی ہے اور فلسطین کی مقامی حکومتوں کو تنبیہ کرتی ہے کہ اِس ظلم و اِستبداد کی پالیسی کو جس کی حمایت رائل کمیشن نے بظاہر قیام و انتظامِ امن کے لئے. لیکن دراصل عربوں کے مفاد کو تقسیم فلسطین کے ذریعہ سے نقصان پہنچانے کی غرض سے کی ہے. جاری رکھ کر مسلمانانِ عالم کے جذبۂ ناراضگی کو اور تقویت نہ دیں۔

فلسطین کانفرنس منعقدہ ۲۵-۲۴۔ ستمبر ۱۹۳۷ء میں جو ڈیلی گیٹ مُقرّر کئے گئے ہیں آل انڈیا مسلم لیگ اُن پر اور اُن کے لیڈر پر اپنے کامل اعتماد کا اظہار کرتی ہے اور اعرابِ فلسطین کے ہر حامی اور دوست سے اپیل کرتی ہے کہ ان کی شکایات رفع کرنے کے لئے مُتحدہ صدا بلند کریں۔ اگر برطانوی حکومت نے اپنی موجودہ یہود نواز پالیسی کو نہ بدلا تو آل انڈیا مسلم لیگ اُسے مُتنبّہ کرتی ہے کہ مسلمانانِ ہندوستان تمام اسلامی دُنیا کے ساتھ مل کر برطانیہ کو اسلام کا دُشمن تصوّر کریں گے اور اپنے مذہبی عقائد کی بناء پر تمام ضروری کارروائی کرنے پر مجبور ہوں گے"۔

۱۹۳۸ء میں جملہ عربی ممالک کے نمائندوں کی ایک کانفرنس قاہرہ میں منعقد ہوئی تاکہ مسئلہ فلسطین پر غور کر کے کوئی موزوں راہ عمل تلاش کی جائے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کو بھی شرکت کی دعوت موصول ہوئی تھی، چنانچہ لیگ کی طرف سے عبدالرحمٰن صدیقی اور چودھری خلیق الزماں قاہرہ گئے۔ اس کانفرنس کے اختتام پر برطانوی حکومت نے بھی اس قضیے کا تصفیہ کرنے کے لئے لندن میں ایک الگ کانفرنس کا انعقاد کیا اور آل انڈیا مسلم لیگ کے دونوں نمائندے وہاں بھی تشریف لے گئے۔

لندن کی کانفرنس میں عبدالرحمٰن صدیقی اور چودھری خلیق الزماں نے آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف سے جو میمورنڈم برطانوی حکومت کو پیش کیا تھا وہ یقیناً اس قابل ہے کہ اس کا مکمل ترجمہ نیچے درج کیا جائے۔

مسئلہ فلسطین سے متعلق آل انڈیا مسلم لیگ کا میمورنڈم جسے عبدالرحمٰن صدیقی اور چودھری خلیق الزماں نے برطانوی حکومت کو پیش کیا۔

"ہز میجسٹی ملک معظم کی حکومت عنقریب لندن میں فلسطین کانفرنس منعقد کرنے والی ہے. لہٰذا ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے نمائندوں کی حیثیت سے اپنے کروڑوں ہم وطنوں کے جذبات و خیالات کو ضبط تحریر میں لاکر آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔ امید ہے جن واقعات و حقائق کا ذکر اس میمورنڈم میں کیا گیا ہے ان کی مدد سے آپ اس مسئلہ کا کوئی معقول اور منصفانہ حل تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے"۔

"اس مسئلے کے جس پہلو نے آج تک عوام کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کئے رکھا ہے. اس میں ایک طرف حسین اور میکموہن. کا باہمی معاہدہ ہے۔ وہ بیان ہے. جو عربی لیڈروں کو دیا گیا تھا اور وہ اینگلو فرانسیسی اعلان ہے جسے جنرل ایلن بی نے کیا تھا۔ دوسری طرف بالفور کا اعلان ہے۔ ان دونوں شقوں میں بہت سی باتیں اور وعدے ایسے درج ہیں جن کا آپس میں اختلاف ہی نہیں بلکہ تصادم ہے اور جنہیں ایک دوسرے سے منطبق کرنے کی جتنی کوششیں اب تک کی گئی ہیں. سوئے قسمت سے ان کا کچھ نتیجہ بر آمد نہیں ہوا۔

اس موضوع پر جس قدر دستاویزیں مل سکی ہیں، ان کا آل انڈیا مسلم لیگ نے نہایت غور سے مطالعہ کیا ہے اور لیگ اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ اس ضمن میں مسلمانان ہند سے جو وعدے کئے گئے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں اس توجہ اور غور و فکر سے محروم رہے ہیں جن کے وہ حقیقتاً مستحق تھے. اگر ان جملہ دستاویزوں پر ایک نظر ڈالی جائے تو بہت سے امور واضح ہو کر ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اتحادیوں نے صاف الفاظ میں عربوں سے مکمل آزادی کا وعدہ کیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ اماکن مقدسہ کلیتہً مسلمانوں کی تحویل میں رہیں گے۔ مسلم لیگ کی رائے ہے کہ یہ مواعید کسی دیگر تاویل و تعبیر کے متحمل نہیں ہو سکتے"۔

## وائسرائے کا نوٹیفکیشن

جب جنگ عظیم میں ترکی بھی شریک ہوا تو صورت حال میں گویا خطرناک تبدیلی ہو گئی۔ مسلمانان عالم کو جس وحدت کے رشتے نے ایک ہی لڑی میں پرو رکھا ہے اس کے پیش نظر برطانوی حکومت نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کو آئندہ کے متعلق مطمئن کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ برطانیہ نے روس اور فرانس کی حکومتوں سے مشورہ کرنے اور ان کی منظوری حاصل کرنے کے بعد

وائسرائے ہند کے ذریعہ سے اعلان کیا کہ یہ جنگ قطعاً مذہبی جنگ نہیں اور نہ اس میں مذہب کو کسی قسم کا دخل ہے۔ اسلام کے اماکن مقدسہ بالکل مامون و محفوظ رہیں گے اور انہیں کوئی گزند نہیں پہنچ سکے گا۔

وائسرائے کا یہ نوٹیفکیشن ۱۴۔ نومبر ۱۹۱۴ء کو جاری ہوا تھا جس کا ایک ٹکڑا یہ ہے:۔

"برطانیہ عظمیٰ اور ترکی کے درمیان جنگ چھڑ جانے کے سلسلہ میں برطانیہ عظمیٰ کو حد درجہ ملال کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس جنگ کی ذمہ داری سراسر حکومت عثمانیہ پر عائد ہوتی ہے جس نے اپنے مشیروں کے غلط مشوروں پر عمل کر کے بغیر کسی اشتعال انگیزی کے عمداً اور جان بوجھ کر یہ جنگ شروع کر دی ہے۔

اس ضمن میں ملک معظم کی حکومت نے ہزایکسی لنسی وائسرائے کو اختیار دیا ہے کہ وہ اسلام کے ان اماکن مقدسہ کے بارے میں جو عرب اور عراق عرب میں واقع ہیں اور بندر گاہ جدہ کے متعلق بھی یہ اعلان عام کردے کہ وہ بالکل مامون و محفوظ رہیں گے اور برطانیہ کی برّی و بحری فوجوں سے انہیں اس وقت تک قطعاً کسی قسم کا گزند نہیں پہنچے گا جب تک کہ ہندوستان سے جانے والے حاجیوں یا عراق کے مقامات مقدسہ کے زائرین کے راستے میں رکاوٹ اور خلل نہیں ڈالا جائے گا۔

ملک معظم کی وفادار مسلمان رعایا کو مطمئن رہنا چاہئے کہ موجودہ جنگ کا مذہب سے قطعاً کوئی تعلق نہیں اور اس ضمن میں برطانوی حکومت کا رویہ ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ ملک معظم کی حکومت کی درخواست پر فرانس اور روس کی حکومتوں نے بھی اس بات کا یقین دلایا ہے"۔

## وزیر اعظم کی یقین دہانی

۹۔ نومبر ۱۹۱۴ء کو گلڈ ۱؎ ہال کی دعوت طعام میں برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر ایسکوئتھ نے جو تقریر کی تھی اس میں انہوں نے ان یقین دہانیوں کی تصدیق و توثیق کی تھی جو اتحادی حکومتوں کی طرف سے کی گئی تھیں اور یہ بھی فرمایا تھا کہ :۔

"ہمیں ترکی کے سلطان کی مسلمان رعایا سے کوئی پرخاش نہیں۔ ہمارے اپنے بادشاہ کی رعایا میں کروڑوں مسلمان شامل ہیں اور یہ بات ہمارے تصور میں بھی نہیں آ سکتی کہ ہم اپنی مسلمان رعایا کے مذہب اور ان کے اماکن مقدسہ کے خلاف کوئی صلیبی جنگ لڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر کبھی ضرورت پڑی اور باہر سے کسی نے حملہ کیا تو ہم ان بیرونی حملہ آوروں کے مقابلے میں پوری طاقت سے ان اماکن مقدسہ اور اپنی مسلمان رعایا کی حفاظت کریں گے اور انہیں صحیح سلامت اور مامون و محفوظ رکھیں گے"۔

اس واقعہ سے بھی پہلے جب ۲۵۔ مارچ ۱۹۱۴ء کو ہندوستان کے مسلمان لیڈروں نے دہلی میں وائسرائے کو ایڈریس پیش کیا تھا تو وائسرائے نے یقین دلایا تھا کہ حکومت کو اسلام کے اماکن مقدسہ کی اہمیت کا پورا احساس ہے اور وہ بھی جانتی ہے کہ ان اماکن مقدسہ کا مسلمانوں کی تحویل میں رہنا کس قدر ضروری ہے۔ اس یقین دہانی کے ساتھ وائسرائے نے یہ اعلان بھی کیا تھا۔

"میں نے گزشتہ ستمبر کی ۱۷۔ تاریخ کو لیجسلیٹو کونسل کے اجلاس میں شملہ میں جو تقریر کی تھی اس کا اعادہ آپ کے سامنے کرنا ضروری نہیں سمجھتا تاہم اتنا بتا دینا چاہتا ہوں کہ اسلام کے جو اماکن مقدسہ موجود ہیں وہ بعینہٖ برقرار رہیں گے۔ یہ اماکن مقدسہ آپ کی قوم اور ہمارے ملک معظم کی حکومت کے درمیان ایک اہم اور طاقتور کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مسلمانان ہند کے مذہبی مفاد کے پیش نظر اور اس امر کی اہمیت کو ملحوظ رکھتے

---

۱؎ گلڈ ہال، لندن کے لارڈ میئر کا سرکاری دفتر ہے۔ ہر سال اکتوبر یا نومبر کے مہینے میں جب نیا لارڈ میئر منتخب ہوتا ہے تو گلڈ ہال کے شان دار ایوان میں ایک دعوت ضرور دیتا ہے۔ جہاں برطانیہ کا وزیر اعظم تقریر کرتا اور اپنی حکومت کی پالیسی کی وضاحت کرتا ہے۔ یہ روایت قدیم سے چلی آ رہی ہے۔ (مصنف)

ہوئے کہ مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے اور اماکن مقدسہ پر ان ہی کا قبضہ ہونا چاہئے۔ برطانوی حکومت اس ضمن میں اپنی ذمے داری کو بخوبی محسوس کرتی ہے"۔

## اعادہ

۱۵۔ جنوری ۱۹۱۵ء کو جب وائسرائے نے امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں تقریر کی تو وزیر اعظم کے الفاظ کو دُہراتے ہوئے اور اس وعدے کا اعادہ کرتے ہوئے کہ اماکن مقدسہ کی سلامتی میں کوئی خلل واقع نہیں ہو گا یہ بھی کہا تھا۔

"حالات و واقعات کا دھارا جو رخ چاہے اختیار کرے یہ امر ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ مسلمانوں کے اماکن مقدسہ مامون و محفوظ رہیں گے۔ اور اسلام بدستور دنیا کی عظیم الشان طاقتوں میں شمار ہو گا۔"

برطانیۂ عظمیٰ کی حکومت اور ہندوستان کی حکومت کے سربراہوں نے جب اس قسم کے وعدے کئے تو ہندوستان کے مسلمانوں کو مستقبل کے متعلق اطمینان ہو گیا اور اسی اطمینان کے باعث وہ لاکھوں کی تعداد میں ملک معظم کی فوج میں بھرتی ہو کر ہر محاذ جنگ پر جا کر بے دریغ غنیم سے لڑے۔ حتیٰ کہ جنرل ایلن بی کے تحت انہوں نے مشرق قریب کی جنگوں میں بھی خوب داد شجاعت دی۔ ان کی ان ہی خدمات اور قربانیوں کے طفیل جن کا حکومت نے بھی بار بار اور کھلے دل سے اعتراف کیا تھا۔ مشرق قریب کی جنگ کا رخ بدل گیا اور بالآخر یہی قربانیاں بڑی حد تک اتحادیوں کو فتح سے ہم کنار کرنے کا موجب ثابت ہوئیں۔

## مایوسی

جونہی جنگ ختم ہوئی مسلمان یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اتحادیوں نے دوران جنگ میں جو وعدے کئے تھے ان میں سے ایک ایک کو فراموش کر دیا گیا ہے اور بجائے اس کے کہ ان وعدوں کو معرض عمل میں لایا جاتا، عرب ملکوں کی آزادی کو تہ تیغ کیا جا رہا ہے۔ عرب ممالک کے حصے بخرے کر کے انہیں اتحادی طاقتیں اپنے اپنے حیطہ اختیار و دائرہ اقتدار میں لا رہی ہیں اور اس تسلط کے جواز میں نئی نئی اصطلاحیں وضع کی جا رہی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں چاروں طرف ایک

بے چینی اور اضطراب پھیلنے لگا۔ یہ صورت حال دیکھ کر حکومت نے شکوک و شبہات رفع کرنے کی کوشش کی اور ۵۔ مئی ۱۹۲۰ء کو حکومت ہند نے ایک نوٹیفکیشن نمبر ۱۱۵۹ جاری کیا جس میں کہا گیا کہ:-

"مسلمانان ہند کو یاد رکھنا چاہئے کہ جہاں تک ان کے ہم مذہب عربوں کی آزادی کا تعلق ہے وہ سابقہ سلطنت عثمانیہ کے ایک بہت بڑے باقی ماندہ حصے میں قائم اور برقرار ہے۔ سابقہ سلطنت عثمانیہ کے جو علاقے مسلمانوں کے تسلط سے آزاد کرائے گئے ہیں وہ نسبتاً بہت چھوٹے ہیں، مثلاً آرمینیا، تھریس اور سمرنا، قبل از جنگ کی مردم شماری کی رو سے ان علاقوں کی بیشتر آبادی غیر مسلموں پر مشتمل تھی"۔

## آزادیٔ کامل

مذکورہ بالا بیان سے واضح ہے کہ اتحادیوں نے اسلامی ممالک کے صرف ان خطوں کو مسلمانوں کے قبضے سے آزاد کرایا ہے جن کی بیشتر آبادی اتحادی طاقتوں کے خیال کے مطابق غیر مسلموں پر مشتمل تھی یعنی آرمینیا، تھریس اور سمرنا۔ اس بات کا ثبوت اس واقعہ سے بھی ملتا ہے کہ جب ہندوستان کے مسلمانوں نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ ترکی سلطنت کو پارہ پارہ نہ کیا جائے تو برطانیہ کے وزیر اعظم نے اس مطالبے کو ناقابل تسلیم قرار دیتے ہوئے یہ عذر پیش کیا تھا کہ ملک عرب کو آزادی کامل ضرور ملنی چاہئے، جس سے مراد سابقہ سلطنت عثمانیہ کے وہ علاقے تھے جہاں عربوں کی اکثریت آباد ہے۔ چنانچہ نوٹیفکیشن میں اس امر کا اظہار یوں کیا گیا ہے۔

"ہندوستان کے مسلمانوں کو (صلح نامہ کی) ان دفعات سے زیادہ دلچسپی ہے جن کا تعلق سابقہ ترکی سلطنت کے ان علاقوں سے ہے جہاں ان کے ہم مذہب عربوں کی اکثریت آباد ہے۔ ملک عرب کی مکمل آزادی ایک تسلیم شدہ چیز ہے۔ کئی پشتوں سے اعراب، ترکی حکومت کی بدنظمی اور بدانتظامی کا شکار چلے آرہے ہیں اور گزشتہ جنگ میں انہوں نے اپنی آزادی کے حصول کے لئے اتحادیوں کے پہلو بہ پہلو داد شجاعت دی تھی۔ اب اتحادیوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ دوبارہ عربوں کو ترکوں کی غلامی میں

ڈال دیں، حد درجہ نامناسب ہے۔ برطانیہ کے وزیراعظم نے وفد خلافت کو بھی یہی جواب دیا تھا کہ محض اس بنا پر کہ ترک اور عرب دونوں مسلمان قومیں ہیں، عربوں کو ان کی آزادی سے محروم کرنا کسی طرح جائز نہیں"۔

## انتداب

ہندوستان کے مسلمانوں کو یقین دلایا گیا تھا کہ یہ انتداب ایک معینہ مقصد اور ایک عارضی مدت کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں اعلان کیا گیا تھا کہ:۔

"اسی قسم کی شرائط کا اطلاق کردستان پر بھی ہوتا ہے جسے حق خود ارادی عارضی طور پر عطا کیا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ ایشیا کے ان خطوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جن کا انتداب صلح کانفرنس نے برطانیہ اور فرانس کے سپرد کیا ہے یعنی فلسطین، عراق اور شام۔

یہ امر بالکل واضح ہے کہ ان تینوں ممالک میں جو انتداب قائم کیا جا رہا ہے وہ ایک خاص مقصد اور ایک عارضی مدت کے لئے ہے۔ اگر ہم فوراً ان خطوں میں قومیّت کا اصول رائج کر دیں تو یقیناً وہاں سخت انتشار اور طوائف الملوکی پھیل جائے گی۔

جن حکومتوں کو انتداب سپرد کیا گیا ہے ان کا یہ کام ہے کہ مقامی باشندوں کو نظم و نسق کے رموز اور طور طریقے سکھائے جائیں، تا آنکہ وہ لوگ اس قابل ہو جائیں کہ کسی بیرونی امداد کے بغیر اپنے اپنے ملک کا نظم و نسق سنبھال سکیں۔

اس نوع کا انتداب قائم کرنے سے اسلام کو کسی قسم کا ضعف نہیں پہنچے گا۔ جن دو عظیم الشان طاقتوں کو انتداب تفویض کیا گیا ہے (برطانیہ اور فرانس) ان کی وسیع سلطنتوں میں مسلمانان عالم کی ایک بہت بڑی تعداد آباد ہے جو اس بات کی ضامن ہے کہ انتداب شدہ علاقوں کے مسلمانوں کے مفاد بالکل محفوظ رہیں گے۔ عرب، عراق اور فلسطین میں اسلام کے اماکن مقدسہ واقع ہیں جن کے ساتھ تمام مسلمانوں کو روحانی اور دلی عقیدت ہے"۔

## مسلمانان ہند کا اضطراب

روز اول سے جب فلسطین کو جمعیت اقوام (لیگ آف نیشنز) کے انتداب کے تحت لایا گیا تھا وہاں کے حالات و واقعات نے ایسی روش اختیار کر لی کہ مسلمانان ہند کے اضطراب اور پریشانی میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ وجہ یہ ہے کہ فلسطین مسلمانوں کا قبلۂ اول ہے جہاں ان کے بہت سے مقامات مقدسہ واقع ہے۔

اتحادیوں نے فلسطین کو ایک خود مختار اور جداگانہ مملکت تسلیم کر لیا تھا لیکن انتدابی حکومتوں نے یہاں اپنے مفوضہ فرائض اور ذمے داریوں کو جس انداز سے ادا کرنا شروع کیا ہے اسے دیکھ کر ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک وسیع اضطراب کی لہر پھیل گئی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ انتداب کی غرض و غایت یہ تھی کہ مقامی باشندوں کی رہنمائی اور اعانت اس طرح کی جائے کہ وقت آنے پر وہ بغیر کسی خارجی امداد کے اپنے ملک کا نظم و نسق سنبھال سکیں۔

مسلم لیگ کی رائے ہے کہ انتداب کی مجوزہ سکیم کے مطابق اصل طریق کار یہ تھا۔ فلسطین کا نظم و نسق کرنے کے لئے مقامی باشندوں کا ایک ادارہ قائم کیا جاتا اور خالصتاً نظم و نسق ہی کے دائرے کے اندر اس مقامی ادارے کی خلوص نیت سے مدد کی جاتی۔ اس کے برعکس گزشتہ بیس سال کے واقعات پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ برطانیہ عظمیٰ نے فلسطین کے باشندوں کی اعانت کے لئے قطعاً کچھ نہیں کیا اور اس فرض کی انجام دہی میں بالکل ناکام رہا ہے جسے تہذیب کے نام پر اس کے سپرد کیا گیا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ برطانیہ نے انتداب کی دفعات و شرائط کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے فلسطین کو برطانوی سلطنت کا ایک جزو بنا لیا ہے۔ جمعیت اقوام کے معاہدے کی رو سے برطانیہ کا فرض تھا کہ فلسطین میں حکومت خود اختیاری کے جملہ ادارے قائم کرنے کی غرض سے مقامی باشندوں کی رہنمائی کرے۔ لیکن برطانیہ نے اس جانب ایک قدم تک نہیں اٹھایا۔

## کچھ اعداد و شمار

یہ حقیقت ہر شخص کو معلوم ہے کہ گزشتہ جنگ عظیم کے خاتمے پر فلسطین میں رہنے والے یہودیوں کی تعداد پچاس ہزار سے بھی کم تھی لیکن جونہی جنگ ختم ہوئی دنیا کے مختلف ممالک کے یہودیوں کو یہاں لا لا کر آباد کرنا شروع کر دیا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج فلسطین میں یہودیوں کی تعداد ساڑھے چار لاکھ تک پہنچ گئی ہے جو ملک کی پوری آبادی کا تیس فی صد عنصر ہے۔

مسلم لیگ کے خیال میں اس پالیسی کی غرض و غایت یہ ہے کہ عربی ممالک کے عین قلب میں ایک یہودی مملکت کا وجود کھڑا کر دیا جائے اور اگر اس قسم کی مملکت کا قیام ممکن نہ ہو تو پھر فلسطین میں اقلیت کا خطرناک شوشہ چھوڑ دیا جائے تاکہ اس طرح عربوں کی قومی نشو و نما رک جائے۔

اس کے علاوہ یہ نکتہ بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ اراضی، بالخصوص زرعی اراضی کی تقسیم میں جو پالیسی اختیار کی گئی ہے اس کا ایک خطرناک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ فلسطین کے ہزاروں اصلی باشندوں کو ان کی زمینوں اور گھروں سے بے دخل کر کے خانہ بدوش بنا دیا گیا ہے اقتصادی اور صنعتی مراعات جس طریقے سے عطا کی گئی ہیں اس سے گویا حقیقی باشندوں کی گردن میں پھانسی کا پھندا پڑ گیا ہے اور ان کی زندگی کی بنیادیں منہدم ہو گئی ہیں۔

بار بار ذمے دار حلقوں سے یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ صیہونیت کی آمد سے ملک کی اقتصادی حالت پہلے سے بہت بہتر ہو گئی ہے۔ حالانکہ واقعات ان دعووں کی تردید کر رہے ہیں۔ جنگ کے معا بعد فلسطین میں جس ظاہری لیکن عارضی خوشحالی کا دور دورہ ہوا تھا کم و بیش اسی قسم کی خوشحالی فلسطین کے ہمسایہ عرب ممالک میں بھی پائی گئی ہے، جس کی وجہ یہودیوں کی آمد سے نہیں بلکہ اور اسباب سے منسوب کی جانی چاہئے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ اسی قسم کے بے بنیاد دعوے معاشرت کے دیگر شعبوں کے متعلق بھی کئے جا رہے ہیں۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ فلسطین میں پبلک ہیلتھ، حفظان صحت، صفائی اور تعلیم نے جس قدر ترقی کی ہے وہ سب کی سب یہودی انجمنوں کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فلسطین کے عربوں کی آبادی میں جو نام نہاد اضافہ ہوا ہے وہ بھی یہودیوں کے داخلے کا نتیجہ ہے۔

## مخالف آبادی

برطانیہ کا رویہ دیکھ کر ایک نہایت معقول اور برمحل سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ انتداب کی رُو سے برطانیہ کا فرض تھا کہ فلسطین میں ایک اچھی، منصفانہ حکومت کے قیام کی تجاویز کو بروئے کار لائے۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ برطانیہ اس فرض کی بجا آوری میں قطعی ناکام رہا ہے کیونکہ اس نے یہودیوں کی ایک کثیر تعداد کو جو فلسطین کے اصلی باشندوں کی حریف اور مخالف ہے، باہر سے لاکر اس ملک میں آباد کر دیا ہے اور یوں انتداب کی ذمے داریوں سے دامن چھڑا کر، وہی ذمے داریاں یہودیوں کے حوالے کر دی ہیں؟ جس وقت برطانیہ کو فلسطین کا انتداب دیا گیا تھا تو یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ وہ اپنی ذمے داریاں اس طرح یہودیوں کے حوالے کر

دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اہل عرب اور عالم اسلام نے بار بار برطانیہ کے اس روّیے پر اعتراض کیا ہے۔

فلسطین کی اس نام نہاد خوش حالی اور مراعات کے دعووں کو اگر درست بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی لامحالہ یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ برطانیہ کی انتدابی حکومت تو محض ایک تماشائی کی حیثیت رکھتی تھی ورنہ فلسطین کو جس قدر ترقی اور تونگری نصیب ہوئی وہ تمام تر یہودیوں ہی کی دستکاری اور کاوش کا ثمر ہے۔

ہم یہ واضح اور دوٹوک اعلان کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ بیرونی ممالک سے ایسے عناصر کو فلسطین میں لا کر داخل کرنا جو اس سرزمین کی اصل آبادی کے حریف اور مخالف ہیں، انتداب کی غرض و غایت کے صریح منافی ہے۔ بالفرض اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہودیوں کی آمد کے باعث فلسطین کی اقتصادی خوشحالی میں اضافہ ہوا ہے تو بھی یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ دنیا کی کوئی قوم اس قسم کی خوشحالی کے حصول کے لئے اپنی سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی موت کے محضر پر بہ طیبِ خاطر دستخط کرنے کو تیار نہیں ہو سکتی۔ ہمیں یہ دیکھ کر مسرت ہوئی ہے کہ رائٹ آنریبل وزیر مستعمرات نے ۲۴۔ نومبر ۱۹۳۸ء کو جو تقریر دارالعوام میں کی تھی، اس میں اسی بنیادی نکتے کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہا تھا کہ :

"عربوں کے پیش نظر اپنی آزادی ہے اور وہ یہ دیکھ کر ہراساں اور خوف زدہ ہیں کہ اگر یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا تو وہ دن دور نہیں جب فلسطین یہودیوں کا قومی وطن بن جائے گا اور خود انہیں (عربوں کو) اپنے گھر کے اندر ان مستعد، محنتی اور روز افزوں یہودیوں کی غلامی کا طوق اپنی گردن میں ڈالنا پڑے گا۔ میں کہتا ہوں کہ سب سے پہلے ہم اہل برطانیہ کا فرض ہے کہ اس ضمن میں عربوں کے جذبات و احساسات سے آگاہی حاصل کریں۔ کیونکہ ہم وہ لوگ ہیں کہ مثلاً اگر ہم سے یہ پوچھا جائے کہ کیا تم اپنی آزادی کو قربان کر کے مادی فوائد حاصل کرنا پسند کرو گے تو ہم بے دریغ جواب دیں گے کہ خدا کے لئے مادی منفعتیں بے شک ہم سے لے لو۔ لیکن ہماری آزادی ہم سے مت چھینو"۔

## بالفور کا اعلان

فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کی غرض سے جس طرح دھڑا دھڑ یہود کو دوسرے ملکوں سے لاکر یہاں آباد کیا جارہا ہے۔ اس کے جواز میں عام طور پر بالفور کے اعلان سے استمداد کی جاتی ہے۔ اگر اس اعلان کا مطالعہ ان وعدوں کی روشنی میں کیا جائے جو مسلمانان ہند سے کئے گئے تھے تو صاف نظر آتا ہے کہ اس اعلان کا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا کہ فلسطین کو ایک یہودی مملکت میں تبدیل کر دیا جائے یا یہ کہ یہاں زبردستی باہر سے یہودیوں کو لا لاکر آباد کیا جائے اور یوں سراسر مصنوعی طریقوں سے یہودیوں کی ایک معتدبہ اقلیت کا مسئلہ پیدا کر کے عربوں کی قومی حکومت کی تشکیل کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کی جائیں۔

اس اعلان میں ایک شق یہ بھی ہے کہ غیر یہودی آبادی کے مذہبی اور شہری حقوق کی حفاظت کی جائے گی۔ اس شق کی روشنی میں اگر اعلان کا مطالعہ کیا جائے تو یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ اعلان کا مقصد یہی تھا کہ عربوں کو اپنے ملک کے اندر حاکیت کا اقتدار حاصل ہو گا۔

بعض مطلب پرست افراد نے اس ضمن میں یہ انداز فکر اختیار کیا ہے کہ برطانوی ایمپائر کی نیک نامی اور وقار کا انحصار اس بات پر ہے کہ اعلان بالفور پر عملدر آمد کیا جائے۔ اس انداز فکر کے جواب میں ہماری گزارش یہ ہے کہ ایک طرف اعلان بالفور اور دوسری طرف وہ حتمی وعدے بھی تو ہیں جو دنیائے اسلام سے کئے گئے تھے۔ اگر ان دونوں چیزوں میں تصادم ہے تو یقیناً اعلان بالفور کے وہ حصے خود بخود ساقط العمل ہو جانے چاہئیں جو دنیائے اسلام کے وعدوں سے متصادم ہوتے ہیں۔ برطانوی ایمپائر کی نیک نامی اور وقار کا انحصار اس امر پر بھی ہے کہ ان وعدوں کا ایفاء ہونا چاہئے جو ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں سے کئے گئے تھے۔

## بے توجہی

عربوں کے جائز مطالبات سے ماضی میں جو مسلسل اور باقاعدہ بے توجہی برتی گئی ہے اس نے بعض اور شکوک و شبہات بھی پیدا کر دیئے ہیں۔ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ برطانیہ نے اپنے انتداب سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنی شہنشاہیت کے اغراض و مقاصد کی ترقی و ترویج شروع کر دی ہے۔ انتداب کی میعاد کو طول دے کر برطانیہ دراصل چاہتا یہ ہے کہ اس علاقے میں جو محض امانت کے طور پر اس کے سپرد کیا گیا تھا فوجی اور بحری اڈے قائم کئے جائیں۔ ہمارے نزدیک یہ طرز عمل فلسطین کے باشندوں کے حق خود ارادی کے سراسر منافی ہے۔

یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ سیاسی شعور اور ذہنی استعداد کے لحاظ سے فلسطین کے باشندے اپنے عراقی بھائیوں کے ہم پلہ ہیں۔ جب برطانیہ عظمیٰ اور عراق کے درمیان ایک تصفیہ ہو چکا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اسی قسم کا تصفیہ برطانیہ اور فلسطین میں بھی نہ ہو جائے۔ اس کام میں جو تعویق و تاخیر ہوئی اس کے باعث روز بروز غم و غصہ میں اضافہ ہو رہا ہے، دسمبر ۱۹۳۸ء کے آخری ہفتہ میں بمقام پٹنہ، آل انڈیا مسلم لیگ کا جو سالانہ اجلاس منعقد ہوا تھا، وہاں پچاس ہزار مسلمانوں نے جمع ہو کر ذیل کی قرار داد منظور کی تھی، جسے اس ملک گیر احتجاج کا نقطۂ عروج کہنا روا ہو گا جو ہندوستان بھر میں برطانوی روش کے خلاف جاری ہے۔

"آل انڈیا مسلم لیگ کی یہ قطعی رائے ہے کہ بالفور کے نامنصفانہ اعلان، اور جبر و تشدد کی اس پالیسی کا جو اس اعلان کے بعد برطانوی امپیریلزم نے فلسطین میں اختیار کر رکھی ہے، مقصد یہ ہے کہ یہود کی ہمدردی کے نام پر اس ملک کو برطانوی ایمپائر کا ایک حصہ بنالیا جائے اور اس طرح عرب ریاستوں کے ایک فیڈریشن کے قیام کے خیال کو پراگندہ کر کے اور دیگر مسلمان مملکتوں کے اتحاد کی راہ میں موانع حائل کر کے برطانوی امپیریلزم کی جڑیں مضبوط کی جائیں۔

اس کے علاوہ برطانیہ کا یہ ارادہ بھی ہے کہ فلسطین کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا کر اس مقدس سرزمین میں اپنے ہوائی اڈے قائم کرے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے عربوں پر جو مظالم توڑے گئے ہیں، ان کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔

مسلم لیگ کا یہ اجلاس ان عربوں کو جنہیں مظالم کا تختۂ مشق بنایا جا رہا ہے اور جو اپنی سرزمین پاک کی حرمت، اپنے قومی حقوق کی حفاظت اور اپنی مادر وطن کی آزادی کے لئے ہر قسم کی قربانیاں کر رہے ہیں، ہیرو اور شہید قرار دیتا ہے اور ان کی بہادری، قربانی اور عزم بالجزم پر ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتا ہے۔

مسلم لیگ کا یہ اجلاس برطانوی حکومت کو متنبہ کرتا ہے کہ اگر اس نے فوراً فلسطین میں یہودیوں کا داخلہ بند نہ کیا اور مجوزہ کانفرنس میں مفتیٔ اعظم کے علاوہ جو عربوں کے مستند لیڈر ہیں، مسلمانان

ہند کے نمائندوں کو بھی شریک نہ کیا تو یہ کانفرنس محض ایک ڈھونگ بن کر رہ جائے گی۔

مسلم لیگ اعلان کرتی ہے کہ مسئلۂ فلسطین پورے عالم اسلام کا مسئلہ ہے اگر برطانوی حکومت عربوں سے انصاف کرنے اور مسلمانان عالم کے مطالبات کو تسلیم کرنے میں ناکام رہی تو ہندوستان کے مسلمان یہ عہد کرتے ہیں کہ عربوں کو برطانوی استبداد سے آزاد کرانے اور یہودیوں کے غلبے سے نجات دلوانے کے لئے بین الاقوامی مسلم کانفرنس، جس میں اسلامیان ہند کے نمائندے بھی شریک ہو رہے ہیں جو پروگرام وضع کرے گی اور جس قسم کے ایثار و قربانی کا مطالبہ کرے گی، اس سے عہدہ بُرا ہونے میں رتی بھر کمی نہیں کریں گے۔

لیگ کا یہ اجلاس برطانوی حکومت کو متنبہ کرتا ہے کہ برطانیہ اور امریکہ کے بعض حلقوں میں جو خیال رائج ہے کہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنایا جائے اگر اس خیال کو جامۂ عمل پہنانے کی کوشش جاری رکھی گئی تو اس سے ایک مسلسل اضطراب، بدامنی اور جنگ و جدال کی صورت پیدا ہو جائے گی"۔

## اسلحہ کا استعمال

دوران جنگ میں اتحادیوں نے اعلان کیا تھا کہ وہ ملکوں کی تسخیر یا مملکتوں پر قبضہ کرنے کے لئے جنگ میں شامل نہیں ہوئے بلکہ محض اس نیت سے شریک ہوئے ہیں کہ محکوم و مغلوب قوموں کو آزادی دلوائی جائے۔ عربوں کو اس اعلان نے بے حد متاثر کیا چنانچہ انہوں نے جنگ میں اتحادیوں کا ساتھ دیا اور انہی کے شانہ بشانہ ہو کر غنیم سے لڑتے رہے تاکہ ان کی آزادی کا دن بھی قریب سے قریب تر آ جائے۔ لیکن انہیں یہ دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی کہ جس آزادی کے حصول کے لئے وہ جدوجہد کر رہے تھے وہ قریب آنے کی بجائے روز بروز دور ہوتی چلی گئی۔ آخر کار وہ حد درجہ پریشانی کے عالم میں ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہو گئے تاکہ قوت بازو سے منزل مقصود تک رسائی حاصل کی جائے۔ ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ حالات کی یہ افسوسناک روش اس بات کی شہادت ہے کہ برطانوی حکومت اپنے ان فرائض کی ادائیگی میں کامیاب ثابت نہیں ہوئی جو انتداب کی رو سے اس پر عائد ہوتے ہیں۔

بہر حال یہ امر موجب اطمینان ہے کہ فلسطین کو تقسیم کرنے کی پالیسی ترک کر دی گئی ہے اور ہمیں امید ہے کہ آئندہ کسی صورت، کسی شکل اور کسی ڈھنگ میں بھی تقسیم کا فارمولا مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔ فلسطین عربوں کا ملک ہے جسے صحیح سلامت اور من و عن عربوں ہی کی تحویل میں دے دینا انتدابی حکومت کا فرض ہے۔ انتداب کو ہمیشہ قائم رکھنا انتداب کے نظریئے اور اس کے مالہ و ماعلیہ کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی قانون بھی اجازت نہیں دیتا کہ انتداب کو دائمی صورت عطا کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ فلسطین کا انتداب جس قدر جلد ختم کر دیا جائے اسی نسبت سے مشرق بعید کا امن و امان بھی جلد بحال ہو جائے گا۔

یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حق خود ارادی کا اصول، اپنی کار فرمائی میں عالمگیر اور یکساں ہے۔ اس کا اطلاق تمام انسانوں پر ایک ہی قاعدے اور طریقے سے ہونا چاہئے۔ اگر یہ تاثر عام ہو گیا کہ سفید فام اقوام کے لئے حق خود ارادی کا مفہوم اور معیار الگ ہے اور گندمی رنگ کے لوگوں کے لئے الگ، یورپ کے رہنے والوں کے لئے الگ اور ایشیا کے باشندوں کے لئے الگ، تو اس مذموم تفریق کے ہاتھوں دنیا بھر میں افراتفری پھیل جائے گی۔ اگر تہذیب کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کی جملہ اقوام آہستہ آہستہ ایک مشترکہ عالمگیر برادری کی صورت اختیار کر لیں تاکہ امن عالم قائم ہو سکے تو ایسی ہر تفریق و تقسیم کا بے رحمی سے سر کچل دینا چاہئے جو انسانوں میں رنگ و نسل کے امتیازات پیدا کرتی ہے۔

ہم موجودہ صورت حال کا خیر مقدم کرتے ہیں کہ عرب مملکتوں کو بھی اس کانفرنس میں شرکت کے لئے مدعو کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ برطانوی ایمپائر اور دنیائے اسلام کے باہمی تعلقات کی بنیاد مشترکہ مفاد پر قائم ہے۔ برطانیہ عظمیٰ کو اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں کسی قسم کا بخل نہیں کرنا چاہئے اور نہ ہی اسے اپنے اس طرز عمل کے جواز میں کسی نوع کا معذرت خواہانہ انداز اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر برطانوی ایمپائر اور عربوں کے درمیان پھر سے دوستانہ تعلقات استوار ہو جائیں تو یہ امر ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے باعث اطمینان ہو گا کیونکہ ہم ہرگز نہیں چاہتے کہ وہ پرانی صورت حال عود کر آئے جہاں یہ خدشہ ہو کہ مبادا ہماری وفاشعاری کہیں دو متضاد و متصادم حصوں میں بٹ جائے۔

لہٰذا ہمیں امید ہے کہ باہمی نزاع کا منصفانہ حل تلاش کرنے اور خیر سگالی بحال کرنے کی جو کوششیں عنقریب شروع ہونے والی ہیں، ان میں کسی قسم کے خارجی اور مخالف عناصر کو بار پانے کی اجازت نہیں دی جائے گی"۔

---

میں نے موجودہ کتاب کی ضروریات کے پیش نظر اور اختصار سے کام لے کر ان کوششوں کا ایک ہلکا سا خاکہ درج کیا ہے جو ہم نے مسئلۂ فلسطین کی خاطر انجام دی تھیں، ہندوستان کے مسلمان خود غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور ہمارے اپنے داخلی و خارجی اور سیاسی و اقتصادی مسائل اس قدر زیادہ تھے کہ ان کے بوجھ سے ہمیں سر اٹھانے کی مہلت نہ تھی لیکن ان مختلف النوع مصائب کے باوجود ہم نے ایک لمحہ کے لئے فلسطین کو نظر انداز نہیں کیا اور اپنی محدود صلاحیتوں کے مطابق اس قضیے کے حل کرنے کی کوششیں ہمیشہ جاری رکھیں۔
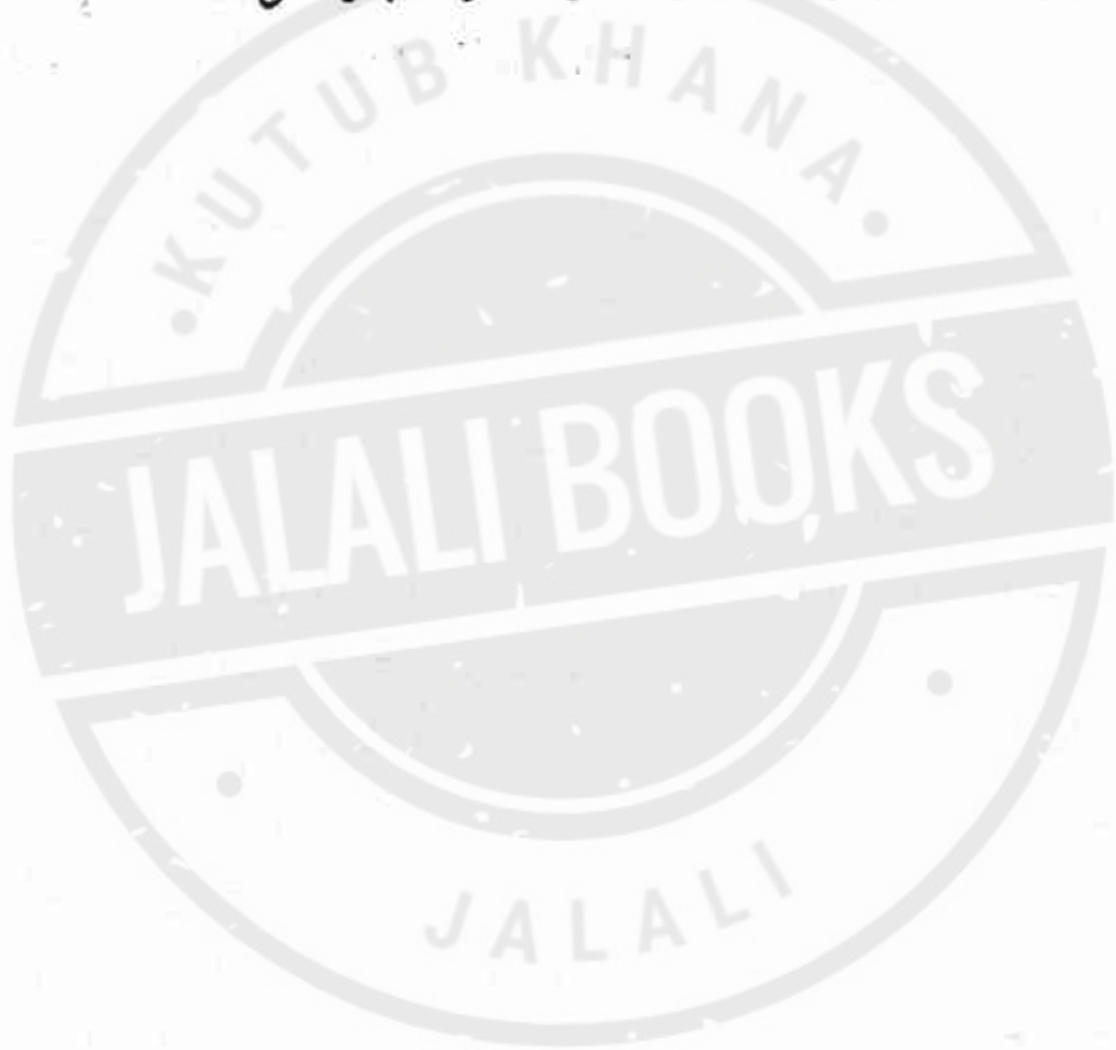
(۹)

## پیرپور رپورٹ

۲۷۔ نومبر ۱۹۳۸ء کو یکایک مولانا شوکت علی کا انتقال ہو گیا اور ہندوستان کے مسلمان ایک بے مثال لیڈر سے محروم ہو گئے۔ مولانا دو ہفتے بخار کی وجہ سے صاحب فراش رہے تھے، لیکن اب بظاہر بالکل تندرست ہو چکے تھے اور دہلی ہی میں مقیم تھے۔ خیال تھا کہ چند روز میں صوبہ سرحد کا دورہ شروع کر دیں گے۔ کیونکہ سرحد کے مسلمانوں کی طرف سے بار بار انھیں دعوتیں موصول ہو رہی تھیں۔ لیکن ایک روز یونہی بیٹھے بیٹھے دفعتہً حرکت قلب رک گئی اور وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

مولانا شوکت علی ہمیشہ اپنے آپ کو سپاہی کہتے تھے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ سپاہیانہ زندگی ان پر ختم تھی۔ وہ عالم دین نہ تھے لیکن عمل کے اعتبار سے ان کا پایہ علمائے دین سے بھی بڑا تھا۔ وہ کوئی شعلہ بیان مقرر بھی نہ تھے، لیکن صاف سیدھی زبان میں جو چند باتیں کہہ دیتے تھے، وہ تیر و نشتر بن کر سننے والوں کے دلوں میں اتر جاتی تھیں۔ مجھے مولانا کی معیت میں اس وقت کام کرنے کا شرف حاصل ہوا تھا جب وہ نومبر ۱۹۳۶ء میں لاہور تشریف لائے اور ملک برکت علی کے ہاں مقیم ہوئے تھے۔ مسلم لیگ کا وہ بالکل ابتدائی دور تھا۔ اور مولانا نے لاہور، امرتسر، فیروزپور، جالندھر، ہوشیارپور وغیرہ کا دورہ کر کے پنجاب اسمبلی کے مسلم لیگی امیدواروں کی حمایت میں بڑی اچھی فضا پیدا کر دی تھی۔

مولانا کی ناگہانی وفات پر مسٹر جناح نے جو بیان دیا اس میں فرمایا کہ:۔

"مولانا شوکت علی کے انتقال سے مسلمانان ہند ایک ایسے بلند پایہ لیڈر سے محروم ہو گئے ہیں، جو اپنی قوم کا ایک جاں باز سپاہی تھا انھوں نے بڑی سے بڑی قربانی کرنے سے کبھی دریغ نہیں کیا اور ہر مصیبت کے وقت قوم کے لئے سینہ سپر ہو کر آگے آ جاتے تھے۔ مسلمان اگر ان سے جان کی

قربانی مانگتے تو وہ اس کے لئے بھی آمادہ تھے۔ ان کی گزشتہ ربع صدی کی سیاسی زندگی کا یہی بنیادی اصول تھا۔

جہاں تک میرے اور ان کے ذاتی مراسم کا تعلق ہے، مرحوم میرے نہایت عزیز دوست تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے ساتھ ان کی وفاداری غیر متزلزل تھی اور مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے جو تعلق انہیں میری ذات سے تھا وہ بھی نہایت مستحکم تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک چٹان کی طرح ہماری پشت پناہی کرتے تھے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے جو مثال وہ قائم کر گئے ہیں، اس کی نظیر مشکل ہی سے کہیں ملے گی" [۱]۔

سر سکندر حیات خاں نے اپنے بیان میں اظہار افسوس کرتے ہوئے فرمایا کہ:۔

"مولانا شوکت علی ہندوستان کے مایہ ناز فرزند اور اسلام کے بہت بڑے جان نثار تھے۔ ان کی سیاسی زندگی کا بنیادی نکتہ وطن کی محبت اور وطن ہی کی خدمت تھی وہ غریبوں کی آنکھوں کا تارا تھے اور غریبوں ہی کی خدمت ہمیشہ ان کا نصب العین رہا۔

جہاں تک میرا اور علیگڑھ کے دیگر اولڈ بوائز کا تعلق ہے ہمارے لئے ان کا سانحۂ انتقال ایک ایسا زخم ہے جو کبھی مندمل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ موت کے بے رحم ہاتھ نے ایک ایسا علیگ ہم سے چھین لیا ہے، جو اس ترقی پسند تحریک کے اوّلین نقیبوں میں سے تھا، جس کا سرچشمہ علیگڑھ سے پھوٹا تھا" [۲]۔

پنڈت جواہرلال نہرو نے اپنے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ

"ہماری جنگ آزادی کے بہادر سپاہی ایک ایک کر کے اٹھتے جا رہے ہیں اور کون نہیں جانتا کہ مولانا شوکت علی کا شمار ہمارے سب سے بہادر اور بے باک سپاہیوں میں ہوتا تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں آزادی کی جو نئی تڑپ پیدا ہوئی ہے اس کے بہترین مظہر مولانا شوکت علی اور مولانا محمد

---

۱، ۲۔ روزنامہ سٹیٹسمین ۔ کلکتہ۔ مورخہ ۲۸ نومبر ۱۹۳۸ء

علی تھے۔ اٹھارہ سال ہوئے جب ترک موالات کی تحریک جاری تھی تو مولانا شوکت علی کی بالا بلند شخصیت، ہندوستان کے دور دراز گوشوں میں ہر جگہ مقبول و محبوب بن گئی تھی۔

سالہا سال تک مجھے ان سے قریب رہ کر، ایک رفیق کی حیثیت سے کام کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ اور اگرچہ گزشتہ چند سال سے ہمارے درمیان بعض سیاسی اختلافات پیدا ہو گئے، لیکن ان اختلافات کے باعث ماضی کی خوشگوار یادیں کبھی ذہن سے محو نہیں ہو سکتیں، اور نہ اس غم کا بار ہلکا ہو سکتا ہے، جو اس شخص کے انتقال سے طاری ہوا ہے جس نے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ مولانا شوکت علی صحیح معنوں میں ایک سپاہی تھے اور سپاہی کی طرح انہوں نے گھوڑے کی پشت پر جان دی۔ اہل ہند کا فرض ہے کہ آج اس سپاہی کی یاد میں ادب و احترام سے اپنی گردنیں خم کریں" [۱]۔

جب اکتوبر ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا تو فیصلہ ہوا تھا کہ ایک کمیٹی قائم کی جائے جو کانگرسی صوبوں کا دورہ کر کے مسلمانوں کی ان شکایات اور تکالیف کا جائزہ لے جو انہیں کانگرسی حکومتوں کے تحت پیش آ رہی تھیں۔ وجہ یہ تھیں کہ یو۔ پی، سی۔ پی، بہار، بمبئی، مدراس اور اڑیسہ وغیرہ میں کانگرس نے خالصتاً ہندو وزارتیں قائم کرنے کے بعد، مسلمانوں کے لئے عملاً روزگار اور امن و عافیت کے تمام دروازے بند کر دیئے تھے اور مسلمان ہر جگہ پریشان اور ہراساں ہو رہے تھے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کی اس کمیٹی کے صدر راجہ سید محمد مہدی تعلقہ دار پیرپور مقرر ہوئے۔ اور ممبروں میں سید اشرف احمد، خان بہادر حاجی رشید احمد، میاں غیاث الدین ایم۔ ایل۔ اے، مولوی عبدالغنی ایم۔ ایل۔ اے، سید حسن ریاض، سید تقی ہادی نقوی، سید ذاکر علی اور اے۔ بی۔ حبیب اللہ شامل تھے۔ راجہ پیرپور کے نام سے منسوب ہو کر اس کمیٹی کا نام بھی پیرپور کمیٹی مشہور ہو گیا۔ اور آگے چل کر اس کمیٹی نے جو تحقیقاتی رپورٹ مرتب کی وہ بھی پیرپور رپورٹ کے

---

۱۔ روزنامہ سٹیٹسمین۔ کلکتہ۔ مورخہ ۲۸ نومبر ۱۹۳۸ء

نام سے مشہور ہوئی ا۔

نومبر ۱۹۳۸ء میں پیرپور رپورٹ شائع ہوئی۔ اور ہندوستان کے طول و عرض میں ایک ہلچل مچ گی۔ اس رپورٹ کے متعلق پروفیسر کوپ لینڈ کو بھی اپنی کتاب میں اعتراف کرنا پڑا کہ

"یہ نہایت قابلیت کے ساتھ اور ایک مدلل پیرائے میں لکھی ہوئی رپورٹ ہے، جس میں مسلمانوں کی شکایات کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کی خاص خوبی یہ ہے کہ کہیں بھی ضبط و تحمل کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پایا اور جو کچھ لکھا گیا ہے بڑی احتیاط سے لکھا ہے۔ کمیٹی کے ممبروں نے کانگرسی صوبوں کا دورہ کرنے کے بعد جو واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں انہیں قلم بند کیا ہے۔ (کمیٹی کے نزدیک) جو مظالم مسلمانوں پر ہوئے ہیں انہیں بیان کرتے وقت نہ تو خواہ مخواہ سنسنی پیدا کرنے والی زبان استعمال کی گئی ہے اور نہ اشتعال انگیز لہجہ اختیار کیا گیا ہے" ۲۔

پیرپور رپورٹ ایک سینتالیس صفحات کا کتابچہ ہے جسے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ گویا "جنرل سروے" ہے دوسرے حصے میں ہندو مسلم نزاع کی نوعیت اور اس کے اسباب بیان کئے گئے ہیں اور تیسرا حصہ مسلمانوں کی جملہ شکایات پر حاوی ہے۔

"جنرل سروے" کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ مسئلہ نے ایسی صورت اختیار کر لی ہے جس کا کوئی تصفیہ نظر نہیں آتا۔ بعض حلقوں کے نزدیک اس قسم کا اعلان کر دینا ہی کافی ہے کہ اقلیتوں کو مطمئن رہنا چاہئے کہ ان کی زبان، کلچر اور مذہب بالکل محفوظ ہیں۔ گویا اقلیتوں کو اس اعلان کے بعد اور کسی قسم کے تحفظ کی ضرورت نہیں۔

یہ انداز فکر بالکل غلط ہے۔ کانگرس نے اگرچہ اپنے اندر چند مسلمانوں، سکھوں اور مسیحیوں کو بھی شامل کر رکھا ہے، لیکن اس کے باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ کانگرس سراسر ہندوؤں کی جماعت ہے۔

آگے چل کر رپورٹ میں اس امر پر بحث کی گئی ہے کہ ۱۹۳۷ء کے بعد سے یکایک فرقہ وارانہ کشیدگی میں اضافہ کیوں ہو گیا ہے۔ اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

---

ا۔ اس رپورٹ کا اصل انگریزی نام تھا۔

Report of the Inquiry Committee appointed by the Council of the All India Muslim League to inquire in the Muslim grievances in Congress provinces.

2 - Indian Politics 1936-1942 (O.U.P.) Page 185

انتخاب میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد کانگرسی لیڈر نشہ اقتدار سے بدمست ہو گئے۔ صوبوں میں انہوں نے مسلمانوں پر مفاہمت اور مصالحت کے تمام دروازے بند کر دیئے۔ اور مسلم لیگ کے ساتھ مل کر کولیشن وزارتیں بنانے سے انکار کر دیا۔ ہندوستان میں ہندوؤں کو ناقابل ترمیم اور غیر متبدل اکثریت حاصل ہے جسے کسی صورت میں ہٹایا نہیں جا سکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بدنصیب اقلیتیں ہمیشہ کے لئے اپنے گلے میں طوق غلامی ڈالنے پر مجبور ہو گئی ہیں۔ ہماری رائے میں کسی قوم کے لئے اس سے بڑی مصیبت اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ اسے مستقل طور پر کسی غیر متبدل اکثریت کے تابع رکھا جائے۔ جس مملکت میں اقلیتوں کو یکساں حقوق اور ترقی کے یکساں مواقع میسر ہوں گے وہی مملکت خوشحال اور پائدار بن سکتی ہے۔

لامحالہ مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ اپنے سیاسی حقوق کا مطالبہ کریں اور اس ملک کی قومی زندگی اور یہاں کی حکومت اور یہاں کے نظم و نسق میں اپنا جائز اور صحیح مقام حاصل کریں۔

ہمارے یہاں سیاسی پارٹیاں روز بروز فرقہ وارانہ رنگ اختیار کرتی جا رہی ہیں اور یہی چیز ہندوستان میں جمہوریت کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے کا باعث ہے۔ اس ملک پر چونکہ ایک مستقل مذہبی اکثریت مسلط ہو چکی ہے' اس لئے یہاں سیاسی پارٹیوں کا رنگ روغن اور وضع قطع وہ نہیں جو دوسرے جمہوری ممالک میں ہے۔

مسلم لیگ کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ ہندوستان کے دیگر فرقوں کے ساتھ جنگ و جدال کی طرح ڈالے بلکہ اس کے پیش نظر صرف مسلمانوں کی تنظیم ہے، تاکہ ان کے سیاسی اور اقتصادی مسائل خوش اسلوبی سے حل کئے جا سکیں۔

کانگرس نے تکبر و رعونت کے نشے میں سرشار ہو کر مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دیا، حالانکہ لیگ کے متعدد لیڈروں نے انتہائی کوشش کی کہ کانگرس کے ساتھ تعلقات خوشگوار رکھیں۔ کانگرس نے مسلم لیگ کو ذلیل کرنے کے لئے عمداً ایسی شرائط پیش کیں، جنہیں کوئی خوددار سیاسی جماعت ایک لحہ کے لئے قبول کرنے کو تیار نہ ہو سکتی تھی۔ مثلاً لیگ سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنا پارلیمنٹری بورڈ توڑ دے، اسمبلی کے اندر مسلم لیگ پارٹی کا وجود ختم کر دے اور لیگ کے تمام ممبر غیر مشروط طور پر کانگرس کی رکنیت قبول کر لیں۔

بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ کانگرسی حکومتوں نے عمداً اور ارادۃً سرکاری

روپیہ خرچ کر کے، لیگ کے مقابلے میں مسلمانوں کی چند حریف جماعتیں، مثلاً آزاد مسلم لیگ وغیرہ کھڑی کیں تاکہ مسلمانوں میں باہمی انتشار پھیلا کر ان کی قومی جمعیت کو درہم برہم کیا جائے۔ مسلمانوں کو وزارتوں، عہدوں اور اسمبلی کی ممبریوں کا لالچ دے کر مسلم لیگ سے منحرف کرنے کی کوششیں کی گئیں۔

جب کانگرس کو گزشتہ انتخاب میں ہندوستان کے پانچ صوبوں کی مجالس قانون ساز میں واضح اکثریت حاصل ہو گئی تو اس نے مسلم لیگ کے تعاون کی پیشکش کو بھی ٹھکرا دیا اور پورے ہندوستان میں کانگرسی راج قائم کرنے کا خواب دیکھنا شروع کیا۔ چنانچہ اسی غرض سے مسلم رابطہ عوام (مسلم ماس کانٹیکٹ) کی تحریک شروع کی گئی جس کا مقصد یہ تھا، کہ کانگرس، مسلم لیگ سے کسی قسم کی مفاہمت نہیں کرے گی، نہ مسٹر جناح سے کسی نوع کی گفت و شنید کرنے کو تیار ہے بلکہ براہ راست مسلمان عوام کے پاس جائے گی اور انہیں پھسلا کر، بہکا کر، ورغلا کر، ڈرا دھمکا کر، اور مادی منفعت کے لالچ دے کر کانگرس کے حلقے میں کھینچ کر لے آئے گی۔ اس کام کے لئے بعض علماء کو تنخواہ دار ملازم رکھا گیا، اردو کے اخبار جاری کئے گئے اور تقریر و تحریر کے تمام حربوں سے مسلح ہو کر مسٹر جناح اور مسلم لیگ کے خلاف سب و شتم کا وسیع سلسلہ جاری کیا گیا۔

کانگرس کی یہ ہمہ گیر یلغار صرف مسلمانوں کے خلاف شروع کی گئی ہے۔ ہندوستان کی اور کسی قوم کو چھوا تک نہیں گیا۔ وجہ یہ ہے کہ کانگرس کو یقین ہے کہ جب تک مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت کو ختم نہیں کیا جاتا ہندوستان میں کانگرسی راج کے قیام کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

کانگرس اپنے موجودہ اقتدار کو ہضم بھی نہیں کر سکی۔ اس نے ہندوستان میں ایک متوازی حکومت کھڑی کر دی ہے اور جو حکومت از روئے آئین پہلے سے یہاں قائم تھی، اس کی جڑیں کھوکھلی کرنا شروع کر دی ہیں۔ کانگرس کا ہر ممبر بلکہ ہر والنٹیر اپنے آپ کو حکومت کا ایک رکن سمجھتا ہے۔ عدالتوں کے نام احکام جاری کئے جاتے ہیں کہ مقدمات کے فیصلے کانگرسی لیڈروں کے حسب منشاء کرو۔ پولیس افسروں کو اپنے فرائض ادا کرنے سے روکا جاتا ہے اور تاکید کی جاتی ہے کہ تفتیش کے دوران میں اپنے اپنے ضلع کے کانگرسی لیڈروں کی ہدایت کے مطابق کام کرو۔ حتیٰ کہ یو۔ پی کے چیف سیکرٹری نے اپنے صوبے کے تمام اضلاع کے ڈپٹی کمشنروں کے نام ایک گشتی مراسلہ جاری کر کے حکم دیا ہے کہ اپنے اپنے ضلع کی کانگرس کمیٹی کے عہدیداروں سے ہر کام میں مشورہ کیا کرو۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر بھگوان داس کا ایک خط بھی ہمارے ہاتھ آ گیا ہے۔ جس میں انہوں

نے ایک مجسٹریٹ کو تاکید کی تھی کہ اس کی عدالت میں جن کانگرسی ممبروں کے خلاف مقدمہ چل رہا ہے انہیں بری کر دیا جائے۔

بندے ماترم کو کانگرس نے قومی ترانہ قرار دے کر مسلمانوں کے جذبات کو سخت مجروح کیا ہے، کیونکہ جس شخص کو بھی اس گیت کے تاریخی پس منظر سے ذرا سی آگاہی ہے وہ جانتا ہے کہ مصنف نے یہ گیت کلیتہً اور خالصتاً مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے کے لئے لکھا تھا۔ کانگرس نے حکومت کی گدی پر بیٹھتے ہی حکم دے دیا کہ آئندہ یہ گیت اسمبلی کے اند، اجلاس شروع ہونے سے پہلے گایا جائے گا اور ان تمام سکولوں میں بھی گایا جائے گا، جہاں ہندو اور مسلمان بچے پڑھتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ مسلمان بچوں کو مجبور کیا گیا کہ بلند آواز سے یہ گیت گائیں۔ جب حالات قطعی ناقابل برداشت ہو گئے تو پٹنہ کے سکولوں کے مسلمان طلبہ نے مجبوراً سٹرائک کر دی۔ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ بندے ماترم کانگرس کا ترانہ ہے تو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ کسی سیاسی پارٹی کو یہ حق حاصل نہیں کہ اپنے ترانے کو قومی ترانہ قرار دے کر ہندوستان کی تمام قوموں پر مسلط کرے۔

وردھا کے نارمل سکول میں جب یہ ترانہ گایا جاتا ہے تو مسلمان بچوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ ہندوؤں کی مانند ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوں۔ سرکاری سکولوں کے بورڈنگ ہاؤسوں میں جو مسلمان بچے رہتے ہیں انہیں گوشت کھانے کی اجازت نہیں۔ صرف دال بھات یا سبزی کھانا پڑتی ہے۔

یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ ترنگا جھنڈا کانگرس کا پرچم ہے لیکن اسے پورے ملک کا پرچم قرار دے کر ہندوستان کی ہر پبلک عمارت پر نصب کیا جاتا ہے۔ حالانکہ مسلم لیگ اسے اپنا قومی پرچم تسلیم نہیں کرتی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا علیحدہ پرچم ہے، لیکن لیگ کے راستے میں کانگرسی حکومتیں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کر رہی ہیں کہ وہ اپنا قومی پرچم نہ لہرا سکے۔

صوبہ بہار کی لوکل باڈیز اور سی۔ پی کے قرضہ مصالحتی بورڈوں سے مسلمانوں کو خارج کر دیا گیا ہے۔ مسٹر گاندھی نے کانگرس کے سالانہ اجلاس ہری پورہ میں جو تقریر کی ہے اس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ چرخہ چلانا اور گائے کی حفاظت کرنا ایک ہی پالیسی کے تحت آتے ہیں۔ یعنی گئو رکھشا کو، جو سراسر ہندو دھرم کا بنیادی عقیدہ ہے، کانگرس کی پالیسی قرار دے دیا گیا ہے۔ اس بارے میں مسلمانوں کا جو عقیدہ ہے وہ ساری دنیا کو معلوم ہے۔

صوبہ بہار میں جب بقرعید اور محرم کی تقریبیں آئیں تو حکومت نے سولہ مختلف مقامات پر مسلمانوں کے خلاف امتناعی احکام صادر کئے۔ یو۔ پی کے ایک قصبے زاہد آباد کے مسلمانوں نے بقر

عید کے موقع پر گائے کی قربانی کرنے کے لیے باقاعدہ عدالت سے ڈگری لے لی تھی، لیکن تقریب سے ایک روز پہلے، حکومت نے دفعہ ۱۴۴ کانفاذ کر کے قربانی بند کر دی۔

یو۔ پی کے وزیر اعظم گوبند بلبھ پنت وزیر تعلیم سمپورنانند اور وزیر قانون ڈاکٹر کاٹجو نے یکے بعد دیگرے اپنی تقریروں میں مسلمانوں پر ہر قسم کے الزام تھوپنے کی کوشش کی ہے اور صوبے میں جتنے فرقہ وارانہ فساد ہوئے ہیں ان سب کی ذمے داری مسلم لیگ پر ڈال دی ہے۔ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ کانگرس اپنے نام نہاد نیشنلزم کی آڑ میں ہندوؤں کی تہذیب، ہندوؤں کی روایات، ہندوؤں کے رسم و رواج، ہندوؤں کا طریق عبادت اور ہندوؤں کی خوراک مسلمانوں پر مسلط کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ مسلمان ہزار بے بس اور مفلوک الحال سہی لیکن جب وہ اس طرز عمل کے خلاف احتجاج کرتے ہیں تو انتہائی دیدہ دلیری سے کہا جاتا ہے کہ مسلمان فرقہ پرست ہیں۔

صوبہ بہار کے وزیر تعلیم نے، ٹیکسٹ بک کمیٹی کے اجلاس میں اپنی حکومت کی پالیسی واضح کرتے ہوئے جو تقریر کی تھی اس میں انہوں نے کہا ہے کہ ہماری قومی زبان ہندی ہے اور آئندہ سکولوں میں وہی مذہبی تعلیم دی جائے جس سے نئی نسل کے لڑکے کبیر، رحمٰن، نانک اور تُلسی داس کے نمونے پر اپنی زندگیاں ڈھال سکیں۔ ظاہر ہے، مسلمان بچوں کو ان کی مذہبی تعلیم سے محروم رکھنا ہی اس پالیسی کا مقصد ہے۔ یو۔ پی میں جب سے کانگرسی راج قائم ہوا ہے قتل کے مقدمات میں چونتیس فی صد، مسلح ڈکیتی کی وارداتوں میں ستر فیصد، نقب زنی میں اکیس فیصد اور فرقہ وارانہ فسادات میں سو فیصد اضافہ ہوا ہے۔ جب اور جہاں کہیں فرقہ وارانہ فساد پھوٹتا ہے، کانگرسی وزیر بلا تأمل اس کی ذمے داری مسلم لیگ پر ڈال دیتے ہیں۔ یو۔ پی کے وزیر قانون نے بھی یہی حرکت کی تھی، لیکن جب اس کی آنکھوں کے سامنے ایک غیر جانبدار مجسٹریٹ نے مقدمے کی سماعت کی، تو فیصلے میں لکھا کہ فساد کی ذمے داری ہندوؤں پر عائد ہوتی ہے۔

صوبائی ہائی کورٹوں نے ایک نہیں بلکہ متعدد اپیلوں کے فیصلوں میں صاف صاف لکھا ہے کہ کانگرسی لیڈر اس حد تک رعونت کا شکار ہو گئے ہیں کہ اپنے آپ کو عدالتوں سے بھی بالاتر سمجھنے لگے ہیں اور انصاف کا خون ہو رہا ہے۔ سی۔ پی کی حکومت کے ایک ذمے دار افسر کے حکم سے میونسپل بورڈوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے سکولوں میں گاندھی جی کا یوم ولادت سرکاری طور پر منایا گیا، جہاں گاندھی جی کی مورتی کی پوجا کی گئی۔ مسلمان طلبہ اور ان کے والدین کو بھی اس موقع پر حاضر ہونے کا حکم دیا گیا تھا۔

احاطہ بمبئی کی کانگرسی وزارت نے تمام اضلاع کے ڈپٹی کمشنروں کے نام احکام صادر کئے

ہیں کہ جب میونسپل کمیٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے ممبر نامزد کرنے کا وقت آئے گا تو اس سلسلے میں اپنے اپنے ضلع کی کانگرس کمیٹی کے صدر سے مشورہ کر کے امیدوار نامزد کئے جائیں گے. لیکن مسلم لیگ سے مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

میں نے اوپر پیرپور رپورٹ کا بہت ہی مختصر خلاصہ درج کیا ہے اور موجودہ کتاب کی محدود ضخامت کے پیش نظر مکمل رپورٹ نقل کی بھی نہیں جاسکتی، تاہم کانگرس نے چھ صوبوں میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد مسلمانوں سے جو سلوک کیا اس کا خاکہ ذہن نشین کرنے کے لئے یہ خلاصہ غالباً کافی ہو گا۔

مشہور انگریز اخبار نویس پیٹرک لیسی نے پیرپور رپورٹ کے مندرجہ واقعات پر بحث کرنے کے بعد اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ

"بعض لوگوں کو یہ واقعات بہت معمولی نظر آئیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ معمولی ہوں، لیکن ہوا کا رُخ پہچاننے کے لئے یہی واقعات کافی ہیں اور ان کا جو مجموعی اثر اس وقت ہوا ہو گا وہ بھی ظاہر ہے۔

تاہم میں اس سلسلے میں ایک بات پوچھتا ہوں۔ فرض کیجئے کہ ۱۹۳۸ء میں جب نیول چیمبرلین برطانیہ کے وزیراعظم تھے تو کونٹی کونسل کا ٹوری صدر[1] اپنی کونٹی کے تمام سکولوں کے نام یہ حکم صادر کرتا کہ اپنے اپنے سکول میں نیول چیمبرلین کا یوم ولادت مناؤ۔ اور اس تقریب پر مذہبی رسوم بھی ادا کرو تو کیا یہ واقعہ ہمارے ہاں معمولی تصور کیا جاتا؟

فرض کیجئے کہ برطانیہ کی آرمی کیٹرنگ کا ڈائرکٹر ایک یہودی ہے، جو اپنے مذہبی عقائد کی بناء پر حکم صادر کرتا ہے کہ آئندہ برطانوی فوج کو سور کا گوشت کھانے کی اجازت نہیں ہو گی۔ تو کیا اس واقعہ کو بھی ہمارے ہاں معمولی تصور کیا جائے گا۔

فرض کیجئے کہ برطانیہ کی لوکل باڈیز میں ممبروں کی نامزدگی کا وقت آتا ہے اور حکومت کا متعلقہ وزیر اپنے ماتحتوں کو حکم صادر کرتا ہے کہ اپنے اپنے حلقے کی ٹوری پارٹی سے مشورہ کر کے ممبر نامزد کرو، لیکن حزب

---

۱۔ جس طرح پاکستان میں نظم ونسق اور انتظامی سہولت کے لئے ملک کو ضلعوں میں تقسیم کیا گیا ہے، برطانیہ میں اس قسم کی تقسیم مختلف کونٹیوں میں کی گئی ہے۔ گویا ہر یونٹ ایک کونٹی کہلاتی ہے (مصنف)

مخالف یعنی لیبر پارٹی یا لبرل پارٹی سے مشورہ ہرگز نہ کرنا، تو کیا آپ اس واقعہ کو بھی معمولی سمجھ کر نظرانداز کر دیں گے؟ اس حقیقت کے ساتھ یہ نکتہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ ہندوستان کے جن صوبوں میں کانگرس نے یہ دھاندلی مچائی تھی وہاں ایک ایسی دائمی، مستقل اور غیر متبدل مذہبی اکثریت کی حکومت قائم تھی، جسے ان صوبوں کے مسلمان کسی انتخاب میں اور کسی پارلیمنٹری قاعدے سے بھی بدل نہیں سکتے تھے" ۱۔

جب ۱۹۳۷ء میں یو۔ پی میں کانگرسی راج قائم ہوا تو وہاں کے گورنر سر ہیری ہیگ ۲۔ تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ یو۔ پی کی اسمبلی میں ایک مسلمان بھی کانگرس کے ٹکٹ پر منتخب نہیں ہوا تھا۔ صرف رفیع احمد قدوائی، بہرائچ کے ایک ضمنی انتخاب میں چودھری خلیق الزماں کی مہربانی کہہ لیجئے یا چشم پوشی کے طفیل منتخب ہو کر آئے تھے ۳۔ اس کے باوجود گورنر نے مسلم لیگ کی انتہائی مخالفت کو گوارا کر لیا لیکن کانگرس کو ناراض کرنا گوارا نہ کیا اور رفیع احمد قدوائی کو مسلمان قوم کا نمائندہ قرار دے کر اپنی کابینہ میں شامل کر لیا تھا۔

یہی سر ہیری ہیگ، جب اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو کر واپس انگلستان تشریف لائے، تو انہوں نے ۲۷۔ اپریل ۱۹۴۰ء کو لندن کے کیکسٹن ہال میں "یو۔ پی اور نیا کانسٹی ٹیوشن" کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ یہ جلسہ ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام اور رائٹ آنریبل سر ہیو او نیل ۴، ممبر پارلیمینٹ کے زیر صدارت منعقد ہوا تھا۔

سر ہیری ہیگ، انڈین سول سروس کے ایک نہایت تجربہ کار اور جہاں دیدہ افسر تھے اور ہندوستان کے تمام سیاسی نشیب و فراز دیکھ چکے تھے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنی تقریر میں کانگرسی وزراء کی حمایت کی۔ ان کے کارناموں کی تعریف فرمائی اور کہا کہ کانگرسی وزیروں نے حتی الوسع فرقہ وارانہ معاملات میں غیر جانب داری سے کام لیا ہے۔

---

1۔ "Fascist India" by Patrick Lacey (1946)

۲۔ Sir Harry Haig

۳۔ اس واقعہ کی تفصیل کے لئے میری کتاب "اقبال کے آخری دو سال" ملاحظہ فرمایئے صفحات ۴۰۸ —— ۴۰۹

۴۔ Sir Hugh O' Neill M.P

مگر اس کا کیا علاج کہ حقائق آخر حقائق اور واقعات آخر واقعات ہیں، جن سے سرہیری ہیگ بھی سعیٔ تاویل کے باوجود، اغماض نہ کر سکے۔ چنانچہ انہیں اپنی تقریر کے آخر میں یہ کہہ کر حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا کہ:-

"گذشتہ عام انتخابات کے وقت مسلمانوں میں باہمی اتفاق موجود نہیں تھا اور ان کی پالیسی غیر واضح اور غیر یقینی تھی، لیکن انتخابات ختم ہونے کے بعد جب انہوں نے دیکھا کہ کانگرس ان سے مساویانہ سلوک کرنے کو تیار نہیں، بلکہ ان کی جداگانہ حیثیت کو ختم کر کے انہیں اپنے اندر جذب کرنے کے درپے ہے تو ردعمل کے طور پر ان میں یک لخت اتحاد و اتفاق کی ایک لہر چل نکلی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم لیگ نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک وسیع، طاقت ور اور مضبوط جماعت کی صورت اختیار کر لی، اس کے بعد کانگرسی وزراء کو جس چیز نے سب سے زیادہ پریشان اور ہراساں کیا وہ یہی مسلمانوں کی سرگرمیاں تھیں۔

سوال کیا جا سکتا ہے، آخر کانگرس میں ایسی کون سی خرابی ہے جس نے مسلمانوں کو اس قدر مشتعل کیا کہ وہ کانگرس کی شدید مخالفت پر اتر آئے؟

اس کا جواب دینے کے لئے ہمیں صوبجات متحدہ کی عام فضا کا جائزہ لینا پڑے گا۔ یہ صحیح ہے کہ کانگرسی لیڈر دعویٰ تو یہی کرتے ہیں کہ ان کی جماعت ایک غیر فرقہ وارانہ قومی تنظیم ہے، لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ کانگرس میں ہندوؤں کی غیر معمولی اکثریت ہے اور سر سے پیر تک ہندوانہ تخیل و تصور اور ہندوانہ اثر و رسوخ اس پر چھایا ہوا ہے۔

جب یو۔ پی میں کانگرسی وزارت قائم ہوئی تو عوام کا جوش و خروش اس بناء پر تھا کہ بالآخر یہی کانگرسی وزارت آہستہ آہستہ ہندو راج کی صورت اختیار کر کے رہے گی۔ عوام کے اس جذبۂ مسرت کا تجزیہ کیا جائے تو اس کی تہہ میں صرف یہی عقیدہ کام کر رہا تھا۔ مسلمانوں نے جب یہ نقشہ دیکھا تو سخت پریشان ہوئے، چنانچہ انہوں نے عزم بالجزم کر لیا ہے کہ وہ کبھی ہندوؤں کی غلامی قبول نہیں کریں گے۔

اگر کانگرسی لیڈر دور اندیشی سے کام لیتے اور ۱۹۳۹ء میں وزارت سازی کے وقت مسلم لیگ کو وزارت میں شامل کر لیتے تو غالباً صورت حال اس قدر خراب نہ ہونے پاتی اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایسی خطرناک دشمنی کی آگ بھی نہ بھڑکتی لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا مسلمانوں کو یقین ہو گیا کہ آل انڈیا کانگرس پارٹی کا مصمم ارادہ ہے کہ برطانوی حکومت کی جانشین بن کر ہندوستان کی زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لے اور ہندو قوم اپنی دائمی اور ناقابل ترمیم اکثریت کی بناء پر اس ملک کی واحد حکمران بن جائے۔

مسلمان یہ صورت حال قبول کرنے کو قطعاً تیار نہ تھے اور انجام کار یہ ہوا کہ ان میں ایسے اداروں اور خیالوں نے زور پکڑنا شروع کیا، جس سے ہندوستان کی وحدت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کا اندیشہ ہے"۔

یہ خیالات، سرہیری ہیگ نے، ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اپریل ۱۹۴۰ء میں لندن آکر ظاہر فرمائے تھے۔ حالانکہ ۱۹۳۷ء میں وزارت سازی کے وقت انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ کانگرس ہندوؤں کی جماعت ہے، اور مسلمانوں کی نمائندگی نہیں کر سکتی۔ یہ بات بھی انہیں بخوبی معلوم تھی کہ رفیع احمد قدوائی کو مسلمانوں کی تائید قطعاً حاصل نہیں، بلکہ وہ کانگرس کے حاشیہ بردار اور کانگرس ہی کے نامزد کئے ہوئے آدمی ہیں۔

سرہیری ہیگ کی مذکورہ بالا تقریر کے وقت ناگپور کے مشہور ہندو بیرسٹر، اور مرکزی اسمبلی کے سابق ممبر، سرہری سنگھ گوڑ بھی جلسے میں موجود تھے۔ انہوں نے کھڑے ہو کر کہا کہ مسلمانوں کے اندیشے بالکل بے بنیاد ہیں، اور ہندوستان کے تمام مسلمان امن و عافیت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس پر عبداللہ یوسف علی مرحوم، جو اس وقت جلسے میں موجود تھے، تڑپ کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کہ

"...........اگر اس بات کی کوئی شہادت درکار ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر کیا بیت رہی ہے تو وہ معرکتہ الآراء پمفلٹ پڑھ لیجئے جو راجہ صاحب پیرپور نے شائع کیا ہے۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ یہ پمفلٹ پڑھنے کے بعد ہر شخص پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ہندوستان

کے حالات وہ نہیں ہیں جو ہم میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ ہونے چاہئیں۔

اگر آپ ہندوستان کے اخبار اٹھا کر دیکھیں ـــــ خبروں کے خلاصے جو انگلستان کے اخباروں میں چھپتے ہیں پڑھنا بے کار ہیں کیونکہ اصل واقعات وہ حذف کر دیتے ہیں ـــــ تو آپ کو معلوم ہو گا کہ آئے دن ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں فرقہ وارانہ فساد برپا ہو رہے ہیں۔ بالخصوص یو۔ پی میں تباہی مچی ہوئی ہے۔ ........"[1]

کوئنٹن ہوگ[2] ۔ برطانوی پارلیمنٹ کی ٹوری پارٹی کے بڑے مشہور اور زبردست رکن ہیں چند سال ہوئے انہیں لارڈ ہیلشم کا خطاب دے کر دارالامراء کا ممبر بنا دیا گیا تھا۔ لیکن جب ہیرلڈ میکملن نے برطانیہ کی وزارت عظمیٰ سے استعفاء دیا تو قیاس تھا کہ کوئنٹن ہوگ کو ان کا جانشین بنا دیا جائے گا۔ چنانچہ اسی امید پر انہوں نے دارالامراء کی ممبری ترک کر کے دوبارہ دارالعوام کی رکنیت اختیار کر لی۔ اگر عین وقت پر، بعض خاص وجوہ سے قرعہ انتخاب سر ایلک ڈگلس ہیوم کے نام پر نہ پڑتا تو بہت ممکن ہے کہ کوئنٹن ہوگ وزیر اعظم بن جاتے۔

اسی کوئنٹن ہوگ نے، برطانیہ کی لیبر پارٹی پر تابڑ توڑ حملے کرتے ہوئے ۱۹۴۷ء میں لکھا تھا کہ

"یہ بالکل واضح ہے کہ لیبر پارٹی، اس ملک میں ایک پارٹی کی واحدانی حکومت قائم کرنے کے درپے ہے اور یہ امر بھی قریب قریب تسلیم شدہ ہے کہ وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچنے ہی والی ہے ........ ........ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لیبر پارٹی کو اپنا مقصد حاصل کرنے میں چنداں رکاوٹ پیش نہیں آ سکتی۔ ٹریڈ یونین اور امداد باہمی کے اداروں میں اس نے اقلیتوں کو اس طرح منظم کر رکھا ہے کہ وہی ان اداروں پر حاوی ہو گئی ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی اور انڈی پنڈنٹ لیبر پارٹی کے جداگانہ وجود ہی گویا ختم کر دیئے گئے ہیں۔

لیبر پارٹی کا جو وسیع نظام قائم ہے اس کی غرض و غایت یہ نہیں کہ

---

1 The Asiatic Review London Volum XXXVI(Pages 248 - 249)

2 Quintin Hogg

برطانیہ کی اندرونی اور بیرونی پالیسی کو کسی معقول اور تسلی بخش نہج پر چلایا جائے۔ بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ صنعت و حرفت اور کواپریٹو تحریک پر قبضہ کر کے اپنی مطلب براری کی جائے۔ لیبر پارٹی کا یہ سارا نظام ٹرانسپورٹ ہاؤس[1] اور اس کے چند مستعد سیاسی عہدیداروں کے رحم پر چل رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کرامویل کے بعد اب تک اس ملک کی سیاسی آزادی کو کبھی کسی فرد یا کسی ادارے سے اس قدر زبردست خطرہ لاحق نہیں ہوا جتنا لیبر پارٹی سے ہے"۲۔

کوئنٹن ہوگ نے جو کچھ لکھا ہے کیا وہ صحیح ہے یا غلط؟ میں سردست اس سے بحث نہیں کرتا۔ یہ برطانیہ کے اپنے گھر کا معاملہ ہے (اگرچہ پچھلے بارہ سال کے عرصے میں پارلیمنٹ اور لوکل باڈیز کے جتنے انتخاب ہوئے ہیں، میں نے ہمیشہ اپنا ووٹ لیبر پارٹی کے امیدوار کو دیا ہے) لیکن سوچنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ برطانیہ میں کسی مستقل، دائمی اور غیر متبدل مذہبی اکثریت کی حکومت کسی دوسری مذہبی اقلیت پر قائم نہیں۔ جس خوش اسلوبی سے پارلیمنٹری نظام حکومت یہاں چل رہا ہے، اس سے بہتر نمونہ غالباً کہیں اور نظر نہیں آ سکتا۔ صورت حال یہ ہے کہ اگر آج ٹوری پارٹی کی وزارت ہے تو کل کو لوگ لیبر پارٹی کو ووٹ دے کر اسے حکومت کی کرسی پر بٹھا دیں گے۔ یہ ردّ و بدل ابتداء سے ہو رہا ہے اور یونہی ہوتا رہے گا۔ لیکن اس کے باوجود کوئنٹن ہوگ دھڑلے سے کہتے ہیں کہ لیبر پارٹی اس ملک میں ایک پارٹی کی وحدانی حکومت قائم کرنے کے درپے ہے جس سے ہماری سیاسی آزادی کو زبردست خطرہ لاحق ہے۔

اگر برطانیہ کی لیبر پارٹی پر یہ الزام لگایا جا سکتا ہے تو انڈین نیشنل کانگرس کے بارے میں کیا ارشاد ہو گا جس نے ان تمام حقوق و مراعات کا، جو جداگانہ انتخاب کی رو سے مسلمانوں کو حاصل تھے، قلع قمع کر کے ہندوستان میں ہندوؤں کی مستقل، دائمی اور ناقابل تبدیل اکثریت کو ہم پر مسلط کر دیا اور جس عذاب سے، بقول پیٹرک لیسی، مسلمان کسی پارلیمنٹری قاعدے اور کسی انتخاب کے ذریعہ سے بھی نجات نہیں حاصل کر سکتے تھے۔

---

۱۔ ٹرانسپورٹ ہاؤس، لیبر پارٹی کے مرکزی دفتر کا نام ہے۔

2- " The Case for Conservatives" by Quintin Hogg 1947 (Pages 304 - 305)

کس کس کا ذکر کروں اور کس کس اہل قلم کا حوالہ دے کر اپنے بیان کو موثق بناتا چلا جاؤں۔ گائی اے ونٹ انگلستان کے ایک مشہور مصنف ہی نہیں ہیں بلکہ ان کا شمار اس ملک کے مستند اہل دانش و بینش اور صاحب فہم و ذکاء لوگوں میں ہوتا ہے۔ وہ برسوں کیمبرج یونیورسٹی میں پڑھاتے رہے۔ دوسری عالمگیر جنگ سے قبل انہیں جمعیت اقوام (لیگ آف نیشنز) نے حکومت چین کی درخواست پر اس کی اقتصادی ترقی کی رفتار کا جائزہ لینے کے لئے وہاں بھیجا تھا اور وہ چار سال چین میں رہے۔ ہندوستان کی سیاست سے بھی گائی ونٹ کا بہت گہرا تعلق تھا اور انہوں نے ہندوستان میں مقیم رہ کر وہاں کے سیاسی مدو جزر کا بہ چشم غائر مطالعہ کیا۔ وہ نہ کانگرس کے مخالف ہیں اور نہ مسلم لیگ کے حامی۔ انہوں نے ہر چیز پر قطعی غیر جانب داری سے نگاہ ڈالی ہے۔

پیرپور رپورٹ کے متعلق اظہار خیالات کرتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں کہ

"مسلمانوں کی بیشتر شکایات یہ ہیں کہ کانگرسی حکومتوں نے اسکولوں میں اردو کی جگہ سنسکرت آمیز ہندی رائج کرنے کی کوشش کی۔ کانگرس پارٹی کے ترنگے جھنڈے کو قومی پرچم قرار دے کر پبلک عمارتوں پر نصب کیا گیا۔ بندے ماترم کے ہندوانہ گیت کو جس سے مسلمانوں کے مذہب اور مذہبی جذبات کو ٹھیس لگتی ہے قومی ترانہ بنا دیا گیا۔ سکولوں میں مسلمان بچوں کو مجبور کیا گیا کہ مسٹر گاندھی کی مورتی کو پرنام کریں۔ سرکاری ملازمتوں کا حصول مسلمانوں کے لئے مشکل قرار دے دیا گیا اور مسلمان ریاستوں میں ہندوؤں کو بھڑکا کر والیان ریاست کے خلاف ایجی ٹیشن شروع کرائی گئی۔

یورپ کے بعض ملکوں میں پارلیمنٹری نظام حکومت کی وجہ سے جو نقصان اقلیتوں کو پہنچا ہے اس کے پیش نظر یہ شکایات کچھ تعجب انگیز نہیں ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ کانگرس نے ان میں سے بعض شکایتوں کا معقول اور تسلی بخش جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ لیکن دقت یہ ہے کہ جب ہم ان معاملات کی تحقیقات کرتے ہیں تو یہ نقطہ نظر اختیار کرنا مناسب نہیں کہ غلط کیا ہے اور صحیح کیا ہے۔ جھوٹ کیا ہے اور سچ کیا ہے۔ بلکہ دیکھا یہ جاتا

---

1- Guy Wint

ہے کہ عوام کے جذبات مشتعل ہوئے ہیں یا نہیں. اور یہ اشتعال اس حد تک پہنچا ہے یا نہیں کہ دونوں قوموں میں باہمی اشتراک و تعاون کا امکان بظاہر ختم ہو جائے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسباب چاہے کچھ ہوں کانگرسی حکومتوں نے بدقسمتی سے اکثر صوبوں میں مسلمانوں کو اس قدر ناراض کر دیا ہے کہ ان میں رنج، غصہ اور خوف کے جذبات پیدا ہو گئے ہیں۔ یہ کیفیت صرف شہروں تک محدود نہیں، جہاں سیاسی جذبات نسبتاً جلد بھڑک اٹھتے ہیں. بلکہ دیہات میں بھی یہی حالت طاری ہے۔ وہاں تو مقامی کانگرس کمیٹیوں نے براہ راست حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔ ان کمیٹیوں میں اکثریت ہندوؤں کی ہے۔ چنانچہ جب صوبوں میں کانگرسی راج قائم ہوا تو ان کانگرسی کمیٹیوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی ذاتی رنجشوں اور عداوتوں کا انتقام لینا شروع کر دیا" ۱۔

میری اس کتاب کے چوتھے باب. بعنوان نہرو اور جناح کی خط و کتابت میں. کانگرس کا ترانہ بندے ماترم بھی زیر بحث آیا تھا۔ پیرپور رپورٹ میں شکایت درج ہے کہ کانگرسی صوبوں میں مسلمانوں کو یہ ترانہ گانے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ جب پنڈت نہرو کے کانوں تک مسلمانوں کی یہ شکایت پہنچی تو انہوں نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے اپنے خط مورخہ ۶۔ اپریل ۱۹۳۸ء میں مسٹر جناح کو لکھا کہ

"......... گذشتہ تیس چالیس سال سے بندے ماترم کو قومی ترانہ سمجھا جا رہا ہے جس میں ہندوستان کی مدح و ستائش کی گئی ہے. جہاں تک مجھے معلوم ہے اب تک کسی نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا ........... یہ چیز قومی تحریک کے لئے نقصان رساں اور لوگوں کے لئے تکلیف دہ ہے کہ عوام کو ایک ایسا ترانہ ترک کرنے پر مجبور کیا جائے جس کے ساتھ وہ عرصہ دراز سے وابستہ ہو چکے ہیں اور جسے وہ عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھتے ہیں"۔

آیئے ذرا ہم بھی غور کریں کہ یہ ترانہ ہے کیا کس نے لکھا. کس مقصد سے لکھا. کیوں کر لکھا

---

1 India and Democracy ـ

اور اس کا پس منظر کیا ہے۔

بنگال کے ایک ہندو ناول نویس بنکم چندر چیٹرجی نے ۱۸۸۰ء کے لگ بھگ ایک ناول "آنند مٹھ" لکھا تھا. جس کا پلاٹ یہ ہے کہ پلاسی کی جنگ اور سراج الدولہ کی وفات کے بعد اگرچہ کلکتہ پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار قائم ہو گیا. لیکن بنگال پر بدستور نوابان مرشد آباد کی حکومت تھی۔ "آنند مٹھ" کا ہیرو ایک شخص بھاؤ نند ہے. جو مسلمانوں کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے ہندوؤں کی فوج جمع کرتا ہے۔ اس دوران میں اس کی ملاقات ایک شخص مہندر سے ہوتی ہے. جس کی بیوی اور بہن کو اس نے ایک دفعہ ڈاکوؤں کے پنجے سے چھڑایا تھا۔ بھاؤ نند اس کے روبرو بندے ماترم کا گیت گاتا ہے۔ مہندر شروع شروع میں کچھ نہیں سمجھتا. لیکن معاملے کی اہمیت کا اندازہ کر کے پھر گانے کو کہتا ہے۔ بھاؤ نند گیت دوبارہ گاتا ہے اور اسے سمجھاتا ہے کہ ملک کو (جسے وہ ہر دفعہ "ماں" کے لفظ سے پکارتا ہے) مسلمانوں سے آزاد کرانے کے لئے مسلح بغاوت کرنا چاہئے۔

مہندر ڈرپوک آدمی ہے اور سہم کر کہتا ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ بھاؤ نند طیش میں آ کر چلّانے لگتا ہے کہ "ہمارا دھرم گیا ہماری ذات پات گئی. ہماری عزت و آبرو گئی. اب ہماری جانیں بھی خطرے میں ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جب تک ان نراشوں کو (مسلمانوں کو انتہائی حقارت سے نراش کہا گیا ہے) ختم نہیں کیا جاتا ہندو دھرم محفوظ نہیں رہ سکتا"۔

مہندر جواب دیتا ہے "کیا تم اکیلے مسلمانوں کو یہاں سے نکال سکتے ہو؟"

بھاؤ نند. بندے ماترم کے گیت کا کچھ حصہ گا کر سناتا ہے. جس کا ترجمہ ہے کہ "جس وقت سات کروڑ زبانوں کا نعرہ بلند ہو گا اور چودہ کروڑ ہاتھ تلواریں چلائیں گے کیا تم اس وقت بھی ماں (وطن) کو کمزور خیال کرو گے؟"

مہندر اب بھی قائل نہیں ہوا اور کہتا ہے کہ مسلمان بڑے طاقت ور ہیں لیکن بھاؤ نند جواب دیتا ہے نہیں مسلمان تو پرلے درجے کے بزدل ہیں۔ اس کے صحیح الفاظ کا ترجمہ ہے۔

"انگریز میدان جنگ سے فرار نہیں ہوتا۔ خواہ اس کی جان خطرے میں کیوں نہ پڑ جائے لیکن مسلمان کو جونہی پسینہ آیا وہ پشت دکھا کر بھاگ اٹھتا ہے اگر کہیں توپ کا ایک گولہ بھی مسلمانوں کے نزدیک جا گرے تو پورا لشکر جان بچا کر بھاگ جاتا ہے"

مہندر اب بھی قائل نہیں ہوا اور وفاداری کا حلف اٹھانے سے انکار کرتا ہے۔ اس پر بھاؤ نند اسے اپنے ساتھ آنند مٹھ لے جاتا ہے اور مندر کا برہمچاری اسے مندر میں لے جاتا ہے.

جہاں اندھیرا سا چھایا ہوا ہے۔ آہستہ آہستہ مہندر دیکھتا ہے کہ سامنے وشنو کا بت براجمان رکھا ہے جس کے چار لمبے لمبے بازو ہیں اور ہاتھوں میں ایک سنکھ، ایک چکر، ایک ڈنڈا اور ایک کنول کا پھول تھام رکھا ہے۔ سامنے دو کٹے ہوئے خون آلود سر پڑے ہیں۔ بائیں ہاتھ لکشمی دیوی اور دائیں ہاتھ سرسوتی دیوی کی مورتیاں ہیں۔ گود میں ایک بڑا خوبصورت سا بت ہے۔

برہمچاری پوچھتا ہے کہ "یہ بت جو وشنو مہاراج کی گود میں پڑا ہے، جانتے ہو کس کا ہے؟" مہندر لاعلمی کا اظہار کرتا ہے تو برہمچاری کہتا ہے کہ یہ ہماری ماں ہے اور ہم اس کے بچے ہیں۔ کہو بندے ماترم۔

یعنی ماں ایک بت کی صورت میں مادر وطن بن کر جلوہ گر ہوئی ہے جس کے اردگرد اور بت بھی رکھے ہیں۔ اور اسی ماں کو نمستے کرنے کے لئے بندے[۱] ماترم کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد برہمچاری، مہندر کو مندر کے ایک اور کمرے میں لے جاتا ہے جہاں بڑی آن بان اور شان و شوکت سے جگت دھرتی کا بت جلوہ گر ہے۔ برہمچاری بتاتا ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ماں (وطن) کی یہ شان و شوکت تھی۔ اس پر مہندر بڑے ادب سے جگت دھرتی یعنی ماں کو پرنام کرتا ہے۔

پھر برہمچاری اور مہندر ایک تہہ خانے میں داخل ہوتے ہیں، جہاں کالی ماتا کا سیاہ، خوفناک لباس سے محروم عریاں بت رکھا ہے۔ برہمچاری مہندر سے کہتا ہے کہ دیکھو، مسلمانوں نے ماں (وطن) کا کیا حال کر دیا ہے۔

مہندر پوچھتا ہے کہ دیوی ماتا نے اپنے ہاتھوں میں یہ ہتھیار کیسے اٹھا رکھے ہیں؟

برہمچاری کہتا ہے کہ ہم ماتا کے بچے ہیں اور ہمیں نے اس کو ہتھیاروں سے مسلح کیا ہے۔

کہو بندے ماترم۔

اس کے بعد دونوں مندر کے ایک اور کمرے میں داخل ہوتے ہیں، جہاں دس بازوؤں والی دیوی دُرگا کا بت رکھا ہے۔ برہمچاری اس کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے کہ جب اپنے دشمن مسلمانوں کا سر کچل ڈالیں گے، تو ماں (وطن) پر دوبارہ یہ جوبن آئے گا۔

لکشمی دیوی اور سرسوتی دیوی کے بت بھی اس کمرے میں رکھے ہیں۔ برہمچاری جوش جذبات سے از خود رفتہ ہو کر ایک بھجن گاتا ہے۔ جس کے الفاظ ہیں۔

---

۱۔ بندے ماترم کا مطلب ہے۔ ماں کو سلام۔

"اے ماتا (وطن) تیرا نام دُرگا ہے جس کے دس بازو ہیں اے ماتا! تیرا نام لکشمی ہے جو کنول کے پھولوں کی رانی ہے۔ اے ماتا! تیرا نام سرسوتی ہے جو علم و عرفان اور دھیان گیان کی دیوی ہے۔ میں تیرے چرنوں میں جھکتا ہوں"۔

پھر بھجن سن کر یکایک مہندر پر بے خودی سی طاری ہو جاتی ہے اور وہ آگے بڑھ کر دیوی کے قدموں پر سر رکھ دیتا ہے اور ایک چیخ مار کر حلف وفاداری اٹھاتا ہے۔

اس کے بعد بھاؤ نند اور مہندر مل کر ہندوؤں کی فوج تیار کرتے ہیں تاکہ ماں کو دشمنوں یعنی مسلمانوں کے پنجے سے آزاد کرایا جائے۔ ہر سپاہی سے قسم لی جاتی ہے کہ جب تک مسلمانوں کو ملک سے نکالا نہیں جائے گا. وہ تمام دنیوی علائق اور خاندانی تعلقات سے کنارہ کش رہے گا۔ قسم اٹھانے کے بعد ہر سپاہی بڑی عقیدت سے بندے ماترم کا گیت گاتا ہے۔

جب ہندوؤں کی فوج مسلح ہو کر تیار ہو جاتی ہے تو وہ جگہ جگہ بڑی بے دردی سے نہتے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑتی ہے۔ اور عام قتل و غارت اور لوٹ مار کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

ناول کے مصنف کے اپنے الفاظ یہ ہیں۔

"ایلچی اور ڈھنڈروچی قصبوں اور گاؤں میں پھیل جاتے ہیں اور جہاں کوئی ہندو نظر آتا ہے اس سے کہتے ہیں. ارے بھائی کیا تم وشنو مہاراج کے پجاری ہو؟ اس کے بعد ہندوؤں کا مسلح گروہ یکایک مسلمانوں کے دیہات پر ٹوٹ پڑتا ہے اور قتل و غارت کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ مسلمان سراسیمہ ہو کر ادھر ادھر جان بچانے کے لئے بھاگتے ہیں اور ماں (وطن) کے بچے مسلمانوں کا مال و دولت لوٹ کر ان کے گھروں کو آگ لگا دیتے ہیں۔ یہ تمام لوٹا ہوا مال ہندو آپس میں تقسیم کر کے بہت خوش ہوتے ہیں۔ پھر وشنو کے مندر میں جا کر مہاراج کے قدموں کو چھوتے اور ماں کی خدمت کا از سر نو حلف اٹھاتے ہیں"۔

ایک اور جگہ مصنف کے قلم کی جولانی ملاحظہ فرمایئے:۔

"مسلمانوں کی آبادیوں پر جب ہندو حملہ کرتے ہیں تو چاروں طرف شور بپا ہو جاتا ہے۔ ہر سمت سے آوازیں آتی ہیں کہ نراشوں (مسلمانوں) کو مارو۔ بعض زور زور سے بندے ماترم کا نعرہ لگاتے ہیں.

بعض پوچھتے ہیں کہ بھائیو. وہ دن کب آئے گا جب ہم ان نراشوں کی مسجدیں گرا کر وہاں رادھا مہادیو کے مندر بنائیں گے؟ پھر یکا یک فضا بندے ماترم کے نعروں سے گونج اٹھتی ہے "۔

ناول کے آخری حصے میں مصنف لکھتا ہے کہ جب ہندوؤں نے مسلمانوں کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے بغاوت کی تو ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج اس بغاوت کو رفع کرنے کے لئے میدان میں آ گئی۔ ہندوؤں کی فوج کے سالار کا نام ستیہ نند ہے۔ اس کی ملاقات ایک طبیب سے ہوتی ہے جو دراصل ایک ہندو اوتار ہے لیکن انسان کا روپ دھار کر نمودار ہوا ہے۔ ستیہ نند مایوس ہو کر پوچھتا ہے "گورو جی مہاراج۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ مسلمانوں کو تو ہم نے بلاشبہ نیست و نابود کر دیا ہے لیکن ہندو راج ہنوز قائم نہیں ہوا. کلکتہ پر بدستور انگریز قابض ہیں"۔

طبیب جواب دیتا ہے "ہندو راج ابھی قائم نہیں ہو گا۔"

ستیہ نند چلا اٹھتا ہے "مہاراج بتائیے پھر کون راج کرے گا ہم پر؟ کہیں مسلمان دوبارہ تو نہیں آ جائیں گے؟"

طبیب کہتا ہے "گھبراؤ مت. انگریز تو ہمارے دوست اور خیر خواہ ہیں۔ مسلمان مٹ گئے وہ دوبارہ کبھی نہیں آنے پائیں گے۔ تقدیر کا فیصلہ یہی ہے کہ پہلے کچھ مدت انگریز ہمارے ملک پر راج کریں گے. پھر حکومت ہندوؤں کے ہاتھ میں آ جائے گی"

میں ہر صائب الرائے. صحیح الدماغ اور غیر جانب دار انسان سے نہایت ادب کے ساتھ درخواست کرتا ہوں کہ بندے ماترم کی اصل حقیقت. علت غائی. شان نزول اور پس منظر پر غور کرنے کے بعد فیصلہ کیا جائے کہ کیا یہ گیت مسلمانوں کا قومی ترانہ بن سکتا ہے؟ کیا یہ گیت مسلمانوں کے خلاف اعلان جنگ ہے یا انگریزوں کے خلاف؟ کیا اس گیت سے مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلتی ہے یا برطانوی ملوکیت کے خلاف؟

ستم ہے کہ گیت کا مصنف تو خود کہتا ہے کہ انگریز ہندوؤں کے دوست اور خیر خواہ ہیں ان کی حکومت کا خیر مقدم کرو۔ ہمارے اصل دشمن مسلمان ہیں۔ لیکن پنڈت نہرو کی سادگی و پرکاری ملاحظہ فرمائیے کہ وہ بندے ماترم کو "برطانوی امپیریلزم" کے خلاف ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ قومی ترانہ قرار دیتے ہیں اور اس دیدہ دلیری پر شرمسار نہیں ہوتے بلکہ فخر کرتے ہیں۔

نہرو. راجندر پرشاد، گاندھی. پٹیل وغیرہ کا شکوہ بے سود ہے۔ رونا تو اس بات کا ہے کہ

حجتہ الاسلام "امام الہند" "فخر المتقدمین والمتاخرین" حضرت مولانا ابوالکلام آزاد بھی لہک لہک کر بندے ماترم گاتے اور مسلمانوں کو حکم دیتے تھے کہ تم بھی گاؤ اس سے تمہاری قومی حمیت بیدار ہوگی۔

مولانا کا وطن مالوف اگرچہ قصبہ کھیم کرن، تحصیل قصور، ضلع لاہور تھا۔ لیکن ان کی تمام عمر کلکتہ میں بسر ہوئی تھی۔ بنگال کے ہندوؤں سے ان کے دیرینہ مراسم تھے۔ بنکم چندر چیٹرجی کے ناول بھی انہوں نے پڑھے تھے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ "کانگرسیت" ان کے اندر اس حد تک حلول کر گئی تھی کہ مسلمانوں کی ذلت و نکبت، مصیبت و رسوائی اور تباہی و بربادی کے بدیہی حقائق بھی انہیں متاثر نہ کر سکتے تھے۔

عمرے کہ بہ آیات و احادیث گذشت
رفتی و نثار بت پرستی کردی

اس ضمن میں وزیر ہند لارڈ زٹلینڈ کے خیالات پر غور کرنا ضروری ہے جو ہندوستان سے چھ ہزار میل دور لندن میں بیٹھے تمام واقعات کا جائزہ لے رہے تھے۔ پیرپور رپورٹ ان کے مطالعہ سے بھی گذری تھی۔ چنانچہ وہ اپنی خود نوشت سوانح عمری میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

" اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں، کانگرس نے جو سلوک مسلمانوں سے کیا تھا اس نے مجھے خاصا پریشان کر دیا تھا۔ جس قسم کی اطلاعیں مجھ تک برابر پہنچ رہی تھیں۔ ان سے صاف ظاہر تھا کہ بعض کانگرس صوبوں میں مسلمانوں کے جذبات کو کھلم کھلا مجروح کیا جا رہا ہے۔ مثلاً کانگرس کا ترنگا جھنڈا پبلک عمارتوں پر نصب کرنا یا ڈسٹرکٹ بورڈوں کے سکولوں کے طلبہ کو بندے ماترم گانے پر مجبور کرنا۔ اگرچہ یہ باتیں بظاہر معمولی معلوم ہوتی ہیں لیکن مسلمان اس سے سخت رنجیدہ اور مشتعل ہو رہے تھے۔ مسلمانوں کی شکایتوں اور تکلیفوں کے اظہار کے لئے جو رپورٹ مرتب کی گئی ہے اس میں ان واقعات کا نمایاں ذکر موجود ہے [1]۔

اسی موضوع پر لارڈ زٹلینڈ نے ۱۱۔ جنوری ۱۹۴۰ء کو ذیل کا خط وائسرائے کو لکھا۔

---

1۔ "Essayez" (Page 270)

" پیرپور رپورٹ میں مسلمانوں کی جن شکایتوں اور تکلیفوں کا اظہار کیا گیا ہے، ان کے جواب میں کانگرسی وزارتوں نے اپنی صفائی میں جو بیان دیئے ہیں، ان میں کم سے کم ایک بیان ایسا ضرور ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ کانگرسی حکومتیں مسلمانوں کے اعتراضات کی نوعیت و کیفیت سے کس قدر بے خبر ہیں۔ مثلاً بندے ماترم کا ترانہ۔

صوبہ بہار کی حکومت نے کہا ہے کہ "جب کانگرسی وزارت قائم ہوئی تھی، تو یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ بعض مسلمانوں کو کانگرس کے پرچم اور اس کے ترانے سے وہ عقیدت و محبت نہیں جو عوام کو ہے۔ اس ترانے کے ابتدائی بند ایسے ہیں جن میں نہایت پیارے الفاظ میں مادر وطن کی خوبصورتی بیان کی گئی ہے۔ اور ہمارے خیال میں یہ ناممکن ہے کہ کسی محب وطن ہندوستانی کو مذہب یا کلچر کی بناء پر اس پر اعتراض ہو۔"

ممکن ہے کہ کانگرسی وزراء کی یہ رائے درست ہو، لیکن کانگرس اس بات کو بالکل نظر انداز کر دیتی ہے کہ یہ گیت نہیں بلکہ بھجن ہے۔ جس کا آغاز اور پس منظر سراسر قابل اعتراض ہے۔ مشہور بنگالی ناول نویس بنکم چندر چیٹرجی نے جب یہ گیت اپنے ناول "آنند مٹھ" کے ہیرو کی زبان سے گوایا ہے تو یہ چھپانے کی ہرگز کوشش نہیں کی گئی کہ یہ دھارمک بھجن ہے، گیت نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ گیت بھی نہیں بلکہ اعلان جنگ ہے جو ہندوؤں نے مسلمانوں کے خلاف اپنی قومی تحریک چلانے کے لئے وضع کیا تھا۔ ناول پڑھ لیجئے۔ یہ بات بالکل واضح ترین الفاظ میں عیاں ہو جاتی ہے کہ جب ہندوؤں نے اپنے غنیم پر فتح پائی تو اس رات ملک کا وہ حصہ ہری رام کے نعروں سے گونج اٹھا۔ اور ہر شخص کی زبان پر تھا کہ مسلمانوں کو شکست ہوئی اور ملک ہندوؤں کو واپس مل گیا۔ کہو ہری ہری"

آپ کو غالباً معلوم ہو گا کہ اس کہانی کی بنیاد ہندو سنیاسیوں کی اس بغاوت پر رکھی گئی ہے جس کا ذکر وارن ہیسٹنگز نے اپنے

خطوں میں کیا ہے اور جو مغلیہ سلطنت کے زوال کے وقت شمالی بنگال میں رونما ہوئی تھی۔ بندے ماترم میں جس ماں کو بار بار سلام کیا گیا ہے وہ دراصل ایک مشہور ہندو دیوی کا مجسمہ ہے جس کا اظہار متعدد صورتوں میں ہوا ہے۔ مثلاً مادر وطن اور ہندوؤں کی قومی روح اسی دیوی کے مختلف پیرایہ اظہار ہیں۔

اگر صوبہ بہار کے کانگرسی وزیر یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کو یہ بھجن عقیدت و محبت کے ساتھ گانا چاہئے تو ان وزراء کی بے خبری حد درجہ قابل افسوس ہے کیونکہ انہیں اپنے قومی ادب سے بھی آگاہی نہیں۔ یہ تو گویا وہی بات ہوئی کہ چیکوسلواکیہ اور پولینڈ کے باشندوں سے کہا جائے کہ وہ جوش مسرت سے ہٹلر زندہ باد کا نعرہ لگائیں۔

میرے اور آپ کے درمیان ہمیشہ اس بات پر اتفاق رہا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو باہمی اختلاف بلکہ تصادم ہو رہا ہے اس کا ایک بنیادی سبب نفسیاتی ہے۔ بندے ماترم وغیرہ جیسے معاملات میں یہی نفسیاتی عنصر اور زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آ جاتا ہے"[1]۔

پیرپور رپورٹ شائع ہونے کے بعد پنڈت نہرو نے بھی ایک اخباری بیان دیا تھا اور حسب عادت بہت تحدی بلکہ رعونت سے کہا تھا کہ رپورٹ میں جو کچھ لکھا ہے غلط ہے اور میں مسلمانوں کی شکایات کی تحقیقات کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کرنے کو تیار ہوں۔

مسٹر جناح نے جواب دیا کہ

"میں نے پنڈت جواہر لال نہرو کا بیان پڑھا ہے جس میں انہوں نے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کرنے پر آمادگی کا اظہار فرمایا ہے۔ لیکن ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ پہلے میں انہیں بتاؤں کہ مسلمانوں کو کانگرسی حکومتوں سے شکایات کیا ہیں۔ ان کے قول کے مطابق وہ تو ان واقعات سے بھی بے خبر ہیں جو خود ان کے صوبے میں ہو رہے ہیں۔

پنڈت نہرو نے جس جوش انصاف کا مظاہرہ کیا ہے مجھے اس پر کوئی شک نہیں۔ لیکن اچنبھے کی بات یہ ہے کہ چھوٹتے ہی انہوں نے ان جملہ

---

1۔ "Essayez" (Pages 271 - 272)

الزامات کو قطعی بے بنیاد اور لغو قرار دے دیا ہے جو مسلمانوں کی طرف سے عائد کئے جا رہے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ کس قدر شرم کی بات ہے کہ جب ہم آزادیٔ وطن کی جنگ میں مصروف ہیں، ایک شخص اٹھتا ہے اور اس قسم کی بے مصرف اور بے ہودہ باتیں کرنے لگ جاتا ہے۔

مسلم لیگ نے ۲۰۔ مارچ ۱۹۳۸ء کو راجہ صاحب پیرپور کے زیرِ صدارت ایک کمیٹی قائم کی تھی، جس نے مختلف صوبوں کا دورہ کر کے اور بیشتر مقامات پر جا کر نہایت غور و خوض سے تمام حالات کا معائنہ کیا۔ اور تفتیش و تحقیق کے مراحل طے کئے اور اس کے بعد ایک رپورٹ مرتب کی جو اخبارات میں شائع ہو چکی ہے۔ کیا اب تک کسی شخص نے پنڈت نہرو کی توجہ اس مطبوعہ رپورٹ کی طرف منعطف نہیں کی؟

پنڈت جی نے از راہ کرم میرے متعلق فرمایا ہے کہ میں اتنا بڑا قانون دان ہونے کے باوجود اس حقیقت سے بے خبر ہوں کہ جب تک یک طرفہ الزامات کو ثابت نہ کیا جائے گا کوئی دوسرا آدمی انہیں باور نہیں کر سکتا۔ بجا فرمایا، لیکن پنڈت جی نے ان الزامات کو سمجھنے اور دریافت کئے بغیر ہی انہیں لغو اور بے بنیاد قرار دے دیا ہے۔ ایک طرف وہ مسلمانوں کی شکایات کو بے بنیاد قرار دیتے ہیں۔ اور دوسری طرف تقاضا کرتے ہیں کہ میں انہیں بتاؤں کہ مسلمانوں کو شکایات ہیں کیا۔ ایسی ذہنیت کے شخص کے ساتھ بحث کرنا بے سود ہے۔

رونا صرف یہی نہیں بلکہ اجودھیا میں جس کانفرنس کی انہوں نے صدارت فرمائی ہے وہاں ان کے سامنے یو۔ پی کے وزیر اعظم نے بڑے دھڑلے سے کہا ہے کہ کانگرسی حکومت مسلمانوں کے ساتھ منصفانہ ہی نہیں بلکہ فیاضانہ سلوک کر رہی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ پیرپور رپورٹ میں فتنہ و فساد اور ظلم و ناانصافی کے جو بیسیوں واقعات درج ہیں اور جن کی اخباروں میں اشاعت بھی ہو چکی ہے، ان کو سردست نظر انداز کر کے صرف اتنا بتا دیجئے کہ ٹانڈہ، داوری، بھاگل پور اور ہزاری باغ میں مسلمانوں کے ساتھ کیا کچھ ہوا ہے؟

میں یو۔ پی کے وزیر اعظم پنڈت بنت سے پوچھتا ہوں کہ وہ مہربانی کر کے بتائیں کہ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ کون کون سا رحم دلی اور فیاضی کا سلوک کیا ہے۔ پنڈت جی نے تو اپنا فیصلہ بھی صادر کر دیا ہے۔ اسی طرح سی۔ پی کے ایک ذمے دار وزیر پنڈت دوار کا پرشاد مصرا نے ایک بڑہانک دی ہے جو آج کے اخبارات میں چھپی ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو. گویا حاتم کی قبر پر لات مار کر بڑے طمطراق سے فرماتے ہیں کہ وہ جملہ الزامات کی تحقیقات کسی مستقل اور غیر جانب دار عدالت سے کروانے کو تیار ہیں۔

اگر ان کا یہ ارشاد محض پراپیگنڈے یا اخباری واہ واہ حاصل کرنے کے لئے نہیں ہوا تو میں یہ بتانا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ جب کسی بات کی تحقیقات کے لئے ایک مستقل اور غیر جانب دار عدالت قائم کی جاتی ہے تو سب سے پہلے ان امور کا تعین کیا جاتا ہے جو عدالت کے رُوبرُو پیش ہوں گے. پھر یہ طے کیا جاتا ہے کہ عدالت کے اختیارات کا دائرہ کیا ہو گا۔ عدالت کی پشت پر کون سی کار فرما طاقت ہو گی عدالت کس کے سامنے جواب دہ ہو گی. اپنی رپورٹ کس کو پیش کرے گی اور آخر کار وہ ہیت حاکمہ کون سی ہے جو عدالت کے فیصلے کو نافذ کرنے کی مجاز ہو گی۔

لہٰذا کسی قسم کی مستقل اور غیر جانب دار عدالت قائم کرنے سے پہلے ان تمام امور کا تصفیہ ضروری ہے۔ سردست مسٹر جواہر لال نہرو کی جو تجویز اخباروں کی زینت بن کر ہمارے سامنے آئی ہے. محض ہوا میں تیر چلانے کے مترادف ہے اگر پنڈت جواہر لال نہرو نے واقعی سنجیدگی کے ساتھ یہ تجویز شائع کروائی ہے۔ تو گذارش یہ ہے کہ انہیں چاہئے کہ براہ راست میرے ساتھ مراسلت کر کے مجھے بتائیں کہ مجوزہ مستقل اور غیر جانب دار عدالت کے اختیارات کیا ہوں گے اور وہ متعلقہ امور. جن کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے کس طرح طے کئے جائیں گے۔

میں اس دوران میں نہایت مخلصانہ طور پر پنڈت جواہر لال نہرو سے عرض کروں گا کہ کسی قسم کا یک طرفہ فیصلہ صادر کرنے سے پہلے انہیں

چاہیے کہ ایک مرتبہ پیرپور رپورٹ کا مطالعہ فرمالیں۔ یہ رپورٹ طبع ہو چکی ہے اور اگر وہ پسند فرمائیں تو لیگ کے دفتر سے ایک نسخہ مل سکتا ہے"[۱]۔

۱۔ روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور، مورخہ ۷ جنوری ۱۹۳۰ء

(۱۰)

# مسلم لیگ کا اجلاسِ پٹنہ

وقت کے ساتھ ساتھ اہل ہند کا یہ مطالبہ زور پکڑتا جا رہا تھا کہ ہندوستانی نوجوانوں کو فوج میں شاہی کمیشن ۱؎ ملنا چاہئے۔ اور کمیشن یافتہ افسروں کی تعلیم و تربیت کے لئے سینڈھرسٹ کے نمونے پر ہندوستان میں بھی ایک ملٹری کالج کھولا جائے۔ تاکہ انہیں انگلستان جانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

۱۹۲۵ء میں ہندوستان کی مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی نے ایک قرار داد کے ذریعہ سے ایک کمیٹی تشکیل کی جس کے صدر لیفٹننٹ جنرل سر اینڈرو سکین ۲؎ تھے۔ ممبروں میں مسٹر جناح اور پنڈت موتی لال نہرو بھی شامل تھے۔ پنڈت نہرو کی شرکت سے کانگرسی حلقوں میں ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ وجہ یہ کہ پنڈت جی مرکزی اسمبلی میں سوراج پارٹی کے لیڈر تھے۔ سوراجیوں کا دعویٰ تھا کہ ہم حکومت سے کسی کام میں تعاون نہیں کریں گے۔ بلکہ کونسلوں اور اسمبلیوں میں داخل ہو کر، ڈیڈ لاک پیدا کر کے آئین کو ناقابل عمل بنا دیں گے۔ اس دعویٰ کی بناء پر سوراج پارٹی نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر حکومت کسی غرض سے کوئی تحقیقاتی کمیٹی قائم کرے تو سوراجی ممبروں کو اس میں شرکت نہیں کرنا چاہئے۔

جب پنڈت موتی لال نہرو کے خلاف خود کانگرسی ممبروں نے یہ الزام لگایا کہ وہ حکومت سے تعاون کر رہے ہیں تو انہوں نے سکین کمیٹی میں اپنی شرکت کا جواز یہ پیش کیا کہ ہندوستانیوں کو فوج میں اعلیٰ عہدے دلوانا اس لئے ضروری ہے کہ ہمارے ملک کی فوج جلد از جلد ہندوستانیوں کی تحویل میں چلی جائے۔ تاکہ ہمیں اپنے ملک کی حفاظت کے لئے انگریزوں کا محتاج نہ رہنا پڑے۔

پنڈت جی کی یہ منطق ان کے سیاسی مسلک کے مطابق تھی یا مخالف اس مسئلہ سے سردست بحث کرنا مقصود نہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ انہوں نے سکین کمیٹی میں شرکت فرمائی جس نے غور و

---

۱؎ King's Commission

۲؎ Sir Andrew Skeen

خوض اور تحقیقات کے بعد فیصلہ کیا کہ سینڈھرسٹ کے نمونے پر ہندوستان میں بھی ایک ملٹری اکیڈیمی قائم کرنا ضروری ہے۔ اور یہ کہ ۱۹۳۸ء میں دوبارہ اس مسئلے پر غور کیا جائے گا کہ آیا مجوزہ اکیڈیمی اپنے مقصد میں کامیاب ثابت ہوئی ہے یا نہیں۔ اور جس رفتار سے ہندوستانیوں کو فوج میں شاہی کمیشن عطا کیا جا رہا ہے وہ مجموعی طور پر ملک کے لئے نفع رساں ہے یا نہیں۔

سکین کمیٹی کی اس سفارش پر ۱۹۳۲ء میں بمقام ڈیرہ دون. ایک انڈین ملٹری اکیڈیمی قائم کر دی گئی۔ لیکن چونکہ پرانی قرار داد کے مطابق ۱۹۳۸ء میں اس پر از سر نو غور کرنا ضروری تھا. لہٰذا ۲۔ ستمبر ۱۹۳۸ء کو مولانا شوکت علی نے مرکزی اسمبلی میں یہ ریزولیوشن پیش کیا کہ حکومت ہند کو چاہئے کہ فوراً ایک کمیٹی قائم کرے جس میں اسمبلی کے انتخاب شدہ ممبروں کی اکثریت ہو۔ اور یہ کمیٹی انڈین ملٹری اکیڈیمی کے موجودہ طرز کار پر غور کرنے کے بعد فیصلہ کرے کہ جس رفتار سے ہندوستانی نوجوانوں کو فوج میں شاہی کمیشن مل رہا ہے. وہ تسلی بخش ہے یا نہیں۔ اور اگر تسلی بخش نہیں تو اس میں کیا کیا تبدیلیاں ہونی چاہئیں۔

بات یہ تھی کہ انڈین ملٹری اکیڈیمی کے قیام کے باوجود وہ مقصد کماحقہ پورا نہیں ہوتا تھا جس کے لئے یہ ادارہ شدّ و مد سے قائم کیا گیا تھا۔ اکیڈیمی کے لیفٹنٹ اور سینڈھرسٹ کے لیفٹنٹ میں بدستور کمتری اور برتری کا فرق موجود تھا۔ سینڈھرسٹ کے تعلیم یافتہ لیفٹنٹ کی تنخواہ. عزت. الاؤنس. مرتبہ. غرضیکہ ہر چیز اکیڈیمی کے تعلیم یافتہ لیفٹنٹ سے زیادہ تھی۔ اور اکثر ایسا ہوتا کہ جو نوجوان انڈین ملٹری اکیڈیمی سے اپنا معینہ کورس پورا کر کے نکلتے. انہیں مزید تعلیم کے لئے سینڈھرسٹ بھیجا جاتا تھا۔ یہ روپے اور وقت دونوں کا زیاں تھا۔ اس کے علاوہ بھرتی کی رفتار اس قدر سُست تھی کہ کہیں پچاس. ساٹھ سال میں جا کر فوج کے ہندوستانی بننے کا امکان تھا۔ لہٰذا یہ ضروری خیال کیا گیا کہ سکین کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں اکیڈیمی اور اس کے پورے طریق تعلیم پر دوبارہ غور کیا جائے۔

۶۔ دسمبر ۱۹۳۸ء کو حکومت ہند کے ڈیفنس سیکرٹری مسٹر اگلوی نے ذیل کا خط مسٹر جناح کو لکھا۔

"مائی ڈیر مسٹر جناح

مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں آپ کو اس موضوع پر خط لکھوں کہ ۲۔ ستمبر ۱۹۳۸ء بروز جمعہ لیجسلیٹو اسمبلی نے ایک قرار داد منظور کی تھی کہ سکین کمیٹی کی رپورٹ کی اس سفارش کو معرض عمل میں لانے کے لئے ایک کمیٹی قائم کی جائے کہ ۱۹۳۸ء میں اس مسئلہ پر نظر ثانی کی جائے گی کہ جس رفتار

سے انڈین آرمی میں ہندوستانیوں کو بھرتی کیا جارہا ہے وہ مناسب ہے یا نہیں۔ مہربانی فرما کر مجھے مطلع فرمائیے گا کہ کیا آپ اس مجوزہ کمیٹی میں شرکت کرنا منظور فرمائیں گے؟

یہ کمیٹی جن امور پر غور کرے گی وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ جس رفتار سے ہندوستانیوں کو انڈین آرمی کے افسروں کے عہدوں پر مقرر کیا جارہا ہے اس پر غور وفکر کر کے دیکھنا کہ

۲۔ جو نتائج اس وقت تک برآمد ہوئے ہیں کیا ان کی روشنی میں یہ رفتار مناسب ہے؟

۳۔ اگر مناسب نہیں تو انڈین ملٹری اکیڈیمی میں بھرتی کرنے کے قواعد میں ایسی تبدیلیوں کی سفارش کی جائے جن سے اس بات کی توقع ہو کہ موزوں امیدواروں کی تعداد میں اضافہ ہو سکے گا۔

میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس کمیٹی کو امید ہے کہ آپ کی پارٹی کے ایک ممبر، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کی خدمات حاصل کی جاسکیں گی۔ وہ اس سے قبل سکین کمیٹی میں بھی کام کر چکے ہیں۔ دیگر جن ممبروں کو دعوت دی جارہی ہے وہ یہ ہیں

بریگیڈئر آر۔ ڈی۔ اِنسکپ ا، آنریبل پنڈت ایچ۔ این۔ کنزرو، آنریبل سراے۔ پی۔ پٹرو، مسٹر آصف علی، مسٹر سبرائن، سرجوگندر سنگھ، لیفٹننٹ کرنل ایم۔ اے رحمٰن، کیپٹن سردار بہادر دلیپ سنگھ، کیپٹن سر شیر محمد خاں، ڈاکٹر بی۔ ایس۔ مونجے۔ ان کے علاوہ محکمہ تعلیم کا ایک نمائندہ اور ڈیفنس سیکرٹری بھی اس کمیٹی میں شریک ہوں گے۔

یہ کمیٹی ۱۶۔ جنوری ۱۹۳۹ء پیر کے روز اپنا اجلاس شروع کرے گی۔ صدارت ہندوستان کے ایڈجوٹنٹ جنرل، لیفٹننٹ جنرل سر آر۔ ولسن کریں گے۔ اندازہ ہے کہ قریباً تین ہفتے کام جاری رہے گا"۔

مسٹر جناح نے اس خط کا حسب ذیل جواب دیا۔

"نئی دہلی۔ ۱۴۔ دسمبر ۱۹۳۸ء

ڈیئر مسٹر اگلوی

---

1 Inskip۔

آپ کا خط محررہ ۶۔ دسمبر ۱۹۳۸ء ملا۔ میں نے اپنی پارٹی مسلم لیگ[۱] سے مشورہ کیا ہے۔ لہٰذا آپ کو اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ جن امور پر یہ کمیٹی غور کرے گی ہم ان سے مطمئن نہیں۔ اور کمیٹی میں کام کرنے کے لئے جن افراد کو آپ نے مدعو کیا ہے، ان سے بھی ہم مطمئن نہیں۔ اس لئے مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی مجوزہ کمیٹی میں کام نہیں کر سکتا[۲]۔

یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ مسٹر جناح، انڈین آرمی کو ہندوستانی افسروں کی تحویل میں دینے کے خلاف تھے۔ سکین کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے سب سے زیادہ زور انہیں نے دیا تھا کہ ہندوستانیوں کو جلد از جلد شاہی کمیشن ملنا چاہئے۔ گول میز کانفرنس میں بھی اس مسئلے پر سب سے زور دار تقریریں انہیں نے کی تھیں۔

اس کتاب کے دوسرے باب، بعنوان فوجی بھرتی کا مسئلہ میں مسٹر جناح کی جو تقریر درج کی گئی ہے، اس کے ایک ٹکڑے کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

"آپ کو کیا معلوم کہ میں کب سے چلّا رہا ہوں کہ فوج کو ہندوستانی بناؤ۔ پہلی گول میز کانفرنس کی ڈیفنس کمیٹی میں میں نے یہی تجویز پیش کی تھی کہ انڈین آرمی کے عہدوں پر بتدریج ہندوستانیوں کا تقرر شروع کر دینا چاہئے۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہو گی کہ گول میز کانفرنس کے ایک بھی ہندوستانی مندوب نے میری تجویز کی حمایت نہیں کی تھی۔

اس وقت جو تجویز میں نے پیش کی تھی وہ بہت نرم تھی۔ اور اگر اس پر عمل در آمد شروع ہو جاتا تو ایک اندازے کے مطابق چالیس اور دوسرے اندازے کے مطابق پچاس سال میں کہیں جا کر فوج کے تمام اعلیٰ عہدوں پر ہندوستانی متمکن ہو سکتے تھے۔

اگر آپ گول میز کانفرنس کی روداد ملاحظہ فرمائیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ مجھے اس تجویز کی حمایت میں تن تنہا لڑنا پڑا تھا۔ کوئی شخص میری مدد کو

---

۱۔ ۱۹۳۴ء کے آخر میں جب مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی مرتب ہوئی تھی تو مسٹر جناح، انڈی پنڈنٹ پارٹی کے لیڈر تھے، جو ایک غیر فرقہ وارانہ اور مخلوط جماعت تھی۔ لیکن آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کلکتہ، منعقدہ اپریل ۱۹۳۸ء کے بعد انہوں نے انڈی پنڈنٹ توڑ کر خالص مسلم لیگ پارٹی قائم کی، جس کے لیڈر خود مسٹر جناح اور ڈپٹی لیڈر میر غلام بھیک نیرنگ تھے۔

۲۔ روزنامہ سٹیٹسمین ۔ کلکتہ مورخہ ۱۶۔ دسمبر ۱۹۳۸ء

آگے نہ آیا"۔

لیکن حکومت ہند کی موجودہ کمیٹی میں شریک ہونے سے انکار کر دینے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ حکومت عمداً اور جان بوجھ کر سکین کمیٹی کی سفارشات پر عملدر آمد کرنے سے گریز کر رہی تھی اور گذشتہ چھ سال میں حکومت کا روّیہ بدستور یہی رہا تھا کہ ہندوستانی نوجوانوں کو فوجی کمیشن دینے میں حتی الامکان بخل اور تساہل کیا جائے۔ سکین کمیٹی کی رپورٹ کا یہ مختصر سا اقتباس حد درجہ معنی خیز ہے۔

"ہمیں معلوم ہے کہ حکومت نے اب تک جس روتیے کا اظہار کیا ہے وہ یہ ہے کہ فوج کو ہندوستانی بنانے کی سکیم کے دائرے کو اس وقت تک وسیع نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ موجودہ خالی اسامیوں کے لئے موزوں امیدواروں کی ایک بڑی تعداد میسر نہیں آتی۔
لیکن اگر ہم انسانی اور عملی نقطہ نگاہ سے اس مسئلہ کا جائزہ لیں۔ اور اس بات کو بھی پیش نظر رکھیں کہ موزوں امیدواروں کی نفسیاتی کیفیت کس قسم کی ہوتی ہے تو ہمیں یقین ہے کہ جب تک حکومت اپنے مذکورہ بالا روتیے پر قائم ہے بھرتی کی رفتار میں کسی قسم کی ترقی کی کوئی امید نہیں"

گویا سکین کمیٹی نے خود حکومت کو ملزم قرار دیا تھا کہ وہ فوج کو ہندوستانی بنانے کی سکیمیں تو وضع کرتی ہے، لیکن چونکہ اس کی اپنی نیت خراب ہے اس لئے ان سکیموں سے حسب خاطر نتائج بر آمد نہیں ہوں گے۔

لکھنؤ کے مشہور اینگلو انڈین اخبار، پائنیر نے جس کا ایڈیٹر انگریز تھا. اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے ۱۴۔ جنوری ۱۹۳۹ء کے مقالہ افتتاحیہ میں واشگاف طور پر لکھا تھا۔

"ہم حیران ہیں کہ اس کمیٹی کے قائم کرنے سے حکومت کا مقصد کیا ہے۔ اور جس طریقے سے انڈین ملٹری اکیڈیمی میں بھرتی کی جاتی ہے اس پر بحث کرنے سے فائدہ کیا ہے؟ اکیڈیمی میں تو قطعاً کوئی خرابی نہیں، اور نہ کبھی کسی نے اکیڈیمی کے نقائص کی شکایت کی ہے۔
ہم یہ بھی نہیں باور کر سکتے کہ اس وسیع و عریض ملک کی کروڑوں انسانوں کی آبادی اس قدر تہی دامن اور تہی دست ہو گئی ہے کہ سال بھر میں ایسے چند درجن نوجوانوں کا میسر آنا بھی ناممکن ہے جو فوجی افسر بننے کی

صلاحیت رکھتے ہوں۔ اصل شکایت یہ ہے کہ فوج کو ہندوستانی بنانے کا جو طریق حکومت نے اختیار کیا ہے وہ ناقص ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اکیڈمی میں موزوں امیدوار نہیں آتے۔ سکین کمیٹی نے بھی اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ جب تک حکومت اپنا طرز عمل نہیں بدلے گی یہ شکایت بدستور قائم رہے گی۔

اگر اس شکایت کا تدارک نہ کیا گیا، اور فوج کو صحیح معنوں میں ہندوستانی بنانے کی حقیقی کوشش نہ کی گئی تو محض بھرتی کے مسئلہ پر غور و فکر کرتے رہنا گویا اندھیرے میں ٹاک ٹوئیے مارنے کے برابر ہو گا۔ ہم صاف لفظوں میں موجودہ کمیٹی کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ حکومت کو مطلع کر دے کہ جب تک سکین کمیٹی کی سفارشات پر عملدر آمد نہیں کیا جاتا، اس ضمن میں کسی نوع کی مزید سفارش کرنا قطعی بے سود ہے"[1]۔

یہی وجوہ تھیں جن کی بناء پر مسٹر جناح نے مسلم لیگ پارٹی سے مشورہ کرنے کے بعد اس کمیٹی کی شرکت سے انکار کیا تھا۔ اس پر مستزاد یہ ہوا کہ کانگرس نے بھی شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ اس کے باوجود حکومت نے کمیٹی مقرر کر دی۔ اور اصحاب ذیل کو اس کے ممبر نامزد کیا۔

سر اے۔ پی۔ پٹرو، آنریبل رائے بہادر رام سرن داس، ممبر کونسل آف سٹیٹ، آنریبل وی۔ وی۔ کالیکرے، ممبر کونسل آف سٹیٹ، آنریبل نواب زادہ خورشید علی خاں، ممبر کونسل آف سٹیٹ، کیپٹن سر شیر محمد خاں، ممبر مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی، کیپٹن سردار بہادر دلیپ سنگھ، ممبر مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی، لیفٹنٹ کرنل ایم۔ اے۔ رحمٰن، ممبر مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی، خان بہادر نواب مظفر خان ایم۔ ایل۔ اے (پنجاب)، سر جوگندر سنگھ، ڈاکٹر بی۔ ایس۔ مونجے، مسٹر سی۔ ایم۔ جی اگلوی، بریگیڈئر آر۔ ڈی۔ انسکپ۔

غور فرمانے کی بات یہ ہے کہ نواب خورشید علی خاں، کونسل آف سٹیٹ کی مسلم لیگ پارٹی کے رکن آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے رکن اور پنجاب مسلم لیگ آرگنائزنگ کمیٹی کے رکن تھے۔

کیپٹن سر شیر محمد خاں، مرکزی اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کے رکن، آل انڈیا مسلم لیگ کونسل

---

1- "The Pioneer" (Lucknow) Editor ' Desmond Young

کے رکن اور پنجاب مسلم لیگ آرگنائزنگ کمیٹی کے رکن تھے۔

خان بہادر نواب مظفر خاں، آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے رکن، پنجاب اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کے رکن اور پنجاب مسلم لیگ آرگنائزنگ کمیٹی کے رکن تھے۔

معتمداً ان تینوں اصحاب کا سینڈھرسٹ کمیٹی میں شریک ہونا مسلم لیگ کی پالیسی اور مسٹر جناح کے فیصلے کے قطعی خلاف تھا۔ اس سارے کھیل کے پس پردہ، سرسکندر حیات کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ اور انہیں کی سفارش پر حکومت ہند نے ان تین اصحاب کو نامزد کیا تھا۔ اور ستم ہے کہ تینوں پنجابی تھے۔ کرنل رحمٰن البتہ مرکزی اسمبلی کے سرکاری نامزد ممبر تھے۔

میں نے اس واقعہ کا ذکر اس لئے کرنا بھی ضروری سمجھا ہے کہ آگے چل کر جب مسلم لیگ اور سرسکندر کے درمیان متعدد اختلافات رونما ہوئے تو یہ واقعہ بھی موضوع بحث بنا تھا۔

۲۴۔ نومبر ۱۹۳۸ء کو ایک دلچسپ اور نتیجہ خیز واقعہ پیش آیا، یعنی کلکتہ کے مسلمانوں نے ہفتوں کی شدید ایجی ٹیشن کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کو عیدین کی نمازوں کی امامت سے برطرف کر دیا۔ مولانا کچھ دیر تو ڈٹے رہے کہ میں امامت سے دست کش نہیں ہوتا۔ لیکن جب شور و شر بڑھا اور مسلمانوں نے سخت دھمکیاں دیں تو انہوں نے اعلان کر دیا کہ آئندہ میں امامت نہیں کروں گا۔

مولانا ابوالکلام کی ذات مدت سے مسلمانوں کی قومی اور اجتماعی زندگی میں سخت انتشار کا موجب بنی ہوئی تھی۔ بنگال میں وہ مولوی فضل حق کی وزارت تڑوانے میں شب و روز کوشاں رہتے تھے۔ ۱۹۳۷ء میں محض انہی کی رخنہ اندازی کے باعث یو۔ پی میں مسلم لیگ اور کانگرس کی کولیشن وزارت قائم نہ ہو سکی اور خانہ جنگی کی ابتداء ہوئی۔ صوبہ سرحد میں انہوں نے صاحب زادہ عبدالقیوم کی وزارت تڑوا کر کانگرس کی کولیشن وزارت قائم کروائی۔ آسام میں انہوں نے سعداللہ کی وزارت تڑوا کر گوپی ناتھ بار دولائی کی کانگرسی کولیشن وزارت بنوائی، حالانکہ کانگرس کا دعویٰ تھا کہ وہ کسی نوع کی کولیشن گوارا نہیں کر سکتی۔

بنگال اور پنجاب دو بڑے صوبے مسلمانوں کے رہ گئے تھے۔ یہاں کانگرس کی پالیسی کیا تھی، اس کا جواب کانگرس کے صدر، سوبھاش چندر بوس کی زبانی سنیے، جنہوں نے ۲۶ دسمبر ۱۹۳۸ء کو بمبئی کی ایک پریس کانفرنس میں فرمایا:

"بنگال کی وزارت میں ردو بدل کرنے کا سوال اس وقت پیدا ہو گا جب موجودہ وزارت ٹوٹے گی۔ سردست اس مسئلہ پر کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ جہاں تک آسام کا تعلق ہے کانگرس کی ورکنگ کمیٹی وہاں کولیشن

قائم کرنے کا اصول منظور کر چکی ہے۔ رہا بنگال اور پنجاب کا معاملہ، جب ان صوبوں کی وزارتیں ٹوٹیں گی، تو یہ معاملہ عملی طور پر حل کیا جائے گا۔

اس مسئلے کے متعدد پہلو ہیں۔ مثلاً یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کانگرس کسی صوبے کی نئی وزارت میں خود شریک نہ ہو، بلکہ باہر رہ کر اس کو تقویت پہنچائے، جیسا کہ ہم نے سندھ میں کیا ہے۔ بنگال اور پنجاب میں ہم سندھ کا فارمولا اختیار کریں گے یا آسام کا۔ اس کا فیصلہ حالات و واقعات کے مطابق کیا جائے گا۔

اگر بنگال کے کانگرسی لیڈر یہ محسوس کرتے ہیں کہ کولیشن وزارت کا قیام کانگرس کے لئے مفید ہے تو یقیناً کولیشن ہی قائم ہو گی۔ اور کانگرس کی ورکنگ کمیٹی سے اس کی اجازت حاصل کرنا ہو گی۔ یہ صحیح ہے کہ کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے ابتداء میں یہی اصول طے کیا تھا کہ ہم کسی قسم کی کولیشن میں شامل نہیں ہوں گے۔ لیکن اب یہ اصول ترک کر دیا گیا ہے۔ پالیسی کا ردّ و بدل ہر صوبے کے جداگانہ حالات کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر کسی صوبے کے حالات کا تقاضا ہے کہ کولیشن وزارت قائم کی جائے تو کانگرس اس کی اجازت دے دے گی"[1]

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ کانگرس کی کوئی پالیسی نہ تھی۔ اور اگر تھی تو صرف یہ کہ مسلمانوں کی قومی جمعیت کو برہم کر کے ان میں انتشار پھیلایا جائے۔ ایک فریق کو شہہ دے کر دوسرے فریق سے لڑایا جائے۔ اور جب اس باہمی رقابت سے ان کی وزارتیں ٹوٹیں تو کانگرس آگے بڑھ کر ایک فریق کا ہاتھ تھام لے اور اپنی وزارت قائم کر لے۔

تاریخ ہند کا ایک مبتدی طالب علم بھی جانتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی بالا دستی قائم کرنے کے لئے پشاور سے لے کر راس کماری تک یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے نفاذ کے بعد کانگرس کا ہرگز مقصد یہ نہیں تھا کہ انگریزوں سے کیونکر لڑا جائے۔ بلکہ اس کا تنہا مقصد یہ تھا کہ مسلم لیگ کو جلد از جلد ختم کیا جائے، تاکہ برطانوی حکومت سے پورے ہندوستان کا سودا چکایا جا سکے۔

---

۱۔ روز نامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ"۔ لاہور۔ مورخہ ۲۸ دسمبر ۱۹۳۸ء

اگر اس پالیسی کا کوئی گوشہ پوشیدہ رہ گیا تھا تو اس کی نقاب کشائی ستیہ مورتی نے کر دی۔
ستیہ مورتی کوئی معمولی حیثیت کے آدمی نہ تھے۔ وہ ہندوستان کی مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی میں کانگرس پارٹی کے ڈپٹی لیڈر اور مدراس میں راج گوپال اچاری کے بعد کانگرس کے سب سے بڑے رہنما تھے۔

انہوں نے ۲۰۔ دسمبر ۱۹۳۸ء کو بمبئی کے کانگرس ہوس میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"اس وقت ہندوستان کے گیارہ میں سے آٹھ صوبوں پر کانگرس حکومت کر رہی ہے۔ امید ہے کہ بہت جلد نو یا دس صوبے اس کے قبضے میں آ جائیں گے۔ ہمارا اگلا قدم یہ ہو گا کہ گیارہ کے گیارہ صوبوں پر کانگرس کی حکومت قائم کی جائے۔ کانگرسی وزارتیں دوسری تمام وزارتوں سے بہتر کام کر رہی ہیں۔ اور لوگوں کو چاہئے کہ ان کی پوری مدد کریں۔

جو قدم ہم اس کے بعد اٹھانا چاہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ تمام صوبوں میں مخلوط انتخاب رائج کیا جائے۔ اور اس کا نفاذ صوبہ وار ہو گا۔ بمبئی اور مدراس کو پنجاب کا انتظار نہیں کرنا چاہئے" [1]۔

رعونت، تکبر، تبختر، خود سری اور فرعونیت کی اس سے بڑی مثال مشکل ہی سے کہیں ملے گی. جداگانہ انتخاب کا اصول برطانوی پارلیمنٹ نے ۱۹۰۹ء میں منظور کیا تھا۔ ۱۹۱۴ء کے میثاقِ لکھنؤ میں کانگرس نے اسے بطیبِ خاطر قبول کر لیا تھا۔ ۱۹۳۲ء میں برطانیہ کے وزیر اعظم ریمزے میکڈانلڈ نے جو کمیونل ایوارڈ صادر کیا تھا اس کی بنیادی شق بھی یہی جداگانہ انتخاب تھا، جسے ایک آل انڈیا مسئلہ کی اہمیت حاصل تھی۔ اور جس کا تصفیہ صرف مسلمانوں کی رضامندی اور منظوری سے ہو سکتا تھا۔ کسی صوبے کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ اپنے طور پر جداگانہ انتخاب کا اصول ترک کر کے مخلوط انتخاب اختیار کر لے۔ لیکن ستیہ مورتی کا تعلّی آمیز اعلان ملاحظہ فرمانے کے بعد سوچنا چاہئے کہ ہندوستان کے مسلمان جن حالات سے دوچار تھے. ان سے نپٹنے کی آخر کیا صورت ہو سکتی تھی۔

۲۰۔ دسمبر ۱۹۳۸ء کے روزنامہ ٹائمز آف انڈیا، بمبئی میں جو خبر درج ہے۔

"پیر کے روز کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے موجودہ اجلاس میں نہایت

---

۱۔ "Times of India" ' Bomby December 21' 1938.

راز داری کے ساتھ اس مسئلہ پر بحث ہوتی رہی کہ بنگال میں کانگرس کی
کولیشن وزارت کیوں کر قائم کی جائے۔ اس وقت بنگال اسمبلی میں
کانگرس کے حامیوں کی تعداد ۱۱۰ ہے۔ اگر رانجن سرکار۲۔ بھی ساتھ آ
ملیں، تو اس تعداد میں بیس سے لے کر بتیس تک مزید ممبروں کا اضافہ ہو
جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت ورکنگ کمیٹی میں رانجن سرکار سے جو
مذاکرات جاری ہیں ان کو بے حد اہمیت دی جا رہی ہے۔

سر دست یہ کہنا مشکل ہے کہ بمبئی میں اس وقت کانگرس کی ورکنگ
کمیٹی کے سامنے اس مسئلے کی کون کون سی تفصیلات پیش ہیں۔ لیکن یہ بات
تو قطعی یقینی اور شک وشبہ سے صاف ہے کہ زیر بحث مسئلہ صرف یہ ہے کہ
بنگال میں ایسی کولیشن وزارت قائم کی جائے جس میں کانگرس کو زبردست
حیثیت حاصل ہو"۔

مولانا ابوالکلام کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے، اس شرانگیز مہم میں برابر کے شریک تھے، بلکہ صحیح تر یہ ہو گا کہ شریک غالب تھے۔ جب بنگال کے مسلمانوں کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا تو انہوں نے تنگ آ کر وہ امامت ہی ان سے چھین لی، جس کے زور پر وہ امام الہند کہلاتے تھے۔

نواب اسمٰعیل خاں، آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے رکن اور یوپی صوبہ مسلم لیگ کے صدر تھے۔ ان کی حیثیت ہر اعتبار سے نہایت وقیع اور بلند پایہ تھی۔ انہی دنوں وہ کہیں دو ایک بار مولانا ابوالکلام آزاد سے ملے تو اخباروں میں چرچا ہوا اور قسم قسم کی افواہیں اڑنے لگیں۔ مسٹر جناح اگرچہ نواب اسمٰعیل خان کی بڑی عزت کرتے تھے لیکن وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی جھگڑے کا تصفیہ کرنے کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی ایک فریق تسلیم کیا جائے۔ مولانا چونکہ اپنی جداگانہ حیثیت کو کانگرس میں مدغم کر چکے تھے اس لئے ہندو مسلم مذاکرات میں وہ اصولاً کسی فریق کی نمائندگی کے اہل نہ تھے۔ اس ضمن میں جو اخباری بیان مسٹر جناح نے دیا میں اس کا اردو میں ترجمہ کر کے اس کی دلآویزی کو خراب کرنا نہیں چاہتا۔

---

۲۔ رانجن سرکار، مولانا فضل الحق کی وزارت میں وزیر خزانہ تھے۔ کانگریس انتہائی کوشش کر رہی تھی کہ ان کو توڑ کر اپنے ساتھ ملا لیا جائے۔

لہٰذا نیچے حاشئے میں وہ انگریزی کا بیان نقل کرتا ہوں ا ۔

مسٹر جناح نے ۱۸۔ اپریل ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس خصوصی منعقدہ کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

"کانگرس نے اس وقت جو پالیسی اختیار کر رکھی ہے میرے نزدیک وہ ایک تباہ کن غلطی کا ارتکاب کر رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کانگرسی ہائی کمان کے پیش نظر سوائے موقع پرستی اور تکبر و نخوت کے اور کچھ نہیں۔ اتفاق سے آج کانگرس ہندوستان کی سب سے بڑی اور سب سے طاقت ور جماعت ہے۔ چنانچہ کانگرسی لیڈر نشے میں سرشار ہو کر ملک کی ہر جماعت کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ابھی سے اپنے آپ کو ہندوستان کے حکمران سمجھنے لگے ہیں۔

وہ خیال کرتے ہیں کہ چھ صوبے تو انہوں نے بلا شرکت غیرے۔ فتح کر ہی لئے ہیں اور ساتویں میں وہ فریق غالب کی حیثیت سے برا جمان ہیں۔ کیونکہ شمال مغربی صوبہ سرحد میں جو کولیشن وزارت قائم ہے اس میں کانگرس پارٹی کو اکثریت حاصل ہے۔ لہٰذا فتح و شادمانی کے نقارے بجا بجا کر وہ اعلان کر رہے ہیں کہ اب چند روز میں باقی چار صوبے بھی کانگرس ہائی کمان کے لشکر جرار کے سامنے ہتھیار ڈال دیں گے۔

میں ایسی ہر پالیسی کا خیر مقدم کرتا ہوں جس کا مقصد یہ ہے کہ خود بھی زندہ رہو اور دوسروں کو بھی زندہ رہنے دو۔ میں سیاسی اور اقتصادی امور میں باہمی اشتراک و تعاون کرنے کا بھی حامی ہوں۔ لیکن میں بہانگ دہل

---

As many inquiries have been made with regard to the alleged recent meeting of Nawab Ismail Khan with Maulana Abul Kalam Azad and a certain amount of misunderstanding has been created in the mind of public by the Press Reports, I wish to make it clear that if Nawab Ismail Khan met Maulana Abul Kalam Azad he had neither authority from the Executive Council of the Muslim League nor had I any knowledge of it. I strongly deprecate any member of the Muslim League going to Maulana Abul Kalam Azad and thereby recognising his pretensions, directly or indirectly, that he hold the Islamic portfolio in the Congress High Command.

"Times of India," Bombay.
(December, 21,1938)

اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ ہم اپنی جداگانہ قومی ہستی کو مٹا کر کانگرس میں جذب ہونا کبھی گوارا نہیں کریں گے۔ کانگرس ہائی کمان نے جسے ورکنگ کمیٹی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، ایک ڈکٹیٹر شپ کی حیثیت اختیار کرلی ہے اور یہ آمرانہ ادارہ دوسری تمام جماعتوں کو مٹا کر اپنے آپ کو ہندوستان کی "شیڈو کیبنٹ" سمجھتا ہے" [۱]۔

ہندوستان میں جناح کے دوست بھی تھے اور دشمن بھی، حامی بھی تھے اور مخالف بھی، اس کو اچھا کہنے والے بھی تھے اور برا کہنے والے بھی۔ لیکن میں ہر غیر جانب دار، مخلص، دیانتدار، بااصول اور درد مند انسان سے عرض کرتا ہوں کہ کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کا طرز عمل دیکھ لیجئے، سوبھاش چندر بوس اور ستیہ مورتی کے مذکورہ بالا بیان پڑھ لیجئے اور پھر سینے پر ہاتھ رکھ کر بتائیے کہ کیا جناح کی جنگ محض حفاظتِ خود اختیاری کی جنگ نہ تھی؟ اور کیا مسلم لیگ کا طرز عمل سراسر مدافعانہ طرز عمل نہ تھا؟

کانگرس کھلے بندوں پنجاب، بنگال، سرحد، سندھ کے صوبے فتح کرنے کا اعلان جنگ کر رہی تھی۔ کانگرس نے یوپی، سی پی، بہار، مدراس، بمبئی اور اڑیسہ میں مسلمانوں کی جداگانہ قومی ہستی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کانگرس مسلمانوں کی رضامندی اور صوابدید کے بغیر، ہم سے جداگانہ انتخاب کا حق چھیننے کا پروگرام بنا رہی تھی۔

ان حالات میں صاف سیدھا سوال ہے کہ ہم کیا کرتے اور ہمیں کیا کرنا چاہئے تھا؟ مسٹر جناح نے کلکتہ ہی کے اجلاس مسلم لیگ میں ۱۸۔ اپریل ۱۹۳۸ء کو اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا تھا:

"مسلمان ایک سے زیادہ مرتبہ واضح کر چکے ہیں کہ مذہب، کلچر، زبان اور شخصی قوانین (پرسنل لاء) کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جس کے ساتھ ہماری موت اور زندگی وابستہ ہے اور جس پر ہماری تقدیر اور ہمارے مستقبل کا انحصار ہے، یعنی اس ملک میں اپنے سیاسی حقوق کا تحفظ کرنا، اور

---

[۱] روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" لاہور۔ مورخہ ۱۹ اپریل ۱۹۳۸ء انگلستان کی پارلیمنٹ میں حکومت کے مدمقابل، حزب مخالف بھی اپنا ایک کابینہ مرتب کرتا ہے۔ جس میں حکومت کی طرح مختلف وزارتیں مختلف ارکان کے سپرد کی جاتی ہیں۔ مثلاً وزیر اعظم کے مقابل حزب مخالف کا لیڈر بیٹھتا ہے۔ وزیر خارجہ کے مقابل حزب مخالف کا وزیر خارجہ بیٹھتا ہے۔ وزیر خزانہ کے مقابل حزب مخالف کا وزیر خزانہ بیٹھتا ہے۔ اس طرح حزب مخالف کے اس مصنوعی کابینہ کو اس ملک کی اصطلاح میں "شیڈو کیبنٹ" کہتے ہیں۔

اس ملک کی قومی زندگی، یہاں کی حکومت اور یہاں کے نظم و نسق کے جملہ اداروں میں اپنا جائز حصہ لینا۔

مسلمان آخری دم تک اس حق کے لئے لڑیں گے۔ ہندو راج قائم کرنے کے خواب درہم برہم ہو کر رہیں گے۔ ہم کبھی اپنے جداگانہ قومی وجود کو مٹنے نہیں دیں گے، اور جب تک زندگی کی رمق ہم میں موجود ہے ہم ہرگز شکست قبول نہیں کریں گے" ا۔

میری ناچیز رائے میں مسلم لیگ کی تحریک کی غرض و غایت ابتداء سے یہی تھی جس کا ذکر مسٹر جناح نے ان چند الفاظ میں کر دیا ہے، یعنی مسلمانوں کے لئے اس ملک کی حکومت اور یہاں کے نظم و نسق کے جملہ اداروں میں اپنا جائز مقام حاصل کرنا۔ مذہب ہو یا کلچر، زبان ہو یا شخصی قوانین، عزت و آبرو ہو یا جان و مال، ان کا تحفظ قطعی ناممکن ہے، جب تک سیاسی طاقت ہاتھ میں نہ ہو۔ اس لحاظ سے مسلم لیگ کی پالیسی جس نے آگے چل کر تحریک پاکستان کی صورت اختیار کی، کلیتہً ایک سیاسی تحریک تھی، جس کی بنیاد مسلمانوں کے حق خود ارادی پر تھی۔ ا۔

ہندوستان میں مدت سے یہ روایت چلی آ رہی تھی کہ وائسرائے کرسمس کی تقریب ہمیشہ کلکتہ میں مناتا تھا۔ اور اس موقع پر ایک اہم تقریر بھی کرتا تھا جس کا تعلق ہندوستان کی سیاست اور برطانیہ کی پالیسی سے ہوتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۔ دسمبر ۱۹۳۸ء کو وائسرائے نے ایسوی ایٹڈ چیمبرز آف کامرس کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت جملہ صوبائی وزارتیں نہایت اچھا کام کر رہی ہیں اور اہل ہند کو چاہئے کہ مجوزہ فیڈریشن کے قیام میں میری مدد کریں۔

یہ دونوں باتیں ہمارے نزدیک غلط تھیں۔ اول اس لئے کہ کانگرسی صوبوں کی وزارتیں سراسر مسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف سرگرم عمل تھیں اور دوسرا یہ کہ اگر ہندوستان میں مجوزہ

---

ا۔ روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ"۔ لاہور۔ مورخہ ۱۹ اپریل ۱۹۳۸ء

ا۔ مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے خیالات و عقائد سے مجھے بہت کم اتفاق ہے۔ لیکن ایک بات انہوں نے بے نظیر کہی تھی جس کی داد نہ دینا جرم ہے۔ عام علماء کے طرز عمل کے خلاف مولانا ہمیشہ ننگے سر پھرتے تھے۔ نہ ٹوپی اوڑھتے نہ عمامہ باندھتے۔ ایک دفعہ کسی نیاز مند نے بڑے ادب سے عرض کیا کہ حضور، کم سے کم ٹوپی تو پہن لیا کیجئے۔ مولانا نے برہم ہو کر فرمایا، کیا کہتے ہو، میری ٹوپی تو اسی دن اتر گئی تھی جس دن دلی کے لال قلعہ سے مغلوں کا جھنڈا اترا اور انگریزوں نے اپنا جھنڈا گاڑا تھا۔

مولانا کے اس ارشاد گرامی میں عبرت و بصیرت کی ایک دنیا آباد ہے۔ (مصنف)

فیڈریشن قائم ہو گیا تو اقلیت کے صوبوں کے علاوہ مسلم اکثریت کے صوبوں پر بھی مستقل ہندو راج مسلط کر دیا جائے گا۔ چنانچہ مسٹر جناح نے وائسرائے کی اس تقریر کے جواب میں فرمایا:۔

"وائسرائے نے مجوزہ فیڈریشن کی حمایت کرتے ہوئے بڑے پُرزور لہجے میں یہ بھی کہا ہے کہ صوبائی وزارتیں بہت اچھا کام کر رہی ہیں۔ ان کے ان الفاظ نے مجھے کسی قدر پریشان کر دیا ہے۔

ہمیں گزشتہ ڈیڑھ سال میں جو تلخ تجربہ ہوا ہے، اس نے آئندہ تمام امیدوں پر پانی پھیر کر رکھ دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وائسرائے اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں کہ کانگرسی صوبوں کی حکومتیں ان جمہوری خطوط پر ہرگز کام نہیں کر رہی ہیں جو پارلیمنٹری نظام کی بنیادی شرط ہیں، بلکہ سراسر فاشی اور آمرانہ نظام کے تحت عمل پیرا ہیں اور ان کی پشت پر برطانوی فوج اور پولیس موجود ہے۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، انہیں کانگرسی صوبوں کے اکثر مقامات پر سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ مسلمانوں کو کچلنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ گورنر سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔ اور اپنے اختیارات خاص کے باوجود مسلمانوں کی حفاظت کرنے میں قطعی ناکام رہے ہیں۔

شفتالو کا وہ پیڑ جو صوبوں میں لگایا گیا تھا بار آور نہیں ہو سکا اور مرجھا رہا ہے۔ اب اسی پیڑ کو وائسرائے دہلی میں جمنا کے ریتے پر اگانا چاہتا ہے۔ اور دعویٰ یہ ہے کہ اس کلیتہً مصنوعی اور سراسر غیر فطری سکیم کے تحت ہندوستان کے برصغیر کی وحدت قائم رکھی جا سکے گی۔ مَیں پوچھتا ہوں کہ کیا ہندوستان کی سیاسی اور اقتصادی یک جہتی کے حصول کا یہی طریقہ ہے؟ وائسرائے کے نزدیک یہ یک جہتی تمام دیگر ضرورتوں اور مصلحتوں پر مقدم ہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے فیڈریشن کی سکیم کے جملہ نقائص اور خامیوں کی طرف سے بھی آنکھیں بند کر لی ہیں۔

اگر حکومت نے زبردستی ہندوستان پر فیڈریشن مسلط کیا تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کے نتائج معاہدۂ ورسائی سے بھی زیادہ تباہ کن ثابت ہوں

گے۔ دنیا جانتی ہے کہ اس بدقسمت معاہدے کی رُو سے چیکوسلواکیہ کی ایک مصنوعی ریاست قائم کی گئی تھی، جس میں مختلف نسلوں اور فرقوں کے قطعی متضاد و مخالف اور متصادم عناصر کو یکجا کر کے ایک نام نہاد پارلیمنٹری جمہوریت کے تحت باندھ دیا گیا تھا۔

وائسرائے چونکہ ہندوستان سے غیر حاضر رہے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ حالات سے بے خبر ہیں۔ ورنہ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ فرقہ وارانہ اتحاد کی تمام امیدیں کانگرسی فاشزم کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو چکی ہیں۔ اس کا تازہ ترین ثبوت وہ خط ہے جو کانگرس کے صدر مسٹر سوبھاش چندر بوس نے مجھے ۱۶۔ دسمبر کو بھیجا تھا اور جو چند روز ہوئے اخباروں میں بھی شائع ہو گیا ہے۔

جب تک کانگرس ہائی کمان اس بے بنیاد اور مضحکہ خیز دعوے سے باز نہیں آتی کہ تنہا کانگرس ہندوستان کے تمام باشندوں کی نمائندگی کی اہل ہے، اس وقت تک ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی تصفیہ نہیں ہو سکتا۔ آل انڈیا مسلم لیگ، مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ چاہے کچھ ہو، ہم اپنے اس بنیادی اصول کو برقرار رکھنے کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنا گوارا کریں گے" ۱۔

پنجاب میں مسلم لیگ کی سرگرمیاں بالکل ٹھنڈی پڑ چکی تھیں۔ اور حالات اس قدر مایوس کن تھے کہ مستقبل قریب میں بھی کوئی توقع نہ تھی کہ صوبائی لیگ از سر نو بحال ہو سکے گی۔ دسمبر ۱۹۳۸ء کے اوائل میں میں نے اور ملک برکت علی نے مشترکہ دستخطوں سے ایک اخباری بیان شائع کیا کہ یونینسٹ پارٹی کو ختم کرنے کا صرف یہی ایک طریق باقی رہ گیا ہے کہ سب جماعتیں اپنے اپنے باہمی اختلافات کے باوجود، یونینسٹ پارٹی کے خلاف ایک مشترکہ محاذ بنائیں۔

ہمارے اس بیان کے چھپتے ہی یونینسٹ پارٹی کے حلقوں میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ روزنامہ زمیندار نے ایک زہر آلود اداریہ مقالہ لکھا، جس میں مجھے تو ایک بے حقیقت شخص سمجھ کر نظرانداز کر دیا اور سارا نزلہ ملک صاحب پر گرایا۔ اور یہاں تک لکھ دیا کہ ملک برکت علی، مسلم لیگ سے مستعفی ہو گئے ہیں۔ حالانکہ یہ سراسر بہتان تھا۔

---

۱۔ روزنامہ "ٹائمز آف انڈیا" بمبئی۔ مورخہ ۲۱ دسمبر ۱۹۳۸ء

ملک صاحب بڑے بُردبار اور متحمل مزاج آدمی تھے۔ لیکن "زمیندار" کا مقالہ افتتاحیہ پڑھ کر طیش میں آ گئے۔ اور فوراً ایک بیان لکھ کر سول اینڈ ملٹری گزٹ اور روزنامہ ٹریبون دونوں کو بھیجا۔ سول نے تو شائع نہ کیا، البتہ ٹریبون میں چھپ گیا۔

ملک صاحب نے "زمیندار" کو یہ کہہ کر آڑے ہاتھوں لیا کہ اگر سر سکندر کی مدح و ستائش اور دربار داری کرتے کرتے اس اخبار نے حق و صداقت کی بجائے کذب و افترا کا مسلک اختیار کر لیا ہے تو بے شک "زمیندار" کو یہ روش مبارک ہو۔ لیکن جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے۔

"میں اوّل و آخر مسلم لیگی ہوں اور میری وفاداری اور عقیدت مسلم لیگ اور صرف مسلم لیگ سے ہے۔ میں نے اس وقت بھی مسلم لیگ کا پرچم فضا میں بلند رکھا اور اسے اپنے ہاتھ سے گرنے نہیں دیا جب گزشتہ الیکشن میں یونینسٹ پارٹی کے لیڈر نے جو آج پنجاب کے وزیر اعظم ہیں اپنی پارٹی کی طاقتوں کو مجتمع کر کے مجھے شکست دینے کے لئے میرے خلاف محاذ بنایا تھا۔ میرا قصور صرف یہ تھا کہ میں مسٹر جناح اور مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑا ہوا تھا اور یونینسٹ پارٹی کا ٹکٹ لینے اور اس پارٹی کے لیڈر کی خوشامد کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

میں نے اس وقت بھی مسلم لیگ کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، جب الیکشن ختم ہونے کے بعد موجود وزیر اعظم، پنجاب وزارتوں اور پارلیمنٹری سیکرٹریوں کے منصب اپنے ہوا خواہوں میں تقسیم کر رہے تھے اور ان کی یہ بخششیں اس حد تک عام ہو گئی تھیں کہ اس شخص کو بھی انہوں نے خرید لیا جو میرے ساتھ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر اسمبلی کا ممبر منتخب ہوا تھا۔

بعد میں جب مسلم لیگ کی چڑھتی ہوئی لہر اٹھی تو سر سکندر، خوف زدہ ہو کر بھاگے بھاگے لکھنؤ پہنچے۔ جہاں انہوں نے اپنے آپ کو میرے لیڈر، یعنی مسٹر جناح کے قدموں پر گرا دیا۔ یہ دیکھ کر میں نے بحیثیت ایک مسلم لیگی کے انہیں اپنی امداد و اعانت کا پورا یقین دلایا۔ لیکن واپس آ کر جب انہوں نے اپنے پروں کے نیچے سے پنجے نکالے اور مسلم لیگ پر قبضہ کر کے اسے یونینسٹ پارٹی کی ایک شاخ بنا کر رکھ دیا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ لیگ کو موت کی نیند سلانے کی کوشش کی تو میں نے اس طرز عمل کے خلاف

شدت سے آواز بلند کی۔ اور قطعاً پروا نہ کی کہ سر سکندر ناراض ہوتے ہیں یا اردو کے وہ دو اخبار کیا شور مچاتے ہیں جن کو سر سکندر نے اپنی پارٹی کے وسیع سرمائے سے قبضے میں لے رکھا ہے۔

میں اپنے مسلمان بھائیوں کو یقین دلاتا ہوں کہ دنیا کی کوئی طاقت مجھے مسلم لیگ سے ایک انچ اِدھر اُدھر نہیں ہٹا سکتی۔ لیگ کے نصب العین اور اغراض و مقاصد پر میرا کامل اعتقاد ہے۔ اور یہی اعتقاد، عمر بھر میری تمام سیاسی سرگرمیوں کی روح رواں رہا ہے۔

اگر سر سکندر کھلے بندوں لیگ کی پیروی کرنے پر آمادہ ہو جائیں اور لیگ کے احکام کو غیر مشروط طور پر یونینسٹ پارٹی کی مصلحتوں پر مقدم رکھیں (حقیقت یہ ہے کہ لیگ کے ساتھ اس قسم کی غیر مشروط پابندی کا عہد باندھنے کے بعد یونینسٹ پارٹی کا وجود بحیثیت ایک مستقل جداگانہ سیاسی جماعت کے خود بخود ختم ہو جاتا ہے) اور مسلم لیگ کے اس جمہوری آئین کے مطابق جو لکھنؤ میں منظور ہوا تھا اور جس کی رُو سے شہری اور دیہاتی طبقات کی تقسیم مٹ جاتی ہے۔ وہ پنجاب بھر میں لیگ کی شاخیں قائم کریں۔ تو میں بحیثیت مسلم لیگ کے ایک ادنے سپاہی کے ان کا شریک و سہیم بننے کو آمادہ ہوں۔ لیکن سب سے اوّل، سب سے مقدم اور سب سے ناقابل ترمیم شرط یہ ہے کہ پہلے یونینسٹ پارٹی کو یکسر ختم کیا جائے۔

اگر وہ ایسا کر دیں تو انہیں مسلم لیگ کے سربراہ کی حیثیت سے یقیناً یہ حق حاصل ہو گا کہ پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کی رضامندی سے ان فریقوں سے جن کے اغراض و مقاصد لیگ سے ملتے جلتے ہیں، ایک کولیشن قائم کریں۔ اس صورت میں ان کے خلاف یہ الزام ہرگز قابل اعتناء قرار نہیں دیا جائے گا کہ وہ لیگ کو ہمیشہ کے واسطے ختم کرنے کی نیت سے درپردہ یونینسٹ پارٹی کے اغراضِ مشؤمہ کو ترقی دے رہے ہیں"۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ۲۶/۲۷۔ دسمبر ۱۹۳۸ء کو پٹنہ (صوبہ بہار) میں ہو

رہا تھا۔ لہٰذا پٹنہ جانے سے چند ہی روز پہلے ملک صاحب کا یہ بیان ٹریبون میں شائع ہو سکا۔

غلام رسول خان اور ملک زمان مہدی نے پٹنہ جانے سے انکار کر دیا۔ خلیفہ شجاع الدین کو بعض خانگی مصروفیتیں تھیں وہ بھی نہ جا سکے۔ البتہ ملک برکت علی، پیر تاج الدین اور راقم التحریر پٹنہ گئے۔ ایک دلچسپ واقعہ یہ ہوا کہ ہمارے ساتھ میاں رمضان علی بھی تشریف لے گئے، جو ریٹائرڈ ڈپوسٹ ماسٹر جنرل تھے اور جن کی ملک برکت علی سے میل ملاقات طالب علمی کے زمانے سے چلی آ رہی تھی۔ پنشن کے بعد وہ بھی عام سرکاری افسروں کی طرح بے کاری سے اکتا گئے تھے اور غالباً کسی شغل کی تلاش میں تھے، سوچا کہ چلو پٹنہ جا کر مسلم لیگ کا میلہ ہی دیکھ آئیں۔ لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ ان کے پیش نظر اور مقاصد بھی تھے جن کی تکمیل انہوں نے نہایت ہوشیاری سے کی۔

ہم ۲۵۔ دسمبر کو صبح کے وقت پٹنہ پہنچے۔ سید عبدالعزیز بیرسٹرایٹ لاء مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔ انہوں نے اجلاس کا انتظام اس وسیع پیمانے پر کیا تھا کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا تھا۔ مہمانوں کے قیام و طعام پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا گیا تھا۔ لکھنؤ کے اجلاس مسلم لیگ کی روح رواں تو راجہ محمود آباد تھے۔ لیکن پٹنہ کے اجلاس کی روح رواں سید عبدالعزیز تھے۔ راجہ صاحب کی طرح وہ کوئی پشتینی رئیس یا تعلقہ دار نہ تھے، بلکہ جو کچھ کمایا تھا پریکٹس سے کمایا تھا۔ اس لئے ان کی دریا دلی غیر معمولی تحسین کی مستحق تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ خاصے مقروض بھی ہو چکے تھے۔

مسٹر جناح کا قیام سید عبدالعزیز کے ہاں تھا۔ اسی شام مجلس انتخاب مضامین یعنی سبجکٹس کمیٹی کا اجلاس منعقد ہونے والا تھا۔ ملک صاحب نے مجھ سے کہا کہ مسٹر جناح سے جا کر مل آؤ۔ اور دیکھو کہ پنجاب کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے۔ چنانچہ میں حاضر ہوا۔ اتفاق سے کمرے میں تنہا بیٹھے کام کر رہے تھے۔ اندر بلا لیا اور پوچھا کہ پنجاب سے کون کون آیا ہے۔

میں نے عرض کیا کہ سر سکندر حیات خاں تو غالباً کل تشریف لائیں گے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے ہمراہ کتنا بڑا لشکر ہو گا۔ لیکن آج صرف، میں ملک برکت علی اور پیر تاج الدین آئے ہیں۔

پوچھا غلام رسول خاں اور زمان مہدی کیوں نہیں آئے؟

میں نے عرض کیا کہ وہ بہت بد دل اور مایوس ہو چکے ہیں اور کہتے ہیں کہ پٹنہ جانے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔

کہنے لگے کہ غلام رسول خاں ضدی آدمی ہے۔

میں نے عرض کیا کہ جو شخص اپنا اصول ترک نہ کرے اور جم کر اپنی جگہ کھڑا ہو جائے، آپ اسے ضدی کہتے ہیں۔

یہ سن کر کسی قدر کبیدہ خاطر ہوئے اور پیشانی پر بل آ گیا۔ پھر فرمایا اور کچھ کہنا چاہتے ہو تو کہو۔

میری جیب میں اس خط کی ٹائپ شدہ نقل تھی جو ہم نے مشترکہ دستخطوں سے یکم دسمبر ۱۹۳۸ء کو مسٹر جناح کی خدمت میں بھیجا تھا۔ (یہ خط اس کتاب کے پہلے باب میں درج کیا گیا ہے) میں نے وہ کاغذ جیب سے نکال کر مسٹر جناح کے ہاتھ میں دے دیا اور عرض کیا کہ آپ کو یاد ہو گا یہ خط ہم نے آپ کی خدمت میں بھیجا تھا۔

ایک نظر دیکھ کر کہنے لگے، ہاں مجھے معلوم ہے۔

میں نے عرض کیا کہ اب صرف دو صورتیں ہو سکتی ہیں یا آرگنائزنگ کمیٹی کو توڑ دیجئے اور پنجاب کی پرانی صوبہ مسلم لیگ کا الحاق کر لیجئے۔ یا نئی آرگنائزنگ کمیٹی قائم کیجئے، جس میں دونوں فریقوں کو مساوی نمائندگی حاصل ہو۔ جب تک یہ نہیں ہو گا، پنجاب کے حالات درست نہیں ہو سکتے۔

فرمایا! ملک برکت علی مجلس عاملہ (ورکنگ کمیٹی) کے رکن ہیں' ان سے کہو یہ معاملہ وہاں پیش کریں۔ ورکنگ کمیٹی فیصلہ کرے گی۔

میں اجازت لے کر واپس آ گیا اور ملک صاحب کو پوری رُوداد سنائی۔ انہوں نے ورکنگ کمیٹی میں یہ معاملہ پیش کرنے کی حامی بھر لی۔

۲۶۔ دسمبر کی صبح کو سر سکندر حیات خاں بھی آ گئے۔ ان کے ہمراہ بیس پچیس آدمی تھے جن میں ملک خضر حیات ٹوانہ، میاں عبدالحیٔ، سید امجد علی، میاں احمد یار خاں دولتانہ، نواب ممدوٹ، بیگم شاہنواز، میر مقبول محمود، سید افضال علی حسنی، میاں امیر الدین، نواب زادہ خورشید علی خاں، میاں مشتاق احمد گورمانی وغیرہ شامل تھے۔ ان کے علاوہ حسب معمول "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کے نامہ نگار میر نور احمد بھی تھے، جن کی حیثیت عملاً سر سکندر کے پریس سیکرٹری کی بن چکی تھی۔ بنگال سے مولوی فضل الحق اور خواجہ ناظم الدین آئے تھے۔

پٹنہ کا یہ اجلاس ہر لحاظ سے قابل دید تھا۔ جوش و خروش کا وہ عالم تھا کہ معلوم ہوتا تھا گویا سمندر لہریں لے رہا ہے۔ آسام سے ایک شخص سکندر شاہ پیدل چل کر آیا تھا۔ اس کا بیان تھا کہ وہ ۷۔ اکتوبر کو اپنے گاؤں سے چلا تھا اور راستے میں تین راتیں اس نے درختوں پر سو کر

گزاریں۔ یوپی، سی پی، بہار کے مسلمانوں کو کانگرسی حکومتوں سے سخت شکایتیں تھیں۔ اور ان کا تقاضا تھا کہ مظالم اور ناانصافیاں برداشت کر کر کے ہمارا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا ہے۔ اب سول نافرمانی کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ ایک قرار داد منظور کی گئی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کو اختیار دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے سول نافرمانی کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرے۔

اس قرار داد کی حمایت میں لیگ کے کھلے اجلاس میں بڑی پر جوش تقریریں ہوئیں۔ سر سکندر نے بلاشائبہ ریب نہایت زور دار تقریر کی۔ اور چاروں طرف سے تالیوں کا وہ شور بلند ہوا کہ سر سکندر اس اجلاس کے ہیرو بن گئے۔ انہوں نے اپنی تقریر کے دوران میں فرمایا:۔

"میں نے ہمیشہ دوسرے صوبوں کے نظم و نسق پر رائے زنی کرنے سے گریز کیا ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بعض کانگرسی صوبوں کی حکومتیں اقتدار کے نشے سے بد مست ہو گئی ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ نو کروڑ مسلمانوں کو نہ تو دبا کر غلام بنایا جا سکے گا اور نہ انہیں اس ملک سے نکالا جا سکتا ہے۔ اگر کانگرس نے رواداری کا سبق نہ سیکھا تو اس کے سوراج کا خواب درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔

اس قرار داد کے محرک اور تائید کنندگان نے جو واقعات بیان کئے ہیں اگر ان کا فوراً سدباب نہ کیا گیا اور اگر وہ آئندہ بھی جاری رہے تو صرف سول نافرمانی ہی شروع نہیں کرنی پڑے گی، بلکہ اس سے بھی برے نتائج ظہور میں آئیں گے۔

لوگ پوچھتے ہیں کہ ایسی صورت میں مسلم اکثریت کے صوبے کیا مدد کر سکیں گے۔ اس ضمن میں کاغذی قرار دادیں کچھ کام نہیں آ سکیں گی۔ نہ گورنر ہی اقلیتوں کی حفاظت کرنے کے قابل ہیں۔ ہاں اگر ضرورت پیش آئی تو میں اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کو یقین دلاتا ہوں کہ پنجاب کا ہر مسلمان اسلام کی حفاظت کے لئے اپنا سر کٹوانے کو تیار ہو جائے گا"۔

سر سکندر نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا کہ

"مسلم لیگ کے کیمپ میں بعض غدار بھی ہیں جو میرے مخالفوں سے

سازباز کر کے مسلم لیگ کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کھلے دشمن کا مقابلہ تو آسان ہے لیکن جو لوگ مار آستین بن کر ڈستے ہیں ان کا سراغ لگانے اور قلع و قمع کرنے کے لئے مہلت درکار ہے۔ بہرحال اب وقت آگیا ہے کہ ان لوگوں کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے اور یہ فرض صوبہ مسلم لیگ انجام دے گی"۔

سر سکندر کے ان الفاظ نے پورے پنڈال کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا کہ موصوف "غدّار" اور "مار آستین" کہہ کہہ کر کن لوگوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ میرے پاس بہار کے جعفر امام بیٹھے تھے۔ راز داری کے لہجے میں مجھ سے پوچھنے لگے کہ سر سکندر کا اشارہ کن لوگوں کی طرف ہے۔

میں نے جواب دیا کہ اس پنڈال میں تو صرف میں اور ملک برکت علی ہی مار آستین بیٹھے ہیں اور ہم دونوں غدّار بھی ہیں۔ ظاہر ہے اشارہ ہماری ہی طرف ہو گا۔ مزید تصدیق کے لئے خود جا کر ان سے پوچھ لیجئے۔

اس پر جعفر امام ہنس پڑے۔

مولوی فضل الحق نے بھی بڑی زور دار تقریر کی۔ اور اپنے مخصوص انداز میں جھوم جھوم کر فرمایا کہ

"اگر مسلم لیگ نے سول نافرمانی شروع کرنے کا فیصلہ کیا تو میں مسلمانان بنگال کی طرف سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہم پوری تن دہی سے اس تحریک کا ساتھ دیں گے۔ ہندوستان کا ہر مسلمان وزیر اپنے منصب پر لات مار کر سول نافرمانی میں شریک ہو گا. بلکہ سب سے پہلے وہی اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کرے گا۔

میں کانگرسی حکومتوں کو متنبہ کرتا ہوں کہ اگر وہ مسلمانوں پر ظلم کرنے سے باز نہ آئیں تو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ بالکل معطل ہو کر رہ جائے گا۔ بلکہ ہمارا فرض ہو گا کہ اسے معطل کر دیں۔ خدا کے فضل سے ہمارے اندر اتنی طاقت ہے کہ ہم غیر کانگرسی صوبوں میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کو بے کار اور بے جان بنا کر رکھ دیں گے"۔

جہاں تک سیاست کی تعلّیوں، لن ترانیوں اور شعبدہ بازیوں کا تعلق ہے، سر سکندر کی تقریر

بے حد کامیاب رہی۔ اور ہندوستان بھر میں تہلکہ مچ گیا۔ پنجاب کے وزیر اعظم کی حیثیت سے ان کا یہ اعلان کرنا کہ میں اسلام کی حفاظت کے لئے اپنی گردن کٹوا دوں گا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ اس تقریر کی گونج کانگرس کے "آنند بھون" سے لے کر لندن کے وائٹ ہال تک پہنچی۔ اور نتیجہ یقیناً وہی نکلا جو ہم چاہتے تھے۔ دوسری قرار داد فیڈریشن کے خلاف اور تیسری قرار داد تقسیم فلسطین کے خلاف منظور کی گئی۔

ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں ملک برکت علی نے پنجاب کے حالات بیان کئے۔ اور بتایا کہ وہاں کوئی مسلم لیگ نہیں اور سیاسی سرگرمیاں بالکل ختم ہو چکی ہیں۔ بہتر ہے کہ آرگنائزنگ کمیٹی کو توڑ دیا جائے۔ اس پر سر سکندر اور ملک صاحب کے درمیان کچھ تیز کلامی بھی ہوئی۔ آخر، سر سکندر حیات خاں نے مسٹر جناح کو اطمینان دلایا کہ واپس جا کر صوبہ مسلم لیگ قائم کرنے کی پوری کوشش کریں گے اور یوں بات جہاں سے چلی تھی وہیں آ ٹھہری۔

پٹنہ ہی کے اجلاس میں، پہلی مرتبہ نواب بہادر یار جنگ حیدر آبادی سے ملاقات ہوئی۔ اور میری طرح اکثر و بیشتر لوگوں نے بھی انہیں پہلی بار وہیں دیکھا تھا۔ وہ نظام کا پراپیگنڈا کرنے کے لئے آئے تھے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ انہوں نے مجھے اور ملک برکت علی کو قطعاً متاثر نہ کیا۔ جس طریقے سے وہ اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی کوشش کر رہے تھے وہ بھی ہمیں پسند نہ آیا۔ برطانوی ہند کی سیاست سے وہ ناواقف تھے۔ پنجاب کے حالات کا توانہیں سرے سے کوئی علم نہ تھا۔

ایک روز وہ ہمارے کیمپ میں تشریف لے آئے۔ اور مجھ سے اور ملک صاحب سے خاصی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ان کا اصرار تھا کہ نظام حیدر آباد کو "ہزمیجسٹی" کا خطاب دلوانا چاہئے۔ میں نے عرض کیا کہ "نواب صاحب! آخر ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارندوں نے اودھ کے نواب غازی الدین حیدر کو بھی تو بادشاہ کا خطاب عطا کر دیا تھا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس خطاب سے نوابان لکھنؤ کی حیثیت میں کوئی بنیادی فرق پڑ گیا تھا؟ جب ضرورت پیش آئی توانہیں کارندوں نے واجد علی شاہ کو پکڑ کر کلکتہ میں قید کر دیا"

اس پر وہ خاموش ہو گئے۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ ہماری باتوں سے مطمئن نہیں تھے۔

اجلاس میں چند لطیفے بھی ہوئے۔ یوں بھی ظاہر ہے جہاں چار مسلمان جمع ہو جائیں، وہاں لطیفوں، چٹکلوں، پھبتیوں اور بذلہ سنجیوں کی کیا کمی ہوتی ہے۔ ستائیس سال گذر چکے ہیں لیکن دو ایک باتیں اب تک یاد ہیں۔ ایک روز سارن پور کے کوئی صاحب میرے پاس تشریف لائے۔ اور کہنے لگے

کہ میں مسجد شہید گنج کی تحریک میں چھ مہینے قید کاٹ چکا ہوں میں نے پوچھا اب کیا ارادہ ہے۔ بولے شہید گنج کی تحریک پھر سے شروع کرنی چاہیئے۔

میں نے خوش فہم آدمی سمجھ کر امیر مینائی کا یہ مقطع پڑھ دیا۔

مری خاک بھی لحد میں نہ رہی امیر باقی
انہیں مرنے ہی کا ابتک نہیں اعتبار ہوتا

کہنے لگے آپ تو خواہ مخواہ مایوس ہو گئے ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ گرجا گھروں میں جا جا کر اذانیں دیں۔

میں بے اختیار ہنس پڑا اور عرض کیا آپ مولوی ظفر علی خاں صاحب سے جا کر ملئے۔ شہید گنج کی تحریک انہوں نے شروع کی تھی اور وہی آپ کو صحیح مشورہ دے سکیں گے۔

سرحد کے سردار اورنگ زیب خاں، نئے نئے مسلم لیگ میں شامل ہوئے تھے اور اپنا مقام پیدا کرنے کے لئے دائیں بائیں ہاتھ مار رہے تھے۔ اجلاس میں سول نافرمانی کی قرار داد پیش ہوئی تو وہ بھی تائید کرنے کے لئے کھڑے ہوئے اور بغیر کسی وجہ اور موقع محل کے کہنے لگے کہ اگر اتاترک فوت ہو گئے ہیں تو کیا ہوا۔[۱] ہمارے پاس دو اتاترک موجود ہیں۔ ایک بنگال کے مولوی فضل الحق دوسرے پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات خاں۔

اجلاس ختم ہوا اور ہم لوگ پنڈال سے باہر نکلے تو اتفاقیہ سر راہ ان سے ملاقات ہو گئی۔ بڑے لحیم شحیم آدمی تھے۔ میں نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ اگر آپ کی کچھ ذاتی اغراض سر سکندر سے وابستہ ہیں تو انہیں پورا کرنے کے بیسیوں طریقے ہیں، اتاترک بچارے کی روح کو آپ جنت میں کیوں پریشان کر رہے ہیں۔

اس پر وہ ہنسے اور دوسری طرف نکل گئے۔

سبجکٹس کمیٹی کے اجلاس میں سب لوگ جمع تھے، لیکن مسٹر جناح ابھی تشریف نہیں لائے تھے۔ ہم نے وقت کٹی کے لئے مولانا ظفر علی خاں سے عرض کیا کہ کچھ سنایئے۔ مولانا اپنا کلام سنا رہے تھے کہ مسٹر جناح آ گئے۔ مولانا نے ان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

کیوں کر اس نگہ ناز سے جینا ہو گا
زہر دے، اس پہ یہ تاکید کہ پینا ہو گا

بمبئی میں جناح کا تلفظ جینا کہا جاتا تھا۔ مولانا کی بدیہہ گوئی سے ہم بے حد محظوظ ہوئے۔

---

۱۔ اتاترک کا انتقال ۱۰ نومبر ۱۹۳۸ء کو ہوا تھا۔

مسٹر جناح خدا جانے سمجھے یا نہیں لیکن ہماری خوش طبعی کو دیکھ کر وہ بھی مسکرائے۔

میاں فیروزالدین احمد مرحوم کا لیگ کے ہر اجلاس میں یہ کام ہوتا تھا کہ سٹیج پر بیٹھ جاتے اور موقع محل کے مطابق نعرے لگاتے تھے۔ مرحوم کی درسی تعلیم تو بہت معمولی تھی لیکن بلا کے ذہین، موقع شناس، اور خوش گفتار تھے۔ تحریک خلافت میں برسوں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کے ساتھ کام کر چکے تھے۔ تقریر بہت اچھی کرتے تھے۔ اور ہندوستان کے بڑے بڑے لیڈروں سے ان کے ذاتی مراسم بھی تھے۔ قائداعظم کا لقب انہی کی ایجاد ہے۔ میں انہیں نقیب ملت کہا کرتا تھا۔

پٹنہ کے اجلاس میں بھی وہ حسب معمول سٹیج پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے تھے اور جب کوئی بڑا لیڈر پنڈال میں داخل ہوتا تو حلق کی پوری قوت سے زندہ باد کا نعرہ بلند کرتے۔ مولوی فضل الحق آئے تو انہوں نے شیر بنگال کا نعرہ لگایا۔ سر سکندر حیات خاں آئے تو شیر پنجاب کا نعرہ بلند کیا۔ سید عبدالعزیز آئے تو عزیز ملت کا نعرہ گونجا۔ اتنے میں شاہنواز خاں ممدوٹ پنڈال میں داخل ہوئے، ظاہر ہے شیر پنجاب کا نعرہ لگ چکا تھا اور ایک صوبے میں ایک ہی شیر ہو سکتا ہے۔ میاں فیروزالدین احمد نے ایک لحہ تامل کیا اور پھر پوری بلند آہنگی سے کہا "حاتم دوراں ــــ زندہ باد"

نواب ممدوٹ حاتم دوراں تھے یا نہیں، یہ تو مجھے معلوم نہیں، لیکن نعرہ خوب لگا۔ اور نواب صاحب بھی خندہ زیر لب کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

پٹنہ کا اجلاس ختم ہوا تو ہم واپس لاہور آ گئے۔ پنجاب کے حالات جہاں تھے وہیں کے وہیں رہے اور ان میں ایک رتی بھر تبدیلی نہ ہوئی۔ آرگنائزنگ کمیٹی بدستور قائم تھی جس پر سر سکندر حیات خاں مسلط تھے۔ پراونشل مسلم لیگ کے قائم ہونے کا بظاہر کوئی امکان نہ تھا اور ہمارے سامنے پھر وہی دل گرفتگی، بے بسی، بے اطمینانی اور بے چارگی تھی جس کا آغاز بدقسمتی سے اپریل ۱۹۳۸ء میں ہو چکا تھا۔

اس کے علاوہ ایک اور چیز بھی تھی جس نے ہماری اجتماعی کوششوں کو بے جان سا بنا رکھا تھا۔ گذشتہ دو سال سے آل انڈیا مسلم لیگ کی پالیسی نے ایک منفی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ ہم لوگ مسلسل و متواتر کانگرس کی زیادتیوں، ناانصافیوں اور مسلم آزاریوں کا گلہ شکوہ کرتے آ رہے تھے۔ مان لیا کہ اقلیت کے صوبوں میں کانگرس مسلمانوں سے اچھا سلوک نہیں کرتی تھی۔ یہ بھی مان لیا کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں کانگرس اپنی سازشوں، ریشہ دوانیوں اور عیاریوں سے ہماری قومی جمعیت کو درہم برہم کرنے کے درپے تھی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ہم اس فیڈریشن کے مخالف تھے، جو

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء نے پورے ہندوستان کے لئے تجویز کیا تھا۔ یہ بھی درست ہے کہ صوبوں کے گورنر، اپنے اختیارات خاص کے باوجود، مسلمانوں کی داد رسی کرنے سے عاجز تھے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان تمام مصائب کا مداوا کیا تھا اور لیگ چاہتی کیا تھی؟

اجلاس پٹنہ کے بعد "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کے انگریز ایڈیٹر نے اسی موضوع پر اپنے ۲۸۔ دسمبر ۱۹۳۸ء کے پرچے میں ایک مقالہ افتتاحیہ لکھا اور کہا کہ

"افسوس ہے کہ مسٹر جناح نے مسلم لیگ کے چھبیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ پٹنہ میں جو خطبہ صدارت دیا ہے، اس میں انہوں نے کانگرس کے اغراض و مقاصد کے متعلق تو بہت کچھ کہہ ڈالا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ خود ان کے پیش نظر کون سا طریق عمل ہے، جس سے وہ مسلمانان ہند کو اس سیاسی جنگ کے لئے منظم کرنا چاہتے ہیں جس سے وہ کانگرس یا کسی دوسری حریف جماعت کی دست درازیوں اور فتنہ انگیزیوں سے اپنے حقوق کو محفوظ کر سکیں۔

اگر مسٹر جناح کے قول کے مطابق کانگرس ہندو راج قائم کرنے میں کوشاں ہے تو لامحالہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ محض شکایتوں کا دفتر کھولنے سے تو کانگرس اپنا منصوبہ ترک نہیں کر دے گی اگر یہ صحیح ہے کہ کانگرسی وزارتیں اپنے اپنے صوبے میں کھلم کھلا یا درپردہ مسلمانوں کے سیاسی حقوق پر ڈاکہ ڈال رہی ہیں تو بھی یہ ماننا پڑے گا کہ صرف کانگرس کے جرائم کی داستانیں بار بار دُہرانے سے مسلمانوں کو کانگرس کے مظالم سے نجات نہیں مل سکتی............ بلاشبہ مسٹر جناح نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ مسلمانوں کو مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے متحد و منظم ہونا چاہئے۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ اتحاد و تنظیم کے کتنے مراحل اب تک طے کئے جا چکے ہیں۔ اور نہ یہ بتایا ہے کہ مسلم لیگ کا وہ کون سا پروگرام ہے جس کے مطابق مسلمانوں کو سیاسی طور پر منظم کیا جا سکے گا۔ من جملہ دیگر امور کے جو بحالات موجودہ مسلمانوں کو پریشان کر رہے ہیں، اور جن میں یقیناً یہ امر بھی شامل ہے کہ کانگرس کی نگاہ میں لیگ کی حیثیت کیا ہے. بنیادی نکتہ یہ ہے کہ کیا مسلم لیگ کو مسلمانانِ ہند کی ایسی تائید و حمایت حاصل ہے کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی

واحد نمائندہ جماعت ہونے کا دعویٰ کر سکے؟

اگر مسلمان بالاتفاق مسلم لیگ کو اپنی نمائندگی کا پروانہ عطا کر دیں تو کانگرس کا اسے مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کرنا یا نہ کرنا بالکل ثانوی بلکہ غیر ضروری حیثیت اختیار کر لے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پٹنہ کے اجلاس میں لیگ نے مسلمانوں کی حیثیت کو پہلے کی بہ نسبت بہت مضبوط کر دیا ہے۔ لیکن نظریہ ظاہر لیگ ہرگز یہ نہیں کر سکتی کہ اپنی نمائندہ حیثیت تسلیم کروانے کے لئے مزید دس سال تک انتظار کرے، تاکہ اس عرصے میں ہندوستان کے دس صوبوں میں سالانہ اجلاس منعقد کر کے اپنی نمائندگی کا ثبوت مہیا کرے۔

اگر لیگ اپنی کسی حریف سیاسی جماعت کے چیلنج کا مقابلہ کر کے اپنی نمائندہ حیثیت کو تسلیم کروانا چاہتی ہے تو اس کا فرض ہے کہ فوراً تمام صوبوں میں اپنے آپ کو نہایت جاں فشانی سے منظم کرے"

"سول اینڈ ملٹری گزٹ" ایک نیم سرکاری اینگلو انڈین اخبار تھا، جو پنجاب کی سیاست میں یونینسٹ پارٹی کا حامی تھا۔ لیکن اس کا انگریز ایڈیٹر بھی محسوس کرتا تھا کہ جب تک فرداً فرداً ہندوستان کے تمام صوبوں میں لیگ منظم نہیں ہو گی وہ اپنی حریف جماعتوں کے چیلنج کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مسلم اقلیت کے صوبوں میں تو لیگ کی تنظیم بلاشبہ پایہ تکمیل کو پہنچ چکی تھی لیکن پنجاب میں بدستور روز اول کا معاملہ تھا۔ یہاں لیگ سرے سے ناپید تھی۔ البتہ یونینسٹ پارٹی تھی جس کی ہمہ گیر طاقت اور عروج کے سامنے بڑے بڑوں کی گردنیں خم ہو رہی تھیں۔

# ضمیمہ

اس کتاب کے چوتھے باب بعنوان " جناح اور نہرو کی خط و کتابت " میں قائداعظم کے ایک خط محررہ ۱۷۔ مارچ ۱۹۳۸ء میں لکھا ہے کہ انہوں نے پنڈت نہرو کو یکم مارچ ۱۹۳۸ء کے نیو ٹائمز" کا پرچہ بھیجا تھا۔ اس پرچے میں جو مضمون درج تھا اس کا مضمون ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ میرے عزیز دوست ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے کیا ہے۔ اصل انگریزی متن بعد میں درج ہے (مصنف)

انڈین نیشنل کانگرس نے اپنے ہری پورہ کے آخری اجلاس میں ایک قرار داد منظور کی جس میں اقلیتوں کو ان کے مذہبی اور ثقافتی حقوق کے بارے میں تحفظ کی یقین دہانی کرائی گئی۔ا۔ قرار داد پنڈت جواہرلال نہرو نے پیش کی جو منظور ہوئی۔ اس موقع پر پنڈت جواہرلال نہرو نے جو تقریر کی وہ خرابی کے اعتبار سے خود اپنی مثال تھی۔ اگر اس تقریر کی روشنی میں قرار داد کا جائزہ لیا جائے تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ قرارداد کسی مخلصانہ جذبے کے تحت منظور نہیں ہوئی تھی بلکہ فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کے لئے شور مچانے والی سادہ لوح اقلیتوں کو مطمئن کرنے کی ایک بے معنی کوشش تھی۔ مسٹر جواہرلال نہرو نے بحث کا آغاز ہی اس بات سے کیا کہ حقیقت میں فرقہ وارانہ مسئلے کا کوئی وجود ہی نہیں۔ اس تقریر کا لب و لہجہ اور انداز کتنا سخت اور متعصبانہ تھا اس کا اندازہ

---

ا۔ کانگرس کا ہری پورہ اجلاس ۱۹ سے ۲۱ فروری ۱۹۳۸ء کی تاریخوں میں منعقد ہوا تھا۔ اس اجلاس میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کی اکتوبر ۱۹۳۷ء کی قرار داد کو دہراتے ہوئے جو ان یقین دہانیوں کو دہراتی تھی جو اس سے بھی قبل کی گئی تھیں از سر نو حسب ذیل اعلان کیا گیا ----- "وہ (کانگریس) ہندوستان کی اقلیتوں کے مذہبی، لسانی، ثقافتی اور دوسرے حقوق کے تحفظ کو اپنا اولین فرض اور بنیادی لائحہ عمل تصور کرتی ہے تاکہ یہ یقین حاصل کیا جائے کہ کسی بھی طریق حکومت میں جس سے کانگرس کا تعلق ہو ان (اقلیتوں) کو ترقی کرنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع میسر آئیں اور وہ قوم کی سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی زندگی میں پورا پورا حصہ لے سکیں۔"

"دی انڈین اینوال رجسٹر، ۱۹۳۸ء جلد اول، صفحہ : ۲۹۹ (مصنف)

ذیل کے اقتباس سے ہو گا جو ان کی تقریر سے لیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا "میں نے نام نہاد فرقہ وارانہ مسئلے کا جائزہ دوربین سے لیا ہے لیکن جب کچھ موجود ہی نہ ہو تو دکھائی کیا دے؟"

ہمارے خیال میں کسی قرارداد کو ایسی بنیادوں پر پیش کرنا بد دیانتی کی انتہا ہے۔ اگر اقلیتوں کا کوئی مسئلہ موجود ہی نہیں تو پھر قرارداد پیش کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ اقلیتی مسئلہ ہے ہی نہیں۔

جس طرح کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے فرقہ وارانہ مسئلے کو سمجھنے یا دیکھنے میں اپنی معذوری یا نااہلیت کا اظہار کیا اس کی یہ پہلی مثال نہیں۔ مسٹر جناح کے بیان کے جواب میں انہوں نے اپنی اس بات کو دُہرایا کہ مسٹر جناح کے منشاء کو سمجھنے کی بہترین کوشش کے باوجود میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ نہرو کے خیال میں فرقہ وارانہ ایوارڈ کی وجہ سے جس کی کانگرس نے مخالفت کی تھی، مقننہ میں نشستیں مخصوص ہو چکنے کے بعد مزید کچھ کرنا باقی نہیں رہا تھا۔

نہرو نے اپنے جارحانہ بیان میں جو کچھ کہا اس کا مطلب یہ ہے کہ فرقہ وارانہ ایوارڈ کا مسئلہ محض متوسط اور بالائی طبقے کے لوگوں کا پیدا کردہ ہے تاکہ مقننہ میں چند نشستیں حاصل کر سکیں یا سرکاری ملازمتوں میں حصہ دار بن سکیں یا وزیر بن سکیں۔ ہم پنڈت جواہر لال نہرو کو بتانا چاہتے ہیں کہ انہوں نے مسلم اقلیت کی حیثیت کو کاملاً غلط سمجھا ہے اور یہ انکشاف سخت افسوسناک ہے کہ ایک ایسی کل ہندوستان تنظیم کا صدر جو تمام ہندوستانی آبادی کی نمائندگی کا دعویٰ رکھتی ہے، مسلم اقلیت کے مطالبات سے اس قدر بے بہرہ ہے۔ ہم کچھ مطالبات ذیل میں درج کرتے ہیں تاکہ پنڈت جواہر لال نہرو کو اس کے بعد یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ معلوم نہیں مسلمان اور کیا چاہتے ہیں؟

مسلمانوں کے مطالبات یہ ہیں:

۱۔ کانگرس آئندہ کے لئے فرقہ وارانہ ایوارڈ کی مخالفت ترک کر دے اور اس کے بارے میں اس ہرزہ سرائی سے باز آ جائے کہ یہ قومیت کی نفی ہے۔ یہ قومیت کے منافی سہی لیکن اگر کانگرس نے اپنے بیان میں یہ کہا ہے کہ وہ فرقہ وارانہ ایوارڈ کی مخالفت نہیں کر رہی تو مسلمان چاہتے ہیں کہ کانگرس کم از کم فرقہ وارانہ ایوارڈ کی واپسی کے تمام مظاہرے ختم کر دے۔

۲۔ فرقہ وارانہ ایوارڈ ملکی مقننہ میں مسلمان اور دوسری اقلیتوں کی محض نمائندگی کا مسئلہ پھر بھی باقی رہ جاتا ہے۔ مسلمان مطالبہ کرتے ہیں کہ مادر وطن کی ملازمتوں میں وہ بھی نمائندگی کا اتنا ہی حق رکھتے ہیں جتنا ہندوؤں کو حاصل ہے اور چونکہ مسلمانوں نے تلخ تجربے کے بعد محسوس کیا ہے کہ ملازمتوں میں نمائندگی کے سلسلے میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ناممکن ہے اس لئے ضروری ہے

کہ ملازمتوں میں مسلمانوں کے حصے کو قانونی دفعات کے اجراء کے ذریعے ملک کے آئین میں کلی طور پر مقرر کر دیا جائے تاکہ کسی محکمے کے ہندو سربراہ کے لئے یہ ممکن نہ ہو کہ وہ "استعداد" کے نام پر مسلمانوں کے حقوق کو پامال کر سکے۔ پنڈت جواہرلال نہرو کو اس امر کا علم ہے کہ استعداد اور اہلیت کے نام پر ہی دفترشاہی نے ملک کی ملازمتوں کے سلسلے میں. روستانیوں کے حقوق کو پامال کیا تھا۔ آج جبکہ کانگرس سات صوبوں میں برسراقتدار ہے مسلمان کانگرسی لیڈروں سے یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ وہ اس ضمن میں قطعی اور واضح پوزیشن اختیار کریں۔

۳۔ مسلمان مطالبہ کرتے ہیں کہ ان کے شخصی قوانین اور ان کی ثقافت کے تحفظ کی بذریعہ آئین ضمانت دی جائے۔ اس ضمن میں پنڈت جواہرلال نہرو اور کانگرس کے خلوص کے امتحان کے طور پر مسلمان مطالبہ کرتے ہیں کہ کانگرس مسجد شہید گنج کے سلسلے میں مظاہروں کو اپنے ہاتھ میں لے اور اپنا اخلاقی اثر و رسوخ استعمال کر کے یقین دلائے کہ مسجد شہید گنج کو وہی پہلا مقام مل جائے گا اور سکھوں کو ان نارواحرکتوں سے روک دیا جائے جس سے بے حرمتی ہوتی ہے اور مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے۔

۴۔ مسلمان مطالبہ کرتے ہیں کہ ان کے اذان دینے اور دیگر مذہبی رسومات ادا کرنے کے حق پر کسی طرح کا حملہ نہ ہو گا۔ ہم پنڈت جواہرلال نہرو کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ضلع لاہور، تحصیل قصور کے ایک گاؤں راجہ جنگ میں سکھ مسلمانوں کو باآواز بلند اذان دینے کی اجازت نہیں دیتے. جب ہمارا ایسے ہمسایوں سے واسطہ ہے تو یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو آئینی ضمانت دی جائے کہ ان کے مذہبی حقوق میں کسی قسم کی مداخلت نہیں ہو گی اور کانگرس کے قانون کی رُو سے بھی ضمانت ہو کہ کانگرس بحیثیت ایک بااثر تنظیم کے اس قسم کے واقعہ کا سدباب کرے گی۔ اس ضمن میں ہم پنڈت جواہرلال نہرو کو یہ بھی بتانا چاہتے ہیں کہ مسلمان گائے ذبح کرنے کو اپنا مذہبی حق قرار دیتے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں کہ اگر سکھوں کو جھٹکے کی اجازت ہے اور جھٹکے کے ذریعے گائے کا گوشت کھانے کی اجازت ہے تو مسلمانوں کو بھی گائے ذبح کرنے کے مسلمہ حق پر اصرار کا ہر حق حاصل ہے۔ پنڈت جواہرلال نہرو مذہبی رسومات میں کچھ زیادہ عقیدہ نہیں رکھتے۔ ان کا دعوئی ہے کہ اقتصادی اصولوں پر زندگی گزارنی چاہئے. چنانچہ ہم پنڈت جواہر لال نہرو کے علم میں یہ بات لانا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے گائے ذبح کرنے کا مسئلہ ایک اقتصادی ضرورت کا مسئلہ ہے۔ اس لئے کسی ہندو کو حق نہیں پہنچتا ہے کہ وہ آئینی طور پر گائے ذبح کرنے پر پابندی لگا سکے۔

۵۔ مسلمان مطالبہ کرتے ہیں کہ جن صوبوں میں اس وقت ان کی اکثریت ہے اس اکثریت کو نئی علاقائی حد بندی یا نئی علاقائی تقسیم کے ذریعے متاثر نہ کیا جائے! اس وقت بنگال، پنجاب، سندھ، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان کے صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ کانگرس کو اس بات کو آئین میں شامل کرنے پر آمادگی کا اظہار کرنا چاہئے اور اس امر کی آئینی ضمانت دینی چاہئے کہ مذکورہ بالا مسلم اکثریت کے صوبوں کو نئی علاقائی حد بندی یا علاقائی تقسیم کر کے اس اکثریت کو متاثر نہیں کیا جائے گا۔

۶۔ قومی ترانے کا مسئلہ بھی ایک اہم امر ہے۔ پنڈت جواہرلال نہرو اس بات سے بے خبر نہیں کہ مسلمانوں نے ہر کہیں بندے ماترم یا اور کسی غیر اسلامی ترانے کو قومی ترانے کے طور پر قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اگر پنڈت جواہرلال نہرو ہندو اکثریت سے یہ بات منوا نہیں سکتے کہ وہ اس ترانے کے استعمال کو ترک کر دے تو پھر انہیں کوئی بلند بانگ دعویٰ نہیں کرنا چاہئے۔ اور یہ احساس کر لینا چاہئے کہ ہندو عوام کی اکثریت ان کی باتوں کو قابل توجہ نہیں سمجھتی اور نہ اس سے زیادہ ان کی اہمیت محسوس کرتی ہے کہ وہ مسلمانوں کی یک جہتی کو خراب کرنے والی ایک مضبوط قوت ہے۔

۷۔ مسلمانوں کا ایک اور مطالبہ زبان اور رسم الخط کے تحفظ کے متعلق ہے. مسلمان اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ عملی طور پر اردو ان کی قومی زبان ہے. انہیں آئینی ضمانت دی جائے کہ اردو زبان کے استعمال کو کسی طریقے سے ختم یا کم نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی اسے کوئی نقصان پہنچایا جائے گا۔

۸۔ لوکل باڈیز میں مسلمانوں کی نمائندگی بھی ایک تصفیہ طلب مسئلہ ہے۔ مسلمان مطالبہ کرتے ہیں کہ فرقہ وارانہ ایوارڈ کے اصول کا الگ جداگانہ انتخاب اور نمائندگی بر بنائے تناسب آبادی والا حصہ اول سے آخر تک مختلف لوکل اور دوسری باڈیز پر یکساں طور پر نافذ ہونا چاہئے۔

ہم اگر بیان کرتے جائیں تو مطالبات کی یہ فہرست طویل سے طویل تر ہو سکتی ہے لیکن فی الحال ہم کانگرس اور پنڈت جواہرلال نہرو کا ان مذکورہ مطالبات کے بارے میں جواب سننا چاہتے ہیں۔ ہم پنڈت جواہرلال نہرو کے علم میں یہ بات لانا چاہتے ہیں کہ وہ یہ اچھی طرح جان لیں کہ مسلمان ہندوؤں کی نسبت صحیح معنوں میں کامل آزادی کے زیادہ مشتاق ہیں۔ وہ ہندوستان میں خود مسلم راج کے حامی نہیں مگر ہندو راج کے ہر منصوبے کا بھی دندان شکن جواب دینے کے لئے تیار ہیں۔ وہ ملک کی مکمل آزادی اور اس ملک میں آباد تمام فرقوں کی آزادی کے حامی ہیں لیکن وہ کسی اکثریت کی حکومت کے قیام کے سخت مخالف ہیں جو مختلف اقلیتوں کی مذہبی، ثقافتی اور سیاسی آزادی

کی ضمانت کو ختم کر سکتی ہو جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔

پنڈت جواہرلال نہرو یہ سوچ کر مطمئن ہیں کہ مذکورہ بالا تمام مسائل بے بنیاد ہیں لیکن انہیں ان معاملات پر دوبارہ غور کرنا ہو گا اور اپنی حیثیت کا اقلیتوں کے جذبات کی روشنی میں جائزہ لینا ہو گا اور یہ دیکھنا ہو گا کہ وہ اقلیتیں جو کانگرس کے اس منصوبے سے متاثر ہوئیں ان معاملات کو کتنا اہم اور نازک معاملہ سمجھتی ہیں اور کتنی شدت سے ان کے بارے میں محسوس کرتی ہیں۔ بالآخر فیصلہ اقلیتوں کے ہاتھ میں ہے نہ کہ اکثریت کے ہاتھ میں۔

پنڈت جواہرلال نہرو کے اس ذہنی رویے کی روشنی میں جس کا بھرم ان کی تقریر میں کھلا اور جس کا اظہار قرار داد کے موید نے بھی ان الفاظ میں کیا کہ اقلیتوں اور اکثریتوں کا مسئلہ بالکل مصنوعی ہے اور شخصی مفاد والے لوگوں کا پیدا کردہ ہے. ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ پنڈت جواہرلال نہرو اور مسٹر جناح کی یہ گفتگو بھی بے نتیجہ ثابت ہوگی۔ اگر کانگرس یہ تصور کرتی ہے کہ اقلیتوں کو ان طفل تسلیوں سے رام کر لیا جائے گا اور انہیں حقوق دیئے بغیر محض لفظوں سے مدغم کر لیا جائے گا تو یہ کانگرس کی سب سے بڑی بھول ہے۔

# THE NEW TIMES, LAHORE
## ON THE COMMUNAL QUESTION
March 1, 1938

In its last session at Haripura, the Indian National Congress passed a resolution for assuring Minorities of their religious and cultural rights.* The rosolution was moved by Pandit Jawahar Lal Nehru and was carried.The speech which Pandit Jawahar Lal Nehru made on this occasion was as bad as any speech could be. If the resolution has to be judged in the light of that speech, then it comes to this that the resolution has been passed not in any spirit of seriousness, but merely as a meaningless assurance to satisfy the foolish Minorities who are clamouring for the satisfaction of the communal problem. Mr. Jawahar Lal Nehru proceeded on the basis that there was really no communal question. We should like to reproduce the trenchant manner in which he put fo:ward the proposition. He said : 'I have examined the *so - called comunal question* through the telescope and, if there is nothing,what can you see?'

*The Haripura Session of the Congress was held from 19—21 February 1938. Reierating the resolutions of the Congress Working Committee in October 1937, which in turn reiterated the undertakings given earlier, the Congress declared afresh as follows: "—————— it regards it as its primary duty and fundamental policy to protect the religious, linguistic, cultural and other rights of the Minothties in India so as to ensure for them in any scheme of Government to which the Congress is a party, the widest scope for their development and their participation in the fullest measure in the ploitical, economic and cultural life of the nation."

The India Annual Register (1938)
Vol. I, Page 299. (Author)

It appears to us that it is the height of dishonesty to move a resolution with these premises. If there is no minority question, why proceed to pass a resolution? Why not state that there is no minority question.

This is not the first time Pandit Jawahar Lal Nehru has expressed his complete inability to understand or see the communal question. When replying to a statement of Mr. Jinnah, he reiterated his conviction that in spite of his best endeavour to understand what Mr. Jinnah wanted, he could not get at what he wanted. He seems to think that with the Communal Award which the Congress has opposed, the seats in the Legislative have become assured and now nothing remains to be done.

He repeats the offensive statement that the Communal Award is merely a problem created by the middle or upper classes for the sake of a few seats in the Legislative or appointments in Government Service or for Ministerial position. We should like to tell Pandit Jawahar Lal Nehru that he has completely misunderstood the position of the Muslim minority and it is a matter of intense pain that the president of an All - India Organization which claims to represent the entire population of India should be so completely ignorant of the demands of the Muslim minority.

We shall set forth below some of the demands so that Pandit Jawahar Lal Nehru may not have any occasion hereafter to say that he does not know what more the Muslims want.

The Muslim demands are:

1. that the Congress shall henceforth withdraw all opposition to the Communal Award and should cease to prate about it as if it were a negative of nationalism. It may be a negative of nationalism but if the Congress has announced in its statement that it is not opposing the Communal Award, the Muslims want that the Congress should at least stop all agitation for the recession of Communal Award.
2. The Communal Award merely settles the question

of the representation of the Muslims and other minorities in the Legislatures of the country. The further question of the representation of the minorities in the service of the country remains.

be respresented in the Services of tneir motherland as the Hindus and since the Muslims have come to realise by bitter experience that it is impossible for any protection to be extended to Muslims' rights in the matter of their representation in the Services. it is necessary that the share of the Muslims in the Services should be definitely fixed in the Consititut-ion by statutory enactment so that it may not by open to any Hindu head of any Department to ride rough shod over Muslims claims in the name of "efficiency". Pandit Jawahar Lal Nehru knows that in the name of efficency and merit, the rights of Indians to man the Services of their country was denied by the bureaucracy. Today when Congress is in power in seven Provinces, the Muslims have a right to demand of Congress leaders that they shall unequivocally express themseleves in this regard.

3. Muslims demand that the protection of their personal law and their culture shall be guaranteed by the statute. And as an acid test of the sincerit of Pandit Jawahar Lal Nehru and the Congress in this regard. Muslim demands that the congress should take in hand the agitation in connection with the Shahidganj Mosque and should use its moral pressure to ensure that the Shahidgunj Mosque is restored to its original position and the Sikhs desist from profance' uses and thereby injuring the religious suceptibilities of the Muslims.
4. Muslims demand that their right to call Azan and perform their religious ceremonies shall not be fettered in any way. We should like to tell Pandit Jawahar Lal Nehru that in a village. in the Kasur Tehsil of the Lahore District, known as Raja Jang.

the Muslim inhabitants of that place are not allowed by the Sikhs to call out their Azans loudly. With such neighbours, it is necessary to have a statutory guarantee that the religious rights of the Muslims shall not be in any way interfered with and on the advent of Congress rule, to demand of the Congress that it shall use its powerful organization for the prevention of such an event. In this connection we should like to tell Pandit Jawahar Lal Nehru that the Muslims claim cow slaughter as one of long as the Sikhs are permitted to carry on Jhatka and to live on Jhatka, the Muslims have every right to insist on their undoubted right to slaughter cows. Pandit Jawahar Lal Nehru is not a very great believer in religious injunctions He claims to be living on economic plane and we should like Pandit Jawahar Lal Nehru to know that for a Muslim the question of cow slaughter is a measure of economic necessity and that therefore it is not open to any Hindu to statutorily prohibit theslaughter of cows.

5. Muslims demand that their majorities in the Provinces in which they are at present in a majority shall not be affected by any territorial redistributions, or adjustments. The Muslims are at present in majority in the Provinces of Bengal, Punjab, Sind, North — Western Frontier Province and Baluchistan. Let the Congress hold out the guarantee and express its readiness to the incorporation of this guarantee in the statute that the present distribution of the Muslim population in the various provinces shall not be interfered with through the medium of any territorial distribution or readjusment.

6. The question of national anthem is another matter. Pandit Jawahar Lal Nehru cannot be unaware that the Muslims all over have refused to accept the Bande Matram or any expurgated edition of that anti — Muslim song as a binding national anthem. If Pandit Jawahar Lal Nehru cannot secceed in

inducing the Hindu majority to drop the use of this song, then let him not talk so tall, and let him realise that the great Hindu mass does not take him seriously except as a strong force to injure the cause of Muslim solidarity.

7. The question of language and script is another demand of the Muslims. The Muslims insist on Urdu being practically their national language; they want statutory guarantees that the use of the Urdu tongue shall not in any way or manner be curtailed or damaged.

8. The question of the representation of the Muslims in the local bodies is another unsolved question. Muslims demand that the principle underlying the Communal Award, namely, separate electorates and representation according to population strength should apply uniformly in all the various local and other elected bodies from top to bottom.

We can go on multiplying this list but for the present we should like to know the reply of the Congress and Pandit Jawahar Lal Nehru to the demands that we have set forth above. We should like Pandit Jawahar Lal Nehru fully to understand that the Muslims are more anxious than the Hindus to see complete independence in the real sense of that term established in India. They do not belive in any Muslim Raj for India, and will fight a Hindu Raj tooth and nail. They stand for the complete freedom of the country and of all classes inhabiting this country but they shall oppose the establishment of any Majority Raj of a kind that will make a clean sweep of the cultrual, religious and political guarantees of the various Minorities as set forth above.

Pandit Jawahar Lal Nehru is under the comforting impression that the questions set forth above are trivial questions but he should reconsider his position in the light of the emphasis and importance which the minorities which are effected by the programme of the Congress place on these matters After all it is the Minorities which are the judge and not the Majorities

It appears thus that with the attitude of mind which

Pandit Jawahar Lal Nehru betrayed in his speech and which the seconder of that resolution equally exhibited in his speech, namely, that the question of minorities and majorities was an artificial one and created to suit vested interests, it is obvious that nothing can come out of the talks that Pandit Jawahar Lal Nehru recently initiated between himself and Mr. Jinnah. If the Congress is in the belief that the reiteration of its inane pledge to the Minorities will satisfy them and that they will be taken in by mere words, the Congress is badly mistaken.
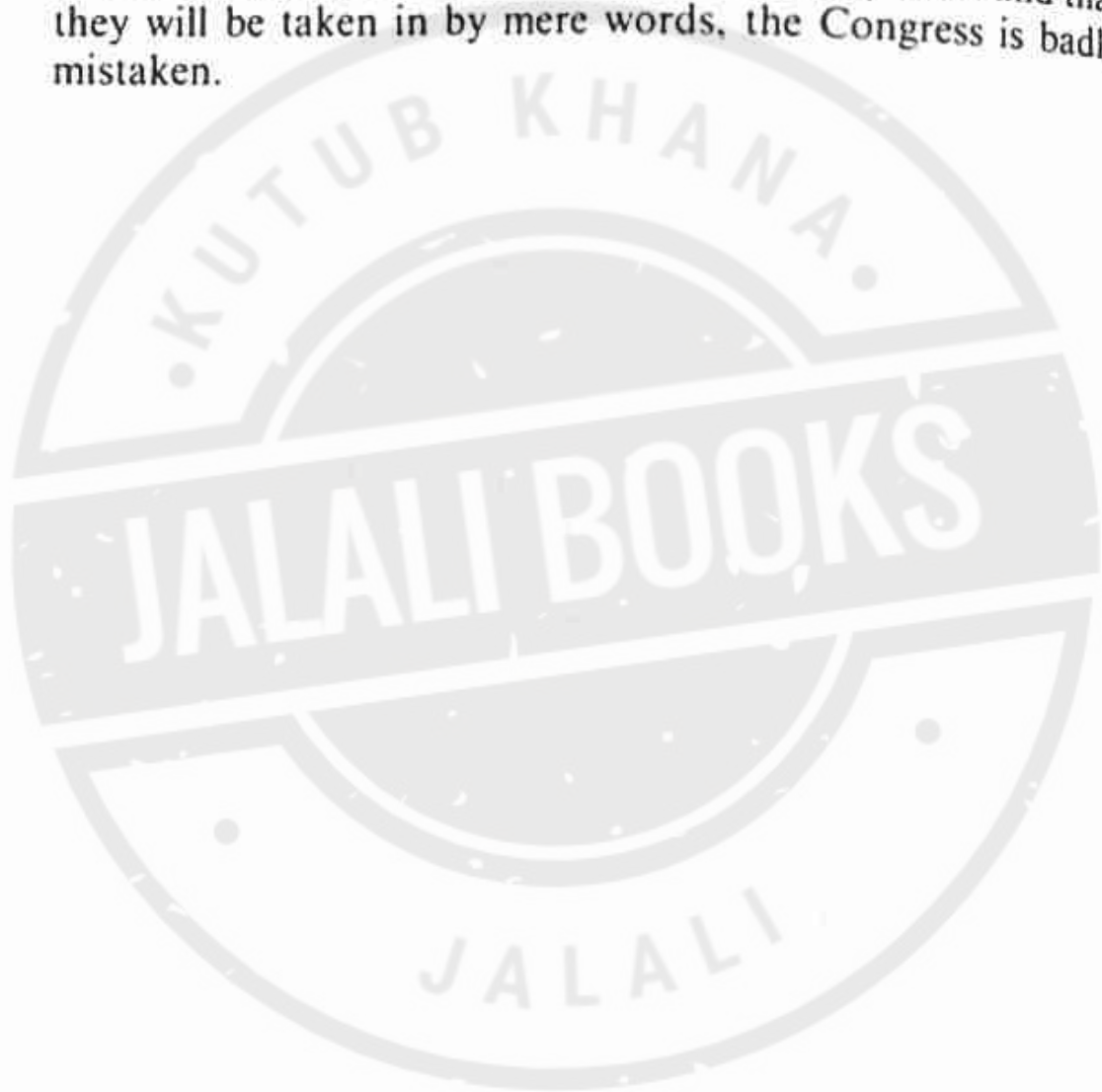
جلد دوم

# ہماری قومی جدّوجہد

جنوری ۱۹۳۹ سے دسمبر ۱۹۳۹ تک

میں اس کتاب کو اپنے والد مرحوم و مغفور کی
یاد اقدس سے منسوب کرتا ہوں جن کی شفقتِ
پدری کے طفیل مجھے فراغت کے چند سال میسّر
آئے اور میں انہیں قومی جِدّوجہد کی نذر کر سکا۔

## مقدمہ

برطانیہ کے وزیر اعظم. ہیرلڈ ولسن نے ۳۰ جون ۱۹۶۷ء کو دارالعوام میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے یہ اعلان کیا تھا.

"ازبسکہ تاریخ سے تعلق رکھنے والے حلقوں میں اس بات سے بہت دلچسپی کا اظہار کیا جارہا ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے آخری ایام کی کیفیت کیا تھی۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس موضوع سے متعلق تمام ضروری مواد شائع کر دیا جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے انڈیا آفس کے ریکارڈ کی چھان بین کر کے صرف وہ مسودے شائع کئے جائیں گے جن کا تعلق انتقال اقتدار اور ان واقعات و کوائف سے ہے جو اس انتقال اقتدار کا باعث بنے۔

جس طرح ہمارے فارن آفس نے برطانیہ کی خارجہ پالیسی سے تعلق رکھنے والے ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۹ء تک کے مسودوں کو سلسلہ وار شائع کیا ہے. بالکل انہی خطوط کے مطابق اس سکیم پر بھی عمل در آمد کیا جائے گا۔ جو اصحاب ان مسودوں کی ترتیب و تدوین و تہذیب کا کام کریں گے وہ آزاد خیال اور مستند تاریخ دان ہوں گے۔ جنہیں ریکارڈ دیکھنے. اسکی چھان پھٹک کرنے اور مسودوں کا انتخاب کر کے انہیں اشاعت کے لئے مرتب کرنے کی پوری آزادی ہو گی۔ پروفیسر پی۔ این۔ ایس۔ مین سرگ ا۔ نے. جو کیمبرج میں برطانوی دولت مشترکہ کی تاریخ کے پروفیسر ہیں۔ اس کام پر آمادگی کا اظہار فرما کر ایڈیٹر انچیف کا عہدہ قبول کر لیا

---

Professor P.N.S Mansergh

ہے۔ امید ہے کہ اس سال کے آخر تک پوری سرگرمی سے اس سکیم پر عمل در آمد شروع ہو جائے گا۔"

اس واقعہ کے دو روز بعد لندن کے مشہور اخبار ڈیلی ٹیلیگراف نے وزیر اعظم کے اس بیان کا خیر مقدم کرتے ہوئے لکھا تھا کہ پروفیسر مین سرگ کا مقدم فرض یہ ہو گا کہ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے دور کی جملہ دستاویزیں جمع کر کے ترتیب وار شائع کریں، کہ برعظیم ہند سے انگریزی حکومت کو ختم کرنے اور اس کی جگہ بھارت اور پاکستان کی دو جداگانہ مملکتیں وجود میں لانے کی اصل جدوجہد کا یہی زمانہ تھا۔

میرے نزدیک ڈیلی ٹیلی گراف کی یہ رائے، کم از کم اس لحاظ سے بالکل درست ہے کہ مسلم لیگ کی وہ تحریک جس نے آگے چل کر تحریک پاکستان کا نام اختیار کیا، ۱۹۳۷ء ہی میں شروع ہوئی تھی۔ اگست ۱۹۴۷ء تک اس تحریک کو لامحالہ مختلف ادوار میں سے گزرنا پڑا۔ اور اس دوران میں امید۔ تشکک۔ مایوسی۔ بددلی۔ حوصلہ۔ امنگ۔ ایثار کی لہریں برابر ہماری قومی زندگی کی سطح پر اٹھتی رہیں۔

فرد کی طرح قوم کو بھی اپنی صحیح منزل معین کرنے کے لئے ایک شدید قسم کی روحانی اور ذہنی کشمکش میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ۱۹۰۶ء میں جب آغا خان کی سرکردگی میں ہندوستان کے مسلمان لیڈروں کے وفد نے وائسرائے کی خدمت میں حاضر ہو کر جداگانہ انتخاب کا مطالبہ پیش کیا تھا تو ہندوستانی مسلمانوں میں صرف جناح ایک شخص تھا جس نے ببانگ دہل اس تجویز کی مخالفت کی تھی اور دلیل یہ دی تھی کہ جداگانہ انتخاب کا اصول متحدہ قومیت کے منافی ہے۔ اس وقت کون یہ کہہ سکتا تھا کہ یہی شخص صرف ۳۴ چونتیس سال بعد مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا سب سے بڑا علم بردار بن کر نمودار ہو گا، اور جداگانہ انتخاب ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ وطن کے قیام کا مطالبہ کرے گا۔

۱۹۳۷ء کے اوائل تک جناح اس پالیسی کا موید اور حامی تھا کہ ہندو اور مسلمان مل کر ہندوستان میں ایک فیڈرل طرز کی حکومت چلائیں۔ چنانچہ جب جنوری ۱۹۳۷ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت ہندوستان کی صوبائی اسمبلیوں کے پہلے انتخابات ہوئے تھے تو مسلم لیگ نے اسی پالیسی کے مطابق انتخابات میں حصہ لیا تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے مینی فسٹو میں، جو خود مسٹر جناح نے مرتب کیا تھا، صاف الفاظ میں یہ درج تھا کہ "مسلم لیگ اور کانگرس کو چاہیئے کہ صوبوں میں مشترکہ وزارتیں قائم کریں تاکہ آزادی کی منزل روز بروز قریب آنا شروع ہو۔ لیکن

جب کانگرس نے نشۂ اقتدار سے بدمست ہو کر مسلمانوں کی جداگانہ قومی ہستی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور مسلم رابطہ عوام (مسلم ماس کانٹیکٹ) کی تحریک جاری کر کے مسلمانوں کو بزور وجبر ہی نہیں بہ حیلہ وفن کانگرس میں شامل کرنے کی وسیع مہم شروع کر دی تو حالات نے یکایک ایک ایسی خطرناک صورت اختیار کر لی تھی کہ مسٹر جناح کو مجبوراً اپنی پرانی پالیسی کو یک سر خیرباد کہنا پڑا۔ بس یہی وہ نقطۂ آغاز تھا جہاں سے تحریک پاکستان شروع ہوتی ہے۔

ڈاکٹر امبد کر نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے:

"مسلم رابطہ عوام کی تحریک کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان قوم کے لیڈروں کو نظر انداز کر کے یا ان سے بے نیاز و بے پروا ہو کر۔ عام ہندوؤں اور مسلمانوں میں سیاسی یگانگت پیدا کی جائے۔ اگر اس تحریک کا تحلیل و تجزیہ کیا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے گویا یہ برطانیہ کی قدامت پسند جماعت (کنزرویٹو پارٹی) کا منصوبہ تھا کہ ٹوریوں کی دولت سے لیبر پارٹی کو خرید لیا جائے۔ یہ تحریک جتنی فتنہ انگیز تھی اتنی ہی بے معنی بھی تھی۔ کانگرس نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا تھا کہ دنیا میں بعض ایسی گراں بہا چیزیں بھی ہیں جن کا مالک ان کی قدر وقیمت سے آگاہ ہونے کے بعد کبھی ان کو اپنے سے جدا کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کسی طرح دھوکا اور فریب دے کر اس شخص سے وہ متاع عزیز ہتھیالی جائے تو سخت رنجش اور کشیدگی پیدا ہونے کا احتمال ہے۔

قوموں کی زندگی میں سب سے بیش قیمت سرمایہ ان کا سیاسی اقتدار ہے۔ بالخصوص ایسی قوم کے لئے جسے آئے دن غنیم کے حملوں کا ہدف بننا پڑے۔ اور جسے اپنی ہستی کو قائم رکھنے کے لئے ہمہ اوقات جدوجہد میں مصروف رہنے کی ضرورت پیش آئے۔ یہ سیاسی قوت جان سے بھی زیادہ عزیز چیز ہے۔ یہی سیاسی قوت ایک ایسا حربہ ہے جس سے یہ قوم اپنی ہستی کو برقرار رکھ سکتی ہے۔ اگر غلط پراپیگنڈے کے زور سے یا واقعات و حقائق کو مسخ کر کے یا اعزاز و مناصب کا لالچ دے کر یا سیم وزر کی جھلک دکھا کر کسی قوم سے اس کی سیاسی قوت چھیننے کی کوشش کی جائے گی تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اس قوم سے گویا حفاظت خود اختیاری کا تمام اسلحہ چھین لیا گیا ہے اور آئندہ اسے ہمیشہ کے لئے مغلوب و محکوم بنا کر اس کی خود

داری سلب کر لی جائے گی۔

ممکن ہے بعض لوگ یہ خیال کریں کہ ان ہتھکنڈوں سے ملک میں اتحاد و اتفاق کی فضا پیدا ہو سکتی ہے لیکن ایسا خیال بالکل غلط اور فساد انگیز ہے۔ مکر و فریب کی ان مکروہ چالوں سے فریق مخالف کی آواز کو دبایا تو جا سکتا ہے، لیکن اتحاد پیدا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یوں کہنا صحیح ہو گا کہ اتحاد کی جگہ عداوت، کدورت اور مخالفت کی آگ پہلے سے بھی زیادہ تندی کے ساتھ بھڑک اٹھے گی۔ کانگرس کی جاری کردہ تحریک مسلم رابطہ عوام نے یہ تمام فتنے کھڑے کر دیئے ہیں۔ اس لئے بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں میں پاکستان کا تصور پیدا کرنے کی بہت بڑی ذمہ داری اسی احمقانہ تحریک کے سر عاید ہوتی ہے[۱]۔"

پس آج ہمیں اس بات کی ضرورت نہیں کہ لوگوں کو یہ بتائیں کہ بابر نے ۱۵۲۶ء میں ہندوستان پر حملہ کیا تھا اور پانی پت کی تیسری لڑائی ۱۷۶۱ء میں ہوئی تھی، یا یہ بتائیں کہ محمد تغلق نے دلی کی بجائے دیوگڑھ کو اپنا دار السلطنت بنالیا تھا اور ساموگڑھ کے میدان میں اورنگ زیب کو فتح اور دارا شکوہ کو شکست ہوئی تھی۔ یہ چبائے ہوئے نوالے ہیں جو ہزاروں دفعہ چبائے جا چکے ہیں:

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

۱۹۴۷ء میں صفحۂ ارض پر ہماری تاریخ کا ایک بالکل نیا باب لکھا گیا تھا۔ چنانچہ آج وقت کا سب سے بڑا تقاضا اور ملک کا سب سے اہم مطالبہ یہ ہے کہ اس قومی جدوجہد کی مفصل روداد مرتب کی جائے جو ۱۹۳۷ء میں شروع ہوئی اور اگست ۱۹۴۷ء میں اپنے انجام کو پہنچی تاکہ دنیا کو معلوم ہو سکے کہ ہم نے کس بے سروسامانی میں سفر کا آغاز کیا تھا اور پھر کیونکر آہستہ آہستہ حالات میں مساعدت پیدا ہوتی گئی۔ الحمدللہ کہ میں اس سلسلے میں اپنے فہم وادراک کے مطابق ۱۹۳۸ء تک کے حالات مرتب کر کے شائع کر چکا ہوں۔ موجودہ کتاب ۱۹۳۹ء کے واقعات و کوائف پر مشتمل ہے۔ اگر زندگی نے وفا کی تو میری اگلی کتاب ۱۹۴۰ء پر ہو گی۔

جس تحریک کو پاکستان کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس میں تین فریق شامل تھے۔ ہندو

---

[۱] Pakistan or the Partition of India by Dr. Ambedker : Page 337

(بالفاظ دیگر انڈین نیشنل کانگرس) مسلمان (بالفاظ دیگر آل انڈیا مسلم لیگ) اور برطانوی حکومت۔ اقتدار و اختیار کلیتہً برطانیہ کے ہاتھ میں تھا اور کانگرس اور مسلم لیگ دونوں اپنی اپنی جگہ اس اقتدار کے حصول میں کوشاں تھیں۔ کانگرس کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ ہندوستان کی تمام قوموں کی نمائندہ جماعت ہے۔ لہٰذا برطانیہ کو چاہئے کہ ہندوستان کی حکومت اس کے حوالے کر کے یہاں سے رخصت ہو جائے۔ اس کے برعکس مسلم لیگ کا دعویٰ یہ تھا کہ کانگرس ہندوؤں اور مسلم لیگ مسلمانوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ لہٰذا برطانوی حکومت کا فرض ہے کہ مسلم لیگ کو مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت مان کر اس کا مطالبۂ پاکستان تسلیم کیا جائے۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، اس باہمی کشمکش کا آغاز ۱۹۳۷ء میں ہو گیا تھا۔ اگرچہ قرارداد پاکستان مارچ ۱۹۴۰ء میں جا کر منظور کی گئی تھی۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ اس قرارداد کا پس منظر سمجھنے کے لئے ہم اپنا سیاسی مطالعہ ۱۹۳۷ء ہی سے شروع کریں۔ برطانیہ کے وزیراعظم ہیرلڈ ولسن کے اعلان کے مطابق جب پروفیسر مین سرگ ان دس برسوں کی مصدقہ روداد مکمل کر چکیں گے تو ہمیں پہلی مرتبہ معلوم ہو گا کہ اس جدوجہد میں برطانوی حکومت کا رویہ کیا تھا۔ اور اس ضمن میں وہ خفیہ رپورٹیں، یادداشتیں اور دستاویزیں بھی منظر عام پر آئیں گی جنہیں آج تک بڑی رازداری کے ساتھ پردۂ خفا میں رکھا گیا ہے۔

جہاں تک انڈین نیشنل کانگرس کے زاویہ نگاہ کا تعلق ہے، ہندوستان کی حکومت اور عوام نے اس زاویہ نگاہ کی وضاحت کے لئے ہزاروں نہیں لاکھوں صفحے سیاہ کر ڈالے ہیں۔ اور بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اہل ہند نے اس موضوع پر جتنی کتابیں شائع کی ہیں انہیں کثرت تعداد کے اعتبار سے گویا کتابوں کا ایک سیلاب کہنا روا ہو گا۔ پاکستان میں اگرچہ وہ جمود تو نہیں رہا جو آج سے چند سال پہلے طاری تھا۔ لیکن پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ موضوع کی تشنگی ہنوز باقی ہے۔ اور جس قدر کام ہونا چاہئے تھا نہیں ہوا، اور جو کچھ لکھا جانا چاہئے تھا اس کا عشر عشیر بھی نہیں لکھا گیا۔ اس سلسلہ میں اگر میری یہ ناچیز کاوش ہماری قومی جدوجہد کے بعض گوشوں پر کچھ روشنی ڈال سکے تو میرے لئے یہ امر موجب مسرت ہی نہیں باعث فخر ہو گا۔ زندگی برق رفتاری سے گزر رہی ہے اور ادھر اپنی کیفیت یہ ہے کہ پردیس کی کلفتیں اور معاش کی روز افزوں مجبوریاں دم لینے کی مہلت نہیں دیتیں۔ پھر بھی خدا کا شکر ہے کہ جو کام محض تائید ایزدی کے

بھروسے شروع کیا تھا وہ آہستہ آہستہ تکمیل کو پہنچ رہا ہے۔

جن چند احباب نے اس کام میں میری مدد کی ان میں خصوصیت سے ملک برکت علی مرحوم کے فرزند اکبر ملک مراتب علی کا بے حد ممنوں ہوں کہ انہوں نے اپنے نامور والد کے بعض ضروری کاغذات جو زمانے کے دستبرد سے بچ گئے تھے مجھے عنایت فرمائے۔ اور میں نے بحد استعداد ان سے استفادہ کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ البتہ اس ضمن میں افسوس ناک بات یہ ہے کہ قائداعظم کے بہت سے قیمتی خطوط جو انہوں نے وقتاً فوقتاً ملک برکت علی کو لکھے تھے دستیاب نہیں ہو سکے۔ قائداعظم کے ساتھ ملک صاحب کے دوستانہ تعلقات عمر بھر قائم رہے حتیٰ کہ جب ۱۹۳۱ء میں قائداعظم ہندوستان کی سیاست سے دل برداشتہ ہو کر انگلستان تشریف لے گئے تھے۔ اور لندن میں اپنا مکان خرید کر پریوی کونسل میں پریکٹس شروع کر دی تھی۔ اس وقت بھی ملک صاحب کے ساتھ ان کی خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ مکتوبات گرامی کا یہ نادر مجموعہ ملک صاحب نے ایک بہت بڑے لفافے میں بند کر کے اپنی کتابوں کی الماری میں رکھا ہوا تھا۔ ملک صاحب کی زندگی میں یہ تمام خطوط میں نے کئی بار پڑھے تھے۔ لیکن افسوس کہ بعد میں یہ خزانہ اس طرح غائب ہوا کہ سراغ تک نہیں مل سکا۔

میں لندن میں مقیم ہوں اور یہ کتاب لاہور سے شائع ہو رہی ہے۔ مجھے بہر صورت یہ پریشانی لاحق تھی کہ چھ ہزار میل دور بیٹھ کر کیوں کر حسب خاطر کتاب کی کتابت و طباعت کی نگرانی کر سکوں گا۔ لیکن اس ضمن میں میرے محترم دوست میر محمد صفدر صاحب اسسٹنٹ ایڈیٹر روزنامہ "پاکستان ٹائمز" لاہور نے جس مہربانی، کرم فرمائی اور ایثار کا ثبوت دیا ہے اس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے میرے پاس موزوں الفاظ نہیں۔ انہوں نے بکمال عنایت یہ سارا کام اپنے ذمے لے لیا حالانکہ ایک روزنامے کی ادارت کی وجہ سے وہ بے حد مصروف اور عدیم الفرصت انسان ہیں۔ چنانچہ کتاب انہی کی کوشش سے چھپ کر ہمارے سامنے آئی ہے۔

یونہی رہی نوازشِ اہلِ کرم اگر
گذرے گی اپنی عمر ادائے سپاس میں

میرے پچھلے پندرہ سال لندن میں گذر چکے ہیں، اور نہیں کہہ سکتا کہ حیات مستعار کے کتنے دن ابھی اور پردیس کی نذر کرنا ہوں گے۔ قدرت کے بھید کون پا سکتا اور اس کے سربستہ راز کس کی سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ کسے معلوم تھا کہ جب ہماری قومی جدوجہد کا دور دورہ ختم ہو گا، اور ہمارا قافلہ برسوں کی بادیہ پیمائی کے بعد اس ارض موعودہ سے ہم کنار ہو گا جس کا نام پاکستان ہے،

تو مجھے وطن اور وطن کی آسائشوں سے یوں محروم ہونا پڑے گا۔

صد باغ و بزم چشم براہِ من است و من
دستِ جنوں گرفتہ بویرانہ می روم

لندن

۶ر جون ۱۹۶۸ء

عاشق حسین بٹالوی
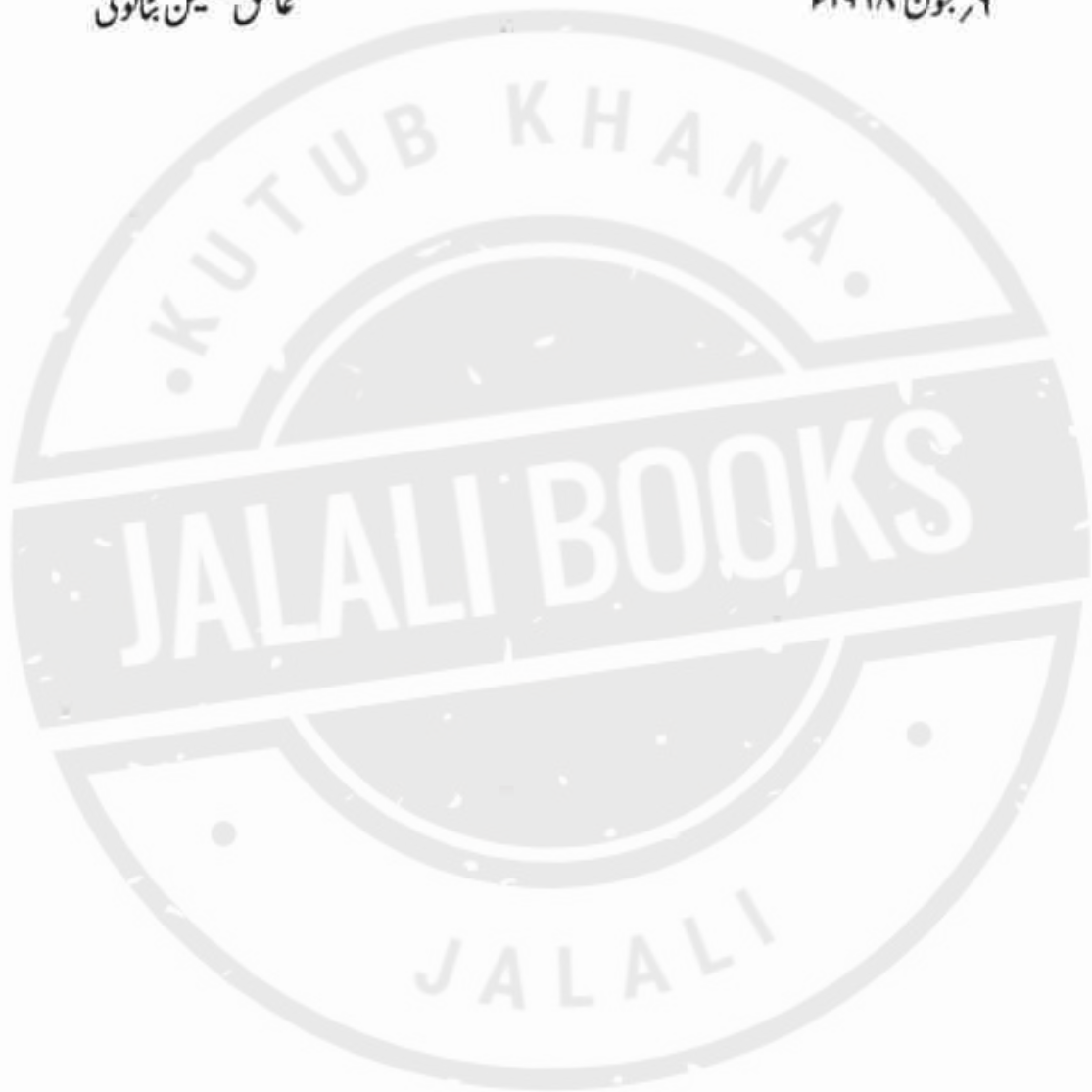
## باب نمبر ۱

# ڈاکٹر کھرے کا حشر

جب جولائی ۱۹۳۷ء میں کانگرس نے چھ صوبوں میں اپنی وزارتیں مرتب کیں تو دعویٰ یہ کیا گیا تھا کہ پارلیمنٹری نظام حکومت کا تقاضا ہے کہ ایوان میں جس پارٹی کی اکثریت ہو گی، تنہا وہی اپنی کابینہ مرتب کرے گی اور اس بارے میں کسی دوسری پارٹی کا تعاون طلب نہیں کیا جا سکتا۔

یہ تھا اصول جس کے تحت کانگرس نے صوبائی خود مختاری کا آغاز بڑے کرّوفر سے کیا تھا۔ کانگرسی لیڈر یہ حقیقت بھول گئے تھے یا یوں کہنا چاہئے کہ انہوں نے عمداً اس طرف سے آنکھیں بند کر لی تھیں کہ جس ملک میں ہندو اور مسلمان امیدوار جداگانہ انتخاب کے تحت منتخب ہو کر اسمبلی میں آتے ہیں۔ جہاں ہندو بحیثیت ایک جماعت کے، مستقل اور ناقابل ترمیم طریقے سے حکومت کی گدی پر متمکن ہیں اور مسلمان، بحیثیت جماعت کے مستقلاً حزب مخالف کی صورت میں ان کے سامنے برا جمان ہیں۔ وہاں پارلیمنٹری نظام حکومت نہیں چل سکتا۔ اور نہ ایک پارٹی کی وحدانی حکومت قائم کی جا سکتی ہے۔ جداگانہ انتخاب کا طبعی بلکہ آئینی تقاضا یہ تھا کہ وزارت میں صرف ان مسلمانوں کو جگہ دی جاتی جنہیں اپنی قوم کا اعتماد حاصل تھا۔ قطع نظر اس سے کہ وہ اکثریت رکھنے والی پارٹی کے ممبر تھے یا نہیں۔ لیکن ان دلائل اور حقائق کے باوجود پنڈت نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد نے تحدی سے فیصلہ کیا تھا کہ ہم وزارت سازی میں انگلستان کے پارلیمنٹری نظام کی پابندی کریں گے اور مسلم لیگ کو وزارت میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

سوال یہ ہے کہ کیا انگلستان کے پارلیمنٹری نظام کی پابندی صرف یہیں تک محدود تھی کہ حیلے بہانے کر کے مسلم لیگ کو اقتدار سے محروم رکھا جاتا یا کیا اس نظام کی دوسری شقوں کو بھی معرض عمل میں لانا ضروری تھا؟ اس کا جواب دینے کے لئے میں سی۔ پی (صوبجات متوسط) کے وزیر اعظم ڈاکٹر این ۔ بی ۔ کھرے کی مثال پیش کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے نہایت احتیاط سے

پارلیمنٹری نظام کی پابندی کی اور محض اس جرم کی پاداش میں انہیں نہ صرف وزارت عظمٰی سے محروم ہونا پڑا بلکہ کانگرس سے بھی نکال دیا گیا۔

ڈاکٹر کھرے کو ۱۹۳۷ء میں سی۔ پی کا وزیر اعظم منتخب کیا گیا تھا اور ایوان کی اکثریت ان کے ساتھ تھی۔ سی۔ پی کے ایک حصے میں مراٹھی بولی جاتی ہے اور دوسرے حصے میں ہندی رائج ہے۔ ڈاکٹر کھرے کا تعلق مراٹھی والے علاقے سے تھا۔ ہندی والے علاقے کو مہاکوشل کہا جاتا ہے۔ دونوں علاقوں میں باہمی رقابت اور چپقلش چلی آ رہی تھی۔ مہاکوشل کے تین وزیر، پنڈت روی شنکر شکلا۔ پنڈت دوار کا پرشاد مصرا اور درگا شنکر مہتہ، ڈاکٹر کھرے کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے اور انہیں سردار پٹیل کی درپردہ شہ بھی حاصل تھی۔ ڈاکٹر کھرے بڑے نامور ڈاکٹر تھے اور کئی ہزار روپے ماہوار کی پریکٹس چھوڑ کر انہوں نے وزارت عظمٰے قبول کی تھی۔ ان کا دامن روپے پیسے کے داغ سے بالکل پاک تھا اس لئے عوام میں بھی خاصے مقبول تھے۔

سی۔ پی کے کابینہ میں چھ وزیر تھے۔ جن میں سے تین مراٹھی والے علاقے اور تین مہاکوشل کے تھے جب کابینہ میں وزیروں کی یہ باہمی چپقلش بڑھی اور وزارت کی یک جہتی میں بھی خلل پڑنے لگا تو کانگرس کی آل انڈیا پارلیمنٹری سب کمیٹی نے, جس میں سردار پٹیل۔ مولانا ابوالکلام آزاد، بابو راجندر پرشاد شامل تھے۔ وزیروں کو بلا کر سمجھوتہ کرا دیا لیکن چند ہفتوں کے بعد حالات بدستور خراب ہو گئے اور مہاکوشل کے تینوں وزیر ڈاکٹر کھرے کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔ اس دوران میں ڈاکٹر کھرے کو یہ بھی معلوم ہوا کہ مہاکوشل کے دو وزیروں کے خلاف بعض حلقوں میں رشوت کا الزام لگایا جا رہا ہے۔ صوبے کے وزیر اعظم کی حیثیت سے انہوں نے تحقیقات کرائی تو الزام صحیح ثابت ہوا۔ اس پر ڈاکٹر کھرے نے دونوں وزیروں کو بلا کر نصیحت کی کہ کابینہ سے استعفا دے دو، میں تمہارے ساتھ کام نہیں کر سکتا۔ لیکن دونوں وزیروں نے مستعفی ہونے سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر کھرے اپنے صوبے کی اسمبلی میں کانگرس پارٹی کے لیڈر تھے چنانچہ جب انہوں نے دیکھا کہ ان کی کابینہ کے دوار کان, ان کی ہدایات کے برعکس استعفا نہیں دیتے تو انہوں نے پوری کابینہ سے مستعفی ہو جانے کو کہا تاکہ وزارت توڑ دی جائے۔ مراٹھی علاقے والے دونوں وزیروں نے جن کے نام آر۔ ایم دیش مکھ اور پی۔ بی گولے تھے۔ اپنے استعفے لکھ کر ڈاکٹر کھرے کے حوالے کر دیئے چنانچہ انہوں نے اپنا اور ان دونوں رفیقوں کا استعفا صوبے کے گورنر سر فرانسس اے وائلی[1] کو جا کر دے دیا۔ یہ واقعہ ۲۰ جولائی ۱۹۳۸ء کو ہوا۔ گورنر نے باقی تین وزرا یعنی پنڈت راوی شنکر شکلا۔ پنڈت دوار کا پرشاد مصرا اور درگاہ شنکر مہتہ سے کہا کہ پارلیمنٹری

1 Sir Francis Wylie

آئین کے مطابق آپ کو بھی لازماً استعفا دے دینا چاہئے۔ لیکن ان تینوں نے مستعفی ہونے سے انکار کر دیا۔ اس صورت میں پارلیمنٹری آئین کے مطابق گورنر کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ صوبے کے وزیر اعظم اور اس کے دونوں ساتھیوں کے استعفے منظور کر کے باقی تین وزرا کے عہدے بھی ساتھ ہی ختم کر دیئے جائیں۔ ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی دفعہ نمبر ۵۱ کا بھی یہی تقاضا تھا۔

چنانچہ سر فرانسس وائلی نے سی۔ پی کی وزارت توڑ دی۔ لیکن آئینی لحاظ سے کابینہ کے بغیر حکومت چل نہیں سکتی تھی لہٰذا گورنر نے دوبارہ ڈاکٹر کھرے کو طلب کر کے کہا کہ نئی کابینہ مرتب کرو۔ ایوان میں ڈاکٹر کھرے کے حامیوں کی اکثریت تھی۔ اس لئے انہوں نے کانگرس پارلیمنٹری پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے نئی وزارت تشکیل کی۔

یہ تھا گناہ جس کی پاداش میں ڈاکٹر کھرے کو کانگرس کی ہائی کمان نے وہ عبرتناک سزا دی کہ ہندوستان کیا معنی انگلستان تک میں اس کی صدائے بازگشت سنی گئی۔ وہ پارلیمنٹری نظام جس کی پیروی کی کانگرس دعوے دار تھی اور جس کی رو سے اس نے یو۔ پی۔ بمبئی۔ مدراس۔ سی پی۔ بہار۔ اڑیسہ میں خالصتاً ہندو وزارتیں قائم کی تھیں۔ اور جس نظام کے خلاف جب مسلم لیگ نے آواز بلند کی تو طنزیہ رنگ میں جواب دیا گیا کہ جناح جمہوریت کا مخالف اور فسطائیت کا حامی ہے۔ اب وہی پارلیمنٹری نظام کانگرس کی ڈکٹیٹر شپ کی بارگاہ پر قربان ہو کر رہ گیا۔

۲۳ - جولائی ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس وردھا میں ہوا۔ سوبھاش چندر بوس نے صدارت کی۔ جہاں ڈاکٹر کھرے کو ایک ملزم کی حیثیت سے بلا کر سخت ترین الفاظ میں ڈانٹ ڈپٹ کی گئی کہ تم نے اپنا اور اپنے دو ساتھیوں کا استعفا گورنر کو کیوں پیش کیا تھا تمہیں چاہئے تھا کہ اپنا استعفا لکھ کر کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش کرتے۔ جب ڈاکٹر کھرے نے جواب دیا کہ پارلیمنٹری نظام اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی رُو سے مجھے اپنا اور اپنے رفیقوں کا استعفا لازماً صوبے کے گورنر ہی کو پیش کرنا چاہئے تھا کیونکہ وزارت مرتب کرنے کا فرض بھی گورنر ہی کا ہے۔ تو ورکنگ کمیٹی نے یہ دلیل قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد ۲۷۔ جولائی کو سی۔ پی اسمبلی کی کانگرس پارلیمنٹری پارٹی کا اجلاس وردھا میں ہوا۔ جہاں کانگرس کے صدر سوبھاش چندر بوس اور ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبر بھی موجود تھے۔ ڈاکٹر کھرے بدستور اپنے صوبے کی پارلیمنٹری پارٹی کے لیڈر تھے اور اس وقت بھی ایوان میں انہی کے حامیوں کی تعداد زیادہ تھی لیکن اس کے باوجود ان سے زبردستی استعفا طلب کیا گیا اور نئے لیڈر کا

انتخاب ہوا۔ جب اس جلسے میں ایک شخص نے دوبارہ ڈاکٹر کھرے کا نام لیڈری کے لئے تجویز کرنا چاہا تو کانگرس کے صدر سوبھاش چندر بوس نے اجازت نہ دی۔ یوں ڈاکٹر کھرے کو اس ناقابل عفو گناہ کی سزا ملی کہ انہوں نے ایسے پارلیمنٹری نظام کی پابندی کرنے کا عہد کیوں کیا تھا۔ جس کے تحت جولائی ۱۹۳۷ء میں کانگرس نے بڑے دھوم دھڑکے سے ہندوستان کے چھ صوبوں میں وزارتیں مرتب کی تھیں۔

اس واقعہ سے چار مہینے قبل، مسٹر جناح نے کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے، کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کو گرینڈ فاشٹ کونسل کے نام سے یاد کیا تھا تو چاروں طرف کانگرس کے حامیوں نے شور مچانا شور کر دیا تھا کہ جناح ہمیں فاشٹ کیوں کہتا ہے۔ ہماری جماعت تو آئین۔ قانون۔ عدل و انصاف اور جمہوری روایات کا پیکر ہے لیکن ڈاکٹر کھرے کے اس واقعہ کے بعد جناح نے نہیں بلکہ خود منصف مزاج ہندوؤں نے واویلا شروع کر دیا تھا کہ ہمیں کانگرس کی ورکنگ کمیٹی سے بچاؤ۔ اگر یہ بھیڑیوں کا گروہ بدستور ہندوستان پر مسلط رہا تو اس ملک میں کبھی جمہوری نظام کامیاب نہیں ہو سکے گا۔

ویسٹرن انڈیا لبریشن فیڈریشن نے اعلان کیا کہ۔

”کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کا فرض صرف اتنا ہے کہ کانگرس کے اغراض و مقاصد اور پالیسی کی وضاحت کر دی جائے۔ جہاں تک صوبائی وزیروں کا تعلق ہے وہ براہ راست صرف اپنے صوبے کے ووٹروں اور لیجسلیٹو اسمبلی کے سامنے جواب دہ ہیں۔ انہیں ہرگز کسی ایسی بیرونی جماعت کے سامنے جواب دہ قرار نہیں دیا جا سکتا جس کا صوبے کی اسمبلی سے کوئی تعلق نہیں۔ اور جس پر چند ایسے افراد قابض ہیں جو قریباً ہر موقع پر بالآخر ایک ہی شخص (گاندھی) کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔ اگر ہندوستان کی آئینی اور دستوری زندگی میں کانگرس کی یہ روش قائم رہی تو انجام کار یہاں ایک بدترین قسم کا نازی اور فاشی نظام رائج ہو جائے گا۔“

مدراس کے مشہور سیاست دان اور سابق وزیر سر کے۔ وی۔ ریڈی نے ڈاکٹر کھرے کا انجام دیکھ کر کانگرسی حکومت کو ایک ایسی آمرانہ مملکت سے تشبیہ دی تھی جہاں کانگرس کی ورکنگ کمیٹی سیاہ و سپید کی مالک ہے۔ لیکن لطف یہ ہے کہ آئینی اور دستوری لحاظ سے یہ کمیٹی کسی جماعت

کے سامنے جوابدہ نہیں۔

جب کانگرس پر ہر طرف سے حملے ہونا شروع ہوئے، کہ یہ ایک نازی اور فاشی طرز حکومت کی بناء ڈال رہی ہے تو گاندھی جی نے اپنی اور کانگرس کی حمایت میں ایک طویل مضمون اپنے اخبار ہریجن میں لکھا۔ اگرچہ کانگرس کے اور بھی چند بڑے بڑے لیڈروں نے اپنی صفائی میں بیان دیئے تھے لیکن چونکہ گاندھی جی کا بیان سب پر بھاری تھا اس لئے میں صرف انہی کے مضمون کا ترجمہ نیچے درج کرتا ہوں تاکہ معلوم ہو جائے کہ ان کے ذہن و فکر کی کیفیت کیا تھی۔ اور وہ کس انداز سے سوچتے تھے:

"صوبجات متوسط کے وزارتی بحران کے بارے میں جو مضامین مختلف اخباروں میں چھپتے رہے ہیں ان کے مطالعہ سے عجیب و غریب باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ ہمیں پہلے سے اندازہ تھا کہ اگر ڈاکٹر کھرے جیسے پرانے اور آزمودہ کار کانگرسی لیڈر کے خلاف کوئی قدم اٹھایا گیا تو ہم پر شدید اعتراض وارد ہوں گے۔ لیکن اس ضمن میں لوگوں نے کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے فرائض کے متعلق جس بے خبری اور جہالت کا اظہار کیا ہے کم از کم مجھے اس کا پہلے سے کوئی اندازہ نہ تھا۔

ڈاکٹر کھرے کا صرف یہی قصور نہیں کہ انہوں نے پارلیمنٹری بورڈ کے احکام کی تعمیل نہ کر کے ضابطے کی صریح خلاف ورزی کی ہے بلکہ ان کا یہ جرم بھی نہایت شدید ہے کہ وہ گورنر کے ہاتھوں اس طرح بیوقوف بنے کہ ان کی اس حرکت کی وجہ سے کانگرس پارٹی کا لیڈر دنیا کے سامنے گویا ایک اضحوکہ بن کر رہ گیا۔ انہوں نے اپنے اعمال سے کانگرس کو ذلیل کر دیا ہے۔ ورکنگ کمیٹی نے ان کو حکم دیا تھا کہ اپنے جرم کا اعتراف کر کے فوراً کانگرس پارٹی کی لیڈری سے مستعفی ہو جاؤ۔ لیکن انہوں نے اس حکم کی تعمیل کرنے سے انکار کر دیا۔ اگر کانگرس کی ورکنگ کمیٹی ڈاکٹر کھرے کی خود سری، نافرمانی اور نااہلی سے چشم پوشی کرتی تو یقیناً اپنے فرض منصبی سے کوتاہی کی مرتکب ہوتی۔ لہذا ڈاکٹر کھرے کو مستوجب سزا قرار دیا گیا۔

مجھے یہ باتیں ضبط تحریر میں لاتے ہوئے سخت تکلیف ہو رہی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میں نے ہی ورکنگ کمیٹی کو تاکید کی تھی کہ ڈاکٹر کھرے

کے خلاف ریزولیوشن منظور کرے۔ لیکن یہ سب کچھ میں نے خوشی سے نہیں کیا تھا۔ ڈاکٹر کھرے میرے دوست ہیں۔ اور ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے انہوں نے مدت تک میرا علاج بھی کیا ہے۔ انہیں جب کبھی ضرورت پیش آئی وہ مشورے اور رہنمائی کے لئے میرے پاس آتے رہے ہیں۔ اور انہوں نے ہمیشہ مجھے اپنا گرو تسلیم کیا ہے۔

اسی دوستی پر اعتماد کر کے میں نے انہیں ۲۵ مئی کو ہدایت کی تھی کہ جرأت سے کام لیں اور کانگرس پارٹی کی لیڈری سے مستعفی ہو کر ایک معمولی رضا کار کی طرح خدمت کرنا شروع کر دیں۔ بجائے اس کے کہ وہ اس نصیحت پر کار بند ہوتے الٹا انہوں نے اپنے غلط اور گمراہ کن مشیروں کی رائے پر عمل کر کے ورکنگ کمیٹی سے لڑنا شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں جو خط انہوں نے مجھ کو لکھا ہے وہ حد درجہ قابل اعتراض ہے۔ اس خط میں وہ صاف کہتے ہیں کہ انہوں نے وزارت عظمیٰ سے استعفا دینے اور نئی کابینہ مرتب کرنے میں کوئی غلطی نہیں کی۔ اور اس سلسلہ میں ورکنگ کمیٹی کو یہ حق نہیں کہ ان سے باز پرس کرے۔

مجھے امید ہے کہ جب وہ ٹھنڈے دل سے اس تمام مسئلے پر غور کریں گے تو انہیں یقیناً اپنی غلطی کا احساس ہو گا۔ اور ورکنگ کمیٹی کے فیصلے کو وہ ایک سپورٹس مین کی طرح خندہ پیشانی سے قبول کر لیں گے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ لڑنا خوب جانتے ہیں اور دوستوں کی فراخ دلی کے ساتھ مالی امداد کرنا بھی ان کا شیوہ ہے۔ یہ خوبیاں اگر کسی شخص میں ہوں تو اسے یقیناً ان پر فخر کرنے کا حق ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان خوبیوں کا مالک ایک اچھا وزیر اعظم یا ایک اعلیٰ منتظم بننے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔ میں بحیثیت ایک دوست کے ان کو تاکید کرتا ہوں کہ فی الحال کانگرس کے ایک خیمہ بردار بن کر کام کریں۔ اور ان کی جن دو مسلمہ خوبیوں کا میں نے ذکر کیا ہے ان سے ہماری جماعت کو پورا فائدہ پہنچائیں۔

اگر ڈاکٹر کھرے یہ محسوس کرتے تھے کہ ان کی کابینہ کے دو وزیر ان سے تعاون کرتے تھے تو انہیں بے صبری سے بھاگے بھاگے گورنر کے

پاس شکایت لے کر نہیں جانا چاہئے تھا بلکہ ان کا فرض تھا کہ اپنا استعفا لکھ کر کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش کرتے۔ اس کے بعد بھی اگر وہ یہ محسوس کرتے کہ ورکنگ کمیٹی نے انصاف نہیں کیا تو داد رسی کے لئے آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا دروازہ کھلا تھا۔ یہ اصول قطعی طور سے ہر شخص کو یاد رکھنا چاہئے کہ اگر وزیروں میں باہمی اختلاف پیدا ہو جائے تو وزیراعظم کو ہرگز یہ حق نہیں کہ سیدھا گورنر کے پاس شکایت لے کر جائے بلکہ اس ضمن میں اس کا اولین فرض ہے کہ فریاد لے کر کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے سامنے حاضر ہو۔ اگر اسے یہ احتمال ہے کہ کانگرس کی مشینری بہت سست رفتار ہے تو اس مشینری کو تیز کرنا کچھ مشکل نہیں۔ اگر اسے یہ اندیشہ ہے کہ ورکنگ کمیٹی کے ممبر خود غرض یا نااہل ہیں تو آل انڈیا کانگرس کمیٹی انہیں برطرف کر سکتی ہے۔ ڈاکٹر کھرے نے جس عُجلت کے ساتھ گورنر کو اپنا استعفا پیش کیا ہے وہ نہ صرف یہ کہ ان کی بہت بڑی غلطی تھی بلکہ ان کا جرم بھی تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ دادرسی کی اصلی جگہ کانگرس کی ورکنگ کمیٹی ہے لیکن اس کے باوجود انہوں نے کمیٹی کے اجلاس سے عین پہلے براہ راست گورنر کو استعفا دے کر ضابطے کی سخت خلاف ورزی کی ہے۔

یہ اعتراض کیا جارہا ہے کہ جن لوگوں کو ہم نے ڈاکٹر کھرے کا جانشین بنایا ہے وہ نااہل اور خود غرض ہیں۔ اور نہ قابلیت کے اعتبار سے ڈاکٹر کھرے کے برابر ہیں۔ یہ الزام اگر درست ہے تو لامحالہ یہ لوگ اپنے اہم منصبی فرائض ادا کرنے میں ناکام رہیں گے۔ لیکن یہاں بھی یہ نکتہ یاد رکھنا چاہئے کہ ورکنگ کمیٹی ایک مقررہ ضابطے کی حدود کے اندر رہ کر کام کرنے پر مجبور ہے۔ وہ کسی صوبے کی مرضی کے خلاف زبردستی اس پر وزیروں کو مسلط نہیں کر سکتی۔ آخر کار یہ لوگ ایوان کے انتخاب شدہ ارکان ہیں اور اگر پارٹی نے انہیں بخوشی اپنا لیڈر منتخب کیا ہے تو ورکنگ کمیٹی اس میں دخل نہیں دے سکتی۔ بجز ایسی صورت کے کہ یہ لوگ ضابطے کی پابندی سے انحراف کے مرتکب ہوں یا ان کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد منظور ہو جائے۔

بااین ہمہ اگر کسی قسم کا بحران پیدا ہو تو وزراء کو اپنے اعلیٰ کیریکٹر کا ثبوت پیش کرنا چاہئے۔ ان کا فرض ہے کہ ایسی صورت میں اپنے عمل کی پاکیزگی اور بے لوثی سے یہ ثابت کریں کہ ان کے خلاف جو الزام عائد کئے جا رہے ہیں بے بنیاد ہیں۔ اور وہ یقیناً ہر صورت میں اس اعتماد کے اہل ہیں جو قوم نے ان پر کیا ہے۔

کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے جس طرح سی۔ پی کے گورنر کے موجودہ رویئے کی مذمت کی ہے اس پر ہندوستان کے بعض اخبارات و جرائد نے ورکنگ کمیٹی کو سخت طعن و تشنیع کا ہدف بنایا ہے۔ پریس کا یہ رویہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارے ملک کی صحافت میں غیر جانب داری اور جرأت کے جوہر موجود ہیں اور یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔ میری عادت ہے کہ میں اپنے مخالفین کے غلط یا صحیح ہونے کے بارے میں جلد رائے قائم نہیں کیا کرتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ کہنے پر بھی مجبور ہوں کہ ہمارے معترضین نے کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے ریزولیوشن پر جس قدر جرح و قدح کی ہے اس سے یہ بالکل ثابت نہیں ہو سکا کہ ہم نے گورنر سے کسی قسم کی زیادتی یا ناانصافی کی ہے۔ اس کا بہترین فیصلہ وقت کرے گا۔ ذرا سوچئے، کہ گورنر نے اس سارے ڈرامے میں کیا پارٹ ادا کیا ہے۔ پہلے تو اس نے ڈاکٹر کھرے اور ان کے دو ساتھیوں کے استعفے منظور کر لئے۔ پھر کابینہ کے باقی تین وزراء سے استعفے طلب کئے۔ جب انہوں نے استعفے داخل کرنے سے انکار کیا تو بے دریغ ان کو وزارت سے برطرف کر دیا گیا۔ اس تمام کارروائی میں پوری ایک رات آنکھوں میں کٹی۔ گورنر خود بھی جاگتا رہا۔ اس کے سٹاف کے آدمی بھی جاگتے رہے اور غریب وزیروں کو بھی رات بھر جگائے رکھا۔ گورنر کی اس جلد بازی کو میں سوائے بد تمیزی کے اور کیا کہہ سکتا ہوں۔

یہ صحیح ہے کہ گورنر کا یہ فعل آئین اور قانون کے عین مطابق ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ کانگرس اور برطانوی حکومت کے درمیان جو "خاموش معاہدہ" ہوا تھا گورنر کی اس کارروائی نے اس "معاہدے" کی روح کو کچل کر رکھ دیا ہے۔

جو لوگ بڑھ چڑھ کر ورکنگ کمیٹی کے ریزولیوشن پر اعتراض کر رہے ہیں انہیں چاہئے کہ وائسرائے کے اس اعلان کا مطالعہ کریں جو اس نے نہایت محنت سے مرتب کیا تھا۔ اور جس میں علاوہ دیگر امور کے کانگرس سے وزارتیں قبول کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ اس اعلان کا مطالعہ کرنے کے بعد انہیں سوچنا چاہئے کہ کیا یہ گورنر کا فرض نہ تھا کہ اپنا فیصلہ صادر کرنے کی بجائے باضابطہ اس کارروائی کو پیش نظر رکھتا جو ورکنگ کمیٹی اور ڈاکٹر کھرے اور ان کے رفیقوں کے درمیان اس وقت جاری تھی؟ یہ ناقابل تردید واقعات ہیں جو زبان حال سے صرف ایک بات کی شہادت دے رہے ہیں یعنی یہ کہ گورنر محض کانگرس کو ذلیل کرنے کے جنون میں مبتلا تھا۔ اور اس جنون آمیز خواہش کی تکمیل کے لئے یہ سارا کھیل کھیلا گیا تھا۔ برطانوی حکومت اور کانگرس کے درمیان جو ان لکھا خاموش معاہدہ ہوا تھا، وہ گویا شریف آدمیوں کا معاہدہ ہے جس کا احترام کرنا فریقین کا فرض ہے۔

اندریں حالات ورکنگ کمیٹی کے ریزولیوشن سے برطانوی حکمرانوں کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے نہ کہ ان کی مذمت کا جیسا کہ ہمارے معترضوں نے خیال کر لیا ہے۔ انگریز عام طور پر "سپورٹس مین" کہلاتے ہیں ان کی حس مزاح بھی خوب تیز ہے۔ مار کھاتے وقت وہ اپنا توازن قائم رکھتے ہیں۔ اور جب دوسروں کو مارنے پر اتر آتے ہیں تو تھپڑ بھی زناٹے کا رسید کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ کانگرس کے اس ریزولیوشن سے گورنر بُرا نہیں مانے گا۔

بہرحال، ورکنگ کمیٹی نے گورنر کے فعل پر جس ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ ایسا کرنا ہمارا فرض تھا۔ کانگرس کسی سے لڑائی مول لینا نہیں چاہتی لیکن اگر کوئی لڑنے پر آمادہ ہو جائے تو پھر ہم بھی آستینیں چڑھا کر لڑنا مرنا جانتے ہیں۔ اگر حکومت کی نیت بخیر ہے اور وہ لڑائی جھگڑے سے بچنا چاہتی ہے تو اس کا فرض ہے کہ کانگرس کو ایک ایسی ہمہ گیر، قومی جماعت تسلیم کرے جو آج نہیں تو کل ہندوستان میں برطانوی حکومت کی جانشین بننے والی ہے۔ یو۔ پی۔ بہار اور اڑیسہ کی حکومتوں میں

بھی چند بحرانی دور آئے تھے۔ لیکن ان تینوں صوبوں کے گورنروں نے کسی قسم کا قدم اٹھانے کی بجائے کانگرس کے فیصلہ کا انتظار کیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ وہاں حالات اس قسم کے تھے کہ ان تینوں گورنروں کا مفاد بھی یہی تھا کہ پہلے دیکھیں کہ کانگرس کیا فیصلہ کرتی ہے۔ کیا ہم یہ باور کر لیں کہ سی۔ پی کے حالات اس نوع کے تھے کہ وہاں برطانوی حکومت کا مفاد یہی تھا کہ بحران طاری کر کے کانگرس کو پریشان کیا جائے۔ ورکنگ کمیٹی کا ریزولیوشن برطانوی حکومت کو ایک قسم کی دوستانہ تنبیہ ہے کہ کان کھول کر سن لو۔ اگر تم کانگرس سے کھلم کھلا لڑائی مول نہیں لینا چاہتے تو آئندہ ہرگز ایسی حرکت نہ کرنا جیسی تم نے ۲۰۔ جولائی کو ناگپور میں کی تھی۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں یہاں کانگرس کا طریق کار اور مقصد واضح کر دوں۔ جہاں تک اندرونی نشوونما اور نظم و نسق کا تعلق ہے، کانگرس صحیح معنوں میں ایک جمہوری ادارہ ہے۔ اور ہر لحاظ سے دنیا کے بہترین جمہوری اداروں کے ہم پلّہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ نکتہ بھی یاد رہنا چاہئے کہ یہ جمہوری ادارہ صرف اس لئے قائم کیا گیا ہے کہ دور حاضرہ کی سب سے بڑی امپیریل حکومت کا مقابلہ کرے۔ لہٰذا کانگرس کی حیثیت ایک فوج کی بھی ہے۔ چنانچہ جب ہم کانگرس کو ایک فوج قرار دیتے ہیں تو معاً اس کی جمہوری حیثیت ختم ہو جاتی ہے اور ورکنگ کمیٹی تمام اختیار و اقتدار کی مالک بن جاتی ہے۔ اس لحاظ سے ورکنگ کمیٹی کانگرس کی تمام اندرونی شاخوں کو زبردستی اپنا حکم منوانے کی مجاز ہے۔ کانگرس کی تمام صوبائی شاخیں اور جملہ صوبائی پارلیمنٹری بورڈ کانگرس کے اس مرکزی ادارے کے تابع ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ کانگرس کی یہ ڈکٹیٹرانہ حیثیت جنگ کی حالت میں مناسب ہو سکتی ہے۔ یعنی اگر سول نافرمانی جاری ہو تو بلاشبہ ورکنگ کمیٹی کو مختار مطلق بن جانا چاہئے۔ لیکن ایسی صورت میں جبکہ حالات اعتدال پر ہیں اور سول نافرمانی بھی بند کر دی گئی ہے، ورکنگ کمیٹی کا مختار مطلق بننا ٹھیک نہیں۔ ہمارے معترض یہ رائے پیش کرتے وقت اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ سول نافرمانی بند کر دینے سے یہ مراد نہیں کہ جنگ

بھی گویا بند کر دی گئی ہے۔ جنگ تو اس وقت بند ہو گی جب ہندوستان خود اپنا دستور مرتب کرے گا جب تک یہ نہیں ہوتا، کانگرس کی حیثیت بدستور ایک فوج کی سی رہے گی۔

برطانیہ کو اپنی جمہوریت پر بڑا ناز ہے۔ لیکن اس نے ہندوستان میں جو نظام حکومت رائج کیا ہے اس کی ظاہر ٹیپ ٹاپ اتار کر دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ سو فیصد فوجی راج ہے۔ ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا طرز حکومت بھی فوجی راج سے کچھ کم نہیں۔ صوبائی وزیروں کی حیثیت مٹی کے کھلونوں سے زیادہ نہیں۔ ضلع کے کلکٹر اور پولیس افسر بظاہران وزیروں کو جناب اور حضور کہہ کر خطاب کرتے ہیں۔ لیکن گورنر سب کا حاکم اعلیٰ ہے۔ وہ آج حکم دے تو یہی کلکٹر اور پولیس افسر طرفۃ العین میں ان وزیروں کو ان کی گدیوں سے نیچے گرا کر اور گرفتار کر کے حوالات میں بند کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اعلان کیا ہے کہ کانگرس نے وزارتیں اس لئے قبول نہیں کیں کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کو اس سپرٹ کے مطابق چلایا جائے جس سپرٹ سے برطانوی حکومت نے اسے وضع کیا تھا۔ بلکہ کانگرس کا مقصد یہ ہے کہ اس ایکٹ پر اس طرح عمل کرے جس سے وہ دن جلد از جلد آئے جب ہم اس ایکٹ کی جگہ آزاد ہندوستان کا دستور وضع کریں گے۔

اندریں حالات جب کانگرس نے ایک فوج کی حیثیت اختیار کر لی ہے تو یہ لازم آتا ہے کہ تمام جملہ اختیار واقتدار ورکنگ کمیٹی کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ وہی کانگرس کی ہر شاخ، ہر کارکن، ہر والنٹیر اور ہر چھوٹے بڑے لیڈر پر اپنا حکم چلائے۔ اور اس کو سیدھے رستے سے ادھر ادھر نہ بھٹکنے دے۔ صرف اسی ایک طریقہ سے جنگ لڑی جا سکتی ہے۔

ہمارے معترض یہ الزام دھرتے ہیں کہ یہ طرز عمل خالص فاشزم ہے۔ لیکن انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ فاشزم تو شمشیر برہنہ ہوتا ہے۔ اگر کانگرس فاشزم پر کاربند ہوتی تو ڈاکٹر کھرے کو اپنا سر کٹوانا پڑتا۔ کانگرس اور فاشزم میں بعد المشرقین ہے۔ کیونکہ کانگرس کا بنیادی عقیدہ عدم

تشدد ہے۔ اور جس طاقت پر اس کا انحصار ہے وہ سراسر اخلاقی طاقت ہے کانگرس اٹلی کے سیاہ قمیصوں والے مسلح اور ہتھیار بند فاشی رضا کاروں کے زور پر حکومت نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر کھرے کی نکسیر تک نہیں پھوٹی۔ وہ آج بھی ناگپور کے ہیرو بن کر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور ان کی حمایت میں ناگپور کے علاوہ بعض دوسرے شہروں کے طلبہ اور عوام بھی مجھے اور کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کو گالیاں دے رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود کسی نے ان سے تعرض نہیں کیا۔ اور کسی کا بال تک بیکا نہیں ہوا۔

یہ کانگرس کی عظمت اور طاقت کا ثبوت ہے. کمزوری کا نشان نہیں۔ میری معلومات کے مطابق آج ساری دنیا میں صرف کانگرس ہی ایک ایسی قابل ذکر سیاسی جماعت ہے جس کا دارومدار عدم تشدد پر ہے۔ لاریب اس پر کانگرس جتنا فخر کرے تھوڑا ہے۔ لوگوں کی حالت یہ ہے کہ کسی قسم کے جبر و اکراہ سے نہیں بلکہ دلی مسرت اور روحانی یگانگت سے کانگرس کے حلقہ بگوش ہیں۔ ڈاکٹر کھرے جیسے پرانے اور آزمودہ کار کانگرسی بھی جب تک چاہیں انشراح صدر کے ساتھ کانگرس میں رہ کر کام کر سکتے ہیں[۱]"۔

گاندھی جی کے اس دلچسپ اور معنی خیز مضمون میں بہت سی سبق آموز باتیں درج ہیں، جن پر اس وقت تفصیلی بحث نہیں کی جا سکتی۔ پڑھنے والے اپنے اپنے فہم اور ذوق کے مطابق ان سے نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔ لیکن جو چیز خصوصیت سے قابل غور ہے، وہ یہ ہے کہ جب کبھی مسٹر جناح اور گاندھی جی کے درمیان مذاکرات شروع ہوئے۔ مسٹر جناح کا اولین مطالبہ یہ تھا کہ میں مسلم لیگ کا نمائندہ بن کر آپ سے گفتگو کرنے کو تیار ہوں۔ آپ کانگرس کے نمائندے کی حیثیت سے بات کیجئے۔ جواب میں گاندھی جی نے ہمیشہ یہ عذر پیش کیا کہ میں تو کانگرس کا چار آنے کا ممبر بھی نہیں۔ میں کانگرس کی نمائندگی کیوں کر کر سکتا ہوں۔ چنانچہ گاندھی اور جناح کی مراسلت اور مذاکرے دونوں اسی چٹان سے ٹکرا کر ناکام ہوتے رہے۔

گاندھی جی نے ڈاکٹر کھرے کی برطرفی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے جو بیان "ہریجن"

---

۱۔ انڈین اینول رجسٹر ۱۹۳۸ء جلد دوم۔ صفحہ ۲۶۹۔ ۲۶۷

میں شائع کیا تھا۔ اس کا ایک ایک لفظ پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہی شخص گاندھی کانگرس کا مالک۔ ڈکٹیٹر۔ مختار مطلق۔ پالیسی بنانے والا معمار اور نجات دہندہ ہے جس کی مرضی کے بغیر کوئی شخص کانگرس میں سانس لینے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ اور جس کو ناراض کرنے کے بعد کسی شخص کا کانگرس کے اندر رہنا ناممکن تھا۔ بایں ہمہ گاندھی جی بوقت ضرورت، نہایت معصومیت سے، یہ عذر پیش کرنا جانتے تھے کہ میری کیا حیثیت ہے۔ میں تو کانگرس کا چونی کا ممبر بھی نہیں ہوں۔

ایسے طرفہ معجون شخص کے ساتھ کوئی سیاسی مفاہمت کرنا یا کوئی معاملہ طے کرنا گویا بازی گری کے کرتب دکھانے کے مترادف تھا۔[1]

پارلیمنٹری نظام کا یہ بنیادی اصول ہے کہ جب وزیر اعظم اپنے عہدے سے مستعفی ہو تو ساتھ ہی پوری کابینہ ختم ہو جاتی ہے۔ انگلستان کی تاریخ میں متعدد مثالیں ایسی موجود ہیں۔ لیکن گاندھی جی کہتے ہیں کہ ہم نے عہد کر لیا ہے کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کو اس سپرٹ کے مطابق نہیں چلائیں گے جس سپرٹ سے ایکٹ بنانے والوں نے اسے وضع کیا ہے بلکہ ہمارا الگ مفہوم ہے۔ الگ طریق کار ہے۔ الگ سپرٹ ہے۔ الگ نظام ہے اور الگ آئینی دستور ہے۔

---

[1] وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو کو بھی یہی شکایت تھی کہ کبھی تو گاندھی جی کانگرس کے نمائندے بن کر ان سے گفتگو کرنے آتے ہیں۔ اور کبھی یہ کہتے ہیں کہ میں تو چونی کا ممبر بھی نہیں۔ میری کیا حیثیت ہے کہ کانگرس کی نمائندگی کروں۔ گاندھی جی کے اس دو رخے پن نے ہندوستان کی سیاست میں سخت الجھنیں پیدا کر دی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ فرقہ وارانہ مفاہمت ہو سکی نہ ہندو مسلمان مل کر برطانوی حکومت کے سامنے کوئی متحدہ مطالبہ پیش کر سکے۔ اور نہ بروقت آئینی ترقی کی جانب کوئی قدم ہی اٹھایا جا سکا۔ گاندھی جی کے اس پراسرار طرز عمل کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ ان کے ایک نہایت مخلص چیلے سیٹھ گھنشیام داس برلا کو بھی یہی شکایت ہے۔ برلا جی نے ۱۲۔ اپریل ۱۹۴۰ء کو وائسرائے سے مل کر جو روئداد قلم بند کی تھی۔ اس میں لکھتے ہیں:

> "انہوں نے (لارڈ لنلتھگو نے) سخت شکایت کی کہ جب بھی گاندھی جی ان سے ملنے آتے ہیں تو صاف لفظوں میں یہ کہتے ہیں کہ میں کانگرس کا نمائندہ نہیں ہوں۔ اس سے انہیں (وائسرائے کو) بہت زحمت اور پریشانی ہوتی ہے۔ اور ملاقات کے خاتمے پر وہ (وائسرائے) یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ گویا ہوا میں معلق ہیں۔ لطف یہ ہے کہ جب دوسری مرتبہ گاندھی جی ان سے (وائسرائے سے) ملنے آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ میں کانگرس کا نمائندہ ہوں۔ مجھے وائسرائے سے مل کر اس بات کا احساس ہوا کہ وہ سخت دل شکستہ اور اداس ہیں اور گاندھی جی کے رویئے سے بہت نالاں بھی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے ہر چند معاملات کو سلجھانے کی کوشش کی لیکن گاندھی جی کچھ بھی نہیں کرتے۔"

"In the Shadow of the Mahatma" by G.D. Birla(1953) : Page 299

لا محالہ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کانگرس نے الیکشن میں کیوں حصہ لیا تھا۔ کانگرسی ممبروں نے کیوں اسمبلیوں کے ایوانوں میں داخل ہو کر حلف وفاداری اٹھایا تھا۔ اور کیوں وزارتیں قبول کی تھیں؟

جواب میں گاندھی جی اور پنڈت نہرو کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم اسمبلیوں میں صرف اس لئے داخل ہوئے ہیں کہ موجودہ آئین کے پُرزے پُرزے کئے جائیں۔ اِس تعلّی پر ہندوستان کے ایک بہت بڑے قانون دان اور کانسٹی ٹیوشن کے ماہر اور حکومت بنگال کے سابق وزیر، سربجے پرشاد سنگھ رائے نے کہا ہے کہ:

"کانسٹی ٹیوشن کو توڑنے کا یہ دعویٰ گاندھی اور نہرو کی صرف زبانوں پر تھا دلوں میں نہیں تھا............ واقعہ یہ ہے کہ کیا کانگرسی اور کیا غیر کانگرسی وزیر سبھی نے ان تمام حدود اور پابندیوں کے اندر رہ کر کام کرنے کا وعدہ کیا تھا جو ۱۹۳۵ء کے ایکٹ نے عائد کی تھیں۔ یہ جو کانگرسی وزیر گاہے گاہے اس قسم کا نعرہ لگاتے تھے کہ ہم آئین کو پُرزے پُرزے کر دیں گے۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ کانگرس کے بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے سرپھروں کو خاموش کیا جا سکے۔ کانگرس نے ۱۹۳۹ء کے آخر میں وزارتیں اس لئے ترک نہیں کی تھیں کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی پابندیوں نے انہیں بے بس کر دیا تھا۔ بلکہ صرف اس لئے کہ وہ جنگ میں شرکت کرنا نہیں چاہتی تھی" [1]۔

ڈاکٹر کھرے نے ۱۹۵۹ء میں اپنی خود نوشت سوانح عمری شائع کی تھی۔ اس میں ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ گاندھی جی کا یہ دعویٰ کہ کانگرس ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کو توڑنے کے لئے اسمبلیوں میں داخل ہوئی تھی سراسر فریب ہے۔ اس کے برعکس گاندھی جی نے راج گوپال اچاری کے ذریعہ سے مدراس کے گورنر لارڈ ارسکائن [1] کو یقین دلایا تھا کہ ہم نئے آئین پر لفظاً و معناً" عمل کرنے کو تیار ہیں۔ گاندھی کی اس یقین دہانی کا نتیجہ تھا کہ لارڈ ارسکائن نے وائسرائے کو آمادہ کیا تھا کہ وہ ایک گول مول سا بیان جاری کر کے معاملے کو بخیر و خوبی ختم کر دیں۔ چونکہ وائسرائے کو در پردہ یقین دلایا جا چکا تھا کہ کانگرس کا یہ نعرہ کہ ہم آئین توڑیں گے محض ایک دِکھاوے کی چیز اور سیاسی شعبدہ بازی ہے۔ اس لئے لارڈ لنلتھگو نے اطمینان سے اپنا بیان شائع کرنے میں کوئی تامل محسوس نہ کیا۔

---

1. "Parliamentary Government in India" by B.P Singh Roy : Page215

1. Lord Erskine

ڈاکٹر کھرے کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:

"فیض پور کی کانگرس میں پنڈت نہرو نے بڑے زور شور سے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ کانگرس کی پالیسی کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ ہم وزارتیں قبول نہیں کریں گے۔ لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت بھی سب کو معلوم ہے کہ گاندھی جی اور راجہ جی کے خیالات اس بارے میں مختلف تھے اور یہ حقیقت بھی سب کو معلوم ہے کہ گاندھی جی نے یہ شرط عائد کر دی تھی کہ جب تک صوبوں کے گورنر یہ وعدہ نہیں کریں گے کہ روز مرہ نظم و نسق میں دخل دینے اور اپنے اختیارات خصوصی کے استعمال سے اجتناب کریں گے۔ کانگرس صوبائی وزارتیں قبول نہیں کرے گی۔

ہوا یہ کہ ۱۹۳۷ء کی گرمیوں میں گاندھی جی بحالیٔ صحت کے لئے ٹیتھل میں مقیم تھے جو ساحل بحریہ پر ایک خوشگوار مقام ہے انہی دنوں راجہ جی نے نہایت خفیہ طریق سے مدراس کے گورنر لارڈ ارسکائن سے جا کر ملاقات کی تھی۔ حالانکہ یہ کانگرس کے ڈسپلن کے بالکل خلاف تھا۔ اس کے بعد راجہ جی ٹیتھل جا کر گاندھی جی سے ملے۔ جب اخباروں میں اور عوام میں بھی چہ میگوئیاں شروع ہوئیں کہ راجہ جی کی گاندھی جی سے کیا گفتگو ہوئی ہے تو راجہ جی نے اس اضطراب کو رفع کرنے کے لئے یہ گپ ہانک دی کہ میں ٹیتھل گاندھی جی سے اپنشد کے دقیق مسائل پر باتیں کرنے گیا تھا۔

سچی بات یہ ہے کہ راجہ جی کی یہ گپ محض ایک فریب تھی۔ اصلی واقعہ یہ ہے کہ راجہ جی نے مدراس کے گورنر لارڈ ارسکائن کو جا کر یقین دلایا تھا کہ کانگرس کا ہرگز یہ ارادہ نہیں کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کو توڑا جائے بلکہ ہم تو اس آئین پر اسی طرح عمل کریں گے جیسے کہ لبرل پارٹی کے لوگ ۱۹۱۹ء کے ایکٹ پر کرتے رہے ہیں۔ اس کے بعد راجہ جی نے ٹیتھل جا کر گاندھی جی کی خوشنودی اور رضامندی حاصل کی۔

جب مدراس کے گورنر نے ہندوستان کے وائسرائے لارڈ لنلتھگو کو یقین دلا دیا کہ کانگرس آئین کو توڑنے کا بالکل ارادہ نہیں رکھتی تو وائسرائے نے بھی گاندھی کو مطمئن کرنے کے لئے ایک بیان جاری کر

دیا۔ اس سودے بازی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جولائی ۱۹۳۷ء کے وسط میں
کانگرس نے اپنی اکثریت کے صوبوں میں وزارتیں مرتب کیں " ۱۔

ڈاکٹر کھرے بڑے نڈر اور لڑ مرنے والے آدمی تھے۔ انہوں نے کانگرس سے نکالے جانے کے بعد خم ٹھونک کر گاندھی۔ پٹیل اور نہرو کا مقابلہ کیا اور یہ جنگ انہوں نے گاندھی جی کے مرنے کے بعد بھی اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک ترک نہیں کی بلکہ جاری رکھی۔

جس بلند آہنگی سے انہوں نے اپنی وزارت عظمیٰ سے برطرفی اور کانگرس کی چیرہ دستی اور فاشیئت کا پول کھولا اس کا ایک ٹکڑہ یہاں درج کرنا بے محل نہ ہو گا۔

"...میں نے ۱۹۳۸ء کی گرمیوں میں پنچ مڑھی سے مہاتما گاندھی کو خط لکھ کر ملاقات کی درخواست کی تاکہ میں اپنی وزارت کے جملہ حالات ان کے سامنے پیش کر سکوں۔ مہاتما جی نے فوراً جواب دیا اور ۱۲ جون ۱۹۳۸ء کا دن ملاقات کے لئے مقرر کیا۔ میں حاضر ہوا اور تمام واقعات گوش گزار کرنے کے علاوہ بعض سرکاری اور غیر سرکاری کاغذات بھی ان کے سامنے پیش کئے۔ گاندھی جی نے ان کاغذات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد بڑی سنجیدگی سے فرمایا کہ ایسے لوگوں کو جن کی دیانت اس قدر مشتبہ ہے کابینہ میں ہرگز نہیں رکھنا چاہئے یہ کہہ کر انہوں نے مجھ سے بڑی ہمدردی اور شفقت کا اظہار کیا اور کہا انہیں میری جملہ مشکلات کا پورا احساس ہے۔

میں نے مہاتما جی کی اس ہمدردی کا شکریہ ادا کیا۔ لیکن رخصت ہونے سے پہلے میں نے زبانی عرض کیا کہ اگر آپ اسی سلسلہ میں، دو ہفتے کے بعد مجھے پھر ملاقات کا موقع عطا فرمائیں تو بہت ممنون ہو نگا۔ انہوں نے بڑی خوشی سے وعدہ کیا۔ چنانچہ میں حسب وعدہ دو ہفتے کے بعد ۲۹ جون ۱۹۳۸ء کو پھر حاضر ہوا۔

اس ملاقات کے دوران میں، میں نے ایک خط انہیں دکھایا جو مکتوب الیہ تک پہنچنے سے پہلے ہی میرے ہاتھ آگیا تھا۔ ستم بالائے ستم اور حیرت بالائے حیرت یہ ہے کہ خط دیکھتے ہی مہاتما جی سخت غصے میں

1. "My Political Memoirs or Autobiography" by Dr. N.B Khare

آ گئے۔ اور طیش کے عالم میں مجھ سے کہنے لگے کہ تم بار بار آکر مجھے تنگ کرتے ہو۔ بھلا مجھ کو ان کاموں سے کیا سروکار میں تو کانگرس کا چار آنے کا ممبر بھی نہیں ہوں۔

مہاتما جی کی یہ قلب ماہیت دیکھ کر میں حیران و ششدر رہ گیا۔ چنانچہ مجھے بھی غصہ آیا۔ اور میں نے وہیں ان کے منہ پر کہا کہ جی ہاں مجھے معلوم ہے کہ آپ کانگرس کے چونّی کے ممبر نہیں ہیں۔ کیونکہ میں بھی کانگرس میں شامل ہوں۔ لیکن اس کے باوجود میں اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہوں کہ کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے آپ ہی خالق، مالک، کرتا دھرتا اور ڈکٹیٹر ہیں۔ اور آپ کی اسی حیثیت کو پیش نظر رکھ کر میں آپ سے ملنے آیا ہوں۔ جب میں پہلی بار آپ کی ملاقات کو آیا تھا تو آپ نے خط لکھ کر مجھے آنے کی اجازت دی تھی اور اب جو آپ سے ملنے آیا ہوں تو آپ نے پچھلی مرتبہ زبانی مجھے اس کی اجازت دی تھی۔ ان دونوں موقعوں پر آپ کانگرس کے چار آنے کے ممبر نہیں تھے۔ تعجب ہے کہ آپ نے پہلے یہ عذر کیوں پیش نہ کیا کہ آپ چونّی کے ممبر نہیں ہیں۔ اور اب یہ عذر تراشنے میں کیا مصلحت ہے۔ معاف کیجئے گا۔ یہ عذر محض ایک ڈھونگ ہے جسے بازار کا ایک معمولی آدمی بھی قبول کرنے کو تیار نہیں۔ آپ تو مہاتما کہلاتے ہیں۔ آپ کو اس قسم کی باتیں زیبا نہیں۔

بہرحال اب میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ اور جو پردہ درمیان میں حائل تھا وہ بھی اُٹھ گیا ہے۔ آئندہ میں کبھی آپ کے پاس نہیں آؤں گا۔ نہ کسی اور ا۔ ب۔ ج۔ د، وغیرہ کے پاس مجھے جانے کی ضرورت ہے۔ بلکہ جس قسم کے حالات پیش آئیں گے میں اپنی اندرونی آواز کے مطابق فیصلہ کروں گا اگرچہ میں بہت معمولی آدمی ہوں۔ لیکن میری اندرونی آواز آپ کی اندرونی آواز سے کمزور نہیں ہے۔"

میں نے اس طرح اپنے دل کی بھڑاس نکال کر مہاتما گاندھی سے عرض کیا کہ کیا مجھے ایک بات پوچھنے کی اجازت ہے؟ انہوں نے کہا ہاں پوچھئے۔ میں نے عرض کیا۔ یہ بتائیے کہ کیا ۱۲ - جون اور ۲۹ جون ۱۹۳۸ء کے درمیان سردار پٹیل آپ سے کسی روز آکر ملے تھے۔ مہاتما

نے کہا ہاں ۲۱ / جون ۱۹۳۸ء کو سردار پٹیل آئے تھے۔ میں نے فوراً کہا۔ بس میں سمجھ گیا کہ آپ نے یکایک یہ پلٹا کیوں کھایا ہے۔

اس کے بعد میں نے ان سے اجازت لی اور واپس ناگپور آگیا۔ چند روز بعد جب صورت حال بہت خراب ہو گئی تو میں نے وزارت توڑنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے کابینہ کے رفیقوں سے درخواست کی کہ اپنے استعفےٰ لکھ کر مجھے دے دو۔ چنانچہ میرے کہنے کے مطابق مراٹھی علاقے سے تعلق رکھنے والے دونوں وزیروں نے استعفےٰ میرے حوالے کر دیئے۔ البتہ مہاکوشل کے تینوں وزیر سیدھے وردھا جا کر کانگرس کے صدر شری راجندر پرشاد سے ملے۔ راجندر پرشاد نے انہیں تحریری ہدایت کی کہ ہر گز اپنے استعفےٰ ڈاکٹر کھرے کو نہ دو۔ کانگرس کے آئین کے تحت شری راجندر پرشاد کو اس قسم کا تحریری حکم دینے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ وہ صرف پارلیمنٹری سب کمیٹی کے ایک ممبر تھے۔ اور اس حیثیت سے ان کی ذاتی ذمہ داری کا حلقہ صرف بہار اور اڑیسہ تک محدود تھا۔ مدراس۔ بمبئی اور سی۔ پی کے صوبے سردار پٹیل کے تحت تھے۔ اس لئے صاف ظاہر ہے کہ شری راجندر پرشاد نے یہ حکم جاری کر کے اپنے اختیارات سے تجاوز کیا تھا۔ اور اس طرح ضابطے کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے تھے۔ لیکن کسی نے ان سے جواب طلبی نہیں کی۔ یہی امر ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ میرے خلاف سازش میں کون کون لوگ شریک تھے۔

اگر میرے مہاکوشل کے رفیق جمہوری روایات کے مطابق اپنے استعفےٰ میرے حوالے کر دیتے تو میں پہلا کام یہ کرتا کہ تمام وزراء کے استعفےٰ کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے سامنے رکھ دیتا۔ اور جو فیصلہ وہاں سے صادر ہوتا اس کی پابندی کرتا۔ لیکن جو کچھ اوپر عرض کیا گیا ہے، اس سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ مجھے ورکنگ کمیٹی سے کبھی انصاف نہیں مل سکتا تھا۔ کیونکہ سردار پٹیل۔ راجندر پرشاد اور گاندھی جیسی عظیم ہستیاں میرے خلاف ادھار کھائے بیٹھی تھیں اور مہاکوشل والوں کی صریحاً طرف داری کر رہی تھیں۔ لہٰذا میرے لئے اس کے سوا

کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ اپنا اور اپنے دو مہاراشٹری رفیقوں کا استعفا گورنر کو پیش کر دوں۔

اس کے بعد گورنر سر فرانس وائلی نے مہاکوشل کے وزیروں کو مشورہ دیا کہ جمہوری روایات کے مطابق آپ بھی استعفا دے دیجئے لیکن انہوں نے انکار کیا۔ اب جمہوری طریق کار کے مطابق گورنر صرف یہی کر سکتا تھا کہ تینوں مہاراشٹری وزراء کے استعفے منظور کر کے مہاکوشل کے وزیروں کے عہدوں کی میعاد بھی ختم کر دی جائے۔ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی دفعہ نمبر ۵۱ کے تحت گورنر اس بات کا مجاز تھا۔ اسے خاص اختیارات استعمال کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے یہ الزام جو لگایا ہے کہ ڈاکٹر کھرے نے اپنے طرز عمل سے گورنر کو گویا مجبور کر دیا کہ وہ اپنے اختیارات خصوصی کو کام میں لا کر وزراء کو برطرف کرے قطعی غلط اور بے بنیاد ہے۔

ازروئے قانون، گورنر بغیر وزارت مرتب کئے صوبے کا نظم و نسق نہیں چلا سکتا تھا۔ لہٰذا مجھے اس نے دوبارہ طلب کر کے درخواست کی کہ میں نئی وزارت تشکیل کروں۔ وجہ یہ تھی کہ میں بدستور اسمبلی کی اکثریت والی پارٹی کا لیڈر تھا۔ چنانچہ میں نے نئی وزارت مرتب کی جو سراسر کانگرسی وزارت تھی اور کانگرس ہی کے اصول اور پروگرام کے تحت بنائی گئی تھی۔ جمہوری طریق کار کی رُو سے میرا یہ فعل بالکل جائز اور صحیح تھا۔ اس کے باوجود کانگرس نے بغیر جملہ امور کی تحقیقات کئے، مجھ پر یہ بہتان لگا دیا کہ میں نے گورنر کا آلہ کار بن کر کانگرس کے وقار کو تباہ کیا ہے۔ یہ بہتان دراصل اس واسطے لگایا گیا تھا کہ کانگرس اپنی ان سازشوں کی پردہ پوشی کرنا چاہتی تھی جو وہ میرے خلاف کر رہی تھی۔

جس ملک میں غیر قوم کی حکومت قائم ہو وہاں ہر شخص کے خلاف نہایت آسانی بلکہ دیدہ دلیری سے یہ الزام لگایا جا سکتا ہے کہ فلاں شخص بدیشی گورنر کا آلہ کار بن گیا ہے۔ کیونکہ ان حالات میں لوگ آسانی

سے یہ بات ماننے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ کانگرس نے اسی قسم کا الزام مجھ پر بھی عائد کیا۔ اور بغیر تحقیقات کئے مجھ کو وزارت عظمٰے سے برطرف کر دیا۔ اس واقعہ سے ہندوستان بھر میں طوفان اٹھ کھڑا ہوا جس کی صدائے بازگشت بہت سے بیرونی ممالک میں بھی سنی گئی۔ مشہور امریکی مصنف جان گنتھر نے اپنی کتاب "ایشیا کے اندر" میں لکھا ہے کانگرسی ہائی کمان نے صوبے کے ایک وزیر اعظم کے ساتھ وہ شرمناک سلوک کیا ہے جو ادنیٰ سے ادنیٰ مجرم سے بھی نہیں کیا جاتا۔[1]

وزارت عظمٰے سے برطرف ہونے کے بعد ڈاکٹر کھرے نے ناگپور کے جلسہ عام میں جو تقریر کی اس کا ایک ٹکڑا ملاحظہ فرمائیے۔

"کانگرس کی موجودہ ورکنگ کمیٹی بالکل قرون وسطےٰ کی اس "تھیاکریسی" کی مانند ہے جب یورپ کے تمام بادشاہ پوپ کے سامنے دو زانو ہوا کرتے تھے۔ اور پوپ ان بادشاہوں پر حکم چلا کر ہر قسم کا جائز و نا جائز فائدہ اٹھاتا تھا۔ مہاتما گاندھی بھی آج پوپ سے کم نہیں ہیں۔ بظاہر وہ کانگرس کے چونی کے ممبر بھی نہیں لیکن صورت حال یہ ہے کہ وہ کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے خالق و مالک ہیں۔ اور اس کمیٹی کے ذریعہ سے تمام کانگرسی حکومتوں سے جو کام چاہیں کروا سکتے ہیں۔ کانگرسی وزیروں کو دم مارنے کی مجال نہیں۔

رومن کیتھلک فرقے کی خوش عقیدگی اور تقلید جامد اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ لوگ مرنے والوں کی روحوں کو نجات ابدی دلوانے کے لئے پوپ کی خدمت میں زر نقد پیش کر کے جنت کے پروانے حاصل کیا کرتے تھے۔ جب اس قسم کی خرافات نے بڑھتے بڑھتے لوگوں کے لئے ایک عذاب کی صورت اختیار کر لی تو مارٹن لوتھر نے علم بغاوت بلند کیا اور اس سارے طلسم کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ یوں گویا ایک نئے فرقے نے۔ جس کا نام پراٹسٹنٹ ہے۔ جنم لیا۔

کانگرس کے اندر بھی کم و بیش یہی کیفیت جاری ہے۔ اگر آپ

---

1. "My Political Memoirs" Dr. N.B Khare(1959) Pages 12-14

مہاتما گاندھی کو پوپ قرار دیں تو پھر مجھے مارٹن لوتھر کا نام دیجئے کیونکہ میں نے بھی مہاتما گاندھی کے خلاف بغاوت کا جھنڈا کھڑا کیا ہے۔ جس کی پاداش میں مجھے کانگرس سے نکال دیا گیا ہے۔ یہ بات اب روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی ہے کہ کانگرس میں ہرگز کسی نوع کی جمہوریت نہیں۔ کانگرس کا صدر مہاتما گاندھی کے ہاتھ میں ایک مٹی کا کھلونا ہے۔ لیکن ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے کہ مہاتما جی کانگرس کے چونی کے ممبر بھی نہیں اور بار بار اپنی اس یگانہ حیثیت پر فخر بھی کرتے ہیں حالانکہ یہی وہ مہاتما ہے جو پس پردہ بیٹھ کر کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کو نامزد کرتا ہے۔

اگر آپ ہندوستان کی تاریخ پر ایک نظر ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ اس ملک کی سب سے بڑی بد بختی یہ ہے کہ لوگوں نے ہمیشہ ایک فرد واحد کو مختار مطلق ہی نہیں بلکہ دیوتا بنا کر اس کے آگے جبینیں جھکائی ہیں۔ کانگرس نے بھی اسی روش کو اپنے لئے نمونۂ عمل قرار دے کر اس کی پیروی شروع کر دی ہے۔ جب تک ہم اس شخصیت پرستی کے خلاف بغاوت نہیں کریں گے۔ کانگرس ایک جمہوری ادارہ نہیں بن سکے گی اور نہ صحیح معنوں میں ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑی جا سکے گی۔

مجھے یقین ہے کہ بالآخر کانگرس کے اندر اس قسم کی بغاوت ہو کر رہے گی۔ میں ایک بہت چھوٹا آدمی ہوں۔ مجھے پروا نہیں کہ میرا کیا حشر ہو گا لیکن جو آگ میں نے آج روشن کی ہے اس کے شعلے دور دور تک پھیلیں گے۔ اور آپ دیکھیں گے کہ کوئی دن کی بات ہے کہ یہ کانگرس کے بڑے بڑے لیڈر بھی گاندھی کی ڈکٹیٹر شپ کے خلاف بغاوت کریں گے۔ اور انہیں بھی اس جرم کی پاداش میں میری طرح کانگرس سے نکال دیا جائے گا۔

یہ ڈکٹیٹر شپ اس قدر ناقابل برداشت ہو گئی ہے کہ وہ لوگ بھی جنہیں گاندھی جی بہت عزیز سمجھتے ہیں یا جنہیں گاندھی جی کا قرب حاصل ہے، انجام کار اس مطلق العنانی کے خلاف یقیناً علم بغاوت بلند کریں گے۔ میں نے مطالبہ کیا تھا کہ میرے خلاف تحقیقات کرا کے دیکھ لیجئے کہ میرا کیا جرم ہے۔ لیکن کسی قسم کی تحقیقات کرائے بغیر مجھ کو

گاندھی جی نے میرے منصب سے برطرف کر دیا ہے۔ مجھے اس کی پروا
نہیں۔ میں اپنے ضمیر کے مطابق اپنی قوم کی بری بھلی خدمت جیسی مجھ سے
ممکن ہوگی، کرتا رہوں گا۔ لیکن آج میرے دل کے اندر سے یہ آواز نکل
رہی ہے کہ گاندھی جی مرنے سے پہلے اپنی قوم کا اعتماد کھو بیٹھیں گے۔
خدا انہیں اس دن کے لئے زندہ رکھے۔ "

حقیقت یہ ہے کہ نہرو۔ پٹیل۔ راجندر پرشاد۔ راج گوپال اچاری وغیرہ سراسر گاندھی کے تخلیق کئے ہوئے بت تھے جن کے اندر خود گاندھی جی نے روح پھونکی تھی۔ مسٹر جناح کی روش ابتدا سے یہ تھی کہ اگر ہندو مسلم اتحاد کے مسئلے پر گاندھی جی سے ان کی مفاہمت ہو جائے تو کانگرس سے اس پر مہر تصدیق لگوانا کچھ مشکل نہ ہو گا۔ لیکن گاندھی جی نے ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک مسلسل یہی اصرار کیا کہ میں تو چار آنے کا ممبر بھی نہیں ہوں۔ میں کانگرس کا نمائندہ کیونکر بن سکتا ہوں۔ گاندھی جی کا یہ بار بار بات ٹالنے کا انداز اور یہ بار بار پہلو بدلنے کا رنگ دیکھ کر ان کے حواریوں کے حوصلے بھی بلند ہو گئے تھے۔ چنانچہ آخر وقت تک مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان جس قدر مذاکرے ہوئے ان کی ناکامی کے صرف دو سبب تھے ایک یہ کہ گاندھی جی کا ارشاد تھا کہ میں کانگرس کا چونی کا ممبر بھی نہیں ہوں۔ دوسرا گاندھی جی کا یہ دعویٰ تھا کہ کانگرس ہندوستان کی تنہا نمائندہ جماعت ہے۔ چنانچہ گاندھی جی نے ڈاکٹر کھرے کے خلاف جو مضمون اپنے اخبار "ہریجن" میں لکھا تھا اس کا یہ فقرہ قابل غور ہے:

"اگر حکومت کی نیت بخیر ہے اور وہ لڑائی جھگڑے سے بچنا چاہتی ہے
تو اس کا فرض ہے کہ کانگرس کو ایک ایسی ہمہ گیر قومی جماعت تسلیم
کرے جو آج نہیں تو کل ہندوستان میں برطانوی حکومت کی جانشین بنے
گی۔ "

گاندھی جی کے اس فقرے کا مفہوم وہی ہے جو پنڈت نہرو کے اس بلند بانگ دعوے کا تھا جو انہوں نے ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے وقت کلکتہ میں کہا تھا کہ:

"آج ہندوستان میں دو فریق ہیں۔ ایک برطانوی حکومت، دوسرا
کانگرس۔ باقی جس قدر جماعتیں ہیں ان کو فیصلہ کرنا ہو گا کہ وہ برطانوی
حکومت کا ساتھ دیں گی یا کانگرس کا۔ "

مسٹر جناح نے اس وقت بھی پنڈت نہرو کی للکار کا یہ جواب دیا تھا کہ:

"آج ہندوستان میں دو نہیں تین فریق ہیں۔ یعنی برطانوی حکومت

کانگرس اور ہم مسلمان۔ ہمارا اپنا پروگرام ہے۔ اپنی پالیسی ہے۔ اپنا نصب العین ہے۔ ہم کسی کے خیمہ بردار بننے کو تیار نہیں۔"

۲

# سوبھاش چندر بوس کا حشر

ہمیں کانگرس کے اندرونی نظام یا طریق کار یا اندرونی فساد یا اس کے بڑے بڑے لیڈروں کی باہمی سازشوں سے براہ راست کوئی سروکار نہیں۔ ہمیں اس بات سے بھی چنداں غرض نہیں کہ کانگرس کی کرسیٔ صدارت پر الف کا قبضہ مناسب تھا یاب کا۔ لیکن جیسا کہ میں گزشتہ باب میں عرض کر چکا ہوں کانگرس کی روحِ رواں گاندھی جی تھے۔ اور ان کی مرضی کے بغیر یا ان کے احکام کی خلاف ورزی کر کے بڑے سے بڑا کانگرسی لیڈر بھی اس جماعت میں ایک دن نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ تاہم ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ جب مسٹر جناح اور گاندھی جی کے درمیان ہندو مسلم مفاہمت کی گفتگو شروع ہوتی تھی۔ گاندھی جی یہ عذر پیش کر کے اٹھ کھڑے ہوتے تھے کہ "میں تو کانگرس کا چونی کا ممبر بھی نہیں ہوں۔ میں کیونکر کانگرس کی نمائندگی کا دعویٰ کر سکتا ہوں۔"

۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان جتنے مذاکرے ہوئے۔ ان کی تمام تر ناکامی کی وجہ گاندھی جی کی یہی ضد تھی۔ لیکن حالات و واقعات اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ کانگرس کے ناخدا صرف گاندھی جی تھے۔ ان کی مرضی کے بغیر کوئی شخص کانگرس کا صدر نہیں بن سکتا تھا۔ ان کی منظوری کے بغیر کانگرس کسی نوع کی تحریک جاری کرنے کی مجاز نہیں تھی۔ ان کی رضامندی کے بغیر کوئی کانگرسی لیڈر وزارت کے منصب پر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اگر گاندھی جی صاف دلی سے مسٹر جناح سے گفت و شنید کرتے اور چونی کی ممبری کے آڑ لے کر اپنے آپ کو بری الذمہ قرار نہ دیتے تو مسلم لیگ اور کانگرس یا بالفاظ دیگر مسلمانوں اور ہندوؤں کے قضیے کا باہمی تصفیہ انگریزی کی مداخلت کے بغیر ہو سکتا تھا۔

گاندھی جی کو کانگرس میں جو ہمہ گیر اقتدار حاصل تھا اس کی ایک مثال گذشتہ باب میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ جہاں ڈاکٹر کھرے کو محض اس لئے صوبجات متوسط کی وزارت عظمیٰ سے

سبکدوش ہونا پڑا تھا کہ گاندھی جی ان سے ناراض ہو گئے تھے۔ حالانکہ ڈاکٹر کھرے کو اپنے صوبے کی اسمبلی کے ممبروں کی اکثریت کی تائید حاصل تھی۔ اور وہ آئینی لحاظ سے یقیناً وزیر اعظم کے منصب پر قائم رہ سکتے تھے۔ اب ذرا دیکھئے کہ بنگال کے سب سے بڑے کانگری لیڈر سوبھاش چندر بوس کا حشر کیا ہوا۔ سوبھاش کا بھی ناقابل عفو قصور یہی تھا کہ گاندھی جی ان سے خوش نہیں تھے۔ سوبھاش کانگرس کا آئینی صدر تھا۔

مندوبین کی اکثریت نے اسے منتخب کیا تھا۔ لیکن چونکہ گاندھی جی کو سوبھاش پسند نہیں تھا۔ لہٰذا اس غریب کو ایسی سخت سزا دی گئی کہ انجام کار اسے وطن چھوڑ کر پردیس میں پناہ لینی پڑی۔ اور وہیں غریب الوطنی میں اپنی جان، جان آفریں کے حوالے کی۔

۱۹۲۰ء کے بعد، جب کانگرس کی رہنمائی میں ترک موالات اور سول نافرمانی کی تحریکیں شروع ہوئیں تو ہندوستان کے ہندوؤں نے دو بڑے ہونہار، قابل اور ایثار پیشہ نوجوان پیدا کئے تھے۔ ایک جواہر لال نہرو دوسرے سوبھاش چندر بوس۔ جواہر لال کی خوش قسمتی تھی کہ وہ بہت جلد گاندھی جی کے منظور نظر بن گئے اور انہی کی سرپرستی میں ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے اگست ۱۹۴۷ء میں بھارت کے وزیر اعظم کے منصب تک پہنچ گئے۔ سوبھاش میں ایک خاص قسم کی سرکشی تھی۔ جس کی سب سے بڑی وجہ بنگال اور گجرات کی پرانی سیاسی رقابت تھی۔ گاندھی جی گجراتی تھے اور سوبھاش بنگالی۔ اس لئے سوبھاش اپنی غیر معمولی قابلیت اور قربانی کے باوجود گاندھی جی کو خوش نہ کر سکے۔ سوبھاش نے ۱۹۲۰ء میں انگلستان میں آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان پاس کیا تھا۔ لیکن ملازمت کے سلسلے میں داخل ہونے سے قبل ہی انہوں نے انڈین سول سروس سے استعفا دے دیا۔ اور واپس ہندوستان جا کر ترک موالات کی تحریک میں شریک ہو گئے۔ جہاں انہیں دیگر سیاسی کارکنوں کی طرح قید و بند کے شدائد برداشت کرنا پڑے۔

فروری ۱۹۳۸ء میں سوبھاش چندر بوس کو کانگرس کے سالانہ اجلاس کی صدارت پیش ہوئی۔ جو احاطہ بمبئی کے ایک گاؤں ہری پورہ میں منعقد ہوا تھا۔ کانگرس کے کسی لیڈر کے لئے اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہو سکتا تھا کہ اس کی عمر بھر کی محنتوں اور مشقتوں کے اعتراف میں اسے کانگرس کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لئے منتخب کیا جائے۔ لیکن سوبھاش کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ اپنی صدارت کے زمانے میں گاندھی جی کو خوش نہ کر سکے، ہر چند کہ گاندھی جی کانگرس کے چونی کے ممبر بھی نہ تھے۔

جب سوبھاش کی صدارت کا ایک سال ختم ہو گیا تو ہندوستان کے ہر سیاسی ذوق رکھنے والے آدمی نے محسوس کیا کہ گاندھی جی کو سوبھاش کی آزادی فکر پسند نہیں اور وہ اسے چھٹی دینا چاہتے ہیں

۱۹۳۹ء میں کانگرس کا سالانہ اجلاس تریپوری میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا جس کی صدارت کے لئے تین آدمیوں کے نام تجویز ہوئے تھے۔ ایک مولانا ابوالکلام آزاد دوسرے ڈاکٹر پٹا بھائی ستیہ رمیّہ اور تیسرے سوبھاش چندر بوس۔ مولانا بہت جلد یہ میدان خالی کر گئے۔ لیکن جانے سے پہلے انہوں نے ایک اخباری بیان میں یہ اعلان کیا۔

"مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہے کہ ڈاکٹر پٹا بھائی سیتہ رمیّہ کا نام بھی صدارت کے لئے تجویز ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس خیال سے اپنا نام واپس لینے کو تیار ہو گئے تھے کہ میں غالباً اپنا نام واپس نہیں لوں گا۔ لیکن جب میں نے انہیں برابر سمجھایا کہ میں صدارت کا امیدوار نہیں ہوں تو میرے اصرار پر وہ کانگرس کی صدارت کے امیدوار بن گئے ہیں۔ وہ کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے پرانے رکن اور انتھک کام کرنے والے کارکن ہیں۔ میں کانگرس کے مندوبین سے پرزور درخواست کرتا ہوں کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو بلا مقابلہ منتخب کریں۔ مجھے امید ہے اور کوئی شخص ان کے مقابلے میں کھڑا نہیں ہو گا۔"

مولانا کا یہ بیان گاندھی جی کے ایماء سے اخباروں میں چھپوایا گیا تھا۔ اس سے پہلے کبھی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا تھا کہ صدارت کے کسی امیدوار نے اپنا نام واپس لیا ہو اور ساتھ پبلک سے پرزور سفارش بھی کی ہو کہ میری جگہ فلاں فلاں آدمی کو صدر منتخب کرو۔

سوبھاش نے یہ محسوس کر کے کہ اس کے خلاف یہ تمام تار گاندھی جی ہلا رہے ہیں، کھلے بندوں اعلان کر دیا کہ میں کانگرس کے آئندہ اجلاس کی صدارت کا امیدوار ہوں۔ مجھے ووٹ دو۔ سوبھاش کا یہ بیان بڑا دلچسپ تھا۔ اس نے کہا۔

"مولانا ابوالکلام آزاد نے صدارت کی امیدواری سے دست بردار ہوتے وقت جو بیان دیا ہے، اس نے صورت حال کو یکسر بدل دیا ہے۔ لہذا میں آنے والے صدارتی الیکشن کے بارے میں دو ایک لفظ کہنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ زیر بحث مسئلے نے اب ایک ذاتی نہیں بلکہ ایک قومی نوعیت اختیار کرلی ہے۔ اس لئے میں کسی قسم کے بے جا تکلف کو اپنے راستے میں حائل نہیں ہونے دوں گا۔ ہندوستان میں برطانوی امپیریلزم کے خلاف جو جدوجہد ہو رہی ہے، اس نے بہت سے نئے پروگرام، نئے افکار اور نئے زاویئے پیدا کر دیئے ہیں۔ لوگ آہستہ آہستہ اس

عقیدے کے حامی بنتے جا رہے ہیں کہ جس طرح دوسرے ملکوں میں صدر کا انتخاب خاص پالیسی اور پروگرام کے مطابق ہوتا ہے۔ ہندوستان میں بھی اسی طرح ہونا چاہئے۔ اور کانگرس کی صدارت کا الیکشن لڑتے وقت ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اس منصب کے امیدوار کی پالیسی کیا ہے اور پروگرام کیا ہے۔ اندریں حالات میں سمجھتا ہوں کہ اگر کانگرس کے اجلاس کی صدارت کے لئے دو آدمیوں کا آپس میں مقابلہ ہو تو چنداں قابل اعتراض نہیں بلکہ اس طرح بہت سی باتیں کھل کر سامنے آ جائیں گی۔

مجھ سے کسی ڈیلی گیٹ نے اب تک یہ نہیں کہا کہ مجھے صدارت سے دست کش ہو جانا چاہئے۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ بہت سے صوبوں نے خود بخود مجھے اپنا صدارتی امیدوار نامزد کر دیا ہے۔ اور ہر طرف سے پُر اصرار درخواستیں چلی آ رہی ہیں کہ میں صدارت کے لئے ضرور کھڑا ہو جاؤں۔ اصرار کرنے والوں میں سوشلسٹ اور غیر سوشلسٹ دونوں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں ملک بھر میں یہ خواہش بھی پائی جاتی ہے کہ مجھے قوم کی خدمت کے لئے صدارت کا ایک سال اور ملنا چاہئے۔ ہو سکتا ہے کہ اس ضمن میں میرا اندازہ صحیح نہیں اور مندوبین کی اکثریت مجھے دوبارہ صدارت کے منصب پر بٹھانا پسند نہیں کرتی۔ لیکن اس کا فیصلہ تو ۲۹ جنوری ۱۹۳۹ء ہی کو ہو گا جب ووٹ ڈالے جائیں گے۔ ایک کارکن کی حیثیت سے میری پوزیشن بالکل واضح ہے۔ مجھے بہر صورت قوم کی خدمت کرنا ہے لیکن یہ خدمت کس جگہ بیٹھ کر کروں۔ اس کا فیصلہ میرے ہم وطن کریں گے بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ صدارت کا فیصلہ صرف ڈیلی گیٹ ہی کر سکتے ہیں۔ بایں ہمہ اگر میرے اہل وطن مجھے حکم دیں کہ فلاں فلاں منصب پر بیٹھ کر قوم کی خدمت کرو تو میں کبھی انکار نہیں کروں گا۔ اور اگر میں نے انکار کیا تو لازماً اپنے فرض کی ادائیگی سے کوتاہی کا مرتکب بنوں گا۔

روز افزوں بین الاقوامی کشیدگی کے پیش نظر اور اس بات کے پیش نظر کہ ہم کبھی ہندوستان میں مجوزہ فیڈریشن نافذ نہیں ہونے دیں گے۔ یہ نیا

سال ہماری قومی تاریخ کا ایک بے حد اہم باب ہے ان حالات و واقعات کی موجودگی میں اگر مندوبین کی اکثریت نے مجھے خدمت وطن کے لئے پکارا تو میں کس منہ سے مقابلہ سے گریز کر سکتا ہوں؟ اور خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ فیصلہ طلب امر قطعاً میری ذات کے ساتھ تعلق نہیں رکھتا؟ بہر حال اگر مولانا ابوالکلام آزاد جیسے بلند پایہ لیڈروں کی اپیل کے جواب میں مندوبین کی اکثریت نے میرے خلاف ووٹ دیا تو میں اس فیصلے کے سامنے بخوشی اپنا سر جھکا دوں گا۔ اور بدستور ایک معمولی سپاہی کی طرح کانگرس اور ہندوستان کی خدمت کرتا رہوں گا۔ موجودہ صورت حال میں میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ غیر مشروط طور پر اپنے آپ کو صدارت کے منصب کے لئے پیش کروں اور مندوبین سے درخواست کروں کہ جو فیصلہ وہ کریں گے مجھے بطیب خاطر منظور ہو گا۔"

سوبھاش چندر بوس کے اس بیان سے گاندھی جی سخت ناراض ہوئے۔ چنانچہ کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کا وہ گروہ جو گاندھی جی کو اپنا گرو سمجھتا تھا سوبھاش سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے آگے بڑھا اس گروہ میں سردار ولبھ بھائی پٹیل۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ بابو راجندر پرشاد۔ اچاریہ کرپلانی۔ جیرام داس دولت رام شنکر راؤ دیو اور بھولا بھائی ڈیسائی شامل تھے۔ یہ لوگ سوبھاش کے دشمن تھے۔ اور نہیں چاہتے تھے کہ وہ دوبارہ صدر بنے۔ انہوں نے ایک مشترکہ بیان اخباروں کو دیا اور تاکید کی کہ ڈاکٹر پٹا بھائی ستیہ رمیہ کو صدر منتخب کیا جائے۔ بیان کے آخری الفاظ یہ تھے:

"اس وقت پٹا بھائی ستیہ رمیہ کانگرس کی صدارت کے لئے موزوں ترین آدمی ہیں اور کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے سب سے پرانے ممبروں میں شامل ہوتے ہیں۔ وہ ایک عرصہ دراز سے قوم کی خدمت کر رہے ہیں ہم کانگرس کے مندوبین سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو منتخب کر کے اپنی فرض شناسی کا ثبوت دیں۔ اور ساتھ ہی ہم سوبھاش بابو سے بھی کہتے ہیں کہ وہ صدارت کی امیدواری سے دستکش ہو جائیں تاکہ ڈاکٹر پٹا بھائی کو بلا مقابلہ منتخب کیا جا سکے۔"

سوبھاش نے جواب میں ایک بہت لمبا بیان شائع کرایا جو پورا نقل نہیں کیا جا سکتا۔ صرف اس کے بعض اہم نکات درج کرتا ہوں۔ پہلے تو اس نے یہ کہا کہ گاندھی جی سمیت کانگرس کے تمام بڑے بڑے لیڈر درپردہ برطانوی حکومت سے فیڈریشن کا سودا کر رہے ہیں۔ اور جونہی برطانوی حکومت نے ان کی چند شرطیں مان لیں فیڈریشن یقیناً قائم کر دیا جائیگا۔ ادھر میں اس تمام سودے بازی اور مجوزہ فیڈریشن کا سخت مخالف ہوں۔

کانگرس کے دائیں اور بائیں بازو میں بہت سے باہمی اختلافات ہیں۔ دائیں بازو والوں کی اکثریت ہے، جس نے اپنے ہتھکنڈوں سے کانگرس کی انقلابی سپرٹ کو کچل دیا ہے۔ میں بائیں بازو کا آدمی ہوں اور چاہتا ہوں کہ کانگرس کی انقلابی روح کو بحال کیا جائے۔ اس لئے موجودہ حالت میں مجھے صدر منتخب کرنا چاہئے۔

اگر کانگرس کے دائیں بازو کے لیڈر بعض وجوہ سے مجھ کو پسند نہیں کرتے تو میں اس شرط پر اپنا نام واپس لینے کو تیار ہوں کہ میری جگہ بائیں بازو کے کسی اور شخص کو صدر بنایا جائے۔ مثلاً اچاریہ نرندر دیو میرے نزدیک نہایت موزوں آدمی ہیں۔

صورت حال بدل چکی ہے۔ اب کانگرس کا صدر محض سالانہ اجلاس کا چیئرمین ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے فرائض میں یہ بھی شامل ہے کہ اپنی خاص پالیسی کو نافذ کرے۔

سردار پٹیل اور ورکنگ کمیٹی کے دیگر ممبروں کو یہ ہرگز زیبا نہیں کہ صدارت کے انتخاب میں ایک شخص کی حمایت میں بیان شائع کریں اور یوں بالواسطہ دوسرے امیدوار کی مخالفت کریں۔

صدر کا انتخاب کلیتہً کانگرس کے مندوبین کا کام ہے۔ سردار پٹیل اور ان کے ہم خیال لیڈروں کا یہ منصب نہیں کہ بیان پر بیان جاری کر کے مندوبین کی رائے کو ایک خاص فریق کے حق میں ہموار کریں۔

اس کے جواب میں سردار پٹیل نے ایک طویل بیان شائع کرایا اور سوبھاش کے جملہ الزامات کی بزعم خویش تردید کی۔ فریقین کی اس بیان بازی نے ہندوستان کی سیاسی فضا میں ایک خاص تموّج پیدا کر دیا تھا۔ اور لوگ بے تابی سے فیصلہ کا انتظار کرنے لگے۔ ایک طرف تنہا سوبھاش چندر بوس تھے اور دوسری طرف گاندھی جی کے ساتھ ان کے عقیدت مندوں کا پورا لشکر تھا۔ گاندھی جی کے حامیوں نے بے دریغ روپیہ خرچ کیا اور مندوبین کو براہ راست پیغامات بھی بھیجے گئے۔

بالآخر ۲۹ جنوری ۱۹۳۹ء کو انتخاب ہوا۔ ہندوستان کے تمام صوبوں کے مندوبین نے

۲۹۵۷ ووٹ ڈالے۔ جن میں سے سوبھاش کو ۱۵۸۰۔ اور ڈاکٹر پٹا بھاتی ستیہ رمتیہ کو ۱۳۷۷ ووٹ ملے اِس طرح سوبھاش بوس ۲۰۳ ووٹوں کی اکثریت سے جیت گئے۔

۱۹۲۰ء کے بعد کانگرس کے سیاسی حلقے میں گاندھی جی کی یہ پہلی شکست تھی۔ لیکن سوبھاش نے صدر منتخب ہوتے ہی جو بیان شائع کیا۔ اس میں یہ بھی لکھا کہ:

"میرا یہ فرض ہے کہ مہاتما گاندھی کا اعتماد حاصل کروں۔ یہ میری انتہائی بدقسمتی ہو گی کہ مجھے دوسرے لوگوں کا اعتماد تو حاصل ہو لیکن ہندوستان کے سب سے بڑے آدمی کے اعتماد سے محروم رہوں۔"

لیکن گاندھی جی سوبھاش کو معاف کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ انہوں نے اس موقع پر جو اخباری بیان دیا اس میں وہ تمام زہر میں بجھے ہوئے نشتر موجود تھے، جو صرف گاندھی جی استعمال کر سکتے تھے۔ انکسار کے پردے میں خود ستائی۔ اعتراف شکست کے پردے میں ہوس انتقام اور محبت کے پردے میں عداوت چھپی ہوئی تھی۔ گاندھی جی کا یہ بیان ان کے زود بیں مزاج کی خوب ترجمانی کرتا ہے۔ فرمایا:

"مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ میں ابتداء سے سوبھاش کے دوبارہ صدر منتخب کئے جانے کے سخت خلاف تھا۔ اس مخالفت کے اسباب کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ میں نے ڈاکٹر پٹا بھائی ستیہ رمتیہ سے کہا تھا کہ صدارت کے مقابلے سے دست بردار نہ ہوں۔ اس لئے یہ شکست پٹا بھائی کی نہیں بلکہ میری ہے۔ میرا وجود ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ میں کانگرس کے اندر ایک خاص پالیسی اور خاص اصولوں پر عمل پیرا ہونے کا مدعی ہوں۔ اگر میری یہ خاص حیثیت مجھ سے چھین لی جائے تو میرا وجود اور عدم وجود برابر ہیں۔ اندریں حالات مندوبین نے سوبھاش کو صدر منتخب کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انہیں میری پالیسی اور اصولوں سے اتفاق نہیں۔ میں اپنی اس شکست پر بہت مسرور ہوں۔

لامحالہ اقلیت صرف یہی کر سکتی ہے کہ وہ اکثریت کو اپنی پالیسی اور پروگرام پر عمل کرنے کی بخوشی اجازت دے۔ اگر اقلیت اکثریت کے پہلو بہ پہلو نہیں چل سکتی تو اس کا فرض ہے کہ کانگرس سے نکل آئے۔ یہ اقدام اکثریت کو مزید طاقت بخشنے کا موجب ہو گا اقلیت کو کسی صورت میں

بھی اکثریت کے راستے میں حائل نہیں ہونا چاہئے۔ اگر وہ اکثریت سے اشتراک و تعاون نہیں کر سکتی تو اسے میدان چھوڑ کر الگ ہو جانا چاہئے۔ میں کانگرس کے ان ممبروں کو جو کانگرسی ذہنیت کے مالک ہیں۔ یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اگر وہ اس وقت کانگرس سے قطع تعلق کر کے باہر آ جائیں گے تو وہی کانگرس کے صحیح نمائندے متصور ہوں گے۔ لہٰذا ہر شخص جو آج کانگرس میں خوش نہیں بے شک باہر آ جائے۔ لیکن یہ قطع تعلق کسی رنج اور غصے کی بناء پر نہیں بلکہ محض اس خیال سے ہونا چاہئے کہ اس طرح قوم ہی کی خدمت ہو گی۔"

گاندھی جی کا یہ بیان حد درجہ خطرناک ہونے کے علاوہ منافقت آمیز دلائل سے بھی بھرا ہوا تھا۔ گاندھی جی جانتے تھے کہ اگرچہ مندوبین کی اکثریت نے سوبھاش کو صدر تو منتخب کر لیا ہے۔ لیکن ملک کے عام ہندو، بالخصوص کانگرسی ہندو، گاندھی جی کے ساتھ ہیں اور وہ جب چاہیں کانگرس کو بے جان اور اس کے منتخب صدر کو مفلوج کر کے رکھ دیں گے۔ سوبھاش کا انتخاب سراسر جمہوری طریقے اور آئینی قاعدے سے ہوا تھا۔ اور شکست خوردہ فریق کا فرض تھا کہ اب ماضی کی تلخی کو بھول کر اور ملک کے وسیع مفاد کے پیش نظر سوبھاش سے تعاون کرے۔ لیکن گاندھی، گاندھی نہیں تھا۔ اگر یہ ثابت نہ کر دکھاتا کہ کانگرس اس کی مرضی کے بغیر ایک قدم نہیں اٹھا سکتی۔ ہر چند کہ وہ خود کانگرس کا چار آنے کا ممبر بھی نہیں تھا۔

سوبھاش بیمار تھا۔ لیکن وہ ۱۲ فروری کو خود چل کر گاندھی جی کی خدمت میں وردھا حاضر ہوا۔ اور دونوں میں تین گھنٹے نہایت اطمینان سے باتیں ہوتی رہیں۔ اس ملاقات کے بعد گاندھی جی کی منظوری سے سوبھاش نے اخباروں کو ایک بیان دیا کہ ہمارے درمیان تسلی بخش طریقے سے ان تمام مسائل پر تبادلہ خیال ہوا ہے جو آج ملک کے لئے وجۂ اضطراب بنے ہوئے ہیں۔ اگرچہ ہم کسی قطعی فیصلے پر نہیں پہنچ سکے لیکن بہت سے امور میں ہمارا عارضی سمجھوتا ہو گیا ہے۔

بیان کے آخر میں سوبھاش نے اخباروں کو تاکید کی کہ فرضی قیاس آرائیوں سے اجتناب کریں ورنہ حالات خراب ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ لطف یہ ہے کہ ادھر سوبھاش وردھا سے رخصت ہوا، ادھر گاندھی جی نے ایک اخباری نمائندے کو خصوصی انٹرویو میں فرمایا کہ:

۱۔ میں نے سوبھاش بابو سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ نئی ورکنگ کمیٹی کی تشکیل میں ان کے سابق شرکاء کاران سے تعاون نہیں کر سکتے۔

۲۔ ورکنگ کمیٹی کے دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے ممبروں نے قطعی فیصلہ کر لیا ہے کہ

تریپوری کے اجلاس کے وقت یا اجلاس سے پہلے یا اجلاس کے بعد وہ کانگرس کی پالیسی کی تشکیل میں سوبھاش کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔

۳۔ اب کہ سوبھاش بابو کو اکثریت کی تائید حاصل ہے۔ انہیں چاہئے کہ اپنی ورکنگ کمیٹی خود مرتب کریں۔ اپنی پالیسی پر خود عمل پیرا ہوں اور اپنا پروگرام خود نافذ کریں۔ مندوبین کی اکثریت نے چونکہ گاندھی مت قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے، لہذا سوبھاش بابو کو گاندھی کے مشورے یا رہنمائی کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔

اس انٹرویو کے بعد گاندھی جی نے ایک قدم اور اٹھایا۔ انہوں نے ورکنگ کمیٹی کے بارہ ممبروں کو حکم دیا کہ استعفاء دے دو۔ چنانچہ سردار ولبھ بھائی پٹیل۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ بابو راجندر پرشاد۔ مسز سروجنی نیڈو۔ بھولا بھائی ڈیسائی۔ ڈاکٹر پٹا بھائی ستیہ رمیہ۔ شنکر راؤ دیو۔ ہری کرشن مہتاب۔ اچاریہ کرپلانی۔ عبدالغفار خاں۔ جیرام داس۔ دولت رام اور جمنالال بجاج نے تار کے ذریعہ سے اپنا استعفاء سوبھاش کو کلکتہ بھیج دی۔ سوبھاش اس وقت بیمار تھا اور بخار ۱۰۳ درجے سے بھی اوپر چلا گیا تھا۔ دو روز کے بعد انہی بارہ ممبروں نے ایک مشترکہ خط سوبھاش کو لکھا۔ جس میں اپنے استعفے کی وجوہ بیان کیں اور کہا کہ ہم چونکہ آپ کے نزدیک رجعت پسند ہیں۔ لہذا مناسب یہی ہے کہ آپ اب ترقی پسندوں کی ورکنگ کمیٹی بنائیے۔

کانگرس کا سارا دفتری نظام اپنی جگہ سے ہل گیا تھا۔ کانگرس کی پارلیمنٹری سب کمیٹی بھی خود بخود ٹوٹ گئی تھی۔ اس سب کمیٹی کے تین ممبر تھے۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ بابو راجندر پرشاد اور سب کمیٹی کا کام یہ تھا کہ جن صوبوں میں کانگرسی وزارتیں قائم ہیں وہاں کے پارلیمنٹری امور کی نگرانی کرے۔ اچاریہ کرپلانی آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے سیکرٹری تھے۔ ان کے استعفے کے بعد کانگرس کے مرکزی دفتر کا انتظام بھی درہم برہم ہو گیا۔ ادھر سوبھاش کی بیماری نے یکایک خطرناک صورت اختیار کر لی تھی۔ انہیں نمونیا ہو گیا تھا۔ اور وہ بستر سے اٹھنے کے قابل بھی نہ تھے۔ ۸۔مارچ کو تریپوری کا اجلاس شروع ہونے والا تھا۔ اس دوران میں گاندھی جی کے خاص الخاص حلقے نے یہ افواہ مشہور کر دی کہ سوبھاش کی بیماری فرضی ہے اور وہ بہانہ کر رہے ہیں۔ چنانچہ سوبھاش کے معالج خصوصی ڈاکٹر سرنیل رتن سرکار کو باضابطہ اعلان کرنا پڑا کہ سوبھاش سخت علیل ہیں۔ اور میں انہیں اس حالت میں کبھی تریپوری جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔

ملک بھر میں خیال آرائیاں ہونے لگیں کہ سوبھاش یا تو صدارت سے استعفا دے دیں گے یا پھر کانگرس کا اجلاس ملتوی کرنا پڑے گا۔ لیکن دونوں میں سے ایک بات بھی نہ ہوئی۔ گاندھی

جی کے تین نیاز مندوں نے. جو ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے ممبر بھی تھے. سوبھاش کو خط لکھا کہ اگر تم نے ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کے بارے میں اپنے توہین آمیز الفاظ واپس نہ لئے تو ہم تریپوری کے اجلاس میں یہ قرار داد پیش کریں گے کہ تمہیں صدارت سے بر طرف کر دیا جائے۔ مجلس استقبالیہ کے ایک مشہور ممبر شمبھو دیال مصرا نے اعلان کیا کہ وہ تریپوری میں سوبھاش کے خلاف عدم اعتماد کا ریزولیوشن پیش کریں گے۔ ایسی حالت میں جبکہ گاندھی جی نے اندر ہی اندر سوبھاش کے خلاف ہندوستان بھر میں آگ لگا دی تھی، سوبھاش نے اپنے ڈاکٹروں اور تیمار داروں کی رائے کی پروا نہ کرتے ہوئے تریپوری جانے کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ انہیں نیم بے ہوشی کے عالم میں بستر پر ڈال کر ۶۔ مارچ ۱۹۳۹ء کو تریپوری پہنچایا گیا۔

گاندھی جی عمداً تریپوری تشریف نہ لے گئے۔ انہوں نے لوگوں کی توجہ کو دوسری طرف منعطف کرنے کے لئے گجرات (کاٹھیاواڑ) کی ایک چھوٹی سی ریاست راج کوٹ میں ایک ہنگامہ بپا کر دیا۔ اور راج کوٹ کے حکمران سے جھگڑا مول لے کر وہیں پڑے پڑے مرن برت رکھ لیا۔ گاندھی جی چونکہ ہندوستان کے مرکزی شخصیت تھے۔ اس لئے ان کا یہ حربہ بہت کارگر ثابت ہوا۔ اور تمام اخباروں میں تریپوری کا ذکر کم اور راج کوٹ کا ذکر بار بار نمایاں الفاظ میں ہونے لگا۔

سوبھاش کی حالت تریپوری میں پہنچتے ہی نازک ہو گئی۔ جبل پور کے انگریز سول سرجن ڈاکٹر بنیٹ نے رائے دی کہ اسے فوراً جبل پور کے سول ہسپتال میں داخل کر دیا جائے۔ لیکن سوبھاش بھی بڑے دم خم کا آدمی تھا۔ اس نے ہسپتال جانے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ میں کانگرس کا اجلاس ختم کر کے واپس کلکتہ جاؤں گا خواہ مجھے اس جدوجہد میں موت ہی کیوں نہ آئے۔

۸۔ مارچ کو مجلس استقبالیہ کا اجلاس ہوا تو سوبھاش کو سٹریچر پر ڈال کر لائے۔ مجلس استقبالیہ کے صدر سیٹھ گروند داس نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا کہ:

"ہماری کانگرس کی تنظیم کا مقابلہ اٹلی کی فاشسٹ پارٹی۔ جرمنی کی نازی پارٹی۔ اور روس کی کمیونسٹ پارٹی سے کیا جا سکتا ہے۔ ان پارٹیوں نے اگرچہ تشدد کا پروگرام اختیار کر رکھا ہے لیکن ہمارا پروگرام عدم تشدد کے عقیدے کا پابند ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اٹلی کے تمام باشندے فاشسٹ پارٹی اور جرمنی کے تمام باشندے نازی پارٹی اور روس کے تمام باشندے کمیونسٹ پارٹی کے ممبر نہیں ہیں اسی طرح ہر ہندوستانی بھی کانگرس کا چونی

کا ممبر نہیں لیکن اس کے باوجود ہندوستان کے تمام باشندے کانگرس کے ساتھ ہیں۔ مہاتما گاندھی کو کانگرس میں وہی پوزیشن حاصل ہے جو مسولینی کو فاشسٹ پارٹی۔ ہٹلر کو نازی پارٹی اور سٹالین کو کمیونسٹ پارٹی میں ہے۔ کانگرس آج جو کچھ بھی ہے وہ سراسر مہاتما گاندھی کی تخلیق ہے"

اب ایک نیا گل کھلا۔ گاندھی جی نے اندر ہی اندر جو کھچڑی پکائی تھی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجلس انتخاب مضامین ( سبجیکٹس کمیٹی ) میں یو۔ پی کے وزیر اعظم پنڈت گووند بلبھ پنت نے یہ قرار داد پیش کی:

"یہ کمیٹی اعلان کرتی ہے کہ کانگرس کی اس بنیادی پالیسی کی پوری سرگرمی سے پیروی کی جائے گی جو پچھلے کئی سال سے مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں ہم کو میسر ہے۔ یہ کمیٹی قطعی اس عقیدے کی حامی ہے کہ اس پالیسی میں کوئی ردّ و بدل نہیں ہونا چاہئے اور آئندہ بھی کانگرس کا پروگرام اسی پالیسی کے تحت مرتب ہو گا۔ یہ کمیٹی گزشتہ سال کی ورکنگ کمیٹی کے کام پر مکمل اعتماد کا اظہار کرتی ہے اور اس بات پر سخت افسوس ظاہر کرتی ہے کہ ورکنگ کمیٹی کے کسی ممبر کے خلاف نازیبا خیالات کا اظہار کیا گیا تھا۔

اس بات کے پیش نظر کہ مبادا آنے والے سال میں کسی قسم کی نازک صورت حال رونما ہو۔ اور اس بات کے پیش نظر کہ اگر ایسی صورت حال پیدا ہوئی تو صرف مہاتما گاندھی کانگرس اور ملک کو منزل کامرانی تک پہنچا سکیں گے۔ یہ کمیٹی اعلان کرتی ہے کہ کانگرس کی مجلس عاملہ کا فرض ہے کہ مہاتما گاندھی کا غیر مشروط اعتماد حاصل کرے۔ لہٰذا یہ کمیٹی پریذیڈنٹ سے درخواست کرتی ہے کہ وہ مہاتما گاندھی کی صوابدید کے مطابق آئندہ سال کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر نامزد کریں۔"

اس قرار داد پر بڑی گرم بحث ہوئی۔ سوبھاش کے حامیوں نے، جن میں مہاراشٹر کے اینے۔ پنجاب کے سردار سردول سنگھ کویشر اور بمبئی کے مسٹر نریمان تھے، قرار داد کی مخالفت کی۔ لیکن جہاں گاندھی کا نام آجائے وہاں کون کسی کی پروا کرتا ہے اور کون ہوش و خرد کی بات سننا پسند کرتا تھا۔ چنانچہ کثرت آراء سے یہ قرار داد منظور ہو گئی۔ اب دیکھنے اور محسوس کرنے والوں کے سامنے صرف یہ ایک سوال باقی تھا کہ سوبھاش کی بوٹیاں یہ گاندھی کے پجاری کب نوچتے ہیں اور

سوبھاش کا جنازہ ہندوستان کی سیاسی زندگی سے نکلنے میں اب کتنی دیر اور لگے گی۔

کلکتہ کے ایک انگریزی اخبار "ہندوستان سٹینڈرڈز" نے ترپوری کے ہنگامے پر ایک مقالہ افتتاحیہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا "بدی کی فتح" ۔ پورے مقالے کا ترجمہ درج کرنا تو ممکن نہیں۔ اس کے جستہ جستہ حصوں کا ترجمہ درج کرتا ہوں:

۱۔ "یہ ایک ایسی داستان ہے جس میں کمینگی، فرومایگی اور خود غرضی نے جس کا اظہار لفظوں میں نہیں ہو سکتا۔ عدم تعاون ۔ ستیہ گرہ حب وطن اور خدمت عامہ کا جامہ اوڑھ لیا تھا۔ ترپوری نے ثابت کر دیا ہے کہ کانگرس کے یہ فرسودہ اور از کار رفتہ لیڈر ذلت و رسوائی کے کس عمیق گڑھے میں جا گرے ہیں۔ اور ذاتی حرص و ہوا کی خاطر بڑے سے بڑے خوفناک جرم کا ارتکاب کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ مسلسل ہر روز کئی کئی گھنٹے ان سے التجائیں کی گئیں کہ خدارا یہ بے جا ضد چھوڑ دیجئے۔ اور یہ التجائیں انسانیت کے نام پر۔ ملک و ملت کے نام پر اور سیاسی شعور کے نام پر کی گئیں۔ لیکن تمام دلائل بے کار ثابت ہوئے۔ اور یہ ضد کے پکے اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہٹے - - - - یہ عدم تشدد اور ستیہ گرہ کا دعوٰی کرنے والے بگلا بھگت کانگری لیڈر نہیں جانتے کہ انہوں نے جو کچھ ترپوری میں کیا ہے، وہ عدم تشدد ہے نہ ستیہ گرہ۔ وہ تو ایک بہت بڑا مذاق ہے جو ان دو مقدس اصولوں کا نام لے کر ان لوگوں نے برپا کیا تھا۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہندوستان کے ہر شہر، ہر قصبے اور ہر گاؤں میں اس نام نہاد عدم تشدد اور ستیہ گرہ کا جنازہ نکالا جائے اور پھر اس لاش کو نذر آتش کر دیا جائے۔"

۲۔ "ہمیں افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ آج مہاتما گاندھی ماضی کا ایک بھوت بن کر رہ گئے ہیں۔ اور اس بھوت سے غالباً آئندہ کوئی مفید کام لیا بھی نہیں جا سکے گا۔ اگر کبھی ایسی ضرورت پیش آئی تھی کہ کانگرس اور ملک کی بہبود کی خاطر دو مخالف فریقوں میں مصالحت کرا دی جائے تو لاریب، یہ ضرورت آج ترپوری میں تھی۔ بایں ہمہ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اگر وہاں یہ مصالحت نہیں ہو سکی تو اس کی تمام تر ذمہ داری مہاتما گاندھی پر عائد ہوتی ہے۔ ہمارے پاس اس امر کی

شہادت موجود ہے کہ انجام کار دائیں بازو کے بعض لیڈر مفاہمت پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اور اس بات پر بھی تیار تھے کہ مسٹر گووند بلبھ پنت کے ریزولیوشن کا ایک قابل اعتراض فقرہ کاٹ دیا جائے لیکن سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں نہ ہو سکا۔ اور کیوں بغیر ترمیم و تنسیخ کے اصل ریزولیوشن کانگرس کے کھلے اجلاس میں پیش کر دیا گیا؟ وجہ ظاہر ہے۔ پنڈت نہرو نے ٹیلی فون پر سوبھاش بوس کی بیماری کی کیفیت بھی مہاتما جی کو بتائی اور کہا کہ حالت نازک ہے۔ ۔ اور یہ بھی عرض کیا کہ بہت ممکن ہے کہ سوبھاش صدارت سے استعفا دے دیں۔ پنڈت نہرو غالباً یہ چاہتے تھے کہ مہاتما جی قابل اعتراض فقرہ حذف کرنے کی اجازت عطا کر دیں لیکن مہاتما جی کے دل کی سختی کو کسی قسم کی ہمدردی ۔ نیاز مندی اور معقول دلیل نرم نہ کر سکی۔ چنانچہ آخر کار وہی کچھ ہوا کہ مہاتما جی کے ان چیلوں کو جو ان کے نام کی آڑ میں ہر قسم کی حرکتیں روا رکھتے ہیں، مہاتما کی مرضی کے خلاف یہ قدم اٹھانے کی جرأت نہ ہو سکی۔

۳۔ "ہم یہ بات بلا خوف تردید کہتے ہیں کہ یہ صرف مہاتما گاندھی تھے جن کی ضد نے آخر وقت تک مصلحت نہ ہونے دی۔ انہوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ متنازع ریزولیوشن پر اپنی مہر پسندیدگی ثبت کی بلکہ کانگرس کے صدر کی خطرناک بیماری کے پیش نظر اس بات پر بھی آمادہ نہ ہوئے کہ اس ریزولیوشن کی بحث کو کچھ وقت کے لئے ملتوی کر دیا جائے۔ نریمان انسانی ہمدردی اور سردول سنگھ مصلحت وقت کی بناء پر التواء بحث کی التجائیں کرتے رہے۔ لیکن مہاتما اپنے تقدس، عفو، ستیہ گرہ اور عدم تشدد کے زور پر کوئی بات ماننے کو تیار نہ تھے۔ لکھنے والے ہاتھ نے لکھا اور لکھ کر بے تکان آگے بڑھ گیا۔ اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ سب کچھ نہایت چالاکی سے کیا گیا اور بے نامی کیا گیا۔ دنیا میں کون ایسا بیوقوف ہے جس پر آج راج کوٹ کے ہنگامے کی اصل حقیقت منکشف نہیں ہو چکی۔ اور کون ایسا سادہ لوح شخص ہے جس کو یہ معلوم نہیں کہ اگر راج کوٹ کا ڈھونگ نہ رچایا جاتا تو مہاتما گاندھی کا تریپوری میں وہ حشر ہوتا کہ ان کے تقدس کی دھجیاں فضائے آسمانی میں اڑتی ہوئی نظر آتیں۔ اگر مہاتما گاندھی کی

صداقت اور ہتنیہ گرہ وہی ہے جس کے نمونے راج کوٹ اور تریپوری میں منظر عام پر آئے ہیں تو ہم ایسے گنہگار اس تقدس سے ہزار درجہ بہتر ہیں۔"

تریپوری کا اجلاس ختم ہوا تو سوبھاش بوس کے تیمار دار ان کو بستر پر ڈال کر واپس کلکتہ لے گئے۔ جب حالت قدرے ٹھیک ہوئی تو سوبھاش نے گاندھی جی کو لکھا کہ آپ جو مشورہ دیں گے اسی کے مطابق ورکنگ کمیٹی کے ممبر نامزد کروں گا۔ لیکن گاندھی جی ہر بار یہی فرماتے تھے کہ میری کانگرس میں کوئی حیثیت نہیں۔ میں تو چونی کا ممبر بھی نہیں ہوں۔ جو لوگ تمہیں پسند ہیں ان کو ممبر نامزد کر دو۔ جب یہ مراسلت کسی ٹھکانے پر نہ لگی اور لوگوں کا اضطراب بھی بڑھ گیا تو سوبھاش نے اپنی اور گاندھی جی کی خط و کتابت اخباروں میں شائع کر دی۔ روز نامہ "سٹیٹس مین" جیسے باوقار اخبار نے اس خط و کتابت پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا:

"جن لوگوں کو واقعات کا پس منظر معلوم ہے وہ مسٹر گاندھی اور مسٹر سوبھاش بوس کی خط و کتابت پڑھ کر یہی نتیجہ نکالیں گے کہ اس لفظی بحث آرائی میں مسٹر بوس کا پایہ نسبتاً زیادہ باوقار ہے۔ فریقین کی اپنی اپنی رائے اور اپنا اپنا زاویہ نگاہ ہے جس سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن مسٹر بوس کی حیثیت بہر حال زیادہ معقول نظر آتی ہے۔ مسٹر گاندھی کی حالت عجیب ہے۔ وہ ہر دفعہ طرح دے جاتے ہیں اور کھل کر واضح بات کہنے سے گریز کرتے ہیں۔ دلیل کا جواب دلیل سے بھی نہیں دیتے۔ اور جب مسٹر بوس کوئی ٹھوس تجویز پیش کرتے ہیں تو جواب میں گاندھی جی ایسی ناممکن بات کہتے ہیں جسے مسٹر بوس قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔"

کانگرس میں دفعتہً ایک ڈیڈ لاک پیدا ہو گیا تھا۔ گاندھی کے پورے گروہ نے سوبھاش سے قطع تعلق کر کے انہیں اس آزمائش میں ڈال دیا تھا کہ تم گاندھی جی کی مخالفت کر کے ایک دن کانگرس کی صدارت کی گدی پر نہیں بیٹھ سکتے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا اجلاس بلایا جائے۔ اور وہاں اس جھگڑے کا فیصلہ ہو۔ چنانچہ سوبھاش نے ۲۸۔ اپریل ۱۹۳۹ء کو کلکتہ میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا اجلاس طلب کیا۔ گاندھی جی تو چونی کے ممبر بھی نہ تھے۔ وہ تشریف نہ لائے۔ لیکن ان کا سارا گروہ کلکتہ پہنچا۔ دونوں فریقوں میں مصالحت اور مفاہمت کی پھر سے کوششیں کی گئیں۔ لیکن گاندھی جی کے حامیوں نے جو کیفیت پیدا کر دی تھی

اس کا تقاضا صرف یہ تھا کہ سوبھاش صدارت سے الگ ہو جائے۔ چنانچہ ان کی امید بر آئی اور سوبھاش چندر بوس نے استعفاء دے دیا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ مختصر یہ کہ بابو راجندر پرشاد کانگرس کے نئے صدر بن گئے جنھوں نے اپنی ورکنگ کمیٹی میں گاندھی جی کے تمام آدمیوں کو بلا استثناء شامل کرلیا، بنگال پراونشل کانگرس کمیٹی کا الحاق مرکز سے منقطع کر دیا گیا۔ اور سوبھاش بوس کو یہ سزا ملی کہ انہیں کانگرس کی چار آنے کی ابتدائی ممبری سے بھی محروم کر دیا گیا۔

اس داستان سرائی سے میرا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ کانگرس کے اندرونی جھگڑوں سے نقاب اٹھائی جائے۔ اس قسم کے جھگڑے دنیا کی ہر سیاسی جماعت میں ہوتے ہیں اور یہ کوئی اچنبھے کی بات بھی نہیں میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ گاندھی جی چوّنی کے ممبر نہ ہونے کے باوجود کانگرس کے مطلق العنان حاکم تھے۔ جس شخص کو چاہتے صدر بنا دیتے اور جس کو چاہتے وہاں سے نکال دیتے تھے۔ کانگرس ہر قدم اٹھانے سے پہلے ان سے اجازت حاصل کرتی تھی۔ وزارتیں قبول کرنا یا ترک کرنا۔ حکومت سے لڑنا یا صلح کرنا۔ وائسرائے سے ملنا یا ملنے سے انکار کرنا۔ یہ تمام امور صرف گاندھی جی کی صوابدید سے طے ہوتے تھے۔ لیکن ستم ہے کہ جب بھی ہندو مسلم قضیے کا تصفیہ کرنے کے لئے مسٹر جناح اور گاندھی کی ملاقات ہوتی تھی تو گاندھی جی اس ضد پر اڑ جاتے تھے کہ میں کانگرس کا چوّنی کا ممبر بھی نہیں۔ میں کیونکر کانگرس کی نمائندگی کا دعویٰ کر سکتا ہوں۔

کیا ان حالات میں ہم یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب نہیں کہ گاندھی جی نے یہ دوگونہ حیثیت اختیار ہی صرف اس واسطے کی تھی کہ ہندو مسلم مناقشے کا کوئی تسلی بخش حل تلاش نہ کیا جا سکے؟[۱]

---

۱۔ اس باب میں جو واقعات اور اقتباسات درج کئے گئے ہیں بیشتر درلاب سنگھ کی ایک انگریزی کتاب The Rebel President سے لئے گئے ہیں۔ جو ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی تھی۔

(مصنف)

## باب نمبر ۳

# ۱۹۳۹ء کا بجٹ

۱۹۳۷ء میں ہندوستان کے تمام صوبوں میں، جدید اصلاحات نافذ ہو گئی تھیں۔ لیکن مرکزی حکومت کا ڈھانچہ ہی پرانا تھا جو مانٹیگو چمسفرڈ اصلاحات کے دور میں قائم کیا گیا تھا۔ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل، حکومت کے سیاہ و سپید کی مالک تھی۔ سالانہ بجٹ کو اگر ایوان مسترد بھی کر دیتا تو وائسرائے اپنے خاص اختیار سے اسے پاس کر سکتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود مرکزی ایوان کے قوم پرست عناصر متحد ہو کر بالعموم حکومت کے خلاف ووٹ دیتے اور بجٹ کو مسترد کر دیتے تھے۔ یہ طرز عمل اور کسی لحاظ سے مفید ہو یا نہ ہو کم سے کم حکومت کے خلاف عدم اعتماد اور ناراضی کے اظہار کا اس سے بہتر پیرایہ اور کوئی نہ تھا۔

۱۹۳۵ء کے بعد مسٹر جناح کی انڈی پنڈنٹ پارٹی نے مرکزی اسمبلی کی کانگرس پارٹی سے مل کر ہر موقع پر حکومت کے خلاف ووٹ دیا اور مسلسل تین سال تک بجٹ کو مسترد کیا جاتا رہا۔ پروفیسر کوپ لینڈ نے اسی صورت حال کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے اپنی ایک کتاب میں لکھا تھا۔

> "۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں دونوں مرتبہ اسمبلی نے بجٹ مسترد کر دیا تھا۔ اور مجبوراً وائسرائے کو اختیارات خصوصی سے کام لے کر بجٹ منظور کرنا پڑا۔ ان دو برسوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے متحد ہو کر جس شدت سے حکومت کی مخالفت کی اور جس بری طرح اسے پریشان کیا اس کی مثال پہلے کبھی ہندوستان کے قوم پرست طبقے نے پیش نہیں کی تھی۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۴۰ء تک چوبیس مواقع ایسے پیش آئے ہیں جب اسمبلی کے مسترد کئے ہوئے قوانین کو حکومت نے اپنے اختیارات خصوصی سے کام لے کر منظور کیا ہو۔ ان چوبیس میں سے آٹھ مواقع

صرف ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں رونما ہوئے۔"

۱۹۳۸ء میں مسٹر جناح نے انڈی پنڈنٹ پارٹی توڑ کر مسلم لیگ پارٹی قائم کی تو انہیں لامحالہ اپنی روش پر نظرثانی کرنا پڑی۔ حالات نے ہمیں ایک ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا کہ اب اس پرانی پالیسی کو جاری رکھنے کا بظاہر کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کانگرس ہمارے خلاف تھی اور حکومت کا رویہ بھی ہمدردانہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری تھا کہ مسلمان اقلیت میں تھے۔ اور بجائے خود کوئی ایسا قدم اٹھانے کے قابل نہ تھے جو ہندوستان کی سیاسی ہیئت میں کسی قسم کی بنیادی تبدیلی پیدا کر سکتا۔ بظاہر عملی صورتیں صرف دو تھیں۔ ایک یہ کہ مسلم لیگ پارٹی اور کانگرس پارٹی میں اتحاد ہو جاتا اور دونوں متحد ہو کر صف آراء ہوتیں۔ مسٹر جناح ابتداء سے اس روش کے حامی تھے۔ لیکن کانگرس کی ضد نے کہ تنہا وہی ہندوستان کی نمائندہ جماعت ہے۔ مسلم لیگ اور کانگرس کے اتحاد کا کوئی امکان باقی نہیں رہنے دیا تھا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ بحالت مجبوری مسلم لیگ حکومت سے اپنا رشتہ استوار کرے۔ مسٹر جناح کو یہ صورت بھی منظور نہ تھی۔ حکومت کا کچھ اعتبار نہ تھا کہ ہوا کے جھونکے کی طرح کدھر کا رخ کرتی ہے۔ آج ہمارے ساتھ ہے تو کل اپنی غرض کے لئے ہمیں دھتا بتا کر فریق مخالف کے ساتھ مل جائے گی۔

اس ماحول میں. مسٹر جناح نے ۲۲ مارچ ۱۹۳۹ء کو مرکزی اسمبلی کے ایوان میں جو تقریر کی. وہ خاص اہمیت رکھتی ہے۔ یہ تقریر اپنی نوعیت کے لحاظ سے اس لئے زیادہ دلچسپی کی حامل ہے کہ مسلم لیگ نے جو روش اختیار کی وہ حکومت اور کانگرس دونوں سے علیحدگی اور بے نیازی کی تھی۔ بعض لوگ شاید یہ تقریر پڑھ کر خیال کریں گے کہ مسٹر جناح حالات گرد و پیش سے مایوس ہو گئے تھے۔ یہ خیال اس اعتبار سے درست ہے کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق تھا حکومت اور کانگرس دونوں کا رویہ قابل اعتراض تھا اور اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ہم حتیٰ الوسع اپنے سود و زیاں کے خود ذمہ دار بنیں۔ اور کسی خارجی طاقت پر بھروسہ نہ کریں۔

۱۹۳۹ء کے مرکزی بجٹ کی ایک شق یہ بھی تھی کہ حکوت نے اس کپاس پر جو دوسرے ملکوں سے ہندوستان میں آتی تھی، درآمدی ڈیوٹی بڑھا دی تھی۔ بمبئی کے ایک کارخانے دار. سرہومی مودی نے اس ڈیوٹی کے خلاف تحریک پیش کی تھی۔ جس پر ایوان میں بڑی دھواں دھار بحث ہوئی تھی۔ مسٹر جناح نے اس موضوع پر تقریر کرتے ہوئے مسلم لیگ پارٹی کی پوزیشن واضح کی تھی۔ اور فرمایا تھا:

"جناب والا۔ اس ایوان میں آل انڈیا مسلم لیگ پارٹی کی پوزیشن بڑی

عجیب و غریب ہے۔ اسے خوش قسمتی کہئے یا بد قسمتی۔ اس ایوان کا توازن ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اگر ہم حکومت کی مدد کریں تو میں سمجھتا ہوں کہ فنانس ممبر نہایت آسانی سے اس بل کو منزل کامرانی تک پہنچا سکتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ فنانس ممبر کی خواہش بھی یہی ہوگی۔ اور وہ میری پارٹی اور ایوان کے رُوبرُو اسی خواہش کا اظہار فرمائیں گے۔

جناب والا۔ ماضی میں ہمارا طرز عمل یہ رہا ہے کہ اگر حکومت نے کوئی ایسا بل پیش کیا ہے جو واقعی عوام کے لئے فائدہ مند تھا تو ہم نے اس کی تائید کی ہے۔ اور اگر وہ بل عوام کے لئے مفید نہیں تھا تو ہم نے اس کی مخالفت کی ہے۔ لیکن اب میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ اس پالیسی کو بدلنا پڑے گا۔ لُبِ لباب یہ ہے کہ ہماری پوزیشن آہستہ آہستہ یہ ہو گئی ہے کہ جب کانگرس ٹھیک کہتی ہے تو کانگرس کی مدد کرو۔ اور جب حکومت ٹھیک کہتی ہے تو اس کی مدد کرو۔ لیکن جب ہم ٹھیک کہتے ہیں تو ہماری کوئی مدد نہیں کرتا۔

جناب والا۔ ہم اس چیز کو محسوس کر رہے ہیں۔ اس لئے میں حکومت سے پوچھتا ہوں کہ آپ کس پالیسی پر گامزن ہیں اور آپ کا طرز عمل کیا ہے اور جہاں تک میری پارٹی کا تعلق ہے آپ نے اس کے لئے کیا کچھ کیا ہے؟ میں خوش ہوں کہ فنانس ممبر نے اپنی لمبی چوڑی تقریر میں کہا ہے کہ کانپور کو یاد کرو۔ بنارس کو یاد کرو۔ بدایوں کو یاد کرو۔ ا۔ لیکن میں اس ایوان کو بتانا چاہتا ہوں کہ ملک میں اور بھی بہت سے شہر، قصبے اور دیہات ہیں جہاں مسلمانوں کے ابتدائی حقوق کو بے رحمی سے پاؤں تلے کچلا گیا ہے۔ حکومت نے وہاں کیا کیا ہے؟

جناب والا۔ کچھ زیادہ مدت نہیں گزری۔ میں نے مسٹر ولبھ بھائی پٹیل کی ایک تقریر پڑھی تھی جس میں انہوں نے کہا تھا کہ "یہ جملہ الزامات بالکل بے بنیاد ہیں۔ اور یہ جو ظلم، نا انصافی، بد سلوکی اور تشدد کی شکایتیں کی جا رہی ہیں، ان میں کوئی صداقت نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اگر

---

ا۔ ان تمام مقامات پر ہندو مسلم فسادات ہوئے تھے۔ (مصنف)

اس قسم کے واقعات ہوتے تو گورنر ضرور مداخلت کرتے۔ "

"میرا خیال ہے مسٹر ولبھ بھائی پٹیل نے حال ہی میں ایک اور تقریر بھی کی ہے جس میں انہوں نے پھر یہی بات دُہرائی ہے کہ "اگر ان بے سروپا الزامات میں ذرہ بھر بھی صداقت ہوتی تو صوبوں کے گورنر بُت بن کر تماشا نہ دیکھتے بلکہ فوراً مداخلت کرتے۔ "

اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ گورنروں نے مداخلت نہیں کی لہٰذا میرے معزز دوست مطمئن ہیں۔

مسٹر لال چند نول رائے:۔ پوائنٹ آف آرڈر۔ کیا اس تقریر کا زیر بحث ترمیم کے ساتھ تعلق ہے؟

پریذیڈنٹ (سر عبدالرحیم):۔ کرسیٔ صدارت کا خیال ہے کہ معزز ممبر، عام سیاسی صورت حال کے پس منظر میں، مسئلہ زیر بحث کے متعلق اپنی پارٹی کے طرز عمل کا جواز پیش کر رہے ہیں۔ "

مسٹر ایم ۔ اے ۔ جناح:۔ آپ نے بجا فرمایا۔ میں بہت سی تقریریں کرنے کی بجائے ایک ہی تقریر میں فنانس بل کے بارے میں اپنی پارٹی کے روّیے کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں۔ میں حیران ہوں کہ مُعزز ممبر نے مجھے کیوں ٹوکا۔ میں تو اُن ممبروں میں سے ہوں جو اِس ایوان کا کم سے کم وقت لیتے ہیں۔ میری یہ عادت نہیں کہ خواہ مخواہ کھڑا ہو کر تقریر کرنے لگ جاؤں چاہے مسئلہ زیر بحث میری سمجھ میں آتا ہو یا نہ آتا ہو۔

نول رائے:۔ میں اِس مسئلے کا قانونی پہلو سمجھنا چاہتا تھا۔

مسٹر جناح:۔ چلو اچھا ہوا۔ آپ سمجھ گئے۔ میں خوش ہوں کہ معزز ممبر نے آج کچھ تو سیکھا۔ جناب والا، میں بتا رہا تھا کہ صورتِ حال کیا ہے۔ فلسطین میں کیا ہو رہا ہے؟ وزیرستان میں کیا ہو رہا ہے؟ جے پور میں کیا ہو رہا ہے؟ برطانوی حکومت کہاں غائب ہو گئی ہے؟

بھائی پرمانند:۔ حیدر آباد کا بھی ذکر کیجئے۔

مسٹر جناح:۔ جب آپ کی باری آئے گی اپنی پارٹی کی پالیسی بیان کیجئے گا۔ میں اِس وقت اپنی پارٹی کی پالیسی کی وضاحت کر رہا ہوں۔ جے پور میں کیا

ہو رہا ہے۔ جہاں سترہ مسلمانوں کو کُتّوں کی طرح گولی مار دی گئی ہے؟ ہماری اطلاع کے مطابق ـــــ اور اِس اطلاع کی تردید اب تک نہیں ہوئی ـــــ اُن مسلمانوں پر بغیر کسی وجہ اور وارننگ کے گولی چلائی گئی۔ کہاں ہے برطانوی حکومت اور کیا تماشا کر رہی ہے وہ؟ میں آپ سے یہ نہیں کہتا کہ ریاستوں پر دباؤ ڈالنے کے لئے اُن کے اندرونی معاملات میں دخل دیجئے۔ میں آپ سے یہ بھی نہیں کہتا کہ ریاستوں کو اپنے ہاں آئینی اصلاحات رائج کرنے پر مجبور کیجئے۔ میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ کسی مُہذّب حکومت کو قائم رکھنے کا یہ ایک بنیادی اُصول ہے۔ کیا ان باشندوں کے اِبتدائی حقوق سے اِنصاف کرنے کا یہی طریقہ ہے؟ جناب والا، میں ایک نہیں۔ دو نہیں۔ بیسیوں مثالیں پیش کر سکتا ہوں لیکن میں ایوان کا وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرتا۔ یوں بھی اِس کام کے لئے یہ موقع مناسب نہیں۔ میں حکومت سے پوچھتا ہوں کہ آپ کیوں ہم سے یہ توقّع رکھتے ہیں کہ ہم آپ کی خاطر یہ بلا مول لیں گے؟ آپ کیونکر یہ امید کرتے ہیں کہ ہم آپ کی اِس قسم کی مُلمّع دار اور لیپ پُوت کی ہوئی تقریروں سے مسحُور ہو کر آپ کی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور ہو جائیں گے؟ چنانچہ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ جہاں تک موجودہ فنانس بل کا تعلق ہے ہم قطعاً حکومت کی مدد نہیں کر سکتے۔ جائیے آپ اپنے راستے پر اور ہم اپنے راستے پر۔

جہاں تک کانگرس پارٹی کا تعلّق ہے۔ میں اِس وقت تفصیلات و جُزئیات میں جانا پسند نہیں کرتا۔ لیکن صاف بات یہ ہے کہ کانگرس پارٹی مسلم لیگ کی مخالف اور دُشمن ہے۔ لہٰذا میں کانگرس والوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہوں کہ سُن لو۔ ہمارا تمہارا اشتراک و تعاون ممکن نہیں۔ کانگرس والے غالباً جواب دیں گے کہ بہت اچّھا یونہی سہی۔ مگر ہماری تعداد سب سے زیادہ ہے۔ میرا جواب یہ ہے کہ تمہاری تعداد بھی زیادہ سہی۔ تمہاری دولت بھی زیادہ سہی۔ اور تمہیں اِس بات کا بھی بڑا گھمنڈ ہے کہ کثرتِ تعداد ہی آجکل کی دُنیا میں فیصلہ کُن عنصر ہے لیکن میں آپ سے صاف صاف کہنا چاہتا ہوں ـــــ میرا رُوئے سخن حکومت اور

کانگرس دونوں سے ہے ـــــــ کہ آپ کبھی ہماری رُوحوں کو مفتوح اور مغلوب نہیں کر سکیں گے۔ آپ الگ الگ ہم سے نبرد آزما ہوں یا دونوں مل کر ہم پر حملہ آور ہوں۔ آپ کبھی اُس اسلامی کلچر کو تباہ نہیں کر سکیں گے جس کے ہم مالک ہیں اور جو ہمیں ورثہ میں ملا ہے۔ یہ اسلامی روح ہمیشہ ہمارے اندر زندہ رہی ہے زندہ رہے گی۔ جو جی میں آئے کر کے دیکھ لیجئے ہمیں بے شک اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنائیے۔ ہمارے جسم کچل ڈالئے، ہمیں سخت سے سخت اذیت پہنچانے سے دریغ نہ کیجئے۔ لیکن کچھ بھی ہو. ہم نے تہیّہ کر لیا ہے کہ اگر ہمیں مرنا ہے تو مردانہ وار مریں گے۔ ہتھیار ڈال کر نہیں مریں گے۔ پیچھے ہٹ کر نہیں مریں گے بلکہ آخری دم تک لڑتے ہوئے جانیں دیں گے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہمارے دل زخموں سے چُور چُور ہو چکے ہیں۔ ہمارا خون کھول رہا ہے ہمیں آگ کی بھٹی میں کُودنا اور شعلوں میں سے گزرنا پڑے گا۔

موجودہ فنانس بل کے بارے میں ہمارا رویّہ یہ ہے کہ ہم کوئی ترمیم پیش نہیں کریں گے اور نہ کسی ترمیم کی حمایت کریں گے۔ خواہ وہ ترمیم کانگرس کی ہو یا کسی اور فریق کی۔ جو آپ کے جی میں آئے کیجئے۔ نتیجہ بظاہر یہ نکلے گا کہ حکومت کو شکست اور کانگرس کو فتح ہو گی۔ ہم اِس معاملہ میں بالکل غیر جانب دار رہیں گے۔ کانگرس کو اپنی اکثریت کی بناء پر کامیابی ہو جائے گی۔ لیکن میں اپنے کانگرسی دوستوں سے کہتا ہوں کہ تمہاری یہ کامیابی صرف اِس چھوٹی سی لابی کے اندر محدود ہو کر رہ جائے گی۔ باہر نہیں جا سکتی۔ آپ کی صحیح کامیابی اور اصل فتح اُس دن ہو گی جب آپ اِس پارٹی اور اس پارٹی کی درمیانی رُکاوٹوں کو دُور کر کے اپنا ہاتھ آگے بڑھائیں گے۔

چنانچہ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ کسی ترمیم کی تائید نہیں کریں گے ہم حکومت کی اِس لئے مدد نہیں کر سکتے کیونکہ برطانوی حکومت تو مسلمانوں کے شہریت کے ابتدائی حقوق کی حفاظت کرنے سے بھی قاصر رہی ہے اور صوبوں کے گورنروں اور ہندوستان کے گورنر جنرل کو اقلیتوں کی حفاظت کرنے کے جو اختیارات ملے تھے وہ بھی ایک سرا سر فریب ثابت ہوئے

ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ فریب سے بھی بدتر ہیں۔

میں اِس بحث میں مزید کوئی حصّہ لینے کو تیّار نہیں۔ لیکن میری پارٹی کے ممبروں کو اختیار ہے کہ چاہیں تو موجودہ ترمیم پر اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں تاکہ حکومتِ ہند کے فنانس ممبر کو اطلاع ہو جائے موجودہ فنانس بل حکومتوں کے فنانس ممبر اور کانگرس پارٹی کا باہمی قضیہ ہے۔ آپ جس طرح چاہیں، اس قضیے کا تصفیہ کیجئے۔ یہ آپ کا کام ہے۔"

میں نے جب مسٹر جناح کی یہ مذکورہ بالا تقریر پڑھی تو شدّتِ جذبات سے میرے بدن میں ایک کپکپی سی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ کپکپی خوشی کی تھی، یا خوف کی تھی۔ یا جوش کی تھی۔ میں اپنے احساسات کا تجزیہ کرنے سے قاصر ہوں۔ لیکن سوچنے والی بات یہ ہے کہ جناح نے یہ تقریر لاہور کے موچی دروازے کے باغ میں نہیں کی تھی جہاں سامعین کے جذبات کو مُشتعل کرنے کے سوا مقرر کا اور کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ اِس کے برعکس یہ تقریر ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے ایوان میں کی گئی تھی۔ جہاں آئین۔ دستور۔ قانون اور کانسٹی ٹیوشن کے ماہروں کا مجمع تھا۔ خود جناح کی ذہنی۔ رُوحانی اور دماغی تربیّت اس قسم کی تھی کہ وہ کبھی بے اختیار ہو کر جذبات کے دھارے میں نہیں بہتا تھا۔ لیکن آج وہی جناح باچشمِ گریاں و باسینۂ بریاں اپنے دل کے زخم دُنیا کو دکھا رہا تھا۔ اور وائسرائے اور بھولا بھائی ڈیسائی دونوں سے گرج گرج کر کہہ رہا تھا کہ تم مل کر بھی ہم پر حملہ کرو گے تو اسلام اور اسلامی رُوح کو مٹا نہیں سکو گے۔ اور اگر ہمیں مرنا ہی ہے تو مردانہ وار مریں گے۔ ہتھیار ڈال کر نہیں مریں گے۔ پیچھے ہٹ کر نہیں مریں گے۔ بلکہ آخری دم تک لڑتے ہوئے جانیں دیں گے۔

اِس تقریر سے تعجّب ہوتا ہے کہ کیا یہ وہی جناح تھا جو ایک زمانے میں اِس قدر پکّا "نیشنلسٹ" تھا کہ مسلم لیگ کی رُکنیّت قبول کرنے سے بھی گریزاں تھا کہ مُبادا اُس کے نیشنلزم پر داغ لگ جائے۔ جو ایک زمانے میں جداگانہ انتخاب کو بھی قوم پرستی کے منافی خیال کرتا تھا۔ جس نے بصد مشکل مسلم لیگ کی ممبری قبول کی بھی تو اِس شرط پر کہ وہ کانگرس کی ممبری ترک نہیں کرے گا۔ جس کا ایک زمانے میں یہ عقیدہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات آہستہ آہستہ مٹ جائیں گے۔ اور بالآخر ہندوستان میں ایک مُتحدہ قومیّت کا ظہور ہو گا۔

غور کرنے کی جگہ ہے کہ وہ کیا چیز تھی جس نے انجامِ کار اُس "نیشنلسٹ" جناح کو اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا کہ آج وہ اسلام کا سب سے بڑا مجاہد اور مسلمانوں کا سب سے دلیر سپاہی بن گیا

تھا؟ جس کی زبانِ دہن و زبانِ قلم کو قدرت نے اسلام کی حفاظت کی سب سے بڑی شمشیر بنا دیا تھا۔ جو سوچتا بھی تھا تو صرف مسلمانوں کی حمایت کے لئے۔ لکھتا بھی تھا تو صرف مسلمانوں کی اعانت کے لئے۔ جناح کے سوانح نگار کے لئے یہ موضوع بے حد حقیقت افروز اور سبق آموز ہے۔ اور جناح کے تفکرات کی یہ بنیادی تبدیلی ہی دراصل ہماری قومی جدّوجہد کا وہ حقیقی نکتہ ہے جسے سمجھے بغیر اس تحریک کے خدّوخال پوری طرح سمجھ میں نہیں آسکتے۔

بالآخر مرکزی اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی غیر جانب دار رہی۔ اور سرہومی مودی نے کپاس کی امپورٹ ڈیوٹی کے خلاف جو تحریک پیش کی تھی وہ کانگرس پارٹی کی مدد سے منظور ہو گئی رائے شماری کے وقت حکومت کو ۴۴ اور حزبِ مخالف کو ۵۹ ووٹ ملے۔

پنجاب میں اس کا بالکل اُلٹا اثر ہوا۔ سر سکندر حیات خاں نے ۲۸۔ مارچ ۱۹۳۹ء کو پنجاب کی لیجسلیٹو اسمبلی میں کھڑے ہو کر سخت افسوس کا اظہار کیا مرکزی اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کی غلط روش کے باعث مرکزی حکومت کو شکست ہوئی اور کپاس کی امپورٹ ڈیوٹی کے خلاف تحریک منظور ہو گئی۔ ان کے الفاظ یہ تھے:

> ہم مُدّت سے حکومتِ ہند کو اِس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ باہر سے درآمد کرنے والی کپاس پر ڈیوٹی عاید کی جائے۔ کیونکہ پنجاب، سندھ اور بعض اور صوبے اِس قدر کپاس پیدا کرتے ہیں کہ مقامی ضروریات پوری کرنے کے بعد بہت سی فالتو کپاس بچ جاتی ہے جسے برآمد کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ ہم نے اپنے زراعت پیشہ طبقے کے مفاد کی حفاظت کے لئے مرکزی حکومت پر زور ڈالا تھا کہ درآمد ہونے والی کپاس پر ڈیوٹی لگائی جائے۔ بدقسمتی سے ہمارے بعض نام نہاد مُحبِّ وطن کارخانے دار اپنے وطن کی کپاس کے مقابلہ میں بدیشی کپاس خریدنا پسند کرتے ہیں۔ اندریں حالات ہمارا فرض تھا کہ حکومتِ ہند سے پُر اِصرار درخواست کریں کہ بدیشی کپاس پر ڈیوٹی لگائی جائے۔ آخر کار حکومتِ ہند کے فنانس ممبر نے ایک سال کے لئے درآمدی کپاس پر تھوڑی سی ڈیوٹی لگانے کا فیصلہ کیا اور اُسے فنانس بل میں بھی شامل کر لیا۔ لیکن اِس اِقدام کی کن لوگوں نے مخالفت کی؟ انہی لوگوں نے جو اپنے آپ کو غریبوں کے حامی اور بے کسوں کے معاون کہتے ہیں۔ اُنہوں نے فنانس بِل کی مخالفت کی۔ اور ایک جداگانہ ترمیم پیش کر کے مطالبہ کیا کہ کپاس کی یہ

امپورٹ ڈیوٹی منسوخ کر دی جائے۔

جناب والا۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس امپورٹ ڈیوٹی کا کن پر اثر پڑنے والا تھا؟ کروڑ پتی کار خانے داروں پر۔ چنانچہ بعض حلقوں میں جو یہ خیال ظاہر کیا جارہا ہے کہ یہ کروڑ پتی کار خانے دار ہی دراصل کانگرس کے آقا اور مالک ہیں۔ دُرست معلوم ہوتا ہے۔"

ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے اسی بجٹ سیشن میں اِنڈو برٹش تجارتی معاہدے پر بھی فیصلہ کُن بحث ہوئی۔ اور رائے شماری کے وقت مسلم لیگ پارٹی غیر جانب دار رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کو شکست ہو گئی۔

اِنڈو برٹش تجارتی معاہدے کا پس منظر یہ ہے کہ ۱۹۳۲ء میں ہندوستان اور برطانیہ میں ایک تجارتی معاہدہ ہوا تھا جو اٹاوہ پیکٹ کے نام سے موسوم ہے۔ ہندوستان چونکہ اُس وقت برطانیہ کا محکوم اور غلام ملک تھا۔ اِس لئے اٹاوہ پیکٹ کے ذریعہ سے برطانیہ۔ کینیڈا۔ آسٹریلیا۔ نیوزی لینڈ نے ایسی تجارتی مراعات حاصل کیں جو ہندوستان کے لئے نقصان دہ اور برطانیہ اور دیگر سفید فام مُستعمرات کے لئے نفع بخش تھیں ہندوستان کی مالی اور اِقتصادی خوشحالی کا دارومدار خام مال کی برآمد پر تھا۔ جس میں کپاس۔ پٹ سن گیہوں۔ کھالیں۔ السی وغیرہ قابلِ ذکر تھیں۔ اِس کے برعکس برطانیہ۔ کینیڈا۔ آسٹریلیا وغیرہ کی خوشحالی کا اِنحصار اِس بات پر تھا کہ ان کی مصنوعات کو ایک ایسی منڈی میسّر آئے جہاں کسی اور ملک کے بنے ہوئے مال کی کھپت نہ ہو سکے تاکہ باہمی مقابلہ کی نوبت نہ آئے۔ اٹاوہ پیکٹ میں یہی اُصول پیشِ نظر رکھا گیا تھا۔

چار سال بعد ۳۰۔ مارچ ۱۹۳۶ء کو مسٹر جناح نے ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں ایک تحریک پیش کی تھی کہ اٹاوہ پیکٹ کو ختم کر کے ہندوستان اور برطانیہ میں ایک نیا تجارتی معاہدہ مُرتّب کیا جائے۔ جس میں یہ اُصول ملحوظ رکھا جائے کہ ہندوستان کا زیادہ سے زیادہ مال اچھے داموں پر برآمد کیا جا سکے ایوان نے یہ تحریک منظور کر لی تھی۔

چودھری ظفر اللہ خاں اُس وقت حکومتِ ہند کے کامرس ممبر تھے۔ چنانچہ اُن کی سرکردگی میں حکومتِ ہند اور برطانیہ میں ایک تجارتی معاہدہ مُرتّب ہوا۔ جس کی جُزئیات طے کرنے کے لئے جو وفد چودھری صاحب کے ساتھ انگلستان گیا تھا اس میں سرکاری ممبروں کے علاوہ بعض غیر سرکاری مُشیر بھی شامل تھے جن کا ہندوستان کے تجارتی حلقوں سے گہرا تعلق تھا۔

تین سال کی گفت و شُنید کے بعد بالآخر ۲۰۔ مارچ ۱۹۳۹ء کو اِس معاہدے پر فریقین کے دستخط ہو گئے اور ۲۷۔ مارچ ۱۹۳۹ء کو کامرس ممبر نے معاہدے کا مُسودہ مرکزی اسمبلی کے ایوان

میں منظوری کے لئے پیش کیا۔ اس مسودے پر ایوان میں دو روز بڑی زور دار بحث ہوئی۔ جس میں کامرس ممبر کے علاوہ تقریباً ایوان کے تمام قابلِ ذکر ارکان نے حصّہ لیا۔ یہ بڑی پُرلطف بحث تھی۔ سیاسی ذوق رکھنے والے اصحاب سے میری درخواست ہے کہ اگر انہیں ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کی ۱۹۳۹ء کی کارروائی کی مطبوعہ رپورٹ کہیں سے حاصل ہو سکے تو ضرور اس بحث کا مطالعہ کریں۔ بھولا بھائی ڈیسائی۔ اکھل چندر دت۔ ستیہ مورتی۔ ڈاکٹر سر ضیا الدّین احمد۔ سر عبدالحلیم غزنوی۔ مسٹر جناح۔ این ایم جوشی۔ منو صوبیدار۔ سر عبداللہ ہارون۔ سر برائس برٹ۔ سر کاؤس جی جہانگیر۔ سنت سنگھ۔ سر ہومی مودی۔ سر رضا علی۔ اے ایکمین۔ ایف ای جیمز۔ ایم ایس اینے۔ بی داس۔ محمد نعمان وغیرہ اُس وقت ایوان کے نمایاں اور مشہور ممبر تھے انہوں نے اس بحث میں شرکت کی۔ اور اپنا اپنا نقطہ نگاہ پیش کیا۔

مجھے اِس وقت صرف یہ بتانا منظور ہے کہ مسلم لیگ پارٹی نے چونکہ رائے شماری کے وقت غیر جانبدار رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اِس لئے مسٹر جناح کا نقطۂ نگاہ کیا تھا۔ اُن کی تقریر کے کچھ حصے کا ترجمہ نیچے درج کرتا ہوں:

"______ سوال یہ ہے کہ جہاں تک اِس معاہدے کا تعلق ہے۔ اِس ایوان کی آئینی حیثیت کیا ہے۔ مُعزّز ممبروں کو یاد ہو گا کہ تین سال پیچھے کی بات ہے، جب مجھے یہ اعزاز حاصل ہوا تھا کہ اٹاوہ پیکٹ کو ختم کرنے کی ترمیم پیش کروں۔ تو میں نے کہا تھا کہ یہ ایوان کاملاً ذِمّہ دار ہے۔ اور حکومت اس ایوان کے سامنے صرف اِن چند گھنٹوں کے لئے جواب دہ ہے جب تک ____ رائے شماری نہیں ہوتی۔ اُس کے بعد ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ حکومت کہاں ہو گی اور اُس کی حیثیت کیا ہو گی؟

اس موضوع پر مزید کچھ کہنے سے قبل میں اپنی اور اپنی پارٹی کی طرف سے آنریبل سر محمد ظفر اللہ خاں کو ہدیۂ تبریک پیش کرنا چاہتا ہوں۔ وہ مسلمان ہیں۔ اور یوں کہنا چاہئے کہ گویا اپنے بیٹے کی تعریف کر رہا ہوں۔ مختلف حلقوں نے اُن کو جو مبارک باد دی ہے، میں اُس کی تائید کرتا ہوں۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ جو کچھ امکانی حد تک ہو سکتا تھا اُنہوں نے اُس میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا۔ بایں ہمہ صورت حال یہ ہے کہ ہمیں اِس بات پر غور کرنا چاہیے کہ آئینی لحاظ سے حکومتِ ہند کی پوزیشن کیا ہے۔ اگر آپ یہ تصوّر کریں کہ ہندوستان ایک آزاد مملکت ہے

یا کم سے کم ڈومینیئن ہے ـــــــــــ میں ڈومینیئن کا لفظ ان معنوں میں استعمال نہیں کرتا جن میں یہ لفظ ویسٹ منسٹر کا قانون وضع ہونے سے پہلے استعمال کرتا تھا۔ بلکہ وسیع تر معنوں میں استعمال کرتا ہوں ـــــــ تو آپ کا یہ تصوّر میری سمجھ میں آ سکتا ہے کہ ہندوستان ایک آزاد مملکت ہے۔ ایک مکمل ڈومینیین ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر آنریبل ممبر کی یہ حیثیت ہوتی اور وہ اس حیثیت سے گفت و شنید کرتے تو یہ تجارتی معاہدہ موجودہ صورت سے بہتر ہوتا۔ لیکن آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان ایک آزاد مملکت نہیں اور نہ ایک ڈومینیین ہے۔ چنانچہ اگر ہماری موجودہ مجبوریوں اور معذوریوں کے نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ معاہدہ کیسا ہے۔ کیا ہم اس صورت میں یہ معاہدہ قبول کر لیں یا مسترد کر دیں؟ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اس قسم کے معاہدوں میں فریقین میں سے کسی کو بھی روپے کے سولہ آنے نہیں ملا کرتے۔ ہر چند وہ ملک آزاد اور خود مختار ہی کیوں نہ ہو۔ لہٰذا یہ آپ کے نقطہ نگاہ پر منحصر ہے کہ جس زاویے سے چاہیں اس معاہدے پر غور کر لیں۔ آئینی لحاظ سے مزید غور کیا جائے تو ہماری پوزیشن اور زیادہ عجیب و غریب نظر آتی ہے۔ حکومت ہند نے فیصلہ کیا ہے کہ اٹاوہ پیکٹ اس مہینے کی ۳۱۔ تاریخ کو ختم کر دیا جائے گا۔ اور یکم اپریل سے موجودہ معاہدہ اس کی جگہ نافذ ہو گا۔ چنانچہ میں اس ایوان کے معزز ممبروں کو بتانا چاہتا ہوں کہ جہاں تک زیر بحث معاہدے کا تعلق ہے وہ ایک طے شدہ حقیقت ہے۔

کل کی بحث کے دوران میں جب آنریبل کامرس ممبر سے یہ پوچھا گیا تھا کہ کیا آپ اس دیوان کے فیصلے کی پابندی کریں گے تو جواب میں انہوں نے کہا تھا کہ ہم اس پر اچھی طرح غور و فکر کریں گے۔ بات صاف ہو گئی ہے کہ چاہے ہم اس معاہدے کو قبول کریں یا مسترد کریں۔ بہر صورت یہ معاہدہ یکم اپریل سے نافذ ہو جائے گا۔ تو پھر یوں کہنا چاہئے کہ یہ معاہدہ ایک طے شدہ حقیقت ہے اور ہم اس وقت گویا اس کا پوسٹ مارٹم کرنے میں مصروف ہیں۔ آپ چاہیں تو اس پر آنسو بہائیں یا اظہار مسرت کریں یا جو جی میں آئے کریں۔ اگر میرا یہ تجزیہ درست ہے تو پھر حکومت مجھ

سے یا میری پارٹی سے کیا توقع رکھتی ہے؟

میری پارٹی کے پیش نظر اوّل اس معاہدے کا آئینی اور سیاسی پہلو ہے۔ دوم یہ کہ یہ معاہدہ مسلمانوں کے مفاد پر کہاں تک اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں نے ہندوستان کے مجموعی مفاد سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جیسا کہ حزب مخالف کے لیڈر نے ابھی کہا ہے۔ ہمیں اپنے اپنے حلقۂ انتخاب کا زاویہ نگاہ بھی سامنے رکھنا پڑے گا۔ میرے معزز دوست نے فرمایا ہے کہ وہ احمد آباد کے کارخانے داروں کے مفاد کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔"

مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی :۔۔۔ "اور گجرات کے کپاس کے کاشت کاروں کا مفاد بھی۔"

مسٹر ایم اے جناح :۔۔۔ "بالکل صحیح۔ یہ ان کا حلقۂ انتخاب ہے اور ان کا فرض ہے کہ گجرات کے کاشت کاروں کے مفاد کو ملحوظ رکھیں۔ لیکن اس کا یقیناً یہ مطلب نہیں کہ بمبئی کے کارخانے داروں یا گجرات کے کپاس کے کاشتکاروں کے مفاد کی خاطر باقی ہندوستان کے مفاد کو پس پشت ڈال دیا جائے۔ اس سارے کاروبار میں مسلمانوں کے مفاد کہاں ہیں اور کیوں کو متاثر ہوئے ہیں؟ اس سوال کا جواب بہت ضروری ہے۔ جس کا ہمیں جائزہ لینا چاہئے میں نے جتنا غور کیا ہے، مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس معاملے میں مسلمانوں کا اتنا حصہ بھی نہیں جتنا آٹے میں نمک۔ لے دے کے صرف ایک مسلمان کا نام لیا گیا ہے۔ یعنی مدراس کے مسٹر جمال محمد کا جو کھالوں کا بیوپار کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ

بعض اور کاموں میں بھی مسلمانوں کا کچھ تھوڑا بہت حصہ ضرور ہو گا۔ مجھے یہاں اپنے معزز دوست سر عبدالحلیم غزنوی سے اختلاف ہے جنہوں نے پٹ سن کا ذکر کیا ہے۔ انہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس معاہدے میں صرف پٹ سن کی بنی ہوئی مصنوعات کا ذکر ہے۔

سر عبدالحلیم غزنوی :۔۔۔ خام پٹ سن بھی۔

مسٹر ایم۔ اے جناح :۔۔۔ بالکل نہیں۔ یہ ایک چال ہے جس کا آپ لوگ بے خبری میں شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ خام پٹ سن نہیں بلکہ پٹ سن کی بنی ہوئی مصنوعات ہیں جنہیں ترجیح دی گئی ہے۔ یہ

درست ہے کہ کسی حد تک اس سے ڈنڈی[۱] کے مفاد پر زد پڑے گی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس سے ہمیں فائدہ نہیں ہو گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کا فائدہ کہاں ہے؟ جہاں تک میں نے غور کیا ہے صرف دو بڑے کاموں سے مسلمانوں کا تعلق ہے۔ ایک کپاس جو بیشتر پنجاب اور سندھ میں پیدا ہوتی ہے۔ دوسرا کھالیں۔ ممکن ہے اور بھی چند چھوٹے موٹے کام ہوں۔ لیکن بڑے کام جن سے مسلمانوں کا تعلق ہے یہی دو ہیں۔"

سر رضا علی:۔ "اُونی قالین اور نمدے بھی"

مسٹر ایم اے جناح:۔ "نہیں۔ اُونی قالینوں اور نمدوں کے کاروبار میں مسلمان صرف مزدوری پیشہ ہیں۔ ان کی اپنی کوئی تجارتی کمپنیاں نہیں ہیں۔ اس طریقے سے فریب کھا جانا بہت آسان ہے۔ چند روز ہوئے جب فنانس بل پر بحث ہو رہی تھی تو سر کاؤس جی جہانگیر اور سر ہومی مودی نے کہا تھا کہ در آمدی کپاس پر ڈیوٹی بڑھا کر گویا حکومت نے اونٹ کی پشت پر آخری تنکا رکھ دیا ہے۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ میری پشت پر آخری تنکا کون سا ہے؟

لنکاشائر کو فوائد پہنچانے کی غرض سے آپ نے کپاس سے کیا سلوک کیا ہے؟ اس سلسلہ میں آج تو پوزیشن پہلے سے بھی بدتر ہے۔ موجودہ معاہدے کی رو سے لنکاشائر کو کپاس کی چار یا ساڑھے چار لاکھ گانٹھوں سے زیادہ لینے کی پابندی نہیں ہو گی۔ حالانکہ اس وقت وہ تقریباً پانچ لاکھ گانٹھیں اٹھا رہا ہے۔ آپ سرکاری دستاویزوں میں یہ اعداد و شمار دیکھ سکتے ہیں۔ اس معاہدے کے ساتھ جو میمورنڈم منسلک کیا گیا ہے۔ میں اس کا کچھ حصہ پڑھ کر سناتا ہوں تاکہ کسی قسم کی غلط فہمی نہ رہے۔ سُنیئے:

"اس آرٹیکل کے تحت خام کپاس کی بر آمد کا جو سکیل تجویز کیا گیا ہے۔ اس نے اس حقیقت کو بخوبی پیش نظر رکھا ہے کہ حال میں برطانیہ میں کپاس کی خریداری بڑھ گئی ہے۔ گزشتہ تین برسوں میں ـــــ مختتمہ ۳۸-۱۹۳۷ء ـــــ اوسطاً ۴۸۷۰۰۰ گانٹھیں ہر سال ہندوستان سے برطانیہ کو بر آمد کی جاتی رہی ہیں موجودہ معاہدے کی رو سے یہ طے ہوا ہے کہ اگر پہلے دو برسوں میں اوسطاً چار لاکھ سالانہ گانٹھوں سے کم بر آمد ہوئیں تو جو ڈیوٹی میں تخفیف کی مالی رعایت دی گئی ہے وہ واپس لے لی جائے گی یا اگر بعد ازاں کسی سال میں یہ بر آمد ساڑھے چار لاکھ گانٹھوں سے کم ہوئی تو بھی یہ رعایت واپس لے لی جائے گی۔ خام کپاس کی بر آمد کا وہ سکیل جس کے مطابق برطانیہ کے بنے ہوئے کپڑے پر ڈیوٹی کا نفاذ کیا جاتا ہے۔ بہت اونچا کر

---

[۱] ڈنڈی۔ سکاٹ لینڈ کا ایک مشہور شہر ہے جو ہندوستان سے خام پٹ سن در آمد کر کے اس کی مصنوعات تیار کرتا تھا۔ آج کل پٹ سن وہ پاکستان سے منگواتا ہے۔

دیا گیا ہے تاکہ برطانیہ کے کاروباری لوگوں کو ہندوستانی کپاس درآمد کرنے کی ہر ممکن ترغیب دلائی جاسکے اور یہ برآمد بڑھتے بڑھتے ساڑھے سات لاکھ گانٹھوں سے بھی اوپر چلی جائے۔ یہ تمام دفعات اس لئے رکھی گئی ہیں کہ برطانیہ میں ہندوستانی کپاس کی مانگ میں اضافہ ہو۔ چنانچہ یہ دفعات ہندوستان میں کپاس کی کاشت کرنے والوں کے لئے بہت بڑی اہمیت کی مالک ہیں"[1]۔

"پوٹنشل ویلیو"! میرے دوست مسٹر جیمز نے جب گارنٹی کا لفظ استعمال کیا تھا تو میں نے ان کی اصلاح کی تھی بلکہ انہیں ٹوکا تھا کہ گارنٹی ہے کہاں؟ کیا یہ انگریزی زبان کو خراب کرنے کے مترادف نہیں کہ اس پوٹنشل ویلیو کو گارنٹی کہا جائے؟ کون سی گارنٹی اور کہاں ہے گارنٹی؟ عدالتوں میں آئے دن اس قسم کے معاہدے ہوتے ہیں کہ اگر ایک فریق نے یہ کام یا وہ کام نہ کیا تو اسے اتنا ہرجانہ ادا کرنا پڑے گا۔ یہاں کون سا ہرجانہ ہے؟ ڈیوٹی میں اضافہ! اگر لنکا شائر نے شرط پوری نہ کی یا عہد شکنی کا ارتکاب کیا تو کس کا نقصان ہو گا؟ کپاس کے کاشت کاروں کا فائدہ کس کو ہو گا؟ کارخانے داروں کو۔ یہ ہے وہ معاوضہ جو آپ کپاس کے کاشت کاروں کو دے رہے ہیں۔

میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ حکومت ہند نے کپاس کے غریب کاشت کاروں کے ساتھ مجرمانہ بے اعتنائی کا سلوک کیا ہے۔ یہ میں اس لئے نہیں کہہ رہا کہ کپاس کے کاشت کاروں کی ایک بڑی تعداد مسلمان ہے۔ ہندو اور دیگر قوموں کے لوگ بھی کپاس کے کاشت کار ہیں۔ میں یہ کیوں کہتا ہوں؟ اس لئے کہ ان کاشت کاروں کی اپنی کوئی جماعت نہیں جو صبح و شام اور دن رات چیخ چیخ کر ان کا نقطہ نگاہ پیش کر سکے۔ سو، یہ ہے کپاس کی پوزیشن۔ خیال فرمائیے کہا یہ جاتا ہے کہ ہندوستان میں کپاس کی پچپن لاکھ گانٹھیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس بے اندازہ ذخیرے کی کتنی کپاس لنکا شائر اٹھائے گا؟ آج کل جس قدر اٹھا رہا ہے اس سے بھی کم گوشوارے میں تین برسوں کی سالانہ اوسط ۴۸۷۰۰۰ گانٹھیں دکھائی گئی ہیں۔ اگر دو سال کی اوسط نکالی جائے تو پانچ لاکھ گانٹھوں سے اوپر بنتی ہے۔ موجودہ معاہدے کی رو سے ہمیں کیا ملے گا؟ پوٹنشل ویلیو! لنکا شائر چار یا ساڑھے چار لاکھ گانٹھیں اٹھائے گا۔

مجھے معلوم ہے کہ پنجاب کے بعض مسلمانوں کا خیال ہے کہ انہیں اس معاہدے سے گویا سونے

---

[1] یہاں انگریزی کے اصل فقرے میں ایک لفظ Potential Value استعمال کیا گیا ہے۔ اور اسی لفظ کو آگے چل کر مسٹر جناح نے اپنی تقریر میں جرح و تنقید کا ہدف بنایا ہے۔ افسوس ہے اس لفظ کا کوئی صحیح مترادف مجھے اردو میں مل نہیں سکا۔

کی ایک کان مل گئی ہے۔ میں پنجاب کے مسلمانوں اور یہاں کے دوستوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ یہ معاہدہ سونے کی کان نہیں بلکہ مٹی کا ڈھیر ہے۔ یہ کہہ کر کہ اس معاہدے سے زراعت پیشہ طبقے کو بہت فائدہ ہو گا۔ یہ لوگ عوام کی آنکھوں میں مٹی جھونک رہے ہیں۔ اور غرض صرف یہ ہے کہ اس طرح انہیں الیکشن میں ووٹ حاصل ہو سکیں۔

ممکن ہے آپ ہمیں اُجڈ۔ سادہ لوح اور جاہل خیال کرتے ہوں۔ لیکن ہم سبھی اُجڈ سادہ لوح اور جاہل نہیں ہیں۔ کچھ لوگ ہم میں ایسے بھی ہیں جو کم از کم حکومت کی سیاسی زبان سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ حکومت کا دعویٰ ہے کہ اس نے ہمیں (اس معاہدے میں) بہت بڑی مراعات عطا کی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ کوئی مراعات عطا نہیں کی گئیں۔ اس کے برعکس جو حالت پہلے تھی وہی اب ہے۔ اس معاہدے سے کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی اشک شوئی تک بھی تو نہیں کی گئی۔ کاشت کاروں کا مطالبہ یہ تھا کہ کپاس کی ساڑھے سات لاکھ گانٹھیں اٹھانے کی گارنٹی دی جائے لیکن اس مطالبے کو بھی ٹھکرا دیا گیا ہے۔

جناب والا! اب۔ کھالوں کی تجارت کو لیجئے۔ گزشتہ چند برسوں میں کھالوں کے کاروبار میں ترقی ہوئی ہے۔ لیکن اس تجارت کا رُخ بیشتر انگلستان کی طرف ہے۔ میرے دوست مسٹر محمد نعمان نے اس کی بخوبی وضاحت کی ہے انگلستان آپ کو اس کاروبار میں ترجیح دیتا ہے لیکن کیفیت یہ ہے کہ انگلستان یہی مال آپ سے خرید کر آگے ادھار پٹے پر دوسرے ملکوں کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس طرح یہ ترجیح آپ کے کسی کام نہیں آئی۔ کیونکہ یہی مال پھر آگے فرانس۔ جرمنی اور دیگر ممالک کا رُخ کرتا ہے نتیجہ صفر نکلا۔ میں حیران ہوں کہ ان حقائق کی موجودگی میں یہ کیونکر کہا جا رہا ہے کہ اس تجارت میں، جس کا تعلق بیشتر مسلمانوں سے ہے، کوئی فروغ ہوا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ جہاں تک اس معاہدے کا تعلق ہے مسلمانوں کو کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچا۔

حکومت مجھ سے کیا مانگتی ہے؟ میرے دوست مسٹر جیمز مجھ سے کس چیز کا مطالبہ کرتے ہیں؟ مسٹر جیمز نے اپنی تقریر میں مجھے ہدیۂ تحسین پیش کرتے ہوئے ایک فلم سٹار سے تشبیہ دی تھی۔ کیا انہوں نے اپنی پچھلی تقریر پڑھی ہے جو انہوں نے تین سال پیشتر اس وقت کی تھی جب میں نے اٹاوہ پیکٹ کو ختم کرنے کی تحریک پیش کی تھی؟ کیا انہیں اپنے یہ الفاظ یاد ہیں:

"جاپان ہاتھ میں خنجر لے کر تاک میں بیٹھا ہے۔ برطانیہ عظمیٰ کو اٹاوہ پیکٹ سے کوئی فائدہ نہیں۔ وہ بخوشی اس سودے سے دستبردار ہونے کو تیار ہے۔ اور آپ کو جو کچھ حاصل ہوا ہے اس سے بھی آپ ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔"

انہیں چاہئے کہ ایک بار پھر اپنی یہ تقریر پڑھ لیں۔ میں انہیں میرلن ڈٹرک سے تشبیہ دے سکتا

ہوں کیونکہ وہ صرف ٹریجک پارٹ ہی کر سکتے ہیں۔ اور یہ بھی ایک ٹریجڈی ہے۔ میں نے اس وقت ان کا مشورہ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور ان سے مرعوب بھی نہیں ہوا تھا" [1]

سر ہومی مودی:۔ ے ویسٹ

مسٹر ایم اے جناح:۔ یہ صحیح ہے کہ میں ایک لحہ کے لئے گھبرا ضرور گیا تھا لیکن پھر میں نے کہہ دیا تھا کہ معاف فرمایئے۔ میں درست کہہ رہا ہوں۔ میں پوچھتا ہوں کہ آج مسٹر جیمز کون سا راگ الاپ رہے ہیں؟ ان کا ارشاد ہے کہ موجودہ معاہدہ اٹاوہ پیکٹ سے بہتر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اس وقت صحیح تھا، اور وہ غلط تھے۔"

مسٹر ایف۔ ای جیمز:۔ "اب میں صحیح کہہ رہا ہوں اور آپ غلط ہیں"

مسٹر ایم۔ اے جناح:۔ "میں آپ کی رہنمائی کو تسلیم نہیں کرتا یہی تو رونا ہے۔ یہ معاہدہ ایک طے شدہ حقیقت ہے۔ حکومت اشاروں اشاروں میں مجھے اپنی طرف بلا رہی ہے۔ گویا سنڈریلا کو بڑی آن بان سے ناچ گھر میں لے جا کر شہزادے کے ساتھ اس کا رقص کرایا جائے گا اور پھر اسے چپکے سے واپس باورچی خانے میں دھکیل دیا جائے گا کہ جاؤ برتن صاف کرو۔ معاف کیجئے گریٹا گاربو خود ایک سٹار بن کر رہے گی۔ وہ سنڈریلا بننے پر آمادہ نہیں۔ جب آپ کو میری مدد کی ضرورت ہوتی ہے تو بے دریغ مجھے اپنی طرف بلاتے ہیں۔ میں پھر اس بات کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ معاہدہ ایک طے شدہ حقیقت ہے جو یکم اپریل سے نافذ ہو جائے گا۔ حکومت اب چاہتی یہ ہے کہ کسی کو قربانی کا بکرا بنا کر دنیا کو یہ بتایا جائے کہ دیکھو اس ایوان نے تجارتی معاہدے پر مہر توثیق ثبت کر دی ہے۔

---

[1] مسٹر ایف ای جیمز مدراس کے یورپین گروپ کے نمائندے تھے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا تھا۔

I Would now make an appeal to my friend, Mr. Jinnah, and I am glad that on this matter he is with us in the House perhaps more frequently then has been possible during previous discussions. I have on more than one occasion compared Mr. Jinnah to Greta Garbo. He has, I may speak quite frankly, the allure, the inscrutability and the elusiveness of that great film Star. But today I am thinking of him as the old woman who lived in the shoe, who had so many fractious children that she did not know what to do.

گریٹا گاربو۔ میرلن ڈٹرک اور مے ویسٹ فلمی دنیا کی مشہور ایکٹرسیں گزری ہیں۔ گریٹا گاربو ۱۹۰۲ء میں سویڈن میں پیدا ہوئی تھی۔ لیکن شہرت اس نے امریکہ میں جا کر حاصل کی۔ میرلن ڈٹرک جرمن نژاد تھی اور مے ویسٹ امریکی۔

جناب والا! میں قربانی کا بکرا کیوں بنوں؟ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں اس معاہدے کے پچانوے فیصد مفاد ہندوؤں اور دیگر غیر مسلم سرمایہ داروں سے وابستہ ہیں۔ مجھے ان سے کوئی گلہ شکوہ نہیں۔ اگر انہیں اس طرح دولت پیدا کرنے اور اپنا کاروبار پھیلانے کا موقع ملتا ہے تو ضرور فائدہ اٹھائیں۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ یہ جنگ برطانوی سرمایہ داروں اور ہندو سرمایہ داروں کی ہے۔ ہندو سرمایہ داروں کی نمائندگی اس ایوان میں کانگرس پارٹی کر رہی ہے۔ اور وہی ان کی جانب سے بولنے کا حق بھی رکھتی ہے۔ ہماری مہربان اور آقائے ولی نعمت حکومت نے اعلان کیا ہے کہ یہ معاہدہ ہندوستان کے لئے مفید ہے۔ یوں کیوں نہیں کہتے کہ زیادہ تر ہندوؤں کے لئے مفید ہے۔ ادھر ہندوؤں کی حالت یہ ہے کہ وہ اسے قبول کرنے کو تیار نہیں۔ تو پھر میں کون ہوں کہ خواہ مخواہ بیچ میں دخل دے کر ان سے کہوں کہ نہیں یہ معاہدہ آپ کے لئے بہت فائدہ مند ہے۔ اسے قبول کر لیجئے۔ اگر یہ معاہدہ ایک فریب ہے۔ جیسا کہ کانگرسی کارخانہ دار شور مچا رہے ہیں تو پھر میں کیوں ان کو یہ فریب کھانے پر مجبور کروں۔ ہندوؤں کو معلوم ہے کہ چاہے کچھ بھی ہو یہ معاہدہ یکم اپریل سے نافذ ہو کر رہے گا۔ لہٰذا اب وہ اسے مسترد کر کے گویا مفت میں گنگا نہانا چاہتے ہیں۔

جناب والا! اصل مصیبت تو ان غریبوں کی ہے جو کپاس کے کاشت کار ہیں کیونکہ کپاس بر آمد کرنے کی جو شرح مقرر کی گئی ہے وہ محض ایک ڈھونگ ہے۔ کاش! حکومت یہ اعلان کرتی کہ جو فیصلہ ایوان کرے گا وہ اس کی پابند ہو گی۔ اگر یہ صورت ہوتی تو اس معاہدے کو قبول کرنے یا مسترد کرنے کا بار ایوان کی اس پارٹی پر پڑتا جس کے پچانوے فیصد مفاد اس معاہدے سے وابستہ ہیں پھر مجھ سے یہ تقاضانہ کیا جاتا کہ میں ان کے حق میں ووٹ دوں۔

جناب والا! اندریں حالات مسلم لیگ پارٹی کی پوزیشن یہ ہے کہ ہمارے نزدیک اٹاوہ پیکٹ اور اس معاہدے میں مدارج کا کوئی بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ ہمارے مفاد تو اسی قدر ہیں جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے۔ اور انہیں بھی یکسر قربان کر دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس جس فریق کے پچانوے فیصد مفاد اس معاہدے سے وابستہ ہیں، جب وہی اسے قبول کرنے پر آمادہ نہیں تو ہم کیوں اس کو قبول کرنے پر مجبور کریں۔ باقی رہی حکومت۔ میرا حکومت سے سوال یہ ہے کہ تم نے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ تم نے کون سی ہماری دادرسی کی ہے؟ جہاں تک حکومت اور کانگرس کا تعلق ہے۔ ہمارے نزدیک ہر دو لعنت والی بات ہے۔ پس! میری پارٹی نے غیر جانب دار رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ جس طرح چاہیں آپس میں اس قضیے کا فیصلہ کر لیں۔"

مسٹر جناح کی یہ تقریر خاصی واضح اور صاف ہے۔ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ انہوں نے

معاہدے کے اچھے اور بُرے پہلوؤں پر مسلم لیگ پارٹی کا نقطہ نگاہ بیان کر کے غیر جانب دار رہنے کا اعلان کیا ہے لیکن بدقسمتی سے اس مسئلے پر بھی سر سکندر حیات خاں نے اُلٹی روش اختیار کی۔ اور ۲۸ر مارچ ۱۹۳۹ء کو پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کی جس بحث کا اوپر حوالہ دیا جا چکا ہے۔ اس میں سر سکندر نے کہا:

"میں اس ایوان کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اٹاوہ پیکٹ کے تحت جو چیزیں باہر سے ہندوستان در آمد کرتا تھا۔ ان میں سے اکثر پر برطانیہ کو ترجیحات حاصل تھیں۔ اگر میرا حافظہ اس وقت غلطی نہیں کرتا تو ان ترجیحات کی مجموعی مالیت اٹھارہ کروڑ روپے تھی۔ جو موجودہ انڈو برٹش تجارتی معاہدے سے یہ رقم گھٹا کر آٹھ کروڑ روپے کر دی گئی ہے۔ ہماری زرعی پیداوار کی بر آمد میں بھی اس تجارتی معاہدے نے اضافہ کر دیا ہے مثلاً تمباکو کو لیجئے جسے پہلے ترجیحات میں شمار نہیں کیا جاتا تھا۔ السی اور پٹ سن بھی، جو بنگال میں پیدا ہوتی ہیں، اسی زُمرے میں آتی ہیں۔ چائے اور کھالوں کو بھی آئندہ ترجیح حاصل ہو گی۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی اشیاء ایسی ہیں جن کا براہ راست زراعت پیشہ طبقے کو فائدہ پہنچے گا۔ اور جنہیں ترجیحات کے زُمرے میں شامل کر لیا گیا ہے۔

لیکن اس تجارتی معاہدے کا اہم ترین جزو کپاس ہے جسے بر آمد کرنے کے لئے ہمیں نہایت اچھی شرائط ملی ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ لنکا شائر اس معاملے میں بہت پس و پیش کرتا تھا اور کپاس کی کوئی خاص معینہ مقدار کی خریداری پر آمادہ نہیں تھا۔ بدقسمتی سے جو مشاورتی بورڈ (حکومت ہند کے کامرس ممبر کے ساتھ) ہندوستان سے گیا تھا اس میں زراعت پیشہ طبقہ کے صرف دو نمائندے شامل تھے۔ باقی تمام ممبر بڑے بڑے کارخانے دار تھے جنہوں نے اس معاہدے کے راستے میں ہر قسم کے روڑے اٹکانے کی کوشش کی۔ ان کی یہ کوششیں اس قدر عامیانہ تھیں کہ انہیں دیکھ کر اسکول کے بچوں کو بھی شرم آنی چاہئے۔ ان لوگوں کا دعویٰ تھا کہ اس معاہدے سے زراعت پیشہ طبقے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اب آیئے دیکھیں کہ واقعات اور حقائق زبان حال سے کیا کہہ رہے ہیں۔ اس سے پہلے یہ قاعدہ تھا کہ انگلستان ہم سے دو اور تین

لاکھ گانٹھوں کے درمیان کپاس خریدتا تھا۔ موجودہ معاہدے کی رو سے یہ طے ہوا ہے کہ شروع میں لنکا شائر ہم سے چار لاکھ گانٹھیں سالانہ خریدے گا۔ پھر پانچ لاکھ اور انجام کار یہ تعداد چھ لاکھ گانٹھوں تک پہنچ جائے گی۔

میرے مخالف دوست اصرار کرتے ہیں کہ ہمیں سولہ آنے وصول کرنے چاہئیں۔ بارہ آنے پر ہر گز سودا نہیں چکانا چاہئے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے یہ دوست یکایک کاشت کاروں کے اس قدر مہربان اور ہمدرد کیوں بن گئے ہیں۔ ہم لوگ، جو کاشتکاروں کے نمائندے ہیں، جب چھ لاکھ گانٹھیں بر آمد کرنے پر رضامند ہیں تو انہیں ہمارا غم کیوں کھائے جارہا ہے۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ ماں سے زیادہ چاہے اور پھاپھا کٹنی کہلائے۔

یہ معاہدہ منظور ہو سکے گا یا نہیں۔ مجھے بہر حال پختہ امید ہے کہ ہمارے صوبے اور ملک کے مفاد کی خاطر اسے ضرور پاس ہو جانا چاہئے۔ لیکن بدقسمتی سے حالات اس قسم کے ہیں کہ مجھے اندیشہ ہے کہ اسے تارپیڈو کر دیا جائے گا۔ مرکزی اسمبلی کی حزب مخالف اس وقت ایوان کی سب سے بڑی پارٹی ہے۔ اور وہ ان کروڑ پتی کارخانے داروں کے ساتھ ملی ہوئی ہے جو اس معاہدے کو تارپیڈو کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اگر وہ یہ معاہدہ مسترد کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ان کا یہ فعل ہمارے ملک کے غریب اور متوسط طبقے کے لوگوں کے خلاف تاریخ کی سب سے بڑی غداری ہو گا۔

چودھری کرشن گوپال دت:۔ "مسٹر جناح سے کہئے نا کہ اسے منظور کروا دیں۔"

وزیراعظم:۔ "کاش! ان کی پارٹی کی اکثریت ہوتی۔"

چوہدری کرشن گوپال دت۔ ان کے ہاتھ میں ایوان کا توازن ہے لیکن یاد رکھیے۔ مسٹر جناح کبھی اس معاہدے کی حمایت نہیں کریں گے۔"

وزیر اعظم:۔ جہاں تک ہمارا اختیار ہے۔ ہم نے انتہائی کوشش کی ہے اور کر رہے ہیں کہ یہ معاہدہ پاس ہو جائے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں یہ

معاہدہ پہلے معاہدے کی بہ نسبت اچھا ہے۔ اور صاف عیاں ہے کہ ہمارے زراعت پیشہ طبقے کو اس سے بے حد فائدہ پہنچے گا۔ اگر اس معاہدے کو تارپیڈو کر دیا گیا تو یہ اس حکومت کا یا مشاورتی بورڈ کے پنجابی نمائندوں کا قصور نہیں ہو گا۔ نہ اسے مرکزی حکومت ہی کا قصور سمجھنا چاہئے کیونکہ وہاں سر ظفر اللہ خاں جیسا دلیر اور بہادر پنجابی بیٹھا ہے جس کی مساعی سے ہندوستان کو وہ مراعات حاصل ہوئی ہیں جو ہر شخص کی توقع سے کہیں بڑھ کر ہیں اِس معاہدے کی ترتیب و تدوین کے وقت سر ظفر اللہ خاں کو بڑے بڑے ماہروں اور زبردست اداروں سے تن تنہا لڑنا پڑا۔ لیکن وہ اس جنگ میں کامیاب و سرخرو ثابت ہوئے۔

اگر یہ معاہدہ مسترد کر دیا گیا تو اس کی ذمہ داری ان لوگوں پر نہیں ہو گی جو غریب کاشت کاروں کے خیر خواہ اور عوام کے ہمدرد ہیں بلکہ کروڑ پتی کارخانے داروں اور ان کے ایجنٹوں کی فتنہ پردازیوں پر ہو گی۔ چاہے یہ لوگ اسمبلی کے اندر سرگرم عمل ہوں یا باہر۔"

پنجاب میں اس وقت کوئی پراونشل مسلم لیگ موجود نہیں تھی۔ سکندر جناح پیکٹ کے باوجود پنجاب اسمبلی میں اب تک کوئی مسلم لیگ پارٹی نہیں قائم کی گئی تھی۔ اس لئے جہاں تک سیاسی پالیسی کا تعلق تھا سر سکندر صرف اپنی یونینسٹ پارٹی کے سامنے جوابدہ تھے۔ لیگ کے سامنے جواب دہ نہ تھے یہی وجہ ہے کہ مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کا یہ باہمی اختلاف بار بار کھل کر سامنے آ رہا تھا۔ مسٹر جناح جو کچھ مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگی نقطہ نگاہ سے کہہ رہے تھے۔ سر سکندر پنجاب میں اس کے بالکل اُلٹ کہتے تھے۔ سر سکندر حیات خاں کی مذکورہ بالا تقریر کے جواز میں زیادہ سے زیادہ یہ عُذر پیش کیا جا سکتا تھا کہ وہ پنجاب کے وزیر اعظم اور یونینسٹ پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے اپنے صوبے کے زراعت پیشہ ہندوؤں سکھوں اور مسلمانوں کی پر زور نمائندگی کرنے کا حق رکھتے تھے۔ یہ حقیقت بجا سہی۔ ہمیں اس سے انکار نہیں لیکن ان کی اس قسم کی تقریروں سے پنجاب میں مسلم لیگ کی تحریک کو جو شدید نقصان پہنچ رہا تھا اس کا آخر مداوا کیا تھا؟ سر سکندر، آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔ جب مسلم لیگ کے سالانہ اجلاسوں میں شرکت کرتے تھے تو یو پی۔ سی پی۔ بہار۔ اڑیسہ بمبئی۔ مدراس وغیرہ کے مسلمان انہیں پنجاب کا مسلم لیگی وزیر اعظم سمجھ کر انتہائی عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے اور فرط عقیدت سے ان کے راستے میں آنکھیں بچھاتے تھے۔ اگر کبھی حسن اتفاق سے وہ کسی قرار داد کی تائید کرنے کے لئے لیگ کے

پلیٹ فارم پر کھڑے ہوتے تو اقلیت کے صوبوں کے مسلمان انہیں اپنا حامی اور معاون سمجھ کر جس زور شور سے زندہ باد کے نعرے لگاتے تھے۔ وہ نظارہ دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ لیکن یہی سر سکندر حیات خاں پنجاب میں مسلم لیگ کا نام تک لینے کے روادار نہ تھے۔ ان کے اس دورُخے پن نے پنجاب میں مسلم لیگ کی تحریک کو سخت نقصان پہنچایا۔ یونینسٹ پارٹی کے بڑے بڑے مسلمان ممبر جو سر سکندر کے انتقال کے بعد مسلم لیگ کے اکھاڑے میں رستم زماں بن کر کُودے، سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور زبان سے احتجاج کا ایک لفظ نکالنے کی جرات نہ کرتے تھے۔

اس واقعہ سے دو روز بعد مسٹر جناح نے ایک اخباری بیان میں پنجاب کے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ وہ اس پُر فریب پراپیگنڈے سے گمراہ نہ ہوں جو گورنمنٹ کے ایجنٹ کر رہے ہیں۔ مسلم لیگ پارٹی ہمیشہ مسلمانوں کی حمایت کرتی رہے گی۔

۴
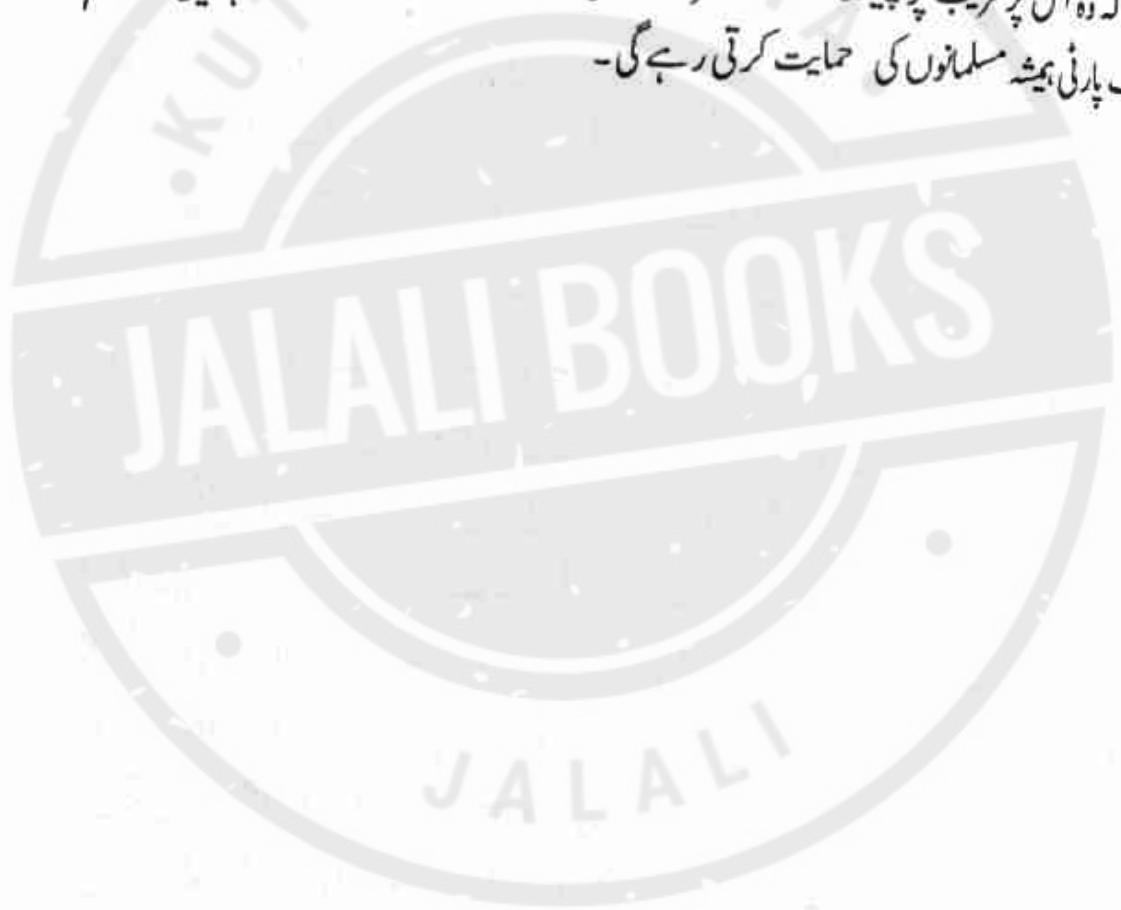
# مسلمانوں کا حقِ خود ارادی

۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے نفاذ کے بعد، کانگرس نے ہندوستان کے چھ صوبوں میں ایک پارٹی کی وحدانی حکومت قائم کر کے مسلمانوں کی جداگانہ قومی ہستی سے انکار کیا تھا۔ اور ساتھ اس نے بے شمار سازشیں کر کے صوبہ سرحد سندھ اور آسام میں مسلمانوں کی وزارتیں درہم برہم کر ڈالی تھیں۔ پھر اس نے مسلم رابطہ عوام (مسلم ماس کانٹکٹ) کی تحریک جاری کر کے اس بات کا بھی اعلان کیا تھا کہ آہستہ آہستہ تمام مسلمانوں کو کانگرس میں جذب کر لیا جائے گا تاکہ مسلم لیگ کا وجود خود بخود ختم ہو جائے۔ اس کے بعد جب کانگرس کو یقین ہو گیا کہ آئندہ یوپی۔ سی پی۔ بہار، اڑیسہ۔ بمبئی۔ مدراس وغیرہ میں اس کی مستقل۔ دائمی اور ناقابل تبدیل حکومت کو کوئی طاقت توڑ نہیں سکتی تو اس نے در پردہ آل انڈیا فیڈریشن کی حمایت بھی شروع کر دی تھی۔ مجوزہ فیڈرل اسمبلی میں اپنی اکثریت حاصل کرنے کے لئے اس نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ ہندوستان کی تمام چھوٹی بڑی ریاستوں میں پرجا پارٹیاں بنوا کر ایجی ٹیشن شروع کرا دی جائے تاکہ جو ریاستی نمائندے فیڈرل اسمبلی میں آئیں انہیں رؤسا نامزد نہ کریں بلکہ عوام منتخب کریں۔ کانگرس کو یہ بھی یقین تھا کہ جس طرح اس نے ۱۹۳۷ء میں صوبائی وزارتیں قبول کرنے سے پہلے گورنروں سے یہ عہد لے لیا تھا کہ وہ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کی خاطر اپنے خاص اختیارات استعمال نہیں کریں گے۔ بالکل اسی طرح وہ فیڈرل اسمبلی میں بھی وزارتیں قبول کرنے سے پہلے وائسرائے سے اپنے حسب منشاء سودا چکا سکے گی۔ کانگرس کو یہ بھی یقین تھا کہ اگر فیڈرل حکومت میں اس کی اکثریت قائم ہو گئی تو اس کی یلغار کے سامنے پنجاب اور بنگال ایک مہینہ بھی نہیں ٹھہر سکیں گے۔

مسلم لیگ شروع سے اس فیڈریشن کی مخالف تھی جو ۱۹۳۵ء کے ایکٹ نے پورے ہندوستان کے لئے تجویز کیا تھا۔ اگر ہم اپریل ۱۹۳۶ء کے بعد کی مسلم لیگی قرار دادوں پر ایک نظر

ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ کم و بیش آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے ہر اجلاس میں فیڈریشن کے خلاف ایک آدھ ریزولیوشن ضرور پاس کیا جاتا تھا۔ اس ضمن میں ہمارے حامی اور مخالف دونوں ہم سے پوچھتے تھے کہ اگر مسلم لیگ کو ۱۹۳۵ء کا فیڈریشن منظور نہیں تو کیا کوئی متبادل سکیم آپ کے پاس ہے؟ اس سوال کا جواب دینے کے لئے جب دسمبر ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس پٹنہ میں ہوا تھا تو ایک کانسٹی ٹیوشن سب کمیٹی بنائی گئی تھی جس کے نو ممبر تھے۔ یعنی مسٹر جناح۔ سر عبداللہ ہارون۔ سردار اورنگزیب خاں۔ نوابزادہ لیاقت علی خاں۔ ملک برکت علی۔ مسٹر عبدالمتین چودھری سید عبدالعزیز۔ سر سکندر حیات خاں۔ خواجہ ناظم الدین۔ اس کمیٹی کا فرض تھا کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تجویز کردہ فیڈریشن کے جواب میں کوئی ایسی تجویز تیار کرے جس سے ہندوستان کے مسلمانوں کے تمام خدشے رفع ہو سکیں اور اس برعظیم میں ایسی حکومت قائم ہو سکے جس سے مسلمانوں کو ہندوؤں کی مستقل اور غیر متبدل اکثریت کے خوف سے نجات مل سکے۔ تقسیم ہند کا معاملہ تو بہت بعد کی بات تھی۔ سردست تو یہ سوچنا تھا کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نے جو پارلیمنٹری نظام رائج کیا تھا اس کی قباحتوں سے محفوظ رہنے کی کیا صورت ہو سکتی تھی۔

بات یہ تھی کہ کچھ بھی ہو تا اب گھڑی کی سوئی کو پیچھے کی طرف گھمانا ممکن نہ تھا۔ ۱۹۳۵ء کی صوبائی خود مختاری کے نفاذ اور آل انڈیا فیڈریشن کے مجوزہ قیام کے بعد اگلا قدم یہی نظر آ رہا تھا کہ چند سال میں ہندوستان کو ایک ڈومینین کا درجہ مل جائے گا۔ ریاستیں قائم رہ سکیں گی یا نہیں۔ پارلیمینٹ کا اقتدار ہندوستان پر باقی رہے گا یا نہیں۔ یہ امور ہمارے لئے چنداں اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ غور طلب اور بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ آنے والی اصلاحات میں مسلمانوں کا مقام کیا ہو گا۔ اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کے مقدر میں بظاہر یہی لکھا جا چکا تھا کہ وہ مستقل طور پر ہندوؤں کی اکثریت کے تابع رہیں گے۔ یوپی۔ سی پی۔ بہار بمبئی وغیرہ کے مسلمانوں نے پنجاب اور بنگال کی مسلم اکثریت کو نقصان پہنچا کر اپنے لئے جو ونیج حاصل کیا تھا، وہ ان کے کسی کام نہیں آ سکا تھا۔ لیکن ادھر پنجاب اور بنگال کے مسلمان، اپنی اکثریت کے باوجود، ہندوؤں کے رحم و کرم پر زندہ تھے۔ اور ان کی خوشنودی حاصل کئے بغیر اپنی وزارتیں بھی نہیں بنا سکتے تھے۔

ان حالات میں، ۲۵ مارچ ۱۹۳۹ء کو میرٹھ میں ایک ڈویژنل مسلم لیگ کانفرنس نواب زادہ لیاقت علی خاں کی صدارت میں ہوئی۔ جہاں نواب زادہ صاحب نے جو خطبۂ صدارت پڑھا اس سے صرف چند جھلکیاں نظر آتی ہیں کہ لیگی لیڈروں کے پیش نظر ہندوستان کے آئینی مسائل کا حل کیا تھا۔

اس طرح ۶ - ۷ مئی ۱۹۳۹ء کو بمبئی پراونشل مسلم لیگ کانفرنس شولاپور میں ہوئی جس کے صدر سر سکندر حیات خاں تھے۔ انہوں نے اس کانفرنس میں جو خطبۂ صدارت پڑھا تھا اس سے بھی صرف چند اشارے ہمیں مل سکتے ہیں کہ ہمارے لیڈروں کے افکار کس طرف کا رخ کر رہے تھے سر سکندر کا طریق کار یہ تھا کہ وہ پنجاب میں مسلم لیگ کے پنپنے یا ترقی کرنے کے قطعاً روا دار نہ تھے۔ اپنے صوبے میں ان کے پیش نظر صرف یونینسٹ پارٹی کی پالیسی اور اسی کی ترویج تھی۔ لیگ کو انہوں نے پنجاب میں عملاً ختم کر کے رکھ دیا تھا۔ لیکن ان کا کمال یہ تھا کہ جب جمنا کے اس پار جاتے مسلم لیگی بن جاتے تھے۔ چنانچہ شولاپور کانفرنس میں جو خطبۂ صدارت انہوں نے پڑھا وہ بہت متوازن، بر محل اور مدلل تھا۔

چونکہ یہ دونوں خطبے بہت ذمہ دار اصحاب نے دیئے تھے جن سے آئینی مسائل کے حل کی نشاندہی بھی ہوتی تھی۔ اور مسلمانوں کے حق خود ارادی کے مسئلے کا حل بھی کچھ سامنے آتا تھا۔ اس لئے انہیں یہاں درج کرنا ضروری ہے۔ اس کے صرف سال بھر بعد یعنی مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں قرار دادِ پاکستان منظور ہوئی اِس طرح اس درمیانی ایک سال کی مسلم لیگی سرگرمیوں کو قرار داد لاہور کا پس منظر کہنا روا ہو گا۔

# نواب زادہ لیاقت علی خاں کا خُطبۂ صدارت

## میرٹھ ڈویژنل مسلم لیگ کانفرنس،

## مورخہ ۲۵ - مارچ ۱۹۳۹ء

"جب سے ہندوستان نے صوبوں میں پراونشل اٹانومی کا آغاز ہوا ہے، مسلمانوں کی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی ہے اور اگر فیڈریشن قائم ہو گیا تو یقین کیجئے کہ مسلمانوں کی حالت اچھوتوں جیسی ہو جائے گی۔ کانگرس صوبوں میں تو مسلمان بالکل یتیم ہو کر رہ گئے ہیں۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء نے اقلیتوں کے مذہبی، سیاسی اور ثقافتی حقوق کی حفاظت کے لئے جو خاص اختیارات گورنروں کو دیئے تھے وہ ایک حرف غلط کی طرح بے کار ثابت ہوئے ہیں۔ اور گورنروں نے اپنی بے بسی کا اظہار کر کے دکھا دیا ہے کہ تمام اقلیتیں سراسر کانگرس کے رحم پر زندہ رہیں گی۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمان بار بار یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ اقلیتوں کے لئے جملہ تحفظات کو باضابطہ دستور کا ایک جزو بنانا چاہیئے اس وقت صورت حال یہ ہے کہ کانگرس نے جو بلند بانگ دعویٰ کیا تھا کہ وہ برطانوی امپیرلزم کے خلاف محاذ جنگ قائم کرے گی اسے تو یوں سمجھئے کہ داخل دفتر کر دیا گیا ہے۔ اور اس کے بجائے گورنروں سے اس نوع کا سمجھوتا ہو گیا ہے کہ کانگرس برطانیہ کے خلاف کچھ نہیں کہے گی۔ اور ادھر گورنر بھی اپنے اختیارات خاص استعمال نہیں کریں گے۔ اس باہمی سمجھوتے کی چکی میں مسلمان ہیں کہ بری طرح پس رہے ہیں۔ کیا ہم اس سے یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب نہیں کہ کانگرس نے وزارتیں قبول کرنے سے پہلے وائٹ ہال سے جو "خاموش معاہدہ" کیا تھا اس کی غرض و غایت یہی تھی؟

مسلمان محسوس کر رہے ہیں کہ اقلیتی صوبوں میں ان کی حیثیت گرتے گرتے کانگرس کی رعایا کی رہ گئی ہے۔ اگر فیڈریشن قائم ہو گیا تو ہماری بربادی میں جو رہی سہی کسر ہے وہ بھی پوری ہو جائے گی کیونکہ برطانوی حکومت اور کانگرس کا باہمی سمجھوتا ہو چکا ہے کہ ریاستوں کی حکومتوں کو بزور جبر ایک ایسی جمہوریت قبول کرنے پر آمادہ کیا جائے گا جس کی پشت پر بندوق اور سنگین کا راج ہو گا تاکہ اس طریقے سے کانگرس کو فیڈرل اسمبلی میں اکثریت حاصل ہو۔ برطانیہ اور کانگرس کے اس عیارانہ اتحاد کو کامیاب بنانے کے لئے دو شکار تلاش کئے گئے ہیں جنہیں بے دریغ اس قربان گاہ پر بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے۔ ایک مسلمان اور دوسرا ریاستیں۔ یہ محض ایک خیالی اندیشہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ اگر مجوزہ فیڈریشن قائم ہو گیا تو جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں بھی وہ کانگرس کے غلام بن کر رہ جائیں گے۔

ہندوؤں کی مستقل، دائمی اور ناقابل تبدیل اکثریت نے ہمارے لئے بڑی نازک صورت حال پیدا کر دی ہے۔ حکومت اس وقت ایک غیر متبدل ہندو اکثریت کے ہاتھ میں ہے اور آئندہ بھی اس کے ہاتھ میں رہے گی۔ مسلمان آج اپوزیشن میں ہیں اور آئندہ بھی قیامت تک اپوزیشن ہی میں رہیں گے۔ بڑی سے بڑی طاقت لسانی بھی اکثریت کو اقلیت یا اقلیت کو اکثریت میں تبدیل نہیں کر سکتی۔ صدیاں گزر جائیں مسلمانوں کی تقدیر میں یہی لکھا جا چکا ہے کہ وہ حزب مخالف کی حیثیت سے ہمیشہ محروم اقتدار رہیں گے۔

میں ایک ایسے آزاد ہندوستان کا متمنی ہوں جس میں مسلمان باعزت طریقے سے رہ سکیں اور انہیں اقتدار اور آزادی حاصل ہو۔ مسلمانوں کو ایک فرقہ کہنا جائز نہیں۔ وہ ایک قوم ہیں۔ نو کروڑ باشندوں کو جنہوں نے صدیوں تک اس ملک پر حکومت کی ہے، ایک فرقہ کہہ کر ٹال دینا حقائق

سے چشم پوشی کرنے کے مترادف ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہندو اور مسلمان ایک ہی ملک میں رہتے ہیں۔ لیکن دونوں کی زندگیاں قطعی مختلف ہیں۔ ان کا مذہب مختلف ہے۔ کلچر مختلف ہے۔ تہذیب مختلف ہے۔ مسلمانوں کو اس نقلی نیشنل ازم سے کوئی دلچسپی نہیں جو ہندوؤں نے یورپ سے مستعار مانگ لیا ہے۔

میں پوچھتا ہوں کہ اندریں حالات جب مسلمانوں کی یہ کیفیت ہے وہ کیونکر اس ملک میں گزارا کر سکیں گے؟ اگر یہ کہا جائے کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں ادھر اُدھر کہیں تبدیلی کر کے مسلمانوں کو مطمئن کیا جا سکے گا تو معاف کیجئے ان جزوی تبدیلیوں سے ہمیں عزت و آبرو کی زندگی میسر نہیں آ سکتی جب تک مسلمانوں کے حقوق کی ضمانت نہیں دی جائے گی اس ملک میں امن و امان قائم نہیں ہو سکے گا۔ دونوں قوموں میں باہمی بے اعتمادی اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ مسلمان یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ ہندوؤں کو محض ہندو ہونے کی وجہ سے ہر قسم کی مراعات سے نوازا جا رہا ہے۔ اور مسلمان صرف اس لئے محروم ہیں کہ وہ مسلمان ہیں۔ بتائیے، جب صورت یہ ہو تو ہندو اور مسلمان دونوں ایک ہی نظام حکومت کے تحت کیونکر زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

ممکن ہے بعض کوتاہ نظر لوگ یہ سوال کریں کہ ماضی میں دونوں قومیں کیونکر یکجا رہتی تھیں۔ اس سوال کا جواب نہایت آسان ہے۔ ماضی میں پارلیمینٹری نظام حکومت یہاں رائج نہیں تھا بلکہ ایک ایسی غیر جانبدار اور وسیع القلب بادشاہت تھی جس نے اپنا مذہب اور کلچر اپنی رعایا پر مسلط نہیں کیا تھا۔ جوں جوں جمہوریت کے نام پر حکومت کا اختیار و اقتدار منتقل ہونا شروع ہوا اسی نسبت سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلاف کی خلیج بھی وسیع ہونا شروع ہوئی، ہندوؤں کی حالت یہ ہے کہ اقتدار چونکہ ان کے ہاتھ میں چلا گیا ہے اس لئے اب وہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کو بالکل پراچین بھارت نمونے پر ڈھال دیں۔ اس کے برعکس مسلمان خود کئی سو سال تک یہاں حکومت کر چکے ہیں۔ وہ کیونکر اس صورت حال کو قبول کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔ لا محالہ اس ناقابل حل الجھن کا تصفیہ صرف یہ ہے کہ دونوں قوموں میں سے ہر ایک کو، بغیر کسی روک ٹوک کے، الگ الگ ترقی کرنے کا موقع دیا جائے۔

اس مقصد کے پیش نظر بہت سی سکیمیں مرتب کی گئی ہیں۔ نہیں کہا جا سکتا کہ بالآخر کون سی سکیم منظوری کی سند حاصل کرے گی۔ لیکن ایک بات ظاہر ہے کہ اگر ہندو اور مسلمان مل جل کر زندگی بسر نہیں کر سکتے تو انہیں چاہئے کہ اس ملک کو مذہب اور کلچر کی بنیادوں پر تقسیم کر لیں۔ یہی ایک طریقہ ہے کہ دونوں قومیں ایک دوسرے کے حقوق پر دست درازی کئے بغیر اپنے اپنے حلقے میں ترقی کر سکیں گی۔

ظاہر ہے ہندو کبھی یہ تجویز قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ اوّل اس لئے کہ وہ پورے ہندوستان کو اپنے زیر نگیں رکھنا چاہتے ہیں۔ دوسرے اس لئے کہ انہیں یہ ہرگز گوارا نہیں کہ مسلمان اپنے نصب العین اور خیالات و عقائد کے مطابق زندگی بسر کریں۔ بہر حال، یہ نظریہ اس قابل ضرور ہے کہ اسے قبول کر لیا جائے۔ اور بہتر یہی ہو گا کہ ہندو اور مسلمان باہمی رضامندی سے قبول کریں" [۱]۔

# سر سکندر حیات خاں کا خطبہ صدارت

## بمبئی پراونشل مسلم لیگ کانفرنس،

### منعقدہ شولا پور بتاریخ ۶-۷ مئی ۱۹۳۹ء

"میں مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں پُر امید اور پُر اعتماد ہوں۔ ہمارے مخالف اور بدخواہ ہزار سازشیں کریں۔ وہ ہمیں اس اعزاز اور افتخار سے محروم نہیں کر سکیں گے جو ہمارے حصے میں لکھا جا چکا ہے اور جس کی خاطر ہم ہندوستان کو ایک ایسا آزاد۔ عظیم الشان اور باوقار ملک بنانا چاہتے ہیں جہاں اس ملک کے باشندے آزادی اور عزت و آبرو کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔

ذرا چاروں طرف نظر ڈال کر دیکھئے کہ آپ کے گرد و پیش کیا واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ پہلے اس بات سے ابتداء کیجئے کہ نئے آئین کے نفاذ کے بعد کیا کیا کچھ ہوا ہے۔ گزشتہ دو سال کے عرصے میں صوبائی خود مختاری کو جس انداز سے چلایا گیا ہے اس سے یہ بات قطعی عیاں ہو گئی ہے۔ کہ برسوں کے غور و فکر کے بعد جن بنیادی اصولوں پر یہ آئین وضع کیا گیا تھا وہ اصول طاق نسیان پر رکھے رہ گئے اور ان پر عملدر آمد نہیں ہوا۔ جن نام نہاد تحفظات کی افادیت اور اہمیت کا ڈھنڈورا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ بنانے والوں نے بہت زور سے پیٹا تھا. وہ یا تو عملاً بے کار اور بے سُود ثابت ہوئے یا ان کو صریحاً نظر انداز کر دیا گیا۔ کم سے کم مجھے اس صورت حال سے کوئی تعجب نہیں ہوا۔ کیونکہ میں نے آج سے دس سال پیشتر پنجاب ریفارم کمیٹی کی رپورٹ میں لکھ دیا تھا کہ مستقبل میں یہی کچھ ہو کر رہے گا۔

---

۱۔ اصل خطبہ صدارت انگریزی میں تھا۔

اسی طرح یہ توقع بھی نقش بر آب ثابت ہوئی کہ ہندوستان کے جملہ صوبوں کی وزارتوں میں اقلیتوں کو جائز اور مؤثر نمائندگی حاصل ہو گی۔ بجز چند ایسے صوبوں کے، جہاں غیر کانگرسی وزارتیں قائم ہیں اور کسی صوبے کے کابینہ میں اقلیتوں کے مستند نمائندے شریک نہیں کئے گئے۔ میں پنجاب کے بارے میں وثوق سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں چاہتا تو پارلیمنٹری اصولوں کی خلاف ورزی کئے بغیر اقلیتوں کے نمائندوں کو اپنی کابینہ میں شامل کرنے سے انکار کر دیتا۔ کیونکہ میری پارٹی کو اسمبلی میں اتنی بڑی اکثریت حاصل ہے کہ میں تنہا اس کے بل پر وزارت بنانے کا اہل ہوں۔ لیکن میرے اپنے صوبے اور مجموعی طور پر سارے ملک کے مفاد کا تقاضا یہ تھا کہ میں ان تمام اہم اقلیتوں کو، جن کے مفاد صوبے سے وابستہ تھے، اور جو ہمارے ساتھ مل کر کام کرنے کو تیار تھیں۔ اپنی کابینہ میں جگہ دوں۔ چنانچہ اس کا جو نتیجہ نکلا اس نے میرے اس فیصلے کو بالکل صحیح اور حق بجانب ثابت کر دیا ہے۔ اس کے باوجود کابینہ کی مشترکہ ذمہ داری کے اصول کو بھی کوئی گزند نہیں پہنچ سکا۔

علاوہ ازیں اس تجربے سے جو کامیابی ہمیں پنجاب میں ہوئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر دوسرے صوبوں کی حکومتیں بھی اپنے اپنے ہاں کی اقلیتوں سے اسی قسم کا سلوک کرتیں تو اس فرقہ وارانہ تلخی اور کشیدگی میں بے حد کمی ہو جاتی جو بدقسمتی سے اس وقت ہندوستان کے بعض حصوں پر چھائی ہوئی ہے۔ ہمیں، دو سال کے مختصر عرصے میں پنجاب میں اقتصادی معاملات اور دوسرے شعبوں میں جو متوازن ترقی ہوئی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم نے اپنی کابینہ میں نہایت خردمندی سے صوبے کے متعدد مفادات کو نمائندگی عطا کی ہے۔

افسوس ہے ہمارے ملک کے بعض لوگ یورپ کے ڈکٹیٹروں کے طور طریقوں کی نقل کر رہے ہیں اور انہی کے عقائد کی پیروی بھی کرنا چاہتے ہیں۔ میری مراد کانگرس کے بعض بڑے بڑے لیڈروں سے ہے، جو زبان سے تو جمہوریت کا راگ الاپتے ہیں لیکن عملاً ڈکٹیٹر شپ کے راستے پر گامزن ہیں۔ نئے آئین نے ہمیں مادر وطن اور عوام کی خدمت کا ایک بڑا نادر موقع عطا کیا تھا۔ اور اگر وہ تمام جماعتیں، جنہیں گزشتہ انتخاب میں، اپنے اپنے عوام کی اکثریت نے ووٹ دے کر وزارت کی گدیوں پر بٹھایا تھا۔ اس اصول پر عمل پیرا ہوتیں کہ خود بھی زندہ رہو اور دوسروں کو بھی زندہ رہنے دو تو عوام کو یقیناً بہت فائدہ پہنچتا۔ یہ جماعتیں اگر وسعت نظر اور حب وطن کے تعمیری جذبے سے سرشار ہو کر اور کسی بیرونی طاقت کے دباؤ سے بے نیاز ہو کر وطن کی خدمت پر کمربستہ ہو جاتیں تو آج اقوام عالم کی برادری میں ہندوستان اپنے اس جائز

اور صحیح مقام کے حصول میں. جس کی وہ مدت سے کوشش کر رہا ہے، کہیں زیادہ قریب ہوتا۔
ہمارے یہاں استعارے کے طور پر کہا جاتا ہے کہ دیوتا انسانوں سے بڑا حسد کرتے ہیں۔ چنانچہ یہی کچھ ہمارے ساتھ بھی ہوا۔ کانگرس کی غیر معمولی کامیابی نے. بدقسمتی سے کانگرسی لیڈروں کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ انہیں چاہئے تھا کہ اس نئے اقتدار کو. جو انہیں حاصل ہوا تھا. جمہوری قاعدوں کے مطابق استعمال کرتے۔ لیکن اس کے بجائے انہوں نے وہی آمرانہ طرز حکومت اختیار کر لیا جو آج یورپ میں مسولینی اور ہٹلر نے اختیار کر رکھا ہے۔ حالانکہ یہی کانگرسی لیڈر ہیں جو آئے دن اپنی تقریروں اور اخباری بیانوں میں ہٹلر اور مسولینی کی آمرانہ حکومت کی مذمت کرتے ہوئے نہیں تھکتے۔

اس پالیسی کا نتیجہ سخت افسوسناک نکلا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کانگرس بگٹٹ گھوڑے کی طرح ڈکٹیٹرشپ کی طرف دوڑ رہی ہے۔ اور اس ملک میں ایک پارٹی کی آمرانہ حکومت قائم کرنے کے درپے ہے۔ ریاستوں کو کچلنے پر جس قدر جاں فشانی اس وقت دکھائی جا رہی ہے اگر وہی محنت ان مسائل کے حل کرنے پر خرچ ہوتی جو مدت سے معرض التواء میں پڑے ہوئے ہماری توجہ کے طلب گار ہیں۔ اور جن کے ساتھ اس ملک کی ترقی و تنظیم وابستہ ہے تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ ایک طرف ہندوستان اپنی منزل مقصود سے نسبتاً بہت قریب ہوتا۔ اور دوسری طرف کانگرس کے وقار میں بھی بہت کچھ اضافہ ہو گیا ہوتا۔ کیا یہ بہتر نہ تھا کہ کانگرس براہ راست اقلیتوں کے نمائندوں سے گفت و شنید کر کے کوئی ایسی مفاہمت کرتی جس سے فرقہ وارانہ مسئلہ خوش اسلوبی سے حل ہو جاتا؟ کیا یہ مناسب نہ تھا کہ اکا دکا ریاست پر ڈورے ڈالنے کی بجائے مجموعی طور پر ریاستی مسئلہ کا کوئی حل تجویز کیا جاتا؟ افسوس کہ اس قسم کا معقول اور باعزت راستہ اختیار کرنے کی بجائے کانگرس نے تہدید و تخویف کے ہتھیار اٹھا لئے ہیں۔ اب صورت حال یہ ہے کہ ایک طرف وہ اقلیتوں کو مٹانے اور دوسری طرف ریاستوں کو نیست و نابود کرنے کے لئے چور دروازے سے داخل ہو کر مختلف ہتھکنڈے استعمال کر رہی ہے جو ہرگز ایک سیاسی جماعت کے شایان شان نہیں۔

ہندوستان کے اچھوت مدت سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ انہیں ایک جداگانہ قوم قرار دے کر خاص حقوق عطا کئے جائیں۔ لیکن تعجب ہے کہ اس مطالبے کی شدید مخالفت وہ جماعت کر رہی ہے جو اچھوتوں کی موجودہ قابل رحم حالت کی ذمہ دار ہے۔ خوف انہیں صرف یہ لاحق ہے کہ اگر اچھوت الگ ہو گئے تو ہندوؤں کی موجودہ اکثریت اقلیت میں تبدیل ہو جائے گی۔ اسی طرح

مسلمانوں کے قومی شیرازے کو منتشر کرنے کی بھی کوششیں کی جارہی ہیں۔ اور ہر قسم کے بُرے بھلے ہتھکنڈے اختیار کئے گئے ہیں۔ مسلم رابطہ عوام (مسلم ماس کانٹکٹ) کا فتنہ بھی مسلمانوں ہی میں پھوٹ ڈالنے کے لئے کھڑا کیا گیا ہے۔

کانگرس نے یہ پالیسی، جو سراسر کوتاہ نظری پر مبنی ہونے کے علاوہ حب وطن کے بھی منافی ہے، محض اس لئے اختیار کی ہے کہ مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں میں تفرقہ ڈال کر ان کے قومی نظام کو خراب کیا جائے۔ اگر کانگرس اسی روش پر گامزن رہی اور بجائے اس کے کہ مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے مسلمہ لیڈروں سے گفت و شنید کر کے کوئی مفاہمت کی راہ تلاش کرے۔ ان میں انتشار پھیلانے پر مصر رہی تو اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہ ہو گا کہ ہمارے ملک میں افتراق و اختلاف کو جو خلیج پہلے سے پیدا ہو چکی ہے اس کا پاٹ روز بروز وسیع ہوتا جائے گا۔ اور یہ صورت حال یقیناً ہر محب وطن ہندوستانی کے لئے رنج و افسوس کا موجب ہے۔

مسلمانوں نے استخلاص وطن کی جدوجہد میں ہمیشہ ہندوستان کی دیگر اقوام کا ساتھ دیا ہے۔ اور ہم آئندہ بھی اپنے برادران وطن کے پہلو بہ پہلو اور شانہ بشانہ جنگ آزادی میں شرکت کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن یہ سن لیجئے کہ ہم کانگرس کے ہم پلہ، مساوی اور برابر کے فریق کی حیثیت سے مادر وطن کو آزاد کرانے کے لئے میدان میں اتر سکتے ہیں۔ اگر ہم سے یہ کہا جائے کہ کانگرس کے خیمہ بردار بن کر پیچھے پیچھے چلو تو قیامت تک ایسا نہ ہو گا۔ خواہ کچھ ہو کر رہ جائے۔ ہم اپنی جداگانہ قومی شخصیت پر کبھی حرف نہیں آنے دیں گے۔ ہم یک دل اور یک جان ہو کر اس بات کا عزم صمیم کر چکے ہیں۔ اگر ہمارے اس پیدائشی حق سے ہمیں محروم کرنے کی کوشش کی گئی جس کی رو سے ہم اس ملک میں ایک آزاد اور باوقار قوم کی طرح زندہ رہنے کے مستحق ہیں تو پھر میں بہانگ دہل یہ اعلان کرنے پر مجبور ہوں کہ ہم اپنے قومی استحکام کی بقاء کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔

یہ بات بھی یاد رکھئے، مسلمان اپنے مذہب، کلچر اور عزت کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ کبھی اس متاع عزیز پر آنچ آئی تو مسلمان اس کی حفاظت کے لئے سینہ تان کر لڑیں گے۔

عزیزان ملت! مسلم لیگ کے پرچم تلے متحد ہی نہیں بلکہ کمر ہمت باندھ لیجئے۔ ہم اپنے دل میں کسی کے خلاف حسد یا بغض یا دشمنی رکھنے کے قائل نہیں۔ لیکن اس متاع گراں مایہ کی حفاظت کے لئے جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے اور جس پر ہماری قومی وحدت کا انحصار ہے ہمیں تیار ہو جانا چاہئے۔

ملک کے کانسٹی ٹیوشن کو مستحکم کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہندوستان کی تمام اقلیتیں، انفرادی اور اجتماعی طور پر، مربوط و متحد ہو جائیں۔ اقلیتوں کا اس طرح مربوط و متحد ہونا قومی اتحاد کے منافی نہیں بلکہ اس کے مطابق اور ہم آہنگ ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک قبیلے کے استحکام کے لئے خاندان کا استحکام لازمی ہے۔ علاوہ ازیں یہ نکتہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اگر اقلیتیں متحد ہو جائیں تو قومی سطح پر ایک پائدار اور آبرومندانہ سمجھوتا بہت آسانی سے ہو سکے گا۔ ملک کی اکثریت کو بھی اس قسم کے سمجھوتے کا خیر مقدم کرنا چاہئے۔ اس کے برعکس اگر اکثریت کی اپنی نیت خراب ہے اور وہ اقلیتوں کے اندر پھوٹ ڈال کر اپنا مقصد پورا کرنے کے درپے ہے تو حالات کی خرابی اور ابتری بدستور قائم رہے گی۔

کیا فیڈریشن کے اندر اور کیا صوبائی حکومتوں میں۔ دونوں جگہ اقلیتوں کے بنیادی حقوق کی حفاظت نہایت مؤثر طریقے سے ہونی چاہئے۔ ہم اس بات کی ضمانت دینے کو تیار ہیں کہ اگر ایک طرف فیڈریشن میں اور دوسری طرف مسلم اقلیت کے صوبوں میں ہمارے حقوق محفوظ کر دیئے جائیں تو ہم اس کے بدلے میں ان صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اقلیتوں کو اسی قسم کی مراعات دینے کو آمادہ ہیں۔ مثلاً پنجاب میں جہاں مسلمان چھپن فیصد ہیں، ہم نے ہندوؤں، سکھوں، مسیحوں اور اچھوتوں کو پورا ویٹیج عطا کیا ہے۔ یہ ویٹیج ملازمتوں میں بھی دیا گیا ہے اور کابینہ میں بھی۔ جہاں تک اقلیتوں کے بنیادی حقوق کا سوال ہے، ہم نے وزارت قبول کرتے ہی اعلان کر دیا تھا کہ یہ بنیادی حقوق محفوظ ہیں۔ اور پھر اس اعلان پر عمل بھی کر کے دکھایا ہے۔ ہمیں امید ہے اور یہ ہمارا مطالبہ بھی ہے کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اقلیت ہے، وہاں بھی اور فیڈریشن میں بھی، ہمارے اسی قسم کے حقوق محفوظ کئے جائیں۔

حال ہی میں کانگرس نے ہندوستانی ریاستوں کے متعلق جو شرانگیز مہم شروع کی ہے اس نے برطانوی ہند کے مسلمانوں کو بھی مجبور کر دیا ہے کہ اس بارے میں اپنے رویئے کا اظہار کریں۔ مسلم لیگ کو ہندوستانی ریاستوں کے باشندوں سے ان کی آئینی جدوجہد میں پوری ہمدردی ہے۔ اور وہ ریاستی باشندوں کی جائز شکایات کو رفع کرانے کی بھی حامی ہے۔ لیکن اس کے باوجود لیگ شدت سے کانگرس کے ان جابرانہ طریقوں کی مذمت کرتی ہے جن سے بعض چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو مرعوب کیا جا رہا ہے۔ اور بعض بڑی ریاستوں کے اندر بدامنی پھیلانے کی مہم کا آغاز کیا گیا ہے۔ ہم یہ حرکتیں کبھی برداشت نہیں کر سکیں گے۔

کانگرس نے اسی قسم کے ہتھکنڈے فیڈریشن کے متعلق بھی اختیار کئے ہیں تاکہ ہر بُرے بھلے اور ہر قسم کے جائز ناجائز طریقے اختیار کر کے فیڈرل حکومت میں بھی اپنی اکثریت حاصل

کرے۔ میرے کہنے کی کچھ ضرورت نہیں۔ اب تو ہر چیز الم نشرح ہو کر رہ گئی ہے۔ کانگرس اور ہندو مہا سبھا کے پیش نظر جس مرکزی حکومت کا تصور ہے وہ اس تصور سے قطعی مختلف ہے جو باقی ہندوستان کے سامنے ہے۔ حالات و واقعات اس بات کی شہادت دینے کو کافی ہیں کہ کانگرس مرکز میں جس قسم کی حکومت قائم کرنے کے منصوبے تیار کر رہی ہے وہ برائے نام فیڈریشن ہو گی۔ اور عملاً وحدانی حکومت ہو گی۔ تاکہ کانگرس کو وہ کلی اقتدار حاصل ہو جائے جس سے وہ مرکز کے علاوہ صوبوں پر بھی اپنی حکمرانی کا سکّہ بٹھا سکے۔

میں اس جگہ کانگرس کی اس ایجی ٹیشن کا بھی ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو اس نے ریاست حیدر آباد میں شروع کر رکھی ہے۔ ہم تکمیل آزادی کے علم بردار ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ دوسروں کے جائز مذہبی جذبات کا احترام کرنا بھی ہمارا فرض ہونا چاہئے۔ اگر حیدر آباد کے غیر مسلموں کو کچھ شکایتیں ہیں تو انہیں چاہئے کہ آئینی طریقوں کے مطابق اپنی حکومت سے رجوع کریں۔ اس صورت میں ہماری تمام ہمدردیاں ان کے ساتھ ہوں گی۔ تاریخ گواہ ہے کہ حیدر آباد کے بلند پایہ فرماں رواؤں نے کبھی تحمل، بردباری اور عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اور حیدر آباد کے روشن خیال اور دور اندیش وزراء نے بھی اسی اصول کے مطابق حکومت کی ہے۔ اندریں حالات مجھے یقین ہے کہ اگر وہاں کے غیر مسلم باشندے اپنی جائز شکایات آئینی طریقے سے حکومت کے سامنے پیش کریں تو ان کا ضرور ازالہ کیا جا سکے گا۔

یہ بات بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ابتداء میں کانگرس اور ہندو مہا سبھا کے ناپاک گٹھ جوڑ ہی نے حیدر آباد میں شورش بپا کرائی تھی۔ لیکن آگے چل کر جب کانگرس نے دیکھا کہ اس پر فرقہ پرستی کا الزام لگ رہا ہے تو چپکے سے الگ ہو گئی۔ اور ایجی ٹیشن کا میدان کلیتہً ہندو مہا سبھا کے حوالے کر دیا۔ جماعتی حیثیت سے اگرچہ کانگرس اس شورش سے علیحدہ ہو چکی ہے۔ لیکن اس نے اپنے ممبروں کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے کہ انفرادی طور پر شورش میں شریک رہیں۔ لہٰذا یہ کہنا کہ کانگرس درپردہ اس تحریک میں شامل ہے۔ واقعات و حالات کی رو سے غلط قرار نہیں دیا جا سکتا۔ حیدر آباد میں یہ ایجی ٹیشن برپا کرنے سے دو مقاصد کانگرس کے پیش نظر ہیں۔ ایک یہ کہ ہندوستان کی دوسری ریاستوں پر دھونس جما کر انہیں مرعوب کیا جائے کہ دیکھو ہمارے مطالبات مانو ورنہ ہم تمہارا ابھی تختہ الٹ دیں گے۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے کلچر اور تہذیب کے اس سب سے بڑے مرکز پر ضرب لگائی جائے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فیڈریشن کے بارے میں کچھ عرض کر دوں۔ حال ہی میں ہمارے ملک میں جو سیاسی تبدیلیاں ہوئی ہیں اور تحریکیں چلائی گئی ہیں ان سے گورنمنٹ آف انڈیا

ایکٹ کے مجوزہ فیڈریشن کے اندرونی نقائص اور خامیاں اور خرابیاں کھل کر سامنے آگئی ہیں۔
آل انڈیا مسلم لیگ اس فیڈریشن کے بارے میں اپنی پالیسی کا اعلان کر چکی ہے۔ تازہ واقعات نے لیگ کی اس پالیسی کے صحیح اور صائب ہونے پر اپنی مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ کانگرس کی جو نیت ہے ہم اسے خوب جانتے ہیں۔ اگرچہ کانگرس نے بھی فیڈرل سکیم کی مذمت کی ہے لیکن ہمیں معلوم ہے کہ کانگرس کی لغت میں ہر لفظ ذومعنی ہے۔ زبان سے تو وہ یہی کہتے ہیں کہ ہم فیڈریشن کو توڑ پھوڑ دیں گے۔ لیکن وقت آنے پر وہ توڑ پھوڑ کے معنی یہ کریں گے کہ فیڈرل حکومت کی گدی پر قبضہ کر لیا جائے۔ آثار نظر آ رہے ہیں کہ اگر کانگرس کو یقین ہو گیا کہ وہ مختلف صوبوں پر تسلط جما سکے گی یا اقلیتوں میں باہمی تفرقہ پھیلانے اور ان کو اپنے شکنجے میں جکڑنے میں کامیاب ہو سکے گی یا برطانوی حکومت کے پر اسرار رویئے نے اس در پردہ اپنی امداد و اعانت کا یقین دلا دیا تو وہ بلا تأمل آگے بڑھ کر فیڈرل حکومت پر قابض ہو جائے گی۔
وقت آ گیا ہے کہ وہ تمام لوگ. جن میں اقلیتوں کے مستند نمائندے بھی شامل ہیں. جو کانگرس کی موجودہ روش کو ہندوستان کے مجموعی مفاد کے لئے نقصان دہ خیال کرتے ہیں۔ واضح اور غیر مشتبہ الفاظ میں اعلان کریں کہ آئندہ ہندوستان کے لئے جو دستور وضع کیا جائے گا۔ اس میں ہمارے حقوق نہایت مؤثر انداز میں محفوظ کئے جانے چاہئیں۔ بہتر یہ ہو گا بلکہ ہندوستان کے مجموعی مفاد کے لئے بھی یہ مفید ہو گا کہ ان تمام فریقوں کے نمائندے یکجا بیٹھ کر غور و فکر کریں۔ اور باہم مشورے سے اس بات کا فیصلہ کریں کہ اگر ہندوستان کا آئندہ طرز حکومت فیڈرل ہوا تو اس کو کامیابی سے چلانے کے لئے دستور میں کیا کیا شرطیں اور شقیں درج ہونی چاہئیں۔
جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے. میں یہ بات پختہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ گزشتہ دو سال میں جو تجربہ ہمیں ہوا ہے۔ جس سرعت سے واقعات میں تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اور جس تیزی کے ساتھ ہندوستان کے باشندوں کے حالات و کوائف میں انقلاب آیا ہے۔ اس کے پیش نظر وہ فیڈریشن جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء نے تجویز کیا تھا قطعی قابل عمل نہیں رہا۔ بایں ہمہ مجھے یہ کہنے میں بھی کوئی تکلف نہیں کہ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان ترقی و تنظیم کے راستے پر گامزن رہے تو ضروری ہے کہ کسی نہ کسی طرز کی فیڈرل حکومت یہاں قائم کرنی ہی پڑے گی۔ اس قسم کی حکومت جبھی قبول کی جا سکتی ہے کہ دیگر امور کے علاوہ اس میں ذیل کی بنیادی شقیں بھی موجود ہوں:

الف۔ ہندوستان کا یہ ناقابل ترمیم حق تسلیم کیا جائے کہ وہ سیاسی طور پر آزادی کی منزل سے ہم کنار ہو سکے گا۔

ب۔ فیڈریشن کی ہر وحدت (یونٹ) کی آزادی اور خود مختاری ایسے مؤثر طریقے سے محفوظ کی جائے کہ نہ مرکزی حکومت نہ کوئی خارجی شورش انگیز تحریک اور نہ کوئی دوسرا یونٹ اس کی آزادی اور خود مختاری میں خلل انداز ہو سکے۔

ج۔ مجوزہ فیڈریشن کی مالیات کو اس طرح منظم کیا جائے کہ تمام یونٹ اپنے اپنے ہاں کے مالی وسائل کو جس طرح چاہیں ترقی دیں۔ مرکزی حکومت دخل اندازی نہیں کر سکے گی۔

د۔ مرکز کے پاس صرف چند ایک بنیادی امور کی سرانجام دہی کے اختیارات رہیں گے، جملہ اختیارات مابقیٰ انفرادی طور پر ہر یونٹ کو منتقل ہو جائیں گے یا اگر دو دو۔ تین تین یونٹیں چاہیں کہ مل کر اپنے گروپ بنالیں تو یہ اختیارات مابقیٰ ان گروپوں کو منتقل کر دیئے جائیں گے" [۱]۔

سر سکندر حیات خاں کی یہ تقریر بڑی خیال انگیز اور معنی خیز تھی۔ ہمارے لیڈروں میں سر سکندر کو بلاشبہ یہ خصوصیت حاصل تھی کہ انہیں نظم و نسق کا وسیع عملی تجربہ بھی تھا۔ پنجاب کے وزیر اعظم کی حیثیت سے انہیں ہر روز جن مسائل سے واسطہ پڑتا تھا ان کا اقلیت کے صوبوں کے مسلم لیگی لیڈروں کو چنداں علم نہیں تھا۔ پنجاب میں مسلمان چھپن یا ستاون فیصد کے قریب تھے۔ لیکن صوبے کی تجارت دولت۔ صنعت و حرفت پر ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ بنکنگ۔ انشورنس۔ در آمد و بر آمد کے ادارے اور کارخانے۔ سب کچھ ہندوؤں کے پاس تھا۔ گزشتہ پندرہ سولہ سال کی کوششوں کے باوجود ابھی تک سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب پورا نہیں ہوا تھا۔ ہندوؤں کا پریس نہایت طاقت ور اور ذی اثر تھا۔ یہی کیفیت سکھوں کی تھی جو مجموعی طور پر نہایت خوش حال اور منظم ہونے کے علاوہ جنگجویانہ سپرٹ کے مالک بھی تھے۔ ان حالات میں کہنے کو تو مسلمانوں کی پنجاب میں اکثریت تھی لیکن حقیقتاً اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے ہندو پورے صوبے پر چھائے ہوئے تھے۔ بڑے سے بڑا مسلمان زمیندار بھی ہندو ساہو کار کا مقروض تھا۔

سر سکندر کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ پنجاب کے حدود کے اندر ایسی کوئی بات کہنے کے روادار نہ ہوتے تھے جس سے ان پر ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے گویا "فرقہ پرستی" کا الزام لگ سکے۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ سیاست روز بروز جو رنگ اختیار کر رہی تھی وہ سراسر ہندوؤں اور مسلمانوں کی فرقہ پرستی بن کر رہ گئی تھی۔ اب کانگرس ہندوؤں کی سیاست کی علمبردار تھی اور مسلم

---

۱۔ اصل خطبہ صدارت انگریزی میں تھا۔

لیگ مسلمانوں کی سیاست کی آئینہ دار تھی اس لئے کسی مسلم لیگی لیڈر کا اس خیال سے ڈرنا کہ مبادا اس پر فرقہ پرستی کا الزام لگ جائے ایک بے معنی سی بات تھی۔ جناح فخریہ اپنے آپ کو مسلمانوں کا حامی اور مسلم لیگی کہتا تھا۔ پھر جناح کے پیرو کیونکر اس روش سے گریز کر سکتے تھے۔ یقیناً وہ وقت، آگیا تھا جب سرسکندر کو شولا پور جیسے دور افتادہ مقام ہی میں نہیں بلکہ پنجاب میں بھی علانیہ مسلم لیگ کا پرچم اٹھانا چاہئے تھا۔

سرسکندر نے اس خطبۂ صدارت میں، جو تجویز پیش کی تھی، کم و بیش انہیں خطوط پر بعض اور لوگ بھی سوچ رہے تھے۔ آگے چل کر پروفیسر کوپ لینڈ نے بھی اس سے ملتا جلتا ایک کانسٹی ٹیوشن کا خاکہ مرتب کیا تھا۔ ۱۹۴۶ء میں جو کیبنٹ مشن سکیم ہمارے سامنے آئی تھی اس کی بنیاد بھی یہی صوبوں کا "گروپنگ" تھی۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں نے اپنے خطبے میں مسلمانوں کو ہندوستان کی ایک اقلیت نہیں بلکہ ایک مستقل قوم قرار دے کر یہ مطالبہ کیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی سیاست کا فیصلہ بین الاقوامی اصولوں کے مطابق ہونا چاہئے۔ بہرکیف میرٹھ اور شولا پور کے ان دو صدارتی خطبوں نے ہماری سیاست میں ایک منفی نہیں بلکہ واضح طور پر ایک مثبت رول ادا کیا۔ اور وہ الجھن جو اس وجہ سے پیدا ہو رہی تھی کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تجویز کردہ فیڈریشن کے جواب میں کوئی متبادل تجویز پیش ہونی چاہئے. کسی حد تک حل ہوتی نظر آ رہی تھی۔

# ۵

# پنجاب مسلم لیگ ریڈیکل پارٹی

اس چمن میں پیروِ بلبل ہو یا تلمیذِ گُل
یا سراپا نالہ بن جا یا نوا پیدا نہ کر

مسٹر جناح نے ۱۷ اپریل ۱۹۳۸ء کو کلکتہ میں پنجاب کے لئے ایک آرگنائزنگ کمیٹی قائم کی تھی، جس کے پینتیس ممبر تھے اور سر سکندر حیات خاں اس کے صدر تھے۔[۱] اس کمیٹی کا فرض تھا کہ جلد از جلد پنجاب میں پراونشل مسلم لیگ کی شاخ قائم کرے۔ لیکن صد افسوس کہ سال بھر سے زیادہ مدت گزر جانے کے باوجود لیگ کی کوئی صوبائی شاخ قائم نہیں ہوئی تھی۔ کانگرس، احرار اور خاکسار تینوں جماعتیں زور شور سے اپنا اپنا پروپیگنڈا کرنے میں مصروف تھیں۔ یونینسٹ پارٹی بھی حکومت کی سرپرستی میں اپنا کام کر رہی تھیں۔ اس کے علاوہ سر سکندر نے ایک نئی جماعت زمیندارہ لیگ قائم کی تھی جس کے جلسے بھی وقتاً فوقتاً سرکاری حکام کے سایۂ عاطفت میں ہوتے رہتے تھے۔ البتہ اس تمام ماحول میں مسلم لیگ کا کہیں کوئی وجود نظر نہیں آتا تھا۔ ہم نے ابتداً محض اپنی کوشش سے لیگ کی ستائیس ڈسٹرکٹ اور ۴۰۰ ابتدائی شاخیں صوبے بھر میں قائم کی تھیں۔ لیکن جب سے پنجاب کی پرانی لیگ کا الحاق مرکزی مسلم لیگ سے منقطع ہوا تھا، یہ تمام شاخیں مُردہ اور بے کار ہو کر رہ گئی تھیں۔ صوبے بھر میں کسی جگہ بھی لیگ کا جلسہ نہیں ہوتا تھا۔ رائے عامہ میں بے حسی اور جُمود پیدا ہو چکا تھا۔ اس دوران میں مسلمانوں کے حلقوں میں تین چار ضمنی انتخاب بھی ہوئے۔ لیکن ان میں سے ایک بھی تو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر نہ لڑا گیا۔ پنجاب کا مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ برائے نام ہی سہی موجود تو تھا جس کے صدر میاں عبدالعزیز بیرسٹرایٹ لاء اور سیکرٹری غلام رسول خاں تھے۔ لیکن جب سر سکندر حیات خاں

---

۱۔ اس آرگنائزنگ کمیٹی کی تشکیل کی پوری تفصیل میری ان دو کتابوں میں درج ہے۔ اقبال کے آخری دو سال اور ہندی قومی جدوجہد ۱۹۳۸ء

رہنما بھی کسی ضمنی انتخاب میں اس بورڈ سے مشورہ کرنے کے روادار نہ تھے تو اس بورڈ کی موت اور زندگی میں کیا فرق ہو سکتا تھا۔ حیرت یہ ہے کہ سر سکندر کی اس بے اعتنائی اور بے اتفاقی کے باوجود عوام دل سے مسلم لیگ کے حامی تھے۔ اور کم و بیش ہر ہفتہ لیگ کے پرانے کارکن لاہور آ کر ہم سے اپنا درد دل بیان کرتے تھے۔ غلام رسول خاں کے مکان نمبر ۱۲، ٹیمپل روڈ پر بدستور پنجاب پروانشل مسلم لیگ کا بورڈ آب و تاب سے آویزاں تھا۔ سر سکندر نے براہ راست تو ہمیں کبھی یہ کہلوا کر نہیں بھیجا تھا۔ لیکن سید افضال علی حسنی نے چند بار ضرور کہا تھا کہ جب پرانی مسلم لیگ کا وجود باقی نہیں رہا تو آپ نے کس قاعدے کے تحت یہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کا بورڈ لگا رکھا ہے۔ غلام رسول خاں مرحوم بھی بڑے دبنگ آدمی تھے۔ انہوں نے جواب دیا کہ آکر اپنے ہاتھ سے یہ بورڈ اتار دیجئے۔ میں خود نہیں اتاروں گا۔

اکتوبر ۱۹۳۸ء کے بعد سے آرگنائزنگ کمیٹی کے اجلاس بھی بند ہو چکے تھے۔ جب سے غلام رسول خاں نے اس کمیٹی کی سیکرٹری شپ سے استعفاء دیا تھا۔ نیا سیکرٹری اب تک مقرر نہیں ہوا تھا۔ اپریل ۱۹۳۹ء میں ایک بڑا عجیب واقعہ ہوا۔ یعنی خان بہادر میاں رمضان علی کو سر سکندر نے پنجاب مسلم لیگ آرگنائزنگ کمیٹی کا سیکرٹری مقرر کر دیا۔ میاں رمضان علی ریٹائرڈ پوسٹ ماسٹر جنرل تھے اور طالب علمی کے زمانے میں ملک برکت علی کے ہم جماعت رہ چکے تھے۔ ہم جب دسمبر ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لئے پٹنہ گئے تھے تو میاں رمضان علی بھی ہمارے ساتھ گئے تھے۔ انہیں سیاست سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ پٹنہ سے واپس آکر میں نے دیکھا کہ ان کی مسلسل ملک برکت علی کے ہاں آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔ میں نے اسے ایک معمولی بات سمجھ کر چنداں اہمیت نہ دی۔ لیکن ملک صاحب اپنی قابلیت، لیاقت جرأت اور صداقت کے باوصف بعض معاملات میں بالکل سادہ لوح واقع ہوئے تھے۔ مثلاً مردم شناسی کا انہیں بہت کم ملکہ تھا۔ انہیں دنوں وہ چند مرتبہ اسمبلی کے کسی کام کے سلسلہ میں سر سکندر حیات خاں کے ہاں گئے تو میاں رمضان علی کے اصرار پر ان کو بھی بغرض تعارف اپنے ہمراہ لے گئے۔ یوں میاں رمضان علی کو سر سکندر کی بار گاہ میں باریابی کا شرف حاصل ہوا۔ اور چند ملاقاتوں کے بعد انہوں نے اپنی تجربہ کاری، ہوشیاری، فن کاری، زمانہ سازی اور مزاج شناسی کے باعث سر سکندر کا اتنا قرب حاصل کر لیا کہ یکایک ایک روز اخباروں میں یہ خبر چھپی کہ میاں رمضان علی کو سر سکندر نے پنجاب مسلم لیگ آرگنائزنگ کمیٹی کا سیکرٹری مقرر کر دیا ہے حالانکہ وہ آرگنائزنگ کمیٹی کے ممبر تک نہ تھے۔

اور تو اور خود ملک صاحب یہ خبر پڑھ کر دم بخود رہ گئے۔ میرے دل میں ملک صاحب کی بے انتہا عزت تھی اور میں نے کبھی سہواً بھی ان کے احترام میں کوتاہی نہیں ہونے دی تھی۔ لیکن اس روز میں نے غصہ میں آکر ان سے صاف کہہ دیا کہ یہ جو کچھ ہوا ہے محض آپ کی بے خبری اور سادہ لوحی کا نتیجہ ہے۔ ورنہ کہاں مسلم لیگ آرگنائزنگ کمیٹی کی سیکرٹری شپ اور کہاں میاں رمضان علی۔ سر سکندر کو تو ایک ایسا آدمی درکار تھا جو ان کے اشاروں میں رقص کرے۔ میاں رمضان علی نے اپنے آپ کو اس خدمت کے لئے پیش کر دیا۔ اور سر سکندر نے قبول کر لیا۔ کاش ! آپ میاں رمضان علی کو سر سکندر کے ہاں لے کر نہ جاتے۔ اب آگے آگے دیکھئے گا کیا گل کھلتے ہیں۔

بات یہ تھی کہ دنیا سر سکندر حیات خاں کا قرب حاصل کرنے کو بے تاب تھی۔ اور اس کے حصول کے صرف دو راستے تھے۔ ایک پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کی رکنیت جو صرف پنجاب کے اکیاسی خوش نصیب مسلمانوں کے مقدر میں لکھی گئی تھی۔ اور دوسرا راستہ تھا مسلم لیگ۔ لیکن مسلم لیگ کی صورت یہ تھی کہ

ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

جس مسلم لیگ کی نمائندگی ہم کرتے تھے اس میں شرکت کرنے سے سر سکندر حیات خاں کا قرب تو نہیں عتاب حاصل ہو سکتا تھا۔ اور ظاہر ہے کوئی شخص اس سودے کے لئے تیار نہ تھا۔ البتہ وہ مسلم لیگ جو یونینسٹ پارٹی کی ایک خانہ زاد کنیز کی حیثیت سے موجود تھی، اور جس کا مقصد بہر صورت یہ تھا کہ نام مسلم لیگ کا ہو لیکن کام یونینسٹ پارٹی کا ہونا چاہئے۔ اس کے دروازے مقدر آزما لوگوں کے لئے ہر وقت کھلے تھے۔ چنانچہ میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ ان دروازوں سے داخل ہو کر بارگاہ سلطانی تک رسائی حاصل کرنے والوں کے کس طرح ٹھٹ کے ٹھٹ لگے رہتے تھے۔ اور انہی لوگوں نے آخر کار پنجاب میں ہماری قومی جدوجہد کو کس طرح غلط راستے پر ڈالا۔ ظاہر ہے. خان بہادر میاں رمضان علی کے لئے صرف یہی ایک دروازہ کھلا تھا۔ چنانچہ وہ داخل ہوئے اور اس مسلم لیگ آرگنائزنگ کمیٹی کے سیکرٹری بن گئے جسے حقیقتاً مسٹر جناح نے اس غرض سے قائم کیا تھا کہ پنجاب میں ایک آزاد، خود مختار اور قائم بالذات پراونشل مسلم لیگ قائم کی جائے۔

میاں رمضان علی کے سیکرٹری بن جانے کے بعد اس بات کی قطعی امید نہیں رہی تھی کہ پنجاب میں مسلم لیگ کی کوئی معقول شاخ قائم ہو سکے گی۔ اب رہ رہ کر یہ سوال ہمارے سامنے آرہا

تھا کہ آخر پنجاب کے بد قسمت مسلمانوں کا ملجا و ماویٰ کیا ہو گا؟ کیا یہ صوبہ ہمیشہ سیاسی اعتبار سے مفلوک الحال اور یتیم رہے گا یا یہاں بھی کبھی مسلم لیگ کا آفتاب طلوع ہو گا؟ پنجاب کی لیجسلیٹو اسمبلی میں اب تک کوئی مسلم لیگ پارٹی قائم نہیں کی گئی تھی۔ مسلمانوں کے حلقوں میں ضمنی انتخاب مسلم لیگ نہیں بلکہ یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر لڑے جاتے تھے۔ صوبے بھر میں کہیں مسلم لیگ کا جلسہ نہیں ہوتا تھا۔ کسی ضلع میں مسلم لیگ کی زندہ و فعال شاخ کام نہیں کرتی تھی۔ گویا یوں کہنا چاہئے کہ چاروں طرف ایک گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

غلام رسول خاں کا خیال یہ تھا کہ ہمیں ایک علیحدہ صوبہ مسلم لیگ قائم کرنی چاہئے۔ لیکن یہ تجویز قابل عمل نہ تھی۔ اول اس لئے کہ آئینی لحاظ سے بدستور آرگنائزنگ کمیٹی قائم تھی۔ اور اصولاً وہی لیگ کی صوبائی شاخ قائم کرنے کی مجاز تھی۔ اس کے مقابلہ میں کوئی دوسری جماعت مسلم لیگ کی متوازی شاخ کھڑی نہیں کر سکتی تھی، آرگنائزنگ کمیٹی کے چھبیس ممبر یونینسٹ پارٹی کے تھے اور صرف ذیل کے نو ممبر یونینسٹ پارٹی سے باہر تھے:

ملک برکت علی، خلیفہ شجاع الدین۔ غلام رسول خاں، ملک زمان مہدی خاں ۔ پیر تاج الدین۔ مولانا ظفر علی خاں۔ مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش ۔ میاں عبد العزیز بیرسٹرایٹ لاء ۔ عاشق حسین بٹالوی۔

جب تک یہ آرگنائزنگ کمیٹی موجود تھی اور ہم نو آدمی اس میں شامل تھے۔ ہم اپنے طور پر کسی قسم کی پراونشل مسلم لیگ قائم کرنے کے مجاز نہ تھے۔ البتہ اس ضمن میں میری تجویز یہ تھی کہ ہمیں مسلم لیگ کے اندر رہ کر اور آرگنائزنگ کمیٹی کی رکنیت کو بحال رکھتے ہوئے ایک پارٹی بنانی چاہئے جو سر سکندر کی "مسلم لیگ کش" پالیسی کو بے نقاب کرے۔ پنجاب میں آل انڈیا مسلم لیگ کے پروگرام پر عمل کرے عوام میں کام کر کے ان کا اعتماد حاصل کرے۔ اور یونینسٹ پارٹی کے حربوں اور ہتھکنڈوں کا مقابلہ کر کے رائے عامہ کو مسلم لیگ کے حق میں منظم کرے۔

سر سکندر حیات خاں کی مسلسل لیت و لعل کو دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ کبھی پنجاب میں مسلم لیگ کی شاخیں قائم نہیں کریں گے۔ اور بالفرض انہوں نے کبھی ایسی شاخ قائم کی بھی تو وہ یونینسٹ پارٹی کی دست نگر ہو کر رہ جائے گی۔ ملک برکت علی پنجاب اسمبلی میں واحد مسلم لیگی ممبر کی حیثیت سے اپنا فرض بجا لا رہے تھے۔ ہم لوگ باہر عوام میں تحریر و تقریر کا کام کریں گے۔ صوبے کے طول و عرض کا دورہ کر کے جگہ جگہ جلسے کریں گے اور آل انڈیا مسلم لیگ کا پیغام لوگوں تک پہنچائیں گے۔ اس طرح ضابطے کی خلاف ورزی بھی نہیں ہو گی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی

پالیسی پر بھی عمل ہوتا رہے گا اور اگر کبھی سر سکندر نے ہم پر ہاتھ ڈالنے کا ارادہ کیا تو ان کا یہ فعل خود مسلم لیگ کی نگاہ میں ایک جرم قرار پائے گا۔

اس پروگرام کو جامۂ عمل پہنانے میں صرف دو مشکلیں حائل تھیں۔ اوّل یہ کہ سرمایہ ناپید تھا۔ وہ کہاں سے آئے گا۔ دوم یہ کہ کارکن کیونکر مہیا کئے جائیں گے۔ سرمایہ کے متعلق میرا خیال تھا کہ فی الحال کام شروع کرنے کے لئے پان سات سو روپے کافی ہوں گے. اور یہ رقم بھاگ دوڑ کر کہیں نہ کہیں سے فراہم کر لی جائے گی البتہ کارکن مہیا کرنا سخت مشکل کام تھا۔ مخلص. ایثار پیشہ. اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان نوجوان ہمارے معاشرے میں عنقا ہو چکے تھے۔ روز گار کی پریشانی اور پیٹ کے دھندے نے پڑھے لکھے طبقے کے افراد کو بے بس بنا رکھا تھا اور کوئی شخص اس حالت میں آگے بڑھنے اور کام کرنے کو تیار نہ تھا۔ بہر حال ان ظاہری رکاوٹوں کے باوجود ہم مایوس نہیں تھے۔ اور ہمیں یقین تھا کہ ایک مرتبہ کام شروع ہو گیا اور عوام میں ہماری محنت کو مقبولیت حاصل ہوئی تو خود بخود بہت سے معاون پیدا ہو جائیں گے۔

میری اس تجویز پر بہت دن مباحثہ ہوتا رہا۔ متعدد پہلوؤں پر شدت سے جرح و قدح کی گئی۔ بعض ایسے مسائل بھی سامنے آئے جن کا پہلے سے کوئی اندازہ نہیں تھا غرضیکہ بحیثیت مجموعی تمام احباب نے بہ انشرح صدر نہیں تو بدرجۂ مجبوری میری تجویز کی تائید کی۔ میں سب سے زیادہ غلام رسول خاں کے متعلق کوشاں تھا کہ ان کو اپنا ہم خیال بناؤں۔ کیونکہ ہمت. دیانت اور اصول پرستی کے اعتبار سے ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ بالآخر فیصلہ یہ ہوا کہ میں اس مجوزہ پارٹی کا مینی فیسٹو مرتب کر کے خود اپنے نام سے شائع کروں۔

اس پارٹی کا نام. پنجاب مسلم لیگ ریڈیکل پارٹی رکھا گیا۔ اور میں نے ذیل کا مینی فیسٹو مرتب کر کے ایک پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا۔

"ایک فریاد ہے مانندِ سپند اپنی بساط
اسی ہنگامے سے محفل تہ و بالا کر دیں

(اقبال)

پنجاب مسلم لیگ ریڈیکل پارٹی

مینی فیسٹو

(منشور عام)

مرتبہ

# مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ

یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے ہندوستان کے تمام صوبوں میں جدید اصلاحات کا نفاذ ہوا۔ اس اہم واقعہ سے تقریباً ایک سال پہلے ۱۲-۱۱ اپریل ۱۹۳۶ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس بمبئی میں سر وزیر حسن کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ جہاں اس مسئلہ پر اچھی طرح غور کیا گیا کہ ملک کے بدلتے ہوئے آئینی حالات کے تحت ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں کے سیاسی، معاشرتی اور مذہبی حقوق کی نگہداشت کا بہترین طریقہ کیا ہو سکتا ہے۔ اور مسلمانوں میں وحدت خیال اور وحدت عمل پیدا کرنے کی بہترین راہ کون سی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ اصلاحات سے پورا فائدہ اٹھانے کے لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ تمام صوبائی اسمبلیوں میں انتخاب کی جنگ مسلم لیگ کے تحت لڑیں تاکہ اس برعظیم کے مسلمانوں کو، جو مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں ہر جگہ بکھرے ہوئے ہیں، ایک سیاسی پالیسی میں منسلک کیا جا سکے۔ اس مقصد کے پیش نظر آل انڈیا مسلم لیگ کے اسی اجلاس میں ذیل کی قرار داد منظور کی گئی:

"چونکہ آئین نو جو عنقریب ہندوستان میں نافذ ہونے والا ہے۔
اس نوعیت کا ہے کہ اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے ایسی سیاسی پارٹیوں کی تشکیل ضروری ہے جن کی پالیسی واضح ہو اور جن کا پروگرام رائے دہندوں میں سیاسی شعور پیدا کرنے کے علاوہ ان جماعتوں میں تعاون کی روح پیدا کرے جن کا مطمح نظر ایک دوسرے کے قریب ہے تاکہ نئے آئین سے پورا استفادہ کیا جائے۔ اور چونکہ مسلمانوں کی تنظیم اور صوبائی حکومتوں میں مسلمانوں کو ان کا جائز حق دلوانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ مسلمان اپنی تنظیم کر کے ایک جماعت بنالیں اور ان کا پروگرام ترقی پسندانہ ہو۔ اس لئے یہ قرار دیا جاتا ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ آئندہ صوبائی انتخابات کی مہم میں شامل ہونے کا اقدام کرے اور اس امر کے لئے مسٹر جناح اپنی صدارت میں ایک مرکزی الیکشن بورڈ کی تشکیل کریں۔ جس میں کم سے کم پینتیس (۳۵) ارکان ہوں۔ مسٹر جناح کو اختیار ہو گا کہ

وہ مختلف صوبوں کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسے صوبائی بورڈ قائم کریں یا صوبائی بورڈوں کا الحاق مرکزی بورڈ سے کریں اور محولہ بالا مقاصد کی تکمیل کے لئے دیگر ذرائع اختیار کریں۔"

## یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ

اس قرارداد کی تائید میں مسلم لیگ کا ایک مرکزی الیکشن بورڈ قائم کیا گیا اور اس کے ساتھ ہر صوبے میں ایک ایک صوبائی بورڈ بھی بنایا گیا۔ مسٹر جناح جب پنجاب میں مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ قائم کرنے آئے تو یونینسٹ پارٹی نے ان کی سخت مخالفت کی اور مسلم لیگ کے نظام کے تحت کام کرنے اور انتخابات میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ یونینسٹ پارٹی کے لیڈر سر فضل حسین تھے۔ اور جب وہ جولائی ۱۹۳۶ء میں فوت ہو گئے تو سر سکندر حیات خاں ریزرو بنک آف انڈیا کی ڈپٹی گورنری سے مستعفی ہو کر فوراً پنجاب آ گئے۔ اور اس پارٹی کی عنان قیادت ان کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ یونینسٹ پارٹی کی مخالفت کے باوجود پنجاب کے مسلمانوں کے ایک طبقے نے علامہ اقبال کی سرکردگی میں مسٹر جناح کی آواز پر لبیک کہا اور اس صوبے میں بھی ایک مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ قائم ہو گیا۔ جس کے صدر علامہ مرحوم تھے۔ لیکن یونینسٹ پارٹی کے مخالفانہ رویئے میں کوئی کمی نہ ہوئی بلکہ روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ اس پارٹی کے حامی اخباروں نے مسٹر جناح اور علامہ اقبال کے متعلق بھی ناشائستہ کلمات لکھنے سے گریز نہ کیا۔ یہاں تک کہ جب جون ۱۹۳۶ء میں مسٹر جناح دوبارہ پنجاب تشریف لائے تو یونینسٹ پارٹی کے حامیوں نے ان کا استقبال سیاہ جھنڈیوں سے کرنا چاہا۔ لیکن علامہ اقبال کی ذات والاصفات اور ان کے نیازمندوں کی اخلاقی طاقت سے مرعوب ہو کر وہ اپنے اس ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔

## انتخابات

جنوری ۱۹۳۷ء میں آئین جدید کے تحت پنجاب اسمبلی کے انتخابات ہوئے۔ یونینسٹ پارٹی نے مسلم لیگ کے امیدواروں کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور تمام ممکن حربے استعمال کئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پنجاب میں مسلم لیگ کو شکست ہوئی اور لیگ کے صرف دو امیدوار اسمبلی میں جا سکے۔ ایک ملک برکت علی۔ دوسرے راجہ غضنفر علی خاں۔ راجہ غضنفر علی خان چند ہی روز بعد غیر مشروط طور پر

یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے اور انھیں پانچ سو روپے ماہوار تنخواہ پر پارلیمنٹری سیکرٹری کا عہدہ مل گیا۔

## پنجاب میں مسلم لیگ کی طاقت

علامہ اقبال اور مسٹر جناح پنجاب میں مسلم لیگ کی اس ناکامی پر قطعاً ہراساں یا بددل نہ ہوئے۔ ان دونوں بزرگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ شکست و فتح کسی جنگ کی عظمت یا کامیابی کا معیار نہیں۔ بلکہ ہر جدوجہد کی غایت یہ ہونی چاہئے کہ کسی بلند، ارفع اور پاکیزہ مقصد کے لئے خلوص دل اور علو ہمت کے ساتھ سعی پیہم کی جائے۔ چنانچہ علامہ اقبال کے مشورے اور مسٹر جناح کی ہدایت سے مسلم لیگ کے کارکن پنجاب کے مختلف مقامات کے دورے پر مصروف ہو گئے اور تحریر و تقریر کے ذریعہ سے انھوں نے عوام کو مسلم لیگ کے کام اور پیغام سے آشنا کرنا شروع کیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں پنجاب میں ستائیس (۲۷) ضلع مسلم لیگیں اور ایک سو چار ابتدائی شاخیں قائم ہو گئیں۔ لیگ کی تحریک کا مسلمانوں نے بہت جوش سے خیر مقدم کیا۔ اور عوام میں اس کو روز افزوں مقبولیت حاصل ہونا شروع ہوئی۔ یوپی۔ سی پی۔ بنگال۔ بہار، بمبئی اور مدراس میں مسلم لیگ کے تحت مسلمانوں نے ایک قلیل مہلت میں قابل تحسین طریقے سے تنظیم کر لی تھی۔ یہ ہمت افزا خبریں لگاتار پنجاب میں بھی پہنچ رہی تھیں۔ چنانچہ حالات و واقعات سے متاثر ہو کر اس پانچ دریاؤں سے سیراب ہونے والی سرزمین کے پر جوش لیکن تلوّن کیش مسلمانوں کے دل میں بھی سوئی ہوئی امیدیں جاگ اٹھیں۔ اور انھوں نے اس ڈوبتے ہوئے انسان کی طرح جو دیوانہ وار ساحل کی طرف لوٹتا ہے، مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونا شروع کیا۔ یونینسٹ پارٹی کے ارکان جنھیں پنجاب میں برسر اقتدار آئے اور وزارت کے خوان یغما پر بیٹھے کم و بیش چھ ماہ گزر چکے تھے۔ اس صورت حال سے گھبرائے مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی بیداری ان کے اس ڈھونگ کے لئے جسے عرف عام میں یونینسٹ پارٹی کہا جاتا ہے پیام مرگ تھی۔

## سکندر جناح پیکٹ

اکتوبر ۱۹۳۷ء کے وسط میں، لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا۔ یہ اجلاس اپنی اہمیت کے اعتبار سے مسلم لیگ کی تحریک جدوجہد میں ایک نشان راہ یا ایک سنگ میل کا کام

دے گا۔ ہندوستان کے دور دراز گوشوں سے مسلمان لیگ کے دامن میں پناہ لینے کے لئے لکھنؤ جمع ہوئے۔ ان کے اندر ایک خلش، ایک کشمکش اور ایک بے چینی تھی جو اس بات کا پتہ دے رہی تھی کہ وہ اپنے حال کو ماضی کے بندھنوں سے آزاد کرانے اور اپنے مستقبل کو درخشاں بنانے کے عزم آہنی کے ساتھ میدان عمل میں آ گئے تھے۔ سر سکندر حیات خاں، جو پنجاب سے یونینسٹ پارٹی کا ایک لشکر ہمراہ لے کر لکھنؤ گئے تھے، ہندوستانی مسلمانوں کی اس نشاۃ ثانیہ کو دیکھ کر گھبرائے یا خوش ہوئے اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن یہ امر یقینی ہے کہ وہ مسلمانوں کی حیات تازہ کے مظاہرے سے متاثر ضرور ہوئے۔ اور انہیں اس بات کا احساس ہو گیا کہ اب وقت کی رفتار سے الگ رہنا ان کے وقار اور استحکام کے لئے مضر ہو گا۔ چنانچہ وہ مسلم لیگ میں شریک ہو گئے۔ یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ انہوں نے یہ اقدام برضا اور رغبت کیا یا بہ جبر و اکراہ۔ وہ لیگ میں انشراح صدر کے ساتھ شامل ہوئے یا سینے پر غم و غصہ کی بوجھل سل رکھ کر۔ سر سکندر حیات خاں کے لیگ میں شریک ہوتے وقت ان کے اور مسٹر جناح کے درمیان چند شرائط طے ہوئیں جنہیں سکندر جناح پیکٹ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس پیکٹ کے الفاظ یہ ہیں :

(ا) سر سکندر حیات خاں واپس پنجاب جا کر اپنی پارٹی کا ایک خاص جلسہ کریں گے اور پارٹی کے مسلمان ممبروں کو جو ابھی تک مسلم لیگ کے ممبر نہیں بنے ہدایت کریں گے کہ وہ لیگ کے عہد نامے پر دستخط کر کے لیگ میں شریک ہو جائیں۔ اس طرح وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی اور صوبائی بورڈوں کے قواعد و ضوابط کے تحت آ جائیں گے۔ اس فعل کا اثر یونینسٹ پارٹی کی موجودہ کولیشن پر نہیں پڑے گا بلکہ وہ بدستور قائم رہے گی۔

(ب) پنجاب اسمبلی کے آئندہ جتنے عام یا ضمنی انتخابات ہوں گے ان میں مسلمان امیدوار مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوں گے۔

(ج) پنجاب اسمبلی کے مسلمان ممبر جو لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے ہیں یا جنہوں نے لیگ کا ٹکٹ قبول کر لیا ہے، باہم مل کر اسمبلی کے اندر مسلم لیگ پارٹی بنائیں گے۔ اس طرح جو مسلم لیگ پارٹی وجود میں آئے گی اس کا فرض ہو گا کہ کسی ایسے فریق کے ساتھ مل کر جس کی پالیسی اور پروگرام لیگ کے مطابق ہو ایک اتحاد یا کولیشن قائم کرے۔ ایسا اتحاد اور کولیشن انتخابات سے پہلے بھی قائم ہو سکتا ہے اور انتخابات کے بعد بھی۔ موجودہ اتحاد کا نام بدستور یونینسٹ پارٹی رہے گا۔

(د) مذکورہ بالا دفعات کے پیش نظر پراونشل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کی از سر نو تشکیل ہو گی۔

## سر سکندر حیات خاں اور مسلم لیگ

اس معاہدے کے بعد سر سکندر حیات خاں نے لیگ کی قیادت قبول کر لی۔ وہ خود اسمبلی میں مسلم لیگ پارلیمنٹری پارٹی کے رہنما قرار پائے اور پنجاب میں لیگ کی تنظیم و ترتیب کے لئے پینتیس ارکان کی جو آرگنائزنگ کمیٹی کلکتہ میں ۱۷ اپریل ۱۹۳۸ء کو مسٹر جناح کے ارشاد کے مطابق بنی تھی' اس کے صدر بھی وہی تجویز ہوئے۔ اس کے بعد مسٹر جناح نے آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے اکیس آدمیوں کی ورکنگ کمیٹی (مجلس عاملہ) بنائی تو اس میں بھی سر سکندر حیات خاں کو جگہ دی گئی۔ ظاہر ہے کہ ان واقعات کے بعد سر سکندر حیات خاں مسلم لیگ میں ایک نہایت ذمے دار، معزز اور زبردست حیثیت کے مالک بن گئے۔ خود مسٹر جناح نے گزشتہ سال سندھ مسلم لیگ کے اجلاس کراچی کے بعد ایک اخباری نمائندے کو بیان دیتے ہوئے سر سکندر حیات خاں کو "مسلم لیگ کا ایک طاقتور ستون" کے نام سے یاد کیا تھا۔ ان حالات و کوائف کی روشنی میں سر سکندر حیات خاں کے سیاسی اعمال کے حسن و قبح کا جائزہ لینے کے لئے ہمارے پاس صرف ایک ہی معیار رہ جاتا ہے' یعنی مسلم لیگ۔ ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ مسلم لیگ کی قیادت قبول کرنے اور لیگ کے نظام میں شریک ہونے کے بعد سر سکندر حیات خاں کے اعمال و افعال لیگ کی پالیسی کے مطابق ہیں یا منافی۔ کسی جماعت کا رہنما اگر اپنی جماعت کے معینہ اصول اور طریق کار کی خلاف ورزی کرے تو اس کے نتائج سخت خطرناک ہوتے ہیں۔ کیونکہ عوام جو بہت زیادہ بصیرت یا ذہانت سے بہرہ ور نہ ہونے کی وجہ سے بالعموم لیڈروں کے نقش قدم پر چلنے کے عادی ہیں' اپنے رہنما کی بے راہ روی سے گھبرا کر تکلیف دہ انتشار میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح جماعتی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔

### تلخ داستان

مسلم لیگ کے گوشۂ عافیت میں پناہ لینے اور لیگ کے چراغ سے اپنا چراغ روشن کرنے کے

باوجود سر سکندر حیات خاں نے بعض اوقات کھلم کھلا اور بعض اوقات درپردہ لیگ کے خلاف جو کچھ کہا اور کیا ہے وہ ایسی تلخ اور افسوس ناک داستان ہے جس کی نظیر ہندوستان کے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں بہت کم ملے گی۔ سر سکندر حیات خاں کے اکثر کارنامے ایسے ہیں جنہیں دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے کہ وہ مسلم لیگ کے ایک عظیم الشان لیڈر کے نامۂ اعمال کا مطالعہ کر رہا ہے یا لیگ کے بدترین دشمن کی کارگزاریاں دیکھ رہا ہے۔

## سینڈھرسٹ کمیٹی

گزشتہ دسمبر میں مرکزی اسمبلی میں سینڈھرسٹ کمیٹی کا معاملہ پیش ہوا تو مسلم لیگ پارٹی نے مسٹر جناح کے زیر قیادت اس کمیٹی میں شرکت سے انکار کر دیا۔ چنانچہ اس ضمن میں مسٹر جناح نے جو خط حکومت ہند کے ڈیفنس سیکرٹری کو لکھا تھا وہ اپنی صاف گوئی کے اعتبار سے مسلم لیگ کے مسلک کا صحیح آئینہ دار ہے۔ حیرت ہے کہ سر سکندر حیات خاں لیگ پارٹی کی اس واضح پالیسی کی خلاف ورزی کر کے سینڈھرسٹ کمیٹی کی کارروائی میں حصہ لینے کے لئے رضامند ہو گئے۔ اور انہوں نے سر شیر محمد خاں۔ خان بہادر نواب مظفر خاں اور نواب زادہ خورشید علی خاں کو اس کمیٹی کے ممبر مقرر کرا دیا۔

سر شیر محمد خاں مرکزی اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کے رکن۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے رکن اور پنجاب مسلم لیگ آرگنائزنگ کمیٹی کے رکن ہیں۔ خان بہادر نواب مظفر خاں آل انڈیا مسلم لیگ کے رکن، پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ پارلیمنٹری پارٹی کے رکن اور پنجاب مسلم لیگ آرگنائزنگ کمیٹی کے رکن ہیں۔ نواب زادہ خورشید علی خاں کونسل آف سٹیٹ میں مسلم لیگ پارلیمنٹری پارٹی کے رکن۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے رکن اور پنجاب مسلم لیگ آرگنائزنگ کمیٹی کے رکن ہیں۔

لامحالہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا سر سکندر حیات خاں کا یہ فعل مسلم لیگ کے خلاف کھلی ہوئی بغاوت نہیں؟ کیا آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر کے فیصلہ کی خلاف ورزی کر کے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے تین ذمہ دار ارکان کو سینڈھرسٹ کمیٹی میں کام کرنے کے لئے نامزد کرانا لیگ کے صدر اور لیگ کے نظام کی توہین نہیں؟ کیا مسٹر جناح کی اس سے بڑھ کر بھی ذلت ہو سکتی ہے کہ ان کی ہدایات کو ناقابلِ التفات قرار دے کر ان کی ورکنگ کمیٹی کے ایک رکن نے کھلے بندوں سینڈھرسٹ کمٹی میں شریک ہونے کا اعلان کر دیا؟ کیا سر سکندر حیات خاں اس واقعہ کے بعد اپنے

آپ کو لیگ کا ایک وفادار خادم کہہ سکتے ہیں؟

## ہندوستانی برطانوی تجارتی معاہدہ

مارچ ۱۹۳۹ء میں ہندوستانی برطانوی تجارتی معاہدہ (انڈو برٹش ٹریڈ اگریمنٹ) مرکزی اسمبلی میں کامرس ممبر نے منظوری کے لئے پیش کیا۔ مسلم لیگ پارلیمنٹری پارٹی نے مسٹر جناح کے زیر قیادت فیصلہ کیا کہ جب اس معاہدے پر ایوان کی رائیں لی جائیں تو وہ غیر جانب دار رہے۔ یعنی نہ حکومت کا ساتھ دے نہ کانگرس کا۔ مسٹر جناح نے ایک معرکۃ الآرا تقریر میں اپنی پارٹی کے اس رویئے کو جائز قرار دیتے ہوئے نہایت شرح و بسط سے بتایا کہ یہ معاہدہ مسلمانوں کے لئے غیر مفید ہے۔ لیکن سر سکندر حیات خاں نے لاہور میں بیٹھے بیٹھے مرکزی اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کے پنجابی ممبروں کو تار دیئے کہ وہ اس معاہدے میں حکومت کا ساتھ دیں۔ چنانچہ رائے شماری کے وقت انہوں نے علانیہ مسٹر جناح کی مخالفت اور حکومت کی تائید کی۔ اس واقعہ سے صرف دو روز بعد سر سکندر نے پنجاب اسمبلی میں کھڑے ہو کر انتہائی دیدہ دلیری سے اعلان کیا کہ یہ معاہدہ ہمارے لئے بہت بڑی نعمت ہے۔ اور مسلمانوں کو اس کا خیر مقدم کرنا چاہئے۔ اس صورت حال سے مسلم لیگ میں سخت الجھن پیدا ہو گئی۔ چنانچہ مضطرب و مجبور ہو کر مسٹر جناح کو ایک اعلان شائع کرنا پڑا جس میں انہوں نے اعداد و شمار سے ثابت کر کے بتایا کہ یہ تجارتی معاہدہ مسلمانوں کے لئے بالکل مفید نہیں۔ اس اعلان میں انہوں نے پنجاب کے مسلمان زمینداروں کو تنبیہ کی کہ حکومت کے خود غرضانہ پروپیگنڈے سے گمراہ نہ ہوں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

> "مجھے یہ معلوم ہے کہ پنجاب کے بعض مسلمان اس خیال میں مگن ہیں کہ اس معاہدے کے ذریعہ انہیں کوئی سونے کی کان مل گئی ہے۔ میں پنجاب کے مسلمانوں اور اپنے یہاں کے دوستوں کو بتاتا ہوں کہ یہ خیال قطعاً غلط ہے۔ مجھے امید ہے کہ سندھ اور پنجاب کے مسلمان اس طرح فریب پراپیگنڈے سے گمراہ نہیں ہوں گے جو گورنمنٹ کے ایجنٹ کر رہے ہیں۔ مسلم لیگ پارٹی ہمیشہ مسلمانوں کے مفاد کی تائید کرتی رہے گی۔"

سر سکندر حیات خاں خوب سمجھتے ہیں اور دنیا بھی اچھی طرح جانتی ہے کہ "گورنمنٹ کے ایجنٹ" سے مراد کون ہے۔ لیکن یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا سر سکندر حیات خاں کے لئے یہ جائز تھا کہ وہ مسٹر جناح اور مرکزی مسلم لیگ پارلیمنٹری پارٹی کے فیصلہ کی خلاف ورزی کر کے مسٹر

جناح اور مسلم لیگ کو اپنوں اور غیروں کی محفل میں یوں رسوا کرتے؟

## فوجی بھرتی کا غیر مشروط وعدہ

ستمبر ۱۹۳۸ء میں شملہ میں پنجاب کے گورنر کو ایک ڈنر دیا گیا جس میں سر سکندر حیات خاں نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر جنگ ہو گئی تو میں حکومت کو یقین دلاتا ہوں کہ برطانوی راج کے قیام و استحکام کے لئے پنجاب کا ایک ایک بچہ ملک معظم کے جھنڈے کے نیچے کٹ مرے گا۔

سر سکندر حیات خاں کی اس تقریر سے ہندوستان کے مسلمانوں میں غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ چنانچہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں جو دسمبر ۱۹۳۸ء میں دہلی میں ہوا تھا۔ مسٹر ظہیر الحسن لاری ایم۔ ایل۔ اے (یوپی) نے سر سکندر کی اس تقریر کے خلاف مذمت کی قرار داد پیش کی۔ مسٹر لاری کا نقطہ نگاہ یہ تھا کہ برطانوی راج کے قیام و استحکام کے لئے جنگ میں غیر مشروط طور پر برطانیہ کو فوجی امداد دینا مسلم لیگ کی پالیسی کے منافی ہے۔ اس لئے سر سکندر حیات خاں نے جو کچھ کہا ہے وہ مسلم لیگ کے خیالات کا آئینہ دار نہیں۔ مسٹر لاری کی اس قرار داد پر بہت گرم بحث ہوئی۔ بالآخر مسٹر جناح نے سر سکندر کو تنبیہ کی کہ آئندہ ایسی حرکت ہرگز نہ کریں۔ اس قسم کے اہم معاملات پر اظہار خیال کرنے سے پہلے مسلم لیگ کے ذمہ دار لیڈروں کا فرض ہے کہ ورکنگ کمیٹی میں فیصلہ کر لیا کریں۔

## ضمنی انتخابات اور مسلم لیگ

سکندر جناح پیکٹ کے تحت سر سکندر حیات خاں نے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ پنجاب اسمبلی میں جو مسلمانوں کی کسی نشست کے لئے اگر کوئی ضمنی انتخاب ہوا تو وہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر لڑا جائے گا۔ لیکن جب ایسے موقعے آئے تو سر سکندر نے اس وعدے کی صریحاً خلاف ورزی کی۔ شہروں میں سیاسی شعور زیادہ ہے اور شہری مسلمانوں میں چونکہ لیگ مقبول ہے اس لئے اس جذبے سے فائدہ اٹھا کر امرت سر اور ملتان کے قصباتی حلقوں میں جب ضمنی انتخاب کا موقع علی الترتیب مئی اور اکتوبر ۱۹۳۸ء میں آیا تو سر سکندر نے ان امیدواروں کو مسلم لیگ کا ٹکٹ دلوایا۔ لیکن دو انتخاب دیہاتی حلقوں میں بھی ہوئے۔ ایک سرگودھا اور دوسرا منٹگمری میں۔ سر سکندر حیات خاں

دیہات میں بسنے والے مسلمانوں میں لیگ کا نام پھیلانا نہیں چاہتے۔ اس لئے ان دونوں ضمنی انتخابات میں امیدواروں کو مسلم لیگ کی بجائے یونینسٹ پارٹی کا ٹکٹ دیا گیا۔ اس طرح دیہات کی وسیع آبادی کو عملاً مسلم لیگ کے نام اور کام سے بے بہرہ رکھنے کی مذموم کوشش کی گئی۔

## سر سکندر حیات خاں منٹگمری میں

نومبر ۱۹۳۸ء میں سر سکندر حیات خاں منٹگمری تشریف لے گئے تو وہاں ان کی خدمت میں مقامی مسلم لیگ نے سپاس نامہ پیش کیا۔ سر سکندر حیات خاں نے سپاس نامے کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ "مسلم لیگ ایک فرقہ ورانہ جماعت ہے، میں اس بات کے حق میں نہیں ہوں کہ فرقہ وارانہ جماعتیں قائم کی جائیں۔ بہتر یہی ہو گا کہ آپ اپنے شہر میں یونینسٹ پارٹی کی ایک شاخ قائم کر لیجئے۔ تاکہ سب قومیں مل کر مشترکہ طور پر کام کر سکیں۔"

سر سکندر حیات خاں کا مندرجہ بالا ارشادِ گرامی کسی تبصرے کا محتاج نہیں۔ ان کے الفاظ، ان کے خیالات و عقائد کی نہایت وضاحت سے تشریح کرتے ہیں۔

## کون سا جھنڈا؟

اپریل ۱۹۳۹ء میں جب پنجاب اسمبلی میں وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی قرار داد پیش ہوئی تو ایک کانگرسی رکن سردار ہری سنگھ کے استفسارات کا جواب دیتے ہوئے سر سکندر حیات خاں نے کہا کہ "مجھ سے یہ بار بار پوچھا جاتا ہے کہ میں کس سیاسی جھنڈے کے نیچے کام کر رہا ہوں۔ میں اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ جس جھنڈے کے نیچے میں کام کر رہا ہوں وہ یونینسٹ پارٹی کا جھنڈا ہے۔ جس پر پانچ دریاؤں اور ایک ابھرتے ہوئے سورج کی تصویر ہے۔"

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مئی ۱۹۳۸ء میں بمبئی میں سر سکندر حیات خاں نے مسلم لیگ کا جھنڈا لہراتے وقت کہا تھا کہ ہماری موت اور زندگی۔ ہماری فتح و شکست اور ہماری عزت و آبرو اس جھنڈے کے ساتھ وابستہ ہے۔

## مسلم لیگ کے فیصلے کی پابندی ضروری نہیں

اسی عدم اعتماد کی قرار داد کی بحث کے دوران میں کانگرسی رکن سردار ہری سنگھ نے سر سکندر سے پوچھا کہ جب مسلم لیگ اور مسٹر جناح انڈو برٹش تجارتی معاہدے کے خلاف ہیں تو آپ نے جو مسلم لیگ کے ایک ذمہ دار لیڈر ہیں اس معاہدے کی حمایت کیوں کی ہے؟ سر سکندر حیات خاں نے جواب دیا کہ "میں پنجاب کی فلاح و بہبود کے معاملات میں مسلم لیگ یا مسٹر جناح کے فیصلے کو دلیل یا حجت قرار نہیں دیتا۔ میرے نزدیک پنجاب کے مفاد ہر چیز پر مقدم ہیں۔ میرے نقطہ نگاہ سے جو چیز پنجاب کے لئے مفید ہے میں اس کی حمایت کروں گا قطع نظر اس کے کہ لیگ اس میں کیا رویہ اختیار کرتی ہے۔"

سر سکندر حیات خاں کے اس جواب سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے لئے مسلم لیگ کا فیصلہ حجت نہیں۔ وہ پنجاب کے لئے اسی فعل کو مستحسن قرار دیتے ہیں جو ان کے نزدیک مفید ہے۔ اگر یہ طریق استدلال اختیار کر لیا جائے تو لیگ کا نظام کیا دنیا کا کوئی سیاسی، مذہبی یا معاشرتی نظام ایک دن زندہ نہیں رہ سکتا۔ جمہوری اداروں میں نظام کو برقرار رکھنے کے لئے اکثریت کے فیصلے سے کوئی شخص اختلاف کرتا ہے تو اس کے لئے دو راستے ہیں۔ یا نظام سے الگ ہو جائے یا چپ چاپ فیصلے کے سامنے گردن جھکا دے۔

## کیا یونینسٹ پارٹی کولیشن کا نام ہے؟

سر سکندر حیات خاں کی طرف سے بار بار یہ کہا جاتا ہے کہ یونینسٹ پارٹی اس کولیشن کا نام ہے جو پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی نے سر چھوٹو رام کی پارٹی سے مل کر قائم کی ہے۔ اس لئے یونینسٹ پارٹی سے گھبرانا نہیں چاہئے۔ یہ صرف کولیشن کا نام ہے اور کولیشن قائم کرنا مسلم لیگ کی پالیسی ہے۔

سر سکندر حیات خاں یہ ارشاد فرماتے وقت اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ کولیشن صرف اسمبلی کی دو یا دو سے زیادہ پارٹیوں سے مل کر بنتی ہے۔ اسمبلی سے باہر کولیشن مستقل طور پر کسی سیاسی جماعت کی حیثیت سے قائم نہیں رہ سکتی۔ اس کا وجود صرف اسمبلی کے اندر ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر اسمبلی ٹوٹ جائے تو کولیشن بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اس نقطہ نگاہ سے غور کیا جائے تو

یونینسٹ پارٹی کولیشن نہیں بلکہ اسمبلی کے باہر مستقل طور پر ایک سیاسی ادارہ ہے جس کے حلقۂ ارکان میں ہندو، مسلمان، سکھ عیسائی سبھی شامل ہیں، اور جس کی صدارت ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی ہر ایک کے حصے میں آ سکتی ہے۔ اس جماعت کا اپنا علیحدہ نظام، علیحدہ طریق کار، علیحدہ پروگرام اور علیحدہ کانسٹی ٹیوشن ہے۔ اس کے اراکین میں صرف پنجاب اسمبلی کے ممبر نہیں بلکہ بہت سے ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو اسمبلی کے ممبر نہیں ہیں۔ پنجاب کے مختلف اضلاع میں یونینسٹ پارٹی کی شاخیں قائم ہیں۔ دنیا کے مختلف ملکوں کے نظام حکومت کا مطالعہ کرنے کے بعد کسی ملک کی کسی قانون ساز مجلس میں اس نوعیت کی کولیشن نظر نہیں آتی۔ بلکہ یوں کہنا شاید زیادہ صحیح ہو گا کہ آئین اور دستور کے کسی ضابطے میں کولیشن کی یہ تعریف موجود نہیں جو سر سکندر حیات خاں بیان فرما رہے ہیں!

## مسلم لیگ یونینسٹ پارٹی کی ایک شاخ

اس ضمن میں اگر کسی غلط فہمی کا امکان تھا بھی تو اس کا ازالہ سر سکندر حیات خاں کے دست راست اور ان کی پارٹی کے نفس ناطقہ چودھری سر چھوٹو رام نے ایک مضمون میں کر دیا ہے جو سکندر جناح پیکٹ کے معاً بعد لاہور کے انگریزی اخبار "سول اینڈ ملٹری گزٹ" میں شائع ہوا تھا۔ چودھری صاحب نے اپنے مضمون میں یونینسٹ پارٹی کی فضیلت اور اہمیت بیان کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسلم لیگ عملاً یونینسٹ پارٹی کی ایک شاخ بن کر رہے گی۔ چودھری صاحب فرماتے ہیں:

> "سر سکندر نے مجھے یقین دلایا ہے۔ اگرچہ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے دوسرے بیان کے بعد جو اخباروں میں شائع ہوا ہے کسی مزید یقین دہانی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ یونینسٹ پارٹی پنجاب کی سیاسیات کا ایک مستقل پہلو رہے گی۔ اور اسمبلی کے اندر اور باہر حسب دستور سابق یہ پارٹی غیر فرقہ وارانہ اصولوں پر کام کرتی رہے گی۔ ہاں فرق صرف اتنا پڑا ہے کہ پہلے کی نسبت سے یہ پارٹی اب زیادہ سرگرمی کے ساتھ مصروف عمل ہو جائے گی۔ اور غالباً یہی ایک راز ہے جو ہمارے حاسدوں کی دشنام طرازیوں کی تہہ میں کام کر رہا ہے۔ سر سکندر نے غیر

مشتبہ الفاظ میں کہا ہے کہ جہاں تک پنجاب میں سیاسی پارٹیوں کی ترتیب و تشکیل کا تعلق ہے اس پیکٹ کا قطعاً کوئی اثر نہیں ہو گا۔ مسلمان ممبروں کو انتخابات کی جنگ میں حصہ لینے سے پہلے یہ وعدہ کرنا پڑے گا کہ وہ کامیاب ہونے کے بعد فوراً یونینسٹ پارٹی میں شریک ہو جائیں گے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ الفاظ بجائے خود اپنی دلیل آپ نہیں ہیں؟ کیا ان الفاظ کے بعد یہ حقیقت واضح نہیں ہو جاتی کہ سکندر جناح پیکٹ نے یونینسٹ پارٹی کے اقتدار کو رتی برابر بھی نقصان نہیں پہنچایا؟ یہ یاد رکھیے کہ آئندہ بھی یونینسٹ پارٹی کے جھنڈے کے نیچے ہی وہ لوگ جمع ہوں گے جو غریبوں' مفلوک الحالوں اور ستم رسیدہ مظلوموں کی خدمت کے جذبے کو اپنا مذہب بنائے ہوئے ہیں۔"

یہ مسئلہ کہ یونینسٹ پارٹی واقعی غریبوں، مفلوک الحالوں اور ستم رسیدہ مظلوموں کی خدمت کرنے والے بے غرض سادھوؤں کا ایک مجموعہ ہے۔ اس وقت زیر بحث نہیں آ سکتا۔ سردست یہی بتانا مقصود ہے کہ یونینسٹ پارٹی کی ہمہ گیری مسلم اور اس کی وسعت و عظمت غیر مشتبہ ہے۔ اس کے سامنے لیگ کی وہی حالت ہے جو آقا کے سامنے غلام کی ہوتی ہے۔

## پہلے پنجابی اور پھر مسلمان

سر سکندر حیات خاں نے ۳ - مئی ۱۹۳۹ء کو گورداسپور میں تقریر کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ "میں پہلے پنجابی ہوں اور پھر مسلمان۔"

یہ سوال بجائے خود نہایت لغو ہے کہ فلاں شخص پہلے پنجابی اور پھر مسلمان، یا پہلے مسلمان ہے اور پھر پنجابی۔ سر سکندر حیات خاں کی قماش کے لوگوں نے یہ مسئلہ صرف اس لئے وضع کر رکھا ہے کہ وہ اس کی آڑ میں یونینسٹ پارٹی کا ڈھونگ قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ اسی خوف ناک مسئلہ کے اثرات ہیں کہ آج پنجاب کے مسلمانوں میں شہری اور دیہاتی کے نام سے ایک اور فرقہ پیدا ہو گیا ہے۔ یہ اسی تباہ کن مسئلہ کے نتائج ہیں کہ آج پنجاب کے شہروں اور پنجاب کے دیہات میں بسنے والے مسلمان ایک دوسرے کو اپنا دشمن سمجھ رہے ہیں۔ کیا پہلے مسلمانوں میں فرقہ بندی کم ہے۔ شیعہ، سنی، حنفی، وہابی، مقلد، غیر مقلد کے جھگڑے ابھی مسلمانوں کی قومی زندگی کا خون چوس رہے تھے کہ سر سکندر حیات خاں نے اپنے فقہ خاص کی رو سے ایک اور فرقہ شہری دیہاتی کے نام

سے پیدا کر کے مسلمانوں کی رہی سہی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ کیا شہری اور دیہاتی مسلمانوں کے مفاد مختلف ہیں؟ کیا پنجاب کے مسلمانوں کے خلاف اگر کبھی طوفان ہلاکت برپا ہوا تو وہ یہ پوچھے گا کہ بتاؤ تم شہری مسلمان ہو یا دیہاتی مسلمان؟ کیا دشمن کی تلوار دیہاتی مسلمان کو چھوڑ دے گی اور صرف شہری مسلمان کی گردن پر وار کرے گی؟ کیا اس قسم کی تفرقہ اندازی مفسدانہ اغراض کے تحت نہیں کی جا رہی؟ کیا اس قسم کے طرز عمل سے وہ مقصد فوت نہیں ہو رہا جو مسلم لیگ کے پیش نظر ہے؟

## ایک لمحہ غور کیجئے

اب رہ رہ کر یہ سوال پیدا ہوتا کہ سر سکندر حیات خاں نے لیگ کا نقاب اوڑھ کر جو کچھ کیا ہے، کیا وہ درست ہے؟ کیا سر سکندر کے اعمال کے نقطہ نگاہ سے جائز ہیں؟ کیا پنجاب میں مسلم لیگ کو فروغ دینے کے لئے اسی پالیسی پر عمل کرنا چاہئے جو سکندر حیات خاں پیش کر رہے ہیں؟ اگر سر سکندر حیات خاں مسلم لیگ کے فیصلوں کو پنجاب کے لئے حجت قرار نہیں دیتے تو ان کے لئے سب سے آسان راہ یہ ہے کہ لیگ سے مستعفی ہو جائیں۔ سر عبدالحلیم غزنوی نے انڈو برٹش تجارتی معاہدے میں مسلم لیگ پارٹی کے فیصلے کی خلاف ورزی کی تھی تو انہیں لیگ سے مستعفی ہونا پڑا تھا۔ سر وزیر حسن اور سیٹھ یعقوب حسن کا رویہ مسلم لیگ کی پالیسی کے متضاد تھا تو انہیں لیگ سے نکل جانا پڑا۔ دیانت داری کا تقاضا یہی ہے کہ سر سکندر حیات خاں اپنے اعمال کا محاسبہ کریں۔ اگر وہ سمجھتے ہیں کہ پنجاب میں لیگ کی پالیسی پر عمل نہیں ہو سکتا تو با اصول انسانوں کی طرح ان کا فرض ہے کہ بلا تامل لیگ سے علیحدہ ہو جائیں۔ جو شخص بیک وقت دو کشتیوں میں سوار ہوتا ہے یا جو شخص ایک ہی وقت میں دو آقاؤں کو خوش کرنا چاہتا ہے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے ہر صوبے میں لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ حکومت انگریزوں کے ہاتھ سے نکل کر عوام کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے۔ لیکن پنجاب ہی ایک ایسا صوبہ ہے جہاں لوگ بدستور یہ خیال کرتے ہیں کہ وہی پرانا دو عملی نظام چلا آ رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس صوبے میں ابھی تک وہی افراد بر سر اقتدار ہیں جن کی ترقی انگریز کے گوشۂ چشم التفات سے وابستہ ہے۔ مسٹر جناح نے اکتوبر ۱۹۳۶ء میں انتخابات کی مہم شروع کرنے سے پہلے. لاہور کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہو خوب کہا تھا.

"حقیقت یہ ہے کہ آپ کا صوبہ افسری صوبہ ہے، جس سے میری مراد یہ ہے کہ آپ کی زندگی کے تمام شعبوں پر دفتری حکومت کا سکہ رواں ہے۔ آپ کے صوبے کے رہنما جو بڑے بڑے عہدوں پر متمکن ہیں گورنمنٹ کے ہاتھ میں کٹھ پتلی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ اور ان کے پیش نظر خود پرستی کے علاوہ اور کوئی مطمح نظر نہیں۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آپ کے رہنماؤں کا لائحہ عمل اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ عوام الناس کی لاعلمی اور جہالت کا پورا فائدہ اٹھائیں۔ اور جہاں دوسرے مقتدر اور تعلیم یافتہ مسلمانوں سے تعاون کا مسئلہ درپیش ہو وہاں خاموشی سے کنی کاٹ جائیں۔ آپ اس حقیقت کو خوب ذہن نشین کر لیجئے کہ آپ کو چند رجعت پسند رہنماؤں کی ایک ایسی ٹولی کو زیر و زبر کرنا ہے جس کی پیٹھ پر ضمیر فروش پریس کا پروپیگنڈا، حکومت کا گوشۂ چشمِ التفات اور لاعلم رائے دہندوں کے ووٹ ہیں۔"

## مسلم لیگ ریڈیکل پارٹی

جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس کی روشنی میں دیکھئے تو صاف معلوم ہوگا کہ پنجاب میں مسلم لیگ کی تحریک کو کانگرس سے خطرہ ہے نہ برطانوی امپیریلزم سے۔ کانگرس علانیہ لیگ کی مخالفت کر رہی ہے، اس لئے ایسے کھلے دشمن کا مقابلہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ برطانوی امپیریلزم نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام مشرقی ممالک میں اسلامی مفاد کے خلاف مصروف عمل ہے۔ مسلمان اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اس لئے ناممکن ہے کہ برطانیہ اپنی موجودہ پالیسی پر کاربند رہتے ہوئے مسلمانوں سے کسی ہمدردی کا اظہار کر کے مسلم لیگ کو غلط فہمی میں مبتلا کر سکے۔ اندریں حالات بہ نظر عائر دیکھا جائے تو پتا چلے گا کہ پنجاب میں اگر لیگ کو خطرہ ہے تو صرف اس جماعت سے جو بظاہر دوست بن کر لیگ پر قابض ہو چکی ہے۔ اور اب ایک خطرناک سازش سے اس کو کچل دینا چاہتی ہے۔ بریں صورت میں ان لوگوں کا جو لیگ کے ہمدرد اور غیر خواہ کارکن ہیں فرض ہے کہ پنجاب میں آل انڈیا مسلم لیگ کے پروگرام اور پالیسی کو زندہ رکھنے کے لئے میدان میں آئیں۔ اگر حالات یونہی رہے تو پنجاب میں لیگ کے وقار کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ آنے

والے مصائب کا تدارک ابھی سے سوچنا چاہئے۔ اس غرض کے لئے ایک پنجاب مسلم لیگ ریڈیکل پارٹی قائم کی جا رہی ہے۔ یہ ریڈیکل پارٹی مروجہ مفہوم کے اعتبار سے کوئی پارٹی نہیں بلکہ ایک پلیٹ فارم ہے جس پر وہ تمام لوگ جمع ہو سکتے ہیں جو پنجاب میں لیگ کو زندہ، مضبوط اور فعّال جماعت دیکھنے کے خواہاں ہیں۔

ریڈیکل پارٹی کا کوئی الگ پروگرام یا علیحدہ پالیسی نہیں ہے۔ اس کا پروگرام وہی ہے جو آل انڈیا مسلم لیگ کا پروگرام ہے۔ اس کی پالیسی وہی ہے جو آل انڈیا مسلم لیگ کی پالیسی ہے۔ ریڈیکل پارٹی مسٹر جناح کو ہندوستان کے مسلمانوں کا سب سے بڑا لیڈر اور مسلم لیگ کو مسلمانانِ ہند کی تنہا سیاسی نمائندہ جماعت سمجھتی ہے۔

ریڈیکل پارٹی کی اپنی الگ رکنیت بھی نہیں ہوگی۔ ہر شخص جو پنجاب مسلم لیگ کی کسی شاخ کا رُکن ہے۔ ریڈیکل پارٹی کا رُکن متصور ہو گا۔ بشرطیکہ وہ مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں پنجاب مسلم لیگ کی تحریک کو ایسے عناصر سے پاک کرنے کا وعدہ کرے جو لیگ کو نقصان پہنچا کر تباہ کرنا چاہتے ہیں، اور اس کے ساتھ اس بات کا بھی وعدہ کرے کہ وہ پنجاب میں آل انڈیا مسلم لیگ کی پالیسی اور آل انڈیا مسلم لیگ کی قرار دادوں کو عملی جامہ پہنانے کی ہر ممکن جدوجہد کرے گا۔"

---

اس مینی فیسٹو کے شائع کرنے میں خاصی دوڑ دھوپ کرنا پڑی۔ لاہور کا کوئی مطبع چھاپنے کو تیار نہ تھا۔ بالآخر میں نے امرت الیکٹرک پریس کے منیجر کو ایک تحریر لکھ کر دی کہ اگر اس پمفلٹ کی طباعت سے حکومت نے پریس کو کسی قسم کا جرمانہ کیا تو میں اس کی ادائیگی کا ذمہ دار ہوں گا۔ اس کے باوجود حکومت نے امرت الیکٹرک پریس کی ضمانت ضبط کر لی۔ لیکن ضبطی کے احکام مینی فسٹو چھاپنے پر نہیں بلکہ اس بنا پر صادر کئے گئے تھے کہ کچھ عرصہ قبل اس پریس سے بندہ بیراگی پر ایک نظم شائع ہوئی تھی جس سے فرقہ وارانہ منافرت پھیلنے کا اندیشہ تھا۔

مینی فیسٹو کی طباعت و اشاعت سے قبل میں نے اس کا ایک تحریری نسخہ مسٹر جناح کی خدمت میں بمبئی بھیج دیا تھا۔ اور ساتھ ایک خط بھی لکھا تھا کہ پنجاب میں مسلم لیگ کی کوئی پراونشل شاخ اب تک قائم نہیں ہوئی۔ حالات حد درجہ مایوس کن بلکہ ناگفتہ بہ ہو گئے ہیں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا مرکزی دفتر خاموش تماشائی کی طرح سب کچھ دیکھ رہا ہے اور کچھ نہیں کرتا۔ اب سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ ہم پنجاب میں مسلم لیگ کے نام اور کام کو زندہ رکھنے کے لئے اپنے طور پر جو کچھ ہو سکتا ہے کریں۔

مسٹر جناح نے اس عریضے کا جو جواب دیا اس کا بلاک شائع کر رہا ہوں:

Little Gibbs Road,
Malabar Hill,
Bombay.
May 4, 1939.

Dear Mr. Ashiq Husain,

I am in receipt of your letter of the 26th April, and you must realise that I have to work according to our Constitution and Rules. If the Punjab Musalmans were not satisfied with the Organising Committee appointed by the Muslim League, their proper course was to move through a regular channel to have that committee dissolved. You say you are yourself a member of the Organising Committee. In that case you ought to know that the Organising Committee was not of my making, but it was accepted by all concerned including the old Leaguers. I think it is hardly fair to say that I changed my views and made Unionists in charge of the Muslim League in your Province. Anyhow, I do not see any reason for the Punjab Musalmans to despair if, as you say, "there are young, educated, enthusiastic Musalmans in the Punjab, who are prepared to lay down their lives in the cause of the League. They are throbbing with life and they regard a great honour to sacrifice their dearest assets under your command. They look to you for national inspiration and national emancipation. Will you disappoint them for the sake of a few opporunists who worship every rising star ? " My answer obviously and emphatically is: certainly not. I can tell them that there is nothing to prevent them from establishing District Leagues all over Punjab. They can afterwards be co-ordinated without much difficulty into a Provincial League, if they are there. If the present Organising Committee fails, then the Working Committee of the All India Muslim League must be approached to take such steps as they think proper to organise the Provincial Muslim League of Punjab. But personally I am as much governed by the Constitution Rules and the Procedure as any other member of the All India Muslim League. If you will study the Constitution, you will find that my powers are limited. You being a member of the Organising Comm. and others who think alike with you can move the Working Committee of the All India Muslim League.

Yours sincerely,

M. A. Jinnah

Ashiq Husain Esq.,
10, Chamberlain Road,
Lahore.

مسلم لیگ ریڈیکل پارٹی کا مینی فیسٹو چھپتے ہی ہم نے اس کے سینکڑوں نسخے پنجاب اور بیرونِ پنجاب لوگوں کو بذریعہ ڈاک بھیج دیئے۔ مسلم لیگ کے ہمدردوں، خیر خواہوں اور مخلص کارکنوں کے حلقے میں ہر جگہ اس پارٹی کا خیر مقدم کیا گیا اور مبارک باد اور حوصلہ افزائی کے بیسیوں خطوط موصول ہوئے۔ میں یہاں نمونے کے طور پر صرف ایک خط نقل کرتا ہوں جو سید فدا حسین شاہ بی۔ اے۔ ایل ایل بی ایڈووکیٹ صدر مسلم لیگ۔ کیمبل پور نے مجھ کو لکھا تھا۔ کیمبل پور کا ضلع سر سکندر حیات خاں کا وطن تھا۔ لہٰذا یہ خط سر سکندر حیات خاں کی اس پالیسی کی جو انہوں نے مسلم لیگ کے بارے میں اختیار کر رکھی تھی صحیح عکاسی کرتا ہے:

کیمبل پور ضلع اٹک

۳۰۔ جون ۱۹۳۹ء

مکرّم و مُعظّم بندہ، سلامت۔ تسلیم!

آپ کا مینی فیسٹو ایسے وقت ملا جبکہ میں کھانا کھا رہا تھا۔ مسلم لیگ ریڈیکل پارٹی کا نام پڑھ کر اِس قدر خوشی ہوئی کہ کھانا چھوڑ دیا گیا۔ اور اوّل سے آخر تک پڑھنے کے بعد دم لیا۔ مجھے آپ کے منشور کے لفظ لفظ کے ساتھ اِتّفاق ہے۔ اور اِس میں بھی کلام نہیں کہ سر سکندر مسلم لیگ میں اسلام کی محبّت کی وجہ سے نہیں آیا بلکہ مسلم لیگ کی بڑھتی ہوئی طاقت سے گھبرا کر اور اُس کی رفتارِ ترقّی کو روکنے کے لئے اُس میں شامل ہوا ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ مسلم عوام مسلم لیگ کے ذریعہ سے بیدار اور منظم ہو کر ایسے ٹوڈیوں اور رُجعت پسندوں کو فی النّار والسقرنہ کردیں۔ جب سے سر سکندر حیات خاں نے مسلم لیگ پر اپنا قبضہ جمایا ہے۔ اس کی رات دن یہ کوشش ہے کہ مسلم لیگ کو کمزور کر کے، اور مسلمانوں میں طرح طرح کے حیلوں سے انتشار پیدا کر کے مسلم طبقہ کو پہلے کی طرح خوابِ خرگوش میں سُلایا جائے۔ لیگ کے کانسٹی ٹیوشن میں اِس قسم کی ترمیمیں ایزاد کی گئی ہیں کہ ہر ضلع میں اپنے تین پٹھوؤں کے ذریعہ سے ایک مکمل ڈسٹرکٹ لیگ بن سکے۔ جس کا ایک فائدہ تو یہ ہو کہ وہ تین کٹھ پُتلیاں اپنا ایک نمائندہ چن کر پراونشل لیگ میں بھیجیں۔ اور اس طرح سے پنجاب کے مختلف اضلاع سے اپنی ٹولی کے آدمی اِکٹھے کر کے اپنی مجلس عاملہ کا انتخاب کیا جائے۔ جس کے آپ بلا خوف و خطر صدر منتخب ہو جائیں۔

اِس قسم کی ترامیم کا دوسرا فائدہ یہ بھی غالباً خیال کر لیا گیا ہو گا کہ اِس طرح سے اصلی کارکنوں کی حوصلہ شکنی ہو جائے گی۔ اور وہ کارکن مایوس ہو کر مسلم لیگ سے علیحدہ ہو جائیں گے اور مسلم لیگ کا کام ماند پڑ جائے گا۔ تیسرا فائدہ مسلم لیگ پر قبضہ جمانے کا یہ بھی اُٹھایا جا رہا ہے کہ جس جس ضلع میں پُرانی لیگیں کئی سالوں سے کامیابی کے ساتھ کام کر رہی ہیں۔ اور جن کے ممبروں کی تعداد اِس وقت ہزاروں تک پہنچ چکی ہے۔ اُن کا پراونشل لیگ کے ساتھ اِلحاق نہیں کیا جاتا جب تک کہ وہ سکندری کلمہ پڑھنے کا یقین نہ دِلا دیں۔ پس، سکندر کو ایک خود غرض اور جاہ پسند سمجھنے والی جہاں جہاں لیگیں موجود ہیں، اُن کا اِلحاق سکندر کے میاں رمضان علی کرنے کو تیار ہی نہیں۔ اب ایسی لیگیں بے چاری کہاں جائیں۔ اور لیگ کی تبلیغ کس طرح کریں۔ جبکہ اُن کی اِس طرح سے دل شکنی کی جا رہی ہے۔ اور اُن کا اِلحاق باوجود ہزارہا ممبر ہونے کے پراونشل لیگ نہ کرے۔

موجودہ مسلم لیگ اٹک کے ساتھ یہی کیفیت جاری ہے۔ سکندر کے رشتہ داروں نے پہلے موجود لیگ پر قبضہ جمانے کی کوشش کی۔ لیکن جب مُنہ کی کھائی تو سکندر صاحب کو رپورٹ کی۔ چنانچہ آپ نے کہا کہ موجودہ قواعد کی رُو سے تم تین آدمی اپنی علیحدہ لیگ بنا لو اور ہم پُرانی ڈسٹرکٹ لیگ کے جس کے ممبروں کی تعداد تین چار ہزار ہے اور جس کے نیشنل گارڈ کے دوصد باوردی رضا کار موجود ہیں، اِلحاق کی منظوری ہی نہ دیں گے۔ چنانچہ ہم لوگ حیران تھے کہ ایسے حالات میں کیا کریں۔ اگر لیگ توڑتے ہیں تو کئی سالوں کی محنت اور قوم کی آئندہ بد حالی کا خیال ستاتا ہے اگر رکھتے ہیں تو کس نام پر رکھیں۔ کیونکہ پراونشل مسلم لیگ پر تو قبضہ سکندر حیات کا ہے۔

اِسی طرح ہمارے ضلع کی بعض مُقتدر ہستیاں جن کا وجود لیگ اور قوم کے لئے ہزاروں سکندروں سے کہیں زیادہ مفید اور کار آمد ہو سکتا ہے۔ مسلم لیگ سے محض اِس لئے مُتنفر اور پرے ہٹے ہوئے ہیں کیونکہ سکندری گورنمنٹ کے مظالم کی وجہ سے وہ اِس کے مخالف ہیں۔ آپ کو

غالباً معلوم ہو گا کہ پیر لعل بادشاہ صاحب سجادہ نشین دربار غوثیہ مکھڈ شریف ہمارے ضلع کی اتنی بڑی ہستی ہیں کہ اڑھائی تین لاکھ فقط ان کے اپنے مرید ہیں اور باقی تمام ضلع اُن کے مدّاحوں اور ثنا خوانوں سے بھرا ہوا ہے۔ سکندر صاحب نے مع مالکانِ شمس آباد وغیرہ یعنی ضلع کی دونوں پارٹیوں نے اپنی متحدّہ طاقت سے پیر صاحب کا مقابلہ کیا۔ لیکن دو ہزار کُل ووٹ حاصل کئے اور چھ ہزار کی بیشی سے شکست کھائی۔ چونکہ پیر صاحب سکندر حیات کے مُخالف ہیں، گو دل میں وہ مسلم لیگ کے سخت حامی ہیں۔ لیکن اس مخالفت کی وجہ سے وہ مسلم لیگ میں شامل نہیں ہو سکتے۔ اور اِسی وجہ سے اپنے بے پناہ اثر کو کسی اور جماعت کی طرف بھی نہیں پھیرتے۔

دو تین روز ہوئے وہ کیمبل پور تشریف لائے۔ کانگرس، خاکسار، احرار اور مسلم لیگ چاروں کے ڈیپوٹیشن مختلف اوقات میں اُن کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ اور ہر ایک نے اپنی طرف سے اُن کی سرپرستی حاصل کرنے کے لئے انتہائی کوشش کی۔ مسلم لیگ ڈیپوٹیشن کی معروضات سُننے کے بعد آپ نے مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد سے کمال ہمدردی کا اظہار کیا۔ اور مسٹر جناح کو ہندوستان کا قائدِ اعظم تسلیم کیا۔ لیکن نہایت درد بھرے لہجے میں اپنی معذوری بدیں الفاظ ظاہر کی کہ میں سکندر حیات کے ساتھ جنّت میں بھی جانا پسند نہیں کروں گا۔ یہ دوسرا فائدہ ہے جو کہ مسلم لیگ کو سکندر حیات کی شمولیّت سے حاصل ہو رہا ہے۔ لہٰذا بدیں وجُوہات آپ نے لیگ کی ریڈیکل پارٹی قائم کر کے مسلم لیگ کے وجود کو پنجاب میں قائم کر دیا ہے۔ ورنہ مجھے تو پچھلے چند دِنوں سے یہ خطرہ لاحق ہو رہا تھا کہ لیگ شاید پنجاب کی سرزمین میں فقط چند روز کی مہمان ہے۔

اگر آپ نے فارم ممبری یا فارم اِلحاق چھپوائے ہوں تو براہِ مہربانی فوراً واپسی ڈاک اِرسال کر دیں۔ ہمارے شہر کی لیگ کے ممبروں کی تعداد ۶۰۰-۵۰۰ کے قریب ہے۔ اور ضلع میں بھی چار پانچ

ابتدائی لیگوں کے علاوہ ہر تحصیل کے ہیڈ کوارٹر پر چار لیگیں ہیں۔ شہر اور ضلع کی لیگ آپ کے فارم آنے پر فوراً آپ کی پارٹی کے ساتھ اِلحاق کی درخواست کر دیں گی۔

پیر صاحب مکھڈ شریف پرسوں لاہور تشریف لے گئے ہیں۔ اُن کے بنگلے کا نمبر ۴۔ ریس کورس روڈ لاہور ہے۔ اُن سے ضرور ملیں اور اُن کو شامل کرنے کی کوشش کریں۔ اگر پیر صاحب شامل ہو گئے تو اُن کے ڈھائی تین لاکھ مریدوں کے علاوہ دس دن کے اندر اندر پورا سب ڈویژن مسلم لیگی ہو سکتا ہے۔ اُن کو ضرور قابو کریں سخت تاکید ہے۔

خاکسار سیّد فدا حسین شاہ۔ ایڈووکیٹ

پریذیڈنٹ سٹی مسلم لیگ۔ کیمبل پور

اخباروں نے اِس مینی فیسٹو پر جو رائے زنی اور تبصرہ کیا اُس کا ذکر لا حاصل ہے۔ اس وقت لاہور سے مسلمانوں کے چار روزانہ اخبار شائع ہوتے تھے۔ زمیندار۔ انقلاب۔ احسان اور شہباز۔ اوّل الذکر تین اخباروں نے ایک لفظ تک پسند نہ کیا۔ شہباز مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش نے روزنامہ احسان سے علیحدہ ہو کر جاری کیا تھا۔ اور مجھے توقع تھی کہ یہ اخبار مسلم لیگ ریڈیکل پارٹی اور اِس کے مینی فیسٹو پر کم سے کم تحسین اور حوصلہ افزائی کے دو لفظ تو ضرور لکھے گا۔ لیکن یہ اُمّید بھی خام ثابت ہوئی۔

میکش صاحب نے ۱۱۔ جون ۱۹۳۹ء کے شہباز میں ایک بڑا لمبا مقالۂ افتتاحیہ لکھا جس کا عنوان تھا۔

"پنجاب مسلم لیگ ریڈیکل پارٹی

تو برائے وصل کردن آمدی      نے برائے فصل کردن آمدی

اِس مقالے کے شروع میں اُنھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مینی فیسٹو کا مُصنّف احساسِ کمتری کا شکار ہے۔ اور کانگرس کی نقّالی کی کوشش کر رہا ہے۔ آگے چل کر فرمایا۔

"اِس سعیٔ تقلید و نقّالی کی ایک مثال اِس وقت ایک پمفلٹ کی شکل میں ہمارے سامنے پڑی ہے۔ جو ہمارے ایک عزیز اور محترم دوست عاشق

حسین بٹالوی نے پنجاب مسلم لیگ ریڈیکل پارٹی کے منشورِ عام کے نام سے شائع کیا ہے۔ اِس پمفلٹ میں عاشق صاحب نے مسلم لیگ کے اُنہی خطوط پر ایک فارورڈ بلاک بنانے کی تحریک کی ہے جس پر چل کر مسٹر سوبھاش چندر بوس کانگرس میں حزبِ اقدام بنانے کی فکر میں ہیں۔ ہم کسی ملی یا سیاسی انجمن کے اندر حزبِ اختلافِ رائے کی بناء پر حزبِ اقدام بایاں بازو یا ریڈیکل پارٹی بنانے کے خیال کو جُرم تصوّر نہیں کرتے۔ لیکن جب اِس قسم کا کوئی اقدام محض دوسروں کی دیکھا دیکھی کیا جائے اُس کی وقعت ہماری نظروں میں بہت بڑی حد تک کم ہو جاتی ہے۔

ہم نے اپنے دوست عاشق صاحب کے اِس پمفلٹ کا مطالعہ بالاستیعاب کیا ہے۔ لیکن ہم اِسے پڑھنے کے بعد اس امر کے قائل نہیں ہو سکے کہ مسلم لیگ کے اندر ہمیں کانگرس والوں کی دیکھا دیکھی کسی قسم کی ریڈیکل پارٹی بنانے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ جس مقصدِ وحید کے لئے عاشق صاحب ریڈیکل پارٹی بنانے کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں وہ مسلم لیگ کی تنظیم کو نقصان پہنچانے کا موجب بن سکتا ہے۔

آگے چل کر سکیش صاحب نے فرمایا:

"عاشق صاحب پنجاب میں مسلم لیگ کو سر سکندر حیات خاں اور اُن کے رُفقا کے پنجۂ اِقتدار سے چھڑانے کے لئے ریڈیکل پارٹی بنانے کے خواہاں نظر آتے ہیں۔ اور اپنی اس خواہش کی وجہ سے یہ بیان فرماتے ہیں کہ سر سکندر حیات خاں اور ان کے دیگر رُفقاء بظاہر مسلم لیگ کے دوست اور بباطن دشمن ہیں۔ یہ ایک ایسا الزام ہے جسے زید بکر کے خلاف اور بکر عمر کے خلاف نہایت آسانی سے استعمال کر سکتا ہے۔ اور محض اس قسم کے احتمالات کی بنا پر ہم کسی بڑی یا چھوٹی شخصیت پر مسلم لیگ کے دروازے بند نہیں کر سکتے۔ جب سر سکندر حیات خاں اور پنجاب اسمبلی کے دیگر مسلم ارکان مسلم لیگ میں شامل ہو چکے ہیں۔ اور آل انڈیا مسلم لیگ کے ساتھ پورا تعاون کر رہے ہیں تو کس دلیل کی بناء پر ہم یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ تم لوگ سچے دل سے مسلم لیگی نہیں بنے۔

سر سکندر حیات خاں اور اُن کے رفقا کے متعلق اِس قسم کا سوء ظن ظاہر کرنے کے لئے عاشق صاحب نے بعض واقعات کا سہارا بھی لیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ سر سکندر حیات خاں نے مسلم لیگ کی واضح پالیسی کی خلاف ورزی کے متعدّد اقدامات کر کے ثابت کر دیا ہے کہ وہ مسلم لیگ کے وفادار خادم نہیں ............ ان واقعات کی بناء پر عاشق صاحب نے یہ نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی ہے کہ سر سکندر مسلم لیگ کے بد خواہ ہیں۔ لہٰذا تمام کام چھوڑ چھاڑ کر پہلے اُن کو مسلم لیگ سے الگ کرنے کی جدّوجہد شروع کر دینی چاہئے۔

اس کے بعد ارشاد ہوا کہ۔

"یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ کے سلسلہ میں عاشق صاحب نے بڑی ہی عجیب بات یہ بیان فرمائی ہے کہ "سکندر جناح پیکٹ نے یونینسٹ پارٹی کو رتی برابر بھی نقصان نہیں پہنچایا۔" ہم حیران ہیں کہ سکندر جناح پیکٹ کا مطلب عاشق صاحب نے یہ کیوں سمجھ لیا کہ یونینسٹ پارٹی کے اقتدار کو نقصان پہنچایا جائے۔ عاشق صاحب جانتے ہیں کہ پنجاب میں مسلم لیگ پارٹی اپنی طاقت کے بل پر وزارت قائم نہیں کر سکتی۔ لہٰذا اُس کے لئے ضروری ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی واضح پالیسی کے مطابق بعض ایسی پارٹیوں کا تعاون حاصل کرے جن کا پروگرام لیگ کے پروگرام سے قریب تر ہو۔ چنانچہ اسی فارمولا کے پیشِ نظر ایک کولیشن وزارت بن گئی۔ جسے قائم رکھنا خود مسلم لیگ کے مفاد کے لئے ضروری ہے۔ عاشق صاحب ہیں کہ وہ اِس حالت میں بھی یونینسٹ پارٹی کو کُشتنی اور گردن زدنی قرار دے رہے ہیں۔ جبکہ اُس کے مسلم ارکان کی اکثریت مسلم لیگ کی حکمتِ عملی کی پابند بن چکی ہے۔ اِن حالات میں ہم اپنے کو عاشق صاحب کی ریڈیکل پارٹی کی موافقت و حمایت کے لئے آمادہ نہیں پا سکتے کیونکہ اس کی غرض و غایت سر سکندر حیات کی ذاتی اور شخصی مخالفت کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتی۔ اور ہم کسی بنیادی اختلاف کے بغیر مسلم لیگ کے اندر پارٹی بازی کی زدح کو ترقی دینے کی کسی کوشش کو مستحسن قرار نہیں دے سکتے۔"

یہ روز نامہ "شہباز" کے مقالۂ افتتاحیہ کا مُلخص میں نے اُوپر درج کیا ہے۔ پورا مقالہ بہت طویل ہے جو اِس وقت درج نہیں کیا جا سکتا۔ جب اپریل ۱۹۳۸ء میں کلکتہ میں مسٹر جناح نے آرگنائزنگ کمیٹی قائم کی تھی تو پنجاب کے دونوں فریقوں سے اس کمیٹی کے ممبروں کی الگ الگ فہرستیں طلب کی تھیں۔ ہم نے میکش صاحب کا نام اپنی فہرست میں درج کیا تھا۔ سر سکندر یہ نام قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ لیکن ہم نے اِصرار کیا تو اُنہیں ماننا پڑا۔

مصیبت یہ تھی کہ پنجاب کے مسلمان اخبار سر سکندر حیات خاں کی سرپرستی کے بغیر چل نہیں سکتے تھے۔ اخباروں کی پُشت پناہی اور مالی اعانت زیادہ تر اِشتہاروں سے ہوتی ہے۔ اِشتہاری فرموں اور کاروباری اور تجارتی اداروں پر ہندو قابض تھے۔ پھر مسلمان اخباروں کو اشتہار کہاں سے اور کیوں کر ملتے۔ اِس کے علاوہ مسلمان اخباروں کی اشاعت بھی نسبتاً بہت کم تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر زمیندار۔ انقلاب احسان اور شہباز کو اپنی زندگی برقرار رکھنے کے لئے سر سکندر کا دست نگر ہونا پڑا۔ ہندو اخباروں میں سے کسی نے مسلم لیگ ریڈیکل پارٹی کے مینی فیسٹو کو درخور اعتناء نہ سمجھا۔ البتہ ڈاکٹر ستیہ پال کے اخبار روزنامہ نیشنل کانگرس کے ایڈیٹر ملک نصراللہ خاں عزیز نے جو میرے کرم فرما دوست تھے۔ اِس مینی فیسٹو پر سنجیدگی سے تبصرہ کرنے کی بجائے اپنے اخبار کے مزاحیہ کالم میں یہ کہہ کر مذاق اڑایا کہ کہا مسلم لیگ جیسی رُجعت پسند اور فرقہ پرست جماعت اور کہاں یہ ریڈیکل پارٹی۔

یہ مینی فیسٹو مئی ۱۹۳۹ء میں شائع کیا گیا تھا۔ آج اُنتیس سال گذر جانے کے بعد اس کا تجزیہ کرنے سے بظاہر کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ لیکن واقعات بہر صورت واقعات اور حقائق بہر حال حقائق ہیں۔ جن سے کوئی اِغماض نہیں کر سکتا۔ ۔ روزنامہ شہباز کے اُس مقالۂ افتتاحیہ کا خُلاصہ یہ تھا کہ:

الف۔ سکندر جناح پیکٹ کا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا کہ یونینسٹ پارٹی کے اِقتدار کو نقصان پہنچایا جائے۔

ب۔ یونینسٹ پارٹی ایک کولیشن تھی جسے قائم رکھنا خود مسلم لیگ کے مفاد کے لئے ضروری تھا۔

ج۔ یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبر مسلم لیگی تھے۔ لہٰذا یونینسٹ پارٹی کو کشتنی اور گردن زدنی قرار دینا غلط تھا۔

د۔ مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی میں پالیسی کے لحاظ سے کوئی بنیادی اِختلاف نہیں تھا۔

گذارش یہ ہے کہ اگر یہ حقائق سر سکندر کی زندگی میں قائم و دائم تھے۔ اور جو شخص انہیں

اُس وقت تسلیم کرنے سے انکار کرتا تھا وہ احساسِ کمتری کا شکار ہونے کے علاوہ مسلم لیگ کی صفوں میں انتشار و افتراق پھیلانے کا ملزم بھی قرار پاتا تھا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ سر سکندر کے انتقال کے معاً بعد یہ حقائق کیوں غلط اور بے حقیقت قرار پائے؟

ملک خضر حیات ٹوانہ بھی تو یہی کہتے تھے کہ:

الف۔ سکندر جناح پیکٹ کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ یونینسٹ پارٹی کے اقتدار کو نقصان پہنچایا جائے۔

ب۔ یونینسٹ پارٹی اس کولیشن کا نام ہے جو پنجاب اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی نے دوسری جماعتوں کے ساتھ مل کر قائم کی ہے۔

ج۔ یونینسٹ پارٹی کے تمام مسلمان ممبر مسلم لیگی ہیں لہٰذا مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں۔

د۔ جب سر سکندر کی زندگی میں سب خاموش تھے اور، کسی شخص نے اس انتظام پر اعتراض نہیں کیا تھا تو آج کیوں اعتراض کیا جا رہا ہے؟ کیا اس کی صرف یہ وجہ نہیں کہ سر سکندر حیات خاں فوت ہو چکے ہیں اور ان کی گدی پر میں بیٹھ گیا ہوں؟ اور کیا یہ سارا ہنگامہ محض میری ذاتی مخالفت کی بناء پر نہیں کیا جا رہا؟

پاکستان بن چکا ہے۔ دنیا نے اسے تسلیم کر لیا ہے۔ زمانے کی کوئی طاقت اور لیل و نہار کی کوئی گردش اس کی بنیادوں کو متزلزل نہیں کر سکتی۔ لیکن کیفیت یہ ہے کہ ہر سال ۱۴/ اگست کو بار بار چند تصویریں اخباروں میں چھپ جاتی ہیں کہ لوگوں نے ہاتھوں میں جھنڈے اٹھا رکھے ہیں اور یونینسٹ پارٹی اور ملک خضر حیات کے خلاف نعرے لگا رہے ہیں۔ ان تصویروں کے نیچے لکھا جاتا ہے: ''کہ تحریک پاکستان کے جلوس۔''

گذارش یہ ہے کہ اگر تحریکِ پاکستان کا مدعاو مقصود صغریٰ و کبریٰ، ملجا و ماویٰ اور سارا طول و عرض وہ چند روزہ تحریک تھی جو ملک خضر حیات ٹوانہ کے دور اقتدار میں یونینسٹ پارٹی کی وزارت کو توڑنے کے لئے برپا کی گئی تھی تو پھر ان لوگوں کے بارے میں کیا ارشاد ہوگا جنہوں نے روز اول ہی سے یونینسٹ پارٹی کی بالا دستی کو قبول نہیں کیا تھا؟ جنہوں نے پہلے دن یہ کہہ دیا تھا کہ یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ دو الگ الگ جماعتیں ہیں جنہیں اکٹھا نہیں کیا جا سکتا۔ جنہوں نے سکندر جناح پیکٹ کے باوجود یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ پنجاب اسمبلی میں کسی مسلم لیگ پارٹی کا وجود ہے؟ جنہوں نے تحریر و تقریر سے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ

سر سکندر حیات خاں یونینسٹ پارٹی کو توڑ کر اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی قائم کریں؟

آج آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ سر سکندر حیات خاں طاقت ور تھے اور ہم لوگ انتہائی بے بس اور کمزور تھے۔ اس لئے بدقسمتی سے ہمیں اپنی کوشش میں کامیابی نصیب نہ ہوئی لیکن گستاخی معاف! محض فریقین کی طاقت اور کمزوری کے اضافی فرق سے حقائق کو منعد ، و مغلوب نہیں کیا جا سکتا۔ جو چیز سر سکندر حیات خاں کی زندگی میں قومی نقطہ نگاہ سے غلط اور نقصان دہ تھی، وہ ملک خضر حیات کے دور میں بھی غلط اور نقصان دہ تھی۔ اگر لوگ سر سکندر کی غلط پالیسی کو محض اس لئے برداشت کرتے رہے کہ سر سکندر طاقت ور تھے اور ان سے پنجہ آزما ہونا محال تھا. تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ جن معدودے چند افراد نے حد درجہ بے سرو سامانی اور بے بسی کے عالم میں سر سکندر کی قہاری و جباری کے خلاف قومی محاذ قائم کیا اور نا مساعد حالات میں مسلم لیگ کا پرچم بلند کیا۔ وہ ملک و ملت کے دشمن تھے؟

اس وقت سر سکندر حیات خاں کے حامی ہم پر یہ الزام دھرتے تھے کہ ہم یونینسٹ پارٹی کی مخالفت کر کے پنجاب کے مسلمانوں میں تشت و افتراق پھیلا رہے ہیں۔ یہاں ان لوگوں کے نام لکھنے سے کچھ حاصل نہیں۔ یہ نام سب کو معلوم ہیں۔ لیکن یہی لوگ تھے جنہوں نے سر سکندر کے آنکھیں بند کرتے ہی چلّانا شروع کر دیا تھا کہ سکندر جناح پیکٹ کا کوئی وجود نہیں۔ پنجاب اسمبلی میں کوئی مسلم لیگ پارٹی نہیں بنائی گئی۔ یونینسٹ پارٹی ایک کولیشن کا نام نہیں بلکہ ایک مستقل اور قائم بالذات ادارہ ہے۔ جب تک اس پارٹی کو توڑ کر مسلم لیگ کے وجود کو آزاد نہیں کیا جاتا. مسلمانوں کو نجات نہیں ہو سکتی اور نہ پاکستان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے گا۔

تم لوگ بھی غضب ہو کہ دل پر یہ اختیار
شب موم کر لیا سحر آہن بنا دیا

آج کل جرمنی میں ایک عجیب قسم کی ذہنی کشمکش چل رہی ہے۔ وہاں کے سکولوں اور کالجوں میں جو درسی کتابیں رائج کی گئی ہیں ان میں ہٹلر کو سخت برا بھلا کہا گیا ہے اور نازی پارٹی کی مذمت کی گئی ہے۔ اور جن لوگوں نے ہٹلر کی زندگی میں اس کی اور نازی پارٹی کی اصولی مخالفت کر کے اپنی گردنیں کٹوائی تھیں یا قید و بند کا شکار ہوئے تھے انہیں قومی ہیرو کا درجہ دیا گیا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں الجھن اس بات سے پیدا ہوئی ہے کہ جو لوگ نازی پارٹی کے ممبر اور ہٹلر کے حامی معاون، مددگار اور دست و بازو تھے. انہیں آخر قومی جدوجہد کی اس نئی تاریخ میں کون سا مقام عطا کیا جائے گا؟ کیا یہ لوگ غدار کہلائیں گے یا محب وطن کے اعزاز سے سرفراز کئے جائیں گے؟

اس مخمصے کا حل یہ تجویز کیا گیا ہے کہ وہ لوگ بھی سچے اور حق پرست تھے۔ کیونکہ جرمنی

فرانس ، انگلستان ، روس اور امریکہ کے خلاف جنگ لڑ رہا تھا۔ اس وقت ہٹلر کے ان حامیوں نے ہٹلر کے احکام کی تعمیل کر کے گویا مادر وطن کی خدمت کی تھی اگر یہ قومی فلسفہ تسلیم کر لیا جائے تو غالباً ہم بھی یہ کہنے کے قابل ہو سکیں گے کہ یونینسٹ پارٹی کے جن مسلمان ممبروں نے سر سکندر کے دور وزارت میں پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی نہ بننے دی۔ سکندر جناح پیکٹ کی آڑ میں یونینسٹ پارٹی کی بالا دستی کو قائم رکھا۔ پنجاب میں مسلم لیگ کی تحریک کو مردہ اور بے جان بنانے کے غرض سے سر سکندر کے ہر قسم کے احکام کی تعمیل کی۔ وہ سچے اور حق پرست تھے۔ کیونکہ اس وقت سر سکندر کی اعانت اور یونینسٹ پارٹی کی مدد کرنا ہی گویا مسلمانان پنجاب کی بہترین خدمت قرار دیا جا سکتا تھا۔

اس کے برعکس جن لوگوں نے سر سکندر کے دور اقتدار میں، حد درجہ بے سرو سامانی اور بد حالی کے باوجود مسلم لیگ کا پرچم بلند کیا۔ یونینسٹ پارٹی کی بالا دستی کو ایک لمحے کے لئے تسلیم نہ کیا۔ پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے قیام کی شبانہ روز کوشش جاری رکھی۔ یونینسٹ پارٹی کو توڑ کر مسلم لیگ کو ایک آزاد۔ خود مختار اور قائم بالذات جماعت بنانے کی جدوجہد کی۔ مسٹر جناح کو مسلمانوں کا قائد اعظم تسلیم کروانے کی سعی کی اور ابتلاء و آزمائش کے اس پورے دور میں سر سکندر حیات خاں کے عتاب پیہم کا شکار ہوئے وہ بھی سچے اور حق پرست تھے۔ کیونکہ حُبّ قومی کا یہی تقاضا تھا۔

۶

# ہندوستان کے آئین سے متعلق پانچ عدد سکیمیں

ہماری قومی جدوجہد میں ۱۹۳۹ء کا سال اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ مسلم لیگ نے حتمی طور پر اس آل انڈیا فیڈریشن کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء نے تجویز کی تھی اب لا محالہ یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ اگر یہ فیڈریشن ہمیں منظور نہیں تو پھر اس کا بدل کیا ہونا چاہئے!

یہ بار آل انڈیا مسلم لیگ پر تھا کہ وہ ۱۹۳۵ء کے فیڈریشن کے مقابل میں کوئی متبادل تجویز پیش کرے۔ اسی خیال کے پیش نظر مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے ایک نو ممبروں کی کانسٹی ٹیوشن سب کمیٹی مقرر کی تھی کہ وہ ان تمام سکیموں پر غور کریں جو ۱۹۳۵ء کے فیڈریشن کے جواب میں مختلف اصحاب نے مرتب کی تھیں۔

اس قسم کی پانچ سکیمیں کانسٹی ٹیوشن سب کمیٹی کو پیش کی گئی تھیں۔ ایک سکیم ڈاکٹر سید عبداللطیف نے مرتب کی تھی۔ دوسری کے مصنف "ایک پنجابی" تھے۔ تیسری چودھری رحمت علی کی سکیم تھی۔ چوتھی کے مصنف مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے دو پروفیسر تھے۔ اور پانچویں سکیم سر سکندر حیات خاں کے غور و فکر کا نتیجہ تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۳۹ء میں عام مسلمانوں میں یہ جذبہ بیدار ہو گیا تھا کہ سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہئے کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں کو محفوظ کیا جائے کیونکہ یہی علاقے مسلمانوں کی اکثریت کے تھے۔ تاہم اس کے ساتھ ہمیں یہ فکر بھی لاحق تھی کہ جن خطوں میں مسلمانوں کی اقلیت ہے وہاں ان کی عزت و آبرو. جان و مال اور سیاسی حقوق کو محفوظ کرنے کا طریقہ کیا ہو گا۔ یہ پانچ سکیمیں جن کے اجمالی خاکے آئندہ چند صفحات میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔ ہمارے اسی اضطراب کی آئینہ دار ہیں۔

ان پانچوں سکیموں میں ایک چیز مشترکہ تھی۔ وہ یہ کہ ہم مسلم اکثریت کے شمالی مغربی

اور شمال مشرقی علاقوں کو ہندوستان سے قطعی طور پر الگ کرنا نہیں چاہتے تھے. بلکہ کسی نہ کسی قسم کی آل انڈیا کانفیڈریشن کا وجود ضروری خیال کرتے تھے۔ یہ پانچوں سکیمیں بالآخر مسلم لیگ کی کانسٹی ٹیوشن سب کمیٹی نے مسترد کر دی تھیں۔

قرار داد پاکستان ۲۴ - مارچ ۱۹۴۰ء کو منظور ہوئی تھی۔ لیکن ۱۹۳۹ء کا پورا سال اسی غور و فکر اور اضطراب میں گذرا کہ ہمیں آئندہ بر عظیم ہند میں اپنے حقوق محفوظ کرنے اور مسلم اکثریت کے علاقوں کو ہندوؤں کی چیرہ دستی سے بچانے کے لئے کس قسم کا دستور مرتب کرنا چاہئے۔

## ڈاکٹر سید عبداللطیف کی سکیم

ڈاکٹر سید عبداللطیف. عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد. دکن میں انگریزی کے پروفیسر تھے۔ ہندوستان کے ادبی حلقوں میں انہیں پہلی مرتبہ اس وقت شہرت حاصل ہوئی تھی جب انہوں نے ۱۹۲۷ء میں غالب پر اپنی کتاب شائع کی تھی۔ ۱۹۳۷ء سے ڈاکٹر لطیف نے سیاسیات میں بھی کچھ دلچسپی لینا شروع کی۔ لیکن یہ دلچسپی محض لکھنے پڑھنے تک محدود تھی۔ عملاً انہوں نے کانگریس یا مسلم لیگ یا کسی اور آل انڈیا جماعت میں شرکت نہیں کی تھی۔

۱۹۳۹ء میں انہوں نے ہندوستان کے مستقبل کے آئین کے بارے میں ایک سکیم آل انڈیا مسلم لیگ کی کانسٹی ٹیوشن سب کمیٹی کے سامنے پیش کی۔ جس میں ہندوستان کو کلچر کی بناء پر متعدد منطقوں میں تقسیم کر کے انہیں ایک فیڈریشن کی صورت میں منسلک کرنے کا خاکہ مرتب کیا گیا تھا۔ [1]

اس سکیم کی رو سے ہندوستان میں پانچ زون مسلمانوں اور کم سے کم گیارہ زون ہندوؤں کے لئے تجویز کئے گئے تھے۔ ریاستوں کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنے گرد و پیش کے طبعی اور تہذیبی حالات کو مد نظر رکھ کر جس زون سے چاہیں اپنا الحاق کر لیں۔
مسلمانوں کے لئے جو زون تجویز کئے گئے وہ یہ تھے:

۱- شمال مغربی زون جس میں سندھ، بلوچستان، پنجاب، شمال مغربی صوبہ سرحد، ریاستہائے خیرپور و بہاول پور شامل ہوں گے اندازہ یہ تھا کہ اس زون میں ڈھائی کروڑ سے کچھ اوپر مسلمانوں کی

---

1. A Federation of Cultural Zones for India

آبادی ہوگی۔

۲۔ شمال مشرقی زون ۔ جس میں بنگال اور آسام کے صوبے شامل ہوں گے۔ ایک اندازے کے مطابق تین کروڑ مسلمان یہاں آباد ہوں گے۔

۳۔ صوبجات یوپی اور بہار کے مسلمانوں کی اکثریت کے لئے ایک علیحدہ زون بنایا جائے گا۔ پٹیالہ کی سرحد سے شروع ہو کر رام پور سے ہوتا ہوا لکھنؤ پہنچ جائے گا۔ سوا کروڑ کے قریب مسلمان یہاں آباد ہوں گے۔

۴۔ دکن زون ۔ ڈاکٹر لطیف کے اندازے کے مطابق دکن میں سوا کروڑ کے لگ بھگ مسلمان آباد تھے جو مختلف ٹکڑیوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ ریاست حیدر آباد کا کچھ حصہ کاٹ کر اور برطانوی ہند کے اضلاع کرنول ۔ کڑپا ۔ چتوڑ ۔ شمالی ارکاٹ اور چنگل پیٹ کو اس کی ساتھ ملا کر ایک الگ زون بنایا جائے گا۔ البتہ ریاست حیدر آباد کی جداگانہ حیثیت بالکل اسی طرح قائم رہے گی۔

باقی ہندوستان ہندوؤں کے لئے ہو گا جس میں ان کے لئے الگ گیارہ زون بنائے جائیں گے۔ ہر زون ایک علیحدہ مملکت کی صورت میں ہو گا اور بالآخر ہندوؤں اور مسلمانوں کے یہ جملہ زون باہمی طور پر ایک فیڈریشن کی شکل اختیار کریں گے۔

جب تک یہ قطعی اور آخری صورت پیدا نہ ہو عبوری دور کے لئے ڈاکٹر لطیف کے پیش نظر ایک اور سکیم تھی۔ مثلاً یہ کہ:

الف۔ ہندوستان میں زبان اور کلچر کی بنا پر مزید صوبے وضع کئے جائیں گے۔ یوپی کے موجودہ صوبے میں سے ایک صوبہ مسلم اکثریت کا بنایا جائے گا۔

ب۔ فیڈریشن کی متصلہ وحدتوں کی باہمی دلچسپی کے جس قدر مشترکہ اقتصادی اور ثقافتی امور ہوں گے. ان پر غور و فکر کر کے کوئی مشترک پالیسی وضع کرنے کے لئے متعدد ریجنل بورڈ بنائے جائیں گے۔

ج۔ مجالس قانون ساز میں مسلمانوں کی نیابت کا موجودہ تناسب بحال رہے گا اور انتخاب بھی جداگانہ ہو گا۔

د۔ جداگانہ انتخاب کی موجودگی میں صوبوں میں برطانوی طرز کا پارلیمنٹری نظام حکومت نہیں چل سکتا۔ اس لئے کابینہ میں صرف انہی مسلمانوں کو جگہ دی جائے گی جنہیں اپنی جماعت کا اعتماد حاصل ہے. قطع نظر اس سے کہ وہ اکثریت رکھنے والی پارٹی کے ممبر ہیں یا

نہیں۔

ھ۔ عبوری دور میں اگر ہندو اور مسلمان نقل مکانی کر کے اپنے اپنے قومی زون میں جانا چاہیں گے تو انہیں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہوگی بلکہ اس قسم کی نقل مکانی کے لئے ہر طرح کی سہولتیں مہیا کرنا صوبائی حکومتوں کا فرض ہو گا۔ بہتر یہ ہو گا۔ کہ ایک رائل کمیشن مقرر کیا جائے جو آبادیوں کے باہمی تبادلے کا موزوں پروگرام وضع کرے۔

"ایک[1] پنجابی" کی سکیم

یہ سکیم میاں کفایت علی نے ایک پونے تین سو صفحے کی کتاب کی صورت میں مرتب کی تھی جسے نواب سر شاہنواز خان والئ ممدوٹ نے اپنے خرچ پر طبع کروا کے شائع کیا تھا۔ کتاب کے سرورق پر مصنف کا نام درج نہیں تھا۔ صرف "ایک پنجابی" درج تھا۔

اس کتاب میں ہندو مسلم تعلقات پر خاصی سیر حاصل بحث کی گئی تھی۔ کانگرس، مسلم لیگ اور خلافت کی تحریکوں کا ذکر تھا۔ انگریزوں کے آنے کے بعد ہندوستان کی معاشرت اور سیاست میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان پر بھی تبصرہ کیا گیا تھا۔ آخر میں اس مسئلے پر بھی اظہار خیال کیا گیا تھا کہ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کے معاشرتی اور سیاسی اختلافات کو نظر انداز کر دیا جائے تو کیا محض اقتصادی امور کے باہمی اشتراک سے ان دو قوموں میں اتحاد پیدا ہو سکتا ہے۔

مصنف نے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی ناکامی پر اظہار خیال کر کے ہندوستان کی مشکلات کا حل یہ تجویز کیا تھا کہ اس برعظیم کو متعدد مملکتوں میں تقسیم کر کے انہیں باہمی طور پر ایک کانفیڈریشن میں منسلک کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں ذیل کے فیڈریشن تجویز کئے گئے تھے۔

۱۔ قسمت انبالہ کو کاٹ کر باقی پنجاب کو سندھ۔ شمال مغربی صوبہ سرحد۔ کشمیر۔ بلوچستان۔ بہاولپور۔ امب۔ دیر۔ سوات۔ چترال۔ خیرپور۔ قلات۔ لس بیلہ۔ کپورتھلہ اور مالیر کوٹلہ سے ملا کر ایک فیڈریشن بنایا جائے۔

۲۔ ہندو انڈیا کا فیڈریشن جس میں یوپی۔ سی پی۔ بہار کے مکمل صوبے۔ بنگال کے بعض حصے، اڑیسہ آسام۔ مدراس۔ بمبئی کے مکمل صوبے اور ریاست ہائے دکن اور راجستان کے علاوہ دیگر ریاستیں شامل کی جائیں گی۔

۳۔ راجستان فیڈریشن، جس میں راجپوتانہ اور وسط ہند کی ریاستیں شامل ہوں گی۔

---

1 "Confederacy of India." by "A Punjabi"

۴۔ ریاست ہائے دکن کا فیڈریشن جس میں حیدر آباد۔ میسور اور بستار کی ریاستیں شامل ہوں گی۔

۵۔ بنگال کا فیڈریشن جس میں مشرقی بنگال۔ سلہٹ اور گوال پاڑہ کے ضلعے اور تری پورہ کی ریاست کو شامل کیا جائے گا۔

یہ پانچ فیڈریشن تجویز کرنے کے بعد مصنف نے ہندوستان کے نقشے میں کچھ تبدیلیاں کرنے کی سفارش بھی کی تھی۔ مثلاً یہ کہ:

الف۔ قسمت انبالہ۔ ضلع کانگڑہ۔ تحصیل اونا۔ تحصیل گڑھ شنکر اور دہلی کو ملا کر ایک نیا صوبہ بنایا جائے۔ اور اگر ایسا کرنا ممکن یا مستحسن نہ ہو تو پھر ہندو اکثریت کے ان تمام علاقوں کو یوپی میں شامل کر دیا جائے۔

ب۔ مغربی بنگال کے ان علاقوں کو جہاں ہندوؤں کی بہت بڑی اکثریت آباد ہے. بہار یا اڑیسہ میں شامل کر دیا جائے۔

ج۔ گوال پاڑہ اور سلہٹ کے اضلاع کو آسام سے کاٹ کر مشرقی بنگال میں شامل کر دیا جائے۔

د۔ ضلع گوال پاڑہ کے شمال میں ایک "کاریڈور" بنایا جائے تاکہ آسام کو باقی ہندو صوبوں کے فیڈریشن سے ملحق کیا جا سکے۔

ہ۔ ریاست ہائے دکن کو بھی ایک ایسا "کاریڈور" ملنا چاہئے تاکہ حیدر آباد اور میسور کو ایک۔ دوسرے سے ملایا جا سکے۔

و۔ راجستان کو بھی ایسا ہی "کاریڈور" ملنا ضروری ہے تاکہ ریاست پٹیالہ کو جو راجستان فیڈریشن کا ایک جزو ہے. راجستان سے ملایا جا سکے۔

اس سکیم کے مصنف کی رائے یہ تھی کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور شمالی مشرقی خطوں میں مسلمانوں کی پوزیشن خاصی مضبوط ہے۔ اس لئے اگر ہندو یا انگریز اس قسم کی مجوزہ کانفیڈریشن کے قیام پر رضامند نہ ہوں تو پھر ہمیں اپنی اکثریت کے علاقوں کو ہندوستان سے بالکل علیحدہ کر لینا چاہئے لفظ پاکستان کو مصنف کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ کیونکہ اس کا خیال ہے کہ اس لفظ کے ساتھ بعض ایسی حکایتیں. روایتیں اور داستانیں وابستہ ہو گئی ہیں جن سے یہ اندیشہ ہوتا ہے گویا پاکستان کا ایسا کوئی خارجی وجود ہے جس کا تعلق برعظیم ہند کے ساتھ نہیں۔

## چودھری رحمت علی کی سکیم

چودھری رحمت علی ضلع ہوشیار پور کے رہنے والے تھے اور اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے کرنے کے بعد متعدد ملازمتوں کے سلسلہ میں منسلک رہے۔ لاہور کے ایچی سن کالج میں جونیئر ہاؤس ماسٹر بھی رہے۔ والئی رُرجان کے پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ بالآخر ۱۹۳۱ء میں مزید تعلیم کے لئے انگلستان تشریف لے گئے۔ کیمبرج سے انہوں نے بی اے کیا اور لندن سے بیرسٹری کی سند حاصل کی۔ لیکن فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ واپس وطن نہیں آئے بلکہ مستقل طور پر انگلستان ہی میں مقیم ہوگئے۔ جہاں سے انہوں نے تحریک پاکستان کا آغاز کیا۔

یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ چودھری صاحب بڑے مخلص حب قومی سے سرشار اور پُر جوش کارکن تھے۔ اگر وہ چاہتے تو اپنے دیگر ہم عصروں کی طرح واپس ہندوستان آکر پریکٹس کرتے اور خوب روپیہ کماتے۔ لیکن انہوں نے انتہائی ایثار اور قربانی کا ثبوت دیا اور ایک بلند پایہ مقصد کی خاطر اپنی پوری زندگی محنت. مشقت اور عسرت میں گذار دی۔ ہندو قوم میں ایسی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں کہ ہندو نوجوانوں نے امریکہ اور یورپ میں بیٹھ کر فقر و فاقہ کی زندگی بسر کی اور حالات نامساعد کے باوجود قومی خدمت کا کام جاری رکھا۔ مسلمانوں میں اس قسم کی مثالیں عنقا ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو چودھری رحمت علی حد درجہ تعریف و توصیف بلکہ تعظیم و تکریم کے مستحق ہیں۔

پاکستان کا لفظ چودھری صاحب کی ایجاد ہے. جسے پہلے پہل انہوں نے اپنے ایک انگریزی پمفلٹ میں استعمال کیا تھا، جو انہوں نے ۲۸ - جنوری ۱۹۳۳ء کو کیمبرج سے شائع کیا تھا۔ [۱] اس لفظ کی ترکیب پانچ حروف سے کی گئی تھی۔ پ برائے پنجاب - ا، برائے افغان یعنی شمال مغربی صوبہ سرحد - ک برائے کشمیر - س برائے سندھ - ستان برائے بلوچستان - اس طرح ہندوستان کے شمالی مغربی علاقے کو جہاں مسلمانوں کی اکثریت آباد تھی. چودھری رحمت علی نے پاکستان کا نام دیا تھا۔

کچھ عرصے بعد چودھری صاحب نے اس سکیم کو مزید وسعت دی اور بنگال اور آسام کو متحد کر کے بانگ اسلام کا نام دیا اور دعویٰ کیا کہ یہ بھی مسلمانوں کا قومی وطن ہو گا۔ پھر کچھ عرصے بعد انہوں نے برعظیم ہند کے ان مسلمانوں کے لئے بھی جداگانہ قومی مملکتوں کا

---

۱۔ اس پمفلٹ کا عنوان Now or Never تھا

دعویٰ کیا جو اپنے اپنے علاقوں میں اقلیت کی حیثیت سے آباد تھے۔ مثلاً حیدر آباد دکن کو ایک الگ مملکت کا نام دے کر اس کا نام عثمانستان رکھا۔ سی پی، بندیلکھنڈ، مالوہ، بہار، اڑیسہ، راجستان، بمبئی، مدراس، مغربی اور مشرقی لنکا کی مسلمان اقلیتوں کے لئے بھی جداگانہ مملکتوں کا مطالبہ کیا اور ان مملکتوں کے نام بالترتیب یہ تجویز کئے۔ صدیقستان فاروقستان، معینستان، ماپلستان، صافستان، ناصرستان۔

چودھری صاحب کی یہ سکیم قابل عمل تھی یا نہیں۔ اس سے بحث نہیں۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ وہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو خواہ وہ اقلیتی صوبوں میں آباد تھے یا اکثریتی صوبوں میں غیر مسلموں کی بالادستی سے آزادی دلوانا چاہتے تھے۔

## علی گڑھ کی سکیم

جس سکیم کو عرف عام میں علی گڑھ سکیم کہا جاتا ہے وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے دو پروفیسروں نے مرتب کی تھی۔ ایک ڈاکٹر سید ظفر الحسن تھے اور دوسرے ڈاکٹر افضال حسین قادری۔ سکیم کے شروع میں بطور تمہید یہ درج تھا کہ برعظیم ہند میں دو قومیں آباد ہیں یعنی ہندو اور مسلمان۔ مسلمان چونکہ ہر اعتبار سے ایک الگ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا انہیں اپنے لئے ایک قومی وطن درکار ہے۔ یہ قومی وطن کہاں ہونا چاہئے؟ اس سوال کا جواب علی گڑھ کے ان دو فاضل پروفیسروں نے یوں دیا تھا۔

برطانوی ہند کو ذیل کے تین خود مختار مملکتوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

۱۔ شمالی مغربی ہندوستان۔ جس میں پنجاب، شمالی مغربی صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو شامل کیا جائے گا۔

۲۔ بنگال سے ہوڑہ۔ مدناپور اور دارجیلنگ کے اضلاع خارج کر دیئے جائیں اور بہار کا ضلع پورنیہ اور آسام کا سب ڈویژن سلہٹ بنگال میں شامل کر کے ایک جداگانہ مملکت بنا دی جائے۔

۳۔ برطانوی ہند کا بقایا رقبہ ہندوستان کہلائے گا جو ایک بالکل علیحدہ مملکت ہو گا۔

ساتھ ہی ان فاضل پروفیسروں کو یہ فکر بھی لاحق تھی کہ مجوزہ ہندوستان میں جو مسلمان رہ جائیں گے ان کا مستقبل کیا ہو گا۔ اس سلسلہ میں یہ تجویزیں پیش کی گئی تھیں:

الف۔ ہندوستان میں دو نئے صوبے بنائے جائیں گے۔ ایک صوبہ دہلی کہلائے گا جس میں

دہلی۔ قسمت میرٹھ ۔ قسمت روہیل کھنڈ اور علی گڑھ کا ضلع شامل ہو گا۔ دوسرا صوبہ مالابار ہو گا جس میں مالا بار اور صوبہ مدراس کا متصل جنوبی علاقہ شامل ہو گا۔

ب۔ ہندوستان کے جن شہروں کی آبادی پچاس یا پچاس ہزار سے زیادہ ہے انہیں آزاد شہر (فری سٹی) کا مرتبہ دیا جائے گا۔

ج۔ ہندوستان کے جن دیہات میں مسلمان آباد ہیں۔ انہیں حتیٰ الوسع اکٹھا کر کے مختلف مقامات پر یک جا کیا جائے گا۔

د۔ مذکورہ بالا تین مملکتوں کی حدود کے اندر جتنی دیسی ریاستیں شامل ہیں، ان کا الحاق انہی مملکتوں سے کیا جائے گا۔ جو ریاستیں دو مملکتوں کی سرحد پر واقع ہیں انہیں اختیار ہو گا کہ جس مملکت کے ساتھ چاہیں اپنا الحاق کر لیں۔

ہ۔ حیدر آباد دکن کو برار اور کرناٹک کے صوبے واپس کر کے ایک جداگانہ خودمختار مملکت میں تبدیل کیا جائے گا۔

و۔ شمالی مغربی ہند کی مملکت میں قلات ۔ جموں و کشمیر ۔ بہاولپور ۔ خیرپور ۔ پٹیالہ ۔ جنید ۔ نابھہ ۔ کپورتھلہ ۔ مالیر کوٹلہ ۔ فرید کوٹ اور شملہ کی تمام پہاڑی ریاستیں شامل کی جائیں گی اور صرف یہی مملکت پاکستان کے نام سے موسوم ہو گی۔

## سر سکندر حیات خاں کی سکیم

سر سکندر حیات خاں بڑے تجربہ کار اور عملی سیاست دان تھے۔ وہ اپریل ۱۹۳۷ء سے پنجاب کے وزیر اعظم چلے آ رہے تھے۔ اس سے قبل پانچ سال حکومت پنجاب کی ایگزیکٹ کونسل میں ریونیو ممبر رہ چکے تھے۔ اور اس دوران میں انہیں دو مرتبہ پنجاب کے قائم مقام گورنر کی حیثیت سے کام کرنے کا بھی موقع ملا تھا۔ ۱۹۲۸ء میں جب سائمن کمیشن ہندوستان آیا تھا تو پنجاب کی لیجسلیٹو کونسل نے جدید اصلاحات کے بارے میں جو کمیٹی سائمن کمیشن کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے مقرر کی تھی، سر سکندر اس کے صدر تھے۔

وہ آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ (ورکنگ کمیٹی) کے رکن تھے اور مسلم لیگ نے جو کانسٹی ٹیوشن سب کمیٹی مقرر کی تھی، اس کے بھی ممبر تھے۔ ظاہر ہے لیگ کی اس سب کمیٹی کا مقصد ہی یہ تھا کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تجویز کردہ فیڈریشن کے جواب میں ہندوستان کے لئے ایک ایسا دستور وضع کرے جس سے مسلمانوں کے حقوق بدرجہ غایت محفوظ ہو سکیں۔

سر سکندر نے ایک سکیم مرتب کی تھی جو عام طور پر زونل[1] سکیم کے نام سے مشہور ہے۔ اور اسے ۳۰ - جولائی ۱۹۳۹ء کو اخبارات میں شائع کروا دیا۔ اور ساتھ ہی اسے ایک پمفلٹ کی صورت میں بھی طبع کروا کے لوگوں میں تقسیم کیا۔ سر سکندر کی بلند پایہ سیاسی شخصیت کے پیش نظران کی سکیم کو بہت اہمیت اور شہرت حاصل ہوئی تھی۔

اسی سکیم کی رو سے ہندوستان میں ایک ایسے فیڈریشن کے قیام کا خاکہ تجویز کیا گیا تھا جس میں سات عدد مختلف زون ہوں گے:

زون نمبر ۱: اس میں بنگال، آسام بنگال کی کی دیسی ریاستیں اور سکم کی ریاست شامل ہو گی۔ بنگال کے دو ایک ضلعے کاٹ لئے جائیں گے تاکہ یہ زون غیر معمولی طور پر وسیع نہ ہو جائے۔

زون نمبر ۲: اس میں بہار اور اڑیسہ شامل ہوں گے۔ بنگال کے جو دو، ایک اضلاع کاٹے جائیں گے انہیں اڑیسہ میں شامل کر دیا جائے گا۔

زون نمبر ۳: اس میں یوپی اور وہ جملہ ریاستیں جو یوپی کی حدود کے اندر موجود ہیں، شامل کی جائیں گی۔

زون نمبر ۴: اس میں مدراس - ریاست ٹراونکور - کورگ اور وہ جملہ ریاستیں جو احاطہ مدراس کی حدود میں موجود ہیں شامل کی جائیں گی۔

زون نمبر ۵: اس میں بمبئی، حیدر آباد، مغربی ہندوستان کی ریاستیں، احاطہ بمبئی کی ریاستیں، میسور اور سی پی (صوبجات متوسط) کی ریاستیں شامل ہوں گی۔

زون نمبر ۶: اس میں ریاست ہائے راجپوتانہ (بیکانیر اور جیسلمیر کو خارج کر کے) گوالیار، وسط ہند کی ریاستیں، بہار اور اڑیسہ کی ریاستیں اور صوبجات سی پی و برار شامل ہوں گے۔

زون نمبر ۷: اس میں پنجاب، سندھ، شمال مغربی صوبہ سرحد، کشمیر، ریاست ہائے پنجاب بلوچستان، بیکانیر اور جیسلمیر کے علاقے شامل ہوں گے۔

برعظیم ہند کو مذکورہ بالا سات مختلف منطقوں میں تقسیم کرنے کے بعد سر سکندر نے آگے چل کر قانون سازی - وزارت - انتظامی امور وغیرہ کے بارے میں چند تفصیلات پیش کی تھیں۔ مثلاً یہ کہ:

۱- ہر زون کی علیحدہ علیحدہ ایک لیجسلیٹو اسمبلی ہو گی جس میں برطانوی ہند اور ریاستوں کے

---

1. Outlines of a Scheme of India Federation

نمائندے شامل کئے جائیں گے۔

۲۔ مذکورہ بالا سات منطقوں کی مجالس قانون ساز میں جتنے نمائندے منتخب ہو کر آئیں گے. ان کو مجموعی طور پر باہم ملا کر مرکزی فیڈرل اسمبلی بنائی جائے گی۔ ان نمائندوں کی تعداد ۳۷۵ ہو گی۔

۳۔ فیڈرل اسمبلی کے ۱/۳ ممبر مسلمان ہوں گے۔

۴۔ ہر زونل اسمبلی میں کوئی مسودۂ قانون اس وقت تک پاس نہیں ہو سکے گا جب تک کہ اسمبلی کے ۲/۳ ممبروں کی تائید اسے حاصل نہ ہو۔

۵۔ مرکزی فیڈریشن کا سربراہ وائسرائے ہو گا جو ملک معظم کی نمائندگی کرے گا۔ اس کی کابینہ میں وزیر اعظم سمیت کم سے کم سات اور زیادہ سے زیادہ گیارہ وزیر ہوں گے۔

۶۔ وزیر اعظم اور دیگر وزراء کا انتخاب خود وائسرائے فیڈرل اسمبلی کے ممبروں میں سے کرے گا۔ لیکن اس قسم کا انتخاب کرتے وقت ذیل کی شرائط کو ملحوظ رکھنا ہو گا۔

الف۔ ہر زون کا کم سے کم ایک نمائندہ کابینہ میں ضرور شامل کیا جائے گا۔

ب۔ وزراء کی مجموعی تعداد میں کم از کم ۱/۳ مسلمان ضرور ہوں۔

ج۔ اگر وزراء کی مجموعی تعداد نو سے زیادہ نہ ہو تو کم از کم دو وزیر ریاستی نمائندوں سے ضرور لئے جائیں گے. اور اگر وزراء کی مجموعی تعداد نو سے زیادہ ہو تو کم از کم تین وزیر ریاستی نمائندوں میں سے لئے جائیں گے۔

د۔ بیس سال تک وائسرائے کو یہ اختیار ہو گا کہ چاہئے تو دفاع اور امور خارجہ کے لئے دو وزیروں کا انتخاب فیڈرل اسمبلی کے ممبروں میں سے کرے اور چاہے تو باہر سے دو آدمیوں کو نامزد کر دے۔ البتہ بیس سال کے بعد تمام وزراء فیڈرل اسمبلی کے انتخاب شدہ ممبروں میں سے لئے جائیں گے۔

ھ۔ مرکزی حکومت کا وزیر جو اپنے زون کے ممبروں کا اعتماد زائل کر دے گا کابینہ سے خارج کر دیا جائے گا۔

۷۔ ڈیفنس کا محکمہ ایک وزیر کے تحت ہو گا جس کی مدد کے لئے ایک مشاورتی کمیٹی کا تقرر کیا جائے گا۔ اس کمیٹی میں ذیل کے افراد شامل کئے جائیں گے.

وائسرائے (صدر) فیڈرل وزیر اعظم ۔ وزیرِ دفاع ۔ وزیرِ خارجہ ۔ وزیرِ مالیات ۔ وزیر مواصلات ۔ کمانڈر انچیف ۔ چیف آف جنرل سٹاف ۔ نیوی کا کوئی سینئر افسر ۔ ائیر فورس کا کوئی

سینئر افسر ۔ ہر زون کا ایک ایک نمائندہ ۔ محکمہ ڈیفنس کا سیکرٹری ۔ پانچ سرکاری اور غیر سرکاری ماہرین جنہیں وائسرائے اپنے اختیار خاص سے نامزد کرے گا۔

۸۔ وزیر خارجہ کی مدد کے لئے بھی اسی قسم کی ایک مشاورتی کمیٹی بنائی جائے گی جس میں وائسرائے سمیت چھ ممبر ہوں گے۔

۹۔ آئین میں ایسے کافی وشافی تحفظات رکھے جائیں گے جن سے اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت ہو سکے۔ برطانوی باشندوں کے خلاف نسلی منافرت نہ پھیل سکے۔ ریاستی معاہدوں کا احترام برقرار رہے۔ برطانوی ہند اور ریاستیں ایک دوسرے کے حقوق پر دست اندازی نہ کر سکیں۔

۱۰۔ ڈیفنس ۔ امور خارجہ ۔ مواصلات ۔ محصولات ۔ کرنسی کے محکمے مرکزی حکومت کی تحویل میں رہیں گے۔ اختیار مابقیٰ زونل اسمبلیوں کے پاس ہوں گے۔

۱۱۔ مرکزی فیڈرل اسمبلی کا صرف ایک ایوان ہو گا۔

۱۲۔ مرکز اور صوبوں میں ایسی با اختیار ہیئت حاکمہ مقرر کی جائے گی جو اقلیتوں کے حقوق کا خاطر خواہ تحفظ کر سکے۔

---

سر سکندر حیات خاں کا معاملہ ڈاکٹر سید عبد اللطیف، چودھری رحمت علی، میاں کفایت علی اور علی گڑھ کے دو پروفیسروں سے قطعی مختلف تھا۔ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کی اسی کانسٹی ٹیوشن سب کمیٹی کے ممبر تھے، جسے لیگ کی مجلس عاملہ نے خاص طور پر اس کام کے لئے مقرر کیا تھا کہ ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تجویز کردہ آل انڈیا فیڈریشن کے جواب میں کوئی موزوں دستور وضع کرے۔ سر سکندر کی اس حیثیت کا آئینی تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنی سکیم کو باضابطہ کانسٹی ٹیوشن سب کمیٹی میں پیش کرتے اور جو فیصلہ وہاں ہوتا اس کی پابندی کرتے۔

سر سکندر نے جو طرز عمل اختیار کیا وہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ انہوں نے اپنی سکیم کانسٹی ٹیوشن سب کمیٹی کے روبرو پیش کرنے کی بجائے اول اسے ہندوستان بھر کے اخباروں میں چھپوایا۔ دوم اسے ایک پمفلٹ کی صورت میں طبع کروا کے ہندوؤں، مسلمانوں اور انگریزوں میں تقسیم کیا، اور یہ سب کچھ انہوں نے کانسٹی ٹیوشن سب کمیٹی کی اجازت، علم آگہی کے بغیر کیا۔

میرے نزدیک سر سکندر کا یہ فعل ضابطے کے قطعی خلاف تھا۔ سکیم اچھی تھی یا بری ۔

اس کے کمزور پہلو کیا تھے اور مضبوط پہلو کون سے تھے۔ اس پر بحث کرنا بعد کی بات تھی۔ پہلا اور مقدم فرض ان کا یہ تھا کہ اپنی سکیم کانسٹی ٹیوشن سب کمیٹی کے سامنے پیش کرتے۔

سر سکندر نے اسی پر اکتفا نہیں کی۔ وہ مسٹر جناح سے چوری چوری اور مسلم لیگ کانسٹی ٹیوشن سب کمیٹی سے بالا بالا اپنی سکیم لے کر گاندھی جی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی۔ لیکن گاندھی جی نے ان سے نہایت توہین آمیز سلوک کیا۔ اس اجمال کی تفصیل ذیل میں بیان کی جاتی ہے:

آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ۲۔ جولائی ۱۹۳۹ء کو بمبئی میں مسٹر جناح کے مکان پر ہوا۔ ملک برکت علی اس اجلاس میں شرکت کے لئے بمبئی گئے۔ تو مجھے بھی ان کے ہمراہ جانا پڑا۔ ہم گرین ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ اتفاق سے ڈاکٹر محمد اشرف بھی بمبئی آئے ہوئے تھے اور گاندھی جی بھی ان دنوں وہیں مقیم تھے۔ ڈاکٹر اشرف کو میری آمد کا حال معلوم ہوا تو مجھ سے ملنے گرین ہوٹل میں تشریف لائے۔ اور کہنے لگے کہ گزشتہ رات سر سکندر حیات خاں نہایت راز داری کے ساتھ گاندھی جی سے بھنگی کالونی میں ملنے آئے تھے اور دو گھنٹے خدا جانے تخلیہ میں کیا باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے ڈاکٹر اشرف سے کہا کہ پنجاب کا وزیر اعظم آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں شرکت کے لئے بمبئی آیا ہے۔ اور اس کی آمد کی خبر بمبئی کے تمام اخباروں نے جلی حروف میں شائع کی ہے۔ تعجب ہے کہ وہ گزشتہ شب گاندھی جی سے ملنے بھنگی کالونی میں گئے اور اس واقعہ کی خبر اخباروں میں شائع نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر اشرف نے جواب دیا کہ یہ ملاقات بصیغہ راز ہوئی ہے اور اخباروں کو اطلاع تک نہیں ملی۔

شام کو ملک صاحب ورکنگ کمیٹی کے اجلاس سے فارغ ہو کر واپس آئے تو میں نے یہ واقعہ ان کے گوش گذار کیا اور یہ بھی عرض کیا کہ آپ مسٹر جناح سے اس کا ذکر ضرور کیجئے گا تاکہ وہ سر سکندر حیات خاں سے دریافت فرمائیں کہ وہ کیوں چوری چھپے گاندھی جی سے ملنے گئے تھے۔ ملک صاحب نے مسٹر جناح سے ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ جب تک یہ خبر باضابطہ اخباروں میں شائع نہ ہو میں محض ڈاکٹر اشرف کی روایت پر انحصار کر کے سر سکندر حیات خاں سے باز پرس نہیں کر سکتا۔ خیر، بات گئی گذری ہوئی۔

اس واقعہ کو پچیس سال گزر چکے تھے کہ پنڈت جواہر لال نہرو کے مکاتیب کا ایک مجموعہ شائع ہوا [1]، جو میری نظر سے بھی گذرا۔ اس میں صفحہ نمبر ۳۷۷ پر سردار ولبھ بھائی پٹیل کا ذیل کا خط

---

1. A Bunch of Old Letters

درج ہے:

بمبئی ۳ / جولائی ۱۹۳۹ء

مائی ڈیر جواہر! "سرالیس" پہلی تاریخ کو باپو سے ملنے آئے تھے اور ان سے اپنی زونل سکیم کا ذکر کرتے رہے۔ باپو نے "سرالیس" سے صاف کہہ دیا کہ مجھ سے اس سکیم کے جملہ پہلوؤں پر بات کرنے کا کچھ فائدہ نہیں کیونکہ راجندر بابو کا پیغام آیا ہے کہ اگر آپ اور آپ کے مسلم لیگی احباب فرقہ وارانہ مسئلہ حل کرنا چاہتے ہیں تو راجندر بابو اور کانگرس کے دوسرے لیڈروں سے جا کر گفتگو کیجئے۔ لیکن اس نوع کی گفتگو میں یہ بات قطعی ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ کوئی فریق کسی پہلو پر بھی اپنے آپ کو پابند کرنے کا مجاز نہیں ہو گا۔

"سرالیس" آج رات پھر آ رہے ہیں۔ لیکن بالکل بے سُود۔ ان کے آنے کا کچھ نتیجہ نہیں نکلے گا!"

سردار پٹیل کا یہ خط پڑھ کر بے اختیار نظیری کا یہ مطلع زبان پر آ گیا۔

رفتی بہ بزمِ غیر نکونامئی تو رفت
ناموسِ صد قبیلہ زیک خامئی تو رفت

## ۷

بلب رسید مرا آں سخن کہ نتواں گفت
بہ حیرتم کہ فقیہانِ شہر خاموشند

اس کتاب کے پانچویں باب میں پنجاب مسلم لیگ ریڈیکل پارٹی کے قیام اور مینی فیسٹو کا مفصل ذکر ہو چکا ہے اور یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ اس مینی فیسٹو کا ردعمل کیا ہوا تھا۔ یونینسٹ پارٹی ایک نہایت مضبوط و مستحکم جماعت تھی جسے سر سکندر حیات خاں اور چودھری چھوٹو رام کی سرپرستی حاصل تھی۔ صوبے کے تمام سرکاری حکام اور بیشتر اخبار اس کی پُشت پر تھے۔ سرمائے کی بھی اسے کچھ کمی نہ تھی۔ اس لئے محض مسلم لیگ ریڈیکل پارٹی کا مینی فیسٹو شائع کر دینا کافی نہ تھا۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے پلیٹ فارم سے بھی یونینسٹ پارٹی کے خلاف آواز بلند کی جاتی۔ بظاہر ایسا کرنا بے حد مشکل تھا۔ اول اس لئے کہ کونسل میں سر سکندر کے حامیوں کی اکثریت تھی اور ہندوستان کے تمام صوبوں کے مسلمان سر سکندر کو مسلم لیگی وزیر اعظم سمجھ کر دل و جان سے ان کے حامی تھے۔ دوم اس لئے کہ جو شخص بھی سر سکندر کے خلاف آواز اٹھاتا تھا اسے مسلم لیگی حلقوں میں یہ کہہ کر مطعون کیا جاتا تھا کہ یہ شخص سر سکندر کی وزارت تڑوا کر گویا پنجاب میں کانگرسی وزارت قائم کروانا چاہتا ہے۔

مصیبت یہ تھی کہ اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کو پنجاب کے حالات کا قطعاً کچھ علم نہیں تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ پنجاب اسمبلی میں کوئی مسلم لیگ پارٹی نہیں بنائی گئی تھی نہ انہیں یہ معلوم تھا کہ پنجاب میں کوئی صوبہ مسلم لیگ نہیں تھی۔ آرگنائزنگ کمیٹی ایک پھانسی کے پھندے کی طرح پنجاب کی گردن میں پڑی ہوئی تھی۔ جس نے ہماری تمام کوششوں کو بے جان و بے روح بنا رکھا تھا۔ سال بھر سے زیادہ مدت گزر چکی تھی۔ لیکن اس کمیٹی نے تمام صوبے میں مسلم لیگ کی ایک شاخ بھی قائم نہیں کی تھی۔ ان حالات میں سوائے اس کے اور کیا چارہ تھا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کو خوابِ غفلت سے جگا کر بتایا جاتا کہ اب پنجاب میں گویا مسلم لیگ کا جنازہ نکلنے والا ہے۔

چنانچہ غلام رسول خاں مرحوم کے مکان پر ایک مجلس مشاورت منعقد ہوئی جس میں یہ فیصلہ ہوا کہ ۲۷۔ اگست ۱۹۳۹ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا جو اجلاس دہلی میں ہو رہا ہے اس میں ذیل کی چار قرار دادیں پیش کی جائیں:

۱۔ چونکہ پنجاب مسلم لیگ آرگنائزنگ کمیٹی اپنے فرائض کی ادائیگی میں قطعاً ناکام رہی ہے۔ لہٰذا اسے فی الفور توڑ دیا جائے۔

۲۔ ازبسکہ سر سکندر حیات خاں آل انڈیا مسلم لیگ کی کانسٹی ٹیوشن سب کمیٹی کے ممبر ہیں۔ اس لئے ان کا فرض تھا کہ ہندوستان کے آئندہ آئین کے متعلق جو سکیم انہوں نے مرتب کی ہے، اسے کانسٹی ٹیوشن سب کمیٹی کے سامنے پیش کرتے۔ لیکن انہوں نے ایسا کرنے کی بجائے براہ راست یہ سکیم اخباروں میں طبع کروائی اور ایک پمفلٹ کی صورت میں چھپوا کر لوگوں میں تقسیم کی۔ ہر گاہ کہ ان کا یہ فعل مسلم لیگ کے مفاد کے خلاف ہے۔ لہٰذا ان کے خلاف ضابطے کی کارروائی کی جائے۔

۳۔ مسٹر جناح اور مرکزی اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی نے ۲۸۔ مارچ ۱۹۳۹ء کو انڈو برٹش تجارتی معاہدے کی مذمت کرتے ہوئے فیصلہ کیا تھا کہ رائے شماری کے وقت ہم غیر جانب دار رہیں گے۔ لیکن سر سکندر نے پنجاب اسمبلی کے ایوان میں بالکل اُلٹ روش اختیار کی اور انڈو برٹش تجارتی معاہدے کی کھلم کھلا حمایت کی۔ سر سکندر کا یہ فیصلہ مسلم لیگ کے مفاد کے خلاف تھا۔ لہٰذا ان کے اس فعل کی سرزنش کی جائے۔

۴۔ دسمبر ۱۹۳۸ء میں مسٹر جناح اور مرکزی اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی نے برطانوی حکومت کی قائم کی ہوئی سینڈ ھرسٹ کمیٹی میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن سر سکندر حیات خاں نے مسٹر جناح اور مرکزی اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کے اس فیصلہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سر شیر محمد خاں، نواب مظفر خاں اور نواب زادہ خورشید علی خاں کو سینڈ ھرسٹ کمیٹی کے ممبر نامزد کروا دیا حالانکہ یہ تینوں اصحاب آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے ممبر ہیں۔ ہر گاہ کہ سر سکندر کا یہ فعل مسٹر جناح اور مرکزی اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کے فیصلے کے صریحاً خلاف ہے۔ لہٰذا سر سکندر سے باز پرس کی جائے۔

مجلس مشاورت نے فیصلہ کیا کہ یہ چاروں قرار دادیں خود میں پیش کروں۔ میں نے بلا تامل یہ فیصلہ قبول کر لیا۔ اور آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری کو باضابطہ خط لکھ کر اطلاع دی کہ میں ۲۷۔ اگست ۱۹۳۹ء کو دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں یہ قراردادیں پیش

کروں گا۔ مہربانی فرما کر انہیں ایجنڈے میں شامل کر دیجئے گا۔

جب ایجنڈا شائع ہوا تو اس میں یہ چاروں قرار دادیں میرے نام کے ساتھ درج تھیں۔ سر سکندر حیات خاں کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ ان کی پنجاب کی رعایا کا کوئی فرد ان کے خلاف کبھی آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے پلیٹ فارم پر لب کشائی کی جرأت کر سکے گا۔ چنانچہ یونینسٹ پارٹی کے اکابر کا ایک اجتماع اس غرض سے شملہ میں ہوا کہ ملک برکت علی۔ غلام رسول خاں۔ زمان مہدی ۔ میاں عبدالعزیز۔ عاشق حسین بٹالوی وغیرہ نے چار قرار دادیں پیش کرنے کا جو فتنہ برپا کیا ہے اس کا مقابلہ کیونکر کیا جائے۔ چند روز بعد اخباروں میں یہ خبر بھی چھپی کہ سر سکندر حیات خاں اپنی جنگ لڑنے کے لئے خود بہ نفس نفیس کونسل کے اجلاس میں شریک ہوں گے اور اپنے مخالفوں کو کچل دیں گے۔

دو تین روز بعد روزنامہ زمیندار ۔ احسان ۔ انقلاب ۔ شہباز میں میرے خلاف گالیوں کا ایک طومار چھپنے لگا۔ ہندو اخبار چپ تھے۔ اور بظاہر تماشا دیکھ رہے تھے۔ صرف سول اینڈ ملٹری گزٹ اور انقلاب نے اس موضوع پر ادارتی نوٹ لکھے۔ سول نے ۱۵۔ اگست ۱۹۳۹ء کے پرچے میں لکھا:

"مسٹر عاشق حسین بٹالوی نے آل انڈیا مسلم لیگ کے آنے والے اجلاس میں سر سکندر حیات خان کے خلاف مذمت کی دو قرار دادیں پیش کرنے کا نوٹس دیا ہے ایک اس بناء پر کہ سر سکندر نے اپنی زونل فیڈریشن کی سکیم شائع کر کے مسلم لیگ کی پالیسی کی خلاف ورزی کی ہے۔ دوم اس بنا پر کہ سر سکندر نے انڈو برٹش تجارتی معاہدے کی حمایت کر کے مسلم لیگ کی پالیسی کی خلاف ورزی کا ارتکاب کیا ہے۔ معلوم نہیں مسٹر بٹالوی کو کس چیز یا کس شخص نے یہ قدم اٹھانے پر آمادہ کیا ہے۔

ہر سیاسی پارٹی، بالخصوص پارلیمنٹری پارٹی کے لئے، ڈسپلن کا ہونا بہت ضروری ہے۔ لیکن جو لوگ مسلم لیگ میں ڈسپلن قائم کرنے کے بڑے علم بردار ہیں انہیں کانگرس کی حالت بھی دیکھ لینی چاہئے کہ وہاں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ کانگرس کی ہائی کمان کو اپنی طاقت اور وسائل و ذرائع کی کثرت کے باوجود بنگال کے باغیوں کو راہ راست پر لانے میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے وہ آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے۔ کوئی ذی ہوش انسان یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کو، بحالات موجودہ

اپنی جماعت میں ڈسپلن قائم رکھنے کے لئے کانگرس سے زیادہ اختیار حاصل ہے۔

جو نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ مذمّت کی ان قرار دادوں کے نتیجے کا انحصار اس بات پر نہیں کہ پنجاب کے وزیر اعظم کی زوئل سکیم کی خامیاں اور خوبیاں کیا ہیں، یا یہ کہ انڈو برٹش تجارتی معاہدے کے متعلق ان کا رویہ مناسب تھا یا غیر مناسب۔ بلکہ اصل لُبِ لباب یہ ہے کہ انہوں نے مبینہ طور پر مسلم لیگ کونسل کو نظر انداز کر دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سر سکندر اور مسلم لیگ کونسل کے باہمی تعلقات کی آج تک تسلی بخش طریقے سے وضاحت نہیں کی گئی۔ اگر یہ قرار دادیں منظور ہو گئیں، اور کونسل کی بھی یہی خواہش ہوئی، تو شاید ان تعلقات کی وضاحت ہو سکے گی۔ بااین ہمہ مسٹر بٹالوی اور ان کے احباب کو چاہئے کہ ان قرار دادوں کو ان کے منطقی نتیجے تک پہنچانے سے قبل ذرا سوچ لیں اور غور کر لیں کہ ان قرار دادوں پر بحث کرنے اور رائے شماری کرنے سے فائدہ کس کو اور نقصان کس کو ہو گا!

اس وقت اگر پنجاب کے وزیر اعظم کے خلاف مذمّت کی قرار داد منظور ہو گئی تو کسی طور بھی مسلم لیگ کو فائدہ نہیں ہو سکتا اور نہ وزیر اعظم کو اس طرح نقصان پہنچنے کا احتمال ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ اگر مسلم لیگ نے مذمت کی یہ قرار داد منظور کر لی تو سکندر حیات خاں بطور یونینسٹ پارٹی کے وزیر اعظم کے پہلے سے بھی زیادہ مضبوط و مستحکم ہو جائیں، ظاہر ہے اس طرح پنجاب میں مسلم لیگ کو، جس کی حالت اس وقت سخت نازک ہے، نا قابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ اس کے برعکس اگر یہ مذمّت کی قرار دادیں مسترد کر دی گئیں تو مسلم لیگ کی حیثیت بہت کمزور ہو جائے گی۔ اندریں حالات یہ کہنا پڑتا ہے کہ مسٹر بٹالوی کی ان قراردادوں کا حشر چاہے کچھ ہو، سر سکندر کو ذاتی طور پر کچھ نقصان نہیں پہنچ سکے گا۔ اور اگر ان قرار دادوں پر بحث ہوئی تو لیگ کو بہرصورت یقیناً نقصان ہو گا۔ مسلم لیگ کونسل نے اگر ان نکتوں کو ملحوظ خاطر رکھا تو کوئی نہ کوئی ایسا راستہ تلاش کر لیا جائے گا جس سے ان دونوں قرار دادوں کو پس پشت

خاں ، سید افضال علی حسنی ، میر مقبول محمود ، میاں مشتاق احمد گورمانی ، سید امجد علی ، نواب مظفر خاں ، نواب زادہ خورشید علی خاں وغیرہ کی صورت میں یونینسٹ پارٹی کا ایک زبردست جتھا وہاں موجود تھا۔

سید نور احمد، پنجاب کے محکمہ اطلاعات (بیورو آف انفریشن) کے ڈائرکٹر تھے۔ اور سر سکندر حیات خاں کے نہایت معتمد علیہ آدمی تھے۔ انہوں نے عین ۲۷۔اگست ۱۹۳۹ء کی صبح کو لاہور کے چاروں مسلمان اخباروں یعنی زمیندار۔ انقلاب۔ احسان اور شہباز میں ذیل کا مراسلہ خود مرتب کر کے شائع کروایا۔

"لکھنؤ ۲۵۔اگست کانگرسی اصحاب اشتمال یہاں مسٹر عاشق حسین بٹالوی کی سرگرمیوں کا مطالعہ دلچسپی کے ساتھ کر رہے ہیں، مسٹر عاشق حسین بٹالوی لاہور کے ایک مستعد نوجوان ہیں اور وہ پنجاب مسلم لیگ کے اندر انتہاپسند جماعت منظم کر کے سر سکندر حیات خاں کو مسلمانان پنجاب کی رہنمائی کے منصب سے معزول کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ کانگرسیوں کی دلچسپی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ مسٹر بٹالوی کچھ عرصہ سے اپنے ارادوں کے متعلق ولایات متحدہ آگرہ واودھ کے سرکردہ مسلم کانگرسیوں کے ساتھ نامہ و پیام کرتے رہے ہیں اور اپنی تحریک کی کامیابی کے لئے ہاتھ پاؤں ہلاتے رہے ہیں۔

گذشتہ ماہ جون میں ڈاکٹر محمد اشرف کو جو یوپی کے سرکردہ مسلمان کانگرسی لیڈر ہیں، مسلمانان پنجاب کی جدید انتہاپسند پارٹی (پنجاب مسلم لیگ ریڈیکل پارٹی) کے منشور کی کاپیاں موصول ہوئیں، جن کے ساتھ اس کے آرگنائزر مسٹر عاشق حسین بٹالوی کا ایک ضمنی مکتوب بھی تھا۔

اس چھٹی کے متن سے یہ واضح ہوتا تھا کہ مسٹر عاشق حسین بٹالوی پنجاب میں ایک ایسی تحریک شروع کرنا چاہتے ہیں جس کی توسیع بعد میں دوسرے صوبوں میں بھی کی جائے۔ لیکن مالی مشکلات نے انہیں اور ان کے رفقاء کو اپنا پروگرام معرض عمل میں لانے سے روک رکھا ہے۔ اس مکتوب کا ایک پیراگراف یہ بھی ہے:

"اگر ہم کافی روپیہ حاصل کر سکنے کے قابل ہو گئے تو کامیابی یقینی ہے۔ میں پنجاب کا دورہ کرنا چاہتا ہوں تاکہ سر سکندر حیات خاں کی

پیش کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس پر لیگ کے نقطہ نگاہ سے بحث کرتے ہوئے یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان اسے قبول نہیں کر سکتے یا لیگ اسے قبول نہیں کر سکتی۔ لیکن اس بنا پر لیگ کے پلیٹ فارم سے سر سکندر کی مذمت بالکل ناقابل تصور ہے۔ تیسرے لیگ اگر کامل آزادی کی حامی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بیک جست کامل آزادی پر پہنچ جائے گی۔ اگر ملک میں کوئی ایسا دستور نافذ ہو جو لیگ کے نصب العین آزادی سے فروتر ہو تو کیا لیگ اس سے علیحدگی اختیار کر لے گی؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ مسلمانوں کے نفع اور نقصان کا اندازہ کرے گی۔ اگر اسے نفع زیادہ نظر آئے گا تو عملاً اسے قبول کرے گی اور اپنے حقیقی نصب العین کے لئے کوشاں رہے گی۔ جیسا کہ موجودہ صوبائی خود مختاری کے نظام میں کیا گیا ہے۔ لیکن یہ عمل اس کے نصب العین کے منافی نہ ہو گا۔ چوتھے سر سکندر کی سکیم میں بلاشبہ تمام متعلقہ عناصر کے اختلافات کو پیش نظر رکھتے ہوئے درجۂ مستعمرات پیش کیا گیا ہے۔ لیکن یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ کامل آزادی مطلوب نہیں بلکہ کامل آزادی کے مفہوم کی تائید کی گئی ہے۔ لہٰذا عاشق صاحب کا اخذ کردہ نتیجہ درست نہیں۔

رہا دوسرا امر، تو گذارش یہ ہے کہ سر سکندر لیگ والوں سے مشورے کے بعد یہ سکیم پیش کرتے تو بہتر ہوتا، لیکن اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ ان پر لیگ کے قواعد کی رُو سے ایسا کرنا ضروری تھا۔ لیگ کی فیڈریشن سب کمیٹی کے سامنے کئی سکیمیں ہیں بعض پہلے سے موجود تھیں۔ بعض سب کمیٹی کے بن جانے کے بعد پیش ہوئیں۔ سر سکندر کی سکیم کو بھی ان میں سے ایک سمجھ لیجئے۔ سر سکندر اگر لیگ کی فیڈریشن سب کمیٹی کے ممبر ہیں تو اس ممبری سے ان کا حق ترتیب سکیم کیونکر زائل ہو گیا۔ وہ اپنی سکیم پیش کر سکتے ہیں۔ اس کی تائید و حمایت میں دلائل دے سکتے ہیں۔ دوسری سکیموں کے نقائص بتا سکتے ہیں۔ ان کی مخالفت کر سکتے ہیں۔ البتہ وہ اکثریت کے فیصلے کے حامی ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر انہیں اکثریت کی حمایت حاصل نہ ہو گی اور ان کی سکیم رد ہو جائے گی، جب بھی وہ بدستور لیگ سے وابستہ رہیں گے۔ پھر مذمت کی علت کیا

ہے؟

عاشق صاحب کی یہ قرار داد سراسر ذاتی رنجش پر مبنی ہے۔ اور پنجاب کے لیگی اس رنجش کے بے جا اور غیر مناسب ہونے سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ باقی رہی سرسکندر کی سکیم تو اس کی مخالفت ہمارے نزدیک بھی ضروری ہے۔ اور اس پر سرسکندر کو یا کسی دوسرے شخص کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

سرسکندر سے میری کوئی ذاتی رنجش یا پرخاش یا عداوت نہیں تھی۔ ان سے میری ملاقات صرف آل انڈیا مسلم لیگ کونسل یا پنجاب مسلم لیگ آرگنائزنگ کمیٹی کے جلسے میں ہوتی تھی۔ وہ چھ سال پنجاب کے نہایت کامیاب وزیر اعظم رہے۔ ان کے مقربین نے ان کی نظر کیمیا اثر کے طفیل بے انتہا مالی فوائد اٹھائے۔ میں نے اس تمام عرصے میں کبھی ان سے اپنے لئے یا اپنے کسی عزیز کے لئے کسی نوع کی ذاتی درخواست نہیں کی تھی۔ حتیٰ کہ یونینسٹ پارٹی کے وہ لوگ بھی جو سرسکندر کے انتقال کے بعد دفعتہً کسی پراسرار طریقے سے مسلم لیگی بن کر سیاست کے اکھاڑے میں آکودے تھے، سرسکندر کی زندگی میں ان کے ایک اشارے سے گویا ذرّے سے آفتاب بن گئے تھے۔ مزید بر آں ملک برکت علی، غلام رسول خاں، زمان مہدی، میاں عبدالعزیز، پیر تاج الدین وغیرہ کے متعلق کیا ارشاد ہو گا۔ کیا ان کو بھی سرسکندر حیات خاں سے کوئی ذاتی رنجش تھی۔؟

جب ملک خضر حیات ٹوانہ کے خلاف ۱۹۴۴ء میں مسلم لیگ نے فرد قرار داد جرم مرتب کی تھی تو سب سے بڑے جرم دو عاید کئے گئے تھے۔ ایک یہ کہ انہوں نے سکندر جناح پیکٹ کی آڑ میں یونینسٹ پارٹی کی بالا دستی کو قائم رکھا۔ دوسرا یہ کہ انہوں نے پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی قائم نہ کی۔ سرسکندر نے اپنے شش سالہ عہد وزارت میں جس شدت، تواتر اور تسلسل سے ان دونوں سیاسی جرائم کا ارتکاب کیا تھا وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ پھر ان سے تعرض کیوں نہ کیا گیا؟ ستم ہے کہ ہم نے جب بھی ان کی اس پالیسی کے خلاف آواز بلند کی تو جواب میں یہ طعنہ دیا جاتا تھا کہ ہم یہ سب کچھ ذاتی رنجش کی بناء پر کر رہے ہیں۔

سول اینڈ ملٹری گزٹ نے اپنے ادارتی نوٹ میں جن اندیشوں کا اظہار کیا تھا وہ اپنی جگہ درست ہوں گے لیکن قومی جدوجہد میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ اس قسم کی پیش پا افتادہ مصلحتوں سے بے نیاز ہو کر منافقت کا پردہ چاک کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

ہو کر رہے گا عشق و ہوس میں کچھ امتیاز
آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

ڈاکٹر محمد اشرف آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے دفتر میں پولیٹیکل شعبے کے نگران تھے۔ اس سے قبل وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تاریخ کے پروفیسر تھے اور میرے پرانے دوست تھے۔ سیاسی عقائد کے اعتبار سے وہ نیم نیشنلسٹ نیم کمیونسٹ تھے۔ ہرچند کہ یونیورسٹی میں انہیں معقول تنخواہ ملتی تھی۔ لیکن وہ درس و تدریس کے ماحول سے نکل کر سیاسی کام کرنے کے خواہاں تھے۔ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں پنڈت جواہر لال نہرو کی چمک دمک اپنے عروج پر تھی جس سے بڑے بڑوں کی آنکھیں چندھیانے لگی تھیں۔ وہ کانگرس کے پلیٹ فارم پر ایک سوشلسٹ بن کر نمودار ہوئے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستان کی نژاد نو کی آنکھوں کا تارہ بن گئے تھے۔ ڈاکٹر اشرف بھی پنڈت نہرو کی کشش کا شکار ہوئے اور ۱۹۳۵ء میں یونیورسٹی کی ملازمت ترک کر کے آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے دفتر میں چلے گئے جہاں انہیں صرف پچھتر ۷۵ روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ ۱۹۳۹ء تک پہنچتے پہنچتے اشرف کانگرس سے برگشتہ خاطر ہو گئے تھے اور جب مسلم لیگ ریڈیکل پارٹی کا مینی فیسٹو شائع ہوا تو انہیں بہت خوشی ہوئی کہ اب مسلم لیگ سر سکندر حیات خاں جیسے لوگوں کے اثر سے آزاد ہو کر ایک عوامی ادارہ بن جائے گی۔

اس زمانے میں وہ اکثر مجھے خط لکھتے رہتے تھے۔ میں نے ان کو بارہا لکھا تھا کہ کانگرس سے مستعفی ہو کر مسلم لیگ میں آ جائیے۔ کیونکہ جب تک آپ جیسے قابل محنتی اور ایثار پیشہ لوگ لیگ میں نہیں آئیں گے لیگ عوام میں مقبول نہیں ہو گی۔ بدقسمتی سے سر سکندر حیات خاں کے حکم سے میری نجی خط و کتابت سرکاری طور پر سنسر ہوتی تھی۔ ڈاکٹر اشرف کے یہ خطوط بھی سنسر شپ کا شکار ہوئے۔ اور آگے چل کر میں بتاؤں گا کہ اس سنسر شپ نے کذب و افترا کا ایک طومار کھڑا کر کے مجھ سے کیونکر انتقام لیا۔

ملک برکت علی کی ذاتی ڈاک بھی سر سکندر حیات خاں سنسر کرواتے تھے۔ ملک صاحب پنجاب اسمبلی کے واحد مسلم لیگی ممبر تھے۔ ہائی کورٹ کے قابل ترین ایڈووکیٹ تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے رکن تھے۔ مسٹر جناح کے پچیس سال کے پرانے ذاتی دوست تھے اور آئین و قانون کا اس درجہ احترام کرتے تھے کہ اس دائرے سے ایک قدم باہر رکھنا انہیں منظور نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان کے نجی خطوط سنسر کئے جاتے تھے۔

۲۷ ر اگست ۱۹۳۹ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس دہلی کے ٹاؤن ہال میں ہوا۔ سر سکندر حیات خاں تشریف نہیں لائے تھے۔ البتہ میاں احمد یار خان دولتانہ، راجہ غضنفر علی

ڈالا جا سکے۔"

"سول اینڈ ملٹری گزٹ" ایک نیم سرکاری اینگلو انڈین اخبار تھا جس کی پالیسی چاہے کچھ ہو لیکن یہ ایک تسلیم شدہ امر تھا کہ وہ نہایت سنجیدہ، باوقار اور ذمہ دار اخبار تھا جس کی رائے کو سیاسی اور صحافتی حلقوں میں احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ سول نے اپنے مندرجہ بالا اور ادارتی نوٹ میں جن اندیشوں کا اظہار کیا ہے ان پر بحث آگے چل کر کروں گا۔ سردست ذیل میں روزنامہ انقلاب مورخہ ۱۳۔ اسبت ۱۹۳۹ء کا ایڈیٹوریل نوٹ نقل کیا جاتا ہے:

"سر سکندر کی سکیم کے متعلق ہمارے خیالات وافکار قارئین کرام سے مخفی نہیں ہیں۔ واقعات سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ اس سکیم سے مسلمانوں کی حالت میں کوئی خوش آئند تغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔ ان کے حقوق قطعاً محفوظ نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا مسلمان اسے قبول نہیں کر سکتے۔ لیکن اس ضمن میں بعض نام نہاد لیگیوں نے عجیب و غریب روش اختیار کر لی ہے۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ سر سکندر کے خلاف عناد کا زہر ٹپکانے کا ایک اچھا موقع ہاتھ آگیا ہے۔ لہٰذا اس سے پورا فائدہ اٹھانا چاہئے۔ اس سلسلے کی ایک کڑی عاشق حسین صاحب بٹالوی کی ایک قرار داد ہے جو ٹربیون وغیرہ میں شائع ہوئی ہے۔

اس میں سر سکندر کے خلاف دو باتیں پیش کی گئی ہیں۔ اوّل یہ کہ انہوں نے اپنی سکیم میں درجہ مستعمرات پیش کیا درآنحالیکہ لیگ آزادئ کامل کی حامی ہے۔ دوم یہ کہ سر سکندر لیگ کی فیڈریشن سب کمیٹی کے ممبر تھے اور انہیں سب کمیٹی کے ممبروں سے مشورہ کئے بغیر اپنی سکیم شائع نہیں کرنی چاہئے تھی۔

لیکن سوال یہ ہے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی ہے جس سے ثابت ہو کہ سر سکندر نے لیگ کے کسی قاعدے کی خلاف ورزی کی؟ درجہ مستعمرات کا مفہوم ملکی معاملات پر کامل اقتدار ہے۔ (سر سکندر کی تجویز صفحہ ۵) اور اس مفہوم کو پیش نظر رکھتے ہوئے درجۂ مستعمرات اور کامل آزادی میں اصلاً فرق نہیں رہتا۔ دوسرے یہ سکیم نہ لیگ کی طرف سے پیش ہوئی نہ مخصوصاً لیگ کے لئے پیش ہوئی بلکہ مختلف عناصر کے امیال و عواطف کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے بدل کے طور پر

عدم موجودگی میں مسلمانوں کا اعتماد حاصل کر سکوں۔ سر سکندر اکتوبر ۱۹۳۹ء تک شملہ میں رہیں گے۔ "

ڈاکٹر محمد اشرف پنجاب کی اس تحریک کو زیادہ مالی امداد پہنچا نہ سکتے تھے۔ تاہم انہوں نے وعدہ کیا کہ مناسب وقت آنے پر اس کے لئے سرمایہ جمع کر دیا جائے گا۔ اس اثناء میں ڈاکٹر صاحب نے مختلف صوبوں کے ان اکابر کو جن سے اس انتہا پسندانہ تحریک کی اعانت کی امید ہو سکتی تھی خط لکھے۔ ان مکتوب الیہم میں روزنامہ الہلال بمبئی کے ایڈیٹر صاحب بھی تھے۔ ان مکاتیب میں اس امر واقعہ کو واضح کر دیا گیا تھا کہ اس قسم کی تحریکوں کے لئے پنجاب نتیجہ خیز زمین نہیں ہے کیونکہ اس صوبے کے جرائد و جمہور سر سکندر حیات خاں کی جماعت کے زیر اثر ہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ انتہا پسندانہ تحریک کو دوسرے صوبوں میں بھی شروع کر دیا جائے۔ بالخصوص بمبئی اور سی پی میں کام کی ابتداء ہو جائے تاکہ آئندہ ماہ اکتوبر تک آل انڈیا مسلم لیگ ریڈیکل پارٹی کی کانفرنس کا انعقاد ہو سکے۔ ہمارے بعض دوستوں نے ان فرائض کی تکمیل کے لئے اخبار پرچم بھی جاری کیا ہے۔ آپ حضرات کا فرض ہے کہ آپ اس اخبار کو ہر دل عزیز بنائیں اور اس کے لئے خریدار پیدا کریں۔

اس نامہ و پیام کے بعد اس انتہا پسندانہ تحریک کے متعلق پنجاب یا دوسرے صوبوں کے اسلامی حلقوں میں کوئی چرچا نہیں ہوا۔ تاہم یقین کیا جاتا ہے کہ تحریک کے مخترعین ہنوز اپنی کوششوں سے مایوس نہیں ہوئے۔ "

"اخباری تار"

زمیندار۔ احسان۔ انقلاب اور شہباز نے اس مراسلہ کے اوپر جلی حروف میں جو سرخیاں جمائیں وہ بھی ملاحظہ فرمایئے:

"سر سکندر حیات خاں کو مسلمانان پنجاب کی رہنمائی کے منصب سے معزول کر دینے کا سودا"

"یوپی کے مسلمان کانگرسیوں کے ساتھ عاشق حسین بٹالوی کی ساز باز

!"

"پنجاب سے مایوس ہو جانے کے بعد دوسرے صوبوں میں غوغا آرائی کا پروگرام۔"

تعجب ہے کہ سید نور احمد یہ مراسلہ ہندوستان بھر کے کسی اور اردو یا انگریزی اخبار میں نہ چھپوا سکے۔حتیٰ کہ پنجاب میں بھی صرف زمیندار۔ انقلاب۔ احسان اور شہباز ہی میں شائع ہوا جو اپنی بقا کے لئے کلیتہً سر سکندر کے دست نگر تھے۔ سید نور احمد صاحب ان اخباروں کے کئی سو پرچے اپنے ہمراہ لے کر ۲۷-اگست کی صبح کو دہلی پہنچے، انہوں نے میرے سامنے یہ پرچے ایک ایک کر کے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے تمام ممبروں میں تقسیم کئے اور یوں اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی سے بہ عزت و آبرو سرخرو ہوئے۔سید نور احمد صاحب نے بس اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ باقاعدہ کونسل کے اجلاس میں بھی شریک ہوئے اور شروع سے آخر تک آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے ارکان میں بڑے ٹھسے سے تشریف فرما رہے۔ حالانکہ حکومت پنجاب کے ایک سرکاری ملازم کی حیثیت سے ان کا یہ فعل سراسر خلاف قانون تھا۔

۲۷ر اگست کو چونکہ کونسل کا اجلاس ہونے والا تھا۔ اس لئے ملک برکت علی ۲۶- کی شام کو مسٹر جناح سے ملنے گئے اور مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ ظاہر ہے وہاں ان چار قرار دادوں کا ذکر ہونا ضروری تھا۔ مسٹر جناح قدرے متفکر تھے۔ انہوں نے پوچھا کہ کل اگر سر سکندر کے خلاف ضابطے کی کارروائی کی گئی تو کیا وہ کانگرس کے کیمپ میں تو نہیں چلے جائیں گے۔ ملک صاحب نے جواب دیا کہ آپ اطمینان رکھئے وہ کبھی کانگرس میں نہیں جا سکتے۔ لیگ کو چھوڑ جائیں تو چھوڑ جائیں کانگرس میں کبھی نہیں جائیں گے۔ یہ سن کر مسٹر جناح نے مجھ سے کہا کہ کل صبح اپنی قرار دادیں پیش کرو۔

۲۷ر اگست کو باقاعدہ میں نے قرار دادیں پیش کیں۔ جلسے میں سخت ہنگامہ ہوا۔ یونینسٹ پارٹی کے جتھے نے بر سر اجلاس مجھے کھڑے ہو کر گالیاں دیں۔ بہر حال اس ردّ و کد کا نتیجہ یہ نکلا کہ پنجاب مسلم لیگ آرگنائزنگ کمیٹی کے بارے میں جو قرار داد پیش کی گئی تھی وہی منظور ہو سکی۔ اور فیصلہ کیا گیا کہ اگر ۱۵-نومبر ۱۹۳۹ء تک پنجاب میں کوئی صوبائی مسلم لیگ قائم نہ ہوئی تو آرگنائزنگ کمیٹی کا وجود خود بخود ختم ہو جائے گا۔ باقی تین قرار دادوں کے متعلق ایوان نے فیصلہ کیا کہ چونکہ سر سکندر حیات خاں خود جلسے میں موجود نہیں ہیں، لہٰذا یہ قرار دادیں آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے حوالے کی جاتی ہیں کہ وہ سر سکندر کا جواب سن کر اپنی رائے سے کونسل کو مطلع کرے۔

دہلی کا اجلاس کہنے کو تو ختم ہو گیا لیکن اب مجھے واپس لاہور جا کر اس عذاب کا سامنا کرنا تھا جو صوبے کے سب سے طاقت ور، ذی اقتدار اور صاحب حکومت و سطوت شخص کی عداوت مول لے کر مجھ پر نازل ہو سکتا تھا۔ زمیندار، انقلاب، احسان اور شہباز میں اس بات کا باہمی مقابلہ ہو رہا تھا کہ مجھے زیادہ سے زیادہ گالیاں کون اخبار دے سکتا ہے۔ محکمہ اطلاعات کے ڈائرکٹر اور پریس برانچ کے سپرنٹنڈنٹ کے درمیان بھی مقابلہ جاری تھا کہ دونوں میں سے کون میرے خلاف زیادہ سے زیادہ مواد اخباروں کو مہیا کر سکتا ہے۔

جو کچھ اس زمانے میں ان چار اخباروں نے میرے خلاف لکھا اور جس جس طرح میری سات پشتوں کے عیب نکالے اس کی داستان اس قدر طویل ہے کہ چاہوں بھی تو بیان کرنے سے عاجز ہوں۔ میرا قصور تھا کیا؟ صرف یہ کہ میں مسلم لیگ کا ایک کارکن تھا اور چاہتا تھا کہ پنجاب میں جلد از جلد ایک پراونشل مسلم لیگ قائم ہو۔

روزنامہ احسان کے مدیر شہیر میرے دوست تھے لیکن اس آزمائش کے وقت سب دوستیاں اور محبتیں ختم ہو گئی تھیں۔ ان پر ہر لحہ پریس برانچ کے سپرنٹنڈنٹ صاحب کا تازیانہ برستا تھا کہ اور لکھو۔ بار بار لکھو۔ جی کھول کر لکھو اور جس قدر گالیاں دے سکتے ہو دو۔ چنانچہ روزنامہ احسان نے اپنے ۳۱۔ اگست ۱۹۳۹ء کے پرچے میں یہ مقالہ افتتاحیہ لکھا۔

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

دروغ بر گردن راوی

کان سنتے ہیں مگر آنکھ گنہگار نہیں

کہ عاشق صاحب نے سر سکندر کو نیچا دکھانے کی غرض سے ڈاکٹر اشرف سے ساز باز کی اور اس مقصد کے لئے ان سے روپیہ مانگا۔ کانگرسی حلقوں سے اس خبر کی تردید نہیں ہو سکی۔ البتہ کانگرس نواز اخباروں نے یہ ضرور لکھا کہ اگر مسلم لیگ جیسی فرقہ پرست جماعت کے خلاف پراپیگنڈا کرنے کی غرض سے عاشق بٹالوی صاحب نے روپیہ مانگا بھی تو کیا گناہ کیا؟ یعنی عاشق صاحب کے گناہ پر پردہ ڈالنے کے لئے انہوں نے گناہ سے بھی بدتر عذر پیش کیا۔

سر سکندر کو انہوں نے نیچا کہاں دکھانا چاہا۔ ایک ہی میدان تھا۔

مسلم لیگ پنجاب میں سرسکندر کی پوزیشن ان کی بشری کمزوریوں کے باوجود بہت بلند ہے۔ لیکن جمہوریت کا ایک کمال یہ بھی ہے اور اسلام کی ایک برکت یہ بھی ہے کہ

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

چنانچہ اسلامی جماعت کے سامنے عاشق صاحب نے سرسکندر کے خلاف تجاویز پیش کیں اور اسلام اور جمہوریت نے انہیں مساوات کا جو حق دیا تھا اسے تخریبی مقصد کے لئے استعمال کیا۔ لیکن تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ انہوں نے بھانپ لیا کہ یہ جوش و خروش جماعتی کم اور ذاتی زیادہ ہے۔ پھر بھی انہوں نے جو جواب دیا سراسر جماعتی اصول کے مطابق تھا۔

عاشق صاحب گھبرائے نہیں۔ انہوں نے ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری تجویز پیش کی اور کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا کہ وہ سرسکندر کے خلاف دل کا بخار نہ نکالیں۔ لیکن عاشق کی تقدیر میں شروع سے جو نامرادی لکھی ہوئی ہے اس نے عاشق صاحب کا پیچھا یہاں بھی نہ چھوڑا اور وہ اپنی تمام تجاویز سمیت ناکام و نامراد رہے۔
اب ان کے خلاف لے دے قدرتی ہے۔ آخر کس برتے پر تتا پانی۔ ساز باز دہریوں سے اور دو دو ہاتھ مسلمانوں سے۔ یہ کب تک۔ اور مسلمان عاشق صاحب کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ ادھر مسلم لیگ کے کوچے سے بے آبرو ہو کر نکلتے وقت عاشق صاحب اس شعر کی تفسیر بنے ہوئے تھے:

طعنہ کم تر زن حرم جویان رہ گم کردہ را
ایں علامت بس کہ ما راہِ حرم گم کردہ ایم

اب عاشق صاحب کے ساتھ وہی کچھ ہو گا جو انہوں نے بے جا طور پر سرسکندر کے ساتھ کرنا چاہا۔ اور سرسکندر چونکہ بے لوث تھے اور الزام غلط اس لئے بچ گئے۔ لیکن عاشق صاحب کا لیگ کے احتساب سے

بچتا ذرا کارِ دارد۔ ان پر ساز باز کا جو الزام ہے اس کی تردید نہیں ہوئی۔ ان کی طرف سے نہ ڈاکٹر اشرف کی طرف سے۔ پھر انہوں نے اس مقصد کے لئے جو کچھ کیا۔ اس کا انکار وہ نہیں کر سکتے تو کیا وہ پاداش عمل سے بچ رہیں گے؟

مسلم لیگ یا سر سکندر نے اگر عاشق صاحب کے خلاف کوئی قدم محض انتقامی طور پر اٹھایا تو یقیناً ان کی مذمت کی جائے گی۔ لیکن اگر تحقیق کے بعد عاشق صاحب کی خطا ثابت ہوئی اور انہیں کوئی مناسب سزا دی گئی تو اس کے لئے لیگ کی تعریف ہوگی۔ ہماری ناقص رائے اس بارے میں یہ ہے کہ کیچڑ اچھالنے سے کوئی فائدہ نہیں عاشق صاحب کی نامرادی بجائے خود ان کے لئے بہت بڑی سزا ہے۔ اور اس راز کا انکشاف کہ انہوں نے ساز باز کی بجائے خود اس حزم و احتیاط کا تقاضا کرتا ہے کہ ایسے نوجوانوں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے اب تحقیق و تفتیش کو نظر انداز کر کے مسلم لیگ کو صرف اس پر اکتفا کر لینی چاہئے کہ اگر عاشق صاحب اعتراف خطا کے بعد شرح صدر کے ساتھ مسلمانوں سے معافی مانگیں تو اسے منظور کرے۔ سر سکندر سے معافی چاہنے کی ضرورت نہیں۔ وہ قوم کا ایک فرد ہیں اور قوم سے معافی میں سب کچھ آ گیا۔ اور اگر عاشق صاحب اس پر آمادہ نہ ہوں تو پھر ضروری کارروائی کی جائے تاکہ آئندہ اس قسم کے واقعات کا سدباب ہو سکے۔"

یہ مقالہ افتتاحیہ محض ایک نمونہ ہے جس سے اس طوفان بے تمیزی کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے جو پنجاب کی یونینسٹ وزارت نے میرے خلاف برپا کیا۔ میں نے حقیقت حال کی وضاحت کے لئے دو بیان اخباروں کو دیئے لیکن کسی اخبار نے بھی کوئی بیان شائع نہ کیا۔

۳۱ راگست ۱۹۳۹ء کو ڈاکٹر محمد اشرف کا الہ آباد سے ایک خط آیا جس کا بلاک نیچے شائع کر رہا ہوں:

Office-bearers for 1939
President:
Rajendra Prasad
Treasurer:
Jamnalal Bajaj
General Secretary:
J. B. Kripalani

अखिल भारतीय कांग्रेस कमेटी
स्वराज भवन, इलाहाबाद
آل انڈیا کانگریس کمیٹی
سوراج بھون۔ الہ آباد
ALL INDIA CONGRESS COMMITTEE
SWARAJ BHAWAN, ALLAHABAD

Telephone: [illegible]
Telegrams: "Congress"
Ref.

31/8/39

Dear Ashiq

True to their characteristics the Unionists are now trying to slander & defame you in connection with my correspondence. The best reply will be to publish my letters & file a suit for defamation. This will further expose the Unionist Govt. Censorship of personal correspondence of League members who happen to be progressive. I am proceeding to Amritsar for Dr. Kitchlew's election for 3 weeks & shall be there from 8 Sept. onwards. It is not fair for me to enter this controversy.

Yours with affectionate Regards,

Ashraf

۱۹۳۹ء کے آخر میں ڈاکٹر اشرف کانگرس سے بالکل علیحدہ ہو گئے۔ انہوں نے ۲۲۔ دسمبر ۱۹۳۹ء کو اس موضوع پر جو خط مجھ کو دہلی سے لکھا تھا اس کی چند سطریں نیچے درج کرتا ہوں:

"ڈیئر عاشق! عجب آدمی ہو۔ بجز میرے دنیا بھر سے ملنے کا قصد رکھتے ہو بلکہ سفر بھی کرتے رہتے ہو اور لطف یہ ہے کہ رسوائی بڑی حد تک میری وجہ سے ہے۔ تو پھر آپ دیانت داری سے اس سازش کو کم از کم ذاتی ملاقاتوں کا موقع دے کر ہی پورا کیجئے۔

جی ہاں! آپ کا خط ملا بلکہ سخت غصہ آیا۔ اس لئے کہ خط الہ آباد آیا اور میں تین ہفتے دہلی میں جناب کے راستے میں ڈیرہ ڈالے پڑا تھا۔ اور خطوں سے معلوم ہوا کہ جناب دہلی سے بمبئی جاتے ہوئے گزرے۔ خاصی شاعری ہو گئی۔

اچھا لیجئے سنئے۔ میں خود بد نامی کے مواقع ختم کر رہا ہوں۔ میں پہلی جنوری سے باضابطہ اور سرکاری طور پر اس دفتر سے علیحدہ ہو رہا ہوں. بلکہ خود الہ آباد سے کنارہ کش ہو رہا ہوں تاکہ آپ کے دشمنوں کو آئندہ سازش کا الزام رکھنے کا موقع نہ ملے۔ کم از کم اس حیثیت سے الزام عائد نہ ہو کہ کانگرس کا ایک دفتری اس میں شریک ہے۔"

ڈاکٹر محمد اشرف کا انتہائی تنگ دستی اور عُسرت کے عالم میں جون ۱۹۶۲ء میں برلن میں انتقال ہوا جہاں وہ مدت سے مقیم تھے۔ ان کی وفات پر مولانا صلاح الدین احمد مرحوم و مغفور نے اپنے رسالہ "ادبی دنیا" میں ایک بڑا درد انگیز مقالہ لکھا تھا جس کا یہ فقرہ میں کبھی نہیں بھول سکتا:

"انہوں نے پردیس میں اپنی جان ناشکیبا جان آفرین کے حوالے کر دی۔"

ڈاکٹر اشرف کے صرف جان ہی ناشکیبانہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ مدت سے ایک کٹا ہوا سر اپنے کندھوں پر لئے پھرتے تھے جسے بالآخر انہوں نے اتار کر پھینک دیا۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اگست ۱۹۳۹ء میں ایک اور اہم واقعہ پیش آیا۔ پنجاب اسمبلی میں قسمت ملتان کے مسلمانوں کے شہری حلقے کی نشست خالی ہو گئی تھی جس کا ضمنی انتخاب ہونے والا تھا۔ یونینسٹ پارٹی نے اس کے لئے خان صاحب شیخ محمد امین بیرسٹرایٹ لاء کو کھڑا کیا تھا۔ جب سے سکندر جناح پیکٹ ہوا تھا پنجاب میں مسلمانوں کی متعدد نشستوں کے لئے ضمنی انتخاب ہو چکے تھے۔ لیکن سر سکندر نے کسی ضمنی انتخاب میں مسلمان امیدوار کو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑا نہیں کیا تھا۔ حالانکہ سر سکندر جناح پیکٹ کی ایک ضروری شق یہ بھی تھی کہ تمام ضمنی انتخاب مسلم لیگ کے ٹکٹ پر لڑے جائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی ہی نہیں بنائی گئی تھی تو لیگ کے ٹکٹ پر الیکشن کیونکر لڑے جا سکتے تھے۔

پنجاب میں پرانا مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ بدستور موجود تھا جو علامہ اقبالؒ کی صدارت کے زمانے میں قائم کیا گیا تھا۔ آئینی لحاظ سے اس بورڈ کو سکندر جناح پیکٹ بھی اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکا تھا۔ میاں عبدالعزیز بیرسٹرایٹ لاء اس کے صدر تھے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ اس ضمنی انتخاب میں ملک زمان مہدی خاں کو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑا کیا جائے گا۔ ملک صاحب بخوشی تیار ہو گئے۔

حلقہ انتخاب میں ملتان، جھنگ۔ منٹگمری۔ لائل پور۔ چنیوٹ۔ اوکاڑہ وغیرہ کا قصباتی علاقہ شامل تھا۔ خاں صاحب شیخ محمد امین سے میرے اچھے دوستانہ تعلقات تھے۔ وہ ضلع جھنگ کے رہنے والے تھے۔ اور مسلسل کئی سال جھنگ میں پریکٹس کرنے کے بعد ہائی کورٹ میں کام کرنے کے لئے لاہور تشریف لے آئے تھے۔ ملک زمان مہدی خان، اپنے زمانہ ملازمت میں ملتان اور منٹگمری میں بڑے نیک نام ڈپٹی کمشنر رہ چکے تھے۔ اور وہاں کے لوگوں میں بڑی عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ جب ۱۹۳۶ء میں علامہ اقبال پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے صدر تھے تو علامہ مرحوم کی خواہش پر ملک زمان مہدی خاں کو پراونشل لیگ کا ڈپٹی پریذیڈنٹ منتخب کیا گیا تھا۔ علامہ مرحوم ملک زمان مہدی خاں کے اس قدر مداح تھے کہ وہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کی صدارت سے مستعفی ہو کر یہ بلند منصب ملک زمان مہدی خاں کے حوالے کرنے کو آمادہ ہو گئے تھے۔

ملک صاحب نے باقاعدہ ٹکٹ کے لئے پنجاب مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کو درخواست دی اور بورڈ نے ایک باضابطہ جلسے میں فیصلہ کیا کہ ٹکٹ ملک صاحب کو عطا کیا جائے۔ جونہی اخباروں میں یہ اعلان ہوا کہ ملک زمان مہدی خاں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہو رہے ہیں

سر سکندر حیات خاں اور نواب شاہنواز خاں والئی ممدوٹ سخت پریشان ہوئے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ مسلم لیگی کارکنوں کا یہ حقیر سا گروہ جسے وہ اپنی دانست میں ایک لاشۂ محض سمجھ کر نظر انداز کر چکے تھے پنجاب میں پھر سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر اپنا امیدوار کھڑا کر کے یونینسٹ پارٹی کے طلسم کو پاش پاش کر دے گا۔

سر سکندر اور نواب ممدوٹ بھاگے بھاگے مسٹر جناح کی خدمت میں دہلی حاضر ہوئے کہ خدا کے واسطے ہمارا بھرم قائم رکھیے اور ملک زمان مہدی کو حکم دیجئے کہ دست بردار ہو جائیں۔ اتفاق ملاحظہ فرمایئے کہ جس دن سر سکندر اور نواب ممدوٹ دہلی پہنچے اسی دن ملک زمان مہدی خاں۔ میاں عبدالمجید بیرسٹرایٹ لاء اور غلام رسول خاں بھی وہاں پہنچ گئے۔ اور سر سکندر اور نواب ممدوٹ سے پہلے جا کر مسٹر جناح سے ملے۔ انہوں نے گزشتہ دو سال کے واقعات کا خلاصہ بیان کیا کہ نہ پنجاب میں کوئی پراونشل مسلم لیگ ہے نہ اسمبلی میں کوئی مسلم لیگ پارٹی بنائی گئی ہے۔ نہ ضمنی انتخاب لیگ کے ٹکٹ پر لڑے جاتے ہیں۔ آخر اس ڈھونگ کو کب تک قائم رکھا جائے گا۔ وقت آگیا ہے کہ اس فریب کا پردہ چاک کیا جائے۔ مسٹر جناح نے فرمایا کہ میں اس جھگڑے میں دخل نہیں دوں گا۔ جاؤ جس طرح جی چاہتا ہے الیکشن لڑو۔

ہمارے لئے یہ قیمتی موقع تھا کہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر لوگوں کو سمجھائیں۔ کہ سر سکندر حیات خاں اور ان کے حواریوں نے سکندر جناح پیکٹ کی آڑ میں پنجاب میں لیگ کو ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ اب عوام کو مسلم لیگ کے نام پر بیدار ہو کر یونینسٹ پارٹی کے ٹولے کو زیر و زبر کرنا چاہئے۔ چنانچہ ہم نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا اور جگہ جگہ جلسے کئے۔ گرمیوں کا موسم تھا لیکن اس کے باوجود سر سکندر خود شملہ سے چل کر لاہور آئے اور ملتان۔ منٹگمری۔ لائل پور وغیرہ کا دورہ کیا۔ راجہ غضنفر علی خاں۔ نواب ممدوٹ۔ سید افضال علی حسنی وغیرہ بھی حلقۂ انتخاب میں گھومتے پھرتے رہے۔ لیکن انہیں کسی پبلک جلسے میں تقریر کرنے یا براہ راست عوام سے خطاب کرنے یا ہمارے روبرو آ کر اپنا نقطۂ نگاہ پیش کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ وہ صرف یہ کرتے تھے کہ ہر ضلع کے ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر ٹھہرتے اور وہیں سرکاری افسروں کو بلا کر تاکید کرتے تھے کہ ووٹ خاں صاحب شیخ محمد امین کے لئے حاصل کئے جائیں۔

ملک زمان مہدی خاں یقیناً اس الیکشن میں کامیاب ہو جاتے لیکن ایک مشکل یہ پیش آئی کہ ملتان کے سید سیف الدین شاہ گیلانی بھی کھڑے ہو گئے۔ اور ملتان کے ووٹوں

کا وہ حصہ جو لازماً ملک صاحب کو ملنا چاہئے تھا سید سیف الدین شاہ گیلانی لے گئے۔ بااین ہمیں جب الیکشن کا نتیجہ نکلا تو تینوں امیدواروں کو جو ووٹ حاصل ہوئے تھے ان کی تعداد حسب ذیل تھی:

| | | |
|---|---|---|
| خان صاحب شیخ محمد امین | = | ۵۲۵۱ |
| ملک زمان مہدی خاں | = | ۴۶۷۵ |
| سید سیف الدین شاہ گیلانی | = | ۵۸۷ |

ملک زمان مہدی خاں کا علی الرغم اعداء ۴۶۷۵ ووٹ لے جانا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ سر سکندر اور ان کی یونینسٹ پارٹی کے لشکریوں کو محسوس ہو گیا تھا کہ ان کے مسلم لیگی حریف کچھ ایسے گئے گذرے نہیں ہیں کہ وہ گویا انہیں اٹھا کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیں گے

علی الرغم دشمن شہید وفا ہوں
مبارک مبارک. سلامت سلامت

میں زمان مہدی خاں کی الیکشن سے فارغ ہو کر ۲۹۔ ستمبر کو واپس لاہور آیا تو معلوم ہوا کہ سر سکندر کے حکم پر ۱۴۔ ستمبر ۱۹۳۹ء کو پنجاب مسلم لیگ آرگنائزنگ کمیٹی کا ایک فوری اجلاس نواب ممدوٹ کے مکان پر ہوا تھا جہاں ایک ریزولیوشن منظور کیا گیا ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر مسٹر ایم اے جناح سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ مجھ کو، غلام رسول خاں کو اور ملک زمان مہدی خاں کو مسلم لیگ سے نکال دیں۔ میں نے اس سلسلہ میں پوچھ گچھ کی اور میاں رمضان علی سے ریزولیوشن وغیرہ کی نقلیں حاصل کیں تو پتا چلا کہ سر سکندر حیات خاں کچھ ضرورت سے زیادہ ہی پریشان اور برافروختہ ہو گئے ہیں۔

میں نے ۲۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو مسٹر جناح کی خدمت میں ایک طویل عریضہ ارسال کیا جس کا ترجمہ ذیل میں درج کرتا ہوں:

لاہور

۲ر اکتوبر ۱۹۳۹ء

ڈیئر مسٹر جناح! میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس دہلی منعقدہ ۲۷۔ اگست ۱۹۳۹ء سے واپس آ کر مسلسل لاہور سے باہر رہا ہوں۔ میرے دوست خان بہادر ملک زمان مہدی خاں کی الیکشن تھی اور مجھے اس سلسلہ میں لاہور سے باہر جانا پڑا تھا۔ دو روز ہوئے میں

واپس لاہور آیا ہوں اور یہاں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا ہے کہ پنجاب مسلم لیگ آرگنائزنگ کمیٹی کا ایک فوری اجلاس سر سکندر حیات خاں کی زیرِ صدارت ۱۴۔ ستمبر ۱۹۳۹ء کو منعقد ہوا تھا جہاں ذیل کی قرار دادیں منظور کی گئیں:

۱۔ ازبسکہ میں، خان بہادر ملک زمان مہدی خاں اور مسٹر غلام رسول خان "گمراہ کن پراپیگنڈے کے ذریعہ سے مسلمانوں میں انتشار و افتراق پھیلا رہے ہیں اور جان بوجھ کر پراونشل مسلم لیگ کی آرگنائزنگ کمیٹی کے کام میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں، لہٰذا آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر سفارش کی جائے کہ وہ ہمارے خلاف ضابطے کی کارروائی کر کے ہمارے نام آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اور پنجاب آرگنائزنگ کمیٹی سے خارج کر دیں۔"

۲۔ ازبسکہ میں "آل انڈیا مسلم لیگ کی مخالف جماعتوں کے ساتھ سازش کر کے مسلم لیگ کو نقصان پہنچا رہا ہوں لہٰذا آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر سے سفارش کی جائے کہ وہ مجھے مسلم لیگ سے نکال دیں۔"

اسی اجلاس میں ایک تیسری قرار داد بھی منظور کی گئی تھی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان کی شرکتِ جنگ کے متعلق، آنریبل سر سکندر خاں نے اپنے بیان میں جس پالیسی کا اعلان کیا ہے اس کی مکمل تائید کی جاتی ہے۔"

اس تیسری قرار داد کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ چونکہ آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ۱۷ر ستمبر ۱۹۳۹ء کو ہونے والا تھا اور سر سکندر حیات خاں چاہتے تھے کہ وہاں جا کر یہ ثابت کر سکیں کہ وہ طبقہ جو ان کے نزدیک "مسلمانان پنجاب اور دیگر فوجی اقوام" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کیا کہتا ہے۔ اور یہ کہ "اس اہم معاملہ میں پنجاب کے مسلمانوں کے جذبات کیا ہیں۔"

میں اس ضمن میں ذیل کے امور آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

(الف) اس نام نہاد فوری اجلاس کا نوٹس ۱۱۔ ستمبر ۱۹۳۹ء کو جاری کیا گیا تھا اور مجھے یا خان بہادر ملک زمان مہدی خاں یا مسٹر غلام رسول خاں کو بالکل کوئی اطلاع نہیں بھیجی گئی تھی۔

(ب) اس اجلاس کا جو نوٹس جاری کیا گیا تھا اس کا مضمون حسب ذیل ہے:

"پنجاب مسلم لیگ آرگنائزنگ کمیٹی کے صدر سر سکندر حیات خاں کی ہدایات کے مطابق اس کمیٹی کا ایک فوری اجلاس ۱۴۔ ستمبر ۱۹۳۹ء کو پانچ بجے شام ممدوٹ وِلا۔ ڈیوس روڈ لاہور پر منعقد ہو گا۔ آپ سے شرکت کی درخواست ہے۔"

(دستخط) رمضان علی لاہور

آنریری سیکرٹری ۱۱۔ ستمبر ۱۹۳۹ء

اس نوٹس پر ایک نظر ڈالنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس میں اشارۃً یا کنایۃً بھی کسی ایسے امر کا ذکر نہیں کیا گیا جس کا تعلق ایجنڈے سے ہے اور نہ یہ بتایا گیا ہے کہ اس اجلاس میں کون کون سے اُمور پر بحث کی جائے گی۔ حتیٰ کہ یہ بھی تو ظاہر نہیں کیا گیا کہ بعض ممبروں کے خلاف ضابطے کی کارروائی کی جانے والی ہے۔ سرسری انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے خلاف کوئی کارروائی کی جائے تو اسے بروقت نوٹس دے کر اس بات کا موقع عطا کرنا چاہئے کہ وہ شخص حاضر ہو کر اپنی صفائی پیش کر سکے۔ آپ کو یاد ہو گا. جب میں نے سر سکندر حیات خاں کے خلاف ضابطے کی کارروائی کئے جانے کا نوٹس دیا تھا تو میرے یہ ریزولیوشن باقاعدہ ایجنڈے میں شامل کئے گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود. چونکہ سر سکندر حیات خاں خود حاضر نہیں ہوئے تھے، آپ نے اِصرار فرمایا تھا کہ ان ریزولیوشنوں پر کونسل کے اجلاس میں

بحث نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا انہیں ورکنگ کمیٹی کے حوالے کر دیا جائے. تاکہ وہ سر سکندر حیات خاں کے نام باقاعدہ نوٹس جاری کر سکے۔

سر سکندر کے طور طریق اس بارے میں بالکل نرالے ہیں۔ وہ ۱۰ - ستمبر ۱۹۳۹ء کو لاہور پہنچ کر نواب شاہنواز خاں والئی ممدوٹ سے فرماتے ہیں کہ مسٹر رمضان علی سے کہیے کہ ۱۳۔ ستمبر کو فوری میٹنگ کا انعقاد کریں۔ ۱۳۔ ستمبر کی تاریخ چونکہ بہت قریب تھی، اس لئے نواب صاحب نے ۱۴۔ ستمبر تجویز کی۔ لہٰذا ۱۱۔ ستمبر ۱۹۳۹ء کو ایک بالکل سرسری نوٹس جاری کر دیا گیا کہ ۱۴ - ستمبر کو اجلاس ہو گا۔ لیکن اس نوٹس میں ایک لفظ بھی ایسا درج نہیں تھا کہ اجلاس میں کون کون سے امور زیر بحث آئیں گے! اس اجلاس میں پندرہ آدمی شریک ہوئے جو سب کے سب سر سکندر کے حاشیہ بردار ہیں۔ بلکہ بعض ایسے لوگ بھی شامل ہوئے تھے جو سرے سے اس آرگنائزنگ کمیٹی کے ممبر نہیں جو آپ نے قائم کی تھی۔ مثلاً نواب محمد سعادت علی خاں۔ نواب زادہ رشید علی خاں۔ خان صاحب قلندر علی خاں اور سید محمد علی جعفری۔ بہر حال تعجب یہ ہے کہ میرے اس نا قابل عفو جرم کی سزا کے لئے کہ میں نے سر سکندر کے خلاف ضابطے کی کارروائی کئے جانے کا نوٹس کیوں دیا تھا۔ سر سکندر نے مجھے اپنے انتقام کا ہدف بنانے کا یہ عجیب و غریب ڈھنگ اختیار کیا ہے۔

ج۔ میں مسلم لیگ کا ایک نہایت سرگرم اور پر جوش ممبر ہوں۔ میرا تمام وقت اور تمام محنت مسلم لیگ کی خدمت کرنے میں صرف ہو رہی ہے۔ میں اس غلط الزام کی پر زور تردید کرتا ہوں کہ "میں مسلم لیگ کے صدر کے احکام اور مسلم لیگ کے فیصلے کی خلاف ورزی کر کے گمراہ کن پراپیگنڈے کے ذریعے سے مسلمانوں میں انتشار و افتراق پھیلا رہا ہوں۔" اگرچہ یہ

بالکل درست ہے کہ میں نے سر سکندر حیات خاں کے ہتھکنڈوں کو بے نقاب کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور سر سکندر کی ان تمام کوششوں سے بھی پردہ اٹھانے میں کمی نہیں کی جو وہ پنجاب میں مسلم لیگ کو موت کے گھاٹ اتارنے اور اسے اپنی یونینسٹ پارٹی کا ایک ماتحت ادارہ بنانے کی خاطر کر رہے ہیں۔ میں اس بے بنیاد الزام کی بھی پر زور تردید کرتا ہوں کہ "میں آل انڈیا مسلم لیگ کی مخالف جماعتوں کے ساتھ سازش کر کے مسلم لیگ کو نقصان پہنچا رہا ہوں۔" مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس دہلی منعقدہ ۲۷۔ اگست ۱۹۳۹ء سے ایک روز پہلے سر سکندر نے نہایت چالاکی سے اردو کے ان اخباروں میں جن پر ان کا قبضہ ہے ایک سراسر بے بنیاد خبر شائع کروائی تھی کہ میں نے پنجاب پراونشل مسلم لیگ کو نقصان پہنچانے کے لئے ڈاکٹر محمد اشرف سیکرٹری آل انڈیا کانگرس کمیٹی سے مالی امداد طلب کی ہے۔ یہ خبر سر سکندر کی حکومت پنجاب کے انفرمیشن بیورو کے ڈائریکٹر سید نور احمد نے خود وضع کر کے اردو کے اخباروں میں چھپوائی تھی۔ چنانچہ میں نے اسی وقت ایک بیان کے ذریعہ سے اس خبر کی تردید کر دی تھی۔ ڈاکٹر اشرف میرے ذاتی دوست ہیں اور ان کے اور میرے درمیان جو خط و کتابت ہوئی تھی وہ میں آپ کے سامنے رکھنے کو تیار ہوں۔ میں نے ڈاکٹر اشرف کو بیّن الفاظ میں تاکید کی تھی کہ مسلم لیگ کو مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کریں اور کانگرس سے اپنا تعلق منقطع کر کے لیگ میں شامل ہو جائیں۔

بجائے اس کے کہ میرا اصل خط شائع کیا جاتا، انفرمیشن بیورو کے ڈائرکٹر نے الٹا ایک جعلی خط وضع کر کے میرے نام سے اخباروں میں چھپوا دیا کہ میں نے ڈاکٹر اشرف سے مالی امداد طلب کی ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ سر سکندر کے ایک کاسہ لیس

ازلی نواب زادہ خورشید علی خاں نے اسی فرضی خط کی بنا پر میرے خلاف ایک قرار داد پیش کرنے کا نوٹس بھی دیا تھا۔ میں بے تابی سے انتظار کر رہا ہوں کہ یہ قرار داد کب پیش ہوتی ہے تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔ تاہم میں اس سے قبل ہی اخباروں میں اعلان کر چکا ہوں کہ یہ خط جس کی بناء پر یہ الزام لگایا جارہا ہے سراسر جعلی اور فرضی ہے۔

آپ میرے لیڈر ہیں اور اس جماعت کے لیڈر بھی ہیں جس کا میں ایک سرگرم، پرجوش اور جاں نثار ممبر ہوں۔ اسی لئے میں یہ جملہ معروضات آپ کی خدمت والا میں پیش کر رہا ہوں تاکہ آپ حالات سے آگاہ ہو جائیں اور آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ سرسکندر نے مجھے ذلیل کرنے اور مجھ کو اذیت پہنچانے کے لئے کیسے کیسے ہتھکنڈے اختیار کر رکھے ہیں۔

آپ نے یقیناً ملاحظہ فرمایا ہو گا کہ محض میرے خلاف یہ دو قرار دادیں پاس کرنا تو کوئی ایسا مقصد نہ تھا جس کے لئے آرگنائزنگ کمیٹی کا فوری اجلاس برپا کرنے کی ضرورت پڑتی۔ بات دراصل یہ ہے کہ ۱۷۔ ستمبر کو آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہونے والا تھا۔ اور سرسکندر وہاں ایک کاغذی ریزولیوشن سے مسلح ہو کر جانا چاہتے تھے تاکہ یہ دعویٰ کر سکیں کہ پنجاب کے مسلمان ان کے ساتھ ہیں اور یوں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کی اس قرار داد کا حلیہ بگاڑ سکیں جو جنگ کے بارے میں پہلے سے منظور کی جا چکی ہے۔

اگر سرسکندر کی نیت نیک ہوتی تو وہ مجھے اور میرے دوستوں کو باقاعدہ نوٹس دیتے۔ اجلاس کا ایجنڈا جاری کرتے اور اس ایجنڈے میں وہ تمام ریزولیوشن بھی درج کرتے جو اجلاس میں پیش ہونے والے تھے۔ کم سے کم اس طرح کارروائی کی ظاہری شکل و صورت تو قاعدے کے مطابق ہوتی

اور قابل اعتراض نہ ٹھہرتی۔

مجھے آپ سے انصاف کی پوری توقع ہے اور مجھے یقین ہے کہ سر سکندر کی یہ کوشش بری طرح ناکام رہے گی۔ جو لوگ اس صوبے میں مسلم لیگ کے سچے اور درد مند خادم ہیں انہیں سر سکندر جس جس طرح پریشان کر رہے ہیں ان کی یہ حرکتیں بھی بالآخر نامرادی اور ناکامی پر منتج ہوں گی۔

پنجاب میں مسلم لیگ کا عملاً کوئی وجود باقی نہیں رہا۔ اسے موت کے گھاٹ اتارنے کے لئے سر سکندر حیات خاں سے جو کچھ امکانی حد تک ہو سکتا تھا وہ کر چکے ہیں۔ کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ مرکزی مسلم لیگ کب تک اس ٹریجڈی کو ایک خاموش تماشائی کی طرح چپ چاپ دیکھتی رہے گی؟ صوبے کا وزیر اعظم ہو یا کوئی اور شخص۔ لاریب جس قومی مقصد کے لئے ہم سرگرم عمل ہیں۔ اس کے سامنے کسی بڑے سے بڑے فرد کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔

آپ کا نیاز مند

عاشق حسین بٹالوی [۱]

جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے وہ پڑھ کر سوچیے کہ ہم صرف گنتی کے چند آدمی تھے۔ ہمارے پاس روپیہ نہیں تھا۔ کارکن نہیں تھے۔ پبلسٹی کا سامان نہیں تھا۔ کوئی اخبار ہمارا بیان چھاپنے کو تیار نہیں تھا۔ ان حالات نامساعد میں ہم نے مسلم لیگ کی سربلندی کے لئے جو کچھ کیا تھا کیا اس سے زیادہ اس وقت ممکن تھا؟

گستاخی معاف۔ مسلم لیگ کے نام پر الاٹمنٹوں ۔ پرمٹوں ۔ لائسنسوں کا بازار تو پاکستان بننے کے بعد گرم ہوا ہے۔ ۱۹۳۹ء میں کون سی الاٹمنٹیں ۔ پرمٹ ۔ لائسنس ہمارے پیش نظر تھے؟ میں بہت ہی معمولی حیثیت کا آدمی ہوں۔ میں نے ساری عمر آزادی سے اپنی بری بھلی روٹی اپنے قلم سے کمائی ہے۔ ۱۹۳۹ء میں حکومت پنجاب نے حد درجہ قابل اعتراض

---

۱۔ انگریزی کا اصل خط اس کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ درج کیا گیا ہے۔

روّیہ اختیار کر کے مجھے اس نان و نمک سے بھی محروم کر دیا تھا۔ میرے دور و نزدیک کے تمام رشتہ داروں کو جو سرکاری ملازمت میں تھے چُن چُن کر انتقام کا ہدف بنایا گیا۔ میرے والد مرحوم و مغفور کی جو اپنے وطن میں بسترِ علالت پر دراز تھے توہین کروائی گئی۔ اور یہ سب کچھ کس جرم کی پاداش میں؟ دشمنی اور عداوت میں بھی شرافت کا ایک معیار قائم رکھا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے یہاں تو بدقسمتی سے وہ معیار بھی مٹ چکا تھا۔

میرے لئے وہ سخت اِبتلاء اور آزمائش کا زمانہ تھا۔ اُنتیس سال گذر چکے ہیں۔ گردن موڑ کر دیکھتا ہوں تو اس تاریک فضا میں صرف ایک شخص نظر آتا ہے جو مصیبت کے وقت چٹان کی طرح میرے ساتھ پہلو بہ پہلو کھڑا رہا اور جس کی زندگی بخش رفاقت نے میری ہر تکلیف کو راحت میں بدل دیا تھا۔

وہ شخص ملک برکت علی تھا۔

میں جب پچھلے دنوں پندرہ سال کی غربت کاٹنے کے بعد لاہور گیا تو ٹیمپل روڈ پر بھی حاضری دی۔ اس سڑک کا حلیہ خاصا بگڑ چکا ہے۔ لیکن میں دیر تک ملک صاحب کے مکان کے سامنے ایک زائر کی طرح سڑک پر کھڑا رہا۔ اندر جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ صرف باہر سے در و دیوار کو دیکھتا رہا۔ اور ماضی کی یادیں آنسوؤں کے سیلاب کی صورت میں میری آنکھوں سے بہہ نکلیں ؂

پائم بہ پیش از سرِایں کُو نمی رود
یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہ کیست

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے اپنے ۲۷۔ اگست ۱۹۳۹ء کے اجلاس میں فیصلہ کیا تھا کہ اگر پنجاب مسلم لیگ آرگنائزنگ کمیٹی نے ۱۵۔نومبر ۱۹۳۹ء تک پنجاب میں پراونشل مسلم لیگ قائم نہ کی تو یہ آرگنائزنگ کمیٹی خود بخود ختم ہو جائے گی۔ سر سکندر حیات خاں اکتوبر ۱۹۳۹ء کے پہلے ہفتے میں شملہ سے لاہور تشریف لائے۔ عالمگیر جنگ شروع ہو چکی تھی۔ اس لئے انہوں نے مسلم لیگ کے کام کی طرف توجہ نہ کی۔ جب سر سکندر خاموش تھے تو نواب شاہنواز خاں والئی ممدوٹ اور میاں رمضان علی کو تردد کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ چنانچہ اسی خاموشی میں ۱۵۔ نومبر کی تاریخ گذر گئی اور پنجاب میں کوئی پراونشل مسلم لیگ قائم نہ ہوئی۔

۱۶۔ نومبر ۱۹۳۹ء کو ملک برکت علی۔ غلام رسول خاں۔ زمان مہدی خاں اور راقم التحریر نے ایک مشترکہ بیان اخباروں کو دیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے ریزولیشن کے

مطابق آرگنائزنگ کمیٹی ۱۵۔ نومبر کو اپنی موت آپ مرچکی ہے۔ لہٰذا کوئی شخص پنجاب مسلم لیگ آرگنائزنگ کمیٹی کے نام پر خط و کتابت کرنے یا اخباری بیان دینے کا مجاز نہیں۔

اس بیان کی اشاعت سے سر سکندر حیات خاں، نواب ممدوٹ اور میاں رمضان علی بہت برہم ہوئے۔ اور انہوں نے بھی کچھ ادھر ادھر بھاگ دوڑ شروع کی۔ میں اس ضمن میں اپنے قلم سے پوری روائداد بیان کرنے کی بہ نسبت یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ ملک برکت علی کا وہ خط نقل کر دیا جائے جو انہوں نے ۱۲۔ دسمبر ۱۹۳۹ء کو مسٹر جناح کو لکھا تھا۔ یہ بڑا طویل خط ہے لیکن ۱۵۔ نومبر کے بعد کے حالات و کوائف پر روشنی ڈالنے کے لئے اس سے بہتر، مستند اور جامع دستاویز ہمارے پاس اور کوئی نہیں:

نمبر ۱۹ ٹیمپل روڈ۔

لاہور۔

۱۲۔ دسمبر ۱۹۳۹ء

ڈیئر مسٹر جناح! آپ کو یاد ہوگا. آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اس اجلاس میں جو ۲۷۔ اگست ۱۹۳۹ء کو دہلی میں ہوا تھا، یہ طے کیا گیا تھا کہ اگر ۱۵۔ نومبر ۱۹۳۹ء تک پنجاب پراونشل مسلم لیگ قائم نہ کی گئی تو پنجاب پراونشل مسلم لیگ آرگنائزنگ کمیٹی، جو آپ نے ۱۵۔ اپریل ۱۹۳۸ء کو کلکتہ میں قائم کی تھی، خود بخود ختم ہو جائے گی۔ ۱۵۔ نومبر ۱۹۳۹ء کی تاریخ گذر چکی ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آرگنائزنگ کمیٹی کا وجود اپنے آپ ختم ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ ذیل کے امور آپ کی خصوصی توجہ کے مستحق ہیں:

۱۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے نئے آئین کے رو سے یہ ضروری ہے کہ ابتدائی اور ڈسٹرکٹ لگیں قائم کی جائیں۔ ابتدائی لیگوں کا فرض ہے کہ ڈسٹرکٹ لیگوں کے لئے ممبر منتخب کریں۔ اور ڈسٹرکٹ لگیں آگے صوبہ مسلم لیگ کے لئے ممبر منتخب کرتی ہیں۔ پنجاب پراونشل مسلم لیگ نے اپنا جو آئین وضع کیا ہے وہ اس بارے میں آل انڈیا مسلم لیگ کے آئین کے قطعی متضاد ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے آئین کے قاعدہ نمبر ۳۸ کی رو سے یہ ضروری ہے

کہ "برطانوی ہند کے ہر ضلع میں ایک ڈسٹرکٹ مسلم لیگ مع شاخوں کے قائم کی جائے۔" پنجاب مسلم لیگ آرگنائزنگ کمیٹی نے جو دستور وضع کیا ہے اس کے قواعد نمبر ۳۷ اور نمبر ۳۸ کی رو سے یہ قرار دیا گیا ہے کہ:

(الف) سٹی اور ڈسٹرکٹ لیگیں قائم کی جائیں۔ (ب) یہ سٹی اور ڈسٹرکٹ لیگیں دو بالکل جداگانہ ادارے ہوں گے جن کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ سٹی لیگیں ان شہروں میں قائم کی جائیں گی جن کی آبادی بیس ہزار یا اس سے اوپر ہے۔ ڈسٹرکٹ لیگوں کا حلقہ ان شہروں کو چھوڑ کر باقی پورے ضلع پر حاوی ہو گا۔ اور (ج) اس طرح جو سٹی اور ڈسٹرکٹ لیگیں وجود میں آئیں گی ان کا براہ راست پراونشل مسلم لیگ سے الحاق ہو گا۔ اور پراونشل مسلم لیگ میں ان کو خاص تناسب سے. جس کا تعین شیڈول الف (۱) اور الف (۲) میں کیا گیا ہے. نمائندگی دی جائے گی۔

ان قواعد سے ظاہر ہے کہ سرسکندر کی آرگنائزنگ کمیٹی نے سرمائیکل اوڈوائر[۱] کی اس پالیسی کی نہایت وفاداری سے پیروی کی ہے جس کی غرض و غایت یہ تھی کہ شہری اور دیہاتی طبقوں کو ایک دوسرے سے الگ تھلگ رکھا جائے۔ آرگنائزنگ کمیٹی کا یہ فیصلہ آل انڈیا مسلم لیگ کے دستور کی دفعہ نمبر ۳۸ کے خلاف ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے آل انڈیا مسلم لیگ کے قاعدہ نمبر ۳۸ کی رو سے ہر ضلع کے لئے ایک الگ ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کا ہونا ضروری ہے۔ اور ایک ضلع میں جتنے شہر واقع ہیں وہ تمام ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کے احاطۂ عمل میں آئیں گے۔

---

۱۔ سرمائیکل اوڈوائر، ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۹ء تک پنجاب کا لیفٹنٹ گورنر تھا۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ پنجاب میں مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات رائج نہ ہو سکیں۔ چنانچہ اس نے پنجاب کی دیہاتی آبادی کو شہری آبادی کا حریف بنا کر صوبے میں ہر قسم کی سیاسی تحریکیں بہ جبر بند کروا دیں۔ امرت سر کے جلیاں والے باغ کا حادثہ سرمائیکل اوڈوائر ہی کے عہد حکومت میں ہوا تھا۔ (مصنف)

ان کی علیحدہ لیگیں نہیں ہوں گی اور نہ ان کا براہ راست
پراونشل مسلم لیگ سے الحاق کیا جا سکے گا شہروں میں بے شک

سٹی مسلم لیگیں قائم کی جا سکتی ہیں لیکن ان کا الحاق ہر صورت میں ڈسٹرکٹ مسلم لیگ سے ہونا چاہئے۔ اور یہ منصب صرف ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کا ہے کہ وہ براہ راست پراونشل مسلم لیگ سے ملحق ہو سکتی ہے۔ کوئی سٹی مسلم لیگ، ڈسٹرکٹ مسلم لیگ سے علیحدہ نہیں کی جا سکتی اور نہ براہ راست کسی سٹی مسلم لیگ کا الحاق پراونشل مسلم لیگ سے ہو سکتا ہے۔ سر سکندر کی پالیسی کا مقصد یہ ہے کہ شہری اور دیہاتی آبادی کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی جائے تاکہ دیہات کے لوگوں پر شہری مسلمانوں کی سیاست کا سایہ نہ پڑے اور یوں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کو نقصان پہنچایا جا سکے۔

۲۔ اگر آپ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے آئین اور قواعد و ضوابط پر ایک نظر ڈالیں تو ملاحظہ فرمائیں گے کہ پنجاب میں انتیس (۲۹) سٹی لیگیں اور انتیس ہی ڈسٹرکٹ لیگیں قائم کئے جانے کی تجویز کی گئی ہے۔ آپ کو مجھ سے یہ معلوم کر کے حیرت ہو گی کہ جہاں سٹی لیگوں کو کل اڑتیس نشستیں دی گئی ہیں وہاں ڈسٹرکٹ لیگوں کے حصے میں اٹھانوے نشستیں آئی ہیں۔ اور نشستوں کی اس تعداد کا تعین اس اصول پر نہیں کیا گیا کہ مسلم لیگ کے ممبروں کی تعداد کیا ہے بلکہ سراسر آبادی کی بنا پر کیا گیا ہے اور آبادی بھی مخلوط جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔ فرض کیجئے کہ دیہاتی حلقے میں مسلم لیگ کا ایک ممبر بھی نہیں۔ اس کے باوجود وہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ میں اٹھانوے نمائندے بھیج سکتے ہیں۔ اس کے برعکس سٹی لیگوں کے ممبروں کی تعداد خواہ لاکھوں تک پہنچ جائے وہ صرف اڑتیس (۳۸) نمائندے بھیجنے کے مجاز ہیں۔

۳۔ اگرچہ قاعدہ نمبر ۳ (ج) کی رو سے یہ قرار دیا گیا ہے کہ پراونشل کونسل میں ایک نشست حاصل کرنے کے لئے پانچ سو ۵۰۰ ممبروں کی شرط ضروری ہے۔ لیکن بعدازاں اس شرط کو بھی یہ

کہہ کر ایک حد تک منسُوخ کر دیا گیا ہے کہ اگر سٹی یا ڈسٹرکٹ لیگ کے ممبروں کی تعداد پانچ سو(۵۰۰) سے کم ہے تو بھی ان کا الحاق اس شرط پر منظور کر لیا جائے گا کہ الحاق کے بعد سال بھر کے اندر وہ پانچ سو(۵۰۰) ممبروں کی تعداد پوری کر سکیں۔ مقصد سراسر یہ ہے کہ صرف کاغذ پر ایک پنجاب پراونشل مسلم لیگ کا ڈھانچہ تیار کر لیا جائے۔ قطع نظر اس سے کہ لیگ کی ہر شاخ میں ابتدائی ممبروں کی مطلوبہ تعداد موجود ہے یا نہیں۔

۴۔ آرگنائزنگ کمیٹی نے جو پنجاب پراونشل مسلم لیگ کا دستور وضع کیا ہے اس کی رو سے اٹھاون ۵۸ سٹی اور ڈسٹرکٹ لیگوں کا قیام ضروری ہے۔ لیکن ۱۵۔ نومبر ۱۹۳۹ء تک پوزیشن یہ تھی کہ صرف بیس لیگوں کا الحاق کیا جا سکا تھا۔ اور ان بیس لیگوں کے ممبروں کی تعداد کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ مکمل ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ پانچ اور لیگوں کا الحاق آرگنائزنگ کمیٹی یا الحاق کرنے والی سب کمیٹی کے علم کے بغیر ہی سر سکندر کے حکم سے کر دیا گیا۔ علاوہ ازیں یہ کہا جاتا ہے کہ دو اور لیگوں کا الحاق ۲۵ نومبر ۱۹۳۹ء کو بھی ہوا تھا حالانکہ اس وقت آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کی اس قرار داد کے مطابق جو ۲۷ اگست ۱۹۳۹ء کو منظور ہوئی تھی آئینی لحاظ سے آرگنائزنگ کمیٹی کا وجود ہی ختم ہو چکا تھا۔ سوائے چار یا پانچ شاخوں کے، جن کی رائے یہ ہے کہ ۱۵ نومبر ۱۹۳۹ء کے بعد آرگنائزنگ کمیٹی کی کوئی آئینی حیثیت نہیں رہی۔ باقی جتنی شاخیں ہیں ان کا وجود محض کاغذی ہے۔ نہ صرف ان کی کوئی ابتدائی ممبر شپ ہے اور نہ ان کے ممبروں کا انتخاب ابتدائی ممبروں نے کیا ہے۔ اس طرح گویا یہ نیا آئین بھی ایک مذاق بن کر رہ گیا ہے۔

۵۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے ایک ریزولیشن میں یہ درج ہے کہ کسی پراونشل مسلم لیگ کا الحاق اس وقت تک مرکز سے نہیں ہو سکتا جب تک کہ صوبے کے ۲۔۳ اضلاع میں ڈسٹرکٹ لیگیں نہ قائم ہو جائیں۔ بظاہر اس وقت

صرف بارہ اضلاع ایسے ہیں جہاں نام نہاد ڈسٹرکٹ لیگیں قائم ہیں حالانکہ پنجاب کے کل اضلاع کی تعداد انتیس ہے۔

۶۔ نومبر ۱۹۳۹ء تک صورت حال یہ تھی کہ کسی الحاق شدہ لیگ کو خواہ وہ سٹی لیگ ہو یا ڈسٹرکٹ لیگ یہ ہدایت نہیں کی گئی تھی کہ پروانشل مسلم لیگ کے لئے اپنے نمائندے منتخب کر کے بھیجو۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کی اس قرارداد نے جو ۲۷ اگست ۱۹۳۹ء کو منظور ہوئی تھی سخت مشکل پیدا کر دی تھی۔ لہٰذا اس مشکل کا حل یہ تجویز کیا گیا کہ آرگنائزنگ کمیٹی کا ایک جلسہ ۸ نومبر ۱۹۳۹ء کو منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا۔ اس جلسے کا نوٹس ایک روز قبل ۷ نومبر ۱۹۳۹ء کو جاری کیا گیا اور یہ نوٹس بھی آرگنائزنگ کمیٹی کے صرف بیس ممبروں کو بھیجا گیا۔ حالانکہ ممبروں کی مجموعی تعداد چالیس کے قریب ہے۔ اس جلسے میں ایک ریزولیوشن پاس کیا گیا ہے کہ پروانشل مسلم لیگ قائم نہیں ہو سکتی۔ ۸ نومبر ۱۹۳۹ء کے اس جلسے میں یہ بھی طے ہوا تھا کہ سٹی اور ڈسٹرکٹ مسلم لیگوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ ۱۵ دسمبر ۱۹۳۹ء تک اپنے اپنے نمائندے منتخب کریں۔

اس قرارداد کی ایک نقل آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی دفتر کو بھیجی گئی تھی جس کے ساتھ سر سکندر نے ایک خط بھی لکھا تھا کہ اگر ضرورت محسوس ہو تو مہربانی فرما کر اس معیاد میں توسیع کر دی جائے۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۳۹ء کو جو جلسہ ہونے والا تھا اب اسے ۱۰ جنوری ۱۹۴۰ء تک ملتوی کر دیا گیا ہے جس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ پہلے پروگرام کے مطابق پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کا اجلاس ۱۵ دسمبر ۱۹۳۹ء کے بعد تک جاری رہنا تھا۔ لیکن اب یہ اجلاس ۸ جنوری ۱۹۴۰ء تک ملتوی کر دیا گیا ہے لہٰذا ۱۵ دسمبر ۱۹۳۹ء کا اجلاس بھی ملتوی کرنا پڑا۔ کیونکہ یونینسٹ پارٹی کے وہ ممبر جو حقیقتاً سر سکندر کی جیب میں رہتے ہیں ۱۵ دسمبر ۱۹۳۹ء سے پہلے لاہور میں موجود نہیں ہوں گے۔ ان لوگوں کے علاوہ لیگ کا اور کوئی ممبر نہیں۔ اور بالفرض اگر کوئی ممبر ہیں بھی تو پانچ دس سے زیادہ نہیں ہوں گے جنہیں سر سکندر کے حکم کے مطابق چند فرضی

لیگوں نے محض کاغذ پر ضابطے کی خانہ پری کے لئے منتخب کیا ہے۔

۷۔ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ سر سکندر کی اس ہدایت کی کہ اپنے اپنے نمائندے منتخب کرو بہت کم بیرونی لیگوں نے تعمیل کی ہے۔ بہت سی شاخیں تو یہ خیال کرنے میں حق بجانب ہیں کہ سر سکندر کی یہ جماعت ایک بالکل فرضی ڈھونگ ہے جو کبھی مسلم لیگ کی تنظیم سے انصاف نہیں کرے گی۔ وہ یہ بھی محسوس کرتی ہیں کہ سر سکندر کا اصل مقصد یہ ہے کہ لیگ پر قبضہ کر کے اسے اپنے اغراض و مقاصد کے لئے استعمال کریں۔ تا کہ یونینسٹ پارٹی کو فروغ ہو۔ بعض شاخیں یہ سمجھتی ہیں کہ ۵ انومبر ۱۹۳۹ء کے بعد آرگنائزنگ کمیٹی کا آئینی طور پر کوئی وجود باقی نہیں رہا اور وہ خود بخود ختم ہو گئی ہے جن سٹی اور ڈسٹرکٹ لیگوں کا الحاق کیا جا چکا ہے۔ ان میں سے بیشتر فرضی ہیں اور ان کا وجود بھی سراسر کاغذی ہے۔ صرف اکا دکا آدمیوں نے مل کر محض سر سکندر کے حکم کی تعمیل کی خاطر یہ لیگیں قائم کر لی ہیں حالانکہ ان کی کوئی ابتدائی ممبر شپ نہیں۔

مندرجہ بالا گزارشات کے پیش نظر کیا یہ مناسب نہیں کہ مسلمانان پنجاب کو حالات سے آگاہ کر دیا جائے اور حقیقت بھی واضح کر دی جائے؟ مسلم لیگ کی اب تک کوئی صوبائی شاخ قائم نہیں ہوئی۔ اور آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کی قرارداد کے مطابق آرگنائزنگ کمیٹی کا وجود بھی ختم ہو گیا ہے۔ اس سے جو نتائج پیدا ہوئے ہیں ان سے بچنے کے لئے سر سکندر نے صرف ایک دن کا نوٹس دے کر ۸ نومبر ۱۹۳۹ء کو ایک فرضی جلسہ کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ نام نہاد الحاق شدہ شاخوں کو لکھ دیا جائے کہ اپنے اپنے نمائندے منتخب کریں۔ یہ خط ۱۶ نومبر کو بھیجا گیا حالانکہ اس تاریخ کو آرگنائزنگ کمیٹی ختم ہو چکی تھی۔ سر سکندر کے اس خط کا جواب بہت مایوس کن رہا ہے۔ بعض لوگوں نے جواب دیا ہے کہ ان کے اضلاع کے نمائندے منتخب کر دیئے گئے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ نمائندے بھی ۱۰ جنوری ۱۹۴۰ء سے پہلے جلسہ نہیں کر سکتے۔ اور جب تک اس قسم کا جلسہ نہ ہو آل انڈیا مسلم لیگ کے آئین کے مطابق کوئی صوبہ مسلم لیگ نہیں بن سکتی۔ اور جب تک صوبہ مسلم لیگ قائم نہ ہو صدر اور سیکرٹری وغیرہ عہدے داروں کا انتخاب عمل میں نہیں آ سکتا۔

موجودہ صورت حال نے اس صوبے کے مسلمانوں کو سخت پریشان کر رکھا ہے۔ چونکہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کی قرارداد کے مطابق آرگنائزنگ کمیٹی ختم ہو چکی ہے۔ لہٰذا یہ کام آپ کا ہے کہ جس طرح چاہیں پنجاب پروانشل مسلم لیگ قائم کریں۔ یہ اختیار صرف آپ کو حاصل ہے۔ ازراہ کرم مجھے اطلاع دیجئے گا کہ کیا آرگنائزنگ کمیٹی ختم ہو گئی ہے یا نہیں۔ اور آئندہ آپ کے پیش نظر کیا پروگرام ہے؟ اگر آپ گستاخی تصور نہ فرمائیں تو میں نہایت ادب سے عرض کر دوں گا کہ وقت آ گیا ہے کہ سر سکندر کے پیچھے پیچھے بھاگنے کی پالیسی ترک کر دی جائے۔ سر سکندر کو یہ منصب حاصل نہیں کہ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کو کنٹرول کریں۔ ان کا فرض ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی پیروی کریں۔ اگر وہ آل انڈیا مسلم لیگ کی پیروی کرنے پر آمادہ نہیں تو پھر لیگ کو ہرگز یہ زیبا نہیں کہ سر سکندر کے پیچھے پیچھے اس خیالِ خام میں بھاگتی رہے کہ ان کی وابستگی لیگ کے لئے کوئی نیک نامی اور تقویت کا موجب ہے۔ پنجاب میں مسلم لیگ عملاً ختم ہو چکی ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہماری موجودہ حالت تو اس حالت سے بھی بدتر ہے جو ۱۹۳۶ء کے انتخابات کے وقت تھی۔ ذاتی طور پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ موجودہ کیفیت کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

مثال کے طور پر ایک واقعہ عرض کرتا ہوں کہ آنریبل ملک خضر حیات خاں، وزیر پبلک ورکس نے اسمبلی کے ایوان میں بیان دیا تھا۔ ہوا یوں کہ لاہور شہر کے لئے ایک کارپوریشن قائم کرنے کا مسودۂ قانون پنجاب کی لیجسلیٹو اسمبلی میں پیش ہے۔ پچھلے چالیس سال سے لاہور کی میونسپل کمیٹی میں مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق حاصل ہے۔ اب جو لاہور کارپوریشن کا یہ بل پیش کیا گیا ہے اس میں جداگانہ انتخاب کا حق موجود نہیں۔ میں نے اس موضوع پر پنجاب اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے حکومت کی توجہ دلائی کہ آنریبل مسٹر فضل الحق کی مثال کو سامنے رکھئے جنہوں نے قانون میں یہ شق درج کر دی ہے کہ مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق ملنا چاہئے۔

میری اس درخواست کے جواب میں آنریبل وزیر نے جو تقریر کی تھی اس میں فرمایا تھا۔

"ابھی کل کی بات ہے کہ جنگ کے ریزولیوشن پر ملک برکت علی نے تقریر کرتے ہوئے درجۂ مستعمرات (ڈومینین سٹیٹس) کی مخالفت کی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ جمہوریت کوئی موزوں طرز حکومت نہیں۔ تعجب ہے کہ آج ملک صاحب ایک ہی سانس میں جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ملک صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ آزادی اور جداگانہ انتخاب دو متضاد اصطلاحات ہیں۔"

میں نے آج تک محض اس خیال سے اس حکومت کی حمایت کی ہے کہ سر سکندر نے مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد کی تائید کرنے اور اسمبلی میں ایک حقیقی مسلم لیگ پارٹی قائم کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ صورت حال یہ ہے کہ اسمبلی میں کوئی مسلم لیگ پارٹی نہیں بنائی گئی۔ چنانچہ میرے لئے یہ ناممکن ہو گیا ہے کہ ایک ایسی یونینسٹ حکومت کی مدد کروں جو تمام اہم معاملات میں آل انڈیا مسلم لیگ کی طے شدہ پالیسی کی خلاف ورزی کر رہی ہے۔ شملہ کے مسلمان جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ یہی مطالبہ کر رہے ہیں۔ لیکن یہ حکومت محض ہندوؤں کو خوش کرنے کے لئے مخلوط انتخاب کی تبلیغ کرنے میں مصروف ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ میں اپنے ضمیر کے خلاف اس حکومت کی مدد کرنے پر مجبور کیا جاؤں۔

گزارش یہ ہے کہ ازراہ کرم موجودہ صورت حال کی وضاحت فرما کر مطلع فرمایئے گا کہ کیا آرگنائزنگ کمیٹی ختم ہو گئی ہے یا نہیں۔ حالات ناقابل برداشت صورت اختیار کر گئے ہیں۔ اور میں نے محض مسلم لیگ کے مفاد کے پیش نظر طویل عریضہ خدمت والا میں ارسال کرنے کی جرأت کی ہے۔

اگر آپ کا ارادہ موجودہ آرگنائزنگ کمیٹی کو مزید طول دینے کا ہے تو میری حتمی رائے ہے کہ اس صوبے میں مسلم لیگ کا جنازہ نکل کر رہے گا۔ اور اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آرگنائزنگ کمیٹی کے ختم

کر دینے سے سر سکندر مسلم لیگ سے اپنا تعلق منقطع کر لیں تو میں صاف صاف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اوّل تو سر سکندر ہر گز ایسا قدم نہیں اٹھائیں گے۔ اور اگر انہوں نے بہ فرض محال یہ قدم اٹھایا بھی تو اس طرح وہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنی قبر کھودیں گے۔ یہ حقیقت ہے کہ مسلم لیگ کی وجہ سے سر سکندر کو پبلک میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ بہترین حل یہی ہے کہ آرگنائزنگ کمیٹی کو ختم کر دیا جائے تاکہ سر سکندر کو یقین ہو جائے کہ آپ واقعی معاملہ کو یک سُو کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ اور اب یہ مذاق اور یہ ڈھونگ زیادہ دیر تک آپ کی آنکھوں کے سامنے جاری نہیں رہ سکتا۔

میں اس عریضے کے ہمراہ پنجاب پروانشل مسلم لیگ کے آئین و قواعد کا ایک نسخہ جسے سر سکندر کی آرگنائزنگ کمیٹی نے منظور کیا ہے خدمت والا میں ارسال کر رہا ہوں۔ قاعدہ نمبر ۲۷ اور آخر میں جو شیڈول درج ہیں وہ خصوصیت سے آپ کی توجہ کے محتاج ہیں۔ از راہ کرم بوقت فرصت جواب سے جلد سرفراز فرمایئے گا۔

آپ کا نیاز مند

ملک برکت علی[۱]

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ پنجاب میں کوئی مسلم لیگ کی تحریک نہیں تھی۔ میں نہایت ادب سے ان سے عرض کرتا ہوں کہ جس قدر روداد میں نے اوپر قلم بند کی ہے اسے بغور پڑھ کر بتایئے کہ جو کچھ ہم نے کیا اور جن حالات نامساعد و واقعات مخالف کے اندر رہ کر کیا۔ اگر اس کے برابر یا اس سے زیادہ کرنا ممکن تھا تو یہ نکتہ چیں اصحاب اس وقت کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے اور کیوں آگے نہ بڑھے؟ آج حالات بدل چکے ہیں۔ پاکستان بن گیا ہے۔ اپنی حکومت ہے، اپنا ملک ہے روپے کی ریل پیل ہے۔ چاروں طرف ہُن برس رہا ہے۔ بڑے بڑے عہدے مل گئے ہیں۔ اس لئے آرام کرسیوں پر دراز ہو کر ایک خندۂ استہزاء کے ساتھ یہ کہہ دینا آسان ہے کہ پنجاب میں کوئی مسلم لیگ کی تحریک نہیں تھی[۱]۔

---

۱۔ انگریزی کا اصل خط اس کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ درج کیا گیا ہے۔

عاشق نہ شدی محنتِ اُلفت نہ کشیدی
کس پیشِ تو غم نامۂ ہجراں چہ کشاید

چودھری خلیق الزمان نے اپنی کتاب "پاتھ وے ٹو پاکستان" میں صفحہ نمبر ۲۳۵ پر لکھا ہے کہ ملک برکت علی اور ان کے ساتھیوں نے پنجاب میں مسلم لیگ کی جو شاخیں قائم کی تھیں وہ سراسر "بوگس" تھیں اور سر سکندر کی شاخیں اصلی۔ سچی۔ پکی۔ کھری اور حقیقی تھیں۔

افسوس ہے میں سردست اس موضوع پر کچھ زیادہ لکھنا مناسب نہیں سمجھتا۔ صرف اس کتاب کے پڑھنے والوں سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنے فہم و ادراک کے مطابق فیصلہ کریں کہ چودھری صاحب کی اس روایت میں کتنی صداقت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ہم نے سر سکندر حیات خاں کی خلاف ضابطہ کارروائیوں کے خلاف بہت احتجاج کیا تو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے مجبور ہو کر ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی تھی کہ پنجاب جا کر دریافت کرے کہ مسلم لیگ کی صوبائی شاخ اب تک کیوں قائم نہیں ہوئی۔ اس کمیٹی میں نواب اسمٰعیل خاں۔ راجہ محمود آباد اور چودھری خلیق الزمان شامل تھے۔ یہ واقعہ مارچ ۱۹۴۰ء کے پہلے ہفتے کا ہے۔ تحقیقاتی کمیٹی لاہور آئی۔ نواب نثار علی خاں قزلباش کے دولت کدے پر یہ تینوں اصحاب ٹھہرے۔ وہیں فریقین کی شہادتیں ہوئیں۔ ملک برکت علی۔ غلام رسول خاں، پیر تاج الدین اور راقم التحریر کی شہادت بیک وقت ہوئی جو مسلسل دو دن جاری رہی۔ سر سکندر۔ نواب شاہنواز خاں ممدوٹ اور میاں رمضان علی کی علیحدہ شہادت ہوئی اس کے علاوہ اور بھی بہت سے گواہ، جو بیرون لاہور سے آئے تھے۔ پیش ہوئے۔ تحقیقات کے خاتمے پر نواب اسمٰعیل خاں مرحوم نے ایک نجی محفل میں صاف کہا تھا کہ پنجاب میں کوئی پراونشل مسلم لیگ موجود نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود تحقیقاتی کمیٹی نے سر سکندر حیات خاں کے حق میں اپنی رپورٹ کی۔ ہم لوگ سوائے اس کے کہ اسے اپنی بدقسمتی پر محمول کرتے اور کیا کر سکتے تھے۔

لالہ ساغر گیر و نرگس مست و بر ماںامِ فسق
داورے دارم بسے یارب کرا داور کنم

کوئی مانے یا نہ مانے حقیقت یہ ہے کہ پنجاب میں مسلم لیگ کے وجود کو ختم کرنے میں سب سے زیادہ حصہ دو چیزوں نے لیا ہے۔ ایک اکتوبر ۱۹۳۷ء کا سکندر جناح پیکٹ جس نے عملاً مسلم لیگ کو یونینسٹ پارٹی کی ایک شاخ بنا کر رکھ دیا تھا اور دوسری یہ تحقیقاتی کمیٹی جس نے مسلم لیگ کو بلاچون وچرا اٹھا کر سر سکندر حیات خاں کی جھولی میں ڈال دیا اور یوں گویا لیگ

زیر زمین دفن ہو کر رہ گئی۔

یہاں یہ عرض کرنا غالباً بے محل نہ ہو گا کہ سر سکندر نے مسلم لیگ پر قابض ہوتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ ملک برکت علی۔ غلام رسول خاں، میاں عبدالعزیز، پیر تاج الدین، خلیفہ شجاع الدین، ملک زمان مہدی خاں، میاں عبدالمجید اور عاشق حسین بٹالوی کو بیک جنبش قلم لیگ سے خارج کر دیا۔ حیرت ہے کہ چودھری خلیق الزمان صاحب نے یہ واقعہ بیان کرتے وقت ایسی خوشی اور مسرت کا اظہار کیا ہے، گویا یہ ان کی کوئی بڑی پرانی آرزو تھی جو حسن تدبیر سے بر آئی تھی۔

۸
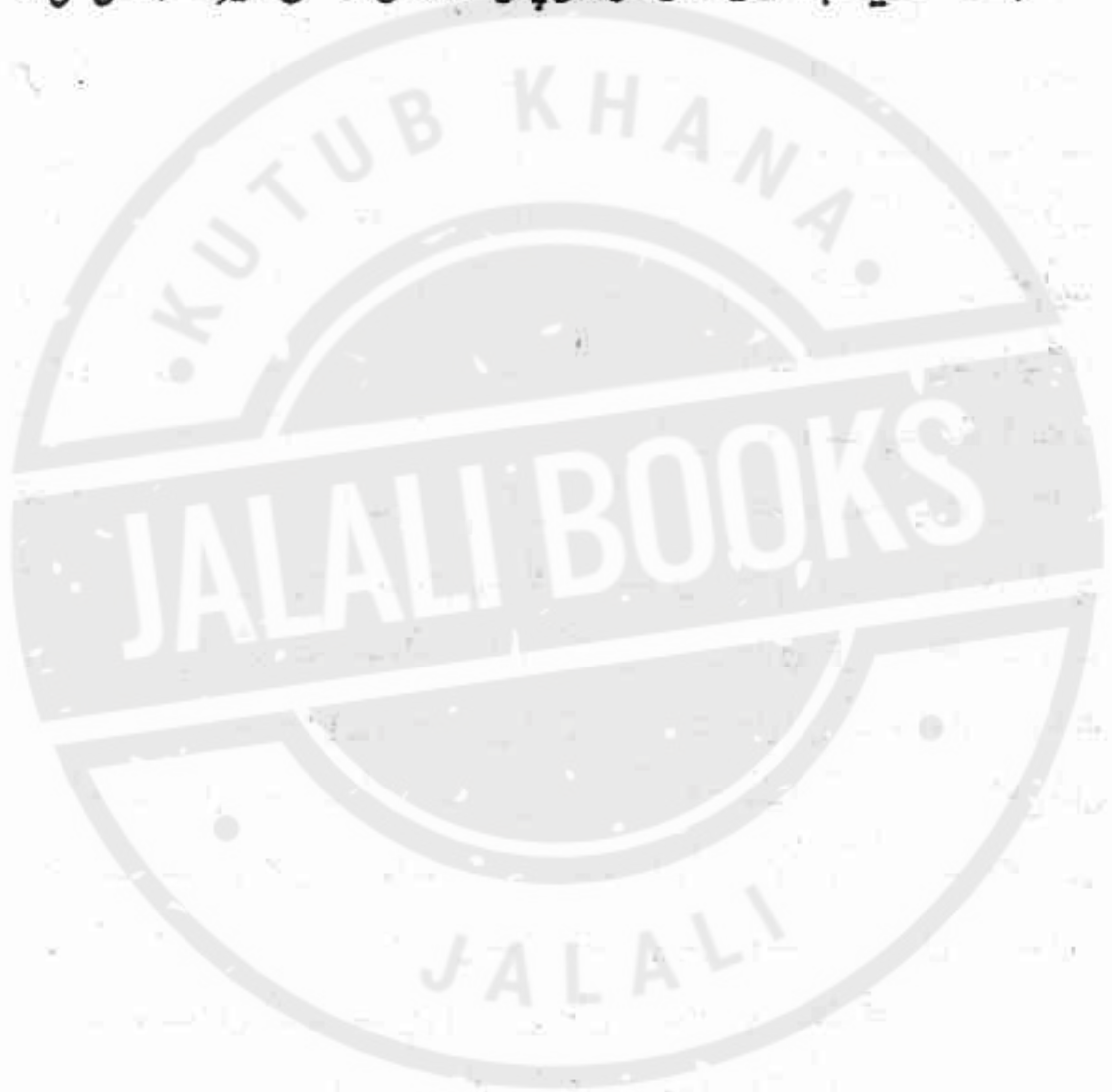
# عالمگیر جنگ نمبر ا

## کانگرس اور مسلم لیگ کا ردِ عمل

یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو جرمنی نے صبح چھ بجے پولینڈ پر حملہ کر کے دوسری عالمگیر جنگ کا آغاز کر دیا۔ اور ۳۔ ستمبر کو دن کے گیارہ بجے برطانیہ اور پانچ بجے سہ پہر کو فرانس نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ یوں اس محاربۂ عظیم کی ابتداء ہوئی۔ جس نے پورے کرۂ ارض کو چھ سال تک آگ اور خون کے سمندر میں غلطاں و پیچاں رکھا۔

ہمیں اس جنگ کے اسباب و علل پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ کم و بیش دنیا کی ہر اہم زبان میں سینکڑوں کتابیں اس موضوع پر شائع ہو چکی ہیں۔ اور ہر روز نئی کتابیں لکھی جا رہی ہیں حقیقت یہ ہے کہ اس جنگ کی بنیاد اسی دن رکھی گئی تھی جب ۱۹۱۴ء والی جنگ عظیم کے خاتمے پر معاہدہ ورسائی مرتب ہوا تھا۔ اور شکست خوردہ جرمنی کو قسم قسم کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا تھا۔ تاہم سیاق و سباق اخذ کرنے کے لئے میں بعض ضروری واقعات کا ترتیب وار تذکرہ کرتا ہوں تاکہ جنگ کا پس منظر سمجھنے میں کسی قدر آسانی ہو۔

۲۸۔ جون ۱۹۱۸ء کو معاہدہ ورسائی مرتب ہوا جس کی رو سے جرمنی پر جو خوف ناک تاوانِ جنگ عائد کیا گیا تھا۔ اس کی ایک معمولی شق یہ تھی کہ جرمنی کو تاوان جنگ کی صرف پہلی قسط آٹھ ارب ڈالر بہ سکۂ زر ادا کرنا پڑی۔ جرمنی کو ایک لاکھ سے زیادہ فوج رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ ٹینک اور جنگی طیارے بنانے کی قطعی ممانعت کر دی گئی تھی۔ ایلس لورین کا علاقہ فرانس کے حوالے کرنا پڑا۔ جرمنی کے ایک صوبے مشرقی پرشیا کو جغرافیائی طور پر جرمنی کی سرزمین سے کاٹ دیا گیا۔ اور دونوں کے درمیان جو علاقہ تھا اسے پولینڈ کے حوالے کیا گیا۔ جرمنی کی مغربی سرحد پر رائن لینڈ کے علاقے کو جرمنی اور فرانس کے درمیان گویا ایک "بفرسٹیٹ" بنا دیا گیا۔ تیس لاکھ جرمنوں کو چیکوسلواکیہ کے اندر دھکیل دیا گیا۔

۱۲۔ ستمبر ۱۹۱۸ء کو ہٹلر نے جرمنی کی مزدوروں کی انجمن میں شرکت کی جس نے آگے چل کر نازی پارٹی کا نام اختیار کیا۔

۳۱۔ جولائی ۱۹۱۸ء کو وائمر میں جرمن نیشنل اسمبلی منعقد ہوئی جس نے جرمنی کے لئے جمہوریہ وائمر کا دستور منظور کیا۔

جنوری ۱۹۲۰ء میں جمعیت اقوام (لیگ آف نیشنز) کی بنیاد رکھی گئی۔

جون ۱۹۲۱ء میں ہٹلر کو نازی پارٹی کا لیڈر منتخب کیا گیا۔

**۲۸۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو مسولینی نے اپنے پچیس ہزار فاشی سپاہیوں کے لشکر کے ساتھ روم پر قبضہ کر لیا۔ اور یوں اٹلی میں فاشی نظام حکومت رائج ہوا۔**

**۸۔ نومبر ۱۹۲۳ء کو ہٹلر نے میونک میں انقلاب برپا کرنے کی ناکام کوشش کی۔**

یکم دسمبر ۱۹۲۵ء کو جرمنی۔ بلجیم۔ فرانس۔ برطانیہ اور اٹلی میں لوکارنو کے مقام پر ایک معاہدہ ہوا کہ کوئی ملک دوسرے ملک پر حملہ نہیں کرے گا۔

ستمبر ۱۹۲۶ء میں جرمنی کو جمعیت اقوام کا رکن بنالیا گیا۔

اکتوبر ۱۹۲۹ء میں امریکہ کے مالی خسارے کی وجہ سے جرمنی کو ایک خوفناک اقتصادی بحران سے دوچار ہونا پڑا جس کے نتائج بڑے دوررس ثابت ہوئے۔

ستمبر ۱۹۳۰ء میں جرمن پارلیمنٹ (رائشتاغ) کے نئے انتخابات ہوئے تو نازی پارٹی کو ۶۵ لاکھ ووٹ ملے۔ اور اس کے ۱۰۷ ممبر منتخب ہوئے۔

ستمبر ۱۹۳۱ء میں جاپان نے منچوریا پر حملہ کر دیا۔ جمعیت اقوام نے احتجاج کیا تو جاپان نے جمعیت کی ممبری ترک کر دی۔

جولائی ۱۹۳۲ء میں رائشتاغ کے نئے انتخابات ہوئے تو ہٹلر نے یہودیوں اور کمیونسٹوں کے خلاف زوردار تقریریں کیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نازی پارٹی کو ایک کروڑ چالیس لاکھ ووٹ حاصل ہوئے اور اس کے ۲۳۰ ممبر منتخب ہوئے اور نازی پارٹی ایوان کی سب سے بڑی پارٹی بن گئی۔ ہٹلر کے چانسلر بننے کا کچھ امکان پیدا ہوا تھا۔ لیکن بعد میں اس کو وائس چانسلر کا منصب پیش کیا گیا جسے اس نے ٹھکرا دیا۔

جون ۱۹۳۳ء میں نئے انتخابات ہوئے تو ہٹلر چانسلر بن گیا۔

۲۳۔ مارچ ۱۹۳۳ء کو رائشتاغ نے ایک قانون پاس کر کے ہٹلر کو مختار مطلق بنا دیا۔

۳۰۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو ہٹلر نے اپنے تمام بڑے بڑے مخالفوں کو قتل کروا کے فوج پر پورا اقتدار حاصل کر

لیا۔

۲۔ اگست ۱۹۳۴ء کو صدر ہنڈن برگ فوت ہو گیا تو ہٹلر جرمنی کا صدر بھی بن گیا۔

یکم اکتوبر ۱۹۳۴ء کو ہٹلر نے عملاً معاہدہ و رسائی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے حکم دیا کہ جرمنی کی فوج تین لاکھ کر دی جائے۔ جنگی طیارے بنائے جائیں اور بحری جہازوں کی تعداد میں بھی اضافہ کیا جائے۔

۳۔ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو اٹلی نے حبشہ پر حملہ کر دیا۔ جمعیت اقوام نے احتجاج کیا، لیکن مسولینی نے قطعاً پروانہ کی۔

۷۔ مارچ ۱۹۳۶ء کو ہٹلر نے معاہدہ ورسائی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے رائن لینڈ پر قبضہ کر لیا۔ اور برطانیہ اور فرانس منہ دیکھتے رہ گئے۔ جمعیت اقوام بھی خاموش رہی۔ یورپ کے بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ ہٹلر نے بعد میں اعتراف کیا تھا کہ رائن لینڈ میں جرمن فوجیں داخل کرنے کے بعد از تالیس ۴۸ گھنٹے جس جان لیوا اضطرابہ میں اس نے گزارے تھے۔ اس کی مثال زندگی بھر نہیں ملتی۔ ہٹلر نے بعد ازاں یہ بھی کہا تھا کہ اگر فرانس اس وقت رائن لینڈ پہ ہلہ بول دیتا تو جرمن فوجوں کو دُم دبا کر وہاں سے بھاگنا پڑتا۔

۱۶۔ جولائی ۱۹۳۶ء کو سپین میں خانہ جنگی شروع ہوئی جس کا اثر سارے یورپ کی سیاست پر پڑا۔ فرانکو نے سپین کی جمہوری حکومت کو تہس نہس کرنے کے لئے باہر سے فوج بھرتی کر کے حملہ کر دیا۔ انگلستان اور فرانس اس خانہ جنگی میں غیر جانب دار تھے۔ لیکن اٹلی اور جرمنی نے کھلم کھلا فرانکو کی مدد کی۔ اس طرح سپین دراصل یورپ کی جمہوری حکومتوں اور ڈکٹیٹروں کی باہمی جنگ کا ایک بین الاقوامی اکھاڑہ بن گیا۔ بالآخر فرانکو کو فتح ہوئی جس سے مسولینی اور ہٹلر کے سر اور اونچے ہو گئے۔ اسی جنگ میں جرمنی نے اپنے نئے تیار شدہ اسلحہ کی آزمائش کی اور اس کی ہلاکت آفرینی کا نظارہ دیکھا۔

۲۵۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو ہٹلر اور مسولینی کا باہمی معاہدہ ہوا اور برلن اور روم کا مشہور محور ظہور میں آیا۔

۲۵۔ نومبر ۱۹۳۶ء کو ہٹلر نے جاپان کے ساتھ روس کے خلاف معاہدہ کیا۔

۴۔ فروری ۱۹۳۸ء کو ہٹلر کی فوجیں یلغار کرتی ہوئی آسٹریا میں داخل ہو گئیں۔ برطانیہ، فرانس اور جمعیت اقوام کی بے بسی اس وقت دیکھنے کے قابل تھی۔ ۱۳۔ مارچ کو ہٹلر نے آسٹریا کو جرمنی کے ساتھ باقاعدہ ملحق کر لیا۔

۳۰۔ ستمبر ۱۹۳۸ء کو برطانیہ اور فرانس کے وزراء اعظم اور ہٹلر کے درمیان میونک کے مقام

پر معاہدہ ہوا کہ چیکوسلواکیہ کا وہ حصہ جہاں تیس لاکھ جرمن آباد تھے اور جو سوڈیٹن لینڈ کہلاتا تھا بلا شرط جرمنی کے حوالے کر دیا جائے۔ چیکوسلواکیہ کے پاس اس وقت دس لاکھ مسلح فوج اور بہترین اسلحہ موجود تھا اور ہٹلر ڈرتا تھا کہ اگر یہ دس لاکھ کا لشکر سامنے آگیا تو مقابلہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔ لیکن برطانیہ اور فرانس نے چیکوسلواکیہ کے جمہوری صدر ڈاکٹر بے نیش سے صاف کہہ دیا کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ تمہیں سوڈیٹن لینڈ کا علاقہ ہٹلر کے حوالے کرنا ہی پڑے گا۔ برطانیہ اور فرانس کے بعض لوگوں نے دبی زبان سے احتجاج بھی کیا کہ ہمیں اس طرح کسی دوسرے ملک کا سودا چکانے کا کوئی حق نہیں۔ بہتر یہ ہو گا کہ سوڈیٹن لینڈ میں استصواب کرا لیا جائے۔ لیکن برطانیہ کا وزیر اعظم نیول چیمبر لین اور فرانس کا وزیر اعظم والا دیئر تلے ہوئے تھے کہ ہٹلر کی جوع الارض پوری کرنے کے لئے یہ مطالبہ مان لیا جائے۔ چنانچہ چیکوسلواکیہ کی حکومت سے پوچھے بغیر ۳۰۔ ستمبر ۱۹۳۸ء کو برطانیہ۔ فرانس اور ہٹلر کے درمیان وہ مشہور میونک پیکٹ ہو گیا جس کی رو سے یکم اکتوبر ۱۹۳۸ء کو ہٹلر کی فوجوں نے اپنی سرحد عبور کر کے سوڈیٹن لینڈ پر قبضہ کر لیا۔ چیکوسلواکیہ کا صدر ڈاکٹر بے نیش استعفاء دے کر انگلستان آگیا اور یہاں سے امریکہ چلا گیا۔

تیس سال گذر چکے ہیں۔ لیکن یہ میونک پیکٹ آج تک انگلستان۔ فرانس اور روس کے مورخوں اور مصنفوں میں بحث و تکرار کا موضوع بنا ہوا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اگر اس وقت نیول چیمبر لین اور والادیئر حوصلہ اور ہمت سے کام لیتے۔ اور ہٹلر کے سامنے یوں گھٹنے نہ ٹیک دیتے تو عالمگیر جنگ ٹل جاتی۔ جب شیر کے منہ کو لہو لگ جائے تو ہر روز نیا شکار تلاش کرتا ہے۔ یہی کچھ حال ہٹلر کا ہو گیا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ برطانیہ اور فرانس میں کوئی دم خم نہیں اور اس کی ہر شرط کو بلا چون و چرا تسلیم کر رہے ہیں تو اس کے مطالبات میں نت نیا اضافہ ہونا شروع ہوا۔

لطف یہ ہے کہ ایک طرف فرانس اور چیکوسلواکیہ اور دوسری طرف روس اور چیکوسلواکیہ کے درمیان باہمی امداد و اعانت کے معاہدے موجود تھے۔ فرانس نے حد درجہ طوطا چشمی سے کام لیا۔ اور باہمی معاہدے کا احترام کرنے کی بجائے الٹا چیکوسلواکیہ کا ایک حصہ کاٹ کر چپکے سے ہٹلر کے حوالے کر دیا۔ روس یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس تمام سودے بازی کے دوران میں اس سے پوچھا تک بھی نہیں گیا تھا۔ بلکہ جب روسی نمائندوں نے فرانسیسی حکومت سے دریافت کیا کہ آیا وہ چیکوسلواکیہ سے اپنے معاہدے کی بنا پر روس کے ساتھ مل کر چیکوسلواکیہ کی مدد کو تیار ہے تو فرانسیسی وزراء نے روکھے منہ سے صرف یہ جواب دیا کہ اگر برطانیہ جنگ میں کودنے کو تیار ہے تو ہم بھی تیار ہیں۔ ادھر برطانیہ کی حالت یہ تھی کہ وہاں

روس اور اس کے "بالشوزم" کو شک و شبہ ہی نہیں بلکہ نفرت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ اور روس سے کسی قسم کی مفاہمت کرنا گویا برطانیہ کے نزدیک خارج از بحث تھا۔

میونک پیکٹ کو صرف ساڑھے پانچ مہینے گزرنے پائے تھے کہ ۱۵۔ مارچ ۱۹۳۹ء کو ہٹلر کی فوجیں یلغار کرتی ہوئی چیکوسلواکیہ کے دارالسلطنت پراگ میں داخل ہو گئیں۔ اور پورے چیکوسلواکیہ پر جرمنی نے قبضہ کر لیا۔ یوں مشرقی یورپ کی اس جمہوری حکومت کا بے دردی سے خاتمہ ہوا۔ جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ یورپ کی مثالی جمہوریہ تھی۔

۱۵۔ مارچ کے بعد برطانیہ کے وزیر اعظم نیول چیمبرلین کو یقین ہو گیا کہ ہٹلر کی کسی بات پر اعتبار نہیں کرنا چاہئے۔ اور یہ کہ اب یورپ کی جنگ چھڑنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ چیکوسلواکیہ سے فارغ ہو کر ہٹلر نے پولینڈ کی طرف توجہ کی۔ کیونکہ جرمنی کے ایک صوبے مشرقی پرشیا اور جرمنی کی سرزمین کے درمیان پولینڈ کا ایک ٹکڑا حائل تھا. جسے عام طور پر انگریزی میں پولش کاریڈور کہا جاتا تھا۔ ہٹلر کا مطالبہ یہ تھا کہ ڈینزگ کا شہر اس کے حوالے کیا جائے تاکہ اسے پولش کاریڈور میں سے گذرنے کی کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ پولینڈ یہ مطالبہ ماننے سے انکار کرتا تھا۔

جرمنی کے اصرار اور پولینڈ کے انکار کی وجہ سے عجیب صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ روس اور جرمنی کے درمیان پولینڈ واقع تھا۔ روس کو اندیشہ تھا کہ اگر ہٹلر نے پولینڈ پر قبضہ کر لیا تو جرمنی اور روس کی سرحدیں مل جائیں گی۔ اور اس کے بعد یقیناً روس ہی کو ہٹلر کا شکار بننا پڑے گا۔ روس کے سامنے دو راستے کھلے تھے۔ ایک یہ کہ فرانس اور برطانیہ کو دوبارہ پکارا جائے کہ آؤ ہم تینوں مل کر اس فتنے کا سدباب کریں۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ اپنی جان بچانے کے لئے ہٹلر سے غیر جارحانہ معاہدہ کر لیا جائے۔ چنانچہ پہلے اس نے برطانیہ سے گفت و شنید شروع کی۔ لیکن برطانیہ کا رویہ سرے سے ناقابل فہم تھا۔ روس نے یہ محسوس کیا کہ برطانیہ حقیقتہً ہٹلر سے ٹکر لینا نہیں چاہتا بلکہ محض روس کی آڑ لے کر جرمنی پر لفظی دھونس جما رہا ہے۔

اب روس نے اپنی حکمت عملی کا آخری پتہ کھیل دیا اور ۲۳۔ اگست ۱۹۳۹ء کو جرمنی سے ایک غیر جارحانہ معاہدہ کر لیا کہ دونوں میں سے کوئی ملک بھی ایک دوسرے پر حملہ نہیں کرے گا۔ اس معاہدے کی ایک خفیہ شق یہ بھی تھی کہ پولینڈ کو روس اور جرمنی میں برابر تقسیم کر دیا جائے گا۔

۲۵۔ اگست ۱۹۳۹ء کو برطانیہ نے پھر اعلان کیا اگر پولینڈ پر حملہ ہوا تو برطانیہ پولینڈ کی مدد کرے گا۔ لیکن لوگ حیران تھے کہ روس کو ساتھ ملائے بغیر تنہا برطانیہ کیونکر پولینڈ کی مدد کر سکتا ہے۔

یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو جرمنی نے باقاعدہ اعلان جنگ کئے بغیر پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ اگلے روز ۲۔ ستمبر کو

برطانیہ کے وزیر اعظم نیول چیمبرلین نے ہٹلر کو الٹی میٹم بھیجا کہ اگر اس نے اپنی فوجیں پولینڈ سے واپس نہ بلائیں تو برطانیہ اعلان جنگ کرنے پر مجبور ہو گا۔ ہٹلر نے اس دھمکی کی کوئی پروانہ کی۔ لہٰذا ۳۔ ستمبر کو برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

جنگ چھڑتے ہی ہندوستان کی سیاسی فضا میں بھی تموج پیدا ہوا چنانچہ ۳۔ ستمبر ہی کو وائسرائے نے ہندوستان کی طرف سے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اس طرح ہندوستان بھی اس محاربہ عظیم میں برطانیہ کا حلیف اور جرمنی کا مخالف بن کر میدان میں اتر آیا۔

یہ نکتہ اس وقت بھی موضوع بحث تھا اور آج بھی ایک ایسا نقاد اسے زیر بحث لانے پر مجبور ہے کہ کیا وائسرائے از خود ہندوستان کو جنگ میں دھکیل دینے کا مجاز تھا؟ آئینی لحاظ سے اس سوال کا جواب یہ ہے کہ وائسرائے کو یقینا یہ اختیار تھا کہ مرکزی اسمبلی سے مشورہ کئے بغیر ہندوستان کی طرف سے اعلان جنگ کرے۔ اگر ہندوستان بھی آسٹریلیا۔ نیوزی لینڈ۔ کینیڈا اور جنوبی افریقہ کی طرح ایک ڈومینین ہوتا تو لامحالہ جنگ میں شرکت یا عدم شرکت کا فیصلہ ہندوستان کی پارلیمینٹ کی منظوری سے کیا جاتا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان اس وقت ڈومینین نہیں تھا۔ اور یہ ڈومینین سٹیٹس یعنی درجہ مستعمرات ہی تو تھا جس کے لئے ہم پچھلے بیس سال سے مسلسل جدوجہد کرتے آرہے تھے ا۔ تاہم ۴۔ ستمبر ۱۹۳۹ء کو ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے لیڈر اور حکومت ہند کے لاء ممبر سر محمد ظفر اللہ خاں نے ایوان میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "مجھے یقین ہے کہ ہم میں سے ہر شخص وہ فرض ادا کرنے کو آمادہ ہے جو ملک معظم اور ملک کی جانب سے ہم سب پر عائد ہوتا ہے۔"

سر ظفر اللہ خاں کی اس تقریر پر مرکزی اسمبلی کے کسی کانگرسی یا غیر کانگرسی ممبر نے اعتراض نہ کیا۔ اور سب نے خاموشی سے یہ تقریر سنی۔ یہی کیفیت کونسل آف سٹیٹ میں بھی پیش آئی۔ وہاں بھی ایوان کے قائد کی تقریر پر کوئی اعتراض نہ ہوا۔ ۱۱۔ ستمبر کو مرکزی اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ کے

---

ا۔ فلپ وڈرف نے اپنی ایک کتاب میں اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھا:

"آئینی لحاظ سے پوزیشن یہ تھی کہ جونہی ملک معظم نے اعلان جنگ کیا ہندوستان خود بخود جنگ میں شریک ہو گیا۔ مستعمرات کی مانند ہندوستان کی طرف علیحدہ اعلان جنگ کی ضرورت نہ تھی۔ یہ ایک ٹیکنیکل نکتہ تھا۔ جسے یقیناً حل کیا جا سکتا اور اس قسم کا بندوبست کیا جا سکتا تھا کہ ہندوستان اپنی طرف سے جنگ کا اعلان کرتا۔ لیکن اس وقت کسی کو اس بات کا خیال نہ آیا۔ یہ بےعونت تجنتر یا عداوت نہ تھی جس کی وجہ سے ہندوستان کے کسی بڑے لیڈر سے مشورہ کئے بغیر ہندوستان کو جنگ میں شامل کر دیا گیا تھا۔ یونہی کسی کو اس وقت اس کا خیال نہیں آیا۔ اور اگر کسی شخص کو اس وقت یہ خیال آتا بھی تو آپ یقین کیجئے گا کہ قانونی نقطہ نگاہ سے فوراً اسے مسترد کر دیا جاتا۔" The Guardian

مشترکہ اجلاس میں وائسرائے نے تقریر کی۔ اور ملک معظم کا ایک پیغام پڑھ کر سنایا کہ ہندوستان اس جنگ میں پوری تن دہی اور استقلال سے حصہ لے گا۔ اور ہر قسم کی امداد برطانیہ کو دے گا۔ اگرچہ آئینی روایات کے مطابق بادشاہ کے اس پیغام پر ایوان میں جرح وقدح نہیں ہو سکتی تھی۔ تاہم اظہار خیال یا اظہار ناراضی کے کچھ اور طریقے تو پیدا کئے جاسکتے تھے۔ لیکن کسی نے احتجاج کے طور پر کچھ نہیں کہا۔

جنگ کا اعلان ہوتے ہی وائسرائے نے ڈیفنس آف انڈیا آرڈی ننس جاری کر دیا۔ دو دن کے بعد ۵۔ ستمبر کو اس آرڈی ننس کی بجائے حکومت ہند کے لاء ممبر نے ڈیفنس آف انڈیا کا ایک مسودہ قانون مرکزی اسمبلی میں پیش کیا جس پر چار روز بحث ہوتی رہی۔ پھر اسے ایک منتخب کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا جس کی اکثر سفارشیں اور ترمیمیں حکومت نے منظور کرلیں۔ ۱۹ ستمبر کو مرکزی اسمبلی میں یہ مسودۂ قانون رائے شماری کے بغیر پاس ہو گیا۔ ۲۷ ستمبر کو اسی طرح رائے شماری کے بغیر ہی کونسل آف سٹیٹ میں بھی پاس ہو گیا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر وائسرائے خود بخود ہندوستان کی طرف سے اعلان جنگ کرنے کی بجائے یہ معاملہ مرکزی اسمبلی میں پیش کرتا تو پھر کیا ہوتا۔ کیا ایوان منظوری دیتا کہ ہاں جنگ میں شرکت کرنی چاہئے یا کیا ایوان منظوری دینے سے انکار کرتا؟ فرض کیجئے کہ حزب مخالف کا لیڈر بھولا بھائی ڈیسائی بحث کے آغاز ہی میں حکومت سے یہ پوچھتا کہ اگر ہم نے جنگ میں شریک ہونے سے انکار کیا تو کیا پھر بھی آپ ہندوستان کو جنگ میں شریک کریں گے؟ جواب میں حکومت اگر یہ کہتی کہ تم انکار کرو یا اقرار کرو، ہم ہر صورت میں ہندوستان کی طرف سے اعلان جنگ کریں گے تو حزب مخالف لیڈر یہ کہتا کہ بہت اچھا اگر آپ کا یہی ارادہ ہے تو پھر ہم سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ جو جی میں آئے کیجئے چنانچہ یہ بحث مباحثہ وہیں ختم ہو جاتا ہے۔ ہاں! آج ماضی پر ایک نظر ڈال کر زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر بفرض محال مرکزی اسمبلی شرکت جنگ کے خلاف فیصلہ کرتی تو برطانیہ کا بین الاقوامی وقار بہت کم ہو جاتا۔

لیکن صورتحال قدرے مختلف تھی۔ ۳/ ستمبر کو اعلان جنگ ہوا۔ اور دو روز بعد ۵۔ ستمبر کو وائسرائے نے اس معاملہ پر گفتگو کرنے کے لئے گاندھی جی کو شملہ آنے کی دعوت دی۔ وائسرائے سے ملاقات کرنے کے بعد گاندھی جی نے ۹۔ ستمبر کو اپنے اخبار ہریجن میں لکھا:

> "ہزایکسی لینسی سے میں نے عرض کیا تھا کہ خالص انسانی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو میری جملہ ہمدردیاں انگلستان اور فرانس کے ساتھ ہیں۔ میں نے یہ عرض کیا تھا کہ میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ لندن، جسے اب تک ایک

ناقابل تسخیر شہر خیال کیا جاتا ہے، دشمن کے ہاتھوں تباہ ہو جائے۔ اس بات کے تصور ہی سے میرا دل لرز اٹھتا ہے۔ اور جب میں وائسرائے کے سامنے پارلیمینٹ کے ایوان اور ویسٹ منسٹر ایبے کا نقشہ لفظوں میں کھینچ رہا تھا۔ اور چشم تصور سے یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ مبادا یہ عمارتیں چکنا چور ہو جائیں تو میری آنکھوں سے زار زار آنسو بہنے لگے۔"

اسی مضمون میں آگے چل کر گاندھی جی نے لکھا تھا کہ:

"میں اس وقت ہندوستان کی آزادی کا خیال نہیں کر رہا۔ یہ آزادی تو بہر حال مل ہی جائے گی۔ لیکن اگر انگلستان اور فرانس کو شکست ہو گئی یا اگر جرمن پر فتح ہوئی بھی اور خود یہ دونوں ملک نڈھال اور تباہ ہو گئے تو ایسی آزادی ہمارے کس کام کی ہو گی!"

پنڈت جواہر لال نہرو جنگ چھڑنے سے پہلے چین کے دورے پر گئے ہوئے تھے۔ جنگ چھڑتے ہی فوراً واپس ہندوستان آئے۔ اور یہاں پہنچ کر جو پہلا اخباری بیان انہوں نے ۱۰۔ ستمبر کو دیا اس میں فرمایا:

"ہم جنگ کو اس نقطہ نگاہ سے نہیں دیکھ رہے کہ برطانیہ کی موجودہ مشکلات سے فائدہ اٹھایا جائے۔ ایسی جنگ جس میں ایک طرف جمہوریت اور آزادی کی طاقتیں اور دوسری طرف فاشزم اور تشدد کی طاقتیں صف آراء ہوں۔ ہماری ہمدردیاں لازماً جمہوری طاقتوں کے ساتھ ہوں گی ............

میں چاہتا ہوں کہ ہندوستان ایک نیا نظام پیدا کرنے کے لئے اس جنگ میں پوری سرگرمی اور ساز و سامان سے حصہ لے۔"

اس سلسلہ میں مرکزی اسمبلی کی کانگرس پارٹی کے ڈپٹی لیڈر ستیہ مورتی کا یہ اعلان بھی، جو ۲۵۔ ستمبر کو روزنامہ "مدراس میل" میں شائع ہوا تھا پڑھنے کے قابل ہے۔

"میں سمجھتا ہوں کہ اگر بدقسمتی سے ہمیں کچھ مزید عرصے کے لئے کسی غیر ملک کی غلامی میں رہنے پر مجبور کیا جائے تو بہتر یہ ہے کہ بجائے جرمنی کے ہم برطانیہ ہی کے تحت زندگی بسر کریں۔ بلاشبہ انگریزوں میں بہت سے نقائص ہیں اور انہوں نے ہمارے ساتھ بہت سی ناانصافیاں بھی کی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ صرف انگریز ایک ایسی قوم ہے جو اصولوں کی پیروی اور رائے عامہ کا احترام کرتی ہے۔ اور جس میں شرافت کی حس اور سیاسی دیانت موجود

ہے۔ برعکس اس کے ہٹلر توڈنکے کی چوٹ اپنے آپ کو دنیا کی تمام سیاہ اقوام کا دشمن قرار دیتا ہے۔ اگر آج ہندوستان پر ہٹلر کی حکومت ہوتی تو وہ یقیناً مہاتما گاندھی کو اور ہم سب کو گولی سے اڑا دیتا۔ ہٹلر کا راج انگریز کے راج سے ہزار گنا بدتر ہوگا۔ ہم سوراج چاہتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم کسی اور ملک کو ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دیں۔"

مسلم اکثریت کے دو بڑے صوبوں یعنی بنگال اور پنجاب کے وزراء اعظم نے بھی جنگ چھڑتے ہی برطانیہ کی غیر مشروط مدد کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔ سر سکندر حیات خاں تو ستمبر ۱۹۳۸ء ہی سے باآواز بلند یہ کہہ رہے تھے کہ اگر جنگ شروع ہوئی تو پنجاب کے تمام ملی وسائل برطانیہ کی خدمت کے لئے حاضر ہیں۔ جنگ چھڑنے سے ہفتہ بھر پہلے جب دنیا کے افق پر سیاہ بادل چھا رہے تھے، سر سکندر حیات خاں نے ۲۵۔ اگست ۱۹۳۹ء کو ایک طویل بیان میں فرمایا تھا کہ:

"پنجاب کے نوجوان اور پنجاب کے تمام وسائل، بلا تأمل اور بغیر کسی حیل وحجت کے برطانیہ اور دیگر اتحادی طاقتوں کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔ تاکہ ہم اس طرح مادر ملت کی خدمت کر سکیں۔ اور حق و انصاف اور آزادی کا نام بلند ہو۔"

۱۳۔ ستمبر کو سر سکندر نے ایک اور تقریر میں جو انہوں نے امرتسر میں کی تھی یہ کہا کہ:

"مجھے ان لوگوں سے اتفاق ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان کو امپریل جنگوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہئے۔ لیکن آج آپ کو انگلستان کی خاطر نہیں بلکہ اپنے گھر کی حفاظت اور حق و انصاف کی خاطر لڑنا ہے۔ اس طرح ہم دنیا کے دیگر اسلامی ممالک کے پہلو بہ پہلو ایک ہی قطار میں کھڑے ہو سکیں گے۔"

پنڈت جواہر لال نہرو کا ۱۰۔ ستمبر کا بیان آپ اوپر ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اس کے دو ہفتے بعد لکھنؤ کے مشہور اینگلو انڈین اخبار روزنامہ پائنیر کے انگریز ایڈیٹر ڈیسمنڈ ینگ کی ملاقات پنڈت جی سے ہوئی اور دونوں میں اس بات پر تبادلہ خیال ہوا کہ کانگرس کن شرائط پر حکومت کی مدد کرنے کو تیار ہو سکتی ہے۔ ڈیسمنڈ ینگ نے یہی روئداد اپنی خود نوشت سوانح عمری میں قلم بند کی ہے۔ لکھتے ہیں:

"ستمبر ۱۹۳۹ء کا ذکر ہے۔ میں ایک روز مسز پنڈت ا۔ کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ مسز پنڈت نے مجھ سے پوچھا کہ میرے بھائی یہیں ہیں۔ کیا آپ ان سے ملنا پسند کریں گے؟ میں نے اس موقع کو غنیمت جانا کہ جواہر لال نہرو سے مل کر معلوم کرنا چاہئے کہ کانگرس کن شرطوں پر اس جنگ کی مکمل امداد کرنا منظور کرتی ہے۔ کیونکہ اس وقت اکثر صوبوں میں کانگرسی حکومتیں برسراقتدار تھیں۔

پنڈت نہرو نے مجھ سے جو شرطیں بیان کیں وہ خاصی معقول تھیں۔ انہوں نے فرمایا کہ ہمیں حکومت ہند میں عہدہ ملنا چاہئے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم جنگ لڑنے یا جنگی پالیسی وضع کرنے میں دخل دیں گے۔ یہ ایک ٹیکنیکل کام ہے جس کا ہمیں کچھ تجربہ نہیں مثلاً اگر ہندوستانی فوجیں ہندوستان سے باہر بھیجی جائیں گی تو ہمیں اس پر اعتراض نہیں ہو گا۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ فوجیں بھیجنے سے پہلے ہم سے مشورہ کر لیا جائے گا۔ اسی طرح جنگی صنعتوں کے لئے بھرتی کرتے وقت بھی ہم سے مشورہ کرنا ہو گا اگر یہ شرطیں مان لی جائیں تو ہم سو فی صد حکومت کے ساتھ ہیں۔ ہم کانگرس والوں میں سے اکثر آپ کی طرح فاشیوں اور نازیوں کے سخت دشمن ہیں۔

میں نے پنڈت نہرو سے پوچھا کیا آپ حکومت ہند میں کوئی عہدہ قبول کرنا پسند کریں گے؟ انہوں نے جواب دیا کہ کانگرس کی ورکنگ کمیٹی جو فیصلہ کرے گی اس کی پابندی ہم کریں گے۔ اگر ورکنگ کمیٹی نے میرا نام تجویز کیا تو میں حکومت ہند میں شامل ہو جاؤں گا ورنہ کوئی اور شخص بھیج دیا جائے گا۔

میں نے اس ملاقات کی روئداد اپنے سیکرٹری سے قلم بند کروا کے مسودہ جواہر لال نہرو کو ٹیلی فون پر پڑھ کر سنایا۔ انہوں نے کہا کہ جملہ شرائط من و عن صحیح درج کی گئی ہیں۔ پھر میں یہ مسودہ لے کر گورنر سرہیری ہیگ کے پاس گیا۔ وہ پڑھ کر بہت متاثر ہوئے۔ میں چونکہ

---

ا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی چھوٹی بہن۔ مسز وجے لکشمی پنڈت۔

اگلے روز دہلی جا رہا تھا۔ گورنر نے کہا کہ آپ یہ مسودہ وائسرائے کو جا کر دکھایئے۔ میں ٹیلیفون کر کے آپ کی ملاقات کا انتظام کئے دیتا ہوں۔

وائسرائے کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ان کے پرائیویٹ سکرٹری سر گلبرٹ لیتھ ویٹ ا۔ نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کو وائسرائے سے کام کیا ہے؟ جب میں نے انہیں کام کی نوعیت بتائی اور مسودہ بھی دکھایا تو وہ ناک بھوں چڑھا کر کہنے لگے۔ آپ ہرگز اس شخص (نہرو) کے لفظوں پر اعتبار نہیں کر سکتے۔ آپ خواہ مخواہ وائسرائے کا وقت ضائع کر رہے ہیں۔

لیکن لارڈ لنلتھگو کا انداز فکر مختلف تھا۔ مسودہ پڑھ کر وہ نصف گھنٹہ مجھ سے سوالات کرتے رہے۔ مثلاً کیا آپ کے خیال میں نہرو کی بات پر اعتبار کرنا چاہئے؟ کیا کانگرس ورکنگ کمیٹی نہرو کی تائید کرے گی؟ کیا نہرو ملاقات کے لئے آنا پسند کرے گا؟ گاندھی کے بارے میں کیا رائے ہے؟

میں نے عرض کیا کہ اگر ان شرائط پر کانگرس کو شرکت کی دعوت دی جائے تو غالباً وہ انکار نہیں کرے گی۔ اور بالفرض اس نے اگر انکار کیا بھی تو ہماری پوزیشن مضبوط ہو جائے گی۔ ہم یہ ثابت کر سکیں گے کہ ہم جنگ جاری رکھنے میں ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی کی شرکت کے خواہاں ہیں۔ گاندھی، ممکن ہے اپنی امن پرستی اور عدم تشدد کے باعث باہر رہے۔ وہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر کانگرس کے باقی لیڈر حکومت کے ساتھ مل گئے تو گاندھی کم سے کم غیر جانب دار رہے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر نہرو کے لفظوں پر اعتبار کر لیا جائے تو فائدہ ہی فائدہ ہے۔

لارڈ لنلتھگو، میری باتیں سن کر کچھ نیم دلی کے ساتھ رضا مند ہوئے۔ لیکن جونہی میں باہر نکلا لیتھ ویٹ کمرے میں داخل ہوئے۔

1. Sir Gilbert Laithwaite

اور مجھے یہ دھڑکا ہوا کہ آخری بات لیتھ ویٹ ہی کی ہو گی جس کی ہم نوائی وائسرائے کی کونسل کے وہ ممبر بھی کریں گے جو کانگرس کے سخت دشمن ہیں چنانچہ آگے چل کر یہی کچھ ہوا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں میری اس تجویز کا کیا حشر ہوا۔ میں اسے اخبار میں شائع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ میں نے جواہر لال سے وعدہ کیا تھا کہ جب تک حکومت پچاس فی صد رضامندی کا اظہار نہیں کرے گی میں اسے شائع نہیں کروں گا۔"[1]

اس میں کوئی شک نہیں کہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے انگریز ممبر نہیں چاہتے تھے کہ سیاسی جماعتوں کا ہندوستان کی مرکزی حکومت میں عمل دخل ہو۔ انہیں غالباً یہ اندیشہ بھی ہو گا کہ اگر دوران جنگ میں سیاسی جماعتوں کے نمائندے ایگزیکٹو کونسل میں آ گئے تو یک دلی اور یک جہتی کے ساتھ کام جاری رکھنا محال ہو گا۔ لارڈ لنلتھگو کے متعلق بھی اکثر لوگوں کا خیال یہ ہے کہ بہت معمولی ذہانت کے مالک شخص تھے۔ اور ان کے مزاج میں وہ جودت اور جلادت قطعی نہ تھی جو لارڈ کرزن میں تھی حالانکہ شاہانہ ٹھاٹھ اور آن بان کے لحاظ سے لارڈ لنلتھگو لارڈ کرزن ہی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کر رہے تھے۔

بایں ہمہ ڈیسمنڈ ینگ کی اس تحریر سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ستمبر ۱۹۳۹ء میں جواہر لال نہرو کا جنگ کے بارے میں کیا انداز فکر تھا۔ اور وہ کن شرطوں پر حکومت کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار تھے لیکن اس سلسلہ میں یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ پنڈت نہرو اور ڈیسمنڈ ینگ کی یہ ملاقات ستمبر کے چوتھے ہفتے میں ہوئی تھی۔ اس سے دس روز پہلے ۱۴۔ ستمبر ۱۹۳۹ء کو کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے جنگ کے بارے میں اپنا مشہور ریزولیوشن پاس کیا تھا۔ جس کے متعلق گاندھی جی نے آگے چل کر ایک بیان میں یہ بھی کہا تھا کہ یہ ریزولیوشن پنڈت نہرو نے مرتب کیا ہے جو زبان و بیان کی دلآویزی اور حسن تحریر کے اعتبار سے ایک آرٹسٹ ہیں ورکنگ کمیٹی کا یہ ریزولیوشن بہت طویل ہے جس کا مکمل ترجمہ درج کرنا بے محل ہو گا۔ جستہ جستہ حصے یہ ہیں:

۱۔ کانگرس فاشیت اور نازیت کی سخت دشمن ہے۔ کیونکہ یہ دونوں نظام ایسے ہیں جنہوں نے آزادی اور جمہوریت کا خون کر دیا ہے۔ جرمنی نے پولینڈ پر جس طرح حملہ کیا ہے۔ ہم اس کی

---

1. "Try Anything Twice," by Desmond Young: Pages 245-46

مذمت کرتے ہیں. کسی بیرونی طاقت کو یہ حق حاصل نہیں کہ از خود ہندوستان کو کسی جنگ میں زبردستی دھکیل دے۔ کسی دوسرے ملک کے خلاف اعلان جنگ کرنے یا صلح کرنے کا حق صرف ہندوستان کے باشندوں کو ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ جنگ جمہوریت اور آزادی کے لئے لڑی جا رہی ہے۔ لیکن یہ دعویٰ کیونکر مان لیں جبکہ خود ہندوستان کو جمہوریت اور آزادی سے محروم کیا جا چکا ہے۔

۲۔ فرانس اور برطانیہ نے ۱۹۱۴ء کی جنگ کے وقت بھی اسی قسم کا دعویٰ کیا تھا کہ ہم آزادی اور جمہوریت کے لئے لڑتے رہے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جنگ ختم ہونے کے بعد فرانس اور برطانیہ نے مفتوحہ ملکوں کے بہت علاقوں پر قبضہ کر کے بدترین قسم کے امپیریلزم کا ثبوت دیا تھا۔ آج بھی منچوریا، حبشہ، چیکوسلواکیہ اور سپین میں جمہوریت جس طرح تباہ کی گئی ہے وہ نقشہ فرانس اور برطانیہ کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ لیکن ان دونوں ملکوں نے جنبش تک نہیں کی۔

۳۔ اگر موجودہ جنگ کی غرض و غایت یہ ہے کہ امپیریلزم کو اور نو آبادیوں پر برطانوی قبضے کو بحال رکھا جائے تو ہندوستان کی اس جنگ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اور اگر برطانیہ جمہوریت اور آزادی کی خاطر میدان جنگ میں اترا ہے تو اس کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ ہندوستان سے اپنا امپیریلزم جلد از جلد ختم کرے۔ جس کی واحد صورت یہ ہے کہ ہندوستان کے باشندوں کو اختیار دیا جائے کہ وہ بغیر کسی خارجی دباؤ کے ایک کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی قائم کر کے اپنا آئین خود وضع کریں۔

۴۔ لہٰذا ورکنگ کمیٹی حکومت برطانیہ سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ صاف اور واضح الفاظ میں اعلان کیا جائے کہ جنگ کے مقاصد کیا ہیں۔ بالخصوص جمہوریت۔ امپیریلزم اور اس نظام نو پر جو آئندہ تشکیل پذیر ہو گا۔ برطانیہ کے یہ مقاصد جنگ کس طرح اثر انداز ہوں گے۔

ان مقاصد میں امپیریلزم کا خاتمہ اور ہندوستان کی آزادی شامل ہے؟ اگر ہے تو ان اصولوں کا فوراً ہندوستان پر اطلاق ہونا چاہئے۔

ان بلند بانگ الفاظ کی جادوگری سے قطع نظر کانگرس کے اس ریزولیوشن کا لُبِ لباب یہ تھا کہ ایک کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی قائم کر کے کانگرس کو اس کا مختار مطلق بنایا جائے تاکہ وہ ۱۹۲۸ء کی نہرو رپورٹ کی طرح اپنی مرضی اور خوشنودی سے ہندوستان کا آئین وضع کرے۔ باقی رہا ریزولیوشن کا وہ حصہ جس میں زیبِ داستاں کے طور پر فاشیت اور نازیت کی مذمت کی گئی اور آزادی اور جمہوریت کے راگ الاپے گئے ہیں۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے

کہ خود کانگرس نے ہندوستان کے چھ صوبوں میں ایک پارٹی کی وحدانی حکومت قائم کر کے بدترین قسم کی فاشیت کا ثبوت دیا تھا۔ جداگانہ انتخاب کا اصول منظور کرنے کے باوجود ہندوستان کے مسلمانوں کی جداگانہ قومی ہستی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ یہ اعلان کر کے ہندوستان میں صرف دو فریق موجود ہیں، ایک کانگرس اور دوسرا برطانوی حکومت مسلم لیگ کے وجود ہی سے آنکھیں بند کر لی گئی تھیں۔ تمام جمہوری اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر صوبائی وزارتوں کو ایک گرینڈ فاشٹ کونسل یعنی کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے تابع کر دیا گیا تھا۔ مسلم اکثریت کے صوبوں میں ہزاروں سازشیں کر کے وہاں کی حکومتوں کا تختہ الٹنے کی کوششیں کی گئیں تاکہ پورے برعظیم ہند پر کانگرس کا قبضہ ہو سکے۔ کانگرس کے جھنڈے کو ہندوستان کا جھنڈا، کانگرس کے ترانے کو ہندوستان کا ترانہ، کانگرس کی زبان کو ہندوستان کی زبان۔ کانگرس کے نظام کو ہندوستان کا نظام قرار دینے کی سرتوڑ جدوجہد کی گئی۔

حیرت ہے کہ وہی خود سر، مغرور متکبر اور مختار مطلق سیاسی جماعت آج اپنے ریزولیوشن میں فاشزم اور امپریلزم کی مذمت میں لغت کے تمام الفاظ استعمال کر رہی ہے۔ بلاشبہ جرمنی کی نازیت اور انگریز کی شہنشاہیت دونوں قابل نفرین نظام تھے۔ لیکن کانگرس نے گذشتہ پونے تین سال میں اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ ہندوستان میں انگریز کے امپیریلزم کی جگہ اپنا امپیریلزم قائم کرنے کی فکر میں ہے۔

تعجب ہے کہ جب کانگرس نے یہ ریزولیوشن مرتب کیا تو مسٹر جناح سے بھی درخواست کی تھی کہ وردھا آ کر کانگرس کے مشوروں میں شریک ہوں۔ اور اس ریزولیوشن کی ترتیب و تدوین میں حصہ لیں۔ چنانچہ ۱۱۔ ستمبر کو کانگرس کے صدر بابو راجندر پرشاد نے ذیل کا تار مسٹر جناح کو دیا:

> "کانگرس کی ورکنگ کمیٹی جنگ کی صورت حال پر بحث کر رہی ہے۔ معاملہ نازک ہے اور پورے ہندوستان سے تعلق رکھتا ہے۔ آپ کے مشورے کی بھی ضرورت ہے۔ ہم بہ نظر تحسین دیکھیں گے۔ اگر آپ بھی ۱۵۔ تاریخ تک وردھا آ کر ہمارے مشوروں میں شریک ہوں۔"

مسٹر جناح نے جواب دیا تھا۔

> "آپ کا تار ملا۔ میں بخوشی آپ سے دہلی میں مشورہ کرنے کو تیار ہوں۔ مختلف مصروفیتوں کے باعث وردھا آنے سے معذور ہوں۔

مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ۱۷۔ کو ہو رہا ہے۔ میرا ۱۳۔ کو دہلی پہنچنا ضروری ہے۔

بابو راجندر پرشاد نے جواب میں تار دیا:

" آپ کے تار کا شکریہ! آپ کو مدعو کرنے کا مقصد یہ تھا کہ موجودہ نازک حالات میں کانگرس کی ورکنگ کمیٹی جو فیصلہ کر رہی ہے اس میں آپ کی مدد حاصل کی جائے۔ میرے دہلی آنے سے یہ مقصد پورا نہیں ہوتا۔"[۱]

کانگرس کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ پورے ہندوستان کی نمائندگی کرتی ہے۔ مسلم لیگ کو وہ مسلمانوں کی بہت سی فرقہ پرست جماعتوں میں سے ایک جماعت سمجھتی تھی۔ لیگ کے ساتھ اس نے صوبائی اسمبلیوں میں اشتراک کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جناح کے ساتھ وہ حقیقتاً کوئی مفاہمت کرنے کو تیار نہ تھی۔ لیکن اب اسے یکایک یہ خیال کیونکر آیا کہ جناح سے استمداد کی جائے اور اپنے ریزولیوشن کی ترتیب میں اس سے بھی مشورہ کیا جائے

من انداز قدت رامی شناسم بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش

یہاں بھی وہی پرانی چال تھی جس سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ مسلم لیگ اور کانگرس میں کوئی باہمی اختلاف نہیں۔ اور جناح کانگرس کی ہم نوائی پر تیار ہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ ۱۴۔ ستمبر ۱۹۳۹ء کو پنڈت نہرو نے کانگرس کی ورکنگ کمیٹی میں اس قرار داد کا مسودہ تیار کیا۔ اور صرف دس روز بعد انہوں نے پرائیویٹ طور پر ڈیسمنڈ ینگ کو وہ شرائط پیش کیں جن پر کانگرس حکومت کے ساتھ اشتراک و تعاون کرنے کو تیار تھی۔ یہ شرائط اوپر درج کی جا چکی ہیں۔ ایک لفظ بھی ان میں ایسا نہیں جس کا مفہوم یہ ہو کہ برطانیہ اپنے مقاصد جنگ کا اعلان کرے یا جس سے برطانوی امپیریلزم کی مذمت مقصود ہو یا جس سے کسی نئے عالمگیر نظام کے ظہور پذیر ہونے کا مژدہ سنایا گیا ہو۔

اگر کوئی مطالبہ ہے تو صرف یہ کہ کانگرس کو حکومت کے ایوان میں عمدہ عطا کیا جائے اور فوجی بھرتی کرنے میں کانگرس سے مشورہ کیا جائے۔ ۱۴۔ ستمبر ہی کو کانگرس نے ایک وار سب کمیٹی بنائی تھی جس کے صدر پنڈت نہرو تھے۔ اور آئندہ جنگ کے بارے میں کانگرس کی پالیسی کی تشکیل کرنا بھی گویا پنڈت نہرو ہی کا کام تھا۔

---

۱۔ روزنامہ سٹیٹسمین کلکتہ۔ مورخہ ۱۶ ستمبر ۱۹۳۹ء

لارڈ زیٹلینڈ نے ڈیسمنڈ ینگ کی تجویزیں سننے کے بعد جس تامل کا اظہار کیا تھا اس کی علت یوں بھی سمجھ میں آسکتی ہے کہ وائسرائے نے سوچا ہو گا کہ جو شخص ۱۴/ ستمبر کو کانگرس کی یہ بلند بانگ قرار داد مرتب کرتا ہے۔ اور اس کے دس روز بعد ایک خفیہ تجویز روزنامہ پائینیر کے انگریز ایڈیٹر کے ہاتھ مجھ کو بھیجتا ہے. اس کی ان دونوں باتوں میں سے کس کو مستند سمجھا جائے اور کس پر اعتبار کیا جائے۔ یہ برطانیہ کے ساتھ سودے بازی کی پہلی کوشش تھی جس کا سلسلہ کانگرس نے آخر وقت تک جاری رکھا۔ **آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے ۸ ستمبر ۱۹۳۹ء کو ذیل کی قرار داد منظور کی۔**

"ورکنگ کمیٹی کی یہ رائے ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے ۲۷۔ اگست ۱۹۳۹ء کو جو قرار داد نمبر ۸ منظور کی تھی وہ مسلمانان ہند کے صحیح جذبات اور آراء کی عکاسی کرتی ہے۔ اس قرار داد کے الفاظ یہ ہیں کہ برطانوی حکومت کی اس پالیسی پر اظہار افسوس کیا جائے کہ اس نے مسلمانان ہند کی مرضی کے خلاف ان پر ایک کانسٹی ٹیوشن مسلط کرنے کی کوشش کی ہے۔ بالخصوص وہ فیڈریشن جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی رو سے تجویز کیا گیا ہے۔ اور جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہندوستان پر ایک ایسی مستقل اور معاندانہ فرقہ وارانہ اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے گی جو مسلمانوں کے مذہبی۔ سیاسی۔ معاشرتی اور اقتصادی حقوق کو پامال کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھے گی۔ نیز وائسرائے اور کانگرسی صوبوں کے گورنروں کا فرض تھا کہ اپنے اختیارات خاص استعمال کر کے اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کرتے اور ان سے انصاف کرتے۔ لیکن انہوں نے اس ضمن میں حد درجہ غفلت بے اعتنائی اور بے تدبیری کا ثبوت دے کر کچھ بھی نہیں کیا۔ اس کے علاوہ فلسطین کے عربوں کے مطالبات تسلیم کرنے سے انکار کیا گیا ہے۔ اندریں حالات اگر برطانوی حکومت آئندہ خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانان عالم اور بالخصوص مسلمانان ہند کی ہمدردی کے حصول کی خواہاں ہے تو اس کا فرض ہے کہ بلا تامل ہندوستان کے مسلمانوں کے مطالبات کو تسلیم کرے۔

ورکنگ کمیٹی وائسرائے کے اس اعلان کو بہ نظر تحسین دیکھتی ہے

جس میں یہ کہا گیا ہے کہ فیڈریشن کی وہ سکیم جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں درج ہے معطل کر دی گئی ہے۔ وائسرائے کا یہ اعلان ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں کے مفاد کے مطابق ہے۔ ورکنگ کمیٹی چاہتی ہے کہ معطل کرنے کی بجائے اس سکیم کو قطعی ترک کر دیا جائے اور ملک معظم کی حکومت تک اپنی آواز پہنچاتی ہے کہ بلاتوقف اس مطالبے پر عمل کیا جائے۔ کمیٹی یہ امر بھی واضح کرنا چاہتی ہے کہ وائسرائے نے مرکزی مجلس قانون ساز کے ممبروں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے "فیڈریشن مقصود" کی جو ترکیب استعمال کی ہے۔ اور کہا ہے کہ ملک معظم کی حکومت کے پیش نظر یہ "فیڈریشن مقصود" ہے۔ کمیٹی ہرگز اس کی تائید نہیں کرتی اور برطانوی حکومت سے پرزور درخواست کرتی ہے کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے صوبائی حصے پر عمل درآمد کرنے کے بعد جو نتائج سامنے آئے ہیں، اور جو حالات بدلے ہیں۔ ان کی روشنی میں ہندوستان کے مستقبل کے آئین کے مسئلے پر از سر نو غور کیا جائے۔

"اس ضمن میں کمیٹی یہ واضح کرنا چاہتی ہے کہ ہندوستان کی سیاست میں مسلمانوں کو ایک خاص اور نمایاں مقام حاصل ہے۔ اور عرصہ دراز سے مسلمان متوقع رہے ہیں کہ وہ ہندوستان کی قومی زندگی۔ یہاں کی حکومت اور ملک کے نظم و نسق میں با عزت مقام حاصل کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا تاکہ آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام رونما ہو۔ اور وہ اپنے مذہبی۔ سیاسی۔ معاشرتی اقتصادی اور ثقافتی حقوق کی طرف سے مطمئن ہو کر اکثریت رکھنے والی قوم کے ساتھ اشتراک کر سکیں۔ لیکن حالات میں جو تغیر پیدا ہوا ہے۔ بالخصوص اس صوبائی آئین کے نفاذ کے بعد جو ایک نام نہاد پارلیمنٹری جمہوریت کے طرز حکومت پر وضع کیا گیا ہے۔ حالات نے جس قسم کا پلٹا کھایا ہے اس کا گذشتہ دو سال سے کچھ اوپر مدت میں یہ تلخ تجربہ ہوا ہے کہ اس صوبائی آئین نے بلا شک و شبہ ہندوستان کے مسلمانوں پر ہندو اکثریت کی ایک دائمی اور مستقل حکومت قائم کر دی ہے۔ اور مختلف کانگرسی صوبوں کی حکومتوں کے

تحت مسلمانوں کا جان و مال اور عزت و آبرو خطرے میں پڑ گئی ہے۔ یہاں تک کہ ہر روز یہ کانگرسی حکومتیں مسلمانوں کے مذہبی حقوق اور کلچر کو مٹانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمان اس بات کے خلاف ہیں کہ ہندوستان کے باشندوں کو لوٹ کھسوٹ کا نشانہ بنایا جائے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ مسلمانوں نے بار بار ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ کیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی مسلمان یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ ہرگز مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں پر ہندو اکثریت کی حکومت قائم نہیں ہونے دیں گے اور نہ مسلمانوں کو ہندوؤں کا غلام بننے دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایسے "فیڈریشن مقصود" کے قطعی خلاف ہیں جن سے جمہوریت اور پارلیمنٹری نظام حکومت کی آڑ میں ہندوستان پر اکثریت کی حکومت قائم ہو۔ اس ملک کے لئے جس میں مختلف قومیں آباد ہوں اور جو ایک قومی مملکت نہیں بن سکتا۔ اس قسم کا پارلیمنٹری نظام حکومت ہرگز موزوں نہیں۔

مسلم لیگ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کے نظریئے کی مخالف ہے۔ وہ ایسے حملے کی مذمت کرتی ہے جو بغیر کسی وجہ کے دوسرے پر کیا جائے۔ وہ انسانیت کی آزادی کی علم بردار ہے۔ اور طاقت ور کو محض طاقت کے بل پر دوسرے کے حقوق غصب کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتی۔ ورکنگ کمیٹی کو پولینڈ۔ انگلستان اور فرانس سے گہری ہمدردی ہے۔ بایں ہمہ وہ محسوس کرتی ہے کہ اس آزمائش کی گھڑی میں برطانیہ کو اس وقت تک مسلمانوں کی مدد اور تعاون بخوبی حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ ملک معظم کی حکومت اور وائسرائے کانگرسی صوبوں میں. جہاں آج مسلمانوں کا مال محفوظ ہے نہ جان۔ عزت محفوظ ہے نہ آبرو۔ اور جہاں ان کے ابتدائی حقوق کو نہایت بے رحمی سے کچلا جا رہا ہے۔ ان کے ساتھ حق و انصاف کا سلوک نہیں کرتی۔ ورکنگ کمیٹی نہایت پر زور الفاظ میں ملک معظم کی حکومت اور وائسرائے سے درخواست کرتی ہے کہ وہ گورنروں کو ہدایت کریں کہ جہاں جہاں صوبائی وزارتیں مسلمانوں کے حقوق کو تلف کر رہی ہیں، انہیں

مظالم کا نشانہ بنا رہی ہیں۔ اور ان کے مذہبی سیاسی۔ معاشرتی اور اقتصادی حقوق پر ڈاکہ ڈال رہی ہیں۔ وہاں یہ گورنر اپنے اختیاراتِ خاص کو جو ازرُوئے آئین انہیں حاصل ہیں استعمال کریں۔ ورکنگ کمیٹی نہایت افسوس سے یہ کہتی ہے کہ گورنروں نے اب تک مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کرنے سے کوتاہی برتی ہے۔ اور اپنے ان اختیارات خاص کو اس خوف سے استعمال نہیں کیا کہ کانگرس کا ہائی کمان مسلسل یہ دھمکیاں دے رہا ہے کہ اگر گورنروں نے یہ اختیارات خاص استعمال کئے تو وہ ان صوبوں میں جہاں کانگرس کی اکثریت ہے "ڈیڈ لاک" پیدا کر دے گا۔

مسلم لیگ اگرچہ ہندوستان کی آزادی کی علم بردار ہے لیکن ورکنگ کمیٹی ملک معظم کی حکومت سے کہتی ہے کہ مسلم لیگ کی منظوری اور رضا مندی کے بغیر اس قسم کا کوئی اعلان نہ کیا جائے جس کا مقصد ہندوستان میں آئینی اور دستوری ترقی کے مدارج معین کرنا ہو۔ نیز ملک معظم کی حکومت اور برطانوی پارلیمینٹ کسی قسم کا دستور وضع نہیں کر سکتی اور نہ منظور کر سکتی ہے جب تک اس بارے میں مسلم لیگ کی منظوری اور رضامندی حاصل نہ کر لی جائے۔

فلسطین کے عربوں کے بارے میں برطانوی حکومت نے جو پالیسی اختیار کی ہے اس نے مسلمانوں کے احساسات و جذبات کو سخت مجروح کیا ہے اور اس ضمن میں جس قدر احتجاج کیا گیا ہے اس کا کوئی معقول نتیجہ اب تک نہیں نکلا۔ ورکنگ کمیٹی پھر ایک بار ملک معظم کی حکومت پر زور ڈال کر کہتی ہے کہ عربوں کے قومی مطالبات جلد تسلیم کئے جائیں۔

آج دنیا کو جو خطرناک بحران درپیش ہے اگر اس سے کامیابی کے ساتھ عہدہ بر آ ہونے کے لئے حکومت برطانیہ کو مسلمانوں کا حقیقی اور آبرُو مندانہ تعاون درکار ہے تو اس کا فرض ہے کہ مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کرے کہ ان کے حقوق محفوظ ہیں۔ نیز اس کا یہ بھی فرض ہے کہ اس سلسلہ میں مسلم لیگ کا جو مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ

جماعت ہے، اعتماد حاصل کرے۔

موجودہ نازک گھڑی میں ورکنگ کمیٹی ہر مسلمان سے درخواست کرتی ہے کہ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے پرچم کے نیچے اس عزم صمیم کے ساتھ کھڑا ہو جائے کہ وہ بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ کیونکہ اسی پر ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں کی آئندہ تقدیر اور عزت و آبرو کا انحصار ہے۔"

ان دونوں قرار دادوں سے کانگرس اور مسلم لیگ کا نقطہ نگاہ ہی نہیں بلکہ بنیادی اختلاف بھی کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ مسلم لیگ کے پیش نظر بلاشبہ ہندوستان کی آزادی تھی۔ لیکن اس ہندوستان کی آزادی نہیں جس میں انگریزوں کے رخصت ہو جانے کے بعد مسلمانوں کو مستقل طور پر ہندوؤں کی غلامی کا پٹہ اپنی گردن میں ڈالنا پڑے گا۔ کانگرس نے جولائی ۱۹۳۷ء میں ہندوستان کے چھ صوبوں میں وزارتیں قبول کرنے سے پہلے وائسرائے کے ساتھ یہ سودا چکایا تھا کہ ان صوبوں کے گورنر کانگرس کے نظم و نسق میں مداخلت نہیں کریں گے۔ جب یہ سودے بازی مکمل ہو گئی تو کانگرس نے کھلم کھلا مسلمانوں کی جداگانہ قومی ہستی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور علی الاعلان کہا تھا کہ اگر ہندوستان کے مسلمان اس ملک میں رہنا چاہتے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ اپنی جداگانہ قومی جماعتوں کو توڑ کر کانگرس میں جذب ہو جائیں۔ گذشتہ ڈھائی سال سے مسلمانوں کی یہ "سیاسی شُدھی" زور شور سے جاری تھی اور اب ان کا اضطراب انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ صوبوں کے گورنروں کو ازروئے آئین یہ اختیار حاصل تھے کہ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کریں۔ لیکن یہ اختیارات خاص کانگرس کے ہائی کمان کی دھمکیوں کے سامنے حرفِ غلط کی طرح باطل ہو کر رہ گئے تھے۔ اور گورنروں نے اپنی بے بسی کا اظہار کر کے دکھا دیا تھا کہ وہ صوبائی خود مختاری (پراونشل اٹانومی) جس کا ہم نے ۱۹۳۶ء میں خیر مقدم کیا تھا، قطعاً بے کار بے سُود اور بے معنی ثابت ہوئی ہے۔ تعجب ہے کہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کئے بغیر، مسٹر جناح کی غیر مشروط قیادت کا اعتراف کئے بغیر، کانگرسی صوبوں میں مسلمانوں کی جملہ شکایات رفع کئے بغیر اور مسلم رابطہ عوام جیسی خطرناک تحریک کو واپس لئے بغیر کانگرس کا صدر بابو راجندر پرشاد مسٹر جناح کو تار دیتا ہے کہ وردھا تشریف لائیے تاکہ ہم اور آپ مل کر جنگ کے بارے میں کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کا ریزولیوشن مرتب کریں۔

صرف یہی نہیں بلکہ جب مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے یہ قرار داد منظور کی تو بابو راجندر

پرشاد نے ۵- اکتوبر ۱۹۳۹ء کو ذیل کا خط مسٹر جناح کو لکھا:

"آل انڈیا مسلم لیگ کمیٹی نے جو قرار داد حال ہی میں دہلی میں منظور کی ہے۔ اس میں صوبائی حکومتوں کا بھی ذکر کیا ہے یہ کہا گیا ہے کہ صوبائی خود مختاری نے بلاشبہ ہندوستان کے مسلمانوں پر ہندو اکثریت کی ایک دائمی اور مستقل حکومت مسلّط کر دی ہے۔ اور مختلف کانگرسی صوبوں کی حکومتوں کے تحت مسلمانوں کا جان و مال اور عزت و آبرُو خطرے میں پڑ گئی ہے۔ یہاں تک کہ یہ کانگرسی حکومتیں ہر روز مسلمانوں کے مذہبی حقوق اور کلچر کو مٹانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی مجھے بتایا ہے کہ جب پچھلے دنوں آپ ان سے ملے تو یہی بات آپ نے ان سے بھی کہی تھی۔

ہمارے نزدیک یہ الزامات قطعی بے بنیاد ہیں اور ان غلط تصورات اور یک طرفہ رپورٹوں پر مبنی ہیں جو آپ کو اور لیگ کو موصول ہوئی ہیں۔ متعلقہ حکومتوں کے خلاف جب بھی اس قسم کے الزامات عاید کئے گئے ہیں تو ان حکومتوں نے تحقیقات کرنے کے بعد انہیں غلط قرار دیا ہے۔ ہم نے پہلے بھی ایک مرتبہ اس بات پر آمادگی کا اظہار کیا تھا کہ اگر آپ اس قسم کے خاص واقعات کی نشان دہی کریں تو ہم کسی غیر جانب دار ادارے سے ان کی تحقیقات کرانے کو تیار ہیں۔ ہم شدت سے محسوس کرتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ آپ بھی اس ضمن میں ہمارے ساتھ اتفاق کریں گے اگر سنجیدگی سے اس قسم کے الزامات عاید کئے جائیں تو ضروری ہے کہ تحقیقات کرنے کے بعد یا انہیں صحیح ثابت کیا جائے یا ان کی تردید کی جائے۔ اگر آپ اس قسم کے واقعات کی مثالیں پیش کریں تو ہم ان کے بارے میں تحقیقات کرنے کو تیار ہیں۔ اگر آپ پسند فرمائیں تو ہم ہندوستان کے سب سے بڑے عدالتی اہل کار یعنی فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس سر مورس گوئر[1] سے درخواست کرنے کو تیار ہیں کہ وہ اس بات کی تحقیقات کریں۔ بالفرض وہ کسی وجہ سے آمادہ نہ ہو سکیں تو انہی کے پائے اور پوزیشن کے کسی شخص سے یہ

---

[1] Sir Maurice Gwyer

درخواست کی جا سکتی ہے۔

میں بخوشی یہ معاملہ کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے سامنے رکھنے کو تیار ہوں اور باضابطہ اس مضمون کی ایک قرار داد کمیٹی میں منظور کروا سکتا ہوں۔ میں آج وردھا جا رہا ہوں جہاں ایک ہفتے کے قریب ٹھہروں گا۔ اگر آپ جلد جواب عطا فرمائیں تو ممنون ہوں گا۔"

مسٹر جناح نے ۶-اکتوبر کو بابو راجندر پرشاد کو ذیل کا جواب دیا۔

"آپ کا خط محررہ ۵- اکتوبر ۱۹۳۹ء کو ملا۔ اطلاعاً عرض ہے کہ میں نے یہ سارا معاملہ وائسرائے کے سامنے پیش کر دیا ہے اور ان سے گذارش کی ہے کہ فوراً اس کی چھان بین اور تحقیقات کریں۔ کیونکہ آئین اور دستور کی رُو سے یہ فرض وائسرائے اور صوبائی گورنروں پر عاید ہوتا ہے کہ اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کی حفاظت کریں۔

اب یہ معاملہ وائسرائے کے زیر غور ہے اور انہی کا یہ فرض بھی ہے جو قدم موزوں سمجھتے ہیں اٹھائیں اور جو اقدامات مناسب خیال کرتے ہیں اختیار فرمائیں تاکہ ہمارے مطالبات کی پذیرائی ہو سکے۔ اور ان صوبوں میں جہاں کانگرسی حکومتیں قائم ہیں مسلمانوں کے اندر یہ احساس اور اطمینان پیدا ہو سکے کہ ان کا جان و مال محفوظ ہے۔

اندریں حالات میں ان متعدد تجویزوں پر جن کا ذکر آپ نے اپنے خط میں کیا ہے بحث کرنا نہیں چاہتا کیونکہ ایسا کرنا بے سود ہے۔ تاہم اتنا ضرور کہوں گا کہ بعض باتیں آپ نے بالکل غلط لکھی ہیں۔[1]"

---

[1] روزنامہ سٹیٹسمین۔ مورخہ ۱۰راکتوبر ۱۹۳۹ء

۹

# عالمگیر جنگ نمبر ۲

## حکومت کا ردِّ عمل

جنگ چھڑنے کے بعد وائسرائے نے ہندوستان کے مختلف لیڈروں سے ملاقاتیں کرنا شروع کیں اور یہ سلسلہ خاصی دیر تک جاری رہا۔ ۵۔ ستمبر کو گاندھی جی شملہ جا کر ملے۔ ۲۶۔ ستمبر کو پھر گاندھی جی نے شملہ میں وائسرائے سے ملاقات کی۔ ۳۔ اکتوبر کو کانگرس کے صدر بابو راجندر پرشاد اور پنڈت نہرو وائسرائے کی خدمت میں باریاب ہوئے۔ ۴۔ اکتوبر کو سردار ولبھ بھائی پٹیل حاضر ہوئے۔ ۵۔ اکتوبر کو مسٹر جناح اور گاندھی جی وائسرائے سے ملے۔ ۱۰ اکتوبر کو سوبھاش چندر بوس۔ صوبہ سرحد کے مسلم لیگی لیڈر سردار اورنگ زیب خاں اور مرکزی اسمبلی کے یورپین گروپ کے لیڈر مسٹر ایکمین کی باری آئی ۱۱۔ اکتوبر کو سر سکندر حیات خاں اور بنگال کے وزیر اعظم مولوی فضل الحق باریاب ہوئے۔ ۱۲۔ اکتوبر کو اچھوتوں کے لیڈر ایم۔ سی۔ راجا۔ کوٹ فتح خاں کے سر محمد نواز خاں۔ پنجاب کے رائے بہادر پربھ سنگھ اور ماسٹر تارا سنگھ حاضر ہوئے۔ یکم نومبر کو مسٹر جناح۔ گاندھی جی اور بابو راجندر پرشاد پھر وائسرائے سے ملے۔ ۴۔ نومبر کو پھر وائسرائے نے گاندھی جی اور مسٹر جناح سے ملاقات کی۔ غرضیکہ مجموعی طور پر وائسرائے نے باون مختلف آدمیوں سے ملاقاتیں کیں۔

کانگرس کو اس بات کا بھی رنج تھا کہ وائسرائے نے یہ ملاقاتوں کا سلسلہ کیوں جاری کر دیا ہے اور کانگرسی لیڈروں کے علاوہ اور لوگوں سے مشورہ کیوں کیا جا رہا ہے۔ یو پی۔ سی پی۔ بہار۔ بمبئی۔ مدراس۔ اڑیسہ میں خالصتاً کانگرسی حکومتیں کام کر رہی تھیں۔ صوبہ سرحد، سندھ اور آسام میں کانگرس نے دوسری پارٹیوں کے ساتھ مل کر کولیشن وزارتیں قائم کر رکھی تھیں۔ ان حالات میں کانگرس کو یہ زُعم تھا کہ برعظیم ہند تو اس کے زیرِ نگیں ہے۔ پھر دوسری پارٹیوں کے لیڈروں کو در خورِ اعتناء سمجھنے کی حاجت ہی کیا ہے۔

گاندھی جی اور جواہر لال نہرو نے فوراً انگلستان میں اپنا پروپیگنڈا شروع کر

دیا تھا۔ جمہوریت اور جمہوری حکومت بڑے دل کش اور دل آویز الفاظ ہیں جن کا برطانیہ کی آئینی روایات کی وجہ سے وہاں بڑا احترام کیا جاتا ہے۔ جنگ چونکہ ہٹلر کے خلاف تھی۔ جس کے استبداد نے بد ترین قسم کی ڈکٹیٹر شپ پیدا کر دی تھی۔ اسلئے لازماً ان الفاظ کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ گاندھی اور نہرو اس نکتے سے خوب واقف تھے۔ چنانچہ ان کے ہر بیان کی تان اس پر آکر ٹوٹتی تھی کہ اگر برطانوی حکمرانوں کی نیت نیک ہے۔ اور وہ واقعی جمہوریت کے خاطر میدان جنگ میں کودے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ فوراً ہندوستان میں جمہوری حکومت قائم کریں۔ یعنی ملک کا نظم و نسق کانگرس کے حوالے کر دیں۔ گاندھی جی نے ۴۔ اکتوبر کے مانچسٹر گارڈین میں اسی قسم کا ایک بیان شائع کیا کہ:

"اس افسوس ناک جنگ میں برطانیہ نے جس جمہوریت کی پاسداری کا پرزور دعویٰ کیا ہے، اگر وہ پہلے ہی مرحلے پر اس دعویٰ میں ناکام رہا تو یہ بہت بڑی ٹریجڈی ہو گی۔ کیا اس دعویٰ میں ہندوستان کی ایسی مکمل آزادی شامل ہے یا نہیں جس میں جملہ اختیارات ہندوستان کے باشندوں کے حوالے کئے جائیں گے؟ یہ ایک بہت سادہ اور ابتدائی سوال ہے، جس کا جواب کانگرس مانگ رہی ہے اور کانگرس کو حق حاصل ہے کہ اس کا جواب طلب کرے۔ مجھے امید ہے کہ یہ جواب کانگرس کے حسب منشاء دیا جائے گا۔ اور برطانیہ کے وہ لوگ جن کی نیت بخیر ہے، اس بارے میں کانگرس کے ہم خیال ہوں گے۔"

پنڈت نہرو نے ۷/ اکتوبر کے "نیوز کرانیکل" میں ایک بیان شائع کیا جس کے دوران میں فرمایا

"اگر اس جنگ کا مقصد جمہوریت اور حق خوداختیاری ہے۔ اور یہ جنگ نازیوں کے تشدد کے خلاف لڑی جا رہی ہے تو یقیناً اس کا مقصد یہ نہیں ہو سکتا کہ دوسرے ملکوں پر قبضہ جمایا جائے۔ تاوان کی رقمیں وصول کی جائیں۔ نو آبادیوں کے باشندوں پر غلامی کا حلقہ قائم رکھا جائے اور امپیریلزم کا نظام برقرار رہے ...... اس تاریخی لمحہ میں برطانیہ کو چاہئے کہ ہندوستان کی آزادی کو تسلیم کر کے اسے اپنا آئین اور دستور وضع کرنے کا حق عطا کرے۔ اس سے کم تر کوئی چیز قبول نہیں کی جا سکتی کیونکہ اس طرح ہندوستان اور برطانیہ کی پرانی دشمنی

بدستور قائم رہے گی۔ لہٰذا اوّلین اقدام یہ ہونا چاہئے کہ ہندوستان کی مکمل آزادی کا اعلان کر دیا جائے۔ اس کے بعد دوسرا قدم یہ ہو گا کہ اس اعلان پر عمل در آمد کرتے ہوئے، بحدِ امکان ہندوستان کی حکومت عوام کے حوالے کی جائے تاکہ وہی ہندوستان کی طرف سے جنگ جاری رکھ سکیں۔ صرف اسی ایک طریقے سے وہ نفسیاتی ماحول پیدا کیا جا سکتا ہے جس سے عوام کی مدد حاصل ہو سکے گی۔ آج ہندوستان ماضی کی تلخیوں کو بھول کر اپنا دستِ تعاون دراز کر رہا ہے۔"

لندن میں کرشنا مینن نے انڈیا لیگ کے نام سے ایک ادارہ قائم کر رکھا تھا جس کے خاصے وسیع تعلقات تھے۔ برطانیہ کی لیبر پارٹی کے بڑے بڑے لیڈروں سے کرشنا مینن کے ذاتی مراسم بھی تھے۔ لیبر پارٹی کا قدیم رجحان کانگرس کی طرف تھا۔ اس موقع پر انڈیا لیگ نے تحریر و تقریر سے پراپیگنڈا شروع کیا کہ جنگ میں اہلِ ہند کا تعاون حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مرکز میں ذمہ دارانہ حکومت قائم کی جائے۔

یہاں یہ نکتہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ذمہ دارانہ حکومت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ وزارت اس پارٹی کی ہو گی جس کی ایوان میں اکثریت ہے۔ پارلیمنٹری نظام حکومت کی بنیادی شق بھی یہی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہندوستان کے تمام صوبوں میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی رو سے پارلیمنٹری نظام رائج ہو چکا تھا۔ لیکن مرکز میں بدستور وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل قائم تھی جو ایک خود مختار اور غیر نمائندہ ادارہ ہونے کی وجہ سے ایوان کے سامنے جواب دہ نہیں تھی۔ کانگرس کو معلوم تھا کہ بغیر پارلیمینٹ کے خاص ایکٹ کے ہندوستان کی مرکزی حکومت کی ہیئت اور نوعیت تبدیل نہیں کی جا سکتی تھی۔ لیکن جنگ نے جس قسم کی ہنگامی صورت حال پیدا کر دی تھی اس کا فوری فائدہ کانگرس یہ اٹھانا چاہتی تھی کہ مرکز میں جلد از جلد اپنا اقتدار قائم کر لے۔ اس قسم کا اقتدار حاصل کرنے کی واحد صورت کانگرس کے پیش نظر یہ تھی کہ پارلیمینٹ کے ایکٹ کا انتظار کئے بغیر حکومت کا نقشہ اس طرح تبدیل کر دیا جائے کہ ایگزیکٹو کونسل میں اکثریت کانگرس کی ہو۔ وائسرائے کو آئینی لحاظ سے وزراء کی رائے کا پابند کر دیا جائے اور حکومت اسمبلی کے سامنے جواب دہ ٹھہرائی جائے۔

کانگرس کو یہ بھی معلوم تھا کہ اگر ایک مرتبہ اسے مرکزی حکومت میں غلبہ حاصل ہو گیا تو پھر اس مقام سے اس کا ہٹانا آسان نہیں ہو گا۔ فیڈریشن قائم ہو یا نہ ہو مرکزی حکومت تو بہر حال اس کی تحویل میں آ ہی جائے گی۔ چھ صوبوں پر وہ بلا شرکت غیرے قابض تھی۔

تین صوبوں یعنی سندھ سرحد اور آسام کی وزارتوں میں وہ شریک غالب کی حیثیت رکھتی تھی۔ صرف مرکز باقی رہ گیا تھا جس پر چھاپہ مارنے کی مدت سے تجویزیں سوچی جارہی تھیں۔ خدا بھلا کرے اس جنگ کا جس کی وجہ سے یہ مشکل بھی آسان ہوتی نظر آرہی تھی۔ کانگرس کو یہ بھی معلوم تھا کہ جس طرح اس نے صوبوں میں وزارتیں قبول کرنے سے پہلے گورنروں سے یہ سودا چکا لیا تھا کہ وہ اپنے اختیارات خاص استعمال نہیں کریں گے، اسی طرح مرکز میں بھی اقتدار حاصل کرتے وقت وائسرائے سے اس قسم کی سودے بازی کچھ مشکل نہیں ہوگی۔

وائسرائے اور ہندوستان کے ان مختلف لیڈروں کے درمیان جو باتیں ہوئیں ان کی کوئی مصدقہ یادداشت ہمارے پاس موجود نہیں جس سے یہ اندازہ کیا جا سکے کہ فریقین کا نقطہ نگاہ کیا تھا، اور انہوں نے گفتگو کے دوران میں اپنے اپنے نقطہ نگاہ کے جواز میں کیا دلائل پیش کئے تھے۔ لارڈ لنلتھگو نے اس باب میں کوئی باضابطہ تحریر اپنی یادگار نہیں چھوڑی۔ اپنے میموئرز بھی نہیں لکھ سکے۔ البتہ وزیر ہند لارڈ زٹلینڈ کے مطبوعہ میموئرز ہمارے پاس موجود ہیں جن سے کچھ جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

لارڈ موصوف، وائسرائے کے ایک خط کا حوالہ دیتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

"مجھے وائسرائے کے ایک خط محررہ ۲۱۔ ستمبر سے یہ معلوم کر کے کچھ تعجب ہوا کہ کانگرس کی ورکنگ کمیٹی مسلسل وردھا میں اپنے اجلاس کر رہی ہے۔ اور اس کے پیش نظر جو پروگرام ہے اس کی پہلی شق یہ ہے کہ کانگرسی صوبوں کے وزرائے اعظم کو یہ ہدایت کی جائے کہ اپنے اپنے صوبے کے گورنر سے اس بات کا مطالبہ کریں کہ ملک معظم کی حکومت اعلان کرے کہ ہندوستان کے بارے میں اس کا مدعا و مقصود کیا ہے اور یہ کہ اس دوران میں برطانوی حکومت کو چاہئے کہ گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل کی نئے سرے سے تشکیل کرے جس میں کانگرس کے ممبروں کو اکثریت حاصل ہو۔ اگر کانگرس کا یہ مطالبہ منظور نہ کیا گیا تو کانگرسی وزارتیں استعفاء دے دیں گی۔" ۱۔

۲۶۔ ستمبر کو گاندھی جی کی وائسرائے سے جو ملاقات ہوئی تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے لارڈ زٹلینڈ لکھتے ہیں کہ:

1, "Essayez," by Lord Zetland, Page 268

"جب ابتدائی باتیں ختم ہو چکیں تو انہوں نے (گاندھی جی نے) ورکنگ کمیٹی کے مطالبات پیش کئے۔ لیکن یہ مطالبات پیش کرنے سے پہلے انہوں نے بطور تمہید اس بات پر اصرار کیا کہ کانگرس کا یہ دعویٰ بالکل بجا ہے کہ وہ سارے ہندوستان کی نمائندہ جماعت ہے۔ لہٰذا یہ جماعت برطانوی حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں اپنے فیصلے کا اعلان کرے۔ اور اس دوران میں ہندوستان کی مرکزی حکومت کی اس طرح تشکیل کی جائے کہ اس میں کانگرس کو موجودہ حکومت کا شریک و سہیم بنایا جا سکے۔ [1]"

آگے چل کر لارڈ ڈرملینڈ نے ایک بڑی دلچسپ اور اہم بات لکھی۔ فرماتے ہیں کہ:

"اس ملاقات کا ایک معنی خیز پہلو یہ ہے کہ گاندھی نے رخصت ہوتے وقت وائسرائے سے درخواست کی تھی کہ اگر وہ کوئی اعلان کریں تو اس اعلان کی عبارت مفہوم یا شرائط کے بارے میں مسلم لیگ سے قطعاً کسی قسم کا مشورہ نہ کیا جائے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ گاندھی کے دل میں اس وقت کیا خیال موجزن تھا اور وہ ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں کے بارے میں کیا کچھ سوچ رہے تھے۔ وہ یقیناً اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتے تھے کہ ان کا یہ دعویٰ کہ کانگرس ہندوستان کے تمام باشندوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے، مسٹر جناح اور ان کے مسلم لیگی رفقائے کار کو ناراض کرنے کے لئے کافی تھا۔ کیا گاندھی اس طرح عمداً اور جان بوجھ کر مسلمانوں کو ہندوؤں سے منقطع کرنے کی کوشش کر رہا تھا [2]؟"

یہ تھا لُبِ لباب ان ملاقاتوں کا جو گاندھی، نہرو، راجندر پرشاد وغیرہ نے وائسرائے سے کی تھیں اور یہ تھا وہ مدعا و مقصود جس کی خاطر بار بار مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ برطانوی حکومت اعلان کرے کہ جنگ میں شریک ہونے سے اس کے مقاصد کیا ہیں۔ برطانیہ کے جو مقاصد ہوں

---

1. "Essayez," Page 270    2. Ahid

سوہوں، کانگرس کا مقصد بدیہی طور پر یہی تھا کہ دھمکی ۔ دھونس ۔ خوشامد ۔ رعب ۔ سازش غرض کہ ہر ممکن حربے کو کام میں لاکر ہندوستان کی مرکزی حکومت پر قبضہ جمایا جائے۔ اور حیرت ہے کہ جناح کو دعوت دی جارہی تھی کہ وہ بھی کانگرس کے مشوروں میں شریک ہو کر اس کی ہم نوائی کریں۔

۱۷ اکتوبر کو وائسرائے نے ایک طویل بیان دیا جس میں یہ کہا کہ:

"میں نے باون اصحاب سے مشورہ کیا ہے جن میں مسٹر گاندھی اور مسٹر جناح بھی شامل ہیں۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ہم کن مقاصد کی خاطر جنگ میں شامل ہوئے۔ سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ دنیا کا امن برقرار رکھا جائے۔ باہمی جنگ و جدال کا سلسلہ بند کیا جائے۔ اور بین الاقوامی مسائل کو تلوار کے زور سے نہیں بلکہ دلیل سے حل کیا جائے۔ جرمنی نے بلا وجہ پولینڈ پر حملہ کر کے جنگ کی آگ روشن کی ہے۔ اگر اس جارحانہ رویئے کا انسداد نہ کیا گیا تو دنیا کا امن و امان غارت ہو جائے گا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں ہمارا فیصلہ کیا ہے اور آئندہ ہندوستان کی دستوری اور آئینی ترقیوں کے متعلق ہمارا طرز عمل کیا ہو گا؟ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کا صوبائی حصہ نافذ ہوئے تو ڈھائی سال گذر گئے ہیں۔ ہماری خواہش تھی کہ فیڈریشن بھی قائم کر دیا جاتا۔ لیکن بدقسمتی سے مجوزہ فیڈریشن پر تمام فریقوں نے اس شدت سے اعتراض کئے ہیں کہ ہم نے اس سکیم کو فی الحال معطل کر دیا ہے۔

برطانیہ کے پیش نظر جو منتہا و مقصود ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان کو ڈومینیئن (درجہ مستعمرات) کا درجہ عطا کیا جائے۔ ۱۹۲۹ء میں لارڈ ارون نے یہ اعلان کیا تھا۔ ۱۹۳۵ء کا ایکٹ وضع کرتے وقت وزیر ہند نے بھی ملک معظم کی حکومت سے مشورہ کرنے کے بعد یہی اعلان کیا تھا۔ میں اس وقت ملک معظم کی اجازت سے یہ اعلان کرتا ہوں کہ ہم جنگ ختم ہونے کے بعد ہندوستان کے متعدد فرقوں جماعتوں، نمائندوں اور والیان ریاست کے ساتھ مل کر اور

ان کے باہمی صلاح و مشورہ سے ایک نیا آئین اس ملک کے لئے وضع کریں گے۔

میں یہ کہنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے پچھلے دنوں جو ملاقاتیں کی ہیں ان میں اقلیتوں کے نمائندوں نے بار بار مجھ سے یہ درخواست کی ہے کہ اگر ہندوستان کے دستور میں ترمیم و تنسیخ کرنے کا وقت آیا تو ان کی رائے کے بغیر اس قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔ میں نے اس بارے میں انہیں اطمینان دلایا ہے کہ جس طرح قبل ازیں گول میز کانفرنس اور پارلیمنٹری سیلیکٹ کمیٹی میں اقلیتوں کی رائے پر غور کیا گیا تھا، آئندہ بھی کیا جائے گا۔

میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جنگی امداد حاصل کرنے، ہندوستان کے مختلف عناصر میں باہمی اعتماد پیدا کرنے اور وقت کی ضروریات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ایک مشاورتی بورڈ بنایا جائے جس میں ہندوستان کی تمام بڑی بڑی پارٹیوں اور والیان ریاست کے نمائندے شریک ہوں گے۔ گورنر جنرل اس بورڈ کا صدر ہو گا۔ اور وہی وقتاً فوقتاً اس بورڈ کے اجلاس طلب کرے گا۔ بورڈ کے ممبروں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہو گی۔ لیکن کوشش کی جائے گی کہ یہ بورڈ ہر اعتبار سے ایک نمائندہ ادارہ ہو۔ ملک کی بڑی بڑی پارٹیاں اپنے اپنے نمائندوں کی فہرستیں بنا کر گورنر جنرل کو پیش کر دیں گی اور گورنر جنرل ان فہرستوں میں سے بورڈ کے لئے موزوں آدمی منتخب کرے گا۔

وائسرائے کا یہ بیان اچھا تھا یا بُرا۔ صاف اور واضح تھا یا مبہم۔ لیکن ایک بات قطعی عیاں ہو کر سامنے آ گئی تھی کہ اب مسلم لیگ کو نظر انداز کرنا حکومت کے لئے ممکن نہ تھا۔ وہ وقت بھی یاد کرنا چاہئے جب ۷ اپریل ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا خاص اجلاس کلکتہ میں ہوا تھا تو مولوی فضل الحق نے اپنی تقریر میں مسلم لیگ کی بے بسی کا نقشہ کھینچتے ہوئے بصد حسرت و یاس کہا تھا کہ ستم ہے کہ وائسرائے گاندھی کو مشورے کے لئے تو بلاتا ہے لیکن جناح کو نہیں بلاتا۔ مولوی صاحب کی اس شکایت کے جواب میں مسٹر جناح نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ مطمئن رہیئے وہ وقت جلد آئے گا جب وائسرائے کیا معنی، وائسرائے سے بھی بڑے لوگوں کو لیگ اور جناح سے

مشورہ کرنا پڑے گا۔

صرف ایک سال اور چار مہینے کے اندر ہم نے جس جاں فشانی سے اپنی قوم کی تنظیم کی تھی یہ اسی کا ثمر تھا کہ اب جناح کا قول گویا قول فیصل تسلیم کیا جا رہا تھا۔ اور وہی نہرو جو کل تک انتہائی تبختر سے یہ کہتا تھا کہ ہندوستان میں صرف دو فریق ہیں۔ ایک کانگرس اور دوسرا برطانوی حکومت۔ آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ ایک تیسرا فریق بھی ہندوستان میں موجود ہے جس کا نام آل انڈیا مسلم لیگ ہے۔

گاندھی جی کی حالت یہ تھی کہ جب وائسرائے سے ملتے تھے تو کہتے تھے کہ میں کانگرس کا نمائندہ بن کر نہیں آیا۔ کیونکہ میں تو کانگرس کا چونّی کا ممبر بھی نہیں۔ میں صرف اپنی ذات کی نمائندگی کرتا ہوں۔ لیکن جب وائسرائے کے بیان پر رائے زنی کا وقت آتا تھا تو سراسر کانگرس کے ترجمان بن کر گوہر افشانی کرتے تھے۔ چنانچہ وائسرائے کے اِس بیان پر نکتہ چینی کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:

"یہ بیان حد درجہ مایوس کن ہے۔ بہتر ہوتا کہ برطانوی حکومت سرے سے کسی قسم کا اعلان کرنے سے انکار کر دیتی۔ وائسرائے کا یہ طویل بیان اِس بات کا ثبوت ہے کہ بدستور وہی پُرانی پالیسی قائم ہے۔ یعنی "تقسیم کرو اور حکومت کرو"۔ جہاں تک میرا خیال ہے۔ کانگرس بحیثیت ایک جماعت کے اور وہ ہندوستان، جس کا نقشہ کانگرس کے تصور میں ہے بحیثیت ایک ملک کے موجودہ جنگ میں جو ہٹلر کے خلاف لڑی جا رہی ہے، برطانیہ کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ وائسرائے کے اِس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر برطانیہ کا بس چلے تو ہندوستان کو ہمیشہ جمہوری حکومت سے محروم رکھا جائے۔ جنگ کے خاتمے پر جس گول میز کانفرنس کے اِنعقاد کا وعدہ کیا گیا ہے وہ سابق گول میز کانفرنسوں کی طرح یقیناً ناکام رہے گی۔ کانگرس نے روٹی کے لئے درخواست کی تھی۔ لیکن جواب میں اُسے پتھر دیا گیا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آئندہ ہندوستان میں کیا ہو گا ............ کانگرس کو اپنی منزلِ مقصود پر پہنچنے سے قبل پھر ایک بار ویرانے میں ٹھوکریں کھانا پڑیں گی۔ اور یہی ایک طریقہ ہے جس سے وہ پاک صاف اور مضبوط و توانا بن سکے گی۔ مجھے اِس میں کوئی شُبہ نہیں کہ کانگرسی ممبر ورکنگ کمیٹی

کے فیصلے کا انتظار کریں گے"۔

اسی طرح بابو راجندر پرشاد اور پنڈت نہرو نے بھی وائسرائے کے بیان پر شدت سے اعتراض کئے۔ ۲۹۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو برطانیہ کے دارالعوام میں اس مسئلے پر بحث ہوئی اور سرسیموئل ہور نے حکومت کا نظریہ پیش کیا۔ کانگرس کا مطالبہ تھا کہ مرکز میں فوراً ذمہ دارانہ حکومت قائم کی جائے۔ اس کے جواب میں سرسیموئل ہور نے اپنی تقریر میں کہا:

"والیان ریاست کو یہ خطرہ ہے کہ برطانوی ہند ان پر حاوی ہو جائے گا۔ مسلمانوں نے حتمی طور پر عہد کر لیا ہے کہ وہ ہرگز مرکز پر ہندو اکثریت کو قابض نہیں ہونے دیں گے۔ اچھوتوں اور دیگر اقلیتوں کو اندیشہ ہے کہ اگر مرکز میں ذمہ دارانہ حکومت قائم ہوئی تو انہیں مستقل طور پر ہندوؤں کی غلامی قبول کرنا پڑے گی۔ یہ ہیں وہ اندیشے اور خطرے جو اس وقت چھائے ہوئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ کاش ایسا نہ ہوتا۔ لیکن جب تک یہ اندیشے موجود ہیں حکومت کبھی یہ مطالبہ منظور نہیں کر سکتی کہ مرکز میں فوراً ذمہ دارانہ حکومت قائم کی جائے"۔

سرسیموئل ہور نے ہندوستان کے فرقہ وارانہ اختلافات پر اظہار افسوس کیا اور کہا کہ ان اختلافات کا مٹانا ہمارا کام نہیں۔ یہ اہل ہند کا فرض ہے کہ اپنے خانگی جھگڑوں کو نمٹا کر کوئی متحدہ محاذ پیش کریں۔ جناح ۱۹۳۶ء سے یہی کہہ رہا تھا کہ مسلم لیگ اور کانگرس کو چاہئے کہ دونوں مل کر متحدہ محاذ قائم کریں۔ اسی غرض سے مسلم لیگ کا پارلیمنٹری بورڈ قائم کیا گیا تھا۔ اسی غرض سے جناح نے کہا تھا کہ فرقہ وارانہ فیصلہ (کمیونل ایوارڈ) کوئی القائے ربانی نہیں کہ اس میں ترمیم نہ ہو سکے۔ کانگرس اور مسلم لیگ میں جب اتحاد ہو جائے گا تو اس ایوارڈ میں بھی تبدیلی کی جا سکے گی۔ لیکن جناح کی ان دردمندانہ گذارشوں پر کانگرس نے کوئی توجہ نہ کی۔ اور اس کے برعکس یہ اعلان کیا کہ مسلمانوں کی جداگانہ قومی ہستی کا کوئی وجود نہیں اور تنہا کانگرس ہندوستان کی نمائندگی کرتی ہے۔

یہاں شاید پہلی جنگ عظیم کی مثال دینا مفید ہو گا۔ جب ۱۹۱۴ء میں پہلی عالمگیر جنگ شروع ہوئی تھی تو ہندوستان کے اندرونی اختلافات بدستور موجود تھے۔ ہندوؤں اور

مسلمانوں میں بے اعتمادی قائم تھی۔ اور باہمی نفاق کی رو چل رہی تھی۔ لیکن مسٹر جناح کی دُور رس نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ اگر اس نازک وقت میں انگریزوں سے کچھ مراعات حاصل کرنی ہیں تو ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحدہ مطالبہ پیش کرنا چاہئے۔ چنانچہ مسٹر جناح ہی کی کوشش سے بتدریج مسلم لیگ اور کانگرس میں اتحاد قائم ہونا شروع ہوا۔ پہلے مرکزی امپیریل کونسل کے ہندو اور مسلمان ممبروں نے مل کر مجوزہ اصلاحات کا ایک خاکہ تیار کیا جو میمورنڈم کی صورت میں وائسرائے کو پیش کیا گیا۔ پھر دسمبر ۱۹۱۶ء میں کانگرس اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس بیک وقت لکھنؤ میں ہوئے۔ جہاں وہ مشہور و معروف میثاق مرتب کیا گیا جو آگے چل کر لکھنؤ پیکٹ کے نام سے مشہور ہوا اور جس کی بنیاد پر ۱۹۱۹ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی عمارت کھڑی کی گئی تھی۔ اس نقطہ نگاہ سے اگر دوسری عالمگیر جنگ پر غور کیا جائے تو نتائج حد درجہ افسوس ناک نکلے۔ جس کی ذمہ داری سراسر کانگرس کی اس ضد پر تھی کہ تنہا وہی ہندوستان کی نمائندہ جماعت ہے۔ یہ وقت تھا جب جناح نے ایک ہوشیار، سمجھدار اور تجربہ کار سیاست دان کی طرح مسلمانوں کی جداگانہ قومی شخصیت اور مسلم لیگ کی نمائندہ حیثیت کو تسلیم کروانے کے لئے بساط سیاست پر اپنی چالیں چلنا شروع کیں۔

سرسیموئل ہور کی تقریر پر گاندھی جی پھر غضب ناک ہوئے اور ایک بیان میں فرمایا کہ:

> "کانگرس نے تو یہ کہا تھا کہ ہندوستان کے مرکز میں ذمہ دارانہ حکومت قائم کی جائے اور جواب میں اقلیتوں کی حفاظت کا ڈھونگ کھڑا کیا گیا ہے۔ سرسیموئل ہور کا یہ دعویٰ بلا دلیل ہے ............
> میں یہ بتا چکا ہوں کہ ہندوستان میں ایسی کوئی اقلیتیں نہیں جن کے حقوق کو محض ہندوستان کے آزاد ہونے سے گزند پہنچے گا۔ اچھوتوں کے سوا ہندوستان کی ہر اقلیت اپنی حفاظت نہایت اچھے طریقے سے کر سکتی ہے ............ سرسیموئل ہور نے ترک موالات کی ہنسی اڑائی ہے اور کہا ہے کہ یہ پالیسی بے حاصل ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ پالیسی کچھ ایسی بے حاصل بھی نہیں۔ اگر اہل ہند نے عدم تشدد کی پیروی کی تو ترک موالات کی تحریک پھر ایک مرتبہ اپنا زور دکھا سکے گی"۔

جب گاندھی جی اور کانگرس کے دوسرے بڑے بڑے لیڈر سرسیموئل ہور کی تقریر پر اپنے رنج و غصہ کا اظہار کر رہے تھے۔ انگلستان کے مشہور اخبار "مانچسٹر گارڈین" کا نامہ نگار ہندوستان آیا اور اس نے پہلی مرتبہ مسٹر جناح سے ملاقات کی۔ اس نے قبل انگلستان کے

اخباروں میں مسلم لیگ یا جناح کا کبھی ذکر نہیں ہوتا تھا۔ صرف کانگرس ہی کا پروپیگنڈا کیا جاتا تھا۔ اب حالات نے رائے عامہ کو اس دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا کہ جناح کو نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ مسٹر جناح نے "مانچسٹر گارڈین" کو ایک طویل بیان دیا اور فرمایا کہ:

"مسلمانوں کو ہمیشہ نمائندہ حکومت کے خطروں کا احساس رہا ہے۔ اور اگر شدّ و مد سے ہندوستان میں جمہوریت قائم کی جائے تو اس سے اور بہت سے خطرے پیدا ہو جائیں گے۔ ۱۹۰۸ء کی منٹو مارلے اصلاحات اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے تاریخی میثاق لکھنؤ کے وقت سے مسلمانوں نے جس جداگانہ انتخاب اور ویٹیج کا مطالبہ کیا ہے وہ ان خطروں کے احساس کا بیّن ثبوت ہے۔ لیکن جب سے نئے صوبائی آئین کا نفاذ ہوا ہے اور خصوصیت سے جس طرح کانگرس کی ہائی کمان نے اپنی پالیسی اور پروگرام پر عمل کیا ہے اس کے بعد تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی ہے کہ کانگرس کا واحد مقصد یہ ہے کہ ملک کی ہر جماعت کو نیست و نابود کر کے صرف اپنے آپ کو ایک بدترین قسم کے مختار مطلق اور فاشسٹ ادارے کی صورت میں قائم رکھے۔

ہندوستان میں پینتیس کروڑ ووٹر ہیں جن کی اکثریت بالکل جاہل، ناخواندہ اور بے شعور ہے۔ جو صدیوں کے پرانے اور بدترین قسم کے توہمات کے اندر محصور ہو کر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور جو معاشرتی اور تمدنی لحاظ سے ایک دوسرے کے سخت مخالف ہیں۔ ان لوگوں کو سامنے رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آئین پر عمل درآمد کرنے کے بعد یہ حقیقت الم نشرح ہو گئی ہے کہ ہندوستان میں پارلیمنٹری جمہوریت کے نمونے کی حکومت ہرگز نہیں چل سکتی۔ نتیجہ یہ نکلا ہے۔ کہ تمام اقلیتوں پر صرف ایک فرقے کی مستقل حکومت قائم ہو گئی ہے۔ اور یہ فرقہ وارانہ حکومت اپنے آپ کو ایک دائمی اور ناقابل ترمیم صورت دینے کے لئے اپنے جُملہ اختیارات و وسائل اور سرکاری ذرائع کو بیدردی سے استعمال کر رہی ہے۔

قطع نظر اور امور سے جن کی تفصیل میں اس وقت بیان کرنا نہیں چاہتا۔ میرا فیصلہ یہ ہے کہ ہندوستان میں جمہوریت کا مطلب صرف

ہندو راج ہے۔ مسلمان کبھی اس صورت حال کو قبول نہیں کریں گے۔ مسلمانوں کے علاوہ چھ کروڑ اچھوت بھی ہیں۔ مسیحی، یہودی، پارسی اور ہندوستان میں رہائش پذیر برطانوی باشندے بھی ہیں۔ چنانچہ مسلم لیگ بڑے غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ہندوستان کے آئندہ دستوری مسئلے پر از سر نو غور کیا جائے۔ اور ملک معظم کی حکومت کو چاہئے کہ اس ضمن میں مسلم لیگ کی جو مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہے، منظوری اور رضامندی لئے بغیر کوئی وعدہ یا اعلان نہ کرے۔ ممکن ہے برطانوی پبلک کو اس قسم کے پراپیگنڈے سے کہ مسلمان ہندوستان کی آزادی کے مخالف ہیں، کسی نوع کی غلط فہمی میں مبتلا کیا جائے۔ میں اس سلسلہ میں یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ ہم بلاشبہ آزادی کے طلب گار ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کس کی آزادی؟ مسلم انڈیا آزادی چاہتا ہے تاکہ اپنے نظریئے کے مطابق اپنے سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور ثقافتی اداروں کو ہرنہج سے ترقی دے سکے۔ در آں حالیکہ ہماری خواہش ہے کہ ہندو انڈیا بھی اسی طرح آزادی کی نعمت سے متمتع ہو کر ترقی اور فروغ حاصل کرے۔

میں جانتا ہوں کہ انگریزوں نے اپنے ملک میں صدیوں کے تدریجی عمل سے جس قسم کا پارلیمنٹری نظام حکومت قائم کیا ہے اس کے پیش نظر وہ سمجھتے ہیں گویا یہی نظام حکومت دنیا کے ہر ملک کے لئے بھی موزوں ہے۔ کینیڈا اور آسٹریلیا میں جہاں کے بیشتر باشندے برطانوی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، یہ نظام چل سکتا ہے۔ لیکن یہی تجربہ ہر جگہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔

جنوبی افریقہ میں جہاں دو زبردست اور حریف فرقے موجود ہیں۔ مثلاً بوئر اور انگریز، یہ نظام کیونکر چل سکے گا۔ پھر یہ بھی یاد رکھیے کہ ان دو فرقوں میں جس قدر باہمی اختلافات ہیں وہ اتنے وسیع اور بنیادی نہیں جتنے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات ہیں۔ آئرلینڈ کی طرف دیکھیے جس کا سکاٹ لینڈ اور انگلستان کے باشندوں سے کتنا گہرا تعلق ہے، لیکن مدتوں ساتھ ساتھ رہنے کے باوجود آئرلینڈ نے

برطانوی پارلیمنٹ کا تسلط قبول نہیں کیا۔ میں یہاں لارڈ مارلے کا وہ مشہور فقرہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ کینیڈا کا اُونی گرم کوٹ ہندوستان کی تپتی ہوئی آب و ہوا میں نہیں پہنا جا سکتا۔

کانگرس بار بار اصرار کرتی ہے کہ تنہا وہی ہندوستان کے تمام باشندوں کی نمائندہ جماعت ہے۔ کانگرس کا یہ دعویٰ بے بنیاد ہونے کے علاوہ ہندوستان کی آئندہ ترقی کے راستے میں حائل ہے۔ کانگریسی لیڈروں کو معلوم ہے کہ وہ قطعی مسلمانوں کی نمائندگی نہیں کرتے۔ مغربی ممالک میں اقلیت کا جو مفہوم ہے اس کے مطابق مسلمانوں کو اقلیت کہنا جائز نہیں۔ ہندوستان کے شمال مغرب اور بنگال میں یعنی کراچی سے کلکتہ تک کے کاریڈور میں ان کی اکثریت ہے۔ یاد رہے کہ برعظیم ہند کے اس حصے کی آبادی برطانیہ عظمیٰ کی آبادی سے دگنی اور رقبہ برطانیہ سے دس گنا سے بھی زیادہ ہے۔ جب تک کانگرس آسمانوں کی پرواز سے نیچے اتر کر زمین پر نہیں آتی اور حقائق کا مقابلہ نہیں کرتی وہ ہندوستان کی ترقی میں روڑے اٹکانے کی ذمہ دار ہے۔ اور جب تک کانگرس اپنی اس پالیسی اور پروگرام سے دست بردار نہیں ہوتی جو اس نے ایک مطلق العنان اور فسطائی جماعت کی طرح اختیار کر رکھا ہے۔ ہندوستان میں کبھی امن و امان نہیں ہو سکے گا"۔

مسٹر جناح کا یہ بیان صحیح نشانے پر بیٹھا۔ اور اس کی صدائے بازگشت برطانوی پارلیمنٹ میں بھی سنی گئی۔ ۲۔ نومبر ۱۹۳۹ء کو دارالامراء میں ہندوستان کی صورت حال پر بحث ہوئی تو حزب مخالف کے لیڈر لارڈ سیموئل نے مسلم لیگ پر ناروا حملے کئے اور اس بات کو خلاف انصاف قرار دیا کہ مسلمانوں کو جو ہندوستان کی آبادی کا چوتھائی حصہ ہیں۔ گویا ویٹو کا اختیار دیا جائے اور یہ عذر پیش کیا جائے کہ جب تک مسلمان راضی نہیں ہوں گے ہندوستان میں ڈومینئین سٹیٹس قائم نہیں کیا جائے گا۔ آخر میں لارڈ سیموئل نے یہ بھی کہا کہ:

"میرے خیال میں اس ایوان کے تمام ممبروں کو مسلمانوں کے مسائل کا احساس ہے اور ان سے ہمدردی بھی ہے۔ بلاشبہ برطانیہ عظمیٰ پر ہندوستان کے مسلمانوں کے حقوق ہیں جن سے ہم دست بردار

نہیں ہو سکتے اور نہ ان کے مستقبل سے غافل ہو سکتے ہیں۔ آج ہندوؤں اور مسلمانوں میں سخت نفاق ہے۔ میں جب گذشتہ سال ہندوستان گیا تھا تو تقریباً ہر شخص نے مجھ سے یہی شکایت کی کہ جس قسم کا ہندو، مسلم اختلاف آج برپا ہے ویسا مشکل ہی سے پہلے کبھی نظر آیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اقلیتوں کا تحفظ ضروری ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ملک کی اکثریت نے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ آخر اکثریت کے بھی تو کچھ حقوق ہیں جن کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے۔ جس جس ملک میں مخلوط آبادی ہے وہاں جمہوریت کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ان دو اصولوں کی آپس میں کسی نہ کسی طرح مطابقت پیدا کی جائے کہ حکومت اکثریت کے ووٹ سے چلے اور ساتھ اقلیت کے حقوق کی بھی حفاظت ہو"۔

وزیر ہند لارڈ زٹلینڈ نے اس بحث کو سمیٹتے ہوئے جو تقریر کی اس میں انہوں نے ہندو مسلم مسئلہ پر یہ کہا کہ:

"......... میں ہندو مسلم اختلافات کے متعلق کچھ کہنا بے کار سمجھتا ہوں کیونکہ آپ سب کو ان کی حقیقت معلوم ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ اور کانگرس کے مینی فیسٹو دونوں اس وقت قرطاس ابیض (وائٹ پیپر) میں شامل ہیں۔ دو تین روز ہوئے آل انڈیا مسلم لیگ کے لیڈر کا ایک بیان "مانچسٹر گارڈین" میں بھی شائع ہوا ہے۔ ان فرقہ وارانہ اختلافات سے چشم پوشی کرنا ممکن نہیں۔ تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ حالات میں سلامتی کا راستہ کون سا ہے؟ یہ راستہ صرف ایک ہے۔ یعنی سب سے پہلے دو بڑی قوموں ہندوؤں اور مسلمانوں کے نمائندے۔ کسی غیر جانب دار شخص کے زیر اہتمام اکٹھے بیٹھ کر نہایت صاف دلی سے اپنے باہمی اختلافات کو ختم کر کے کوئی مشترکہ راستہ تلاش کر سکتے ہیں۔ اس قسم کی بحث پر ہندوؤں کی نمائندگی کانگرس اور مسلمانوں کی نمائندگی مسلم لیگ کرے گی۔

وائسرائے نے بالکل یہی روش اختیار کی ہے۔ چنانچہ اس نے کانگرس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کو اس مقصد کے لئے دعوت دی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ اگر اس بحث مباحثہ اور

مشورے کا یہ نتیجہ نکلا کہ دونوں قوموں میں کوئی قابل عمل سمجھوتہ ہو گیا
تو راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ دور ہو جائے گی اور ہم مرکزی
جماعت میں سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں کو شریک کر سکیں
گے"۔

لارڈ زٹلینڈ کی اس تقریر کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ انہوں نے کھلے لفظوں میں اعتراف کر لیا کہ کانگرس ہندوؤں کی اور مسلم لیگ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے۔ یہی حقیقت منوانے کے لئے جناح پچھلے تین سال سے جدوجہد کر رہا تھا۔ اور کانگرس کی ہٹ دھرمی کی انتہا تھی کہ بار بار اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار کرتی تھی۔ بالآخر صداقت بے نقاب ہو کر رہی اور برطانوی حکومت نے مسلم لیگ کو مسلمانان ہند کی نمائندہ جماعت اور مسٹر جناح کو مسلمانوں کا قائداعظم تسلیم کر ہی لیا۔

لائے اس بت کو التجا کر کے
کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

۵۔نومبر ۱۹۳۹ء کو دارالامراء اور دارالعوام میں پھر ہندوستان کے مسئلے پر بحثیں ہوئیں، لیکن سب سے اہم بحث ۱۴۔ دسمبر ۱۹۳۹ء کو دارالامراء میں ہوئی۔ جہاں وزیر ہند لارڈ زٹلینڈ نے ایک زوردار تقریر کی۔ گاندھی جی نے چند روز قبل یہ کہا تھا کہ ہندوستان کا مسئلہ حل کرنے کی واحد تجویز یہ ہے کہ ایک کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی (مجلس دستور ساز) منعقد کی جائے جو آزاد ہندوستان کا دستور تیار کرے۔

جہاں تک مسلم لیگ کی پالیسی اور مسلمانوں کی جداگانہ قومی حیثیت کو تسلیم کرنے کا تعلق ہے لارڈ زٹلینڈ نے اپنے دور وزارت میں اس سے بہتر تقریر ایوان میں کبھی نہیں کی تھی۔ انہوں نے دو ایک باتیں نہایت اہم کہیں۔ مثلاً:

"سوال یہ ہے کہ کانگرس کے مطالبات تسلیم کرنے کے لئے ہمارے راستے میں رکاوٹ کیا ہے؟ سب سے بڑی رکاوٹ اقلیتوں کے بارے میں کانگرس اور مسلم لیگ کا باہمی اختلاف ہے۔ اس اختلاف کی نوعیت واضح کرنے کے لئے میں کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے ایک تازہ بیان کا یہ فقرہ نقل کرتا ہوں کہ "یہ کمیٹی اعلان کرتی ہے کہ کانگرس کے مطالبات تسلیم کرنے کی راہ میں فرقہ وارانہ معاملات قطعاً حائل نہیں ہو سکتے"۔

" مجھے یقین ہے کہ کانگرس کی ورکنگ کمیٹی یہی کچھ سمجھتی ہو گی جو اس نے اپنے بیان میں کہا ہے۔ لیکن ملک معظم کی حکومت اس بارے میں کانگرس کی ہم خیال نہیں۔ ملک معظم کی حکومت کی رائے ہے کہ کوئی آئین اس وقت تک کامیابی کے ساتھ نہیں چل سکتا جب تک اسے ان اقلیتوں کی منظوری حاصل نہ ہو جو اس آئین کے تحت زندگی بسر کریں گی۔ میں اس سلسلہ میں اچھوتوں یا آبادی کے دیگر طبقوں کی اہمیت کو کم کرنا بالکل نہیں چاہتا۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت مسلمان ہیں۔ میرے نزدیک اس چیز کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ کانگرس میں چند مسلمان بھی شامل ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ گذشتہ الیکشن میں ۴۸۲ مسلمان ممبر صوبائی اسمبلیوں میں منتخب ہوئے تھے، جن میں سے صرف ۲۶ ممبر کانگرس کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تھے۔ مسٹر گاندھی نے خود اعتراف کیا ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ مسلمانوں کی سب سے بڑی جماعت ہے۔ اگرچہ مسٹر گاندھی اس کے ساتھ مسلمانوں کی بعض اور انجمنوں کے نام بھی لیتے ہیں۔ جو آل انڈیا مسلم لیگ کو اپنا نمائندہ نہیں سمجھتیں۔

ایک اور حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہئے۔ مسلمانوں کو اقلیت ہم اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اعداد و شمار کے لحاظ سے ہندوؤں سے تھوڑے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ آٹھ نو کروڑ کے قریب ایک علیحدہ فرقہ ہیں جن میں اب تک اپنے اس عہد ماضی کی یاد باقی ہے جب برعظیم ہند کے بہت بڑے حصے پر مغلیہ خاندان کی حکومت تھی۔ وہ عسکری اور فوجی روایات کے حامل ہیں جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ آج بھی ہندوستان کی فوج میں ان کی بہت بڑی تعداد شامل ہے۔ میں نے یہ چند حقائق اس لئے بیان کئے ہیں کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ یورپ کی اقلیتوں کو ہندوستانی مسلمانوں سے تشبیہہ دینا غلط ہے۔ اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ یورپ کی اقلیتوں کی وجہ سے کس قدر فتنہ و فساد برپا ہوا ہے۔

میں کانگرس کے لیڈروں سے درخواست کرتا ہوں کہ ہندوستان

کی سب سے بڑی اور سب سے طاقت ور جماعت کی حیثیت سے ان مشکلات کے سمجھنے کی کوشش کریں جنھوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کو موجودہ پالیسی اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے۔

مسٹر گاندھی نے ۲۵۔ نومبر کے ہریجن میں لکھا ہے کہ ایک کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی (مجلس دستور ساز) منعقد کرنی چاہئے جو ایسے تحفظات کے تحت کام کرے گی جو اقلیتوں کے نزدیک تشفی بخش ہوں۔ آگے چل کر مسٹر گاندھی یہ بھی کہتے ہیں کہ چونکہ یہ اصطلاح بہت مبہم ہے لہٰذا ان تحفظات کا تعین پہلے سے کر لینا چاہئے۔

ہم بھی تو یہی کہتے ہیں کہ آئینی اور دستوری ترقی خواہ کسی طریقے سے ہو، اس کے لئے بحد امکان اقلیتوں کی منظوری اور رضا مندی حاصل کرنا ضروری ہے۔ لیکن یہ ہمارے اختیار میں نہیں کہ ہم اس قسم کی ہندو مسلم مفاہمت ہندوستان پر مسلط کریں۔ یہ فرض تو خود اہل ہند کا ہے۔

بلا شبہ بعض اور مسائل بھی ہیں جو ہماری توجہ کے مستحق ہیں۔ مثلاً ہندوستان کے دفاع کا مسئلہ۔ والیان ریاست کا مسئلہ اور ان برطانوی باشندوں کا مسئلہ جو ہندوستان میں آباد ہیں۔ بایں ہمہ سب سے اہم اور ضروری مسئلہ اس وقت اقلیتوں کا ہے"۔

لارڈ زٹلینڈ کی اس تقریر پر گاندھی، نہرو، راج گوپال اچاری وغیرہ بہت بگڑے۔ اول اس لئے کہ لارڈ زٹلینڈ نے تسلیم کیا تھا کہ کانگرس ہندوؤں کی جماعت ہے اور آل انڈیا مسلم لیگ مسلمانوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ دوم اس لئے کہ جب تک مسلمانوں کی آئینی حیثیت کے بارے میں کانگرس اور مسلم لیگ میں باہمی مفاہمت نہیں ہو گی ہندوستان کے مروجہ آئین میں تبدیلی کرنا ممکن نہیں۔ سوم اس لئے کہ ہندوستانی مسلمانوں پر اقلیت کا لفظ ان معنی میں استعمال نہیں ہو سکتا جن معنوں میں یہ لفظ یورپ کی اقلیتوں پر استعمال ہوتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اگر ہم ایک طرف کانگرسی لیڈروں کی بات پر اعتبار نہیں کر سکتے تھے تو دوسری طرف انگریزوں کا قول بھی ہمارے نزدیک کوئی صحیفہ آسمانی نہیں تھا جسے بلاچوں چرا تسلیم کر لیا جاتا۔ اس لحاظ سے ہمارے لئے یہ دونوں برابر تھے۔ ابھی دو سال پہلے کی بات تھی کہ کانگرس نے مسلم لیگ کو نظر انداز کر کے اور مسلمانوں کے احتجاج کو پس پشت ڈال کر

ہندوستان کے چھ صوبوں میں خالص کانگرسی وزارتیں قائم کی تھیں تو وزیر ہند، وائسرائے او صوبوں کے گورنروں نے کانگرس کے خلاف انگلی تک نہیں ہلائی تھی۔ اس سلسلہ میں یاد رکھے کے قابل نکتہ یہ ہے کہ ہندوستان میں تین فریق موجود تھے جن کے درمیان باہمی کشمکش جاری تھی ہندو (بالفاظ دیگر کانگریس) مسلمان (بالفاظ دیگر مسلم لیگ) اور انگریز۔ حکومت انگریزوں کے ہاتھ میں تھی اور وہی ہندوستان کے مالک و مختار بھی تھے۔ لیکن اب حالات اس سرعت سے تبدیل ہو رہے تھے کہ انگریز یہی حکومت بتدریج ہندوستانیوں کے حوالے کر رہے تھے۔ اور صاف نظر آ گیا تھا کہ عنقریب تمام اختیارات اہل ہند کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائیں گے۔ مسلمانوں کو سب سے زیادہ یہ خلش پریشان کر رہی تھی کہ انتقال اختیارات کے ان مختلف مراحل میں ان کا حصہ کیونکر متعین ہو گا۔ اسے کون متعین کرے گا، اور وہ حصہ کس کے قبضے میں جائے گا۔ کانگرس انگریزوں سے یہ کہتی تھی کہ تم ہندوستان سے رخصت ہو جاؤ۔ ہم تمہارے جانے کے بعد مسلمانوں کو مطمئن کر لیں گے۔

جناح کانگرس کے اس مکر و فریب کے جال میں پھنسنے کو تیار نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کانگرسی لیڈروں کے لفظوں پر قطعی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کہتا تھا کہ بے شک انگریزوں کو ہندوستان سے نکل جانا چاہئے لیکن پہلے آئینی طور پر یہ فیصلہ کرو کہ ہندوستان کی حکومت میں مسلمانوں کا کتنا حصہ ہو گا؟ اور اس حصے کو ہندوستان کے دستور میں آئینی تحفظات کے تحت کیوں کر محفوظ کیا جائے گا!

کانگرس کے لیڈروں کو جناح کے خلاف سب سے بڑا غصہ یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے حصے کا تصفیہ انگریزوں سے کیوں کرواتا ہے۔ یہ کام ہمارے سپرد کیوں نہیں کرتا۔ صورتِ حال یہ تھی کہ یا ہندو اور مسلمان مل کر کوئی متحدہ مطالبہ پیش کرتے اور انگریزوں کو ان کے سامنے جھکنا پڑتا۔ کانگرس کی ضد۔ رعونت۔ تکبر۔ خود فریبی اور مسلم آزاری نے یہ راستہ بالکل بند کر دیا تھا۔ جناح نے ۱۹۳۵ء کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نافذ ہونے سے پہلے کانگرس سے بار بار یہی درخواست کی تھی کہ آؤ ہم دونوں مل کر ایک متحدہ محاذ قائم کریں۔ لیکن کانگرس نے جواب دیا تھا کہ نہ مسلم لیگ مسلمانوں کی نمائندگی کرتی ہے اور نہ جناح ہی مسلمانوں کا ترجمان ہے۔ لہٰذا کانگرس جناح سے کوئی گفت و شنید کرنے کو تیار نہیں۔ جب مسلمانوں نے ردِ عمل کے طور پر مسلم لیگ کے پرچم کے نیچے اپنی تنظیم کی تو کانگرسی لیڈروں نے انتہائی تبختر سے ہر بار یہ اعلان کیا کہ کانگرس ہندوستان کی تمام قوموں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ اور برطانیہ کو چاہئے کہ جملہ اختیارات کانگرس کے حوالے کر دیئے جائیں۔

دوسرا راستہ وہی تھا جو ۱۹۳۱ء کی گول میز کانفرنس میں اختیار کیا گیا تھا۔ جب ہندو اور مسلمان آپس میں فرقہ وارانہ امور کا تصفیہ نہ کر سکے تو یہ معاملہ برطانیہ کے وزیر اعظم کے سپرد کر دیا گیا تھا کہ وہی فیصلہ کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے کمیونل ایوارڈ صادر کر دیا۔ گاندھی جی نے اپنی ضد اور کانگرس کی ہٹ دھرمی پر پردہ ڈالنے کے لئے ۴۔نومبر ۱۹۳۹ء کو اپنے اخبار ہریجن میں لکھا کہ:

"جناب جناح صاحب تو مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے برطانیہ پر امیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔ وہ کانگرس کی کسی پیشکش سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔ ان کی یہ عادت ہے کہ اپنے مطالبات میں روز افزوں اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور جو کچھ برطانوی حکومت دیتی ہے یا جو کچھ دینے کا یقین دلاتی ہے تو جناح صاحب ایک قدم آگے بڑھ کر اس سے بھی زیادہ مانگنا شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ مسلم لیگ کے یہ مطالبات ایک لامتناہی سلسلے کی صورت اختیار کر گئے ہیں"۔

مسٹر جناح نے گاندھی جی کے اس قابل اعتراض بیان پر سخت افسوس کا اظہار کیا اور فرمایا کہ:

"مجھے یہ دیکھ کر سخت صدمہ ہوا ہے کہ مسٹر گاندھی نے ایک ایسا بے بنیاد الزام عائد کیا ہے جس میں ذرہ بھر بھی صداقت نہیں۔ موجودہ حالات میں وہ میرے یا مسلمانان ہند کے خلاف اس سے زیادہ زہر آلود بیان ہرگز نہیں دے سکتے تھے۔

انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی توہین کی ہے۔ مسٹر گاندھی جیسی حیثیت کے آدمی کی طرف سے اس بیان کا شائع ہونا حد درجہ افسوس ناک ہے۔ میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمان کسی خارجی قوت پر بھروسہ نہیں کرتے بلکہ صرف اپنی ذات پر اعتماد رکھتے ہیں۔ ہم اپنے حقوق کے لئے آخری دم تک لڑیں گے۔ بے شک کانگرس اور برطانوی حکومت دونوں متحد ہو کر ہمارے خلاف صف آراء ہو جائیں۔ ہمیں قطعاً پروا نہیں [1]"۔

---

[1] روزنامہ سٹیٹسمین، کلکتہ۔ مورخہ ۹، نومبر ۱۹۳۹ء

# عالمگیر جنگ نمبر ۳

## وائسرائے کی آخری کوشش

نومبر ۱۹۳۹ء کا پہلا ہفتہ وائسرائے کے لئے خاصی مصروفیت کا زمانہ تھا۔ یکم نومبر کو وہ بیک وقت مسٹر جناح، گاندھی جی اور بابو راجندر پرشاد سے ملے۔ ۲- کو ایک طرف گاندھی اور جناح کی نجی ملاقات ہوئی اور دوسری طرف پنڈت نہرو اور بابو راجندر پرشاد وائسرائے سے ملے۔ ۳- کو پنڈت نہرو اور مسٹر جناح کی نجی ملاقات ہوئی۔ ۴- کو گاندھی اور جناح نے وائسرائے سے الگ الگ ملاقاتیں کیں۔ ۵- کو پھر مسٹر جناح اور گاندھی جی سے وائسرائے سے الگ الگ ملے۔ غرضیکہ ہر طرف قیاس آرائیاں ہونے لگیں کہ دیکھیں ان بار بار کی ملاقاتوں کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

مسلمانوں کے علاوہ ہندوستان کی دیگر اقلیتوں کے لیڈروں نے بھی مسٹر جناح کو تار دیئے تھے کہ خدا کے لئے آپ جب وائسرائے سے ملیں تو ہماری نمائندگی بھی کیجئے گا۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ کانگرس کی پالیسی سے صرف مسلمان ہی ناراض نہ تھے بلکہ اور اقلیتیں بھی ہراساں اور پریشان تھیں۔ مثلاً اچھوتوں کے لیڈر ڈاکٹر امبیدکر نے مسٹر جناح کو لکھا تھا کہ:

"میں نے مسٹر شوراج ایم۔ ایل۔ اے سے کہا تھا کہ مدراس واپس آتے ہوئے آپ سے مل کر درخواست کریں کہ جب آپ کی وائسرائے سے ملاقات ہو تو از راہ کرم اچھوتوں کا بھی خاص طور پر ذکر کیجئے گا۔ مسٹر شوراج نے مجھے اطلاع دی ہے کہ آپ نے فرمایا تھا کہ آپ کے پاس اس مضمون کا کوئی تحریری مختار نامہ ہونا چاہئے۔ لہٰذا میں آپ کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لئے یہ خط ارسال کر رہا ہوں۔ مسٹر شوراج آپ کو اسی مضمون کا علیحدہ خط لکھیں گے۔ امید ہے آپ ضرور ہماری مدد کریں گے"۔

مسٹر شوراج نے مدراس سے مسٹر جناح کو تار دیا کہ:

"آپ اقلیتوں کے حقوق کے محافظ ہیں۔ وائسرائے سے جب آپ ملیں تو

اچھوتوں کے حقوق کی ترجمانی کیجئے گا۔"

سر کے ۔ وی ۔ ریڈی نے مدراس سے مسٹر جناح کو تار دیا تھا کہ:

"یکم اکتوبر کے مدراس میل میں جو میرا بیان شائع ہوا ہے اسے ضرور ملاحظہ فرمایئے گا۔ جو کچھ اس میں درج ہے میں اس کی صداقت کا ذمہ دار ہوں۔ غیر کانگرسی جماعتوں کو خونخوار بھیڑیوں کا شکار ہونے سے بچایئے"۔

مسٹر جناح نے ۵ - نومبر کو اخباری نمائندوں سے کہا تھا کہ میں نے وائسرائے کے سامنے جملہ اقلیتوں کا نقطہ نگاہ پیش کر دیا ہے۔ امید ہے وہ توجہ فرمائیں گے۔ ا۔

وائسرائے کے ساتھ ان لیڈروں کی جو باتیں ہوئیں ان کا خلاصہ اس خط میں بیان کیا گیا ہے، جو وائسرائے نے صدر کانگرس بابو راجندر پرشاد کو لکھا تھا۔ اور جواب میں جو خطوط راجندر پرشاد اور مسٹر جناح نے اپنی اپنی جماعت کی طرف سے وائسرائے کی خدمت میں بھیجے تھے۔

۲۔ نومبر کو وائسرائے نے کانگرس کے صدر بابو راجندر پرشاد کو جو خط لکھا تھا اس کا مضمون حسب ذیل ہے:

"آپ کو یاد ہو گا، کل ہمارے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ جو صورت حالات میں نے آپ کے اور ان اصحاب کے سامنے، جو اس ملاقات کے وقت موجود تھے، پیش کی تھی۔ اسے ایک واضح اور معین صورت میں بہ ضبط تحریر آپ کو بھیجوں گا۔ مقصد صرف یہ ہے کہ معاملے کو سلجھایا جائے اور مجھے اس کام میں ملک معظم کی حکومت کی تائید بھی حاصل ہے۔

کل کی ملاقات میں جو اصحاب موجود تھے وہ کانگرس اور مسلم لیگ کے لیڈر ہیں۔ اسی حیثیت سے میں نے ان کے سامنے یہ تجویز پیش کی تھی کہ چونکہ مرکز میں باہمی خیر سگالی اور یگانگت کے ساتھ کام کرنا بے حد ضروری ہے۔ اس لئے آپ لوگ سر جوڑ کر آپس میں صلاح مشورہ کیجئے کہ کیا کوئی صورت ایسی نکل سکتی ہے کہ آپ ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک و تعاون کر کے صوبوں کے نظام حکومت میں حصہ لیں۔ اگر اس قسم کی صورت نکل آئے تو مجھے وہ تجویزیں ارسال کیجئے۔ پھر میں کوشش کروں گا

---

ا۔ روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ"، لاہور۔ ۶۔ نومبر ۱۹۳۹ء

کہ آپ کی دونوں جماعتوں ( کانگرس اور لیگ ) کے نمائندوں کو مرکزی حکومت میں اپنی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر نامزد کروں۔

میں نے یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ میرے خیال میں یہ ضروری نہیں کہ اس وقت جو صوبائی دائرے میں اختلاف اور جھگڑے موجود ہیں ان میں سے ایک ایک کو نپٹایا جائے۔ مقصد صرف یہ ہے، اور میں نے دوران بحث بھی اس پر زور دیا تھا، کہ صوبائی حدود کے اندر اس قسم کی کوئی قابلِ عمل مفاہمت ہو جائے جس سے یہ ممکن ہو سکے کہ میرے ملاقاتی اور وہ جماعتیں جن کی وہ نمائندگی کرتے ہیں، کوئی ایسی سکیم پیش کریں جسے مرکز کے لئے قابل غور قرار دیا جا سکے۔

مرکز میں جو انتظام ہو گا اس کے بارے میں مَیں نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر ممکن ہوا تو ایک یا ایک سے زیادہ نمائندے دیگر اہم گروہوں میں سے بھی لئے جائیں گے۔ اور اس غرض کے لئے میں بوقت ضرورت آپ سے مشورہ کروں گا۔ دوسری بات میں نے یہ کہی تھی کہ یہ انتظام، جس کے لئے آپ کو دعوت دے رہا ہوں، صرف دوران جنگ کے لئے مؤثر ہو گا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد جو وسیع تر آئینی اور دستوری تبدیلیاں کی جائیں گی وہ اس عارضی انتظام سے بالکل مختلف ہوں گی۔ اور میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اس آخری نکتے کے متعلق میرے بیان میں ملک معظم کی حکومت کی پوزیشن واضح کر دی گئی ہے۔ میں اس بیان کے ان چند حصوں کی نقول ملفوف کر رہا ہوں جو میں نے کل کی میٹنگ میں پیش کئے تھے۔

تیسری بات یہ ہے کہ سیاسی پارٹی کا جو رکن میری ایگزیکٹو کونسل کا ممبر نامزد کیا جائے گا وہ اپنے حقوق و مراعات اور فرائض کے اعتبار سے میری کونسل کے موجودہ ممبروں کے ہم پلہ ہو گا۔ چوتھی بات یہ ہے کہ یہ انتظام موجودہ قانون کی عام حدود کے اندر ہو گا۔ جس سے ظاہر ہے کہ یہ ردّ و بدل صرف زمانہ جنگ کے لئے کیا جا رہا ہے۔

میں نے کہا تھا کہ اصل مقصد یہ ہے کہ اگر ہم اس ضمن میں کوئی قابلِ عمل سکیم وضع کر لیں تو پھر اسے جلد از جلد نافذ کر دینا چاہیے۔ ہندوستان کے آئندہ دستور کے متعلق ملک معظم کی حکومت نے وعدہ کیا ہے کہ جنگ

ختم ہونے کے بعد اس پر غور کیا جائے گا۔

میرے خیال کے مطابق مذکورہ بالا گذارشات سے معاملہ واضح ہو گیا ہے۔ میں نے کل بھی یہ کہا تھا اور آج بھی کہتا ہوں کہ میں ہر وقت آپ کی یا ان صاحب کی مدد کے لئے حاضر ہوں جو کل ہماری میٹنگ میں موجود تھے۔ چاہے آپ دونوں الگ الگ مجھ سے مشورہ کریں یا اکھٹے آئیں۔ میں اس ضروری معاملے کو سلجھانے کے لئے، جو کچھ میرے اختیار میں ہے، کرنے سے دریغ نہیں کروں گا۔ میں نے کل بھی یہ کہا تھا اور آج پھر دہراتا ہوں کہ یہ تجویز جو میں نے پیش کی ہے اس امر کی آئینہ دار ہے کہ ملک معظم کی حکومت کس خلوص سے مکمل مفاہمت کی خواہاں ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس پر غایت ہمدردی سے توجہ کریں گے"۔

وائسرائے کے بیان کے چند حصوں کی نقل:

"میں نے ۱۸۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء کے اعلان میں یہ کہا تھا کہ ملک معظم کی حکومت یہ تسلیم کرتی ہے کہ جب ہندوستان کی فیڈرل حکومت کے خاکے پر غور کرنے کا وقت آئے گا تو جس قسم کے حالات اس وقت ہوں گے ان کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی کون کون سی تفصیلات موزوں ہیں۔ مجھے ملک معظم کی حکومت نے یہ کہنے کا اختیار دیا ہے کہ جنگ ختم ہونے کے بعد وہ بخوشی ہندوستان کے مختلف فرقوں، جماعتوں، پارٹیوں اور والیان ریاست کے نمائندوں کے مشورے اور تعاون سے اس ایکٹ میں ضروری ترمیمیں کرنے کو تیار ہے۔

میں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں نے یہ امر واضح کر دیا ہے کہ ملک معظم کی حکومت اس بات کی خواہش مند ہے کہ برطانیہ اور ہندوستان کا باہمی اشتراک اس طرح ترقی کرے کہ بالآخر ہندوستان کو ڈومینئین کا درجہ حاصل ہو جائے۔ ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی سکیم اسی منزل کو پیش نظر رکھ کر مرتب کی گئی تھی۔ لیکن جنگ ختم ہونے کے بعد ملک معظم کی حکومت اہل ہند کی خواہشات کے مطابق اس ایکٹ میں ضروری تبدیلیاں کرنے پر آمادہ ہے۔

اقلیتوں کے مطالبات کا ذکر کرتے ہوئے میں نے آخر میں یہ بھی لکھا تھا کہ اقلیتوں کے خیالات اور مفاد پر غور کیا جائے گا۔ جو لوگ ماضی قریب میں ملک

معظم کی حکومت اور پارلیمنٹ کے ساتھ آئین سازی کے کام میں شرکت کر چکے ہیں، ہم یقیناً ان سے دوبارہ ہندوستان کے آئین میں ترمیم و تبدیلی کرتے وقت مشورہ اور تعاون کریں گے"۔

## راجندر پرشاد کا وائسرائے کو جواب

"آپ کے ۳۔ نومبر کے خط کا شکریہ. جس میں آپ نے ان تجویزوں کو قطعی صورت میں قلم بند کیا ہے جو آپ نے یکم نومبر کو ہمارے سامنے پیش کی تھیں. جب ہم آپ سے ملے تھے۔ میں نے اور میرے رفیقوں نے ان پر اچھی طرح غور کیا ہے۔ ہم نے اس معاملے میں مسٹر جناح سے بھی مفصل گفتگو کی ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارا جواب اب بھی وہی ہے جو ہم نے بوقت ملاقات آپ کو دیا تھا۔ اور اس جواب میں ہم کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے۔

میں شروع ہی میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب آپ سے میری اور گاندھی جی کی ملاقات ہوئی تھی تو ہم نے محسوس کیا تھا کہ کانگرس نے جنگ کے متعلق جو اہم ترین اخلاقی سوال اٹھایا ہے اس کی طرف آپ نے اشارہ تک بھی نہیں کیا۔ یعنی برطانیہ کے سامنے وہ کیا مقاصد ہیں جن کی خاطر وہ جنگ میں شریک ہوا ہے؟ جب تک اس سوال کا جواب نہ مل جائے ہم کسی قسم کی ضمنی اور ذیلی تجاویز پر غور کرنے کے لئے تیار نہیں۔ موجودہ بحران کی وجہ یہ ہے کہ یورپ میں جو جنگ چھڑ گئی ہے اس میں برطانیہ نے اہل ہند کی مرضی کے بغیر ہندوستان کو شریک کر دیا ہے۔ یہ ایک سراسر سیاسی بحران ہے جس کا فرقہ وارانہ مسئلہ سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس بحران نے جو اہم سوال پیدا کئے ہیں وہ یہ ہیں کہ برطانیہ کن مقاصد کی خاطر جنگ میں شریک ہوا ہے. اور ان مقاصد کا ہندوستان پر کیا اثر پڑتا ہے۔

آپ کو یاد ہو گا کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے ۱۴۔ ستمبر کو ایک طویل بیان شائع کیا تھا کہ برطانوی حکومت کو چاہئے کہ اپنے مقاصد جنگ کا اعلان کرے اور خاص طور پر یہ بتائے کہ ان مقاصد کا ہندوستان پر کیا اثر پڑے گا؟ اور اس

وقت ان مقاصد کو کیونکر بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا گیا تھا کہ ہندوستان کے باشندوں کو لازماً حق خودارادی حاصل ہونا چاہئے۔ جس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ وہ بغیر کسی خارجی دباؤ کے ایک کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی قائم کر کے اپنا آئین اور پالیسی وضع کریں۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے ۱۰ ، اکتوبر کو اس بیان پر مہر تصدیق ثبت کر کے برطانوی حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ جو اعلان وہ شائع کرے اس میں فوراً ہندوستان کی آزادی کو تسلیم کر لیا جائے اور بحالات موجودہ اس آزادی کا زیادہ سے زیادہ اطلاق ہندوستان پر ہونا چاہئے۔

کمیٹی نے یہ بھی کہا تھا کہ ہندوستان کی آزادی. جمہوریت. وحدت اور اقلیتوں کے حقوق کے مکمل اعتراف اور تحفظ پر مبنی ہونی چاہئے۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ وائسرائے نے برطانوی حکومت کی پالیسی کی وضاحت کی خاطر ایک بیان دیا جس کے کچھ اقتباسات آپ نے مجھے ارسال فرمائے ہیں۔ کمیٹی نے اس بیان کے معاً بعد اس پر غور کیا تھا لیکن کمیٹی کی رائے اس کے متعلق یہ ہے کہ یہ بیان افسوس ناک اور بالکل غیر تسلی بخش ہے نتیجہ یہ ہوا کہ کمیٹی کو مجبوراً یہ اعلان کرنا پڑا کہ وہ برطانیہ کو کسی قسم کی مدد دینے سے معذور ہے۔ اور ساتھ ہی کمیٹی نے ان صوبوں کی وزارتوں کو جہاں کانگرس کی اکثریت ہے ہدایت کی ہے کہ مستعفی ہو جائیں۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ وائسرائے نے برطانوی حکومت کی وضاحت کے لئے جو بیان دیا تھا،اسے ہندوستان کی بہت بڑی اکثریت نے جس میں غیر کانگرسی جماعتیں بھی شامل ہیں، ناپسند کیا ہے۔ اس کے بعد برطانوی حکومت نے پارلیمینٹ میں جو بیان دیئے تھے، انہوں نے بھی اس پالیسی میں کوئی خاص تبدیلی نہیں کی جس کا خاکہ وائسرائے کے بیان میں پیش کیا گیا ہے۔ آپ نے یہ بالکل بجا کہا ہے کہ جس پالیسی پر آپ اس وقت گامزن ہیں وہی ہے جس کے اقتباسات آپ نے مجھے بھیجے ہیں۔

افسوس ہے کہ ہم اس پالیسی کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ اور جب تک برطانوی حکومت کانگرس کی پیش کردہ شرائط کے مطابق اپنی پالیسی مرتب نہیں کرتی ہم حکومت سے کسی قسم کا تعاون کرنے کو تیار نہیں۔ ہمیں یہ دیکھ کر سخت تکلیف

ہوئی ہے کہ اس بحث کو خواہ مخواہ فرقہ وارانہ مسئلہ سے آلودہ کر دیا گیا ہے جس سے سارا معاملہ اُلجھ کر رہ گیا ہے۔ کانگرس متعدد بار یہ اعلان کر چکی ہے کہ ہم فرقہ وارانہ قضیے کے تمام پہلوؤں کا تصفیہ باہمی سمجھوتے سے کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قضیے کی آڑ لے کر ہندوستان کی آزادی کا اعلان کرنے میں کیوں تامل کیا جارہا ہے۔

یہ آزادی کسی خاص فرقے کی نہیں بلکہ پورے ہندوستان کی آزادی ہو گی اور جو مجلس دستور ساز ہندوستان کا آئین وضع کرے گی اس میں تمام فرقوں کو نمائندگی حاصل ہو گی۔ اور اس کا انتخاب وسیع ترین فرنچائز کے اصولوں پر ہو گا۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ تمام اقلیتوں کے حقوق محفوظ ہونے چاہئیں اور اس امر کا فیصلہ باہمی سمجھوتے سے ہونا چاہئے. ہمارے خیال میں برطانوی حکومت نے اس مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لے کر اور یہ بار اٹھانے میں شریک ہو کر فرقہ وارانہ مفاہمت کو پہلے سے بھی زیادہ مشکل بنا دیا ہے۔ کانگرس کا یہ اعلان برطانوی حکومت کے تمام اندیشے رفع کرنے کے لئے کافی ہے کہ ہم کسی ایسے آئین کا تصور بھی نہیں کر سکتے جس میں حقیقی اقلیتوں کے حقوق ان کے حسب خاطر محفوظ نہ کئے جائیں۔ ہمارے خیال میں جب تک مجوزہ (آزادیٔ ہند کا) اعلان نہیں ہوتا مزید گفت و شنید بے کار ہے۔ جنگ یورپ میں جو تازہ ترین صورت پیدا ہوئی ہے اس کے پیش نظر اس قسم کے واضح اعلان کی ضرورت پہلے سے بھی بڑھ گئی ہے کہ جنگ کے مقاصد بیان کئے جائیں۔ اگر ایک تسلی بخش اعلان ہو جائے تو ہم نہایت خوشی سے آپ کے ساتھ اس تجویز کے مالۂ و ماعلیہ پر بحث کرنے کو تیار ہیں جو آپ نے پیش کی ہے۔ اور اس قسم کی بحث کا فائدہ بھی اسی وقت ہو گا۔

یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ گاندھی جی کو اس طریقہ سے کُلی اتفاق ہے ہمارا ارادہ کل شام وردھا روانہ ہو جانے کا ہے بشرطیکہ آپ کے نزدیک یہاں ہمارا قیام مزید چند روز کے لئے ضروری نہ ہو"۔

جناح کا وائسرائے کو جواب

"اس مشترکہ ملاقات کے حوالے سے جو آپ نے یکم نومبر کو مسٹر گاندھی،

ڈاکٹر راجندر پرشاد اور مجھ سے کی تھی۔ اور بحوالہ اس خط کے جو آپ نے ۲۔نومبر کو بھیجا تھا گذارش ہے کہ میرا خیال یہ تھا کہ مجھ کو اور کانگرس کے لیڈروں کو آپ کی پیش کردہ تجویز پر غور کرنا ہو گا۔ آپ نے اپنے خط میں بھی تو یہی لکھا تھا کہ "کل کی ملاقات میں جو اصحاب موجود تھے وہ کانگرس اور مسلم لیگ کے لیڈر ہیں۔ اس حیثیت سے میں نے ان کے سامنے یہ تجویز پیش کی تھی کہ چونکہ مرکز میں باہمی خیرسگالی اور یگانگت کے ساتھ کام کرنا بے حد ضروری ہے۔ اس لئے آپ لوگ سرجوڑ کر آپس میں صلاح مشورہ کیجئے کہ کیا کوئی صورت ایسی نکل سکتی ہے کہ آپ ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک و تعاون کر کے صوبوں کے نظام حکومت میں حصہ لیں۔ اگر اس قسم کی صورت نکل آئے تو مجھے وہ تجویزیں ارسال کیجئے۔ پھر میں کوشش کروں گا کہ آپ کی دونوں جماعتوں (کانگرس اور لیگ) کے نمائندوں کو مرکزی حکومت میں اپنی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر نامزد کروں۔ میں نے یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ میرے خیال میں یہ ضروری نہیں کہ اس وقت جو صوبائی دائرے میں اختلاف اور جھگڑے موجود ہیں۔ ان میں سے ایک ایک کو نپٹایا جائے۔ مقصد صرف یہ ہے۔ اور میں نے دوران بحث میں بھی اس پر زور دیا تھا کہ صوبائی حدود کے اندر اس قسم کی کوئی مفاہمت ہو جائے جس سے یہ ممکن ہو سکے کہ میرے ملاقاتی اور وہ جماعتیں جن کی وہ نمائندگی کرتے ہیں۔ کوئی ایسی سکیم پیش کریں جسے مرکز کے لئے قابل قبول قرار دیا جا سکتے"۔

"میرا یہ خیال ہے کہ ہمیں آپ کی اس تجویز پر غور و خوض کرنا تھا۔ اور وہ بھی اس روشنی میں کہ مسلم لیگ کے ۲۲۔ اکتوبر کے ریزولیوشن کو کوئی ضعف نہ پہنچے جس میں یہ کہا گیا تھا کہ "آپ نے ملک معظم کی حکومت کی جانب سے جو اعلان کیا ہے وہ اطمینان بخش نہیں اور اس ضمن میں مزید وضاحت اور یقین دہانی کی ضرورت ہے۔ اور نہ کانگرس کے اس مطالبے کو کوئی ضعف پہنچے جو آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے ۱۰۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء کے ریزولیوشن میں کیا تھا۔ چنانچہ میں کانگرس کے لیڈروں سے ملا۔ انہوں نے حتمی طور پر مجھ کو بتایا کہ وہ من جملہ ان امور کے جن کا ذکر آپ نے اپنے خط محررہ ۲۔ نومبر میں کیا تھا کسی امر پر بحث کرنے کو تیار نہیں۔ اور یہ کہ جب تک برطانوی حکومت ان کے اس

مطالبے کو نہیں مانتی جس کا اظہار آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے ریزولیوشن میں کیا گیا ہے۔ وہ صوبوں اور مرکز کے نظام حکومت کے بارے میں کوئی بات کرنا نہیں چاہتے۔ لہٰذا ان دونوں سوالوں پر مزید کوئی گفت و شنید نہ ہو سکی لے"۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی مفاہمت کا یہ ایک بڑا قیمتی موقع تھا جو کانگرس کی ضد نے ضائع کر دیا۔ اگر وائسرائے کی اس تجویز کے مطابق تمام صوبوں میں کانگرس اور مسلم لیگ کی مشترکہ وزارتیں بن جاتیں تو ساتھ مرکزی حکومت میں بھی دونوں جماعتوں کے نمائندے شامل ہو سکتے تھے۔ اس طرح کم سے کم جنگ کے دوران میں دونوں جماعتوں کو مل کر کام کرنے کا موقع ملتا۔ اور کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ آپس کے جملہ اختلافات آہستہ آہستہ کم ہونے شروع ہوتے۔ لیکن افسوس کہ کانگرس بدستور ۱۹۳۷ء کی پالیسی پر کاربند تھی۔ اور صوبائی دائرے میں مسلم لیگ کے ساتھ کولیشن بنانے پر آمادہ نہ تھی۔

یہ صاف سیدھا اور برمحل راستہ اختیار کرنے کی بجائے کانگرسی لیڈروں نے بھانت بھانت کی بولیاں بولنا شروع کر دیں۔ کانگرس کے صدر بابو راجندر پرشاد نے پٹنہ سے ایک بیان داغ دیا کہ وائسرائے کو چاہئے تھا کہ کانگرس کے مطالبے کے جواب میں ہندوستان کی آزادی کا اعلان کرتا۔ اُلٹا اس نے ہمارے گھر کے اندرونی اختلافات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی فرقہ وارانہ کشیدگی کو ہندوستان کی آزادی کے راستے میں حائل نہیں ہونا چاہئے۔

پنڈت نہرو نے بھی اپنی قدیم عادت کے مطابق پہلے انقلاب کا نعرہ لگایا۔ پھر فرمایا کہ ہندو مسلم اختلافات کی آڑ میں ہندوستان کی آزادی ملتوی کرنا برطانوی امپیریلزم کا پرانا کھیل ہے۔ ہندوستان کا موجودہ مسئلہ سراسر سیاسی ہے۔ جسے فرقہ وارانہ مفاہمت سے کوئی واسطہ نہیں۔

گاندھی جی نے ۸۔ نومبر کو اپنے اخبار ہریجن میں ایک طویل مضمون لکھا۔ اور حسب معمول سیاست کی تلخیوں کو استعاروں اور تشبیہوں میں بیان کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً

"آقا جب اپنے غلاموں کو آزاد کرتا ہے تو غلاموں سے یہ نہیں پوچھا کرتا کہ تم آزادی چاہتے ہو یا نہیں۔ اسی طرح آج برطانیہ کو یہ

---

لے روزنامہ سٹیٹسمین کلکتہ۔ مورخہ ۱۳۔ نومبر ۱۹۳۹ء

زیبا نہیں کہ ہندو مسلم مسئلہ کو بہانہ بنا کر ہندوستان کی آزادی کو ملتوی کرے"۔

آگے چل کر فرمایا:

"یہ آنکھ مچولی اب ختم ہونی چاہئے۔ اقلیتوں کو یقیناً حفاظت درکار ہے لیکن یہ حفاظت بالاقساط نہیں بلکہ پوری کی پوری بیک جنبش قلم ملنی چاہئے۔ آزادی کا وہ پروانہ جس سے صرف اکثریت متمتع ہو سکے اور اقلیت محروم رہے اس قابل بھی نہیں کہ اس پر ایک نظر ڈالی جائے ......... ہندوستان پر برطانیہ کا قبضہ ہے اور یہ امپیریلزم کے پرانے ہتھکنڈے ہیں کہ اقلیت اور اکثریت میں باہمی بے اعتمادی پیدا کر کے اپنا مطلب پورا کیا جائے۔ فرقہ وارانہ مسئلہ حل کرنے کی بہترین تدبیر یہ ہے کہ اس مسئلے کو مختلف فرقوں کے حوالے کر دیا جائے۔ جب تک برطانیہ اس میں دخل دیتا رہے گا. ہندوستان پر اس کے قبضے کا جواز بھی قائم رہے گا"۔

گاندھی جی کی اس قسم کی تحریریں پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ان کی یہ عادت کس قدر راسخ ہو چکی تھی کہ بوقت ضرورت نہایت آسانی سے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر حقائق سے انکار کر دیتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ہندوستان پر برطانیہ کا قبضہ تھا۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ ہر امپیریلزم کے اپنے اپنے ہتھکنڈے ہوتے ہیں جن سے وہ محکوم قوموں پر اپنا اقتدار قائم رکھتا ہے۔ لیکن سوچنے والی بات یہ ہے کہ نہرو رپورٹ سے لے کر ۱۹۳۷ء کی صوبائی اصلاحات کے نفاذ تک اکثریت نے کس دن اقلیت کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کی تھی؟

گول میز کانفرنس میں خود گاندھی جی بھی شریک تھے. اور انگریز نے اس وقت صاف کہہ دیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو سمجھوتہ ہو گا وہ اسے بخوشی منظور کر لے گا۔ لیکن گاندھی جی کبھی سمجھوتے پر آمادہ نہ ہو سکے اور بدستور یہی اصرار کرتے رہے کہ پہلے ڈاکٹر انصاری کو ہندوستان سے بلواؤ پھر میں مسلمانوں کے وفد سے بات کروں گا۔ جب ان سے عرض کیا گیا کہ آپ چاہیں تو بے شک ڈاکٹر انصاری کو کانگرس کے ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے طلب فرمالیں. ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ تو جواب یہ دیا گیا کہ نہیں. مسلمان ڈاکٹر انصاری کو اپنا نمائندہ بنا کر یہاں بلوائیں۔ جواب میں دوبارہ عرض کیا گیا کہ ڈاکٹر انصاری کی سیاست ایسی ہے کہ ان پہ گول میز کانفرنس کے مسلم وفد کو اعتماد نہیں۔ اس لئے وہ ہماری نمائندگی نہیں کر

سکتے، تو گاندھی جی نے صاف کہہ دیا کہ جب تک ڈاکٹر انصاری لندن نہیں آتے میں مسلم وفد سے فرقہ وارانہ مفاہمت پر کوئی بات کرنے کو تیار نہیں۔

اس کشاکش کا نتیجہ کیا نکلا؟ خود ہندوؤں نے برطانیہ کے وزیراعظم ریمزے میکڈانلڈ کو ثالث مقرر کر دیا کہ جو فیصلہ وہ کریں گے ہمیں منظور ہو گا۔ جب ریمزے میکڈانلڈ نے کمیونل ایوارڈ صادر کیا تو ہندوستان کے گوشے گوشے سے ہندوؤں کی مخالفت کا سیلاب امڈ آیا کہ ہمیں یہ ایوارڈ منظور نہیں۔

جب ۱۹۳۷ء میں صوبائی اصلاحات نافذ ہوئیں تو جناح نے بار بار منتیں کیں کہ آؤ مسلم لیگ اور کانگرس کی مشترکہ وزارتیں قائم کریں تاکہ ہندو مسلم مفاہمت کی بنیاد استوار ہو سکے۔ لیکن گاندھی جی نے کہا تو صرف یہ کہ "مجھے روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آتی"۔ اور جواہر لال نہرو نے ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا کہ "ہندوستان میں صرف دو فریق موجود ہیں۔ ایک کانگرس اور دوسرا برطانوی حکومت"۔

جب مسٹر جناح نے یہ نظریہ تسلیم کرنے سے انکار کیا اور فرمایا کہ ایک تیسرا فریق بھی موجود ہے۔ یعنی مسلمان۔ تو جواہر لال نے حد درجہ رعونت سے جواب دیا کہ جناح سرمایہ داروں کا نمائندہ ہے اور مسلمانوں کی جداگانہ قومی ہستی ایک مذاق ہے۔ ہندوستان میں صرف ایک قوم آباد ہے جس کا نام ہے ہندوستانی۔ اور اس کی صرف ایک نمائندہ جماعت ہے یعنی انڈین نیشنل کانگرس۔ پھر مسلمانوں کی قومی جمعیت کو منتشر کرنے کے لئے رابطہ عوام (مسلم ماس کانٹکٹ) کی تحریک جاری کی گئی۔ اکا دکا مسلمان کو وزارت کا چکمہ دے کر مسلم لیگ سے توڑنے کی کوشش کی گئی۔ کانگرسی روپے سے مسلمانوں کے لئے اخبار جاری کرائے گئے تاکہ ان میں انتشار پھیلایا جائے۔ تنخواہ دار مولوی ملازم رکھے گئے کہ "اسلام" کا نام لے کر مسلمانوں کو مسلم لیگ سے منحرف کریں۔ اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے گئے ان سے ان غریبوں کا امن و عافیت غارت ہوا اور عزت و آبرو کی بھی تباہی مچی۔ لیکن حد یہ ہے کہ گاندھی جی نے وزارتیں قبول کرنے سے پہلے وائسرائے سے سمجھوتہ کر لیا تھا کہ صوبوں کے گورنر اقلیتوں کی حفاظت کے لئے اپنے اختیارات خاص استعمال نہیں کریں گے۔ چنانچہ جب مسلمانوں نے کانگرسی مظالم سے تنگ آ کر واویلا کیا تو گورنر اپنے اس سمجھوتے کی بناء پر چپ چاپ تماشا دیکھتے رہے۔

ستم یہ ہے کہ یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد آج گاندھی جی اور نہرو جی ایک طرف

امپیریلزم کو لعن طعن کرتے ہیں۔ دوسری طرف فرقہ وارانہ مسئلے کے وجود سے انکار کرتے ہیں۔ تیسری طرف یہ فیصلہ صادر کرتے ہیں کہ جب تک برطانوی اقتدار قائم ہے فرقہ وارانہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ اور چوتھی طرف مسلمانوں کے ناصح مشفق بن کر انہیں نصیحت کرتے ہیں کہ ہم پر اعتبار کرو۔ ہم تمہارے خیر خواہ ہیں۔

انگریز کی ابن الوقتی مُسلّم سہی۔ کون اس سے انکار کرتا ہے لیکن جب وائسرائے نے اپنی اور راجندر پرشاد اور جناح کی مذکورہ بالا مراسلت بغرض اشاعت اخباروں کے حوالے کی تو ساتھ ایک بیان بھی شائع کیا تھا جس میں منجملہ دیگر باتوں کے یہ بھی کہا تھا کہ ہندوستان میں اس وقت دو سب سے بڑی سیاسی پارٹیاں ہیں۔ ایک کانگرس دوسری مسلم لیگ۔ ان دونوں میں اتحاد ہونا ضروری ہے اور آگے چل کر کہا تھا کہ:

"میں نے ان دونوں پارٹیوں کے نمائندوں (جناح، گاندھی اور راجندر پرشاد) سے درخواست کی تھی کہ وہ صوبائی نظام حکومت کے متعلق باہمی مشورے سے کوئی فارمولا تلاش کریں۔ جس کی بناء پر آگے چل کر مرکز میں گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل میں توسیع کی جا سکے ......... اس باہمی مشورے کا نتیجہ انتہائی مایوس کن نکلا اور ان دو بڑی پارٹیوں کے نمائندوں میں اس قدر شدید اختلاف ہے کہ وہ بنیادی مسائل پر اکٹھے نہیں ہو سکتے"۔

گاندھی اور نہرو کی برافروختگی کی حقیقی وجہ یہ تھی کہ وائسرائے نے لفظاً نہ سہی معناً آل انڈیا مسلم لیگ کو ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کر کے اسے کانگرس کے مساوی درجہ دے دیا تھا۔ کانگرسی لیڈروں کے لئے یہ اتنا بڑا سانحہ تھا کہ وہ اس کے تصور سے پریشان ہو رہے تھے۔ اگر مسلم لیگ مسلمانانِ ہند کی نمائندگی کرتی تھی تو لامحالہ کانگرس کی پوزیشن یہ رہ جاتی تھی کہ وہ ہندوؤں کی نمائندہ جماعت ہے۔ کچھ اور نہ سہی. اس جنگ نے کم از کم یہ نکتہ تو واضح کر ہی دیا تھا۔

شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ
اب مآلِ سعیٔ اسکندر کھلا

مسٹر جناح پر یہ الزام دھرنا کہ وہ سمجھوتے سے گریزاں تھا یا فرقہ وارانہ مفاہمت کے خواہاں نہیں تھے. ایک غلط اور بے بنیاد اتہام ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جنگ نے ہمیں ایک ایسے

مقام پر لا کھڑا کیا تھا جہاں ہندوستان کی دو بڑی سیاسی پارٹیوں، کے سامنے صرف ایک راستہ کھلا تھا۔ اور وہ راستہ یہ تھا کہ یا ۱۹۱۶ء کے میثاق لکھنؤ کی طرح کانگرس اور مسلم لیگ میں کوئی مفاہمت ہو جائے اور دونوں فریق مل کر انگریز کے سامنے ایک متحدہ مطالبہ پیش کریں۔ اگر یہ نہیں ہو سکتا تھا تو برطانوی حکومت. دنیا کے ہر بُرے بھلے امپیریلزم کی طرح. ہمارے اندرونی اختلافات سے فائدہ اٹھانے کو تیار تھی۔ کانگرس کی دوش اس بارے میں جو کچھ بھی تھی آپ کے سامنے ہے۔ پہلے اس نے مسلم لیگ کی نمائندہ حیثیت سے انکار کیا۔ پھر اس نے مسلمانوں کی جداگانہ قومی ہستی سے انکار کیا۔ اور آخر میں اس نے یہ اعلان کیا کہ صرف کانگرس ہندوستان کی تمام قوموں کی نمائندہ جماعت ہے۔ اور انگریز کو چاہئے کہ جملہ اقتدار و اختیار اس کے حوالے کر کے رخصت ہو جائے۔

مسٹر جناح کی روش اس بارے میں کیا تھی؟ اس کا اظہار انہوں نے ۷۔ نومبر ۱۹۳۹ء کو بمبئی کے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے کیا تھا کہ:

"جہاں تک میرا تعلق ہے میں ہمیشہ کانگرس کے لیڈروں کی ایسی کوشش کا خیر مقدم کروں گا جس سے ملک کی دو بڑی قوموں میں باہمی تصفیہ ہو سکے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اس تصفیے کے بغیر ہندوستان آئندہ ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتا.................. بعض کانگرسی لیڈر یہ کہتے ہیں کہ دستور وضع کرنا کانگرس کا کام ہے۔ جس سے اقلیتوں کا کچھ واسطہ نہیں۔ اقلیتوں کو تو صرف اپنے تحفظات سے غرض رکھنی چاہئے۔ کانگرس یا تو غلط راستے پر جا رہی ہے یا پھر وہی پرانا کھیل کھیل رہی ہے جس سے مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کو فریب دینا مقصود ہے۔ اقلیتوں کو صرف تحفظات ہی درکار نہیں بلکہ وہ یہ بھی معلوم کرنا چاہتی ہیں کہ آئندہ کانسٹی ٹیوشن کس نوع کا ہو گا۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کی چار صوبوں میں اکثریت ہے"۔

اس دوران میں کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے ایک قرار داد کا مسودہ مرتب کیا اور تمام صوبوں کی کانگرسی حکومتوں سے کہا کہ وہ قرار داد باضابطہ ہر صوبے کی لیجسلیٹو اسمبلی کے اجلاس میں پیش کر کے منظور کرا دی جائے۔ یہ مسودہ حسب ذیل تھا۔

"یہ اسمبلی اس بات پر افسوس کا اظہار کرتی ہے کہ برطانوی حکومت نے موجودہ جنگ میں جو برطانیہ عظمیٰ اور جرمنی میں لڑی جا

رہی ہے باشندگان ہند کی مرضی کے بغیر ہندوستان کو شریک کر لیا ہے۔
مزید بر آں اس نے ہندوستان کی رائے کو قطعی نظر انداز کر کے ایسے
قوانین پاس کئے اور ایسے اقدامات کئے ہیں جن سے صوبائی حکومتوں
کے اختیارات اور ان کی سرگرمیوں میں قطع و برید کی گئی ہے۔ یہ اسمبلی
حکومت سے سفارش کرتی ہے کہ وہ حکومت ہند کو اور حکومت ہند کے
توسط سے برطانوی حکومت کو یہ پیغام پہنچا دے کہ جنگ کے متفقہ مقاصد
کے پیش نظر یہ لابدی ہے کہ اہل ہند کا تعاون حاصل کرنے کے لئے
ہندوستان پر جمہوریت کے اصولوں کا اطلاق کیا جائے۔ اور اس کی
پالیسی کا نفاذ اہل ہند کے ہاتھ میں ہونا چاہئے۔ لہٰذا یہ اسمبلی برطانوی
حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اس نوع کا صاف اور واضح اعلان
کرے کہ اس نے ہندوستان کو ایک آزاد اور خود مختار قوم تسلیم کرنے
کا فیصلہ کر لیا ہے جسے اپنا دستور وضع کرنے کا اختیار ہو گا۔ اس کے
علاوہ جہاں تک ممکن ہو مستقبل قریب میں ایسا قدم اٹھایا جائے جس
سے حکومت ہند کی تشکیل کے سلسلے میں اس اعلان کو عملی جامہ پہنایا جا
سکے۔ اس کے علاوہ یہ اسمبلی اس بات کی سفارش کرتی ہے کہ اس
صوبے میں جنگ سے متعلقہ جتنے اقدامات کئے جائیں وہ صوبائی حکومت
کی منظوری سے ہوں اور وہی ان کو نافذ بھی کرے"۔

جب اخباروں میں یہ اعلان ہوا کہ کانگرسی حکومتیں فرداً فرداً تمام کانگرسی صوبوں کی اسمبلیوں میں یہ قرار داد پاس کروانا چاہتی ہیں تو آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ جب یہ قرار داد ایوان میں پیش ہو تو اس صوبے کی مسلم لیگ پارٹی کا لیڈر ذیل کی ترمیم پیش کرے:

"یہ اسمبلی حکومت سے سفارش کرتی ہے کہ وہ حکومت ہند کو اور
حکومت ہند کے توسط سے ملک معظم کی حکومت کو یہ پیغام پہنچا دے کہ
اگر جنگ کے دوران میں یا جنگ کے اختتام پر ہندوستان کے دستور پر
غور کرنے کی نوبت آئی تو وہ اس بات کو ملحوظ خاطر رکھے گی کہ موجودہ
آئین کی رو سے جس قسم کا پارلیمنٹری جمہوری نظام رائج کیا گیا ہے وہ

ناکام رہا ہے۔ اور یہ نظام لوگوں کے مزاج اور حالات کے قطعی ناموافق ہے۔ اور یہ کہ ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ سے قطع نظر کر کے ہندوستان کے آئندہ دستور کے پورے مسئلے پر از سر نو غور و خوض اور نظر ثانی کی جائے گی۔ اور یہ کہ برطانوی حکومت کو چاہئے کہ اس ضمن میں اصولاً یا کسی اور طریقے سے آل انڈیا مسلم لیگ کی منظوری اور رضامندی کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھائے کیونکہ تنہا آل انڈیا مسلم لیگ مسلمانان ہند کی نمائندگی اور ترجمانی کا حق رکھتی ہے"۔

مسلم لیگ کی اس ترمیم پر ہر صوبے کی اسمبلی کے کانگرسی ممبروں نے بہت شور مچایا اور ایک ایک کر کے وہی فرسودہ دلائل پیش کئے جو اس سے قبل گاندھی، نہرو، راجندر پرشاد اقلیتوں کے بارے میں پیش کر چکے تھے۔ جب یوپی کی اسمبلی میں چودھری خلیق الزمان نے یہ ترمیم پیش کی تو اچاریہ نرندر دیو نے کہا کہ تعجب ہے کہ جس اسلام نے دنیا کو جمہوریت کا سبق دیا تھا، آج اسی اسلام کے نام لیوا یہ مسلم لیگی ممبر جمہوریت کی مخالفت کر رہے ہیں۔

اچاریہ نرندر دیو اپنے آپ کو سوشلسٹ کہتے تھے لیکن ان کا سوشلزم بھی یہ پیش پا افتادہ حقیقت سمجھنے سے معذور تھا کہ جس ملک میں ہندو اور مسلمان دو قومیں آباد ہوں۔ جہاں جداگانہ انتخاب کے تحت ہندو اور مسلمان امیدوار اپنی اپنی قوم کے ووٹوں سے منتخب ہو کر اسمبلی میں آئیں۔ جہاں ایوان میں ہندوؤں کی مستقل۔ دائمی۔ ناقابل تبدیل اکثریت حکومت کی گدی پر متمکن ہو اور مقابل میں مسلمانوں کی مستقل۔ دائمی۔ ناقابل تبدیل اقلیت حزب مخالف کی صورت میں موجود ہو۔ وہاں "پارلیمنٹری ڈیماکریسی" کا نظام ایک دن نہیں چل سکتا۔ اور یہی پارلیمنٹری نظام تھا جس کے خلاف ہم اپنے غم و غصہ کا اظہار کر رہے تھے۔

کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے ۲۲۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو وردھا میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ آٹھ صوبوں کی کانگرسی وزارتیں فوراً استعفاء دے دیں۔ کانگرس کے احتجاج اور تہدید و تخویف بلکہ واضح لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ "بلیک میل" کے ترکش کا یہ سب سے بڑا تیر تھا جو گاندھی جی کے خیال میں ٹھیک نشانے پر بیٹھ سکتا تھا۔ چنانچہ جنگ سے متعلق مذکورہ بالا ریزولیوشن منظور کرانے کے بعد یوپی، سی پی۔ بہار۔ بمبئی۔ مدراس۔ اڑیسہ۔ آسام اور صوبہ سرحد کی وزارتوں نے استعفا دے دیا۔

یہ ایک دلچسپ سوال ہے کہ اگر اس وقت کانگرسی وزارتیں استعفانہ دیتیں اور بدستور آٹھ صوبوں میں حکومت کی گدیوں پر بیٹھ کر برطانیہ کو پریشان کرتیں تو کیا اس طرح ان کا اثر

زیادہ ہوتا؟

اس سوال کا جواب بعد میں واقعات نے خود بخود دے دیا۔ اور بہت سے کانگرسی لیڈروں نے محسوس کیا کہ وزارتیں چھوڑ کر انہوں نے سخت غلطی کی ہے۔ آٹھ صوبوں کی وزارتیں اپنے اندر بے اندازہ طاقت کا خزانہ رکھتی تھیں۔ اور جنگ کے زمانے میں یہ وزارتیں برطانوی حکومت کو خاصا پریشان بھی کر سکتی تھیں۔ فرض کیجئے کہ یوپی۔ سی پی۔ بہار۔ بمبئی۔ مدراس۔ اُڑیسہ۔ آسام اور صوبہ سرحد کے وزراء مجموعی طور پر جنگی سرگرمیوں میں برطانوی حکومت کی مزاحمت کرتے اور قدم قدم پر روڑے اٹکاتے تو وائسرائے کیا کرتا۔ زیادہ سے زیادہ یہی کرتا کہ ان آٹھ صوبوں کے وزراء کو برخاست کر دیتا۔ اس طرح کانگرس گویا ایک ہیرو بن کر میدان میں نکل آتی اور اس کی طاقت میں ہزار گنا اضافہ ہو جاتا۔ چھ صوبوں میں کانگرس کو اتنی بڑی اکثریت حاصل تھی کہ باقی تمام جماعتیں مل کر بھی اس کے مقابل میں وزارت بنانے کی استعداد نہ رکھتی تھیں۔ اس طرح ہندوستان میں ایک ڈیڈلاک پیدا ہوتا جو برطانوی حکومت کو دنیا بھر میں رسوا کرنے کے لئے کافی تھا۔

گاندھی جی کا اندازہ یہ تھا کہ کانگرس کے استعفے سے انگریز ڈر جائے گا۔ اور جو مطالبہ وہ گفت و شنید سے نہیں منوا سکے اسے وزارت سے استعفاء دے کر بہ جبرواکراہ منوالیا جائے گا۔ لیکن یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ چنانچہ ۱۹۴۲ء تک کانگرس نے دھونس اور دھمکی کے تمام حربے ایک ایک کر کے استعمال کر ڈالے جو سراسر بے کار ثابت ہوئے۔ بالآخر راج گوپال اچاری کی قسم کے دوراندیش مدبر اس کوشش میں مصروف ہو گئے کہ کانگرس کو کسی نہ کسی طرح دوبارہ وزارتوں کی گدی پر لا کر بٹھایا جائے۔ لیکن دریا کا پانی بہتا ہوا بہت آگے نکل گیا تھا۔ جسے واپس لانا محال تھا۔ اس دوران میں کانگرس کے حامیوں نے انگلستان کی رائے عامہ کو اپنے حسب منشاء ہموار کرنے میں کوئی کمی نہ ہونے دی۔ سیٹھ گھنشیام داس برلا اس وقت لندن میں موجود تھے جو وزیر ہند لارڈ زٹلینڈ سے برابر ملتے اور نرم اور گرم الفاظ میں گاندھی جی کی نیابت کرتے تھے ۱۔ کرشنا مینن کی انڈیا لیگ کے جلسے ہائیڈ پارک میں ہوتے تھے جہاں کانگرس کو ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت اور گاندھی جی کو ہندوستان کا نجات دہندہ تسلیم کروانے کے لئے مختلف مقرر اپنی اپنی خطابت کے جوہر دکھاتے تھے۔ انگلستان کے مسیحیوں کا ایک فرقہ کوئیکر ۲۔ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جنہیں بظاہر سیاست سے کوئی واسطہ نہیں

---

1. "Essayez;" Page273 2.Quaker

رکھنا چاہئے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان کوئیکروں کی تمام ہمدردیاں گاندھی اور کانگرس کے ساتھ تھیں۔ چنانچہ ان لوگوں نے کانگرس کی حمایت کرنے کے لئے لندن میں ایک الگ انجمن بھی قائم کر رکھی تھی [1]۔ مس اگاتھا ہیریسن اور مسٹر کارل ہیتھ اس انجمن کے بڑے سرگرم کارکن تھے۔ [2] انہوں نے برطانوی کابینہ کے وزراء پر زور ڈالنا شروع کیا کہ گاندھی سے فوراً سمجھوتہ کر لینا چاہئے۔ لیبر پارٹی کے ممبر بھی بارباز لارڈز ٹیٹینڈ سے کہتے تھے کہ ہندوستان کی مرکزی نمائندہ انجمن صرف انڈین نیشنل کانگرس ہے جس کی مرکزی نمائندہ شخصیت صرف گاندھی ہے۔ جب تک گاندھی کو راضی نہیں کیا جائے گا ہندوستان میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔

لارڈز ٹیٹینڈ نے انہی دنوں ایک خط میں وائسرائے کو لکھا تھا۔

"اب اس ملک کے دائیں بائیں دونوں طرف سے مجھ پر تیروں کی بارش شروع ہو گئی ہے۔ اگاتھا ہیریسن کو گاندھی کا ایک تار ملا ہے جو اس نے فوراً مجھ کو بھیج دیا ہے۔ گاندھی لکھتا ہے۔ کہ آپ کے اور اس کے درمیان جو اختلاف کی خلیج حائل ہے اس کا پاٹنا سخت مشکل ہے۔ کارل ہیتھ کا بھی ایک خط مجھ کو ملا ہے۔ وہ خط اور اپنے جواب کی نقل آپ کو بھیج رہا ہوں۔ جم سالسبری اور پیچ کروفٹ کے خطوط بھی موصول ہوئے ہیں۔ سنیل نے دو، ایک دن ہوئے۔ مجھ سے کہا تھا کہ وہ عنقریب دارالامراء میں یہ بحث اٹھائے گا کہ کانگرس کے ساتھ ہمارے مذاکرات کا کیا نتیجہ نکلا ہے [3]"۔

لارڈ ٹیٹینڈ نے کارل ہیتھ کو جو جواب دیا تھا وہ بھی ملاحظہ فرمایئے جس سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کارل ہیتھ نے اپنے مکتوب میں کیا کچھ لکھا ہو گا۔

"مائی ڈیئر مسٹر ہیتھ۔ مسٹر گاندھی اور وائسرائے کے باہمی مذاکرات جس طرح اچانک منقطع ہوئے ہیں اس نے مجھے بھی حیران و پریشان کر دیا ہے۔ آپ نے اپنے خط میں جو ابھی مجھے ملا ہے، لکھا ہے کہ آپ کو ان

---

1. Indian Conciliation Group

2. Miss Agatha Harrison, Mr. Carl Heath

3. "Essayez": Page 283

مذاکرات کے ٹوٹ جانے کی حقیقی وجہ معلوم نہیں۔ میرے خیال میں مسٹر گاندھی نے جو بیان بعد کو شائع کیا تھا اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ مسٹر گاندھی نے اس بیان میں کہا ہے کہ کانگرس کی پوزیشن یہ ہے کہ جب تک ہندوستان کے باشندوں کو کسی بیرونی طاقت کی دخل اندازی کے بغیر اپنی تقدیر کا فیصلہ کرنے کی آزادی نہیں ملتی وہ مطمئن نہیں ہو سکتے۔

ایک اور بیان میں مسٹر گاندھی نے یہ کہا ہے کہ ہندوستان اور انگلستان میں اس وقت تک کوئی باعزت اور پُرامن سمجھوتہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ انگلستان صحیح پالیسی اختیار نہیں کرتا اور بنیادی اختلاف کو رفع نہیں کرتا۔ بنیادی اختلاف سے مراد یہ ہے کہ انگلستان کو ہندوستان کا یہ مطالبہ فوراً منظور کرنا چاہئے کہ ہندوستان کو اپنا آئین اور مرتبہ وضع کرنے کا کلی اختیار حاصل ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ کانگرس کے لیڈروں نے ہماری مشکلات کو سمجھنے کی ذرہ بھر کوشش نہیں کی کہ ہمارے لئے یہ پوزیشن قبول کرنا ممکن نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اصل مطالبے سے ایک انچ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا روا ہو گا کہ انہیں مصالحت اور مفاہمت کی کوئی خواہش نہیں۔

میں نے پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے واضح کر دیا تھا کہ ہم اپنے آپ کو ہندوستان کے آئندہ آئین کی تشکیل و تعمیر سے بری الذمہ قرار نہیں دے سکتے۔ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ مسلمانوں کے جذبات خاصے مشتعل ہو چکے ہیں۔ اور اگر ہم اس حالت میں کانگرس کا مطالبہ مان لیں تو ہندوستان میں خانہ جنگی کی آگ بھڑک اُٹھے گی۔ جس کے بجھانے کے لئے ہمیں لا محالہ آگے بڑھنا پڑے گا۔ مسٹر گاندھی کو یہ تمام باتیں اچھی طرح معلوم ہیں۔ مجھے حیرت اس بات سے ہے کہ جب وہ کانگرس کے ابتدائی مطالبے میں کوئی ترمیم و تخفیف کرنے کو آمادہ نہیں تو پھر انہیں وائسرائے سے جا کر ملنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

ہم جن مشکلات میں اس وقت گھرے ہوئے ہیں، میں ان میں سے نکلنے کا راستہ تلاش کر رہا ہوں۔ لیکن صاف بات یہ ہے کہ اگر کانگرس

نے اپنے اصلی مطالبے سے انحراف نہ کیا تو کسی باعزت سمجھوتے کا امکان نہیں۔ مسٹر گاندھی کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ برطانیہ عظمیٰ اور ہندوستان میں آبرومندانہ مفاہمت کے خواہاں ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کیا ہم ایسی مفاہمت کے خواہاں نہیں؟"

چند روز کے بعد لارڈ زٹلینڈ نے ایک اور خط میں وائسرائے کو لکھا۔

"آپ کا ۶۔ فروری ۱۹۴۰ء کا خط ۲۲۔ کو یہاں پہنچا۔ اور ۱۳۔ کا لکھا ہوا خط اس سے ایک روز بعد ملا۔ ان خطوں کے ساتھ ان تمام گفتگوؤں کی تفصیل بھی موصول ہوئی جو آپ نے سکندر، فضل الحق، جناح اور گاندھی کے ساتھ کیں۔ یقین کیجئے میں نے ان مذاکرات کی تفصیل کا بڑے شوق سے مطالعہ کیا۔ یہ عجیب و غریب مرقع ہے جس میں باہمی اغراض، مفاد، اندیشے، آرزوئیں، امنگیں شدّت سے آپس میں دست و گریباں ہیں۔ اور جس چیز نے ان کو چاقو کی دھار کی طرح تیز کیا ہے وہ ذاتی دشمنی۔ حسد اور خوف ہے۔ میں حیران ہوں کہ اس دہکتی ہوئی بھٹی میں سے ہم کیونکر کوئی ایسی پائدار چیز نکال سکیں گے جسے کسی سیاسی عمارت کا سنگ بنیاد بنایا جاسکے گا۔ اور عمارت بھی ایسی وسیع و عریض جس کے اندر برعظیم ہند کے تمام نمائندے سما سکیں؟"

یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ اس وقت انگلستان میں مسلم لیگ کے پراپیگنڈے کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ پٹنہ کے اجلاس میں آل انڈیا مسلم لیگ نے ایک فارن سب کمیٹی قائم کی تھی جس کے کنوینر سر عبداللہ ہارون تھے۔ لیکن اس سب کمیٹی کا وجود صرف کاغذی بن کر رہ گیا تھا۔ عملاً کوئی کام نہ ہو سکا۔ اس کوتاہی کی متعدد وجوہ تھیں۔ اوّل سرمائے کی کمی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ مسلم لیگ کی نہضتِ ثانیہ کو ہنوز صرف دو سال گذرے تھے۔ اس قلیل عرصے میں ہم ابھی تک ہندوستان میں اپنا پروپیگنڈا مکمل نہیں کر سکے تھے۔ انگلستان اور دوسرے ممالک میں جا کر کام کرنا تو بالکل خارج از بحث تھا۔ ایک اور مشکل یہ تھی کہ انگلستان میں بیٹھ کر تحریر و تقریر سے منظم پروپیگنڈا کرنے والا کوئی تجربہ کار اور موزوں آدمی ہمارے پاس نہیں تھا۔ دوسروں کو ایثار اور قربانی کا سبق وہی شخص دے سکتا ہے جو خود ان صفات کا پیکر ہو۔ مسلم لیگ کی تہی دستی کا یہ عالم تھا کہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ پنجاب میں ایک شخص بھی اپنا وقت لیگ کی خدمت کے لئے وقف کرنے کو تیار نہیں تھا۔ روزگار کے دھندوں اور معاش کی مجبوریوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو

پریشان کر رکھا تھا۔ متمول اور خوش حال گھرانوں کو قومی کام سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان حالات میں کون شخص انگلستان جا کر محض لیگ کے پراپیگنڈے کی خاطر اپنی زندگی برباد کرنے کو آمادہ ہو سکتا تھا۔

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ نے ہر صوبائی اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کو ہدایت کی تھی کہ جب کانگرسی حکومت جنگ کے بارے میں اپنا ریزولیوشن پیش کرے تو مسلم لیگ پارٹی کی طرف سے ایک ترمیم پیش کر دی جائے۔ اس ضمن میں پنجاب کی حالت ایک لحاظ سے بڑی دلچسپ تھی۔ یہاں یونینسٹ پارٹی کی حکومت تھی۔ اسمبلی میں کوئی مسلم لیگ پارٹی نہیں تھی۔ اور صوبے میں لیگ کی کوئی پراونشل شاخ بھی موجود نہیں تھی۔ ضابطے کی کارروائی پر عمل کرتے ہوئے، آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی دفتر نے اسی قسم کی ایک ہدایت ملک برکت علی کو بھی بھیج دی جو پنجاب اسمبلی میں تنہا مسلم لیگی ممبر تھے، کہ جب اسمبلی میں جنگ کا ریزولیوشن پیش ہو تو مسلم لیگ کی طرف سے یہ ترمیم پیش کر دی جائے۔ سر سکندر حیات خاں، آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے ممبر ضرور تھے۔ لیکن جس حکومت کے وہ سربراہ تھے اس کا مسلم لیگ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ چنانچہ ملک برکت علی نے حالات کی مزید وضاحت طلب کرنے کے لئے ۲۶۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو ذیل کا خط مسٹر جناح کی خدمت میں ارسال کیا[1]:

”ڈیئر مسٹر جناح! آپ نے کانگرسی صوبوں کی اسمبلیوں کی مسلم لیگ پارٹیوں کو جو ہدایات بھیجی ہیں، میں نے پڑھی ہیں کہ جب ان اسمبلیوں میں کانگرسی وزارتیں جنگ کے بارے میں اپنی قرار داد پیش کریں تو مسلم لیگ پارٹیوں کو کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے۔ آپ نے لیگ پارٹیوں کو ہدایت کی ہے کہ کانگرس کی مجوزہ قرار داد کے جواب میں ایک ترمیم پیش کی جائے جس میں یہ الفاظ بھی درج ہوں کہ ”موجودہ دستور کے تحت جس قسم کا پارلیمنٹری جمہوری نظام رائج ہے وہ ناکام ثابت ہوا ہے۔ اور یہ نظام لوگوں کے حالات اور مزاج کے مطابق نہیں“۔ اس مجوزہ ترمیم میں یہ بھی درج ہے کہ ”برطانوی حکومت کو چاہئے کہ اس ضمن میں اصولاً یا کسی اور طریقے سے آل انڈیا مسلم

---

۱۔ انگریزی کا اصل خط کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ درج کیا گیا ہے۔

لیگ کی منظوری اور رضامندی کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھائے۔ کیونکہ تنہا آل انڈیا مسلم لیگ مسلمانان ہند کی نمائندگی اور ترجمانی کا حق رکھتی ہے"۔

گذارش یہ ہے کہ حکومت پنجاب نے بھی ایک قرار داد کا نوٹس دیا ہے جو آئندہ ہفتے اسمبلی میں پیش کی جائے گی۔ اس قرار داد کا متن حسب ذیل ہے۔

"یہ اسمبلی حکومت پنجاب کی اس پالیسی کی تائید کرتی ہے جو اس نے موجودہ بین الاقوامی بحران کے بارے میں اختیار کی ہے۔ اور جس میں نازی اور فاشی ممالک کی جارحانہ کارروائیوں کی مذمت کرتے ہوئے اس جارحیت کا مقابلہ کرنے کے عزم کا اظہار کیا گیا ہے، اور یہ بھی اعلان کیا گیا ہے کہ پنجاب اور ہندوستان کی عزت اور سلامتی کو محفوظ کرنے کے لئے اس صوبے کے تمام ذرائع استعمال کئے جائیں گے۔

یہ اسمبلی اس امر کا بھی اظہار کرنا چاہتی ہے کہ یہ بات فوراً واضح کر دینا چاہئے کہ جنگ ختم ہونے کے بعد ہندوستان کے آئین پر اس نقطہ نگاہ سے از سر نو غور کیا جائے گا کہ فوراً درجہ مستعمرات (ڈومینئین سٹیٹس) عطا کیا جائے۔ جس میں اقلیتوں اور دوسرے طبقوں کے حقوق کی شافی طریقے سے حفاظت کی گئی ہو۔ اور یہ کام جملہ فریقوں کے باہمی مشورے اور اتفاق رائے سے انجام پائے گا"۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا ہو گا کہ اس ریزولیوشن کی ابتداء ہی اس بات سے ہوتی ہے کہ حکومت پنجاب نے موجودہ بین الاقوامی بحران کے بارے میں جو پالیسی اختیار کی ہے اس کی تائید کی جائے۔ یہ بھی آپ نے ملاحظہ فرمایا ہو گا کہ اس ریزولیوشن میں حکومت سے ہندوستان کے آئین پر از سر نو غور کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے تاکہ فوراً درجہ مستعمرات حاصل کیا جا سکے جس میں اقلیتوں اور دوسرے طبقوں کے حقوق کی شافی طریقے سے

حفاظت کی گئی ہو۔ اور یہ کام جملہ فریقوں کے باہمی مشورے اور اتفاق رائے سے انجام پائے گا۔

میرے خیال کے مطابق یہ مطالبہ کرنا کہ درجۂ مستعمرات عطا کیا جائے گویا عملاً اس بات کا ثبوت ہو گا کہ برطانوی حکومت نے ہندوستان کے آئندہ آئین کے بارے میں اصولاً کوئی اقدام کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے مسلم لیگ نے کانگرسی صوبوں کی مسلم لیگ پارٹیوں کو جو ہدایات بھیجی ہیں ان میں واضح الفاظ میں یہ درج ہے کہ برطانوی حکومت کو چاہئے کہ اس ضمن میں اصولاً یا کسی اور طریقے سے کوئی اقدام نہ کرے۔ لہٰذا میں ذیل کے نکات کے بارے میں آپ کی ہدایات کا منتظر ہوں:

۱۔ کیا میں اس بات پر اعتراض کروں یا نہ کروں کہ حکومت پنجاب نے اپنے ریزولیوشن میں درجۂ مستعمرات کا مطالبہ کر کے برطانوی حکومت کو کسی قسم کے اقدام پر آمادہ کرنے کی کوشش کی ہے؟

۲۔ کیا میں اس ریزولیوشن کے پہلے حصے کی حمایت کروں یا نہ کروں جس میں حکومت پنجاب کی اس پالیسی کی تائید کی گئی ہے جو اس نے جنگ میں تعاون کرنے کے بارے میں اختیار کر رکھی ہے؟ بظاہر اس تائید کا مطلب یہ ہے کہ پنجاب کے وزیر اعظم کے اس بیان کی تائید کی جائے جو انہوں نے ۲۵۔ اگست کو دیا تھا۔ اور اس سے قبل کے ان بیانوں کی بھی تائید کی جائے جس کی وجہ سے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے جلسے میں انہیں فہمائش کی گئی تھی۔

۳۔ کیا میں اس ریزولیوشن کے اس حصے کی تائید کروں یا نہ کروں جس میں جملہ فریقوں کے باہمی مشورے اور اتفاق رائے کا تو ذکر ہے۔ لیکن ان انجمنوں اور جماعتوں کا ذکر نہیں جو ان متعلقہ فریقوں کی نمائندگی کرتی ہیں؟ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے

کہ جہاں تک مسلمانان ہند سے مشورہ کرنے کا تعلق ہے کیا میں اس بات پر اصرار کروں یا نہ کروں کہ صرف آل انڈیا مسلم لیگ ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے ؟

اگر آپ واپسی ڈاک سے جواب عنائت فرمائیں تو ممنون ہوں گا۔ اور اگر یہ خیال ہے کہ واپسی ڈاک سے جواب بھیجنا تاخیر کا موجب ہو گا تو از راہ کرم فوراً بذریعہ تار جواب عطا فرمایئے۔ فی الحال اس ریزولیوشن کے پیش ہونے کی کوئی قطعی تاریخ مقرر نہیں ہوئی۔ گمان غالب یہ ہے کہ اگلے ہفتے پیش ہو گا۔ اگر مسلم لیگ پارٹی کی طرف سے کوئی ترمیم پیش کی جائے تو وہ ترمیم اصل ریزولیوشن پر بحث شروع ہونے سے دو روز قبل پیش ہونی چاہئے۔ آپ کو اخباروں سے معلوم ہو جائے گا کہ ان قرار دادوں کی بحث کے لئے کون سی تاریخ مقرر ہوئی ہے۔ اس کی روشنی میں آپ چاہیں تو جواب بذریعہ ڈاک بھیج دیں اور چاہیں تو تار سے ارسال فرمائیں۔

زیادہ نیاز۔

آپ کا مخلص

(دستخط) ملک برکت علی

مسٹر جناح نے ملک صاحب کے اس خط کا جواب تو ضرور دیا ہو گا۔ لیکن جیسے میں اس کتاب کے مقدمہ میں عرض کر چکا ہوں، بدقسمتی یہ ہوئی کہ ملک صاحب کے انتقال کے بعد مسٹر جناح کے تمام مکاتیب کسی پر اسرار طریقے سے ملک صاحب کے مکان سے چوری ہو گئے۔ اس لئے کچھ معلوم نہیں کہ مسٹر جناح نے جواب میں کیا لکھا ہو گا۔ تاہم ۳۔ نومبر ۱۹۳۹ء کو سردار بہادر گوربچن سنگھ نے پنجاب اسمبلی کے اجلاس میں باقاعدہ حکومت کی طرف سے ایک ریزولیوشن پیش کیا۔ جواب میں کانگرس پارٹی کی طرف سے ڈاکٹر گوپی چند بھارگو اور مسلم لیگ کی طرف سے ملک برکت علی نے ترمیمیں پیش کیں۔ ملک صاحب نے فرمایا کہ مسلم لیگ کا مطمع نظر آزادئ کامل ہے۔ لہٰذا ہم ڈومینئین سٹیٹس کے مطالبے کی حمایت نہیں کر سکتے۔ ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا کہ آزادی کے حصول سے پہلے اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کا مسئلہ تسلی بخش طریقے سے طے ہو جانا چاہئے۔ اور اس ضمن میں صرف آل انڈیا مسلم لیگ کو یہ حق حاصل ہے کہ ہندوستان کے

مسلمانوں کی نمائندگی کرے۔

جب ایوان میں تقسیم آراء کا وقت آیا تو کانگرس کے ۳۹ ووٹوں کے مقابلے میں ۱۰۴ ووٹوں کی اکثریت سے حکومت کی قرار داد منظور ہو گئی۔ اور کانگرس کی ترمیم ناکام رہی۔ ملک صاحب کی ترمیم کی تائید میں سوائے ملک صاحب کے اور کسی نے ہاتھ کھڑا نہ کیا۔

# جناح اور وائسرائے کی خط و کتابت

گذشتہ تین ابواب میں عالم گیر جنگ کے بارے میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے حکومت، کانگرس اور مسلم لیگ کا طرز عمل واضح ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔ اور تینوں میں سے ہر جماعت نے جو پالیسی اختیار کی تھی اس کا کوئی پہلو ڈھکا چھپا نہیں رہا۔ یہ جنگ ۱۹۴۵ء تک جاری رہی۔ اور اس دوران میں قسم قسم کے اتار چڑھاؤ اور نشیب و فراز پیش آئے۔ جن پر بتدریج آئندہ صفحات میں بحث ہوتی رہے گی۔ تاہم اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ جنگ شروع ہوتے ہی جب وائسرائے نے مختلف سیاسی لیڈروں سے ملاقاتوں کا آغاز کیا تھا تو ساتھ ہی ان لیڈروں سے باقاعدہ خط و کتابت کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ یہ بالمشافہ ملاقاتیں اور خط و کتابت دراصل ایک ہی تصویر کے دو پہلو تھے۔ جو باتیں ملاقاتوں میں ہوتی تھیں انہی کو ضبط تحریر میں لا کر خطوں کی صورت میں محفوظ کر دیا جاتا تھا، تاکہ آئندہ سیاسیات کے طالب علم کو واقعات و حالات کے سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔

مسٹر جناح اور وائسرائے کی اس باہمی مراسلت کا آغاز پہلے مرحلے پر ۵۔ نومبر ۱۹۳۹ء کو ہوا تھا جو ۲۶۔ ستمبر ۱۹۴۰ء تک جاری رہا۔ چونکہ زیر بحث موضوع ایک ہی تھا۔ اس دلئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ خط و کتابت کا وہ حصہ یہاں درج کیا جائے جو ۱۷۔ جون ۱۹۴۰ء تک قائم رہا۔ ۱۷۔ جون ۱۹۴۰ء کی تاریخ کی تخصیص میں نے اس لئے کی ہے کہ اس کے بعد خط و کتابت نے مختلف رنگ اختیار کر لیا تھا۔ جس کا تعلق ۱۹۳۹ء کے واقعات سے کم اور ۱۹۴۰ء سے زیادہ ہے۔ ۲۴۔ مارچ ۱۹۴۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ نے قرار داد پاکستان منظور کی تھی، جس کے بعد وائسرائے اور مسٹر جناح کی باہمی مراسلت کا موضوع بدل گیا تھا۔ لہٰذا خط و کتابت کے اس جزو کو میں اپنی اگلی کتاب میں، جو ہماری قومی جدوجہد کے ۱۹۴۰ء کے واقعات و کوائف پر مشتمل ہو گی، شامل کروں گا۔

جناح

نئی دہلی

۵ ۔ نومبر ۱۹۳۹ء۔

ڈیئر لارڈ لنلتھگو! میں ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے ۴ ۔ نومبر کو ملاقات کا موقع عطا کیا۔ آپ نے ۲۸ - اکتوبر کو اپنے خط میں لکھا تھا کہ اگر آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کی ۲۲۔ اکتوبر کی قرار داد کے بعض پہلوؤں کی مزید وضاحت کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو آپ بخوشی مجھے ملاقات کا وقت دیں گے۔

۴ ۔ نومبر کو اس موضوع پر آپ سے میری مفصل بحث ہو چکی ہے۔ آپ کے حسب خواہش ذیل کے نکات آپ کے ملاحظے کے لئے ارسال کر رہا ہوں۔ امید ہے آپ جلد جواب عطا فرمائیں گے۔

۱۔ جونہی یہ جنگ ختم ہوئی یا جس وقت حالات و واقعات نے اجازت دی گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء سے قطع نظر کر کے ہندوستان کے آئندہ کانسٹی ٹیوشن کے پورے مسئلے پر از سر نو غور کیا جائے گا۔

۲۔ ہندوستان کی دو بڑی قوموں یعنی مسلمانوں اور ہندوؤں کی منظوری اور رضامندی کے بغیر ملک معظم کی حکومت یا پارلیمینٹ کسی نوع کا اعلان کرنے یا کسی قسم کا آئین وضع کرنے کی ہرگز مجاز نہیں ہوگی۔

۳۔ ملک معظم کی حکومت کو چاہئے کہ اعراب فلسطین کے تمام جائز قومی مطالبات تسلیم کرنے کی کوشش کرے۔

۴۔ ہندوستانی سپاہیوں کو کسی مسلمان ملک کے خلاف استعمال نہیں کیا جائے گا۔ میں نے ملاقات کے وقت ان جملہ نکات کی تائید میں تفصیلی دلائل آپ کی خدمت میں پیش کر دیئے تھے۔ اس کے علاوہ آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کی ۱۸۔ ستمبر اور ۲۲۔ اکتوبر کی قرار دادوں کی نقول بھی آپ کے ملاحظہ کے لئے بھیجی جا چکی ہیں۔

مجلس عاملہ کے ۱۸ ستمبر کے اعلان میں ایک اور مسئلے کا بھی ذکر کیا گیا تھا یعنی کانگرسی صوبوں میں مسلمانوں سے انصاف کیا جانا چاہئے۔ کیونکہ کیفیت یہ ہے کہ ان صوبوں میں تو مسلمانوں کے ابتدائی حقوق تک کو بے رحمی سے کچلا جا رہا ہے۔ لیکن کانگرس نے چونکہ وزارتوں سے استعفاء دے دیا ہے۔ اس لئے میں سردست اس موضوع پر کچھ کہنا نہیں

چاہتا۔
گذارش یہ ہے کہ میں کل صبح بمبئی جارہا ہوں۔

آپ کا مخلص
ایم۔ اے جناح

وائسرائے
نئی دہلی ۷ نومبر ۱۹۳۹ء

ڈیئر مسٹر جناح! آپ کے ۵ نومبر کے خط کا بہت بہت شکریہ۔ جن نکات کا ذکر آپ نے کیا ہے، میں ان کی اہمیت کو بخوبی محسوس کرتا ہوں۔ جتنی جلدی ممکن ہو سکا آپ کو جواب بھیجنے کی کوشش کروں گا۔

آپ کا مخلص
لنلتھگو

جناح
بمبئی۔ ۱۸ نومبر ۱۹۳۹ء

ڈیئر لارڈ لنلتھگو ۔ آپ کے ۷ نومبر کے خط کا شکریہ۔ جس دن سے آپ کا خط موصول ہوا ہے۔ چاروں طرف سے یہ تقاضا ہو رہا ہے کہ ہم نے آپس میں کیا معاملہ طے کیا ہے۔ اگر آپ کو چنداں اعتراض نہ ہو تو میں اپنا ۵ نومبر کا خط اور آپ کا جواب اخباروں کو بغرض اشاعت بھیج دوں۔

آپ کا مخلص
ایم۔ اے جناح

وائسرائے
کیمپ وائسرے ۲۷-۲۶ نومبر ۱۹۳۹ء

ڈیئر مسٹر جناح آپ کے ۱۸ نومبر کے خط کا شکریہ۔ مجھے آپ کی اس خواہش کا بخوبی احساس ہے کہ آپ اپنا ۵ نومبر کا خط اور میرا جواب شائع کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اگر آپ اور دس دن ٹھہر جائیں تو مجھے خوشی ہو گی۔ وجہ یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے خط کی اشاعت اور میرے جواب میں (جس کی ترتیب و تدوین میں اس لئے کچھ وقت لگے گا کہ مجھے ملک معظم کی حکومت سے مشورہ کرنا ہے) کم سے کم وقفہ ہونا چاہئے۔ تاہم اگر آپ کے خیال میں اس کی بلا توقف اشاعت ضروری ہے تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ بہر حال، میری درخواست یہ ہے کہ ازراہ کرم مجھے پہلے سے اطلاع کر دیجئے گا کہ کس تاریخ کو آپ یہ خط شائع کر رہے ہیں۔

آپ کا مخلص

لنلتھگو

## جناح

تار

بمبئی۔ ۲۹ نومبر ۱۹۳۹ء

امید ہے میرا ۱۸ کا خط آپ کو مل گیا ہو گا۔ آپ کے فوری جواب کا منتظر ہوں۔

جناح

## وائسرائے

تار

۲۹ نومبر ۱۹۳۹ء

آپ کے آج کے تار کا بہت شکریہ۔ مجھے امید ہے میرا خط جو ۲۷ نومبر کو بہاولپور سے پوسٹ کیا گیا تھا۔ اب تک آپ کو مل گیا ہو گا!

لنلتھگو

## کیمپ وائسرائے۔ کلکتہ۔

۲۳ دسمبر ۱۹۳۹ء

ڈیئر مسٹر جناح۔ اب میں اس قابل ہوں کہ آپ کے ۵ نومبر کے اس خط کا جواب

دے سکوں جس میں آپ نے بعض غور طلب امور میرے سامنے پیش کئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس بات کا احساس ہو گا کہ جن امور کا ذکر آپ نے اپنے خط میں کیا ہے، ان میں سے چند ایک ایسے ہیں جن پر اگر تمام متعلقہ پہلوؤں سے بحث کی جائے تو بعض ایسے تنقیح طلب امور سامنے آئیں گے جن کا اثر ہندوستان کی دوسری قوموں پر پڑنا لازمی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو خطوط ہم اس وقت ایک دوسرے کو لکھ رہے ہیں، ان میں ایسے تنقیح طلب امور کے بارے میں کسی قسم کا اعلان یا اظہار خیال کرنا مناسب نہیں۔ تاہم مجھے امید ہے کہ میرا جواب ہر چند کہ اس کا دائرہ ان پابندیوں نے محدود کر رکھا ہے۔ کسی حد تک آپ کی مشکلات رفع کرنے میں معاون ہو گا۔

۲۔ آپ کے پہلے سوال کے جواب میں میری گذارش یہ ہے کہ میں نے ۱۸ اکتوبر کو ملک معظم کی حکومت کی منظوری سے جو اعلان کیا تھا، اس کے مطابق (بوقتِ ضرورت) گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے کسی حصے پر یا اس پالیسی اور خاکے پر جو اس ایکٹ کی بنیاد ہے، غور کیا جا سکے گا۔

۳۔ آپ نے جو دوسرا نکتہ پیش کیا ہے اس کے بارے میں میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ملک معظم کی حکومت کو اس کا پورا احساس ہے کہ ہندوستان میں کسی آئین اور دستور کے استحکام کے لئے مسلمانوں کو مطمئن کرنا ضروری ہے۔ آپ کو اس سلسلہ میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ کی قوم کو ہندوستان میں جو اہمیت حاصل ہے، اس کا خیال رکھا جائے گا۔

۴۔ فلسطین کے متعلق پالیسی وضع کرتے وقت ملک معظم کی حکومت نے عربوں کے تمام جائز مطالبات کو تسلیم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور ملک معظم کی حکومت کو اس معاملہ کی اہمیت کا بخوبی احساس رہے گا۔

۵۔ آخر میں آپ نے مجھ سے یہ کہا ہے کہ میں آپ کو اس بات کا یقین دلاؤں کہ ہندوستانی سپاہیوں کو کسی مسلمان کے خلاف استعمال نہیں کیا جائے گا۔ خوش قسمتی سے ملک معظم کی حکومت اس وقت کسی مسلمان ملک کے خلاف برسرپیکار نہیں۔ لہٰذا یہ سوال پیدا نہیں ہوتا۔ تاہم آپ محسوس کریں گے کہ ان وسیع حدود کے اندر، جن کا اظہار آپ نے اپنے خط میں کیا ہے۔ اس قسم کا یقین دلانا ممکن نہیں۔ کیونکہ ہندوستان کو بہر حال یہ حق حاصل ہے کہ اپنی حفاظت کے لئے اپنی فوج استعمال کر سکے۔ نہیں معلوم آئندہ مستقبل میں کیا واقعات رونما ہوں گے۔ لہٰذا اس وقت ایسا جواب دینا جس سے ہندوستان کے اس حق کو

مشروط اور محدود کر دیا جائے سر دست ممکن نہیں۔ بہر حال جیسا کہ آپ کو معلوم ہے حکومت ہند کی درخواست پر ملک معظم کی حکومت نے اس ضمن میں ہر احتیاط اختیار کی ہے کہ مسلمانان ہند کے جذبات و احساسات کا احترام کیا جائے۔

آپ کا مخلص
لنلتھگو

جناح
۱۰ اورنگ زیب روڈ۔ نئی دہلی
۶ فروری ۱۹۴۰ء

ڈیئر لارڈ لنلتھگو ۔ میں اس عریضے کے ہمراہ ورکنگ کمیٹی کی اس قرارداد کی ایک نقل آپ کے ملاحظے کے لئے بھیج رہا ہوں جو کمیٹی نے ۳ فروری ۱۹۴۰ء کو اس خط و کتابت کے متعلق منظور کی ہے جو آپ کے اور میرے درمیان ہوتی رہی ہے۔

آپ کا مخلص
ایم۔ اے جناح

## قرارداد

آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے اس خط و کتابت پر غور کیا ہے جو مسٹر جناح بصدر آل انڈیا مسلم لیگ اور ہز ایکسی لنسی وائسرائے کے درمیان ہوتی رہی ہے۔ اور جس کا اختتام وائسرائے کے ۲۳۔ دسمبر ۱۹۳۹ء کے خط پر ہوا ہے۔ ورکنگ کمیٹی کی رائے میں وائسرائے کا جواب اطمینان بخش نہیں کیونکہ بعض اہم مسائل ایسے ہیں جن کی مزید وضاحت اور تشریح درکار ہے۔ لہٰذا یہ کمیٹی صدر کو اس بات کا اختیار دیتی ہے کہ وہ ورکنگ کمیٹی کے خیالات کو وائسرائے کے سامنے پیش کر کے یہ درخواست کریں کہ ہز ایکسی لنسی کو چاہئے کہ ورکنگ کمیٹی کی ان قراردادوں پر غور کر کے جو ۱۸۔ ستمبر اور ۲۲۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو منظور کی گئی تھیں۔ امور متعلقہ کے بارے میں یقین دلائیں تاکہ اس طرح مسلمانان ہند کے دلوں سے جملہ شکوک و شبہات اور اندیشے رفع کئے جا سکیں۔

---

جناح

نئی دہلی۔ ۲۳۔ فروری ۱۹۴۰ء

ڈیئر لارڈ لنلتھگو۔ آپ کے اور میرے درمیان جو خط و کتابت ہوتی رہی ہے اور جس کا آخری مکتوب آپ نے مجھے ۲۳۔ دسمبر ۱۹۳۹ء کو لکھا تھا۔ میں نے اسے ۳۔ فروری ۱۹۴۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے سامنے رکھ دیا تھا۔

جیسا کہ آپ نے ٦۔ فروری کو بوقت ملاقات مجھ سے کہا تھا۔ میں اس ضمن میں ورکنگ کمیٹی کے خیالات آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

آپ نے پہلے نکتے کی جو وضاحت فرمائی ہے۔ ورکنگ کمیٹی اسے بہ نظر پسندیدگی دیکھتی ہے۔ اور اس بات پر بھی اطمینان کا اظہار کرتی ہے کہ آپ نے ملک معظم کی حکومت کی منظوری سے ۱۸۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو جو اعلان کیا تھا اس میں یہ چیز شامل ہے کہ ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے کسی حصے پر یا اس پالیسی اور خاکے پر جس کے مطابق یہ ایکٹ وضع کیا گیا تھا نظر ثانی کی جا سکے گی۔

جہاں تک دوسرے نکتے کا تعلق ہے ورکنگ کمیٹی آپ کی وضاحت سے مطمئن نہیں۔ ورکنگ کمیٹی نے یہ درخواست کی تھی کہ اس امر کا حتمی یقین دلایا جائے کہ مسلمانان ہند کی منظوری اور رضامندی کے بغیر، اصولاً یا کسی اور طریقے سے اس قسم کا کوئی اعلان نہیں کیا جائے گا۔ نہ ملک معظم کی حکومت کوئی آئین ہندوستان پر مسلط کرے گی نہ پارلیمینٹ ہی کوئی آئین وضع کرے گی۔ یہ صحیح ہے کہ آپ نے ذیل کے الفاظ میں اس نوع کا یقین دلانے کی کوشش ضرور کی ہے کہ:

"ملک معظم کی حکومت کو اس کا پورا احساس ہے کہ ہندوستان میں کسی آئین اور دستور کے استحکام کے لئے مسلمانوں کو مطمئن کرنا ضروری ہے۔ آپ کو اس سلسلہ میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ کی قوم کو جو اہمیت حاصل ہے۔ اس کا خیال رکھا جائے گا"۔

تاہم مجھے افسوس کے ساتھ یہ کہنا ہے کہ آپ کے ان الفاظ سے مسلم لیگ کا مطالبہ پورا نہیں ہوتا کیونکہ ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں کا مسئلہ بدستور صلاح مشورے کا محتاج رہے گا۔ اور اس کا آخری حل بھی برطانیہ عظمیٰ کے ہاتھ میں ہو گا کہ وہ جس طرح چاہے اس کا تصفیہ کرے افسوس ہے کہ ہم اس پوزیشن کو قبول نہیں کر سکتے۔

جہاں تک فلسطین کا تعلق ہے آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ ملک معظم کی حکومت سے

پرزور درخواست کرتی ہے کہ اس قضیے کو اس طرح حل کیا جائے جس سے عرب مطمئن ہو جائیں۔ مجلس عاملہ کو آپ کے ان الفاظ سے خوشی ہوئی ہے کہ ملک معظم کی حکومت نے عربوں کے تمام جائز مطالبات کو تسلیم کرنے کی پوری کوشش کی ہے اور آئندہ بھی یہ کوشش جاری رکھی جائے گی۔ دنیائے اسلام کی آنکھیں فلسطین کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ لہٰذا اس قضیے کا فوری حل تلاش کرنا بے حد ضروری ہے۔

رہا یہ سوال کہ ہندوستانی سپاہیوں کو کسی اسلامی ملک کے خلاف استعمال نہیں کیا جائے گا۔ مجلس عاملہ کا خیال ہے کہ آپ کو اس ضمن میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ جب ہم نے آپ سے اس بات کا حتمی وعدہ طلب کیا تھا کہ ہندوستانی سپاہیوں کو ہندوستان سے باہر کسی اسلامی ملک کے خلاف استعمال نہیں کیا جائے گا۔ تو ہمارا مقصد اس سے یہ نہیں تھا کہ کل کو اگر ہندوستان پر کسی بیرونی غنیم نے حملہ کیا تو ہندوستان کی حفاظت کے لئے ہندوستانی سپاہیوں کو استعمال نہیں کیا جائے گا۔ بہرکیف ہم آپ کے شکر گذار ہیں کہ آپ نے ہمیں یہ اطلاع دی ہے کہ حکومت ہند کی تحریک پر ملک معظم کی حکومت نے اس سلسلہ میں مسلمانان ہند کے جذبات کا احترام کرنے کی ہر ممکن احتیاط کی ہے۔ لیکن ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اس مسئلے کی مزید وضاحت کی جانی چاہیے۔

مسلم لیگ سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ مسلمانان ہند کی طرف سے اس امر کا یقین دلائے کہ مسلمان موجودہ جنگ میں برطانیہ کی پوری مدد کریں گے۔ مجلس عاملہ کی رائے اس مطالبے کے جواب میں یہ ہے کہ پہلے مسلمانان ہند کو اطمینان دلایا جانا ضروری ہے کہ ان کا مستقبل محفوظ ہے اور وہ محض ہوا میں معلق نہیں۔ بنابریں ہم یہ مطالبہ کرنے میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہیں کہ اس قسم کا پختہ یقین دلایا جائے کہ ہماری منظوری اور رضامندی کے بغیر آئندہ ہندوستان کے آئین یا کسی عبوری انتظام کے بارے میں کسی فریق کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کیا جائے گا۔ اگر ملک معظم کی حکومت مسلمانان ہند کی "لیڈرشپ" کو ایک ذمہ دار فریق سمجھنے پر آمادہ ہے تو حکومت کا فرض ہے کہ اس "لیڈرشپ" پر اعتماد کرے۔ بالخصوص ایسے مسئلے میں جس کا تعلق مسلمانوں کے مستقبل کا تعین کرنے سے ہے۔

ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ آپ بلاوجہ دوسرے فرقوں کے متعلق اس قدر ذکی الحس ہیں۔ ہماری یہ ہرگز خواہش نہیں کہ کسی فرقے کے ساتھ ناانصافی یا زیادتی کی جائے۔ ہم نے جو غور طلب نکات اٹھائے ہیں ان کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں اندیشہ ہے کہ کہیں ہندوستان کی دوسری طاقتور جماعتوں سے مرعوب ہو کر حکومت کوئی ایسا قدم اٹھانے یا ہندوستان کے آئندہ دستور کے بارے میں کوئی ایسی مفاہمت کرنے پر تیار نہ ہو جائے جس سے مسلمانوں کے مفاد کو نہ صرف سخت نقصان

پہنچے بلکہ انہیں ملیامیٹ کرنے کا احتمال ہو۔

مسئلہ فلسطین کے بارے میں اور ہندوستانی سپاہیوں کے متعلق مسلمانوں کے جن مطالبات کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے ان سے ہرگز کسی دوسرے فرقے کے مفاد کو گزند نہیں پہنچتا۔ موجودہ خط میں جملہ اسباب اور تفصیلات پر سیر حاصل بحث نہیں کی جا سکتی۔ تاہم اگر آپ پسند فرمائیں اور آپ کو اس کام کے لئے فرصت بھی ہو تو میں حاضر ہو کر مجلس عاملہ کا نقطہ نگاہ تفصیل سے پیش کرنے کو آمادہ ہوں۔

آپ کا مخلص

ایم۔ اے جناح

---

## وائسرائے

۱۹۔ اپریل ۱۹۴۰ء

ڈیئر مسٹر جناح آپ کا خط محررہ ۲۴۔ فروری پڑھ کر خوشی ہوئی کہ میرے ۲۳۔ دسمبر کے خط سے آل انڈیا مسلم لیگ کے بعض شکوک و شبہات کا ازالہ ہو گیا ہے۔ آپ کے خط سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ لیگ کی مجلس عاملہ کو مسئلہ فلسطین اور اختتام جنگ کے بعد دستور معاملات پر نظر ثانی کرنے کے بارے میں میری جانب سے کوئی مزید وضاحت درکار ہے۔

بہر حال، آپ یہ معلوم کرنے کے خواہاں ہیں کہ ہندوستانی سپاہیوں کو مسلمان ممالک کے خلاف استعمال نہیں کیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں میرے لئے یہ امر باعث اطمینان ضرور ہے کہ آپ کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ اگر کل کو ہندوستان پر کسی بیرونی غنیم نے حملہ کیا تو ہندوستان کی حفاظت کے لئے ہندوستانی سپاہیوں کو استعمال نہیں کیا جائے گا۔ جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں آپ اس قسم کی کوئی گارنٹی نہیں مانگتے جس سے ہم آئندہ پیش آنے والے واقعات کے بارے میں ابھی سے گویا اپنے آپ کو پابند کر دیں۔ سردست اس قسم کی گارنٹی دینا بدیہی طور پر ممکن نہیں۔ تاہم میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ اگر کبھی حالات نے اس قسم کی صورت اختیار کی تو جس تردد کا اظہار آپ نے کیا ہے اس سے ہرگز چشم پوشی نہیں کی جائے گی۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس وقت جملہ اسلامی ممالک کے ساتھ ملک معظم کی حکومت کے تعلقات دوستانہ اور ہمدردانہ ہیں۔ ان میں سے بعض ملکوں کے ساتھ ملک معظم کی حکومت کے باقاعدہ معاہدے قائم ہیں اور بعض کے ساتھ پر خلوص مراسم ہیں۔

آپ نے لکھا ہے کہ میں نے آپ کے دوسرے نکتے کی جو وضاحت اپنے خط میں کی ہے اس

سے لیگ کی مجلس عاملہ کی بخوبی تسکین نہیں ہوئی۔ آپ نے یقیناً وزیر ہند کی ۱۸۔ اپریل کی تقریر پڑھی ہوگی جس میں یہ الفاظ بھی درج ہیں:

"............ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آئندہ ہندوستان کا دستور اس ملک کے باشندوں کی مرضی کے بغیر برطانوی حکومت اور پارلیمینٹ زبردستی مسلط کرے گی۔ ملک معظم کی حکومت نے وعدہ کیا ہے کہ آئندہ دستور وضع کرتے وقت ہندوستان کی تمام جماعتوں کے نمائندوں سے مشورہ کیا جائے گا۔ ظاہر ہے اس وعدے کا مطلب یہی ہے کہ دستور کی تشکیل باہمی مشورے سے ہوگی نہ کسی قسم کے جبر و اکراہ سے۔ یہ صحیح ہے کہ اگر متحدہ ہندوستان کے تصور کو حقیقت کا جامہ پہنانا ہے ـــــ جس کی خاطر بے شمار ہندوستانیوں اور انگریزوں نے محنت کی ہے ـــــ تو لازماً ہندوستان کی مختلف قوموں میں باہمی اتحاد کا ہونا ضروری ہے۔ اندریں حالات میں یہ قطعی باور نہیں کر سکتا کہ اس ملک کی کوئی حکومت یا کوئی پارلیمینٹ ملک معظم کی رعایا کے آٹھ کروڑ مسلمانوں پر جو ہندوستان کے باشندے ہیں۔ اس قسم کا آئین زبردستی مسلط کرنے کی کوشش کرے گی جس کے تحت وہ امن و عافیت کی زندگی بسر نہ کر سکیں"۔

مجھے یقین ہے کہ آپ اس بات سے اتفاق فرمائیں گے کہ اس ضمن میں جو شکوک پیدا ہو سکتے تھے، وزیر ہند کے اس اعلان سے رفع ہو جائیں گے۔

آپ کا مخلص

لنلتھگو

---

جناح

ماتھران۔ ۱۸۔ مئی ۱۹۴۰ء

ڈیئر لارڈ لنلتھگو۔ آپ کا خط محررہ ۱۹۔ اپریل ۱۹۴۰ء ملا۔ شکریہ قبول فرمائیے۔ جواب بھیجنے میں جو تاخیر ہوئی ہے اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ وجہ یہ تھی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کی تشکیل کا مسئلہ درپیش تھا، اور میں اس سوچ میں تھا کہ یہ مرحلہ طے ہو جائے تو آپ کو خط لکھوں۔ گذارش یہ ہے کہ نئے سال کی مجلس عاملہ کی تشکیل ہوگئی ہے۔ اس لئے میں عنقریب آپ کا خط اس کے سامنے پیش کروں گا۔ اور جو فیصلہ وہاں ہوگا اس سے آپ کو مطلع کروں گا۔

آپ کا مخلص
ایم۔ اے جناح

---

## جناح

بمبئی ۱۷۔ جون ۱۹۴۰ء

ڈیئر لارڈ لنلتھگو ۔ مجلس عاملہ کا اجلاس ۱۶۔ جون کو بمبئی میں ہوا تھا۔ جو قرار داد اس اجلاس میں منظور کی گئی تھی اس کی ایک نقل اس عریضے کے ہمراہ آپ کو بھیج رہا ہوں۔ اگر آپ کے خیال میں اس مسئلے پر کسی مزید بحث وتمحیص کی ضرورت ہے یا میرا بالمشافہ حاضر ہونا ضروری ہے تو میں بخوشی آپ سے ملاقات کے لئے آنے کو تیار ہوں۔

آپ کا مخلص
ایم۔ اے جناح

آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اجلاس منعقدہ بمبئی بتاریخ ۱۵ ر ۱۶ ر ۱۷ ر جون ۱۹۴۰ء میں ذیل کی قرار داد منظور کی گئی۔

آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کی رائے ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے مطالبات کے جواب میں وائسرائے نے اپنے ۱۹۔ اپریل ۱۹۴۰ء کے مکتوب میں جو مزید وضاحت کی ہے وہ کافی نہیں۔ با ایں ہمہ مجلس عاملہ اپنے صدر مسٹر ایم۔ اے جناح کے ذیل کے بیان کی تائید کرتی ہے۔ جو ۲۷۔ مئی ۱۹۴۰ء کو شائع ہوا تھا۔

”ہم نے موجودہ جنگ کے سلسلہ میں اس وقت تک برطانوی حکومت کے راستے میں کوئی مشکل کھڑی نہیں کی اور نہ حکومت کو کسی طرح پریشان کیا ہے۔ جن صوبوں میں مسلم لیگ کی آواز کو نمایاں اہمیت حاصل ہے، ان صوبوں کو برطانوی حکومت کے ساتھ اشتراک وتعاون کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ اگرچہ ہم نے اس ضمن میں جو مطالبات پیش کئے تھے کہ برطانوی حکومت ہماری منظوری اور رضا مندی کے بغیر ہندوستان کے آئندہ دستوری معاملات کے بارے میں کسی قسم کا اعلان نہ کرے، ان کا تاحال کچھ فیصلہ نہیں کیا گیا۔

بہرکیف ہم گذشتہ نومبر میں وائسرائے کی اس تجویز پر غور کرنے کو بھی آمادہ ہو گئے تھے کہ اہم امور کے تصفیے کو فی الحال ملتوی کر کے صوبائی دائرے میں کوئی آبرومندانہ اور قابل عمل سمجھوتہ کر لیا جائے تاکہ بعدازاں وائسرائے کی ایگزیکٹو

کونسل میں، موجودہ آئین اور قانون کی حدود کے اندر رہ کر ہمارے نمائندے شامل ہو سکیں۔ لیکن اس تجویز کو مسٹر گاندھی اور کانگرس نے بلا تامل مسترد کر دیا تھا۔

وائسرائے نے اسی نوع کی ایک اور کوشش فروری کے اوائل میں کی تھی جس کا حشر بھی یہی ہوا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد سے وائسرائے اب تک کانگرس کے اشارے کے منتظر ہیں کہ ادھر سے کچھ تحریک ہو تو یہ بھی کوئی قدم اٹھائیں۔

جہاں تک مسٹر ایمری[۱] کے بیان اور وائسرائے کی نشری تقریر کا تعلق ہے میری رائے ہے کہ یہ فرض برطانوی حکومت کا ہے کہ وہ مسلمانوں کی لیڈر شپ پر اعتماد کرے۔ جس کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اگر اس نے دوستوں کی طرح ہم پر اعتماد کیا تو جواب میں ہم بھی اسی اعتماد کا ثبوت دیں گے۔

مجلس عاملہ کو یہ دیکھ کر سخت اضطراب اور فکر ہو رہا ہے کہ نازی اپنے روزافزوں جارحانہ حملوں سے ایک ایک کر کے بہت سے ملکوں کی آزادی سلب کر رہے ہیں اور اطالوی حکومت نے اتحادیوں پر اس وقت حملہ کر کے جبکہ فرانس غنیم کے ٹڈی دل لشکر کا بہادرانہ مقابلہ کر رہا تھا۔ جس طرز عمل کا ثبوت دیا ہے اسے مجلس عاملہ ایک ذلیل فعل تصور کرتی ہے۔

دنیا میں جو تشویش ناک صورت حال پیدا ہو گئی ہے اس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ اپنے ملک کی حفاظت کے لئے کمربستہ ہو جائے، مجلس عاملہ حکومت ہند سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ ملک کو ایسے منظم طریقہ سے تیار کرے کہ وہ ہر قسم کی آفت کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو سکے۔ وائسرائے اور کمانڈر انچیف نے ہندوستان کی حفاظت کی جو تجویزیں اپنے بیان میں پیش کی ہیں اور جن تجویزوں کا اظہار بعض صوبوں کے گورنروں نے اپنے بیانات میں کیا ہے وہ مجلس عاملہ کے نزدیک موجودہ حالات سے عہدہ بر آ ہونے کے لئے ہرگز تسلی بخش اور کافی نہیں۔ لہٰذا مجلس عاملہ اپنے صدر کو یہ اختیار دیتی ہے کہ وہ وائسرائے کے ساتھ گفت و شنید کر کے ایسے موثر اور فوری طریقے اختیار کریں جن سے ملک کے

---

۱۔ لارڈ زٹلینڈ ۳ار مئی ۱۹۴۰ء کو وزیرِ ہند کے عہدے سے استعفاء دیدیا تھا۔ اور ان کی جگہ مسٹر ایمری وزیر ہند مقرر ہوئے تھے۔ (مصنف)

وسائل وذرائع کو اس طرح منظم کیا جائے جس سے ہندوستان کی حفاظت کی خاطر جنگی کوششوں میں زیادہ مستعدی اور تیزی پیدا ہو سکے۔

مجلس عاملہ کا خیال یہ ہے کہ حالات نے اس وقت جو نازک صورت اختیار کر لی ہے اس کے پیش نظر جب تک صوبہ وار نہیں بلکہ آل انڈیا پیمانے پر مسلم لیگ اور حکومت اور وہ تمام جماعتیں جو موجودہ خطرے کے مقابلہ میں ہندوستان کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھانے کو تیار ہیں باہم خوش اسلوبی سے آپس میں تعاون نہیں کرتیں اس وقت تک صحیح مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔

مجلس عاملہ کی یہ رائے ہے کہ حکومت نے جو پراونشل اور ڈسٹرکٹ جنگی کمیٹیاں بنائی ہیں۔ ان میں مسلمانوں اور دیگر افراد کے شریک ہونے سے مقصد پورا نہیں ہو گا۔

چودھری خلیق الزمان نے اپنی کتاب "پاتھ وے ٹو پاکستان" میں مسٹر جناح کے مذکورہ بالا بیان پر چار اعتراض کئے ہیں۔ ایک یہ کہ مسٹر جناح کیوں اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ جنگی سرگرمیوں کے بارے میں حکومت اور مسلم لیگ کا تعاون صوبہ وار نہیں بلکہ آل انڈیا پیمانے پر ہونا چاہئے۔ چودھری صاحب کا خیال ہے کہ اس قسم کی مفاہمت صوبہ وار ہونی چاہئے تھی تاکہ پنجاب اور بنگال کی وزارتوں کو موقع ملتا کہ اپنے اپنے مقامی حالات کے مطابق حکومت سے تعاون کرتیں۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ مسٹر جناح نے یہ کیوں کہا تھا کہ مسلم لیگ آل انڈیا پیمانے پر ان جماعتوں کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہے جو موجودہ خطرے کے مقابلہ میں ہندوستان کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھانے کو آمادہ ہیں۔

تیسرا اعتراض چودھری صاحب نے یہ کیا ہے مسٹر جناح نے حکومت کی قائم کی ہوئی پراونشل اور ڈسٹرکٹ جنگی کمیٹیوں کی مذمت کیوں کی ہے۔

چوتھا اعتراض یہ ہے کہ مسلم لیگ کی یہ دھونس کوئی معنی نہیں رکھتی تھی کہ ہم حکومت کو پریشان کر سکتے ہیں۔ پنجاب اور بنگال کی وزارتوں کا مسلم لیگ سے محض برائے نام تعلق تھا۔ مسٹر جناح حکم بھی دیتے تو ان دونوں صوبوں کی وزارتیں کبھی مستعفی نہ ہوتیں۔ پھر ایسی غیر یقینی حالت میں حکومت کو پریشان کرنے کے لئے کون سے وسائل مسلم لیگ کے پاس تھے۔

چودھری صاحب کے ان اعتراضوں کے جواب میں پہلی گذارش تو یہ ہے کہ مسلم لیگ نے فیصلہ کر دیا تھا کہ انفرادی طور پر جو مسلمان چاہے اور جس طرح چاہے جنگی سرگرمیوں میں حکومت

کی مدد کر سکتا ہے۔ البتہ آل انڈیا مسلم لیگ کی سرکاری اور باضابطہ پالیسی یہ ہے کہ حکومت جب تک ہماری چند شرطیں نہیں مانتی ، لیگ جنگی سرگرمیوں میں حکومت سے باقاعدہ تعاون نہیں کر سکتی۔ جوں جوں جنگ کا دائرہ وسیع ہوتا گیا یہ شرطیں واضح اور صاف ہو کر معین صورت اختیار کرنے لگیں۔ وائسرائے نے اپنی ایگزیکٹو کونسل میں توسیع کرنی چاہی تو مسٹر جناح کو لکھا کہ وہ مسلم لیگ کے دو نمائندے اپنی کونسل میں لینے کو تیار ہے۔ اسی قسم کی دعوت کانگرس کو بھی دی گئی تھی۔ کانگرس اس وقت صوبائی وزارتوں سے مستعفی ہو چکی تھی اور کچھ معلوم نہیں تھا کہ آئندہ کیا روّیہ اختیار کرتی ہے۔ بظاہر سول نافرمانی کی دھمکیاں دی جا رہی تھیں لیکن در پردہ کانگرس اور حکومت کے درمیان سودے بازی کی کوشش جاری تھی۔ جس کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ حکومت کانگرس کو ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کر لے۔ بہت ممکن تھا کہ حکومت سول نافرمانی کی دھمکیوں سے مرعوب ہو کر کانگرس کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیتی۔ اگر ایسی صورت پیدا ہو جاتی تو پھر ہم کیا روش اختیار کرتے؟ چنانچہ میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ مسٹر جناح نے وائسرائے کی دعوت کا جواب دیتے ہوئے لکھا تھا کہ مسلم لیگ باضابطہ اپنے دو نمائندے ایگزیکٹو کونسل میں بھیجنے کو آمادہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس بات کی قید لگا دی جائے کہ کل کو اگر کسی اور سیاسی جماعت کو بھی بحیثیت ایک جداگانہ سیاسی جماعت کے ایگزیکٹو کونسل میں شریک کیا گیا تو اس کی شرکت کی شرطیں مسلم لیگ کی صوابدید سے طے کی جائیں گی۔ وائسرائے نے یہ شق ماننے سے معذوری کا اظہار کیا تو آل انڈیا مسلم لیگ نے ایگزیکٹو کونسل اور جنگی مشاورتی کمیٹی، دونوں میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ اب بتائیے کہ اگر ان حالات میں مسلم لیگ آل انڈیا پیمانے پر حکومت سے اپنی شرکت کی شرطیں منوانے کی کوشش نہ کرتی تو محض صوبائی سطح پر کیوں کر انہیں تسلیم کروایا جا سکتا تھا؟

پنجاب میں زور شور سے بھرتی ہو رہی تھی۔ ہندو، مسلمان، سکھ رنگروٹوں کی قطاریں بھرتی کے دفتروں کے سامنے لگی رہتی تھیں، جن میں روزانہ صبح و شام اضافہ ہو رہا تھا۔ لوگ بڑھ بڑھ کر سپلائی کے ٹھیکے لے رہے تھے اور لاکھوں روپے کما رہے تھے۔ نہ کانگرس ان سرگرمیوں میں مزاحم ہوتی تھی نہ مسلم لیگ۔ یہی کیفیت ہندوستان کے باقی صوبوں کی تھی۔ سیٹھ جمنالال بجاج۔ سیٹھ گھنشیام داس برلا۔ سیٹھ رام کرشن ڈالمیا جیسے کروڑ پتی سرمایہ دار حکومت کو جنگی سامان سپلائی کرنے میں مصروف تھے، حالانکہ یہ تینوں سیٹھ کانگرس کی پشت پناہی بھی کرتے تھے۔ بایں ہمہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ آل انڈیا پیمانے پر مسلم لیگ کی کسی باضابطہ پالیسی کا تعین نہ صرف ضروری بلکہ ناگزیر تھا۔

حکومت نے جو پراونشل اور ڈسٹرکٹ جنگی کمیٹیاں بنائی تھیں ان میں وہ مسلم لیگ کے نمائندوں کو بحیثیت جماعت کے شامل کرنا چاہتی تھی۔ اور حکومت کی یہی روش تھی جس پر مسٹر جناح کو اعتراض تھا۔ میں انشاء اللہ ۱۹۴۰ء کے حالات و واقعات بیان کرتے وقت اپنی اگلی کتاب میں یہ بتاؤں گا کہ جب سر سکندر حیات خاں نے ان کمیٹیوں میں مسلم لیگ کے آدمیوں کو شریک کرنا چاہا تو ملک برکت علی نے سخت احتجاج کیا تھا۔ بالآخر نواب شاہنواز خاں ممدوٹ نے خود بمبئی جا کر مسٹر جناح سے عرض کیا کہ ان کمیٹیوں میں مسلم لیگیوں کو شرکت کی اجازت عطا کر دیجئے۔ مسٹر جناح کا جواب بہر صورت یہی تھا کہ انفرادی طور پر آپ بے شک شامل ہو سکتے ہیں لیکن مسلم لیگ بحیثیت ایک جماعت کے اس وقت تک شریک نہیں ہو گی جب تک حکومت ہماری شرطیں نہیں مانتی۔

آخر اس میں قباحت ہی کیا تھی جس پر چودھری صاحب نے اس طرح غم و غصہ کا اظہار کیا ہے۔ چودھری صاحب نے اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"مجھے پنجاب کی صورت حال نے سخت فکر مند بنا دیا تھا کیونکہ وہاں بعض لوگ سر سکندر پر چاروں طرف سے حملے کر رہے تھے۔ سر سکندر کے دوستوں نے جب یہ حالت دیکھی تو سر سکندر سے اصرار کرنا شروع کیا کہ آپ مسلم لیگ سے استعفا دے دیجئے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر میں سخت پریشان ہو گیا۔ چنانچہ میں نے ۹۔ جولائی کو مسٹر جناح کو لکھا کہ ہمارے جون ۱۹۴۰ء کے بمبئی والے ریزولیشن نے ملک بھر میں اضطراب پھیلا دیا ہے۔ جسے رفع کرنا بہت ضروری ہے۔ جب بہت دن انتظار کرنے کے بعد بھی مسٹر جناح کا جواب نہ آیا تو میں نے پھر انہیں ۷۔ اگست کو خط لکھا کہ پنجاب کے چند اہم اور ذی حیثیت آدمی اس غلط فہمی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں جو آپ کے اور سر سکندر کے درمیان پیدا ہو گئی ہے۔ مہربانی فرما کر مسلم لیگ کے مفاد کی خاطر یہ غلط فہمی دور کیجئے"۔

گذارش یہ ہے کہ پنجاب کے مسلمانوں میں مجلس احرار شروع سے سر سکندر حیات کے خلاف تھی۔ خاکسار بھی خلاف تھے۔ کانگرس میں کوئی قابل ذکر مسلمان ایسا نہیں تھا جس سے سر سکندر کو مخالفت کا اندیشہ ہوتا۔ لے دے کے ایک مسلم لیگ کے کارکنوں کا مختصر سا گروہ ضرور تھا جو سر سکندر کی پالیسی کے خلاف تھا۔ اگر چودھری صاحب کا روئے سخن انہی چند بد قسمت افراد کی طرف ہے تو کیوں نہیں کھل کر ملک برکت علی۔ غلام رسول خاں۔ زمان مہدی۔ میاں عبدالعزیز وغیرہ کے نام لکھ دیئے تاکہ بات صاف ہو جاتی!

# یومِ نجات[1]

کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے حکم سے اکتوبر ۱۹۳۹ء کے آخر میں ہندوستان کے سات صوبوں کی کانگرسی وزارتوں نے استعفاء دے دیا تھا۔ جیسا کہ میں ایک گذشتہ باب میں عرض کر چکا ہوں کانگرس کا یہ فیصلہ اس کے تہدید و تخویف اور دھمکی اور دھونس کے ترکش کا آخری تیر تھا۔ گاندھی جی کو یقین تھا کہ انگریز اس حربے میں مرعوب ہو جائے گا اور جو مطالبہ وہ وائسرائے سے اپنی ذاتی گفت و شنید کے ذریعے سے نہیں منوا سکے۔ اس طرح منوا لیا جائے گا۔

مسٹر جناح نے ۲۔دسمبر ۱۹۳۹ء کو ہندوستان کے مسلمانوں سے درخواست کی کہ ۲۲۔دسمبر ۱۹۳۹ء کو جگہ جگہ جلسے کر کے خدا کا شکر ادا کریں کہ انہیں کانگرسی مظالم سے نجات ملی ہے۔ مسٹر جناح کے بیان کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

"میں تمام ہندوستان کے مسلمانوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ بروز جمعہ ۲۲۔دسمبر کو یوم نجات و تشکر منائیں کہ بالآخر کانگرسی وزارتیں ختم ہوئیں اور ہمیں بھی چین کا سانس لینا نصیب ہوا۔ مجھے امید ہے کہ ہندوستان بھر کی پراونشل ڈسٹرکٹ اور پرائمری لیگیں اپنے اپنے ہاں پبلک جلسے منعقد کر کے ذیل کی قرار داد مناسب ترمیم کے ساتھ منظور کریں گی اور ساتھ ہی شکرانے کے نفل بھی پڑھے جائیں گے، کہ خدا نے ہمیں کانگرس کے ظالمانہ راج سے نجات دلائی ہے۔

مجھے توقع ہے کہ یہ جلسے بڑے حزم و احتیاط اور تحمل سے منعقد کئے جائیں گے، اور کوئی ایسی بات نہیں کی جائے گی جس سے کسی فرقے کی دل آزاری ہو کیونکہ مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے ساتھ جس قدر زیادتی اور ناانصافی ہوئی اس کی ذمہ داری کانگرس کی ہائی کمان پر ہے"۔

---

1. Day of Deliverance

قرارداد کا متن:۔

" ( جگہ کا نام ) کے مسلمانوں کا یہ پبلک جلسہ اپنی اس حتمی رائے کا اظہار کرتا ہے کہ کانگرس کی وزارت جس شدت سے مسلمانوں کے خلاف اپنی پالیسی پر کاربند رہی ہے اس نے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ کانگرس کا یہ دعویٰ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کہ وہ تمام قوموں کے مفاد کی منصفانہ نمائندگی کرتی ہے۔ اس جلسے کی حتمی رائے ہے کہ کانگرسی وزارت مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے مفاد اور حقوق کی حفاظت کرنے میں ناکام رہی ہے۔

کانگرسی وزارت نے نظم و نسق کے دائرے اور لیجسلیٹو اسمبلی کے اندر اپنے فرائض ادا کرتے وقت نہایت گھناؤنے پن سے مسلمانوں کی رائے کو کچلنے، ان کے کلچر کو مٹانے ان کی مذہبی اور معاشرتی زندگی میں مداخلت کرنے اور ان کے اقتصادی و سیاسی حقوق کو پاؤں تلے روندنے کی انتہائی کوشش کی ہے۔

جہاں جہاں ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلافی اور نزاعی امور پیدا ہوئے ہیں وہاں کانگرسی وزارت نے بالالتزام ہندوؤں کی طرف داری، حمایت، اور اعانت کی ہے اور مسلمانوں کے حقوق کو ہمیشہ نقصان پہنچایا ہے۔

کانگرسی حکومت نے ڈسٹرکٹ افسروں کے روزمرہ آئینی فرائض میں حتیٰ کہ چھوٹے چھوٹے کاموں میں بھی جس تسلسل و تواتر سے مداخلت کی ہے اس سے مسلمانوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ کانگرس کے اس طرز عمل نے ایک ایسی فضا پیدا کر دی ہے جس سے ہندو عوام کو یقین ہو گیا ہے کہ ملک میں ہندو راج قائم ہو گیا ہے چنانچہ اس سے ہندوؤں بالخصوص کانگرسی ممبروں کے حوصلے اتنے بلند ہو گئے کہ انہوں نے جگہ جگہ مسلمانوں سے بدسلوکیاں کرنا شروع کیں اور ان کے ابتدائی حقوق آزادی کو بھی پامال کیا گیا۔

لہٰذا یہ جلسہ مختلف صوبوں میں کانگرسی راج کے ختم ہونے پر اطمینان کا اظہار کرتا ہے اور نہایت مسرت سے آج یوم نجات مناتا ہے کہ مسلمانوں کو گذشتہ ڈھائی سال کے مظالم اور ناانصافیوں سے نجات ملی ہے اور بارگاہِ ربّی میں دعا کرتا ہے کہ مسلمانان ہند کو ایسی قوت تنظیم اور ڈسپلن عطا ہو کہ وہ دوبارہ اس قسم کی وزارت قائم نہ ہونے دیں بلکہ اس کی بجائے صحیح معنوں میں ایک ایسی مقبول وزارت قائم کریں جو تمام فرقوں اور ان کے مفاد سے یکساں انصاف کرے۔

یہ جلسہ (صوبے کا نام درج کیا جائے) کے گورنر اور اس کے مشیروں سے پرزور درخواست کرتا ہے کہ سابقہ کانگرسی وزارت نے مسلمانوں کے ساتھ جو ظلم اور ناانصافیاں کی ہیں ان کی جلد از جلد تحقیقات کر کے ان کی حق رسی اور داد خواہی کی جائے۔ کیونکہ گورنروں نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی دفعہ نمبر ۹۳ کے تحت مختلف صوبوں کی حکومت سنبھالتے وقت اس قسم کا اعلان کیا تھا۔ اس طرز عمل سے عوام کو یقین ہو جائے گا کہ موجودہ حکومت تمام فرقوں کے ساتھ یکساں انصاف کرنے کی پالیسی کو بروئے کار لا رہی ہے"۔

مسٹر جناح کا یہ بیان چھپتے ہی پشاور سے لے کر مدراس تک پورا برعظیم یوں بھڑک اٹھا گویا کسی نے بارود کے ڈھیر میں چنگاری پھینک دی ہے۔ ۲۴۔ مارچ ۱۹۴۰ء کو جب قرار داد پاکستان منظور ہوئی تھی تو اس وقت بھی کانگرسی حلقوں میں وہ شور و غوغا اور نالہ و شیون برپا نہیں ہوا تھا جو یوم نجات کے اس اعلان پر ہوا۔ گاندھی۔ نہرو۔ راج گوپال اچاری۔ پٹیل۔ ابوالکلام وغیرہ دم بخود رہ گئے۔ میرے نزدیک یہ مسٹر جناح کی سیاست کا اس لحاظ سے یقیناً شاہکار تھا کہ انہوں نے ایک ہی ضرب سے دنیا پر یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ کانگرس ہرگز ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت نہیں۔

ہندوستان کے پارسیوں اور اچھوتوں نے دس قدم آگے بڑھ کر جناح کے اس اعلان کا خیر مقدم کیا اور اپنے اپنے قومی اجتماع میں فیصلہ کیا کہ ۲۲۔ دسمبر کے جلسوں میں پارسی اور اچھوت بھی شریک ہوں گے۔

ڈاکٹر امبیدکر نے اپنے ایک اخباری بیان میں کہا۔

"جب مسٹر جناح کا بیان میری نظر سے گذرا تو میں اپنی اس غفلت پر بے حد شرمندہ ہوا کہ انہوں نے پیش قدمی کر کے مجھے ان خیالات کے اظہار اور ان الفاظ کے استعمال کرنے سے محروم کر دیا ہے جن کا مسٹر جناح سے زیادہ میں حق دار ہوں۔

کانگرسی راج میں ہندوؤں نے مبیّنہ طور پر مسلمانوں پر جو ظلم کئے ہیں ان کے بارے میں کوئی کچھ کہے لیکن یہ بات تو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ کانگرسی حکومتوں نے جس طرح کروڑوں اچھوتوں کو اپنے مظالم کا نشانہ بنایا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اگر کسی غیر جانب دار عدالت کے سامنے مسٹر جناح اور مسلم لیگ ظلم و تشدد کے ایک سو واقعات میں سے پانچ ثابت کر سکتے ہیں تو میں اس قسم کے سو

فیصد واقعات کا ثبوت بہم پہنچانے کو تیار ہوں۔ مسٹر جناح سے کہیں زیادہ میں اس بات کا دعوے دار ہوں کہ کانگرسی وزارتوں کے مظالم کی تحقیقات کرنے کے لئے ایک رائل کمیشن مقرر ہونا چاہئے۔

یہ صحیح ہے کہ اچھوتوں پر جتنے ظلم ہوئے ہیں وہ ہندوؤں ہی نے کئے ہیں لیکن میں اپنے ہندو دوستوں کو یقین دلاتا ہوں کہ یوم نجات کی تجویز ہرگز ہندوؤں کے خلاف نہیں بلکہ سراسر کانگرس کے خلاف ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک بالکل سیاسی تحریک ہے۔ اگر اس کے برعکس ہندوؤں نے اس تحریک کی یہ تعبیر کی کہ یہ کانگرس پر نہیں بلکہ خود ان پر حملہ ہے تو پھر اس کے لئے ہندوؤں کو کانگرس ہی کا شکر گذار ہونا چاہئے۔ اس طرز عمل سے دو باتیں ثابت ہو جائیں گی۔ ایک یہ کہ کانگرس ہندوؤں کی جماعت ہے۔ دوسری یہ کہ ہندو اس طرح کانگرس سے وابستہ ہیں کہ وہ کبھی اس جماعت کو آزمائش کی کسوٹی پر رکھنے کو تیار نہیں"۔ ا۔

۱۹۔ دسمبر ۱۹۳۹ء کو بمبئی کے سرکردہ پارسی نمائندوں کا جلسہ ہوا جس میں پارسیوں کے سب سے بڑے مذہبی رہنما سردار نوشیرواں کیقباد بھی شریک ہوئے۔ ان کے علاوہ دستور منوچہر۔ سرکاؤس جی جہانگیر۔ سرجیمسٹ جی جیجی بھائی۔ منوچہر کھارگھٹ۔ سرنوروجی و ماسیا۔ پروفیسر سہراب داور۔ سرجہانگیر کویاجی۔ سیٹھ کاؤس جی جال بھائی۔ سرڈنشا پٹیٹ وغیرہ بھی شرکاء محفل میں موجود تھے۔ اس جلسے میں یوم نجات کی تجویز کی حمایت کی گئی اور ہندوستان کے تمام پارسیوں سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنے اپنے شہر میں یوم نجات کے جلسوں میں شرکت کریں۔

پونا کے ایک مسلم لیگی لیڈر شیخ جان محمد نے سردار نوشیرواں کیقباد کو دعوت دی تھی کہ آپ ۲۲۔ دسمبر کو پونا تشریف لا کر یوم نجات کے جلسے میں شریک ہوں۔ سردار نوشیرواں کیقباد نے جواب میں جو خط لکھا تھا وہ یقیناً اس قابل ہے کہ اس کا ترجمہ یہاں درج کیا جائے۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں بعض مصروفیتوں کے باعث ۲۲۔ دسمبر کو پونا آ کر یوم نجات کے جلسے میں شریک نہیں ہو سکتا۔ تاہم میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری اور میری تمام قوم کی ہمدردیاں اس معاملہ میں مسلمانوں کے ساتھ ہیں۔ یہ کہہ کر میں اپنی قوم کے عام جذبات کی ترجمانی کر رہا ہوں۔ آپ کے لیڈر مسٹر جناح نے ان جذبات و احساسات کا جن سے آج اکثر اہل ہند کے سینے لبریز ہیں، اس جرأت

---

ا۔ روزنامہ "ٹائمز آف انڈیا" بمبئی۔ مورخہ ۱۹ر دسمبر ۱۹۳۹ء

اور وطن پرستانہ انداز میں اظہار کیا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

مجھے اکثر ایسے پارسیوں کی مثالیں معلوم ہیں جنہوں نے کانگرسی وزارتوں کے استعفے کی خبر سنتے ہی آتش کدوں میں جا کر خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ انہیں کانگرسی حکومت سے نجات ملی ہے۔ ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سلسلے میں مسٹر جناح نے اپنے اہل ملک کو جو موقع عطا کیا ہے اس کی جتنی تعریف کی جائے تھوڑی ہے۔ پھر جس عالی ظرفی کے ساتھ وہ یہ کام کر رہے ہیں اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ انہیں ہندو قوم کے ساتھ کوئی کینہ بغض یا عداوت نہیں۔

مجھے یقین ہے کہ ہندوؤں سمیت تمام قوموں کے افراد اگر جسمانی نہیں تو کم سے کم روحانی طور پر مسٹر جناح کے ساتھ شریک ہو کر خدائے تعالیٰ کا شکریہ ادا کریں گے کہ اس نے تباہی کا طوفان آنے سے قبل انہیں بروقت بچالیا۔ آیئے! آج ہم اپنے پروردگار کا شکر کرتے وقت صمیم قلب سے یہ دعا بھی کریں کہ وہ کانگرس کو جو کسی زمانے میں ایک نیک نام جماعت تھی، ان تمام خرابیوں اور برائیوں سے نجات دے جو اس میں سرایت کر گئی ہیں۔ اور ہم پر رحم فرما کر ہندوستان کو ایسے لوگوں سے بچائے جن کی وطن پرستی کا مدعا و مقصود ہندوستان کی فلاح و بہبود نہیں بلکہ اپنی غرض مندی مطلب برآری اور نفس پروری ہے"[1]۔

کانگرسی لیڈروں کے غم و غصہ کا یہ عالم تھا کہ انہیں الفاظ نہیں ملتے تھے جن سے جناح کے خلاف اپنی آتشِ غضب کا اظہار کر سکیں۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل کانگرس کی پارلیمنٹری سب کمیٹی کے صدر تھے۔ اور چونکہ جناح کے بیان کا سب سے بڑا ہدف کانگرسی وزارتیں تھیں۔ اس لئے سردار پٹیل نے اپنی اور کانگرسی وزارتوں کی صفائی میں ایک طویل بیان دیا جس میں بڑی دلچسپ باتیں کہیں۔ مثلاً:

"............ میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ مسٹر جناح کے عائد کردہ الزامات غلط اور نامعقول ہونے کے علاوہ فرقہ وارانہ امن کے لئے سخت مضر ہیں۔ جب کانگرسی وزارتوں نے کام شروع کیا تھا تو میں نے پارلیمنٹری سب کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے تمام وزارتوں کو ہدایت کی تھی کہ اقلیتوں کے

---

۱۔ روزنامہ ٹائمز آف انڈیا۔ بمبئی۔ مورخہ ۲۱ر دسمبر ۱۹۳۹ء

حقوق کی حفاظت کریں۔ جب کبھی فرقہ وارانہ نوعیت کی شکایتیں پیدا ہوئیں تو جملہ وزارتوں نے بڑی احتیاط سے چھان بین کی اور اکثر معاملات کی تو پارلیمنٹری سب کمیٹی نے دوبارہ تحقیقات کی تھی بلکہ میں نے اس سے بھی ایک قدم آگے جاکر ہدایت کی تھی کہ اگر کبھی گورنر یہ محسوس کرے کہ وزارتیں اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت ٹھیک نہیں کر رہیں تو وزیروں کو چاہئے کہ بے دریغ گورنر سے مداخلت کی درخواست کریں ............... اگر مسٹر جناح کی یہی طے شدہ رائے ہے جس کا اظہار انہوں نے اپنے بیان میں کیا ہے تو اکثر لوگ یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ وہ فی الحقیقت ان مذاکرات کو جو ان کے اور پنڈت جواہرلال نہرو کے درمیان ہونے والے تھے کامیابی کے ساتھ کسی نتیجے پر پہنچانے کے خواہاں نہیں ہیں۔ جب تک مسٹر جناح اپنا یہ انتہائی شرانگیز بیان واپس نہیں لیتے ان کے ساتھ کسی آبرومندانہ اور خود دارانہ طریقہ سے مذاکرات جاری رکھنا قطعی ناممکن ہے۔ علاوہ ازیں کانگرس ایک قومی جماعت کی حیثیت سے جس بلند پایہ منصب کی حامل ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ یوم نجات کی فرقہ وارانہ دھمکیوں کے تحت کسی قسم کی گفت و شنید شروع نہ کی جائے"۔

گاندھی جی نے کہا "جناب جناح صاحب" یہ بیان شائع کر کے گویا خود ہی مستغیث اور خود ہی جج بن بیٹھے۔ راج گوپال اچاری کا ارشاد یہ تھا کہ جناح کے طور طریق بالکل ہٹلر سے ملتے ہیں جو پہلے ایک من گھڑت الزام لگاتا ہے اور پھر چیکوسلواکیہ اور آسٹریا میں اپنی فوجیں لے دوڑتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے فرمایا کہ آج جناح کانگرسی وزارتوں کے مستعفی ہونے پر یوم نجات مناتا ہے۔ اور کل کو اگر کانگرس دوبارہ وزارت کے منصب پر آبیٹھی تو کیا مسلمان مجلس عزا گرم کریں گے؟

اس کے علاوہ یوپی۔ سی پی۔ بہار۔ بمبئی۔ مدراس۔ اڑیسہ ۔ آسام کے کانگرسی وزراء اعظم نے بھی الگ الگ بیان دیئے کہ ہم اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے کی بناء پر کہتے ہیں کہ ہمارے صوبوں میں کانگرسی حکومت کے دوران میں مسلمانوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اور جناح کے یہ الزامات غلط ہیں۔

ملک برکت علی نے لاہور سے ایک زور دار اخباری بیان دے کر یوم نجات کی تجویز کی حمایت کی اور فرمایا:

"............ کانگرسی صوبوں کے مسلمان جن مظالم کا شکار ہوئے ہیں ان کی شکایتوں سے مسلمانوں کے دل لبریز ہیں۔ مسٹر جناح مسلمانان ہند کے مسلمہ لیڈر ہیں اور جن خیالات کا اظہار انہوں نے کیا ہے ان کے خلاف اگر کوئی شخص کسی

نوع کا احتجاج کرے بھی، ہر چند کہ یہ احتجاج کرنے والے میرے معزز رفیق کار مسٹر عبدالرحمٰن صدیقی ہی کیوں نہ ہوں، تو بھی مسٹر جناح کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا اور نہ ان کی اس پوزیشن میں رتی بھر کمی ہوتی ہے جو انہیں مسلمانوں کے واحد مسلّمہ لیڈر کی حیثیت سے حاصل ہے۔

مسٹر پٹیل اور ان کے ہم خیالوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ مسٹر جناح کے بغیر کسی قسم کی مفاہمت ناممکن ہے۔ اور نہ مسلمان اس مفاہمت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کو تیار ہیں جس پر مسٹر جناح کی مہر تصدیق ثبت نہیں ہو گی۔ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ آج مسلمان مسٹر جناح کے علاوہ اور کسی شخص کو اپنا لیڈر تسلیم نہیں کرتے اور نہ کسی اور شخص کو یہ اختیار دینے کو تیار ہیں کہ وہ مسلمانوں کی طرف سے کانگرس سے گفت و شنید کرے۔[۱]"

مسلم لیگی حلقوں میں سے صرف عبدالرحمٰن صدیقی نے یوم نجات کی تجویز کے خلاف ایک نہایت قابل اعتراض بیان دیا تھا. جس میں مسٹر جناح پر بعض ناروا ذاتی حملے بھی کئے گئے تھے۔ مثلاً یہ کہ ساٹھ سال سے اوپر عمر کے آدمی کو سیاسیات سے علیحدہ ہو جانا چاہئے۔ لہٰذا مسٹر جناح کو چاہئے کہ سیاست سے الگ ہو جائیں۔

کھودا پہاڑ اور نکلی چوہیا والی مثل مسٹر جناح کے اس بیان پر صادق آتی ہے۔ یعنی بمبئی کی مالا بار ہل کو کھودنے پر گویا یوم نجات کی چوہیا نکلی ہے۔

مسٹر جناح کو کوئی حق نہیں تھا کہ ورکنگ کمیٹی سے مشورہ کئے بغیر یوم نجات کی تجویز پیش کرتے، مسلم لیگ اور کانگرس دونوں نے ڈکٹیٹرانہ روش اختیار کر لی ہے. جس سے اندیشہ ہے کہ ہندوستان میں جمہوری سیاست ختم ہو جائے گی۔

عبدالرحمٰن صدیقی کے اس بیان کی خود کلکتہ کے لوگوں نے مذمت کی۔ چنانچہ مولوی فضل الحق نے کہا.

"مسٹر عبدالرحمٰن صدیقی آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ میں میرے رفیق کار ہیں مجھے ان کا بیان پڑھ کر سخت افسوس ہوا ہے۔ مسٹر جناح کے متعلق انہوں نے نہایت افسوس ناک اور نازیبا باتیں کہی ہیں۔ مسٹر صدیقی یا کسی اور شخص کو یہ حق تو پہنچ سکتا ہے کہ تفصیلات کے بارے میں مسلم لیگ کے صدر سے اختلاف کریں۔ لیکن یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ ان اختلافی امور کو اخباروں میں ایسے طریقہ سے

---

۱۔ روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" لاہور۔ مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۳۹ء

شائع نہیں کروانا چاہئے جس سے لیگ کے وقار کو گزند پہنچے۔ مسٹر صدیقی نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، بالخصوص جس انداز سے انہوں نے مسٹر جناح پر ناروا حملے کئے ہیں۔ اس سے ان تمام صحیح الفکر مسلمانوں کو جو اپنی قوم کی بہتری کے خواہاں ہیں رنج پہنچا ہے۔ "[۱]

نواب زادہ لیاقت علی خان نے فرمایا:

"مجھے اعتماد ہے کہ مسلمان یوم نجات مناتے وقت نہایت احتیاط اور عقیدت سے ہمارے لیڈر کے احکام کی پیروی کریں گے اور کوئی بات ایسی نہیں ہونے دیں گے جو دوسرے فرقے کے جذبات واحساسات کو تکلیف پہنچانے کا موجب ہو۔

یوم نجات اظہار مسرت کے لئے نہیں منایا جارہا کہ کانگرسی راج ختم ہوا ہے بلکہ بارگاہ ربی میں اس بات کا شکریہ ادا کرنے کے لئے کہ خدا نے ملک کو ایک ظالم حکومت سے نجات دی ہے اور ساتھ ہی بارگاہ خداوندی میں دعا کی جائے گی کہ ملک میں ایک ایسی حکومت قائم ہو جو سب کے ساتھ برابر انصاف کرے اور جس پر تمام طبقوں کو یکساں اعتماد ہو۔ یہ تقریب مناتے وقت انتہائی عجز وانکسار کا اظہار کیا جائے اور جلسوں میں نظم ونسق کے ساتھ ادب واحترام اور وقار بھی برقرار رکھنا ضروری ہے "[۲]

پنجاب سے سوائے ملک برکت علی کے اور کسی شخص نے یوم نجات کی تجویز کی حمایت نہ کی۔ مجلس احرار نے مخالفت کی۔ سر سکندر حیات خاں نے ایک نہایت لغو بیان دے کر سارے معاملے کو الجھا دیا اور منجملہ دیگر بے محل باتوں کے یہ بھی کہا کہ ہندوستان کی تمام قوموں کے چوٹی کے ایک درجن لیڈروں کو چاہئے کہ اکٹھے بیٹھ کر فیصلہ کریں کہ آئندہ کانسٹی ٹیوشن کس نوع کا ہونا چاہئے۔ اس کے بعد یہ لیڈر اپنی سفارشیں ہر صوبے کی لیجسلیٹو اسمبلی کو پیش کریں۔ اور جب وہاں مہر تصدیق لگ جائے تو پھر یہی سفارشیں برطانوی حکومت کی خدمت میں پیش کی جائیں۔

جب اخباری نمائندوں نے اس مبہم تجویز کے بارے میں مزید وضاحت طلب سوال کئے تو سر سکندر نے کہا کہ:

"اگر مہاتما گاندھی اور مسٹر جناح یہ تجویز پسند کریں تو پھر میں عرض کروں گا کہ دونوں کو چاہئے کہ مل کر وائسرائے سے درخواست کریں کہ وہ تمام قوموں کے

---

۱۔ روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ لاہور۔ مورخہ ۱۲ر دسمبر ۱۹۳۹ء

۲۔ روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ لاہور۔ مورخہ ۱۲ر دسمبر ۱۹۳۹ء

ایک درجن لیڈروں کو جمع کر کے ایک کانفرنس منعقد کریں"۔

بیان کے آخر میں سر سکندر نے کہا:

"میں ہندوستان کے تمام لیڈروں بالخصوص ان لیڈروں سے جو اس وقت آپس میں لفظی جنگ لڑنے میں مصروف ہیں۔ خلوص و ادب سے درخواست کرتا ہوں کہ گڑے مُردے اکھاڑنے کا کچھ فائدہ نہیں۔ مضیٰ ما مضیٰ انہیں چاہئے کہ بے مصرف باتوں میں وقت ضائع کرنے کی بجائے اصل اور محبوب مقصد پر اپنی نظر رکھیں۔ یعنی ہندوستان میں فرقہ وارانہ امن کیوں کر قائم کیا جا سکتا ہے۔ اور اس سیاسی نصب العین کے حصول کا جو ہر محب وطن ہندوستانی کو عزیز ہے کون سا راستہ ہے"۔ ا۔

سر سکندر کے دو پارلیمنٹری سکریٹریوں، راجہ غضنفر علی خاں اور میر مقبول محمود نے بھی اپنے لیڈر کے نقش قدم پر چل کر یوم نجات کی تجویز کی مذمت کی اور ایک اخباری بیان میں اسے "پریشان کن اور فرقہ وارانہ اتحاد کے منافی" قرار دیا۔

جب مسلم لیگ کے مخالفوں نے یہ چرچا کرنا شروع کیا کہ یوم نجات گویا مسلم لیگ کا ہندوؤں کے خلاف اعلان جنگ ہے تو مسٹر جناح نے ایک اور بیان میں اپنی اور لیگ کی حیثیت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"۲۲۔ دسمبر کو جو یوم نجات منایا جانے والا ہے اس کے خلاف مزید اعتراض وضع کرتے ہوئے ایک یہ بات بھی کہی جا رہی ہے کہ میری یہ تحریک ہندوؤں کے خلاف ہے جس سے فرقہ وارانہ کشمکش اور تیز ہو جائے گی۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ مسلم لیگ کو بدنام کرنے کے لئے کانگرس اس قسم کے خطرناک اور شرانگیز پراپیگنڈے پر اتر آئی ہے۔

میں پھر ایک دفعہ یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ہمیں کانگرسی راج کے مظالم سے نجات ملی ہے۔ اس لئے ہماری موجودہ تحریک کا رخ کسی طرح بھی ہمارے اہل وطن ہندوؤں کے خلاف بحیثیت ایک قوم کے نہیں۔

امر واقع یہ ہے کہ ہمیں کانگرس کے طرز عمل کے خلاف سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں آبرومندانہ طریقہ سے مل کر

---

ا۔ روزنامہ سٹیٹسمین ۔ مورخہ ۱۷؍ دسمبر ۱۹۳۹ء

کام کرنے سے بالکل روک دیا ہے۔

مسلم لیگ سب کے لئے یکساں انصاف کی علم بردار ہے۔ خواہ مسلمان ہوں یا کسی اور فرقے کے لوگ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے کہ تمام اقلیتوں بلکہ غیر کانگرسی ہندوؤں نے بھی میری تجویز کی حمایت کی ہے۔ میں ان تمام ہندوستانیوں سے درخواست کرتا ہوں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کے حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ہمیں ایک پارٹی کی وحدانی حکومت کی بجائے. جو غیر متبدل اکثریت کی بناء پر قائم کی گئی ہو۔ ایک ایسی مقبول حکومت کی ضرورت ہے جو تمام طبقوں سے ایک سا انصاف کرے. کہ آگے بڑھیں اور لوگوں کو اپنے خیالات سے آگاہ کریں۔

۲۲. دسمبر کی تقریب کسی لحاظ سے بھی اپنے ہم وطن ہندوؤں کے خلاف بحیثیت ایک فرقے کے ہرگز نہیں منائی جارہی بلکہ صرف کانگرسی حکومت کی مذمت مقصود ہے۔ چنانچہ جو لوگ اس نقطہ نگاہ سے اتفاق کرتے ہیں۔ میں ان سب کو دعوت دیتا ہوں کہ آئیں اور ہمارے جلسوں میں شریک ہوں "[۱]۔

جب جناح کی اس تجویز سے سارا ہندوستان گونج رہا تھا اور مسلمان ہی نہیں بلکہ دوسری اقلیتوں کے نمائندے بھی یوم نجات کی تائید اور حمایت میں اخباری بیان دے رہے تھے۔ کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے اس روائتی شترمرغ کی طرح جو اپنا سر ریت میں چھپا کر حقائق سے چشم پوشی کرتا ہے اس ہنگامے سے آنکھیں بند کر لیں اور ۲۱۔ دسمبر ۱۹۳۹ء کو وردھا میں بیٹھ کر ذیل کی قرارداد منظور کر کے گویا اپنے فرض سے سبکدوشی حاصل کر لی۔

"ورکنگ کمیٹی کی رائے میں فرقہ وارانہ تصفیے کا اس وقت تک ہرگز تسلی بخش فیصلہ نہیں ہو سکتا جب تک مختلف فریق ایک تیسری پارٹی سے آس لگائے بیٹھے ہیں جس کی نظر کرم کے طفیل انہیں خاص مراعات حاصل ہونے کی امید ہے۔ ہرچند کہ اس طرح قومی مفاد کو نقصان ہی کیوں نہ پہنچے۔ جب کسی قوم پر بدیشی حکومت مسلط ہو جائے تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم کے مختلف عناصر میں پھوٹ پڑ جاتی ہے کانگرس نے ان تمام عناصر کو متحد کرنے کی ضرورت سے کبھی اغماض نہیں کیا۔ یہی ایک جماعت ہے جس نے اپنا قومی کردار قائم رکھنے کے لئے ہمیشہ ملک میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس میں اسے کامیابی بھی ہوتی رہی ہے۔ ورکنگ

---

۱۔ روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" لاہور۔ مورخہ ۱۹ر دسمبر ۱۹۳۹ء

کمیٹی کو یقین ہے کہ ایک مستقل اور پائدار اتحاد جبھی قائم ہو گا کہ پہلے بدیشی حکومت کا خاتمہ کیا جائے"۔[1]

مسٹر جناح کا نقطہ نگاہ یہ تھا کہ جب ہندوستان کے سات صوبوں میں کانگرسی وزارتیں مسلمانوں کے حقوق کو کچل رہی تھیں تو ان صوبوں کے گورنروں نے مسلمانوں کو بچانے کے لئے کچھ نہیں کیا حالانکہ ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی رو سے گورنروں کا یہ آئینی فرض تھا کہ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کریں۔ اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ گورنروں نے بھی اپنے فرائض سے غفلت برتی اور براہ راست نہ سہی بالواسطہ کانگرس کے ساتھ شریک رہے۔

کانگرسی لیڈروں نے یوم نجات کی تجویز کے جواب میں اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دینے کے لئے ایک یہ حجت بھی پیش کی تھی کہ اگر بقول جناح کے کانگرسی وزارتیں مسلمانوں پر ظلم کر رہی تھیں تو گورنر کیوں خاموش بیٹھے رہے؟ کیوں انہوں نے آگے بڑھ کر کانگرسی وزیروں کو راہ راست پر لانے کی کوشش نہ کی؟ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کانگرس کا نامہ اعمال بالکل صاف ہے ورنہ گورنر ضرور مداخلت کرتے۔ اس کے علاوہ بابو راجندر پرشاد اور سردار پٹیل نے گورنروں کو مخاطب کر کے کہا کہ اپنے اپنے صوبوں کے کانگرسی وزیروں کی حسن کارکردگی کے سرٹیفکیٹ دو کہ انہوں نے بالکل غیر جانب داری اور انصاف پسندی سے ڈھائی سال حکومت کی ہے۔

مسٹر جناح نے اس بات کو پکڑ کر ۱۴ر دسمبر ۱۹۳۹ء کو ایک زبردست بیان اخبار کو دیا کہ کانگرسی صوبوں میں مسلمانوں سے جو ناانصافی اور زیادتی ہوئی ہے اس میں بقول کانگرسی لیڈروں کے گورنر بھی برابر کے شریک تھے۔ لہٰذا:

"میں یہ مطالبہ کرتا ہوں کہ ان تمام شکایات کی تحقیقات ایک ایسے ٹریبونل سے کرائی جائے جسے اس بارے میں مکمل اختیارات حاصل ہوں۔ میں برطانوی حکومت سے کہتا ہوں کہ ایک رائل کمیشن مقرر کیا جائے جو صرف ہز میجسٹی کے ہائی کورٹ کے ججوں پر مشتمل ہو اور جس کی صدارت پریوی کونسل کے ایک لاء لارڈ کریں۔ میرے نزدیک کانگرس یا کسی اور فریق کو اس تجویز پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے بلکہ ان سب کو میری اس درخواست کی تائید کرنا چاہئے"۔

بیان کے آخر میں مسٹر جناح نے یوم نجات کے جلسوں کے بارے میں فرمایا:

"مجھے اعتماد ہے کہ یہ جلسے بڑے سلیقے سے منعقد کئے جائیں گے اور کوئی بات

---

[1] روزنامہ سٹیٹسمین۔ ۲۲ر دسمبر ۱۹۳۹ء

ایسی نہیں کی جائے گی جس سے کسی فرقے کے جذبات کو ٹھیس لگے۔ بااین ہمہ اپنی اس بات کی وضاحت کرنے کے لئے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تمام ڈسٹرکٹ اور پرائمری لیگوں کو چاہئے کہ کسی قسم کی ہڑتال نہ کریں۔ جلوس نہ نکالیں۔ مظاہرے نہ کریں بلکہ جلسوں میں عجز و انکسار اور تدبر کی فضا طاری ہونا چاہئے۔ ہمارے دلوں میں تشکر و امتنان کے جذبات موجزن ہیں، مسرت و کامرانی کا جوش بالکل نہیں"۔

مسٹر جناح کی اس تجویز پر بھی کانگرسی حلقوں میں بہت شور اٹھا کہ نہ نو من تیل ہو گا نہ رادھا ناچے گی۔ نہ برطانوی حکومت رائل کمیشن مقرر کرے گی اور نہ کبھی ان "نام نہاد مظالم" کی تحقیقات ہو سکے گی۔ لیکن غور کیا جانا چاہئے کہ آئینی لحاظ سے ایسے امور کی تحقیقات کے لئے جن میں گورنر بھی ملوث ہوں سوائے رائل کمیشن کے اور کون سا ادارہ کام کر سکتا تھا۔

پنڈت نہرو کو رائل کمیشن کی تجویز پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ کانگرس کبھی یہ توہین برداشت نہیں کر سکتی کہ ہماری حکمرانی کی صلاحیتوں کا جائزہ لینے کے لئے سفید فام انگریزوں کا کوئی کمیشن انگلستان سے یہاں آئے۔

ملک برکت علی نے جواب میں ایک طویل بیان دیا اور فرمایا کہ جب کانگرس کے صدر بابو راجندر پرشاد نے اس تحقیقات کے لئے ہندوستان کے فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس، سرمارس گوئر کا نام تجویز کیا تھا تو کیا وہ انگلستان کے رہنے والے سفید فام انگریز نہ تھے؟ بیان کے آخر میں ملک صاحب نے کہا:

"کانگرسی دوستوں کو اس خیال میں مگن نہیں رہنا چاہئے کہ وہ مسلمانوں کا گلا گھونٹنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یہ جھگڑا اب صرف جناح بنام کانگرس تک محدود نہیں بلکہ سوال آٹھ کروڑ مسلمانوں کا ہے جو بیک آواز ان مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہے ہیں جو ان کے ہم مذہب بھائیوں پر سات صوبوں میں روا رکھے گئے ہیں"۔

صوبوں کے گورنروں کا مسئلہ جب بیچ میں آیا تو برطانوی حکومت کے ارکان بھی چونکے۔ ہندوستان میں چند چوٹی کے اینگلو انڈین اخبار نکل رہے تھے جو ملکی سیاست میں کانگرس یا مسلم لیگ کسی کے بھی ہم نوا نہیں تھے بلکہ جن کے پیش نظر بنیادی طور پر برطانوی حکومت کے مفاد تھے۔ مثلاً پنجاب میں سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ یوپی میں پائینر۔ بمبئی میں ٹائمز

آف انڈیا۔ کلکتہ میں سٹیٹس مین وغیرہ۔ رائل کمیشن کے تقرر اور گورنروں کے خلاف تحقیقات کرانے کے مطالبے پر ان اخباروں نے جناح کے خلاف مقالے لکھنا شروع کئے لیکن جہاں تک حقائق کا تعلق تھا ان میں سے کوئی اخبار بھی یوم نجات کی تجویز کے خلاف کچھ نہ کہہ سکا۔ روزنامہ سٹیٹس مین نے ۱۵، دسمبر ۱۹۳۹ء کو ایک طویل ایڈیٹوریل[1] لکھا جس کے بعض اجزاء کا ترجمہ نیچے درج کیا جا رہا ہے:

"مسٹر جناح کی اس تجویز پر کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ سات صوبوں میں کانگرسی راج سے نجات پانے کی خوشی میں یوم تشکر منائیں۔ چاروں طرف سے اعتراضوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ لیکن جوں جوں بحث طول پکڑ رہی ہے، مسٹر جناح کی متوازن اور معقول پوزیشن کے سامنے ان کے جذباتی نکتہ چینوں کی حیثیت خراب ہوتی جا رہی ہے۔ اب صاف نظر آنے لگا ہے کہ کانگرس اپنے ماضی سے شرمسار ہے اور اس وجہ سے پریشان بھی ہے۔

اس گھبراہٹ کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کانگرس صرف ایک ہی قسم کے "یوم" منانا جانتی ہے۔ اور دوسروں کے "یوموں" کو بھی اسی پیمانے سے ناپتی ہے۔ اپنے دور میں اس نے بے شمار "یوم" منائے تھے جن کا نتیجہ کشت و خون کی صورت میں نکلا تھا۔ لیکن کانگرس کی تاریخ میں ایسا ایک "یوم" بھی نظر نہیں آتا۔ جب اس نے بارگاہ ربی میں شکریہ ادا کیا ہو۔ دعا مانگی ہو اور عجز و انکسار کا اظہار کیا ہو۔ جب کبھی برطانوی حکومت اور کانگرسی لیڈروں میں کسی قسم کی مفاہمت ہوئی تو کانگرس نے ہمیشہ اس خیال سے کہ اس نے گویا اپنے حریف کو شکست دے کر ذلیل کیا ہے مسرت و کامرانی کا "یوم" منایا۔ حالانکہ ایسے موقع کی پذیرائی تدبر اور صلح و آشتی سے کرنی چاہئے تھی۔ ہمیں معلوم ہے جب ۲۶، جنوری ۱۹۳۱ء کو کلیتہ سرتیج بہادر سپرو اور مسٹر جیکر کی شبانہ روز کوششوں سے کانگرسی قیدیوں کو رہائی ملی تھی تو کلکتہ میں کس قسم کا یوم منایا گیا تھا۔ ہمیں یہ بھی یاد ہے کہ دو مہینے بعد جب انہی صبر آزما کوششوں کے طفیل لارڈ ارون اور مسٹر گاندھی میں سمجھوتہ ہوا تھا تو اس خوشی میں جو یوم منایا گیا تھا اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ کانپور میں خون کی ندیاں بہہ گئی تھیں۔ اور

---

1. "A Time to Make Friends"

گرمیوں کا پورا موسم قاتلوں کے زندہ باد کے نعرے لگانے کی نذر ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے جو لوگ ان "یوموں" کو فتح و نصرت کی یادگار سمجھ کر مناتے رہے ہیں اب اس انجام سے خائف ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جو سلوک انہوں نے دوسروں سے کیا تھا وہی سلوک الٹ کر خود ان سے نہ کیا جائے۔ اسلام انہیں بتا دے گا کہ ان کے یہ اندیشے غلط اور بے بنیاد ہیں اور انہیں خوف زدہ نہیں ہونا چاہئے۔ ہمیں اعتماد ہے کہ مسٹر جناح کے یہ الفاظ کہ لوگ کسی قسم کی ہڑتال نہ کریں۔ جلوس نہ نکالیں۔ مظاہرے نہ کریں بلکہ جلسوں میں عجز و انکسار اور تدبر کی فضا طاری ہونا چاہئے۔ ہمارے دلوں میں تشکر و امتنان کے جذبات موجزن ہیں۔ مسرت و کامرانی کا جوش بالکل نہیں۔

باقی رہا یہ سوال کہ مسلمانوں نے اگر کانگرسی وزارتوں کے مستعفی ہونے سے اطمینان کا سانس لیا ہے تو کن وجوہ سے؟ اس کا جواب تلاش کرنا بے کار ہے۔ کیونکہ اطمینان بہرحال اطمینان ہے جسے کوئی دلیل رد نہیں کر سکتی۔ لیگ کا دعوئی یہ ہے کہ مسلمانوں کا حشر وہی ہوا ہے جیسے ہل چلاتے وقت بے دریغ جو چیز نیچے آئے اسے روند کر رکھ دیا جائے۔ یہ صرف مسلمان جانتے ہیں کہ ان کے جسموں پر کہاں کہاں زخم لگے ہیں۔ اب اگر کانگرس یہ چاہتی ہے کہ ادھر ادھر سے لوگوں کو پکڑ کر مسلمانوں کو طفل تسلیاں دے تو ایسا کرنا محض تضیع اوقات ہے۔ البتہ صورت حال میں ایک طرح کی الجھن ضرور پیدا ہو گئی ہے۔ مسٹر جناح گورنروں اور ان کے پس منظر میں وائسرائے کو بھی مورد الزام گردانتے ہیں۔ ادھر کانگرس گورنروں سے درخواست کر رہی ہے کہ وہ اپنے اپنے وزراء کو خوشنودی کا پروانہ عطا کریں۔ لطف یہ ہے کہ ایک طرف کانگرس گورنروں پر یہ الزام لگاتی ہے کہ وہ مسلم لیگ کے ساتھ گویا سازش میں شریک ہیں اور دوسری طرف انہی گورنروں سے حسن کارکردگی کی سند کے حصول کی کوشش بھی کی جا رہی ہے۔ تاکہ لیگ کا منہ بند کیا جا سکے۔ گورنر کبھی ایسا نہیں کریں گے۔ اور اگر انہوں نے ایسا کیا اور خوشنودی کے پروانے کانگرسی وزراء کو عطا کر دیئے تو مسٹر جناح کے اس مطالبے کا کہ رائل کمیشن مقرر کیا جانا چاہئے کوئی جواب نہیں بن پڑے گا۔ جناح کی منطق بے پناہ ہے۔ اس نے کانگرس کی اس تجویز کے پرخچے اڑا دیئے ہیں کہ سرمارس گوئیز کو

ثالث بنا دیا جائے۔ آخر اس تجویز کے پیچھے کون سی کار فرما طاقت موجود ہے۔ کانگرس نے خود یہ تجویز پیش کی تھی۔ اس لئے اب وہ مسٹر جناح کے اس مطالبے کو ٹال نہیں سکتی کہ رائل کمیشن مقرر ہونا چاہئے جو ہائی کورٹ کے ججوں پر مشتمل ہو اور جس کی صدارت پریوی کونسل کے ایک لاء لارڈ کریں "۔

ملک برکت علی نے ۱۷۔ دسمبر ۱۹۳۹ء کو ذیل کا خط مسٹر جناح کو لکھا۔

"ڈیئر مسٹر جناح میں اس عریضہ کے ہمراہ اس بیان کی ایک نقل ملفوف کر رہا ہوں جو میں نے ۱۲۔ دسمبر ۱۹۳۹ء کو دیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایسوسی ایٹڈ پریس لاہور کے دفتر کا انچارج سخت متعصب ہندو ہے۔ اس نے یہ بیان اخباروں کو بغرض اشاعت نہیں بھیجا۔ آج میں نے ایک اور بیان اپنے دستخط کر کے براہ راست اخباروں کو بھیجا ہے۔ جونہی یہ بیان چھپا میں اس کی ایک مطبوعہ نقل آپ کی خدمت میں ارسال کروں گا۔ یونینسٹ وزارت کے دو پارلیمنٹری سکریٹریوں یعنی میر مقبول محمود اور راجہ غضنفر علی خاں نے آپ کی یوم نجات کی تجویز پر سخت اعتراض کئے ہیں کہ یہ "تجویز پریشان کن ہے جس سے فرقہ وارانہ امن کو نقصان پہنچے گا"۔ ان کے لیڈر سر سکندر حیات خاں کا بھی ایک بیان آج اخبار میں چھپا ہے۔ جس میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہا گیا کہ (۱) مسٹر گاندھی اور مسٹر جناح کو چاہئے کہ وائسرائے سے درخواست کریں کہ وہ لیڈروں کی ایک چھوٹی سی گول میز کانفرنس نامزد کریں جو کوئی متفقہ فارمولا تلاش کرے، اور (۲) ان لیڈروں کو جو اس وقت لفظی جنگ لڑنے میں مصروف ہیں گڑے مُردے اکھاڑنے سے پرہیز کرنا چاہئے۔ مضیٰ ما مضیٰ انہیں چاہئے کہ بے مصرف باتوں میں وقت ضائع کرنے کی بجائے اصل اور محبوب مقصد پر نظر رکھیں یعنی ہندوستان میں فرقہ وارانہ امن کیونکر قائم کیا جا سکتا ہے اور اس سیاسی نصب العین کے حصول کا، جو ہر محب وطن ہندوستانی کو عزیز ہے، کون سا راستہ ہے۔

یوں ایک اہم موقع کا اس شخص نے فائدہ اٹھایا ہے۔ فضل الحق نے البتہ مردانہ وار للکار لگائی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ صورت حال پر غور کرنے کے لئے فوراً آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس منعقد کرنا چاہئے تاکہ ایک مستند بیان جاری کیا جا سکے۔ یہ اجلاس کرسمس کے ہفتے میں

ایسے روز دہلی میں ہونا چاہئے جس کا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اس اجلاس سے جو کلکتہ میں ہو گا. اور آپ کی جبل پور کی مصروفیتوں کے ساتھ تصادم نہ ہو۔

آپ کا مخلص ا۔
ملک برکت علی

اس کتاب کے ساتویں باب میں ملک برکت علی کا ایک اور خط بھی نقل کیا گیا ہے جو انہوں نے ۱۲۔ دسمبر ۱۹۳۹ء کو مسٹر جناح کی خدمت میں ارسال کیا تھا اور جس میں تفصیل سے پنجاب کے حالات بیان کئے تھے۔ مسٹر جناح نے جواب دیا تھا کہ میں بہت مصروف ہوں۔ بہتر ہے آپ یا لاہور سے کوئی اور شخص بمبئی آ جائے تاکہ بالمشافہ گفتگو ہو سکے۔

ملک صاحب بعض مجبوریوں کے باعث خود نہ جا سکے تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ تم چلے جاؤ اور ضروری کاغذات اور دستاویزیں بھی ساتھ لیتے جاؤ تاکہ مسٹر جناح کو پنجاب کے حالات سے پوری طرح آگاہ کر سکو۔ چنانچہ میں تعمیل ارشاد میں ۲۰۔ دسمبر ۱۹۳۹ء کو بمبئی پہنچا اور ۲۲۔ کی رات کو یوم نجات کے اس عظیم الشان اور ہنگامہ خیز جلسے میں بھی شریک ہوا جو محمد علی روڈ پر منعقد ہوا تھا۔ اور جس کے متعلق اکثر جہاں دیدہ لوگوں کی رائے تھی کہ بمبئی کے مسلمانوں کا اتنا بڑا ہجوم اس سے قبل کسی پبلک جلسے میں نہیں دیکھا گیا۔

اس جلسے کی صدارت اسمٰعیل ابراہیم چندریگر نے کی تھی اور ریزولیوشن سر کریم بھائی ابراہیم نے پیش کیا تھا جس کی تائید میں سر ہرام جی جیجی بھائی نے پارسیوں اور ڈاکٹر امبیدکر نے اچھوتوں کی طرف سے تقریریں کیں۔ ڈاکٹر امبیدکر کی تقریر بڑی زور دار تھی۔ انہوں نے کہا کہ آج ہندوستان میں برطانوی حکومت کی پوزیشن ایک ریسیور کی سی ہے جس کی تحویل میں فریقین کی متنازعہ جائداد ہے۔ اگر کانگرس نے. جو خود اس تنازعہ میں ایک فریق کی حیثیت رکھتی ہے۔ ریسیور کو ڈرا دھمکا کر یا مار پیٹ کر یہ جائداد ہتھیالی تو کانگرس کا یہ فعل برطانوی حکومت کے خلاف نہیں بلکہ اقلیتوں کے خلاف بھی ایک جرم قرار پائے گا۔

ہندوستان کے گوشے گوشے میں یوم نجات منایا گیا۔ لاہور میں بادشاہی مسجد میں نماز جمعہ کے بعد جلسہ ہوا جس کی صدارت ملک برکت علی نے کی اور اپنی تقریر میں فرمایا کہ گذشتہ ڈھائی سال میں اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کا جو کچھ حشر

---

ا۔ انگریزی کا اصل خط اس کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ درج کیا گیا ہے۔

ہوا ہے اس کے سامنے جلیاں والے باغ کے مظالم بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ سوائے رائل کمیشن کے اور کوئی ادارہ ان مظالم کی تحقیقات نہیں کر سکتا۔

پارسیوں کی طرف سے لاہور کے ایک مشہور بیرسٹر ہومی رستم جی نے تقریر کی کہ آج بلا شبہ جناح ہندوستان کی تمام اقلیتوں کا ہیرو ہے جو تن تنہا کانگریس کے فاشزم کے خلاف یہ جنگ لڑ رہا ہے۔ پارسی قوم کو مسٹر جناح کی لیڈر شپ پر مکمل اعتماد ہے۔ اور ہم بھی جناح کی فوج میں شامل ہیں۔[1]

لاہور میں اس وقت سر سکندر حیات خاں اور ان کے دونوں مسلمان وزیر میاں عبدالحئ اور ملک خضر حیات ٹوانہ موجود تھے۔ تین مسلمان پارلیمنٹری سیکرٹری اور تین ہی مسلمان پارلیمنٹری پرائیویٹ سیکرٹری بھی لاہور میں موجود تھے۔ نواب شاہنواز خاں والئی ممدوٹ اور میاں رمضان علی بھی اسی لاہور میں تشریف فرما تھے۔ علاوہ ازیں وہ چند منتخب روزگار لوگ بھی لاہور میں براجمان تھے جو آج مضحکہ خیز دعویٰ کرنے سے نہیں ہچکچاتے کہ ۲۳۔ مارچ ۱۹۴۰ء کو قرارداد پاکستان کا مسودہ انہوں نے لکھا تھا۔ لیکن حیرت ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی یہ توفیق نہ ہوئی کہ یوم نجات کے جلسے میں آکر شرکت کرتا۔

کام اس فرقہ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

میں ۲۴۔ دسمبر ۱۹۳۹ء کو گیارہ بجے مسٹر جناح کی خدمت میں ان کے دولت کدے پر حاضر ہوا۔ مسلم لیگ کے ضروری کاغذات کا فائل پہلے سے ان کی میز پر رکھا تھا۔ جسے غالباً وہ پڑھ چکے تھے۔ میں نے صرف چند باتیں زبانی پوچھیں۔ اول یہ کہ پنجاب مسلم لیگ آرگنائزنگ کمیٹی موجود ہے یا ختم ہو گئی؟ فرمایا ۱۵۔ نومبر ۱۹۳۹ء کے بعد ختم ہو گئی۔ دوم یہ کہ اگر ۱۵۔ نومبر ۱۹۳۹ء تک حسب قواعد پنجاب میں کوئی پراونشل مسلم لیگ قائم نہیں ہوئی تو آئندہ آپ کا کیا ارادہ ہے؟ فرمایا اس کا فیصلہ پوری تحقیقات کے بعد کیا جائے گا اور جو کچھ اب

---

۱۔ مسٹر ہومی رستم جی پچھلے دس بارہ سال سے لندن میں مقیم ہیں۔ اور میں جس محلے میں رہتا ہوں اس سے کچھ فاصلے پر ان کا مکان ہے۔ کبھی راستہ چلتے ہوئے سڑک پر یا لائبریری میں ان سے ملاقات ہوتی ہے تو لاہور کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ انہیں ۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کے یوم نجات کا جلسہ اچھی طرح یاد ہے۔ ایک روز ہنس کر کہنے لگے کہ میں صرف ایک دفعہ مسجد کے اندر گیا ہوں اور وہ بھی یوم نجات کے جلسے پر۔ (مصنف)

تک ہو چکا ہے اس کی روشنی میں اگلا قدم اٹھاؤں گا۔ سوم یہ کہ کیا کوئی شخص ۱۵۔ نومبر ۱۹۳۹ء کے بعد پنجاب مسلم لیگ آرگنائزنگ کمیٹی کی طرف سے باضابطہ یا بے ضابطہ خط و کتابت کرنے کا مجاز ہے؟ فرمایا جب آرگنائزنگ کمیٹی ہی ختم ہو چکی ہے تو کون اس کی طرف سے خط و کتابت کرنے کا مجاز ہو سکتا ہے! پھر میں نے عرض کیا کہ کیا آپ اس مضمون کا ایک بیان اخباروں کو دینا پسند فرمائیں گے؟ فرمایا معاملہ صاف ہے۔ بیان کی چنداں ضرورت نہیں۔ عرض کیا کہ مجھے اجازت ہے کہ میں لاہور میں ملک صاحب کو آپ کے اس فیصلے کی اطلاع کر دوں اور یہاں کے اخباروں کو بھی ایک بیان دے دوں؟ فرمایا میرے نزدیک اخباری بیان دینے کی کچھ ایسی ضرورت نہیں۔ البتہ ملک صاحب کو بے شک اطلاع کر دو۔

اس کے بعد پنجاب کے حالات دریافت فرماتے رہے۔ میرے پاس ضروری کاغذات اور اخباروں کے تراشے موجود تھے جو میں نے ان کے ملاحظہ کے لئے پیش کئے۔ واپس ہوٹل میں آکر میں نے ملک صاحب کو عریضہ لکھا جس میں ملاقات کی تفصیل بیان کی اور یہ بھی عرض کیا کہ اگر آپ مناسب خیال کریں تو اخباروں میں اعلان کر دیجئے کہ آرگنائزنگ کمیٹی ۱۵۔ نومبر ۱۹۳۹ء کے بعد ختم ہو گئی ہے۔ لہٰذا کوئی شخص اس کمیٹی کی طرف سے خط و کتابت کرنے کا مجاز نہیں۔

ملک صاحب نے اخباروں میں اعلان بھی کیا اور اٹھارہ آدمیوں کے دستخط سے انگریزی میں ایک مراسلہ چھپوا کر پنجاب کے تمام سرکردہ مسلم لیگیوں کو ڈاک سے بھیج دیا۔ اس مراسلہ کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

لاہور

۳۱۔ دسمبر ۱۹۳۹ء

جناب مکرم! ۱۔ اپریل ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے ایک پینتیس ممبروں کی آرگنائزنگ کمیٹی مقرر کی تھی جس کا فرض یہ تھا کہ اس آئین کے مطابق جو اکتوبر ۱۹۳۷ء میں بمقام لکھنؤ منظور کیا گیا تھا، پنجاب میں ایک پراونشل مسلم لیگ قائم کرے۔ آنریبل وزیراعظم سر سکندر حیات خاں کو اس آرگنائزنگ کمیٹی کا صدر بنایا گیا تھا۔ ان پینتیس ممبروں میں تقریباً ستائیس ممبر ایسے تھے جن کے نام آنریبل وزیراعظم نے تجویز کئے تھے۔ باقی آٹھ

---

انگریزی کا اصل مراسلہ اس کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ درج کیا گیا ہے۔

ممبر اُس پارٹی کے نمائندے تھے جو پنجاب میں پہلے سے مسلم لیگ کی پراونشل شاخ چلا رہی تھی۔ مقصد پیش نظر یہ تھا کہ پنجاب کے اندرونی جھگڑوں کو ختم کر کے اِس صوبے میں آل انڈیا مسلم لیگ کی ایک طاقت ور شاخ قائم کی جائے۔ اُس وقت سے لے کر اب تک آرگنائزنگ کمیٹی نے کچھ کام نہیں کیا۔ چنانچہ جب دسمبر ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس پٹنہ میں ہوا تھا تو ملک برکت علی نے مجلس عاملہ کی میٹنگ میں یہ تحریک کی تھی کہ اِس آرگنائزنگ کمیٹی کو توڑ کر اس کی جگہ نئی آرگنائزنگ کمیٹی قائم کی جائے۔ لیکن آنریبل وزیر اعظم نے اُس وقت بحث وتمحیص کے بعد یہ وعدہ کیا تھا کہ واپس پنجاب جاتے ہی وہ ہر ضلع اور ہر قصبے میں لیگ کی شاخیں قائم کر کے ایک باقاعدہ پراونشل مسلم لیگ کا قیام عمل میں لائیں گے۔ بایں ہمہ اِس سلسلہ میں آج تک کچھ نہیں ہوا۔ پنجاب کے تمام شہروں اور قصبوں کے باشندے دل سے مسلم لیگ کے حامی ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کے ہاں لیگ کی شاخیں قائم کی جائیں۔ لیکن افسوس کہ اِس جذبے کا کچھ فائدہ نہیں اٹھایا گیا، اور اِس کے برعکس ہر جگہ یونینسٹ پارٹی کا پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے۔

۳۰ر مئی ۱۹۳۹ء کو لیگ کی چھ شاخوں کا الحاق کیا گیا تھا۔ ۲۲ر جون ۱۹۳۹ء کو پندرہ اور شاخوں کا الحاق ہوا۔ اِس طرح مسلم لیگ کی کل اکیس شاخیں قائم کی گئیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اِن اکیس میں سے بارہ ڈسٹرکٹ لیگیں ہیں۔ حالانکہ پنجاب کے ضلعوں کی تعداد انتیس ہے۔ ۸۔اگست کو نواب سر شاہنواز خاں ممدوٹ نے اپنے مکان پر چند احباب کو اِس غرض سے مدعو کیا تھا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی تیاری کے سلسلہ میں کچھ مشورہ کیا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ اِس مجلس مشاورت میں چار اور شاخوں ............ کا الحاق کیا گیا ہے۔ حالانکہ اگر ایسا الحاق ہوا بھی ہے تو قطعی خلاف قاعدہ ہے۔ کیونکہ یہ مجلسِ مشاورت نہ آرگنائزنگ کمیٹی تھی اور نہ مسلم لیگ کی شاخوں کا الحاق کرنے والی سب کمیٹی۔ اِس مجلسِ مشاورت میں ضلع اٹک کی بارسوخ اور زبردست مسلم لیگ کے الحاق کی درخواست کو محض اِس لئے مسترد کر دیا گیا تھا کہ آنریبل وزیر اعظم کے ایماء سے ان کے بھتیجے نے وہاں اپنی ایک علیحدہ ڈیڑھ

اینٹ کی مسلم لیگ کھڑی کر لی ہے جو سراسر فرضی اور بوگس ہے۔

آرگنائزنگ کمیٹی کا مسئلہ پھر ایک بار ۲۷۔ اگست ۱۹۳۹ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس منعقدہ دہلی میں زیر بحث آیا جہاں مسٹر عاشق حسین بٹالوی نے یہ قرار داد پیش کی تھی کہ چونکہ آرگنائزنگ کمیٹی اپنا فرض ادا کرنے میں ناکام رہی ہے لہٰذا اسے توڑ دیا جائے۔ تقریباً سارا ایوان اس قرار داد کا حامی تھا اور چاہتا تھا کہ آرگنائزنگ کمیٹی کا یہ ڈھونگ ختم کر دینا چاہئے۔ لیکن بالآخر یہ تجویز منظور کی گئی کہ اگرچہ آرگنائزنگ کمیٹی اپنے فرض کی ادائیگی میں بالکل ناکام رہی ہے، تاہم اسے مزید ڈھائی مہینے کی مہلت دی جائے اور اگر ۱۵۔ نومبر ۱۹۳۹ء تک پنجاب میں ایک باضابطہ پراونشل مسلم لیگ قائم نہ کی جا سکی تو آرگنائزنگ کمیٹی کا وجود خود بخود کالعدم ہو جائے گا۔

یہ قرار داد آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے ۲۷۔ اگست ۱۹۳۹ء کو منظور کی تھی۔ اُس کے بعد سوا دو مہینے کے قریب بالکل خاموشی رہی۔ پھر یکایک ۷۔ نومبر ۱۹۳۹ء کو نواب سرشاہنواز خاں ممدوٹ نے ایک نوٹس جاری کیا کہ آرگنائزنگ کمیٹی کا ایک فوری اجلاس ۸۔ نومبر ۱۹۳۹ء کو ان کے مکان پر ہو گا۔ یہ نوٹس صرف اُن بیس منتخب ممبروں کو بھیجا گیا تھا جو آنریبل وزیر اعظم کے منظور نظر ہیں، حالانکہ آرگنائزنگ کمیٹی کے موجودہ ممبروں کی تعداد چالیس سے کچھ اوپر ہے۔ ممکن ہے اِس ضمن میں یہ عذر پیش کیا جائے کہ اجلاس چونکہ فوری تھا لہٰذا صرف لاہور کے مقامی ارکان ہی کو مدعو کیا جا سکتا تھا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ بہت سے مقامی ممبروں کو عمداً دعوت نامہ نہیں بھیجا گیا تھا جن میں میاں عبدالعزیز بیرسٹرایٹ لاء، مسٹر غلام رسول خاں۔ خلیفہ شجاع الدین۔ ملک برکت علی۔ پیر تاج الدین اور مسٹر عاشق حسین بٹالوی شامل ہیں۔ اور تو اور آرگنائزنگ کمیٹی کے سیکرٹری میاں رمضان علی سے بھی اِس اجلاس کے بارے میں مشورہ نہیں کیا گیا تھا۔ اس اجلاس میں صرف یہ قرار داد منظور کی گئی تھی کہ پنجاب میں ایک صوبہ مسلم لیگ قائم کی جائے ظاہر ہے یہ قرار داد محض ایک دھوکا اور فریب ہے جس سے آل انڈیا مسلم لیگ کی آنکھوں میں مٹی جھونکنا مقصود ہے۔ کیونکہ محض اِس قسم کی ایک رسمی قرار داد سے تو پراونشل مسلم لیگ قائم نہیں ہو سکتی۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے آئین میں یہ واضح طور پر درج ہے کہ کسی صوبے میں پراونشل مسلم لیگ قائم کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اُس صوبے کی تمام ڈسٹرکٹ اور سٹی لیگیں اپنے اپنے نمائندے منتخب کریں۔ کیوں کہ بالآخر یہی نمائندے مجموعی طور پر پراونشل مسلم لیگ کی صورت اختیار کرتے ہیں۔
صورت حال یہ ہے کہ ۸۔ نومبر ۱۹۳۹ء تک پنجاب کی ایک بھی ڈسٹرکٹ یا سٹی لیگ سے یہ نہیں کہا گیا تھا کہ اپنے نمائندوں کا انتخاب کرو۔ آرگنائزنگ کمیٹی نے جو عبوری دستور اپنے لئے وضع کر رکھا ہے اُس کی رو سے یہ لازمی ہے کہ اٹھاون ڈسٹرکٹ اور سٹی لیگیں قائم کی جائیں۔ یہ دستُور بجائے خود حد درجہ ناقص ہونے کے علاوہ اُس دستور سے قطعی مختلف ہے جو آل انڈیا مسلم لیگ نے لکھنؤ میں وضع کیا تھا۔ لیکن اِس چیز سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تو بھی یہ حقیقت مسلم ہے کہ ۸۔ نومبر ۱۹۳۹ء تک صرف اکیس لیگوں کا باضابطہ الحاق ہوا تھا۔ اور اگر اُن چار لیگوں کو بھی شامل کر لیا جائے جن کا الحاق آنریبل وزیراعظم کی دستکاری سے ۸۔ اگست کو اُس جلسے میں ہوا تھا جو محض آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی تیاری کے متعلق مشورہ کرنے کے لئے منعقد کیا گیا تھا تو یہ تعداد پچیس تک پہنچ جاتی ہے۔
آل انڈیا مسلم لیگ کے دستُور کے مطابق ایک پراونشل مسلم لیگ جبھی وجود میں آ سکتی ہے کہ پہلے تمام ڈسٹرکٹ لیگیں اپنے اپنے نمائندے منتخب کریں اور پھر وہ تمام نمائندے جمع ہو کر صوبہ مسلم لیگ کی صورت اختیار کریں۔ پنجاب کی موجودہ حالت یہ ہے کہ آرگنائزنگ کمیٹی نے صرف کاغذی ریزولیوشن منظور کر دیا ہے کہ پراونشل مسلم لیگ قائم کی جائے حالانکہ کسی ڈسٹرکٹ اور سٹی لیگ نے ابھی تک ایک نمائندہ بھی منتخب نہیں کیا۔
اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے اُس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آرگنائزنگ کمیٹی کا وجود ۱۵۔ نومبر ۱۹۳۹ء کو خود بخود ختم ہو گیا تھا۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ میاں رمضان علی کو اِس امر کی ہدایت کی گئی تھی کہ وہ مختلف مسلم لیگوں کو اِس مضمون کے خطوط لکھیں کہ وہ ۱۵۔ دسمبر ۱۹۳۹ء تک اپنے اپنے نمائندے منتخب کریں۔ ان خطوں پر ۱۶۔ نومبر ۱۹۳۹ء کی تاریخ درج ہے۔ جب میاں رمضان علی نے آنریبل وزیراعظم کے ارشاد کی تعمیل میں یہ خطوط لکھے تھے تو

بظاہر یہ حقیقت فراموش کر گئے تھے کہ اُس وقت وہ آرگنائزنگ کمیٹی کے سیکرٹری نہیں تھے کیونکہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کی اس قرار داد کی رو سے جو ۲۷۔اگست ۱۹۳۹ء کو منظور ہوئی تھی، یہ آرگنائزنگ کمیٹی ۱۵۔نومبر ۱۹۳۹ء کو خود بخود کالعدم ہو گئی تھی۔ ہمارے معزز رفیق کار مسٹر عاشق حسین بٹالوی نے جو بالمشافہ مسٹر ایم. اے جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ سے مشورہ کرنے کے لئے بمبئی گئے ہیں۔ ہمیں وہاں سے اطلاع دی ہے کہ مسٹر جناح اِس نقطہ نگاہ سے متفق ہیں۔

## ہماری درخواست

مسلم لیگ کے دوستوں، خیر خواہوں اور ہمدردوں سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اِس بات سے متنبہ رہیں کہ مسٹر رمضان علی نے جو نوٹس جاری کیا ہے کہ ۱۰۔جنوری ۱۹۴۰ء کو بدھ کے روز ایک نام نہاد کونسل کا اجلاس ہو گا وہ قطعی خلافِ قاعدہ اور خلافِ قانون نوٹس ہے۔ لطف یہ ہے کہ ۱۰۔جنوری کو تعطیل بھی نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ۱۰۔جنوری کا دن غالباً رکھا ہی اس واسطے گیا ہے کہ پنجاب کے مختلف اضلاع کے لوگ لاہور نہ آسکیں اور صرف لیجسلیٹو اسمبلی کے یونینسٹ ممبروں کو جمع کر کے ایک میٹنگ کا بہروپ بھر دیا جائے۔ اندریں حالات بہتر یہ ہو گا کہ اِس سلسلہ میں مسٹر ایم. اے جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ کی مزید ہدایات کا انتظار کیا جائے. کیونکہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے ۲۷۔اگست ۱۹۳۹ء کو جو قرار داد منظور کی تھی اس کی رو سے یہ اختیار صرف مسٹر جناح کو ہے کہ چاہیں تو نئی آرگنائزنگ کمیٹی کی تشکیل فرمائیں اور چاہیں تو آل انڈیا مسلم لیگ کے جمہوری دستور کے مطابق پنجاب میں ایک صحیح معنوں میں جان دار مسلم لیگ کی صوبائی شاخ قائم کریں۔

آرگنائزنگ کمیٹی نے جس کا وجود ۱۵۔نومبر کے بعد خود بخود کالعدم ہو گیا تھا۔ جو کانسٹی ٹیوشن وضع کیا ہے۔ وہ حد درجہ قابلِ اعتراض ہے۔ سر مائیکل اوڈوائر کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے اِس کمیٹی نے پنجاب کے مسلمانوں کو شہری اور دیہاتی دو الگ الگ طبقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ آرگنائزنگ کمیٹی اُپنے ناکارہ پن کے باعث خود اپنی موت مر گئی ہے۔ ورنہ

صوبہ پنجاب کو اِس غیر جمہوری آئین کے خلاف سخت جدوجہد کرنا پڑتی جو اِس کمیٹی نے ہم پر مسلّط کرنے کے لئے تیار کیا تھا۔

۱۔ میاں عبدالعزیز بیرسٹرایٹ لاء ایم۔ ایل۔ اے ممبر کونسل آل انڈیا مسلم لیگ۔

۲۔ سیّد محمد رضا ایم۔ ایل۔ اے ممبر کونسل آل انڈیا مسلم لیگ۔

۳۔ خلیفہ شجاع الدین بیرسٹرایٹ لاء ممبر کونسل آل انڈیا مسلم لیگ۔

۴۔ سیّد ولایت حسین ایم۔ ایل۔ اے ممبر کونسل آل انڈیا مسلم لیگ۔

۵۔ غلام رسول خاں، بیرسٹرایٹ لاء ممبر کونسل آل انڈیا مسلم لیگ۔

۶۔ ملک زمان مہدی خاں (ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر) ممبر کونسل آل انڈیا مسلم لیگ۔

۷۔ رب نواز خاں پلیڈر۔ سیکرٹری ڈسٹرکٹ و سٹی مسلم لیگ فیروزپور، ممبر کونسل آل انڈیا مسلم لیگ۔

۸۔ پیرزادہ محمد ذکاء اللہ صدر ڈسٹرکٹ مسلم لیگ شملہ ممبر کونسل آل انڈیا مسلم لیگ۔

۹۔ شیخ ظہیر الاسلام صدر مسلم لیگ شاہ آباد ضلع کرنال۔

۱۰۔ ملک برکت علی ایم۔ ایل۔ اے ممبر ورکنگ کمیٹی و ممبر کونسل آل انڈیا مسلم لیگ۔

۱۱۔ میاں نُور اللہ ایم۔ ایل۔ اے ممبر کونسل آل انڈیا مسلم لیگ۔

۱۲۔ عاشق حسین بٹالوی۔ ممبر کونسل آل انڈیا مسلم لیگ۔

۱۳۔ پیر تاج الدّین، بیرسٹرایٹ لاء ممبر کونسل آل انڈیا مسلم لیگ۔

۱۴۔ خواجہ نذر محمد، بیرسٹرایٹ لاء ممبر کونسل آل انڈیا مسلم لیگ۔

۱۵۔ میاں عبدالحمید، بیرسٹرایٹ لاء ممبر کونسل آل انڈیا مسلم لیگ۔

۱۶۔ شیخ ظفر علی، پلیڈر و میونسپل کمشنر منٹگمری ممبر کونسل آل انڈیا مسلم لیگ۔

۱۷۔ سید میر احمد شاہ پلیڈر، اٹک ممبر کونسل آل انڈیا مسلم لیگ۔

۱۸۔ شیخ محمد امین ایڈووکیٹ۔ سیکرٹری ڈسٹرکٹ مسلم لیگ، جھنگ۔

# جناح اور نہرو کی خط و کتابت

جب وائسرائے نے اکتوبر ۱۹۳۹ء کے پہلے ہفتے میں جنگ کے بارے میں مختلف لیڈروں سے دہلی میں ملاقاتیں کی تھیں تو مسٹر جناح اور پنڈت نہرو بھی اس سلسلہ میں وہیں موجود تھے۔ چنانچہ پنڈت جی اور مسٹر جناح میں ایک الگ ملاقات ہوئی تھی۔ اور گفتگو بیشتر اس مسئلہ پر ہوتی رہی کہ کوئی ایسی صورت پیدا کی جائے جس سے کانگرس اور مسلم لیگ متحد ہو کر برطانوی حکومت سے سیاسی مراعات کا مطالبہ کر سکیں۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ دسمبر میں جب مسٹر جناح بمبئی میں ہوں گے تو پنڈت نہرو مزید گفتگو کے لئے وہاں ان سے ملاقات کریں گے۔

یوم نجات کے بعد پنڈت جی نے جگہ جگہ مسلم لیگ اور مسٹر جناح کے خلاف حد درجہ قابل اعتراض تقریریں کرنا شروع کیں۔ کہیں جا کر یہ کہا کہ مسلم لیگ ملک میں برطانوی تسلط قائم رکھنے کی خواہاں ہے۔ کہیں یہ کہا کہ مسٹر جناح برطانوی اقتدار کے حامی ہیں اور کہیں جا کر یہ فرمایا کہ جب تک مسلم لیگ اپنا رویہ نہیں بدلتی کانگرس اس سے فرقہ وارانہ مفاہمت کی گفت و شنید پر کبھی تیار نہیں ہو گی۔

دسمبر کی آخری تاریخوں میں پنڈت جی لاہور تشریف لائے اور یہاں بھی انہوں نے اسی قسم کی متعدد تقریریں کی تھیں۔ امرتسر کے جلیانوالے باغ میں انہوں نے ۳۱۔ دسمبر ۱۹۳۹ء کو تقریر کی تھی جس کے دوران میں کسی شخص نے پوچھا کہ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ آپ صوبوں میں مسلم لیگ کے ساتھ کولیشن وزارتیں بنا لیتے۔ پنڈت جی نے بہت برہم ہو کر فرمایا۔ ہرگز نہیں! ایسی وزارتیں ایک دن نہ چل سکتیں اور ملک بھر میں فساد ہو جاتا۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ پنڈت نہرو آج بھی اسی دنیا میں آباد تھے جو انہوں نے جولائی ۱۹۳۷ء میں اپنے لئے وضع کی تھی۔ اور بدستور ان کا یہی عقیدہ تھا کہ کانگرس مسلمانوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ یوپی میں رفیع احمد قدوائی۔ بمبئی میں یٰسین نوری۔ سی پی میں یوسف

شریف، بہار میں ڈاکٹر سید محمود اور مدراس میں سیٹھ یعقوب حسن کو انہوں نے اس دعوے سے وزارتوں کے منصب پر بٹھا دیا تھا کہ یہ لوگ مسلمانوں کے نمائندے ہیں۔ پنڈت جی کی اس حرکت سے ہندوستان میں آگ لگ گئی تھی۔ اور مسلمانوں نے احتجاج کیا تھا کہ یہ وزیر کانگرس کے نامزد کئے ہوئے اہل کار ہیں۔ مسلمانوں کے نمائندہ وزیر ہرگز نہیں۔ پس یہ تھی ابتدا کانگرس کے اس فاشی طرز حکومت کی جس کے خلاف مسلمان گزشتہ ڈھائی سال سے واویلا کر رہے تھے۔ لیکن تعجب ہے کہ پنڈت نہرو ۳۱۔ دسمبر ۱۹۳۹ء کو بھی اپنے عقیدے سے ایک انچ ادھر ادھر ہٹنے کو تیار نہ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۲۔ دسمبر کے یوم نجات نے پنڈت جی کے اس دعوے کا ایک ایسا زبردست جواب دیا تھا جس سے یہ حقیقت الم نشرح ہو گئی تھی کہ کانگرس ہرگز مسلمانوں کی نمائندگی نہیں کرتی۔

پنڈت جی کی ان تقریروں کے جواب میں مسٹر جناح نے یہی مناسب خیال کیا کہ وہ خط و کتابت شائع کر دی جائے جو اکتوبر ۱۹۳۹ء کے بعد دونوں کے درمیان ہوئی تھی تاکہ واقعات کی صحیح تصویر سب کے سامنے آ جائے۔ چنانچہ انہوں نے ۷۔ جنوری ۱۹۴۰ء کو چند تمہیدی سطروں کے ساتھ ذیل کی مراسلت اخباروں کے حوالے کر دی۔

"سخت افسوس ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے حال ہی میں پنجاب اور دوسرے مقامات کا دورہ کرتے وقت مجھ پر ایسے ناروا حملے کئے ہیں جو کسی ذمہ دار لیڈر کے ہرگز شایان شان نہیں ہو سکتے انہوں نے مجھ پر یہ الزام لگایا ہے کہ میں ہندوستان میں انگریزی راج کو برقرار رکھنے پر تلا ہوا ہوں۔ پنڈت جی کا یہ الزام بے بنیاد ہی نہیں بلکہ شرافت سے گرا ہوا بھی ہے۔ میرے اور ان کے درمیان جو مذاکرات ہونے والے تھے ان سے انکار کر دینے کی جو وجوہ انہوں نے بیان کی ہیں وہ غلط اور گمراہ کن ہونے کے علاوہ حقیقت سے دور کا تعلق بھی نہیں رکھتیں۔

میں ان کے غیر ذمہ دارانہ بیانات پر مزید کچھ کہنا سننا پسند نہیں کرتا البتہ اس خط و کتابت کو جو ہمارے درمیان ہوئی ہے اخباروں کے حوالے کر رہا ہوں جس سے صاف معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے باہمی مذاکرات کو طول نہ دینے کے اصل اسباب کیا تھے۔ اس کے علاوہ پبلک پر یہ حقیقت بھی منکشف ہو جائے گی کہ پنڈت جی نے اور کانگرس نے جو روش اختیار کر رکھی ہے وہ کس حد تک ناممکن العمل ہے"۔

نہرو

الٰہ آباد

یکم دسمبر ۱۹۳۹ء

مائی ڈیئر جناح! ہم جب پچھلی مرتبہ دہلی میں ملے تھے تو یہ طے ہوا تھا کہ آئندہ بھی ملاقات ہو گی تاکہ فرقہ وارانہ مسئلے پر مزید بحث و تمحیص ہو سکے۔ آپ نے کہا تھا کہ واپس بمبئی جا کر مجھے اطلاع دیں گے کہ ملاقات کی کون سی تاریخ مقرر کی جا سکتی ہے۔ میں اس وقت سے آپ کے خط کا انتظار کر رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ جو تاریخ آپ کو منظور ہو گی مجھے اس سے مہربانی فرما کر مطلع کریں گے۔

سر سٹیفرڈ کرپس[1] بہت جلد ہندوستان آنے والے ہیں اور دو تین ہفتے یہاں قیام کریں گے۔ مجھے ان کے یہاں پہنچنے کی صحیح تاریخ کا ابھی علم نہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ ہفتہ عشرہ میں آ جائیں گے۔ اگر ممکن ہوا تو آپ سے وہ ضرور ملیں گے۔ مجھے ان کا پروگرام معلوم نہیں اور یہ بھی نہیں معلوم کہ کس کس شہر کا دورہ کریں گے۔ بہرحال میرا خیال ہے کہ بمبئی ضرور جائیں گے۔ ازراہ کرم مجھے ضرور اطلاع دیجئے گا کہ کیا آپ اس مہینے کے تیسرے ہفتے کے لگ بھگ یا کچھ دن بعد تک بمبئی ہی میں ہوں گے؟ اس طرح سر سٹیفرڈ کرپس کو اپنا پروگرام مرتب کرنے میں بہت کچھ آسانی ہو گی۔ وہ ہوائی جہاز سے آ رہے ہیں اور سیدھے الٰہ آباد پہنچیں گے۔

آپ کا مخلص

جواہر لال نہرو

---

جناح

بمبئی۔ ۴۔ دسمبر ۱۹۳۹ء

مائی ڈیئر جواہر! آپ کے یکم دسمبر کے خط کا شکریہ۔ میں آئندہ دو تین ہفتے بمبئی ہی میں ٹھہروں گا۔ اگر آپ کو ان دنوں یہاں آنے کی سہولت ہو تو جو تاریخ آپ کو منظور ہو گی میں اس روز آپ سے ملنے کو بخوشی تیار ہوں۔ مہربانی فرما کر مجھے اطلاع دیجئے گا کہ کس تاریخ کو اور کتنے

---

[1] Sir Stafford Cripps

بجے آپ تشریف لا سکیں گے۔

مجھے بھی سر سٹیفر ڈ کرپس کا خط موصول ہوا تھا اور میں نے ان کی ہدایت کے مطابق آپ کی معرفت انہیں جواب بھیج دیا ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے میں آئندہ دو تین ہفتے بمبئی ہی میں ٹھہرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

سر سٹیفر ڈ کرپس کے خط سے معلوم ہوا ہے کہ وہ ۸۔ کو الہ آباد پہنچیں گے۔ جب وہ بمبئی آئیں گے میں بخوشی ان سے ملاقات کے لئے حاضر ہوں۔ جونہی ان کا جواب آیا میں ان کی سہولت کے مطابق ملاقات کی صحیح تاریخ اور وقت کا تعین کر سکوں گا۔

آپ کا مخلص

ایم۔ اے جناح

---

نہرو

الہ آباد

۹۔ دسمبر ۱۹۳۹ء

مائی ڈیئر جناح! دو روز ہوئے میں نے آپ کو لکھا تھا کہ میں بمبئی آ رہا ہوں۔ اور وہاں آپ سے ملاقات ہو گی۔ کل صبح میں نے اخباروں میں آپ کا بیان پڑھا ہے، جس میں آپ نے اعلان کیا ہے کہ ۲۲۔ دسمبر کو اس خوشی میں یوم نجات اور یوم تشکر منایا جائے گا کہ آخر کار ہندوستان کے ان صوبوں میں جہاں کانگرس کی حکومت تھی کانگرسی راج کا خاتمہ ہوا ہے۔ میں نے یہ بیان بار بار پڑھا ہے۔ اور پورے چوبیس گھنٹے اس پر غور کرتا رہا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ اپنے اس خط میں آپ کے بیان کے جملہ پہلوؤں پر کسی بحث کا دروازہ کھولوں۔ آپ میرے خیالات و عقائد سے واقف ہیں کہ میں کس طرح ہمیشہ صداقت کی تلاش میں رہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میرا اندازہ غلط ہو۔ لیکن میں نے مزید روشنی کے حصول میں اپنی کوششوں میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ ہر چند کہ وہ روشنی مجھے حاصل نہیں ہوئی۔

جس چیز نے کل سے مجھے سخت پریشان کر رکھا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے درمیان اقدار کی قیمت اور زندگی کی غرض و غایت کا باہمی اختلاف کس حد تک بڑھ چکا ہے۔ میرے اور آپ کے درمیان جو گفتگو گزشتہ ملاقاتوں میں ہوئی تھی۔ میں نے اس کے بعد یہ محسوس کیا تھا کہ ہمارا اختلاف کچھ زیادہ شدید نہیں۔ لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ اس خلیج کا پاٹ پہلے سے کہیں زیادہ

وسیع ہو گیا ہے۔ اندریں حالات میں حیران ہوں کہ اگر ہم دوبارہ ملے بھی اور ان امور پر جو اس وقت درپیش ہیں تبادلہ خیالات کیا بھی تو حاصل کیا ہو گا۔ جب دو افراد کسی مسئلہ پر غور و فکر کرنے کے لئے ایک جگہ بیٹھتے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ بحث کا کوئی مشترکہ موضوع ہو اور ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس بحث سے نتائج حاصل کرنے کے لئے کوئی مشترکہ مقصد سامنے ہو۔ میرا فرض ہے کہ یہ مشکل اپنے سامنے بھی رکھوں اور آپ کی خدمت میں بھی پیش کروں۔

آپ نے دہلی میں ایک خط مجھے دکھایا تھا جو آپ کو بجنور سے موصول ہوا تھا۔ میں نے اس معاملہ کی تحقیقات کی ہے۔ اور میری معلومات کے مطابق جو واقعات اس خط میں درج ہیں وہ درست نہیں۔ اگر آپ اصل حقیقت دریافت کرنا چاہیں تو میں آپ کی تشفی کے لئے بجنور سے پوری تفصیل منگوا سکتا ہوں۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ اس خط کی جو آپ نے مجھے دہلی میں دکھایا تھا۔ ایک نقل عنایت کریں۔

آپ کا مخلص

جواہر لال نہرو

---

جناح

بمبئی

۱۳ر دسمبر ۱۹۳۹ء

ڈیئر جواہر لال نہرو! آپ کا ۹ر دسمبر کا خط ملا۔ اخباروں سے معلوم ہوا ہے کہ آپ دورہ کر رہے ہیں۔ اس لئے میں حیران ہوں کہ آپ کو کس پتے سے جواب بھیجوں۔ تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ آپ ۱۴ر دسمبر کو بمبئی پہنچ رہے ہیں۔ لہٰذا یہ عریضہ بمبئی کے پتے سے ارسال کر رہا ہوں مجھے آپ سے اتفاق ہے کہ "یہ ضروری ہے کہ بحث کا کوئی مشترکہ موضوع ہو اور ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس بحث سے نتائج حاصل کرنے کے لئے کوئی مشترکہ مقصد سامنے ہو"۔ یہی وجہ ہے کہ جب گزشتہ اکتوبر میں مجھے آپ سے اور مسٹر گاندھی سے دہلی میں ملنے کا اتفاق ہوا تھا تو میں نے کہا تھا کہ جب تک کانگرس مسلم لیگ کو ہندوستان کے مسلمانوں کی تنہا نمائندہ جماعت تسلیم نہیں کرتی اس وقت تک ہندو مسلم تصفیے کی گفتگو کا جاری رکھنا ناممکن ہے۔ کیونکہ آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے یہ بنیادی شرط طے کر رکھی ہے۔ دوسری

بات یہ ہے کہ کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے ریزولیوشن میں جس قسم کے اعلان کا مطالبہ کیا ہے۔ اور جس کی تائید آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے اپنے ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۹ء کے ریزولیوشن میں کی تھی ہم ہرگز اس کی حمایت نہیں کر سکتے۔ قطع نظر اس سے کہ کانگرس کا یہ ریزولیوشن الجھا ہوا اور ناقابل عمل ہے۔ یہ ضروری ہے کہ پہلے ہم اقلیتوں کے بارے میں کوئی باہمی سمجھوتہ کریں۔ مسلم لیگ وائسرائے کے بیان سے بھی مطمئن نہیں۔

اگر ہم خوش قسمتی سے ہندو مسلم مسئلے کا کوئی حل تلاش کر لیں تو پھر متحد ہو کر برطانوی حکومت سے ایسے اعلان کا مطالبہ کیا جا سکے گا جو ہمیں مطمئن کر سکے۔ مسٹر گاندھی نے اور آپ نے میری یہ دونوں تجویزیں قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ تاہم آپ نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ آپ مجھ سے دوبارہ بھی ملنا پسند فرمائیں گے۔ میں نے جواب میں عرض کیا تھا کہ جب آپ چاہیں میں ملاقات کرنے کو حاضر ہوں۔ آپ نے اپنے یکم دسمبر کے خط میں بھی مجھ سے بمبئی میں ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا تو میں نے اطلاع دی تھی کہ دسمبر کے تیسرے ہفتے تک میں بمبئی ہی میں قیام کروں گا۔ اور اس دوران میں آپ جب چاہیں تشریف لا کر مل سکتے ہیں۔ میں مکرر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ اس مسئلہ پر مزید گفت و شنید کرنے پر آمادہ ہیں تو میں حاضر ہوں۔

بجنور والے واقعہ کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے میں اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے لئے لازم ہے کہ کسی خاص نتیجے پر پہنچنے سے پہلے مکمل عدالتی تحقیقات کرائی جائے۔ مزید بر آں تنہا ایک واقعہ لے کر اس کی چھان پھٹک کرنا بے معنی سی بات ہے۔ میرے نزدیک ضروری یہ ہے کہ ایک رائل کمیشن مقرر ہونا چاہئے جو اس بات کی نہایت جامع و مانع تحقیقات کرے کہ کانسٹی ٹیوشن کو جس طرح معرض عمل میں لایا گیا ہے وہ کہاں تک قابلِ اعتراض ہے، اور ہمیں کانگرسی حکومتوں کے خلاف کیا کیا شکائتیں ہیں!

آپ کا مخلص

ایم۔ اے جناح

---

نہرو

بمبئی۔ ۱۴۔ دسمبر

مائی ڈیئر جناح۔ ۱۳۔ دسمبر کے خط کا شکریہ قبول کیجئے جو مجھے آج دوپہر کو یہاں پہنچنے پر

دیا گیا۔ میں نے پچھلا خط الہٰ آباد سے آپ کا وہ بیان پڑھ کر لکھا تھا جس میں آپ نے مسلمانوں سے درخواست کی تھی کہ کانگرسی حکومتوں کے ختم ہونے پر "یوم نجات و تشکر" منائیں۔ مجھے یہ بیان پڑھ کر سخت تکلیف ہوئی تھی کہ اب سیاسی مسائل کے بارے میں ہمارے باہمی اختلاف کی خلیج کس حد تک وسیع ہو چکی ہے۔ اسی بنیادی اختلاف کے پیش نظر میں نے محسوس کیا تھا کہ ہمارے مذاکرات کے لئے کوئی مشترکہ زمین باقی نہیں رہی۔ چنانچہ یہی مشکل میں نے آپ سے بیان کی تھی اور وہ مشکل بدستور موجود ہے۔

آپ نے اپنے خط میں دو اور شرطیں پیش کی ہیں جنہیں قبول کئے بغیر باہمی گفت و شنید کا دروازہ نہیں کھل سکتا۔ اول یہ کہ کانگرس مسلم لیگ کو مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کرے۔ گذارش یہ ہے کہ کانگرس نے ہمیشہ لیگ کو مسلمانوں کی ایک اہم اور ذمہ دار جماعت تسلیم کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم شدت سے خواہش مند ہیں کہ اپنے باہمی اختلافات رفع کئے جائیں۔ بظاہر آپ چاہتے یہ ہیں کہ ہم اس سے بھی آگے جا کر یہ کریں کہ ان مسلمانوں سے قطع تعلق کرلیں۔ جو مسلم لیگ کے تو ممبر نہیں لیکن ہمارے نہایت دیرینہ اور مخلص رفقائے کار ہیں۔ لیگ کے علاوہ مسلمانوں کی اور بھی بہت سی جماعتیں موجود ہیں۔ مثلاً جمعیت العلماء۔ آل انڈیا شیعہ کانفرنس۔ مجلس احرار۔ آل انڈیا مومن کانفرنس وغیرہ۔ ٹریڈ یونین اور کسان سبھا جیسے اداروں میں بھی بہت سے مسلمان شامل ہیں۔ عملی طور پر ان میں سے اکثر جماعتوں اور افراد نے وہی پروگرام اختیار کیا ہے جو کانگرس کا ہے۔ ہم کیونکر ان جماعتوں کے وجود سے انکار کر سکتے ہیں یا ان سے اپنا تعلق منقطع کرنے پر تیار ہو سکتے ہیں۔

آپ نے اکثر موقعوں پر یہ کہا ہے اور بجا کہا ہے کہ کانگرس ہندوستان کے ہر شخص کی نمائندگی نہیں کرتی۔ کانگرس واقعی ان لوگوں کی نمائندگی نہیں کرتی جو اس کے پروگرام سے متفق نہیں۔ خواہ ان میں ہندو ہوں یا مسلمان۔ بالآخر یہی کہنا پڑے گا کہ کانگرس صرف اپنے ممبروں اور ہمدردوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ جیسے مسلم لیگ یا کسی اور جماعت کے بارے میں بھی یہی کہا جائے گا کہ وہ صرف اپنے ممبروں اور ہوا خواہوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ لیکن کانگرس اور لیگ میں اہم ترین فرق یہ ہے کہ در آں حالیکہ کانگرس کی رکنیت کا دروازہ ہر اس شخص کے لئے کھلا ہے جو کانگرس کے اغراض و مقاصد اور طریق کار سے اتفاق کرتا ہے۔ لیگ کی رکنیت صرف مسلمانوں تک محدود ہے۔ پس آئینی لحاظ سے کانگرس کی بنیاد قوم پرستی (نیشنلزم) ہے، جسے اگر کانگرس ترک کر دے تو اس کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔ آپ کو

معلوم ہے کہ بہت سے ہندو ایسے ہیں جو ہندو مہاسبھا کے ممبر ہیں اور نہیں چاہتے کہ کانگرس ہندوؤں کی نمائندگی کا دعویٰ کرے۔ اسی طرح سکھ ہیں۔ اور بھی بہت سے لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ فرقہ وارانہ مسائل پر ان کی رائے تسلیم کی جائے۔

اندریں حالات، مجھے افسوس ہے کہ ہم آپ کا مطالبہ قبول نہیں کر سکتے کہ تمام دیگر جماعتوں کو پس پشت ڈال کر صرف مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کر لیں۔ یہی کیفیت کانگرس کی بھی ہے کہ اپنے وسیع نظام کے باوجود ہم اس کے لئے اس قسم کا دعویٰ ہرگز نہیں کر سکتے۔ بااین ہمہ میں آپ سے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جب دو جماعتوں میں مشترک دلچسپی رکھنے والے امور پر گفت و شنید ہوتی ہے تو اس قسم کے سوال رخنہ انداز نہیں ہونے چاہئیں۔

دوسرا نکتہ آپ نے یہ اٹھایا ہے کہ کانگرس نے برطانوی حکومت سے جس اعلان کا مطالبہ کیا ہے، مسلم لیگ اس کی حمایت نہیں کر سکتی۔ یہ امر واقعی افسوس ناک ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے، کہ فرقہ وارانہ مسائل کے باہمی اختلاف کے علاوہ سیاسی مسائل میں بھی ہم آپس میں متفق نہیں ہیں۔ کانگرس نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ برطانوی حکومت سے صرف یہ مطالبہ کیا ہے کہ وہ بتائے کہ اس جنگ میں شامل ہونے سے اس کا مدعا و مقصود کیا ہے۔ دوم یہ کہ ہندوستان کی آزادی کا اعلان کرے اور سوم یہ کہ اس بات کا اعلان کرے کہ ہندوستان کے باشندوں کو یہ حق حاصل ہے کہ بغیر کسی خارجی دخل اندازی کے خود اپنا کانسٹی ٹیوشن وضع کر سکیں۔ اگر مسلم لیگ کو ان باتوں سے اتفاق نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا سیاسی نصب العین قطعی ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ کانگرس کا یہ کوئی نیا مطالبہ نہیں بلکہ کانگرس کے آئین کی شق اول میں درج ہے۔ اور گزشتہ کئی سال سے ہم جس پالیسی پر عمل پیرا ہیں وہ بھی اسی پر قائم ہے۔ میں حیران ہوں کہ کانگرس کیونکر اس سے دست بردار ہو سکتی یا پھر بحد آخر اسے تبدیل کر سکتی ہے۔ اگر آپ میری ذاتی رائے پوچھیں تو میں ہرگز اس میں کسی تبدیلی کا روادار نہیں۔ یہ کسی شخص کا ذاتی سوال نہیں بلکہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا باقاعدہ ایک ریزولیوشن ہے جس کی تائید ہندوستان کے گوشے گوشے میں کی جا چکی ہے میں اس بارے میں بالکل بے بس ہوں۔

ظاہر ہے کہ سیاسی نقطہ نگاہ سے ہمارے درمیان کوئی قدر مشترک باقی نہیں اور ہمارے نصب العین بھی الگ الگ ہیں۔ لہٰذا اب کسی قسم کا بحث مباحثہ بالکل بے سود ہے۔ پچھلا خط جو میں نے آپ کی خدمت میں لکھا تھا وہ آپ کے اس اخباری بیان سے متعلق تھا جس میں آپ نے

مسلمانوں کو تاکید کی تھی کہ کانگرسی حکومتیں ختم ہونے پر یوم نجات منائیں ۔ آپ کے اس بیان سے بہت سے اہم اور دور رس نتائج پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں لیکن جن سے ہم سب متاثر ہوں گے۔ ایک طرف یوم نجات منانا اور دوسری طرف فرقہ وارانہ مسائل حل کرنے کی سعی کرنا۔ یہ دونوں چیزیں کیونکر ایک دوسرے سے منطبق کی جا سکتی ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان حالات میں اور اس پس منظر میں ہماری ملاقات کوئی معقول نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی۔ تاہم میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم فرقہ وارانہ مسائل کے تصفیے کی خاطر آپ سے ملنے اور کھلے دل سے تبادلہ خیال کرنے کو ہر وقت تیار ہیں۔

بجنور والے واقعہ کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے میں اسے پڑھ کر سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ یک طرفہ الزام عائد کئے جاتے ہیں جن کی نہ تحقیق و تفتیش ہوتی ہے اور نہ تصفیہ کیا جاتا ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ شکوے شکایتوں کا دفتر کھولنا تو آسان ہے لیکن بغیر تحقیق و تفتیش کے ان پر انحصار کر لینا خطرے سے خالی نہیں۔

آپ مخلص

جواہر لال نہرو

جناح

بمبئی۔ ۱۵۔ دسمبر ۱۹۳۹ء

ڈیئر جواہر لال۔ آپ کا خط محررہ ۱۴۔ دسمبر ۱۹۳۹ء ملا۔ افسوس ہے کہ آپ نے دوسرے نکتے کے متعلق مری پوزیشن کا صحیح اندازہ نہیں کیا۔ میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ کانگرس نے برطانوی حکومت سے جس اعلان کا مطالبہ کیا ہے، مسلم لیگ اس کی حمایت نہیں کر سکتی۔ میں نے تو یہ کہا تھا کہ ہم کانگرس کے اس مطالبے کی حمایت نہیں کر سکتے جو ورکنگ کمیٹی کے ریزولیوشن میں درج ہے اور جس کی تائید آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے ۱۰۔اکتوبر ۱۹۳۹ء کو کی تھی۔ اس کی وجوہ میں اپنے خط میں لکھ چکا ہوں۔

اگر کانگرس کے اس ریزولیوشن میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں ہو سکتا، جیسا کہ خود آپ

نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ آپ کسی نوع کی تبدیلی گوارا نہیں کر سکتے۔ اور جبکہ یہ بھی آپ واضح الفاظ میں لکھتے ہیں کہ آپ مسلم لیگ کو مسلمانان ہند کی مستند اور نمائندہ جماعت تسلیم کرنے کو تیار نہیں تو پھر بتایئے کہ ان حالات میں آپ مجھ سے کیا توقع رکھتے ہیں کہ میں کیا کروں اور مجھے کیا کرنا چاہئے!

آپ کا مخلص

ایم۔ اے جناح

---

نہرو

بمبئی۔ ۱۷۔ دسمبر ۱۹۳۹ء

ڈیئر جناح۔ آپ کے ۱۵۔ دسمبر کے خط کا شکریہ۔ جس اختلاف کا آپ نے ذکر کیا ہے میں اسے سمجھتا ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ مسلم لیگ اعلان کے مطالبے کی مخالفت نہیں کر سکتی۔ کانگرس کا مطالبہ یہ ہے کہ جنگ کے اغراض و مقاصد کی وضاحت کی جائے۔ ہندوستان کی آزادی تسلیم کی جائے۔ اور یہاں کے باشندوں کا یہ حق مانا جائے کہ وہ اپنا دستور وضع کرنے کے مختار ہیں حقیقت یہ ہے کہ وضع دستور کا یہ حق دراصل آزادی کا جزو لاینفک ہے۔ یہ بنیادی اصول ہیں جو ہمارے مطمح نظر یعنی حصول آزادی سے خود بخود پیدا ہوتے ہیں۔ چونکہ مسلم لیگ کا مطمح نظر بھی یہی ہے۔ اس لئے بظاہر دونوں جماعتوں میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہونا چاہئے۔ یہ صحیح ہے کہ جب ان اصولوں کو معرض عمل میں لانے کا وقت آئے گا تو بہت سے اہم امور بھی زیر غور آئیں گے۔ لیکن جہاں تک بنیادی مطالبات کا تعلق ہے۔ یہ اصول ہندوستانی نیشنلزم کا لب لباب ہیں جنہیں ترک کرنے یا جن میں بہت کچھ رد و بدل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم گویا اپنے ہاتھوں سے اپنی آزادی کو فنا کر دیں گے۔

جنگ کے بارے میں بھی کانگرس گزشتہ گیارہ سال میں بار بار اپنی پالیسی کی وضاحت کر چکی ہے۔ ہمارا موجودہ اعلان اسی پالیسی کا منطقی نتیجہ ہے۔ اس پالیسی کی تشکیل میں ذاتی طور پر میرا بھی حصہ ہے۔ چنانچہ میں اس کو بہت کچھ اہمیت دیتا ہوں۔ آپ محسوس کریں گے کہ پسند یا ناپسند کے سوال سے قطع نظر ایسی پرانی اور محکم پالیسی کو بدلنا بے حد مشکل ہے۔ یہ پالیسی حقیقتاً سیاسی ہے۔ اور میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ ہندوستان کے مطالبہ آزادی سے صرف یہی ایک پالیسی پیدا ہو سکتی ہے۔ جزئیات و تفصیلات پر غور و فکر اور بحث ہو

سکتی ہے۔ اور باہمی مشورے سے ان پر عمل در آمد بھی ہو گا۔ اس کے علاوہ اقلیت اور دوسرے گروہوں کے مفاد کی نگہداشت بھی کی جائے گی۔ لیکن اس اعلان کی بنیاد ہی سے انکار کر دیا جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ ہماری پالیسی اور ہمارے سیاسی نقطہ نگاہ میں سخت اختلاف ہے۔ بحیثیت موجودہ اس کا ہندو مسلم مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہم دونوں کے سیاسی مدعا و مقصود میں کوئی چیز بھی مشترک نہیں۔

میں ایک بار پھر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہماری جماعت کا کوئی شخص مسلم لیگ کی اہمیت طاقت اور اثر و رسوخ سے انکار نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم لیگ سے گفت و شنید کرنے اور ان مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے بےتاب ہیں جن کا ہمیں اس وقت سامنا ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ مختلف شرائط کی صورت میں اس قسم کی مشکلات سد راہ بن جاتی ہیں کہ ہم ان مسائل کی بحث کا آغاز بھی نہیں کر پاتے۔ یہ شرائط جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں نہایت دور رس اہمیت کی حامل ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ شرطیں کیوں ہمارا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ میرے نزدیک یہ چنداں مشکل نہیں کہ ان شرطوں کو راستے سے ہٹا کر ہم براہ راست اصل معاملہ کو سلجھانے کی کوشش کریں۔ لیکن دقت یہ ہے کہ مشکلات اپنی جگہ سے ہٹنے کا نام نہیں لیتیں۔ اور ان میں مزید اضافہ بھی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ میں تو یہ خیال کرنے پر مجبور ہوں کہ اصل رکاوٹ ہمارے سیاسی نقطہ نگاہ اور مطمح نظر کا اختلاف ہے۔

آپ نے اب جو یہ اعلان کر دیا ہے کہ ۲۲۔ دسمبر کو ہندوستان بھر میں جلسے کئے جائیں۔ اس سے ایک ایسی نفسیاتی الجھن پیدا ہو گئی ہے جس کی موجودگی میں کوئی باہمی افہام و تفہیم ممکن نہیں۔ مجھے اس صورت حال سے سخت رنج ہو رہا ہے۔ کاش آپ اس الجھن کو، جس سے سوائے کدورت اور بدمزگی کے اور کچھ پیدا نہیں ہو گا، رفع کر سکیں۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں فرقہ وارانہ مصالحت کے لئے اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کروں گا۔ لیکن مجھے اس سلسلہ میں یہ کبھی گوارا نہیں کہ اپنی عزت نفس قربان کر دوں یا آپ سے کسی قسم کی قربانی کرنے کو کہوں۔ میرے سیاسی عقائد نہایت پختہ ہیں اور ان عقائد کی خاطر میں نے ہر قسم کی تنگی ترشی برداشت کی ہے۔ میں کبھی ان سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں چہ جائیکہ آج جب کہ دنیا گویا آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر کھڑی ہے۔

آپ کا مخلص

جواہر لال نہرو

جن لوگوں نے جناح اور نہرو کی وہ خط و کتابت پڑھی ہے جو ۱۹۳۸ء میں دونوں کے درمیان ہوئی تھی۔ ا، انہیں مذکورہ بالا خطوط پڑھ کر کچھ تعجب نہیں ہوا ہو گا۔ بنیادی نکتہ یہ تھا کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور کانگرس کو لیگ کی یہ حیثیت تسلیم کر کے اس سے کسی قسم کی گفت و شنید کا آغاز کرنا چاہئے۔ پنڈت نہرو اس حقیقت سے اغماض کر رہے تھے۔

پنڈت جی نے ۳۰ دسمبر ۱۹۳۹ء کو لاہور میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

"ہمارا جھگڑا صرف مسلم لیگ سے ہے۔ مسلمانوں کی دوسری سیاسی جماعتوں سے ہمیں کوئی پرخاش نہیں۔ مثلاً مجلس احرار سے کانگرس کا کوئی اختلاف نہیں۔ احرار نے ماضی میں ہمیشہ کانگرس سے تعاون کیا ہے۔ اور آئندہ بھی یہ تعاون جاری رہے گا۔"

گزارش یہ ہے کہ مجلس احرار اگست ۱۹۳۱ء میں قائم ہوئی تھی۔ اور اس کے سیاسی پروگرام کی بنیادی شق یہ تھی کہ مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب کا حق قائم رہنا ضروری ہے۔ کانگرس اصولاً جداگانہ انتخاب کی مخالف اور مخلوط انتخاب کی حامی تھی۔ کانگرس کا دعویٰ یہ تھا کہ صحیح قوم پرستی (نیشنلزم) کا تقاضا یہ ہے کہ فرقہ وارانہ جماعتوں کو توڑ کر ہندوستان کے تمام باشندے کانگرس میں شامل ہو جائیں۔ مجلس احرار اسلام محض ایک فرقے یعنی مسلمانوں کی جماعت تھی، جس کا وجود ہی کانگرس کے ادعائے قوم پرستی (نیشنلزم) کی نفی کرتا تھا۔ اور مجلس احرار کے لیڈر اپنی جماعت کو توڑ کر کانگرس میں جذب ہونے کو تیار نہ تھے۔

کانگرس کا دعویٰ تھا کہ کوئی کانگرسی ممبر کسی فرقہ پرست جماعت کا ممبر نہیں بن سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ کوئی شخص بیک وقت مجلس احرار اور کانگرس کا ممبر نہیں رہ سکتا تھا۔

احرار نے ۱۹۳۱ء میں مسلمانوں کے حقوق کی بحالی کے لئے تحریک کشمیر شروع کی۔ کانگرس نے اس کی مخالفت کی تھی، اور کہا تھا کہ یہ تحریک فرقہ پرستانہ ہے۔ مجلس احرار نے ۱۹۳۳ء میں کمیونل ایوارڈ کی حمایت کی تھی در آں حالانکہ کانگرس کے نزدیک یہ ایوارڈ سراسر قوم پرستی کے منافی تھا۔ احرار نے مرزائیت اور قادیانیت کے خلاف ایک وسیع تحریک چلائی۔

---

ا یہ مکمل خط و کتابت میری کتاب "ہماری قومی جدوجہد ۱۹۳۸ء" میں درج ہے۔

اور مسلمانوں میں احرار کو جس قدر مقبولیت حاصل ہوئی وہ اس تحریک کے طفیل تھی جس کا دارومدار چند مخصوص مذہبی عقائد پر تھا۔ کانگرس کو اصولاً اس تحریک سے کوئی دلچسپی نہ تھی جب ۱۹۳۶ء میں مسٹر جناح نے نئے آئین کے تحت صوبائی الیکشن لڑنے کے لئے ایک مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ بنایا تھا تو مجلس احرار کے رہنما اس میں شامل ہو گئے تھے حالانکہ پنڈت نہرو مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے مخالف تھے۔

جب پنڈت نہرو نے نومبر ۱۹۳۶ء میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ آج ہندوستان میں صرف دو جماعتیں ہیں۔ ایک کانگرس اور دوسری برطانوی حکومت، تو جناح نے اس دعویٰ کے جواب میں کہا تھا کہ دو نہیں تین جماعتیں ہیں۔ ایک کانگرس دوسری برطانوی حکومت اور تیسری مسلمان۔ مجلس احرار نے جناح کے اس دعوے کی تائید کی تھی۔

اگست ۱۹۳۱ء سے لے کر دسمبر ۱۹۳۹ء تک مجلس احرار نے کانگرس کی کسی تحریک میں حصہ نہیں لیا تھا۔ بلکہ صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں کانگرسی امیدواروں کے خلاف اپنے امیدوار کھڑے کئے تھے۔ مثلاً امرتسر کے انتخاب میں ڈاکٹر کچلو (کانگرسی امیدوار) کے مقابلہ میں چودھری افضل حق کو کھڑا کیا گیا تھا۔

ان حالات و کوائف کی موجودگی میں پنڈت نہرو کا ۳۰۔ دسمبر ۱۹۳۹ء کو لاہور آ کر بلند آہنگی سے یہ کہنا کہ ہمارا جھگڑا صرف مسلم لیگ سے ہے اور مسلمانوں کی دوسری جماعتوں بالخصوص مجلس احرار سے ہماری کوئی پرخاش نہیں، غلط ہونے کے علاوہ واقعات کے لحاظ سے بھی گمراہ کن تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ خود مجلس احرار بھی مسلم لیگ کی دشمن تھی۔ اور غالباً اس مشترکہ دشمنی کی بناء پر پنڈت جی نے احرار کو اپنا ہمدرد اور خیر خواہ تصور کر لیا تھا۔

سر سٹیفرڈ کرپس، جن کا ذکر پنڈت جی نے اپنے پہلے خط میں کیا ہے، ۷۔ دسمبر کو ہندوستان پہنچے اور ۲۶۔ دسمبر کو کلکتہ سے عازم رنگون ہو گئے جہاں سے وہ چین تشریف لے گئے۔ ان بیس دنوں میں انہوں نے ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں کا دورہ کیا۔ الٰہ آباد میں وہ پنڈت نہرو کے مہمان تھے۔ بمبئی میں بھولا بھائی ڈیسائی کے ہاں ٹھہرے۔ کلکتہ میں کانگرس پارٹی کے چیف وہپ جے۔ سی گپتا کے ہاں قیام کیا اور لاہور میں میاں افتخار الدین کے مکان پر مقیم ہوئے۔ گاندھی جی۔ پنڈت نہرو۔ راج گوپال اچاری وغیرہ سے ان کے دیرینہ مراسم تھے۔

سر سٹیفرڈ کا شمار برطانیہ کی لیبر پارٹی کے "انٹیلکچوئل" طبقے میں ہوتا تھا۔ اور ان کا رُجحان بیشتر کانگرس کی طرف تھا۔ دسمبر ۱۹۳۹ء میں جب وہ ہندوستان آئے تھے تو اس وقت صرف پارلیمینٹ کے ممبر تھے۔ کوئی سرکاری منصب یا عہدہ ان کے پاس نہیں تھا۔ البتہ ۱۹۴۰ء میں انہیں برطانیہ کا سفیر بنا کر ماسکو بھیج دیا گیا تھا۔ اور آج یہ کوئی ڈھکا چھپا راز نہیں رہا کہ ۱۹۴۱ء میں روس اور جرمنی کو ایک دوسرے سے لڑا دینے میں سب سے بڑا ہاتھ سر سٹیفرڈ کا تھا۔ سر سٹیفرڈ نے اپنی زندگی میں جو سیاست کی شطرنج کھیلی تھی اس میں یہ کارنامہ ان کی سب سے کامیاب چال خیال کیا جاتا ہے۔

سر سٹیفرڈ کرپس ۱۲۔ دسمبر کو لاہور آئے اور اگلے روز ۱۳۔ کو یہاں سے رخصت ہو گئے۔ ایک دن میں کانگرس۔ ہندو مہاسبھا۔ اکالی پارٹی اور مجلس احرار کے نمائندوں نے ان سے الگ الگ ملاقاتیں کیں۔ حتیٰ کہ کانگرسی طلبہ کا ایک وفد بھی جا کر ان سے ملا۔ لیکن حیرت کا مقام ہے کہ مسلم اکثریت کے اس سب سے بڑے صوبے میں کوئی مسلم لیگی لیڈر ایسا نہیں تھا جو سر سٹیفرڈ سے مل کر انہیں لیگ کا نقطہ نگاہ سمجھاتا۔ اس شہر لاہور میں آئندہ صرف تین مہینے کے بعد ۲۳۔ مارچ ۱۹۴۰ء کو قرارداد پاکستان منظور ہونے والی تھی۔ اور اسی لاہور کی تہی دامنی، فرومائیگی اور بدقسمتی ملاحظہ فرمایئے کہ یہاں کوئی شخص مسلم لیگ کا نقطہ نگاہ پیش کرنے کے لئے آگے آنے کو تیار نہ تھا۔ جب خود سر سکندر حیات خاں خاموش تھے تو ان کے ہوا خواہوں اور نیاز مندوں سے یہ توقع عبث تھی کہ وہ اپنی زبانوں پر مسلم لیگ کا نام لائیں گے۔

بالآخر جب دیکھا کہ وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے تو ۱۲۔ دسمبر کی شام کو خود ملک برکت علی میاں افتخار الدین کے مکان پر جا کر سر سٹیفرڈ سے ملے اور ان سے مفصل گفتگو کی۔ سر سٹیفرڈ کرپس کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کے بڑے حامی تھے۔ اور اس ضمن میں گاندھی جی اور پنڈت نہرو کی شد و مد سے تائید کر رہے تھے۔ ملک صاحب نے ان سے کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی اور ہندوستان کی مرکزی حکومت کی ان مجوزہ تبدیلیوں کے بارے میں گفتگو کی جو کانگرس کے پیش نظر تھیں، اور انہیں بتایا کہ جس کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کا خاکہ کانگرس پیش کر رہی ہے اس کا مجموعی طور پر مسلمانوں پر کیا اثر پڑے گا۔

سر سٹیفرڈ کرپس ۲۳۔ دسمبر کو کلکتہ تشریف لے گئے اور ۲۵۔ کو مولوی فضل الحق سے ملے۔ اس ملاقات کی جو روداد باضابطہ مولوی فضل الحق کے سیکرٹری نے اخباروں کو بھیجی تھی وہ ۲۷۔ دسمبر کے سٹیٹس مین میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے:

"سر سٹیفرڈ کرپس اور مسٹر اے۔ کے فضل الحق (وزیراعظم بنگال) کے درمیان ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلہ پر گفتگو ہوتی رہی اور اس بات پر بھی بحث ہوئی کہ مستقبل قریب میں اِس مسئلے کے تصفیے کے امکانات کیا ہیں۔
مسٹر حق نے سر سٹیفرڈ کو بتایا کہ مسلم لیگ اور مسلمانوں کے لیڈروں کے خلاف جس شدت سے کانگرسی اخباروں میں پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے اس سے اس مسئلہ کے تصفیے کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ کانگرسی راج میں متعدد صوبوں کے مسلمانوں پر مظالم ڈھائے گئے تھے۔ جب مسلمانوں نے احتجاج کیا تو کانگرسی اخباروں نے بڑے زور شور سے مطالبہ کیا کہ اِن الزامات کا ثبوت پیش کرو۔ جواب میں مسٹر فضل الحق نے فردِ قرار دادِ جرم مرتب کر کے پیش کی تو سوائے ایک کے باقی تمام کانگرسی اخباروں نے اِس رپورٹ کو دبا دیا۔ اور اُس کے بجائے سخت اشتعال انگیز اور گالیوں سے بھرے ہوئے افتتاحیہ مقالے شائع کرنا شروع کئے جن میں نہ صرف مسٹر جناح اور مسلم لیگ کے لیڈروں کا مذاق اڑایا جاتا تھا بلکہ نہایت تحدّی سے یہ دعویٰ بھی کیا جاتا تھا کہ مسلمانوں کے تمام عائد کردہ الزامات غلط ہیں۔
وزیراعظم نے سر سٹیفرڈ سے کہا کہ میں بنگال کے ہندوؤں کا یہ مطالبہ ماننے کو بالکل تیار ہوں، اور میں نے اِس نوع کا ایک پبلک اعلان بھی کیا ہے کہ بے شک ایک رائل کمیشن مقرر کر کے میری حکومت کے خلاف تحقیقات کرالی جائے۔ مسٹر فضل الحق نے سر سٹیفرڈ کی توجہ ایک اخباری رپورٹ کی طرف مبذول کی جس میں سر سٹیفرڈ نے بمبئی میں اعلان کیا ہے کہ مسلمان کانگرسی حکومتوں کے خلاف جو الزام لگاتے ہیں وہ بے بنیاد ہیں۔ سر سٹیفرڈ نے جواب میں بتایا کہ انہوں نے یہ بالکل نہیں کہا تھا کہ وہ واقعات جن کی مسلمان شکایت کر رہے ہیں بے بنیاد ہیں بلکہ صرف یہ کہا تھا کہ ان کے خیال میں اِن واقعات کی ذمہ داری کانگرسی حکومتوں پر عائد نہیں کرنی چاہئے۔ خاص طور پر اِس لئے کہ گورنروں نے مداخلت نہیں کی تھی۔ مسٹر حق نے یہ نکتہ واضح کرتے ہوئے کہا کہ گورنروں سے یہ کبھی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ مسلمانوں کے الزامات کو درست تسلیم کریں گے۔ کیونکہ اگر وہ اُیسا کریں تو خود ملزم قرار پائیں گے۔
سر سٹیفرڈ نے اِس بات پر زور دیا کہ بہتر یہ ہو گا کہ اب ماضی کی رنجشوں کو

بھول کر مستقبل کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی جائے۔

مسٹر فضل الحق نے کہا کہ جو فرقہ وارانہ تلخی پیدا ہو چکی ہے اُسے رفع کرنے کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ رائل کمیشن مقرر کر کے اُن الزامات کی غیر جانبدارانہ تحقیقات کرائی جائے جو مسلمان کانگرسی حکومتوں کے خلاف اور ہندو مسلمانوں کی حکومتوں کے خلاف عائد کر رہے ہیں۔ جب تک یہ نہیں ہو گا فرقہ وارانہ تلخی کم نہیں ہو سکتی۔

مسٹر حق نے سر سٹیفرڈ کو بتایا کہ وہ بدستور اِس قسم کے کمیشن کے تقرر کا مطالبہ جاری رکھیں گے۔ اُنھوں نے سر سٹیفرڈ پر یہ بات بھی واضح کر دی کہ اکثریت اور اقلیت کے درمیان جو تنازعہ پیدا ہو چکا ہے اسے کانسٹی ٹیوٹنٹ اسمبلی کبھی حل نہیں کر سکتی۔ یہ بھی انہوں نے سر سٹیفرڈ سے کہا کہ ہندوستان کے امن و امان کی خاطر اقلیتوں کا مسئلہ تسلی بخش طریقہ سے حل کرنا ضروری ہے۔ اور جب تک ایسا حل تلاش نہ کر لیا جائے کسی قسم کی آئندہ آئینی ترقی کا خیال ترک کر دینا چاہئے۔

اِس ملاقات کے دوران میں بعض اُن متنازع مسائل پر بھی بحث ہوئی جنھوں نے ہندوستان کی دو بڑی قوموں کے درمیان منافرت اور تلخی پیدا کر رکھی ہے"۔

# فردِ قرار دادِ جرم

پُوچھ لے قاتل زبانِ تیغ سے سب سرگزشت
کُشتے کس منہ سے بتائیں کیا ہوا کیوں کر ہُوا

یُوپی۔ سی پی۔ مدراس۔ بہار۔ بمبئی۔ اڑیسہ میں کانگرسی راج کے دوران میں مسلمانوں پر جو کچھ بیتی، اور جن مصائب کا انہیں نشانہ بنایا گیا۔ اُس کی کچھ تفصیل پیرپور رپورٹ اور شریف رپورٹ میں درج ہے۔ جب پنڈت جواہر لال نہرو اور کانگرس کے دوسرے بڑے بڑے لیڈروں نے اِن واقعات سے قطعی انکار کیا تو بنگال کے وزیراعظم مولوی فضل الحق نے ڈنکے کی چوٹ جواب دیا کہ اگر نہرو۔ گاندھی۔ راجندر پرشاد کو اِن واقعات سے انکار ہے تو میں ان مظالم کی تفصیل بیان کر سکتا ہوں جن کا مجھے براہ راست علم ہے۔ اِس پر پنڈت نہرو اور مولوی فضل الحق کے درمیان اخباری بحث چھڑ گئی۔ بالآخر پنڈت جی نے کہا کہ اگر مولوی فضل الحق کے پاس ایسی معلومات ہیں تو بے شک ظاہر کر دیں۔ مولوی فضل الحق خدا بخشے بڑے دلیر آدمی تھے۔ انہوں نے ۱۵۔ دسمبر ۱۹۳۹ء کے روزنامہ سٹیٹس مین میں ایک مفصل مضمون لکھا جسے حقیقتاً کانگرس کے خلاف فردِ قرار دادِ جرم کہنا چاہیئے۔ اِس میں مولوی صاحب نے ایک ایک کر کے وہ تمام واقعات بیان کئے جن کی صحت کا اُنہیں کامل یقین تھا۔

مولوی فضل الحق کوئی معمولی آدمی نہ تھے۔ وہ ہندوستان کی سب سے بڑی پریذیڈنسی کے وزیراعظم تھے۔ اور اِس حیثیت سے اپنے صوبے کے "لاء اینڈ آرڈر" کے محافظ بھی تھے۔ اس لئے جب ان کے قلم سے یہ مضمون نکلا تو برطانوی حکومت کے ایوان اور کانگرس کے سوراج بھون دونوں جگہ ہل چل مچ گئی۔ اِس مضمون کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے:

تمہید

دو سال سے کچھ اُوپر مُدت گذر چکی ہے۔ میرے پاس ایسی دستاویزیں موجود ہیں جن میں ان مظالم کی خوں چکاں رُوداد درج ہے جن کا ہندوستان کے کانگرسی صوبوں میں کانگرسی راج کے دوران میں مسلمانوں کو نشانہ بنایا گیا۔ جب بھی مَیں نے اُن مظالم کا ذکر کیا تو ہندو لیڈر اور ہندوؤں کے اخبار پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئے کہ یہ محض فرضی اور بے بنیاد کہانیاں ہیں۔

میں نے اب تک ظلم و ستم کے اِن واقعات کا ذکر اخباروں میں کرنے سے محض اس لئے احتراز کیا ہے کہ کہیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات میں جو پہلے ہی سے خوشگوار نہیں۔ مزید تلخی پیدا نہ ہو جائے۔ لیکن اب پانی سر سے گذر رہا ہے۔ اِس لئے یہ حقائق دُنیا کے سامنے پیش کرنے پر مجبور ہوں۔

گذشتہ ڈھائی سال میں ہندوستان کے اُن صوبوں میں جہاں کانگرس برسراقتدار ہے، کانگرسی نظم و نسق کے تحت جتنے فسادات ہوئے ہیں، اور اُن فسادات میں مسلمانوں کا جس قدر مالی اور جانی نقصان ہوا ہے اُس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں پہلے کبھی نہیں ملتی۔ کہ اتنی قلیل مدت میں جان و مال کا اتنا کثیر نقصان ہوا ہو۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ محض اتفاقی بات ہے کہ یہ سارا نقصان مسلمانوں ہی کا ہوا ہے؟

میں نے اِس بیان کی طوالت کم کرنے کے لئے واقعات کو بہت اختصار سے پیش کیا ہے۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ اصل واقعات کے پیش منظر میں جو حقائق موجود ہیں وہ بھی عرض کر دیئے جائیں۔ کانگرسی وزارتوں نے حکومت سنبھالتے ہی بعض عجیب و غریب حرکتیں کیں۔ مثلاً یہ کہ سرکاری افسروں کے نام احکام جاری کئے گئے کہ اہم انتظامی امور میں مقامی کانگرس کمیٹی کے ممبروں سے مشورہ کیا جائے۔ سرکاری اور نیم سرکاری عمارتوں اور سکولوں پر کانگرس کا ترنگا پرچم لہرایا جائے۔ سرکاری اور غیر سرکاری مجمعوں میں کانگرس کا ترانہ بندے ماترم گایا جائے۔ ہندی زبان اور ہندوؤں کے کلچر کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ جب مسلمانوں نے اِس دھاندلی اور ناانصافی کے خلاف احتجاج کیا تو مسلم لیگ اور مسلم لیگی لیڈروں کا مذاق اڑایا گیا۔ مسلم لیگ کا ذکر حقارت سے کیا جانے لگا۔ اور جب کہیں ہندوؤں کی اِس چیرہ دستی کی وجہ سے فرقہ وارانہ فساد برپا ہوا تو حکومت نے بے تکان اِس کی ذمے داری مسلمانوں کے سر تھوپ دی۔ اِس جانب دارانہ پالیسی کا ہندو عوام پر بڑا تباہ کن

اثر ہوا۔ ہندوؤں نے محسوس کیا کہ وہ "رام راج" آگیا ہے۔ جس کا اُنہیں مدت سے انتظار تھا۔ سرکاری افسروں نے اپنی ملازمت میں ترقی حاصل کرنے کے لئے اپنے نئے آقاؤں یعنی کانگرس کے لیڈروں کی ہر طرح خوشامد کرنا شروع کر دی اور ہر موقع پر اُن کی ہاں میں ہاں ملانے کو اپنا شعار بنالیا۔

ہندوؤں کو یکایک احساس ہوا کہ اُن کی وہ شوکت رفتہ جو گذشتہ کئی صدیوں سے غائب ہو چکی تھی دفعتہً واپس آ گئی ہے۔ چنانچہ وہ بے بس مسلم اقلیت کو ایسی حقارت سے دیکھنے لگے. جیسے ہوّمر کے زمانے میں ایک دیو سائیکلوپس کمزور اور منحنی انسانوں کو دیکھا کرتا تھا۔ اور سائیکلوپس کی طرح وہ بھی صرف ایک ہی آنکھ سے دیکھتے تھے۔ ان کی دوسری آنکھ. جو انہیں حق و انصاف اور مساوات کی آگہی عطا کر سکتی تھی اور یہ باور کرا سکتی تھی کہ ہندوستان میں رہنے والے مسلمان تعداد میں کم سہی تاہم اپنے کچھ حقوق تو رکھتے ہیں، بند ہو چکی تھی۔ یہ تھی وہ فضا جس میں ہندوؤں نے مسلم اقلیتوں پر اپنی مرضی مسلّط کرنے کا آغاز کیا۔

اور اُن کی یہ مرضی تھی کیا؟ گئو ماتا کا تحفظ لازمی ہے۔ مسلمانوں کو گائے کا گوشت کھانے کی ہرگز اجازت نہیں دینی چاہئے۔ مسلمانوں کے مذہب کو ضرور ذلیل کرنا چاہئے۔ اذان کی ممانعت کر دینی چاہئے۔ عین نماز کے وقت مسجدوں کے سامنے سے باجے گاجے اور ڈھول ڈھمکے کا جلوس نکالنا ضروری ہے۔ ہندی زبان اور ہندوؤں کا کلچر مسلمانوں پر مسلّط کرنا چاہئے۔ قبرستانوں. مسجدوں. امام باڑوں کی بے حُرمتی کرنی چاہئے۔ پھر اس میں تعجب ہی کیا ہے کہ اس ماحول میں الم ناک حادثوں کا ایک تانتا بندھ گیا۔ آگ اور خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ دیہاتی علاقے خوف و ہراس اور دہشت کی کمین گاہیں بن گئے۔ کہیں کہیں یہ بھی ہوا کہ مظلوم بالآخر مقابلے پر ڈٹ گئے اور تمام فسادات یک طرفہ نہ رہے۔ لیکن یہ بالکل ایسی ہی بات ہو گی. جیسے کوئی جرمن مورخ پولینڈ کے باشندوں پر الزام لگائے کہ انہوں نے جرمنی کی حملہ آور فوجوں کا کیوں مقابلہ کیا تھا!

اب چند واقعات عرض کرتا ہوں جن کی تفصیلات میرے پاس موجود ہیں۔ اور جو میرے علم کے مطابق درست ہیں۔ لیکن اِس ضمن میں یہ امر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ کانگرس کے خلاف ہمارا استغاثہ صرف انہی واقعات تک محدود ہے۔ میں نے ہندی زبان رائج کرنے کی مہم کے استبداد کا ودیا مندر اسکیم کے نفاذ کا لوکل باڈیز میں مسلمانوں کی نمائندگی کو کم سے کم تر کر دینے کا اور متعدد دوسرے قابلِ اعتراض امور کا ذکر نہیں کیا۔ اِن باتوں سے اُس وقت نمٹا جائے گا جب یہ مکمل استغاثہ کسی بااختیار ٹریبونل کے سامنے پیش ہو

گا۔

میں یہ بیان پڑھنے والوں سے درخواست کرتا ہوں کہ اس بات کا ضرور خیال رکھیں کہ جب مسلمانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا تو اِن کانگرسی حکومتوں نے بحالیٔ امن کی خاطر بڑی چالاکی سے ایک نیا طریقہ ایجاد کیا۔ یعنی یہ کہ:

۱۔ جب مسلمانوں پر تشدد کی وارداتیں ختم ہو جاتی تھیں تو سرکاری افسروں بالخصوص پولیس کے اہل کاروں کو اجازت دی جاتی تھی کہ فریقین میں "مصالحت" کرا دیں۔ اور اس مصالحت کی شرطیں بالعموم یہ ہوتی تھیں کہ مسلمان "رضا کارانہ" طور پر گائے کا گوشت کھانا اور گائے ذبح کرنا ترک کر دیں گے یا پھر ان ہندوؤں سے جنھوں نے اُن پر ظلم کیا تھا، کسی فرضی قصور کی معافی مانگ لیں۔

۲۔ پولیس کو موقع دیا جاتا تھا کہ ملزموں کو گرفتار کرنے اور ان کی تلاشی لینے میں عملاً ڈھیل دے تاکہ اس دَوران میں ارتکاب جرم کی جملہ شہادتیں معدوم ہو جائیں اور ملزموں پر مقدمہ نہ چلایا جا سکے۔ اور چلایا بھی جائے تو عدم شہادت کی وجہ سے سزا نہ ہو سکے۔

اب میں مختصر طور پر اصل واقعات پیش کرتا ہوں:

## صوبہ بہار

### اورنگ آباد، ضلع گیا

۲۵۔ جولائی ۱۹۳۷ء کو مدن پُورہ میں مویشیوں کی منڈی کے موقع پر مسلمانوں پر اچانک حملہ کیا گیا۔ حملہ آور ہندو تھے اور پہلے سے مسلح ہو کر آئے تھے۔ بہت سے مسلمان زخمی ہوئے جن میں ایک عورت بھی شامل تھی۔ مسلمانوں کی دکانیں اور مال لوٹ لیا گیا۔ اِس واقعہ سے ایک روز پہلے ایک ہندو مقرّر نے جلسہ عام میں ہندوؤں کو اشتعال دلایا تھا۔ جس سے فساد کا صریح خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن پولیس نے حفظِ ماتقدّم کے لئے کوئی پیش بندی نہ کی۔ حکومت نے ہندو مقرّر کے خلاف کوئی کارروائی بھی نہ کی۔ اس کے برعکس بہار کے وزیرِاعظم نے اپنے ۳۱۔ اگست ۱۹۳۷ء کے بیان میں فساد کی تمام ذمے داری مُسلمانوں پر ڈال کر گویا زخموں پر نمک چھڑکا۔ ۱۹۔ ستمبر ۱۹۳۷ء کو بہار کے وزیرِاعظم نے اِس بات سے انکار کیا کہ کوئی عورت بھی زخمی ہوئی۔ لیکن اورنگ آباد ہی کے ایک کانگرسی کارکن نے وزیرِاعظم کی تردید کی اور

اُس عورت کا نام بتایا جس کی دکان لوٹ لی گئی تھی اور جو خود بھی اِس طرح زخمی ہوئی تھی کہ اُسے علاج کیلئے ایک مہینہ اورنگ آباد کے ہسپتال میں رہنا پڑا تھا۔

## نگر نورسا۔ ضلع پٹنہ

ستمبر ۱۹۳۷ء کے لگ بھگ اِس جگہ کے ہندو گوالوں نے مسلمانوں کے ایک قبرستان پر تصرّف بے جا کر کے وہاں ایک مکان بنا لیا۔ جن مسلمانوں نے اِس دھاندلی کی مزاحمت کی انہیں زدوکوب کیا گیا۔ اِس کے بعد ہندوؤں نے گاؤں میں گھس کر مزید حملے کئے۔ بہار کے سب ڈویژنل افسر نے بعض ہندوؤں کو مداخلت بے جا کے جرم میں سزا دی۔ لیکن اپیل پر مسٹر ایس پی چیٹرجی جج نے اُنہیں بری کر دیا۔ بریت کی خوشی میں گاؤں کے ہندوؤں نے جلوس نکالا جس میں مسلمانوں کو گالیاں دیں اور استغاثہ کے ایک گواہ کو مارا۔ اس کے بعد قبرستان کی مزید بے حرمتی کی گئی اور مسلمانوں کو ڈرایا دھمکایا گیا۔ بہار کی وزارت کی توجہ اِس طرف مبذول کرائی گئی لیکن اُس نے مقامی مسلمانوں کی کوئی حفاظت نہ کی۔

## راج پور خیرا۔ ضلع گیا

۹۔ نومبر ۱۹۳۷ء کو اِس گاؤں کے ہندوؤں نے مقامی امام باڑے پر دھاوا بول دیا۔ اور جونہی عشاء کی نماز کی اذان ہوئی نمازیوں پر ٹوٹ پڑے۔ ہندو مہلک ہتھیاروں سے لیس تھے بہت سے مسلمان زخمی ہوئے۔ اُس کے بعد ہندوؤں نے مسلمانوں کے گھروں پر حملہ کیا۔ ایک گھر جلا کر راکھ کر دیا گیا۔ بظاہر اِن مفسدوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔

## کرن پورہ۔ ضلع سارن

۲۰۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو (شب برات کے دن) مانجھا جاگیر کے دو ہندو سپاہی ایک مسلمان کے گھر میں داخل ہوئے جس نے ایک دفعہ ہندوؤں کے خلاف شکایت کی تھی اور وہاں کسی مرد کو موجود نہ پا کر زنان خانے میں جا گھسے۔ اُس وقت دو عورتیں نہا رہی تھیں۔ جب انہوں نے شور مچایا تو انہیں باہر گھسیٹ کر مارا پیٹا گیا۔ اُن کی چیخ پکار سن کر کچھ پڑوسی آ گئے۔ جب انہوں نے احتجاج کیا تو انہیں ہندو زمیندار کے سامنے لے جا کر پہلے بری طرح مارا۔ پھر فی کس دس روپے جرمانہ کیا اور شام کے پانچ بجے تک حبس بے جا میں رکھا۔ اِن بے ہودگیوں کے باوجود مجرموں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔

## کھیرپتا۔ ضلع سارن

۳۰۔ نومبر ۱۹۳۷ء کو ہندوؤں نے متعدد مسلمانوں کو حملہ کر کے زخمی کر دیا۔ زخمیوں میں ایک بڑھیا بھی شامل تھی۔ مسلمانوں کے تین گھر جلا دیئے گئے۔ ایک مسجد کی بے حرمتی کی گئی، اور اُسے نقصان پہنچایا گیا۔ مسجد کی دیواروں پر برچھیوں اور خشت باری کے نشان دیکھے جا سکتے ہیں۔ کچھ مسلمانوں پر مسجد کے اندر حملہ کیا گیا، جہاں وہ پناہ لینے کے لئے چھپ گئے تھے۔ اُن کے زخموں سے بہنے والا خون مسجد کے فرش پر نظر آرہا تھا۔ ایک مسلمان کی دکان لوٹ لی گئی۔ حملے کے وقت مسلمان عورتوں اور بچوں نے گنے کے کھیت میں پناہ لی اور رات بھر خوف سے کانپتے رہے۔ گھر کے برتن۔ کپڑا۔ غلہ۔ بیل۔ بکریاں اور آلاتِ کشاورزی جو مسلمانوں کی ملکیت تھے لوٹ لئے گئے یا جلا دیئے گئے۔ زخمی مسلمانوں کو واردات کے کوئی بیس گھنٹے بعد ہسپتال پہنچایا گیا اور کہیں تیسرے دن جا کر ان کے بیانات قلم بند کئے گئے۔

## لال پورہ۔ ضلع پٹنہ

نومبر ۱۹۳۷ء کے آخری ہفتے میں کھریا بازوپور کا ایک ہندو، ہندوؤں کا جتھا لے کر اس جگہ آیا اور مقامی ہندوؤں کو مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لئے کھلم کھلا اُبھارنے لگا۔ دو دن کے اندر اندر فساد ہو گیا۔ متعدد مسلمان زخمی ہوئے۔ ایک کو بہت کاری زخم آیا۔ ہندو "جے مہابیر" کے نعرے لگا لگا کر ایک مسلمان کا دھان کا کھیت کاٹنے لگے۔ جب اُس نے مزاحمت کی کوشش کی تو مسلمانوں پر حملہ کر دیا گیا۔ پولیس کے بروقت پہنچ جانے سے صورتِ حال قابو میں آگئی۔ لیکن اُن لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی جنہوں نے براہ راست اشتعال دلا کر یہ حملے کروائے تھے۔

## خطرے کی اطلاعات پر کان نہ دھرنا

۱۹۳۸ء کی بقرعید سے چند روز پیشتر بہار میں بہت سی جگہوں پر ہندو گھوم پھر کر گئو رکھشا کا پرچار کرنے لگے، اور بعض مقامات پر تو اُنہوں نے ہندوؤں کو بھڑکایا کہ "گئوماتا" کو ہر قیمت پر بچانا چاہیے۔ مُسلم اخبارات نے بھی اور بعض مسلمانوں نے انفرادی طور پر بھی اپنے اپنے مقامی حکام کے ذریعہ سے بار بار بہار کی حکومت کو اِن شرانگیز حرکتوں کی طرف متوجہ کیا۔

اور اِس طرف بھی توجہ مبذول کرائی کہ گیا کے ایک گاؤں نوادہ میں پنڈتوں کے ہاتھ سے لکھے ہوئے "پاٹھ" کھلم کھلا تقسیم کئے جارہے ہیں، جن میں ہندوؤں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ گائے کی فروخت اور ذبیحہ گاؤ کو زبردستی بند کروا دیں۔ بہرحال حکامِ بالا نے مناسب احتیاطی تدابیر اختیار نہ کیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ متعدد مقامات پر ہندوؤں نے ایسے تشدد آمیز طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا کہ خود بہار کے وزیرِاعظم کو اعتراف کرنا پڑا کہ مسلمانوں کو گائے ذبح کرنے کے مذہبی فریضے سے باز رہنے پر مجبور کیا گیا ہے۔

## چک بیاس۔ ضلع مظفرپور

دسمبر ۱۹۳۷ء میں اُس جگہ کے ہندوؤں نے اچانک یہ مطالبہ کیا کہ مسلمان گائے کا گوشت کھانا بند کر دیں اور مسجدوں میں اذان بھی نہ دیں۔ چنانچہ مسلمانوں کو ڈرا دھمکا کر ایک نام نہاد معاہدے پر اُن سے دستخط کروا لئے گئے کہ مسلمان اپنے گھروں میں گائے کا گوشت نہیں کھائیں گے اور اگر اُن میں سے کسی نے ایسا کیا تو وہ پانچ سو روپے جرمانہ ادا کرے گا یا تین دن کے اندر گاؤں چھوڑ کر چلا جائے گا۔ پولیس کے سب ڈویژنل افسر نے اس شکایت کی تحقیقات کی اور اطلاع دی کہ یہ معاہدہ "بڑے دوستانہ انداز" میں ہوا ہے اور مسلمانوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ "گائے کے گوشت سے سروکار نہ رکھیں گے"۔ انسپکٹر کی رپورٹ کا سہارا لے کر مظفرپور کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے فروری ۱۹۳۸ء کے تیسرے ہفتے میں ایک ایسا اخباری بیان جاری کیا جو حقائق کے سراسر خلاف تھا۔ گائے کا گوشت کھانے اور اذان دینے کے سلسلہ میں جائے واردات کے ہندو بدستور مسلمانوں کو تنگ کرتے رہے۔ یہ معاملہ بہار کونسل کے سامنے پیش کیا گیا اور وزیر مالیات نے تسلیم کیا کہ "شکایت درست تھی اور بلند آواز سے اذان نہ دینے کے لئے مقامی ہندوؤں نے مسلمانوں پر دباؤ ڈالا ہے"۔ وزیر نے یہ بھی کہا کہ اُس جگہ کے ہندوؤں کو تنبیہ کر دی گئی ہے کہ "اگر ہندوؤں نے مسلمانوں کی عبادت میں مزید خلل ڈالا تو ضروری کارروائی کی جائے گی"۔ اِس طرح مسلمانوں کو بغیر روک ٹوک کے کئی مہینے تک پریشان کیا جاتا رہا۔ لیکن نہ تو اُن مقامی افسروں سے باز پرس ہوئی جن کی غلط رپورٹوں نے حکومت کو گمراہ کیا تھا اور نہ حکومت نے اُن ہندوؤں کے خلاف کوئی قدم اٹھایا جو ایک عرصے سے مسلمانوں کے عبادت کرنے کے حق میں دخل انداز ہوتے رہے۔ اِس واقعہ کو ایک نمونہ سمجھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کانگرسی حکومت کے دوران میں بہار کے دوسرے مقامات پر کیا کچھ نہیں ہوتا رہا ہو گا۔

## مجھیا دن - پرگنہ سنتھال

فروری ۱۹۳۸ء میں اِس گاؤں کے مسلمانوں کو ہندوؤں نے حملہ آور ہو کر پیٹا اور گاؤں کے کنوؤں سے پانی بھرنے سے زبردستی روک دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں نے اپنے دستور کے مطابق درونِ خانہ گائے ذبح کی تھی۔ اِس فساد میں مسلمانوں کی کوئی حفاظت نہیں کی گئی اور نہ ہندو مجرموں کے خلاف کسی قسم کی کارروائی کی گئی۔

## رسول پور کیٹسر - ضلع پٹنہ

مسلمانوں نے اپنے قدیم دستور کے مطابق گائے ذبح کی تو ہندوؤں نے اُن کا بائیکاٹ کر دیا اور طرح طرح سے دق کیا۔ ۱۲۔ فروری ۱۹۳۸ء کو سینکڑوں ہندوؤں نے جمع ہو کر مسلمانوں پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن پولیس بروقت پہنچ گئی۔ اگلے دن ہندوؤں نے مسلمانوں کے کئی کھیت جلا دیئے۔ مسلمان راہ گیروں کو راستے میں روک روک کر مارا۔ گاؤں کے کنوئیں اُن پر بند کر دیئے۔ ۲۰۔ فروری ۱۹۳۸ء کو داناپور کا سب ڈویژنل افسر مصالحت کرانے کے لئے بھتیا ڈاک بنگلے پر آیا۔ مسلح ہندوؤں کا بہت بڑا ہجوم مختلف نعرے لگاتا ہوا قریب ہی جمع ہو گیا اور فساد پھیلانے کی کوشش کرنے لگا۔ پولیس کے ہندو افسروں نے مقامی مسلمانوں سے کہا کہ وہ ہندوؤں کا "غصہ ٹھنڈا" کرنے کے لئے گائے کی قربانی ترک کر دیں۔ حالانکہ دیوانی عدالت اِس سلسلے میں مسلمانوں کے حق میں فیصلہ دے چکی تھی۔ ایک مسلمان عورت نے چند ہندوؤں کی شکایت کی۔ لیکن پولیس نے توجہ تک نہ کی۔ ایک اور مسلمان جب ہندوؤں کی شکایت کرنے پہنچا تو اسے گالیاں دے کر بھگا دیا گیا۔ اُس علاقے کے مسلمانوں کو عرصے تک تنگ کیا جاتا رہا اور کئی مسلمان مار پیٹ میں زخمی بھی ہوئے۔ بالآخر مقامی مسلمانوں نے بہار کے وزیر اعظم کو ایک عرضداشت پیش کی۔ جس میں پانچ مختلف صریح الزامات عائد کئے گئے تھے اور ہندو سرغنوں کے نام بھی درج تھے۔ اس اپیل کا نتیجہ ایک اور مثالی "مصالحت" تھی جس میں مسلمان اپنے مذہبی حقوق سے "بڑے دوستانہ انداز میں دست بردار ہو گئے"۔ یہ بھی انہی مصالحتوں میں سے ہے جنہیں زبردستی مسلمانوں کے سر منڈھا گیا۔ اور اگر اُن کے بارے میں بے لاگ تحقیقات کی جائے تو اُن کا بھرم کھلتے دیر نہ لگے گی۔

مجھولی۔ ضلع بھاگل پور

اِس گاؤں میں جس کی ساری آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ مسلمانوں کو گائے ذبح کرنے سے اس لئے منع کیا گیا کہ کہیں ہندو "مشتعل" نہ ہو جائیں۔ یہ خاصا مشہور واقعہ ہے اور جو بہار کی حکومت کے شائع کردہ "اطلاع ناموں" سے یہ واضح ہو جائے گا کہ دوسرے دیہات کے ہندو جتھے بنا بنا کر اور مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کے لئے یہاں آتے رہے۔ لیکن انہیں روکنے یا سزا دینے کے لئے مقامی حکام نے کوئی قدم نہ اٹھایا۔ اِس کے برعکس اُنہوں نے ہندو ہجوم کی دل دہی کی اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ اپنے مذہبی اور شہری حق سے دست بردار ہو جائیں۔

کٹرہ۔ ضلع پٹنہ

مارچ ۱۹۳۸ء میں مسلمان اخباروں میں شائع ہونے والی ایک اطلاع کے مطابق تقریباً تین سو ہندوؤں کے ایک جتھے نے، جو ہتھیاروں سے مسلّح تھا اور بندے ماترم کے نعرے لگا رہا تھا۔ ایک مسلمان کی زمین پر زبردستی قبضہ کرنا چاہا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اُنہوں نے مسلمان زمیندار کے ایک رشتے دار کو قتل اور چھوٹے بھائیوں کو شدید زخمی کر دیا۔ اِس بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ ہندو مجرموں کے خلاف کیا کارروائی کی گئی۔

جھاما پور۔ ضلع پٹنہ

۸۔اپریل ۱۹۳۹ء کو رات کے گیارہ بجے دو سو مسلّح ہندوؤں نے ایک مسلمان کے مکان پر ہلّہ بول دیا۔ کواڑ توڑ ڈالے اور اُسے قتل کر دیا۔ گھر کے دو ملازموں پر بھی حملہ کیا اور پردہ دار عورتوں کی بے حرمتی کی اور زیور لوٹ لئے۔ معلوم نہیں کہ مجرموں کے خلاف کیا کارروائی کی گئی۔

کھدیا اور ٹھکرہ۔ ضلع چمپارن

اوّل الذکر مقام پر فروری ۱۹۳۸ء میں ہندوؤں نے ایک بوڑھے مسلمان کو بری طرح مارا۔ لیکن مجرموں سے مُطلق باز پُرس نہ ہوئی۔ ثانی الذکر مقام پر ہندوؤں نے ایک مسجد اور اس کے کنوئیں کو ناپاک کر دیا۔ انہوں نے ایک سور مار کر آدھا مسجد میں اور آدھا کنوئیں میں ڈال دیا۔ اِس کی اطلاع ۳۰۔ مارچ ۱۹۳۸ء کو پولیس کو دی گئی لیکن مجرموں کو آج تک سزا

نہیں ملی۔

## تلوتھو۔ ضلع شاہ آباد

۱۱۔ مارچ ۱۹۳۸ء کو ایک مسجد میں نجاست ڈالی گئی۔ اس جرم کے چشم دید گواہ موجود تھے لیکن مجرموں کو سزائیں نہیں ملیں۔

## تلوکاری۔ ضلع ہزاری باغ

ایک مسلمان کے گھر میں شادی تھی اور دعوت میں گائے کا گوشت بھی پکایا گیا تھا۔ اس جرم کی سزا یہ ملی کہ پورے مسلمان گھرانے پر ہندوؤں نے طرح طرح کے ظلم ڈھائے اور سختیاں کیں۔ اس واقعہ کی تفصیلات خاصی مشہور ہیں۔ ہندوؤں نے بڑی تعداد میں مسلمانوں کے گھروں کا محاصرہ کر لیا۔ اُس کے ہاتھ پیر باندھ کر جکڑ دیا۔ پھر بڑی بے دردی سے مارا۔ ایک نیچ ذات کے آدمی سے اُس کے منہ میں پیشاب کروایا۔ گھر کی عورتوں پر حملہ کیا۔ باورچی خانے کے برتن توڑ پھوڑ دیئے۔ اور دوسری چیزوں کو نقصان پہنچایا۔ پولیس کا ہندو افسر رات گئے وہاں پہنچا مگر کوئی تفتیش نہ کی۔ اگلی صبح اُس نے بے چارے غریب مسلمان کو اُسی قسم کی کسی "مصالحت" پر جس کا ذکر پہلے ہو چکا تھا، راضی ہو جانے پر مجبور کیا۔ اور یہ معاملہ وہیں ختم ہو جاتا اگر پولیس کا انگریز سپرنٹنڈنٹ بذات خود اِس واردات کی تفتیش شروع نہ کر دیتا۔ بہار کی وزارت نے خطا کار افسروں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی۔ اگر پولیس کا سپرنٹنڈنٹ دخل نہ دیتا تو کسی شخص پر مقدمہ نہ چلتا۔ مقدمے کے دوران میں مجسٹریٹ نے پھر "مصالحت" کی تجویز پیش کی۔ ملزموں میں سے بعض کو جو سزائیں دی گئیں وہ اتنی ناکافی تھیں کہ خود سیشن جج نے اپیل میں انہیں "حیرت انگیز طور پر کم" بتایا۔ کانگرسی وزارت کا یہ کارنامہ شریف رپورٹ جلد اول میں بیان ہو چکا ہے۔ حکومت نے سزا میں اضافے کے لئے کوئی اقدام نہ کیا۔ جس انسپکٹر نے زبردستی نام نہاد مصالحت کرائی تھی اُسے کوئی سزا نہ دی گئی۔ مقدمے کے دوران میں کانگرس کے بڑے بڑے لیڈر ہندو ملزموں کی کھلم کھلا مدد کرتے رہے۔ اور انہیں شہر کی کانگرس کمیٹی کے دفتر میں جو کانگرسی حکومت کے پارلیمنٹری سیکرٹری کے گھر میں واقع تھا ٹھہرایا گیا۔

## بھاگل پور

جولائی ۱۹۳۸ء میں بھاگل پور میں جو شرمناک فساد ہوا تھا اُس کا سبب یہ تھا کہ بہار کی وزارت نے مقامی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے فیصلے میں براہ راست دخل دیا تھا۔ پہلے یہاں کبھی ہندوؤں کو رتھوں کا جلوس نکالنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ لیکن اس دخل در معقولات کی بدولت قدیم دستور کے خلاف اس قسم کا خاص جلوس نکالنے کی اجازت دی گئی۔ جب فساد ہوا تو مسلمانوں کا بائیکاٹ کیا گیا اور انہیں ہندوؤں اور پولیس کے ہاتھوں بڑی پریشانی اٹھانی پڑی۔ مولانا شاہ منت اللہ نے جو لیجسلیٹو اسمبلی کے کانگرس نواز رکن ہیں۔ مسٹر عبدالحمید رسمی نے جو بھاگل پور کانگرس کی مسلم رابطہ عوام کمیٹی کے سیکرٹری ہیں۔ مسٹر جمال احمد خاں نے جو کانگرسی میونسپل کمشنر ہیں، اخباروں کو الگ الگ تین بیان دیئے۔ جن میں اِن فسادات کے بارے میں کانگرسی وزارت اور اُس وزارت کے اشاروں پر چلنے والے مقامی حکام کے طرز عمل کی سخت مذمت کی گئی۔ خود اِن کانگرسیوں نے کانگرسی وزارت اور اُس کے افسروں پر سنگین الزام لگائے۔

## غریبا گنج۔ ضلع مونگھیر

اس گاؤں میں صرف چار مسلمان تھے۔ انہیں گائے کا گوشت کھانے پر طرح طرح سے پریشان کیا گیا۔ گاؤں کے کنوئیں اُن پر بند کر دیئے گئے۔ جب اِن غریبوں نے شکایت کی تو ایک اور بالجبر "مصالحت" وجود میں آگئی۔ اس کے بعد مسلمانوں کو فوجداری مقدمات میں ماخوذ کر کے مزید ستایا گیا۔

## مسموہنا۔ ضلع ہزاری باغ

یہاں کے مسلمانوں کے ایک قبرستان کی بے حرمتی کی گئی اور مسلمانوں کا بائیکاٹ کیا گیا۔ پولیس نے قابلِ دخل اندازی جرائم کا اندراج کرنے سے انکار کر دیا۔ بالآخر بہت سے مظالم برداشت کرنے کے بعد مسلمانوں کو یہاں بھی ایک بالجبر "مصالحت" کرنے پر مجبور کیا گیا۔

## کنودھ۔ ضلع گیا

نومبر، دسمبر ۱۹۳۸ء میں اِس گاؤں کے مسلمانوں کو گائے کا گوشت لانے پر تنگ کیا

گیا۔ صورت اس کی یہ تھی کہ ان مسلمانوں کو بلاوجہ ستایا جاتا تھا۔ مار پیٹ کی جاتی تھی۔ قتل کی دھمکیاں دی جاتی تھیں۔ حبس بے جا میں رکھا جاتا تھا۔ اور بغیر کسی قصور کے جرمانہ وصول کیا جاتا تھا۔ اس کے باوجود حکام نے کسی قسم کی کارروائی نہیں کی۔

### ردھوئی۔ ضلع گیا

اس گاؤں کے مسلمانوں کا اپریل، مئی ۱۹۳۸ء میں گائے کا گوشت کھانے کے جرم میں بائیکاٹ کیا گیا۔ اور انہیں مختلف طریقوں سے ستایا گیا۔ گاؤں کے ڈیڑھ سو گھرانوں میں سے سترہ گھرانے مسلمانوں کے تھے۔ انہیں اپنا سارا وقت خوف و ہراس میں گزارنا پڑتا تھا۔ حکومت نے ان کی حفاظت نہیں کی۔

### کوناند

۱۶۔ اگست ۱۹۳۸ء کو ایک مسلمان قصائی کو راستے میں روک کر اُس کی گائے چھین لی گئی۔ پھر ہندوؤں کے ایک بڑے مجمع نے مسلمانوں پر حملہ کر کے سات آدمیوں کو زخمی کر دیا۔ جن میں سے ایک زخمی بہار شریف کے ہسپتال میں مر گیا۔ اس کے باوجود جب گرفتاری کا وقت آیا تو بہت سے مسلمانوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور جو ہندو گرفتار کئے گئے ان کی تعداد گویا آٹے میں نمک کے برابر تھی۔

### منی پور۔ ضلع دربھنگہ

۱۵۔ ستمبر ۱۹۳۸ء کو یہاں کے ہندوؤں نے دو معزز مسلمانوں سے دنگا فساد کیا جس کی وجہ سے ہندو بہت بڑی تعداد میں جمع ہو گئے۔ اور اُنہوں نے دونوں مسلمانوں کو بری طرح مارا جن میں سے ایک کو ایسی شدید ضربیں لگیں کہ اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔ ہندو غنڈوں کا سرغنہ یہ کہہ کہہ کر اشتعال دلا رہا تھا "بھیتریا مار مارو" (اندرونی مار مارو) بے چارے مسلمان کی ڈاڑھی نوچ لی گئی۔ اِس واقعہ کی جو تفصیلات ہم تک پہنچی ہیں اِتنی ہولناک ہیں کہ بیان نہیں کی جا سکتیں۔ واردات کی تفتیش کرنے والے ہندو سب انسپکٹر نے ظلم و ستم کے اس واقعہ کی تمام شہادتیں دبا دیں۔ ڈاکٹر نے بھی جسمانی ضربوں کے واضح نشانات کو نظر انداز کر دیا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ اُن وحشی اور سنگدل انسانوں سے کیا سلوک کیا گیا۔

## داؤد نگر۔ ضلع گیا

ستمبر ۱۹۳۸ء میں ہندوؤں نے ایک امام باڑے کے احاطے میں زبردستی مورتی نصب کر دی۔ پولیس کے ہندو سب انسپکٹر نے مسلمانوں کی داد رسی کرنے سے انکار کر دیا۔ مسلمانوں نے استغاثہ دائر کر دیا۔ اس اثناء میں ہندو انسپکٹر پولیس بہ عجلت تمام موقع پر پہنچا، اور اس سے قبل کہ عدالتی تحقیقات شروع ہوتی اُنہی ہتھکنڈوں سے جنہیں کانگرسی حکومت کے دور میں پایہ تکمیل کو پہنچایا گیا ہے، مسلمانوں کو "مصالحت" پر دستخط کرنے پر مجبور کر دیا۔

## مجھولی۔ ضلع مونگھیر

دسمبر ۱۹۳۸ء میں یہاں کے ہندوؤں نے عمداً مسلمانوں پر حملہ کیا۔ مال لوٹا اور ایک گھر جلا دیا۔ اِس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ایک مُسلمان نے گائے کی قربانی کی تھی۔ مقامی کانگرس کمیٹی کے سیکرٹری نے ہندوؤں کا جرم بہت گھٹا کر پیش کرنے اور جھگڑے کا قصور وار مسلمانوں کو ٹھہرانے کی کوشش کی۔ یہ معلوم نہیں کہ مجرموں کا کیا بنا۔

## کروان۔ ضلع گیا

پہلی فروری ۱۹۳۹ء کو عید کے روز مسلّح ہندوؤں کا ایک ہجوم "مہاتما گاندھی کی جے" کا نعرہ لگا کر مومن مسلمانوں کے بارہ گھروں میں گھس گیا۔ سامان لوٹ لیا اور گھر توڑ پھوڑ دیئے۔ مجرموں کو کیا سزا ملی۔ اِس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔

## برارا۔ ضلع دربھنگہ

پہلی فروری ۱۹۳۹ء کو عید کے روز ہزاروں مسلّح اور منظم ہندوؤں نے کانگرسی جھنڈے لہرا کر اور کانگرس، گاندھی جی اور گئو ماتا کی جے کے نعرے لگا کر اِس گاؤں کے مسلمانوں پر ہلہ بول دیا۔ مسلمانوں کی تمام املاک تباہ کر دی گئیں۔ جن میں کھیتوں کی کھڑی فصلیں بھی شامل تھیں۔ مقامی حکام نے گولی چلائی۔ لیکن اُن اصلی سرغنوں کو، جن کا اس جھگڑے میں ہاتھ تھا، گرفتار کرنے کی کوشش نہ کی گئی۔

## کیتھا۔ ضلع بھاگل پور

پہلی فروری ۱۹۳۹ء کو ہندوؤں کے ایک ہجوم نے مسلمانوں پر جو عید کی نماز پڑھنے مسجد

میں جمع ہوئے تھے، حملہ کر دیا۔ اور نہ اُنہیں نماز پڑھنے دی نہ قربانی کرنے دی۔

## نیا گاؤں۔ ضلع مظفرپور

پرانے تسلیم شدہ دستور کے خلاف ہندوؤں نے ضد کی کہ مسلمان گائے ذبح نہ کریں۔ ۱۹۳۹ء میں بقرعید کے دن مسلمانوں نے حسب معمول اپنا حق استعمال کیا۔ ہندوؤں نے بدلہ لینے کی غرض سے ۶۔ مارچ ۱۹۳۹ء کو "گاندھی جی کی جے" کا نعرہ لگا کر مسلمانوں پر حملہ کیا۔ ایک مسلمان شہید ہوا اور سولہ زخمی ہوئے۔ زخمیوں میں عورتیں بھی شامل تھیں۔ مسلمانوں کے ۱۵۹ مکان جو ۵۹ مسلم خاندانوں کی ملکیت تھے جلا دیئے گئے۔ یہ واقعہ انتہائی خوف اک اور منظم ہونے کے علاوہ اُن واقعات کے سلسلے کی ایک کڑی تھا، جن کا منصوبہ ہندوؤں نے بڑے غور و فکر کے بعد تیار کیا تھا۔ اور جن کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اُنہوں نے ہر قسم کی بہیمیت استعمال کی اور جو بہار کی کانگری وزارت کے عرصہ حکومت پر بدنما داغ ہیں۔ بہت سے مجرموں کو کوئی سزا نہیں ملی۔ مظلوموں کو معاوضہ بھی نہیں دیا گیا۔

## ہنسولی۔ مورہنیا۔ مچھیل۔ ضلع پٹنہ

فروری ۱۹۳۹ء میں بقرعید کے موقع پر ان دیہات کے مسلمانوں پر ہندوؤں نے ظلم ڈھائے۔ ہنسولی میں ہندوؤں نے تقاضا کیا کہ جو گائے ذبح کی جانے والی ہے وہ اُن کے حوالے کر دی جائے۔ اِسی سلسلہ میں چھ مسلمانوں کو زخمی کر دیا اور گاؤں پر تین بار حملہ ہوا۔ مورہنیا میں پہلی فروری کو صبح سویرے ہندوؤں نے گاؤں کا محاصرہ کر لیا۔ اور قربانی کی گائے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ گاؤں کے مسلمان بقرعید کی نماز بھی نہ پڑھ سکے۔ مچھیل میں مسلمانوں نے سب انسپکٹر پولیس کو پہلے مطلع کر دیا تھا کہ ہندو فساد پر آمادہ ہیں۔ لیکن سب انسپکٹر نے کوئی پروا نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کئی مسلمانوں کے گھروں پر حملے ہوئے اور املاک کو نقصان پہنچایا گیا۔

## تیوری۔ ضلع پٹنہ

ایک مسلمان لڑکے کو بڑی بے رحمی سے زدو کوب کیا گیا اور ہندوؤں کی ایک ٹولی اُسے زندہ جلانے ہی والی تھی کہ کچھ راہ گیروں نے چھڑا لیا۔ بہار کی حکومت نے اپنے ایک پریس نوٹ میں اس واقعہ کو تسلیم کیا لیکن حفظِ امن کے لئے بظاہر کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔

## گیا

۶ر مئی ۱۹۳۹ء کو گیا میں جو فساد شروع ہوا تھا اُس کا قصہ بہت لمبا اور شرمناک ہے۔ اتنا کہنا کافی ہو گا کہ حکام بالا نے اپنے رویئے سے ہندوؤں کی بے جا پاسداری اور مسلمانوں کی مخالفت کی۔ سرکاری بیانوں میں مسلمانوں کے نقصانات اور ہندوؤں کی زیادتیاں گھٹا کر اور ہندوؤں کے نقصانات اور مسلمانوں کے قصور بڑھا چڑھا کر پیش کئے گئے۔ ذمہ دار لوگوں نے جو بیان دیئے تھے اُن کی ایک بڑی تعداد ریکارڈ پر موجود ہے۔ جن کے مطالعہ سے ثابت ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں نے جو الزام ہندوؤں پر لگائے تھے وہ درست ہیں۔ جن محلوں میں مسلمانوں کی اکثریت آباد تھی وہاں ضرورت سے زیادہ پولیس تعینات کی گئی۔ جبکہ ہندو اکثریت والے محلوں میں پولیس یا تو سرے سے تھی ہی نہیں یا ضرورت سے بہت کم تھی۔ پولیس نے مسلم لیگ کے کارکنوں کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ مسجدوں کو نقصان پہنچے۔ مسلمانوں کی دکانیں لٹنے اور جلائے جانے کی خبروں کو دبا دینے کی کوشش کی گئی۔ اِن مسلمانوں تک کو پریشان کیا گیا جو ذمہ دار عہدوں پر فائز تھے۔ اِس کے برعکس ہندو غنڈوں سے مطلق باز پرس نہ ہوئی۔ اِس کے علاوہ حکومت نے متعدد طریقے ایسے اختیار کئے جن سے ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کی صریح حق تلفی ہوتی تھی۔ یہ سب الزامات ثابت کئے جا سکتے ہیں۔

## پرن پورن۔ ضلع گیا

اِس گاؤں کے مسلمان قصائیوں کو جو قدیم وقتوں سے گائے کا گوشت فروخت کرتے آئے تھے. اپنا کاروبار جاری رکھنے سے روک دیا گیا اور مسلمانوں کو مجبور کیا گیا کہ گائے کا گوشت کھانا چھوڑ دیں (اپریل ۱۹۳۵ء) پریشان اور مظلوم مسلمانوں کی کوئی داد رسی نہ ہوئی۔

## پٹنہ

۱۳۔ جون ۱۹۳۹ء کو ہندوؤں نے مسلمانوں کی ایک برات پر حملہ کر کے تیرہ براتی زخمی کر دیئے۔ بہار کی حکومت نے ایک گمراہ کن پریس نوٹ جاری کیا جس میں کہا گیا تھا کہ کھلی جگہ پر گائے ذبح ہوتی دیکھ کر ہندو مشتعل ہو گئے تھے۔ خود ہندوؤں کو بھی تسلیم تھا کہ گائے گاؤں کے قدیمی سلسلے میں ذبح کی گئی تھی اس کے علاوہ جس گائے کی بات ہو رہی ہے وہ رات کو ذبح ہوئی تھی۔ ہندوؤں نے مسلمان عورتوں تک کو زدوکوب اور بے آبرو کیا۔ اس واقعہ کے

پانچ دن بعد تک نہ کسی ہندو کو گرفتار کیا گیا۔ نہ کسی ہندو کے مکان کی تلاشی ہوئی اور یوں جان بوجھ کر ثبوت تلف کرنے کا موقع بہم پہنچایا گیا۔

ا را ہا۔ ضلع بھاگل پور

ہندو اصرار کرتے تھے کہ مسلمان اذان دینی چھوڑ دیں۔ ظاہر ہے مسلمان اس پر راضی نہ ہوئے۔ چنانچہ متعدد بار مسلمانوں کو ذلیل اور تنگ کیا گیا۔ بالآخر جون ۱۹۳۹ء میں ہندوؤں نے مسلمانوں پر حملہ کیا اور ان کا مال لوٹا۔ اس کے بعد جو مقدمے چلے انہیں بالآخر کانگرس کے جانے پہچانے طریقے یعنی ایک نام نہاد "مصالحت" کی نذر ہونا پڑا۔

چارو۔ ضلع دربھنگہ

ہندو نماز کے وقت. مسجد کے آگے سے ایک نیا ہری کیرتن کا جلوس نکالنے پر مصر تھے اس پر کچھ تکرار ہوئی اور اس کے بعد مئی ۱۹۳۹ء میں ہندوؤں کا ہجوم یہیں آکر مسلمانوں پر حملہ آور ہوا۔ مسلمانوں کے گھر لوٹ لئے گئے۔ بہت سی نازیبا حرکتیں کی گئیں۔ ایک ستر سالہ بوڑھا زخموں سے جانبر نہ ہو سکا۔

پٹنہ شہر

۱۱۔ مئی ۱۹۳۹ء کو آریہ سماجی ایک مسلمان کے گھر سے دو مسلمان عورتوں کو زبردستی اغوا کر کے لے گئے۔ آریہ سماجیوں کے ساتھ بہت سے ہندو تھے جنہوں نے مسلمان کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ ایک عورت بچ کر بھاگ نکلی لیکن دوسری کو لے جاکر آریہ آشرم میں بند کر دیا گیا۔ پولیس نے دخل دینے سے انکار کر دیا۔ جب بہار کی صوبائی مسلم لیگ کے صدر نے بہار کے وزیراعظم کی توجہ اس واقعہ کی طرف مبذول کرائی تو سرکاری طور پر سرسری سی تحقیقات ہوئی اور اگرچہ مسلمان کے گھر میں ہندوؤں کا زبردستی داخل ہونا تسلیم کر لیا گیا لیکن کوئی کارروائی نہ کی گئی۔ اس معاملے کی مزید تفصیلات ریکارڈ میں موجود ہیں جس عورت کو ہندو اٹھا کر لے گئے تھے اسے چھڑا کر مسلمانوں کے حوالے نہ کیا گیا بلکہ آریہ سماجیوں نے اسے ایک ہندو سے بیاہ دیا حالانکہ اس کا مسلمان شوہر صحیح سلامت موجود ہے۔ اور اپنی بیوی کی بازیابی کے لئے درخواست دے چکا ہے جس کی کوئی شنوائی نہیں۔ پٹنہ میں حال ہی میں اسی قسم کے دو اور واقعات ہوئے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایک ہندو سب ڈویژنل افسر نے ایک بے گناہ

مسلمان عورت کو بہار سے نکل جانے کا حکم دیا۔ یہ ایک ایسا فعل ہے جسے خود بہار کی حکومت نے "غیر دانش مندانہ" قرار دیا۔ اس افسر کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا گیا۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ہندو ایک مسلمان عورت کو زبردستی اٹھا کر لے گئے۔ جسے بڑی مشکل سے ان کے قبضے سے چھڑایا گیا۔ لیکن عورت کو ضمانت دینے پر مجبور کیا گیا حالانکہ اس نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ ہندوؤں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی۔

## سمستی پور۔ ضلع دربھنگہ

۱۷۔ جولائی ۱۹۳۹ء کو بعض آریہ سماجیوں نے ایک مسلمان عورت کو اغوا کرنا چاہا اور اسے اٹھا کر اپنے آشرم میں لے گئے۔ عورت کو ان کے قبضے سے چھڑا لیا گیا۔ لیکن مجرموں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی۔

## پھلواری شریف۔ ضلع پٹنہ

ہندوؤں کے جلوسوں کو دستور کے خلاف یہ اجازت دی گئی کہ وہ مسجدوں کے آگے سے مورتی کے ساتھ گاتے بجاتے گذرا کریں۔

## باڑھ۔ ضلع پٹنہ

۱۔ مسلم لیگ کے ایک اسسٹنٹ سیکرٹری کو طرح طرح سے ستایا گیا۔

۲۔ ایک مسلمان کو اس کی بیوی سمیت حوالات میں بند کر دیا اور اس پر مقدمہ یہ چلایا گیا کہ اس نے اپنی ہی بیوی کو "اغوا" کر لیا ہے۔ ہندو اس کی بیوی کو ہندو ثابت کرنا چاہتے تھے۔ عدالت نے اسے بری کر دیا۔ لیکن اس نے اس سلسلہ میں بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔

۳۔ مسلمانوں کو مارا پیٹا گیا اور ایک عورت زبردستی اغوا کر لی گئی۔ لیکن مجرموں کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا گیا۔

۴۔ ۲۳۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو ہندوؤں کے ایک جلوس نے مسجد کے سامنے تراویح کی نماز کے دوران میں باجا بجایا۔ جب پولیس نے ان سے لائسنس طلب کیا تو انہوں نے لائسنس دکھانے سے انکار کر دیا اور پولیس کا حکم ماننے سے بھی انکار کیا۔ پولیس نے اس پر بھی کچھ نہ کیا۔

## پنڈارک۔ ضلع پٹنہ

۱۹۳۹ء کے محرّم میں پہلے ہندوؤں نے تعزیئے کے جلوس پر پتھر برسائے پھر تعزیوں کو

توڑ پھوڑ دیا۔ پولیس کو اطلاع کی گئی۔ لیکن کوئی کارروائی عمل میں نہ آئی۔

معافی۔ ضلع پٹنہ

۱۹۳۹ء کے محرّم سے قبل ہی مسلمانوں کا بائیکاٹ کر دیا گیا۔ اس سال ہولی کے موقع پر ہندوؤں کے ایک مسلح ہجوم نے مسلمانوں کو لوٹنے اور قتل کرنے کی دھمکی دی۔ جب مسلمانوں نے پولیس کو اطلاع دی تو پولیس نے اُلٹا مسلمانوں کو گرفتار کر لیا جو اپنے گھروں کی حفاظت کر رہے تھے۔

پلکھی۔ ضلع پٹنہ

ہندوؤں نے مسلمانوں کو اذان دینے سے روک دیا اور مسلمانوں کے قبرستان پر مہابیری جھنڈا گاڑ دیا۔ پولیس نے کوئی کارروائی نہ کی۔

مکھار۔ ضلع پٹنہ

اس گاؤں کے ہندوؤں نے یہ عُذر پیش کر کے کہ کسی مسلمان نے گھر میں ہندو عورت چھپا رکھی ہے۔ مسلمانوں کے گھروں پر حملہ کر دیا جس کی قیادت مقامی کانگرس کمیٹی کا سیکرٹری کر رہا تھا۔ حکام نے ہندو عورت کے بارے میں ہندوؤں کی شکایت کو قطعی بے بنیاد پایا۔ لیکن مجرموں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی اور اس معاملہ کو پس پشت ڈال دیا گیا۔

کرائے پرس رائے۔ ضلع پٹنہ

ہندوؤں نے مویشیوں کی منڈی لوٹ لی۔ مسلمان قصائیوں کو ان کے گھروں میں گھس کر مارا اور ان کے مویشی چھین لئے پولیس کی تفتیش بالکل سطحی تھی اور ملزموں کے خلاف استغاثے کی کارروائی بھی ناقص تھی۔ ملزم بری ہوگئے۔ اس حادثے کا ہونا تو تسلیم کیا گیا لیکن کسی کو سزا نہ ہوئی۔

صالح پور۔ ضلع پٹنہ

مسلمانوں کی مویشیوں کی منڈی لوٹ لی گئی۔ لیکن مجرموں کے خلاف کوئی کارروائی نہ

کی گئی۔

## کڑی سرائے۔ ضلع پٹنہ

۲۹۔ اگست ۱۹۳۹ء کو ایک مسلمان قصائی کو گائے کا گوشت بیچنے پر زدو کوب کیا گیا۔ پولیس کے سب انسپکٹر نے تفتیش کی لیکن مجرموں کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا گیا۔

## کوروا۔ ضلع پٹنہ

سب انسپکٹر پولیس کی موجودگی میں کئی مسلمانوں کے گھروں پر حملہ کیا گیا اور سامان اور زیور لوٹا گیا۔ مسلمان بقرعید کی نماز نہ پڑھ سکے اور نہ انھیں قربانی کی اجازت دی گئی۔

## غوث پور۔ ضلع گیا

ایک پولیس افسر نے ایک ایسے "معاہدے" پر جس میں گائے ذبح کرنے کے حق سے دست برداری کا اعلان تھا، ایک مسلمان سے انگوٹھے کا نشان لگوایا۔ بعد میں اس پر اور ایک اور مسلمان پر تعزیرات ہند دفعہ نمبر ۲۱۱، ۱۹۳، ۱۱۴/۲۱۱ کے تحت مقدمہ چلایا گیا۔ انگریز سیشن جج نے ملزم کو بری کر دیا اور جن لوگوں نے یہ جھوٹا مقدمہ بنایا تھا ان پر اپنے فیصلے میں سخت نکتہ چینی کی۔

## آرہ۔ ضلع شاہ آباد

ایک روز ایک مسلمان شوہر کو آریہ سماجیوں نے اس الزام میں گرفتار کر لیا (گویا یہ آریہ سماجی خود پولیس کے اہل کار تھے) کہ جو عورت اس کے ساتھ ہے وہ ہندو ہے۔ چنانچہ اسے تھانے لے جا کر حوالات میں بند کر دیا گیا۔ خوب ذلیل کرنے کے بعد اسے رہا کیا گیا کیونکہ کوئی شخص یہ ثابت نہ کر سکا کہ وہ عورت ہندو ہے۔ آریہ سماجیوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی۔

بھ نول۔ ضلع شاہ آباد

۲۵۔ مئی ۱۹۳۹ء کو ہندوؤں اور مسلمانوں میں کشیدگی ہوئی تو دو مسلمان قتل کر دیئے گئے۔ پولیس کو اطلاع کی گئی لیکن معاملہ رفع دفع کر دیا گیا اور قاتل صاف بچ گئے۔

سروان۔ ضلع سارن

ایک مسلمان منڈی سے گائے خرید کر گھر لے جا رہا تھا کہ ہندوؤں نے ایک ہندو چوکیدار کی مدد سے زبردستی گائے چھین لی۔ مسلمان کو ناحق پریشان کرنے کے بعد اس پر جھوٹا مقدمہ بنا دیا گیا لیکن وہ بری ہو گیا۔ تاہم گائے واپس نہ مل سکی اور مقدمے پر اس کا جو روپیہ خرچ ہوا وہ الگ۔ جن ہندوؤں نے یہ قبیح حرکت کی تھی ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہوئی۔

گور گھاٹ۔ ضلع سارن

جو واقعہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ اسی قسم کے دو واقعات اس گاؤں میں بھی پیش آئے۔

پچنچوپالی۔ ضلع سارن

اس گاؤں کے ہندوؤں نے اچانک مسلمانوں کو کنوئیں سے پانی بھرنے سے روک دیا۔ اور وجہ یہ بتائی کہ تم لوگ گائے کا گوشت کھاتے ہو حالانکہ مسلمان ہمیشہ ان کنوؤں سے پانی بھرا کرتے تھے۔ پولیس نے مسلمانوں کی کوئی مدد نہ کی۔

لوتھی۔ ضلع سارن

اس گاؤں کے ہندوؤں نے مسلمانوں کے ایک قبرستان پر قبضہ کر کے وہاں "کھدر بھنڈار" کی عمارت کھڑی کر دی۔ عدالتی تحقیقات سے جگہ کا قبرستان ہونا ثابت ہو گیا۔ لیکن زیادتی کا شکار ہونے والے مسلمانوں کے نقصان کی کچھ تلافی نہ کی گئی۔

بہادر پور۔ ضلع سارن

گاؤں کے ہندوؤں نے مسلمانوں کے قبرستان میں جا کر کچھ قبریں ڈھا دیں اور

مسلمانوں کو وہاں مردے دفن کرنے سے زبردستی منع کیا۔ ایک میت کو چوبیس گھنٹے تک دفن نہ کیا جا سکا۔ پولیس نے مسلمانوں کی مدد کی لیکن ہندوؤں نے ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو کر قبرستان پر قبضہ کر لیا۔ ہندوؤں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی۔

## ابوئی۔ ضلع سارن

ہندوؤں نے حملہ کر کے ایک مسلمان بزرگ علاول پیر کے مزار کو نقصان پہنچایا۔ اس مزار پر مسلمانوں کا دعویٰ تاریخی دستاویزوں سے ثابت ہو چکا ہے۔ احکام نے خواہ مخواہ مسلمانوں کو تنگ کیا اور ان پر مقدمے چلائے لیکن ہندوؤں کے خلاف جو شکایت کی گئی تھی اس کے بارے میں کوئی قدم نہ اٹھایا۔

## بھاگا۔ ضلع چمپارن

اس جگہ کے ہندوؤں کو دستور کے بالکل خلاف مسجد کے آگے سے مہابیری جھنڈے کا جلوس نکالنے کی اجازت دی گئی۔ اس گاؤں کے مسلمانوں سے متعدد ناانصافیاں اور زیادتیاں کی گئیں۔ مثلاً بازار سے مسلمان درزیوں کو نکال دیا گیا۔ ایک مسلمان کے کفن کے لئے کپڑا بیچنے سے انکار کیا گیا۔ مسلمانوں کی بہت سی دکانیں لوٹی گئیں اور مسلمانوں کا عام طور پر بائیکاٹ کیا گیا۔ ایک مرتبہ ایک ہندو دائی کو ایک مسلمان کے گھر جانے سے، جہاں بچہ پیدا ہونے والا تھا، زبردستی روک دیا گیا۔ مسلمان عورتوں پر بھی بہت سے حملے کئے گئے لیکن مجرموں کو سزا نہیں ملی۔

## بنولی۔ ضلع دربھنگہ

ایک مسلمان اپنی بیوی کو زنانہ سواری پر بٹھا کر کسی جگہ لے جا رہا تھا۔ دو کانگرسی ہندوؤں نے سواری روک کر اصرار کیا کہ اندر جو عورت بیٹھی ہے وہ ہندو ہے۔ اتفاق سے ایک ہندو لڑکے نے جو میاں بیوی دونوں کو جانتا تھا۔ شناخت کیا کہ وہ خاتون اپنے ساتھی کی بیوی ہے۔ لیکن اس خاتون کی بے پردگی اور بے عزتی ہوئی۔ مجرموں کو سزا نہ ملی۔

## بھاگل پور

بھاگل پور کے ان فسادات کے متعلق جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، ہندوؤں نے کھلم کھلا

انتہائی اشتعال انگیز اشتہار تقسیم کئے جن پر مصنف اور مطبع کے نام موجود ہیں۔ مجرموں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی۔ اشتہار ہمارے پاس موجود ہیں۔

## شیخوپورہ۔ ضلع مونگھیر

اس گاؤں میں مسلمانوں کو گائے کی قربانی سے روکا گیا۔ حالانکہ اس بارے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک مدت سے مفاہمت چلی آ رہی تھی۔ اس کے بعد مسلمانوں کے گھروں کو لوٹا گیا اور ایک مسلمان قتل کر دیا گیا۔ حکام نے کسی قسم کی کارروائی نہیں کی۔

## بٹھہ۔ ضلع مونگھیر

ایک مسجد کی دیوار توڑ دی گئی اور ہندو قرآن مجید اٹھا کر لے گئے۔ کسی ہندو پر مقدمہ نہیں چلایا گیا۔ اس کے برعکس مسلمانوں کو دھمکیاں دی گئیں کہ اگر انہوں نے ہندوؤں کے خلاف عدالتی کارروائی کی تو ان پر دفعہ نمبر ۲۱۱، تعزیرات ہند کے تحت مقدمہ چلایا جائے گا۔

## اسلام پور ہاٹ۔ ضلع پورنیہ

بعض کانگرسیوں نے مسجد کے بالکل سامنے مسلمانوں کی وقف زمین پر مندر تعمیر کیا۔ کانگرسی حکومت کے ڈر سے مسلمانوں نے چپ چاپ یہ زیادتی برداشت کی۔

## لکھی سرائے۔ ضلع مونگھیر

معمول کے مطابق مسلمانوں نے ایک جلوس نکالا۔ لیکن ہندوؤں نے جلوس کو درہم برہم کیا۔ اور مسلمانوں کے پانچ گھر لوٹ لئے گئے۔ مجرموں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی۔

## صاحب گنج۔ پرگنہ سنتھال

۱۔ ہندوؤں نے مہابیری جلوس مسجد کے آگے سے گذارا۔ مسلمانوں نے اس پر اعتراض کیا۔ چنانچہ ۲۹۔ مارچ ۱۹۳۹ء کو ہندوؤں نے مسلمانوں کی دکانیں لوٹ لیں۔ ان کا سامان اٹھا کر

گنگا میں پھینک دیا۔ اور دو مسلمان لڑکوں کو سخت زخمی کر دیا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی سختیاں کیں۔ ان تمام باتوں کی پولیس کو اطلاع کی گئی۔ لیکن اس نے ہندو مجرموں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی۔ اس کے بجائے سات مسلمانوں کو گرفتار کر کے تنگ کیا گیا۔ ان پر جھوٹے مقدمے چلائے گئے۔ اور جب ثبوت بہم نہ پہنچا تو انہیں رہا کرنا پڑا۔

۲۔ اس سب ڈویژن کے ایک ایس۔ ڈی۔ او کا مسلم کش رویہ شریف رپورٹ کی دوسری جلد میں تفصیل سے درج کیا جائے گا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس شخص نے مسلم لیگ کے سیکرٹری کو دھمکی دی تھی کہ "میں مسلمانوں کو گولی مار دوں گا اور انہیں سیدھا کر دوں گا"۔ ایس۔ ڈی۔ او کے خلاف ایک شکایت بابو راجندر پرشاد کو بھیجی گئی۔ جس میں تمام الزامات درج تھے۔ لیکن بابو راجندر پرشاد نے اس معمولی اخلاق کا ثبوت بھی نہ دیا کہ شکایت موصول ہونے کی رسید ہی بھیج دیتے۔

### کسادا۔ ضلع ہزاری باغ

یہاں کے مسلمانوں کو ایک کچی مسجد کی عمارت کو پختہ کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

## یو۔ پی

جن واقعات کا ذکر اوپر بہار کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ اسی قسم کے بہت سے واقعات یوپی میں بھی پیش آئے۔ ان میں سے چند ایک کا ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے۔

### دادری۔ ضلع بلیا

۲۰۔ نومبر ۱۹۳۷ء کو مویشیوں کی ایک منڈی میں مسلمانوں پر منظم حملہ کیا گیا۔ دو مسلمان شہید اور تقریباً پچاس زخمی ہوئے۔ ان کے مویشی اور مال لوٹا گیا۔ منڈی میں پولیس کی بھاری تعداد موجود ہونے کے باوجود یہ فساد ہوا۔ حکام کو پہلے سے خبردار کر دیا گیا تھا کہ ہندو فساد پر آمادہ ہیں۔ لیکن انہوں نے مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت نہ کی۔ مولانا احمد سعید جیسے مسلمان کانگرسی لیڈر تک نے علانیہ حکام کی مذمت کی۔ انہوں نے چند کانگرسی لیڈروں کے نام بھی لئے جنہوں نے ہندوؤں کو براہ راست مشتعل کیا تھا۔ ان ہندو

لیڈروں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی۔ یوپی کی حکومت نے ایک سرکاری بیان جاری کیا جس میں ہندوؤں کو الزام سے بچانے کی کوشش کی گئی۔ چند ہندوؤں پر مقدمہ چلایا گیا۔ لیکن بہت سے مجرموں سے بالکل باز پرس نہ ہوئی اور سرغنے کھلے پھرتے رہے۔

## گوجیکل۔ ضلع گورکھپور

اس گاؤں میں، جہاں دو سو ہندو گھرانوں کے درمیان صرف دو مسلمان خاندان آباد تھے۔ ۱۰۔ اگست ۱۹۳۷ء کو ایک مسلمان قتل کر دیا گیا۔ پولیس نے اس سلسلے میں مقامی کانگرس کمیٹی کے صدر اور بعض دوسرے لوگوں کا چالان کیا۔ لیکن عدالت نے انہیں ضمانت پر رہا کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۸۔ نومبر ۱۹۳۷ء کی رات کو مقتول کے خاندان کے باقی افراد کو بھی جن میں ایک سات سال کی لڑکی بھی شامل تھی قتل کر دیا گیا۔ پولیس کو پہلے سے اس خطرے سے آگاہ کر دیا گیا تھا لیکن انہوں نے حفاظت کی کوئی تدبیر اختیار نہ کی۔

## سیتاپور

۱۲۔ فروری ۱۹۳۸ء کو ہندوؤں کے ایک بہت بڑے ہجوم نے تیرتھ بازار میں مسلمانوں کی دکانیں لوٹ لیں اور دکانداروں کو مارا۔ مقامی کانگرس کمیٹی کے ممتاز لیڈر فسادیوں کی رہنمائی کر رہے تھے۔ اس کے بعد پیرا نامی گاؤں میں مسلمانوں کے گھر بار لوٹے اور جلائے گئے۔ یہ خالصتاً مسلمانوں کا گاؤں تھا اور اس میں ستر کے قریب گھر تھے جو سب کے سب جلا کر راکھ کر دیئے گئے۔ مسلمانوں کے گنے کے کھیتوں کو بھی جلا دیا گیا۔ پھر کانگرسی لیڈروں کی رہنمائی میں ایک مسلمان رئیس قاضی افتخار احمد کے مکان پر حملہ کیا گیا۔ بہت سے سرغنوں سے جو کانگرسی تھے، کسی قسم کا مواخذہ نہ کیا گیا۔

## زاہد آباد۔ ضلع گورکھپور

دستور کے بالکل خلاف یہاں ۱۹۳۸ء کی بقرعید پر مسلمانوں سے کہا گیا کہ گائے ہرگز ذبح نہ کریں۔ صوبے کی لیجسلیٹو اسمبلی کے دو مسلمان ممبر اور لیگ کے تقریباً تین سو رضا کار گرفتار کیے گئے۔ یوپی کی اسمبلی میں کانگرسی وزیروں نے ان واقعات کا ذمہ دار

مسلم لیگ کو ٹھہرا کر زخموں پر نمک پاشی کی۔ حالانکہ یہ ہندو تھے جنہوں نے تشدد پر اتر آنے کی دھمکیاں دی تھیں اور گائے کی قربانی زبردستی رکوا دی تھی۔

مراد آباد۔ بریلی اور بدایوں

ان شہروں میں منجملہ دوسری باتوں کے محرم کے دوران میں مسلمانوں پر پابندیاں عائد کر دی گئیں جن کی وجہ سے وہ اپنی قدیم مذہبی رسوم ادا نہ کر سکے۔ حالانکہ اور بہت سے مقامات پر ہندوؤں کو اپنی مذہبی رسوم ادا کرنے اور جلوس نکالنے کے سلسلے میں طرح طرح کی نئی حرکتیں کرنے کی اجازت دی گئی۔

باندہ

۱۹۳۸ء کی ہولی پر مقامی کانگرس کمیٹی کے ایک لیڈر کی رہنمائی میں یہاں کے ہندوؤں نے ہولی منانے کی غیر معمولی تیاریاں کیں۔ نماز کے وقت ایک مسجد کے سامنے سے بہت بڑا جلوس نکالا گیا اور نمازیوں پر جان بوجھ کر رنگ ڈالا گیا۔ مسجد کو ناپاک کیا گیا اور اس کے اندر اینٹیں اور کیچڑ پھینکا گیا۔ بعد میں ہندوؤں نے مسجد پر حملہ کیا اور ایک طرف کی دیوار کے کچھ حصے کو نقصان پہنچایا۔ مسجد میں جو لوگ موجود تھے ان میں سے بعض زخمی ہو گئے۔ ہندوؤں نے مسجد میں گھس کر دیوار پر لٹکی ہوئی گھڑی اور مُصلّے تباہ کر دیئے۔ اس کے بعد ایک مسلمان کی آٹے کی چکی اور ایک اور مسلمان کی موٹر کو آگ لگا دی گئی۔ اور بھی بہت سی ظالمانہ حرکتیں کی گئیں۔ اس واقعہ کے پندرہ دن بعد تک کسی ہندو کو گرفتار نہیں کیا گیا۔ تا آنکہ ثبوت بالکل تلف ہو گیا۔

موسیٰ پور۔ تحصیل دھام پور

ہولی پر یہاں بھی ہندوؤں نے مسلمانوں کی آبادی پر حملے کئے۔ بہت سے مسلمان زخمی ہوئے ایک کے شدید چوٹیں آئیں۔ اگرچہ گاؤں کی تقریباً ساری مسلم آبادی زخمی ہو گئی تھی۔ لیکن صرف پندرہ مسلمانوں کو جن میں دو عورتیں بھی شامل تھیں، بجنور کے ہسپتال بھیجا گیا۔ پولیس کی تفتیش ناقص تھی۔ اور معلوم ہوا ہے کہ ہسپتال میں زخمیوں کے ساتھ بدسلوکی کی گئی۔ مسلمانوں کو دفعہ ۱۴۴ کی رو سے گائے ذبح کرنے سے روک دیا گیا۔ حالانکہ دیوانی عدالت کئی سال پہلے انہیں ذبیحہ گاؤ کا حق دے چکی تھی۔

### محمد پور اور جام داد پور۔ ضلع بجنور

۱۹۳۸ء کی ہولی پر، اول الذکر مقام پر ہندوؤں کا ایک گروہ مسلمانوں کے گھروں میں گھس گیا۔ مسلمانوں پر رنگ ڈالا۔ املاک کو نقصان پہنچایا اور ایک مسلمان خاتون پر دست درازی تک کی۔ ثانی الذکر مقام پر بھی مسلمانوں کو اسی طرح ستایا گیا اور مسجد کے فرش اور دیواروں پر رنگ ڈالا گیا۔ لیکن مفسدہ پردازوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی۔

بنارس، ۱۹۳۸ء

مارچ ۱۹۳۸ء میں ہولی کے فسادات پر مسلمانوں کو جان و مال کا بہت سا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ بہت سے مسلمان زخمی ہوئے۔ ایک ہندو دکان دار نے گولی چلا کر کئی مسلمانوں کو زخمی کر دیا لیکن ایک کانگرسی وزیر نے لیجسلیٹو اسمبلی کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے اس حادثے کو بہت معمولی قرار دیا۔ بندوق کو محض "بچوں کا کھلونا" بتایا اور دکان دار کے فعل کو "حفاظت خود اختیاری" کہہ کر اس کی حمایت کی۔ یوں اس سارے معاملے کے بارے میں قبل از وقت رائے قائم کر لی گئی جس سے مقامی حکام کو ایک خطرناک وطیرہ اختیار کرنے کا جواز مل گیا۔ مسلمانوں کے تمام محلوں میں پولیس مشکل ہی سے نظر آتی تھی۔

بنارس، ۱۹۳۹ء

محرم کے دوران میں بار بار ایسی حرکات کی گئیں جن سے مسلمانوں کو اشتعال دلانا مقصد تھا۔ لیکن مفسدوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی۔ ایک ہندو پنڈت نے شہر کے مجسٹریٹ کو تحریری عرضداشت پیش کی جس میں واضح الفاظ میں کہا گیا تھا کہ ہندو فساد شروع کرنے اور مسلمانوں کو قتل کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ پنڈت نے ان ۱۱۷ ہندوؤں کے نام بھی لکھے جو اس سازش میں شریک تھے لیکن حکام نے کوئی قدم نہ اٹھایا۔ اشتعال انگیز اشتہار جن میں ہندوؤں کو تشدد پر اکسایا گیا تھا اور اعلیٰ حضرت نظام حیدر آباد کی توہین کی گئی تھی علانیہ بانٹے گئے۔ ان اشتہاروں کی تقسیم کو روکنے کا کوئی بندوبست نہ کیا گیا۔

۳ مارچ ۱۹۳۹ء کو ہندوؤں کو ایک بہانہ مل گیا اور انہوں نے فساد شروع کر دیا جس کا منصوبہ وہ بہت پہلے سے بنا چکے تھے۔ اگلے روز صوبے کا ایک ہندو کانگرسی وزیر بنارس آیا اور اس نے حکام اور کانگرس کے مقامی لیڈروں سے خفیہ صلاح مشورہ کیا۔ اس کے بعد مقامی حکام نے عمداً مسلمانوں کو تنگ کرنا شروع کیا۔ کرفیو کے اوقات میں انہیں معدودے چند پرمٹ دیئے جاتے تھے۔ اس کے برعکس ہندوؤں کو ان سے بیس گنا زیادہ پرمٹ جاری کیے گئے اور وہ شہر بھر میں ہر طرف بڑی آزادی سے گھومتے پھرتے تھے مقامی کانگرسی لیڈروں نے (جن کے نام بتائے جا سکتے ہیں) ناجائز طور

پر پولیس کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ تھانوں میں جا بیٹھے جو مسلمان شکایت لے کر آتے انہیں مار کر بھگا دیتے اور پولیس کو بہلا پھسلا کر ان ہندوؤں کو رہا کرا لیتے جو گرفتار ہو کر آتے تھے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے طریقوں سے ہندوؤں کی مدد اور مسلمانوں کو تنگ کرتے رہے۔ ان حالات کے پیش نظر مسلمانوں کے جانی اور مالی نقصان کی مکمل تفصیل حاصل ہی نہ ہو سکی۔

ان فسادات کے دوران خاص بنارس اور اس کے مضافات میں دس مسجدیں مکمل یا جزوی طور پر مسمار کر دی گئیں حکام نے محض کانگرسی حکومت کے کہنے پر اور اپنے ضمیر کے خلاف مسلم لیگ کے مقامی سیکرٹری کا چالان کر دیا۔ لیکن اس غریب کے خلاف جو الزام لگائے گئے وہ اس قدر بے بنیاد تھے کہ فسادات کی تحقیقات کرنے والے ہندو مجسٹریٹ کو اسے بری کرنا پڑا اور استغاثے پر سخت نکتہ چینی کرنا پڑی۔ مسلم لیگ کے عہدیداروں کو اس طرح دیدہ دانستہ پریشان کیا گیا۔

**ہاپوڑ**

مزاروں کی بے حرمتی کی گئی اور قبرستان میں ہل چلا دیا گیا۔ مجرم ہندوؤں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی۔

**سیانہ**

۱۵ مئی ۱۹۳۹ء کو ایک مسلمان قصائی کو بری طرح زدوکوب کیا گیا۔ مقامی مسجد کے امام نے پولیس کو اطلاع دی تو اسے بھی مارا پیٹا گیا۔ اس کے بعد امام کو آتش زنی کے ایک مقدمے میں پھانس دیا گیا۔ اور بھی کئی مسلمانوں کو مارا پیٹا گیا۔ مسلمانوں کو زبردستی اس بات پر رضامند کرنے کی کوشش کی گئی کہ گائے کا گوشت کھانا چھوڑ دیں۔ حکام نے مسلمانوں کی کوئی حفاظت نہ کی۔

**ہرنوئی۔ ضلع بلند شہر**

یہاں کے مسلمانوں کو مجبور کیا گیا کہ ایک مندر کی تعمیر کے لئے چندہ دیں۔ ابتداء میں مسلمانوں نے احتجاج کیا تو ان کا بائیکاٹ کر دیا گیا اور انہیں گاؤں کے کنوئیں سے پانی بھرنے اور چراگاہ میں مویشی چرانے سے روکا گیا۔ آخر کار وہ ہندوؤں کی بات ماننے پر مجبور ہو گئے۔ حکام نے اس سلسلے میں مسلمانوں کی کوئی حفاظت نہ کی۔

**ہنڈوہ۔ ضلع بدایوں**

یہاں مسلمانوں کو کئی بار گائے ذبح کرنے کی تحریری اجازت ملتی رہی تھی۔ لیکن ۱۹۳۹ء میں کوئی وجہ بتائے بغیر یہ اجازت بند کر دی گئی۔

**نگلا شرقی۔ ضلع بدایوں**

مسلمانوں کے مذہبی جلوسوں پر ناجائز پابندیاں لگا دی گئیں۔ مسلم لیگ کے رہنماؤں کو گرفتار

اور پریشان کیا گیا اور ان پر دفعہ نمبر ۱۰۷ ضابطہ فوجداری کے تحت مقدمہ دائر کیا گیا۔ یہاں جھگڑا کھڑا کرنے میں لیجسلیٹو اسمبلی کے دو کانگرسی رکن پیش پیش تھے۔

اڑیہ۔ ضلع اٹاوہ

مسلم لیگ کا اجلاس کرنے اور پھر اسی پنڈال میں اچھوتوں کو اپنی کانفرنس کرنے کی اجازت دینے کے جرم میں مسلمانوں کا مکمل بائیکاٹ کیا گیا۔ بائیکاٹ کا اعلان کرنے کے لئے مطبوعہ اشتہار تقسیم کئے گئے۔ ایک مقامی مسلمان کے بازار کا بھی بائیکاٹ کیا گیا اور عام ہندوؤں کو خرید و فروخت کے لئے اس بازار میں جانے سے زبردستی روکا گیا مسلمانوں کو گاؤں کے کنوؤں سے پانی نہ بھرنے دیا گیا اور اپنا کنواں کھودنے سے روکا گیا۔ حکام نے کوئی کارروائی نہ کی۔

سوریہ۔ ضلع اٹاوہ

۷۔ مارچ ۱۹۳۹ء کو ہندوؤں کے ایک بہت بڑے مسلح مجمع نے گاؤں کا محاصرہ کر لیا۔ اور یہ بہانہ بنا کر کہ مسلمانوں نے دو ہندوؤں کو مار ڈالا ہے، یہاں کے مسلمانوں کا قتل عام کرنا چاہا۔ مسلمانوں پر جو الزام لگایا گیا وہ جھوٹا ثابت ہوا۔ لیکن مجمع کے سرغنوں کے خلاف جو مسلمانوں کو مارنے کے ارادے سے آئے تھے، کوئی کارروائی نہ کی گئی۔

اترولی۔ ضلع علی گڑھ

ہندوؤں نے مسلمانوں کو زبردستی کانگرس کے ممبر بنانے کی کوشش کی۔ اسکول کے ایک مسلمان ٹیچر نے ممبر بننے سے انکار کیا تو اس پر جھوٹ موٹ ایک جرم کا الزام لگایا گیا۔ اور بغیر کسی تحقیقات کے اسے برخاست کر دیا گیا۔ پولیس کے ایک مسلمان سب انسپکٹر نے جو چھٹی پر تھا۔ ایک عدالتی تحقیقات کے دوران میں مقامی مسلمانوں کی طرف سے گواہی دی۔ بعد میں اُسے کئی مہینے تک پریشان کیا گیا اور آخر ایک فوجداری مقدمے میں ماخوذ کر لیا گیا۔ اُس جگہ ایک مسجد ہے جس کے سامنے سے پہلے کبھی کسی جلوس کو باجے گاجے کے ساتھ گزرنے کی اجازت نہ ملی تھی۔ ۱۹۳۹ء میں ہندو زبردستی وہاں سے جلوس نکالنے پر مصر تھے۔ اس کے نتیجے میں جو گڑبڑ ہوئی اُس کی تحقیقات کے لئے مسلمانوں کے احتجاج کے باوجود عیدالاضحیٰ کا دن چنا گیا۔ مسلمانوں کے معزز رہنماؤں کو خواہ مخواہ گرفتار کر کے پریشان کیا گیا۔

قطب پور۔ ضلع علی گڑھ

یہ بہانہ بنا کر کہ ایک مسلمان نے ایک بچھیا زخمی کر دی ہے، مسلمانوں پر دھاوا بول دیا گیا۔ مسجد کے مینار توڑ ڈالے اور مسلمانوں کی دکانیں لوٹ لیں۔ پولیس نے کوئی کارروائی نہ کی۔ بلکہ اس کے برعکس ہندوؤں کو یہ موقع دیا کہ مسلمانوں سے ایسے "معاہدے" پر زبردستی دستخط کروا لیں جس

کی شرطیں انتہائی ذِلّت آمیز تھیں۔

## ہاتھرس

مسلمانوں کی دو دکانیں لُوٹی گئیں اور انہیں اتنا دہشت زدہ کر دیا گیا کہ وہ اپنی شکائتوں کا ذکر کرتے ہوئے بھی ڈرتے'اِس دنگے کا سبب یہ تھا کہ مئی ۱۹۳۹ء میں مسلمان پولیس افسر نے ایک ہندو کو گرفتار کر لیا تھا۔ہندو مجرموں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی۔ اِس کے برعکس اُنہیں اجازت دی گئی کہ جلسے منعقد کریں اور اشتعال انگیز تقریریں کریں۔

## گنیش پور تحصیل

اتروَلی کے قریب گنیش پور تحصیل میں ایک مسلمان کو. جو اپنے گھر کے سامنے ایک چبوترے پر نماز پڑھا کرتا تھا بڑی بے دردی سے مارا پیٹا گیا۔ وجہ یہ تھی کہ اُس نے وہاں نماز پڑھنی ترک کرنے سے انکار کیا تھا۔ فسادیوں نے چبوترہ منہدم کر دیا۔ بعدازاں اُس مسلمان کا بھی بائیکاٹ کیا گیا۔ اور اُس کے گھر کی عورتوں کی بے عزتی کی گئی۔ آخر کار وہ عورتوں کو گاؤں سے باہر بھیجنے پر مجبور ہو گیا مجرموں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی۔

## سارناتھ (نزدیک بنارس)

یکم اگست ۱۹۳۸ء کو ہندوؤں کے ایک میلے میں مسلمانوں پر اچانک حملہ کیا گیا. اور اندھا دھند مارا پیٹا گیا۔ فساد کے سرغنوں سے کوئی باز پُرس نہ کی گئی۔

## انولہ (بریلی)

۱۴۔ مئی ۱۹۳۹ء کو عید میلادالنبیؐ کے موقع پر ہندوؤں نے یکایک مسلمانوں کے ایک جلوس پر حملہ کر دیا۔ متعدد مسلمان زخمی ہوئے۔ لیکن فساد کرنے والے ہندوؤں سے کوئی باز پرس نہ کی گئی۔

## آگرہ

مارچ ۱۹۳۸ء میں الہ آباد میں جو فسادات ہوئے تھے اُن کی روداد کا مناسب طور پر لب لباب پیش کرنا ممکن نہیں۔ اِتنا کہنا کافی ہو گا کہ ۱۹۳۸ء کے محرّم کے دوران میں حکام نے اُس قدیم دستوُر پر عمل کرنے سے انکار کر دیا جس کے مطابق براتوں کو اُن راستوں سے نہیں گزرنے دیا جاتا تھا جن سے تعزیئے نکل رہے ہوں۔ محرّم سے پہلے دفعہ نمبر ۱۴۴ لگا دی گئی اور مسلمانوں کو یہ کہہ کر دھمکایا گیا کہ فساد کرنے والوں کو فوج گولی سے اڑا دے گی۔ اس کے بعد ۹ محرم (۱۲ مارچ) کی رات کو ہندوؤں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے روبرو ایک تعزیہ چھین کر توڑ پھوڑ دیا۔ مسلمانوں نے جس تحمل سے کام لیا اس کی تعریف ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اپنی رپورٹ میں کی۔ پولیس نے استغاثے کی کارروائی میں اتنے پھوہڑپن

کا ثبوت دیا کہ تعزیئے کے حادثے میں جو لوگ ماخوذ تھے انہیں سزا نہ مل سکی حالانکہ خود ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے عدالت میں ہندوؤں کے تشدد آمیز رویئے کی گواہی دی تھی۔ ہولی کے تہوار پر، جو چند دن بعد شروع ہوا۔ ہندوؤں پر دفعہ نمبر ۱۴۴ کے تحت کوئی پابندی نہ لگائی گئی۔ یہاں تک کہ فسادات شروع ہو گئے اور مسلمانوں کو مارا پیٹا، لوٹا اور قتل کیا جانے لگا۔ ان حادثوں کی پوری تفصیل جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حکام نے جانبداری سے کام لیا اور مسلمانوں کو ناجائز طور پر ستایا گیا۔ الہ آباد کے مسٹر ظہور احمد کے بیان اور پیرپور رپورٹ میں موجود ہے۔

### اوائل۔ ضلع الہ آباد

ہندوؤں نے ایک ایسے گاؤں سے جہاں بیشتر آبادی مسلمانوں کی تھی۔ دستور کے خلاف زبردستی رام لیلا کا جلوس گزارنے کی کئی بار کوشش کی لیکن حکام نے انہیں منع کیا۔ اس پر ہنود ناراض ہو گئے اور انہوں نے انتقام لینے کے لئے راہ چلتے مسلمانوں کو مارنا پیٹنا اور ان پر اکا دکا حملے شروع کر دیئے۔ مسلمان بچوں کے لئے سکول اور مسلمانوں کے لئے صحیح سلامت بازار تک جانا محال ہو گیا۔ مسلح ہندو ادھر ادھر گھومتے پھرتے تھے اور انتقام لینے کی دھمکیاں دیتے تھے۔ بعض مقامی ہندو افسروں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے صورت حال سے اغماض کیا۔ قانون کی یہ نافرمانی ایک عرصے تک جاری رہی اور مسلمانوں کو کسی قسم کی حفاظت نہ مل سکی۔

### رائے پور، ضلع پیلی بھیت

جولائی ۱۹۳۷ء اور یاد رہے کہ یہ وہی مہینہ ہے جس میں کانگرسی وزارت قائم ہوئی تھی مسلمانوں کو ستانے اور ڈرانے دھمکانے کا آغاز ہوا۔ جب ان کی جان ضیق میں آگئی تو مسلمانوں نے کھمریا نامی گاؤں کو ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب وہ اپنا مال و اسباب بیل گاڑیوں پر لاد کر لے جا رہے تھے تو ہندوؤں نے زبردستی انہیں روکنے کی کوششیں کی۔ ہندوؤں کے ایک بڑے ہجوم کے سرغنے کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی۔ اس فساد کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں پر مقدمے چلائے گئے۔ لیکن ہندوؤں کے سرغنے جنہوں نے بغیر کسی اشتعال کے حملہ کیا تھا اور جن میں سے بعض کانگرس کے مقامی لیڈر تھے بالکل بچ گئے۔

### ٹانڈہ، ضلع فیض آباد

مسلمانوں پر ۲۱ اگست ۱۹۳۸ء کو ہولناک مظالم ڈھائے گئے۔ مسلمانوں نے اپنی مسجد کے آگے سے ہندوؤں کے ایک جلوس کو باجے گاجے کے ساتھ گزرنے کی اجازت دینے سے اس لئے انکار کر دیا تھا کہ اس بات کا قدیم رواج کے مطابق کوئی جواز نہ تھا۔ اس گناہ پر مقامی حکام نے مسلمانوں کے پرامن مجمع پر گولی چلانے کا حکم دیا۔ مسلمان ہلاک اور زخمی ہوئے اور فائرنگ کے

بعد پولیس نے مسلمانوں کو زدو کوب کیا۔ پولیس والے مسلمانوں کے گھروں میں داخل ہو گئے اور سوئے ہوؤں تک کو گرفتار کر لیا جن میں بچے اور بوڑھے بھی شامل تھے۔ مارشل لاء کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس جگہ سے بذریعہ ریل گاڑی سفر کرنا ممنوع قرار دے دیا گیا۔ تار برقی کے ذریعہ سے خبروں کی ترسیل روک دی گئی اور مسلمانوں کی اتنی بری گت بنائی کہ ان کا حال زار اور خوف و ہراس بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ان حقائق کی تصدیق ان بیانات سے ہوتی ہے جو خود ٹانڈہ کانگرس کمیٹی کے صدر نے اور مولانا حسین احمد مدنی نے جو کانگرس کے بہت بڑے حامی تھے شائع کئے تھے۔ خود ان کانگرسیوں نے ہندو سب ڈویژنل افسر اور مقامی پولیس کے طرز عمل پر شدید نکتہ چینی کی۔ یوپی کی حکومت نے طویل تاخیر کے بعد جسٹس یورک کو تحقیقات کرنے پر مامور کیا، لیکن اس وقت تک تمام ثبوت دبا دیا گیا تھا۔ اسی لئے مسلمانوں نے اس لاحاصل اور بعد از وقت تحقیقات کا بائیکاٹ کر دیا۔ اس دوران میں کانگرس کے ہندو لیڈر کھلم کھلا اپنے آپ کو حق بجانب قرار دیتے رہے کہ انہوں نے مسلمانوں پر جو سختیاں کی ہیں وہ بالکل درست تھیں۔

## علی گڑھ

۲۶- جنوری ۱۹۳۹ء کو سیوا سمتی کے ہندو والنٹیروں نے بغیر کسی اشتعال کے مُسلم یونیورسٹی کے کچھ طلبہ پر حملہ کر دیا۔ ایک ذمہ دار ہندو پولیس افسر اور ایک کانسٹیبل نے ہندو والنٹیروں کی حمایت کی اور حکم دیا کہ مُسلمانوں پر لاٹھی چارج کیا جائے۔ ایک ہندو سب انسپکٹر پولیس نے تو ریوالور کے فائر بھی کئے۔ یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر نے اِس بارے میں پریس کو جو بیان دیا تھا۔ اُس میں اِس واقعہ کی تفصیلات موجود ہیں۔

## زمانیا۔ ضلع غازی پور

۱۳- جون ۱۹۳۸ء کو ہندوؤں کے ایک ہجوم نے کسی اشتعال کے بغیر تین مسلمانوں پر حملہ کر دیا جو اِکّے میں بیٹھے غازی پور جا رہے تھے۔ وہ بُری طرح زخمی ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے پولیس کو حملہ آوروں کے نام بتائے لیکن ہندو سب انسپکٹر نے اس بناء پر اُس کا یہ مرتے دم کا بیان قلم بند نہیں کیا کہ زخمی کی ذہنی حالت "اطمینان بخش نہ تھی"۔ کچھ ہی دیر بعد وہ آدمی ہسپتال میں فوت ہو گیا۔ باقی دو نے شکایت کی کہ ہسپتال کا ہندو ڈاکٹر اُن کا ٹھیک علاج نہیں کر رہا۔ اور اگرچہ اُن کی حالت ابھی نازک تھی لیکن وہ ڈر کے مارے ہسپتال سے رخصت ہو گئے۔ زمانیا کے مسلمانوں کو اور بھی کئی طرح سے پریشان کیا گیا۔ ہندو سب انسپکٹر پر یہ الزام

لگایا گیا کہ اُس نے جانب داری سے کام لے کر اپنے فرائض سے کوتاہی کا ثبوت دیا ہے۔ لیکن حکام نے کوئی کارروائی نہ کی۔

## سی۔ پی اور برار

ذیل میں ایک بہت مختصر سا بیان درج کیا جاتا ہے جس سے یہ بالکل واضح ہو جائے گا کہ کانگرسی راج میں اِس صوبے کے مسلمانوں پر کیا کچھ بیتی:

۱۔ ہندو مہا سبھا کے لیڈروں اور اُن کے گماشتوں کو مسلمانوں کے خلاف انتہائی زہریلا پروپیگنڈا کرنے کی کھلی چھٹی دے دی گئی۔ در آں حالیکہ مسلم لیگ کے رہنماؤں اور کارکنوں کی خاصی بڑی تعداد سے مچلکے لئے گئے یا اُن پر تعزیراتِ ہند کی مختلف دفعات کے تحت مقدمے چلائے گئے۔ فرقہ پرست ہندو اخباروں پر کوئی روک ٹوک عائد نہ کی گئی۔ حالانکہ اُن میں سے بعض جو مراٹھی زبان میں شائع ہوتے تھے، انتہائی اشتعال انگیز مواد چھاپتے رہے۔ اِس کے برعکس تقریباً سبھی مسلمان اخباروں کے خلاف اس سے کہیں کم اشتعال انگیز تحریریں شائع کرنے پر قانونی کارروائی کی گئی۔

۲۔ اکولہ، ناگ پور، کھام گاؤں، ملکہ پور اور کھنڈوہ کے مسلمانوں نے بار بار شکایت کی کہ بعض آریہ سماجی کارکن اشتعال انگیز تقریریں کر رہے ہیں، لیکن حکومت نے کوئی پروا نہ کی۔ صرف ایک آریہ سماجی پر دفعہ نمبر ۱۵۳ تعزیرات ہند کے تحت مقدمہ چلایا گیا جو حکومت نے جلد واپس لے لیا۔ شخصِ مذکور نے بھوک ہڑتال کر دی اور ہندوؤں نے تشدد آمیز مظاہرے اور ہڑتالیں شروع کر دیں، جن سے حکومت صریحاً مرعوب ہو گئی۔ اِس کے برعکس معزز مسلمانوں پر کہیں معمولی خطاؤں کی بنا پر مقدمے چلائے گئے اور سزائیں دی گئیں۔

۳۔ متعدد مقامات پر قدیم دستور کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ہندوؤں کے بڑے بڑے جلوسوں کو مسجدوں کے سامنے سے گذرنے دیا گیا اور کئی مرتبہ مسجدوں کی بے حرمتی کی گئی اور ان کی املاک تباہ کر دی گئیں۔ ایسے واقعات پنڈورنا (تحصیل سونہ) بٹن سنگی (تحصیل ناگ پور) گڈی گودام (ناگ پور ٹاؤن) دہمتری (ضلع رائے پور) تو گاؤں (ضلع چاندہ) کھام گاؤں، کرہ، ملکہ پور، چندربسوہ (برار) میں اور دوسری جگہوں پر پیش آئے۔

۴۔ اِس قسم کے متعدد واقعات پیش آ چکے ہیں کہ ہندو مہاسبھا کے شرپسندوں کے مسلح گروہ نے اُن عورتوں کو بے خوف و خطر زبردستی اغوا کر لیا جو پہلے ہندو تھیں اور بعد کو اپنی مرضی سے مسلمان ہو کر مسلمانوں سے شادیاں کر چکی تھیں۔ پولیس میں رپٹ لکھانے کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ناگ پور ان واقعات کے لئے بدنام ہو گیا ہے۔ اِس قسم کا صرف ایک معاملہ عدالت تک پہنچ سکا۔ باقی کا سراغ تک نہ مل سکا۔

۵۔ کھام گاؤں میں مسلح ہندوؤں کا ایک گروہ یہ بہانہ تراش کر کہ ایک ہندو عورت کو مسلمان کر لیا گیا ہے. زبردستی ایک مسلمان کے گھر میں گھس گیا۔ یہ الزام بے بنیاد تھا لیکن مسلمان کو بُری طرح زدوکوب کیا گیا۔ اِسی تعلقے کے ایک گاؤں بھیڑا میں بھی اِسی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ بعض بڑے بڑے نامور ہندو لیڈروں کی قیادت میں ہندوؤں کا گروہ اِسی انداز سے مسلمانوں کے بہت سے گھروں پر حملہ آور ہوا۔ گھر والوں کو مارا پیٹا اور املاک تباہ کر دیں لیکن مجرموں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی۔

۶۔ برار میں ضلع بلدانہ کے ایک گاؤں لونر میں میٹھے پانی کا صرف ایک کنواں تھا. جہاں سے مسلمان پینے کا پانی لے سکتے تھے۔ یہ کنواں قدیم زمانے میں مسلمان بادشاہوں نے بنوا کر دیا تھا۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کو وہاں سے پانی بھرنے سے منع کر دیا۔

۷۔ ۱۹۳۵ء میں ناگ پور اور اروی کے فسادات میں جو مسلمان مارے گئے تھے، اُن کے قاتل جیل میں طویل میعاد کی سزائیں بھگت رہے تھے۔ لیکن کانگرسی وزارت کے برسرِاقتدار آتے ہی اُنہیں رہا کر دیا گیا۔

۸۔ ۱۹۳۸ء میں جبل پور میں جو فسادات ہوئے تھے ان میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے حصہ لیا تھا۔ اِن فسادات کے سلسلہ میں جو مقدمے چل رہے تھے وہ واپس لے لئے گئے۔ لیکن دوسری جگہوں پر اسی نوعیت کے مقدمے صرف اِس لئے واپس نہیں لئے گئے کہ ملزم مسلمان تھے۔ جبل پور کے فسادات میں چار مسلمان ہلاک ہوئے تھے۔ اِس لئے غالب امکان یہی تھا کہ مسلمانوں کی بہ نسبت ہندوؤں کو زیادہ سخت سزائیں ملیں گی۔ لہٰذا جبل پور میں مقدمے واپس لے لئے گئے۔

۹۔ غیر جانب داری سے تحقیق کی جائے تو پتا چلے گا کہ اس صوبے میں بیشتر فساد ہولی کے موقع پر ہوئے اور سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو اٹھانا پڑا۔ اِس کے باوجود سزا پانے والوں میں مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔

۱۰۔ کٹنی کے مقام پر ایک بے گناہ مسلمان لڑکے کو قتل کر دیا گیا۔ چند بارسوخ ہندو گرفتار

ہوئے اس پر ہندوؤں نے احتجاجی جلسے اور مظاہرے کئے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گرفتار ہونے والے اشخاص کو رہا کر دیا۔ اُس لڑکے کے قتل کے جرم میں کسی آدمی پر مقدمہ نہیں چلا۔

۱۱۔ کھنگی کے مقام پر ایک مسلمان نوجوان حوالات میں مشتبہ حالات میں مر گیا۔ اس کے جسم پر زخموں کے نشان تھے۔ حکومت نے مجرموں کو گرفتار کرنے کے لئے کوئی قدم نہ اٹھایا۔

۱۲۔ چندر بسوہ کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہاں ایک فساد میں ہندو اور مسلمان دونوں زخمی ہوئے اور ایک ہندو مارا گیا۔ اس کے فوراً بعد گاؤں کی تمام بالغ مسلمان آبادی کو گرفتار کر لیا گیا۔ کانگرسی وزیراعظم نے اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے گاؤں کے تمام مسلمان باشندوں کو شدومد سے مجرم ٹھہرایا۔ ماتحت افسروں کو اتنا اشارہ کافی تھا۔ چنانچہ ۱۵۷ مسلمانوں کو جن میں بچے بوڑھے اور بیمار بھی شامل تھے۔ حوالات میں بند کر کے بڑی اذیتیں پہنچائی گئیں۔ آخر میں صرف ۴۳ آدمیوں پر مقدمہ چلا۔ باقیوں کو اگرچہ رہا کر دیا گیا لیکن اُنہوں نے بہت تکلیفیں اٹھائیں۔ پولیس نے گاؤں پر چھاپہ مارتے اور مسلمانوں کو گرفتار کرتے وقت بہت زیادتیاں کیں۔ بعدازاں گاؤں میں تعزیری پولیس تعینات کر دی گئی۔ حالانکہ ایڈووکیٹ جنرل نے عدالت کے سامنے یہ تسلیم کیا تھا کہ اس وقت اس علاقے میں کوئی کشیدگی نہ تھی۔

۱۳۔ صوبے بھر کے ہندو اپنے اخباروں اور عام جلسوں کے ذریعہ سے بلا روک ٹوک یہ پروپیگنڈا کرتے رہے کہ مسلمانوں کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے۔ اس طرح مسلمانوں کی تجارت اور کاروبار کو بڑا نقصان پہنچا۔ ہندوؤں سے کھلم کھلا کہا گیا کہ وہ مسلمانوں سے سودا نہ خریدیں۔ مسلمانوں سے اگر کچھ مال خرید چکے ہیں تو اُس کی قیمت ادا نہ کریں۔ بہت سے مقامات پر مسلمانوں کی دکانوں کی ناکہ بندی کی گئی۔ دیہات میں رہنے والے مسلمان فقیروں کو وہاں سے نکال دیا گیا۔ عید گاہوں کی بے حرمتی کی گئی۔ بسوہ میں محرّم کے موقع پر تعزیئے پر اور مسجد اور اسلامی کتب خانے پر گوبر اور پاخانہ پھینکا گیا۔ لوکل باڈیز کے ذمہ دار افسروں نے مسلمان مزدور بھرتی کرنے پر مسلمان ٹھیکیداروں کو ڈانٹ ڈپٹ کی۔ مسلمان تانگے والوں اور ٹیکسی ڈرائیوروں کا بائیکاٹ کر دیا گیا۔ اور کارخانوں اور نجی اداروں میں کام کرنے والے مسلمانوں کو رفتہ رفتہ نکال دیا

گیا۔

۱۴۔ مندرجہ ذیل توہین آمیز نعرے ہندوؤں کے جلوسوں کا معمول بن گئے تھے۔ "ہندوستان ہندو کا ہے نہ کسی کے باپ کا"۔ "نظام بے شرم" "نظام مردہ باد" "مسلمان بے شرم"۔ "اسلام مردہ باد"۔ پولیس اِس نعرے بازی کا کوئی نوٹس نہ لیتی تھی۔

۱۵۔ ملکہ پور میں نماز کے وقت ایک مسجد کے آگے سے باجے گاجے کا جلوس نکالنے کی کوشش کی گئی۔ محرّم کے موقع پر ایک تعزیہ جلا دیا گیا۔ کئی مسلمانوں پر جنھوں نے صلح کرانے کی کوشش کی تھی، لاٹھیوں اور برچھوں سے حملہ کیا گیا۔

۱۶۔ مرتضٰی پور میں مسلمانوں نے میلادالنبیؐ کا جلسہ کیا۔ عین اسی وقت آریہ سماجیوں نے حیدر آباد کے خلاف جلسے کئے۔ مسلمانوں کے جلسے پر ہندوؤں نے پتھر پھینکے۔ لیکن مقدمہ صرف مسلمانوں پر چلا۔

۱۷۔ مسٹر شریف کو اس بناء پر وزارت سے برطرف کر دیا گیا کہ انھوں نے ایک ایسے مسلمان کو رہا کروایا تھا جو ایک ہندو لڑکی پر دست درازی کے جرم میں سزا بھگت رہا تھا۔ لیکن کانگرسی وزارت نے ہوشنگ آباد کے ایک پنواڑی کی، جو کہیں زیادہ سنگین جرم کا مرتکب ہوا تھا، سزائے موت معاف کر دی۔ اس مقدمے میں مقتولہ مسلمان عورت تھی اور ملزم ہندو تھا۔ یہی ایک مثال وزارت کی ذہنیت کا پتا دینے کے لئے کافی ہے۔

۱۸۔ ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ لوکل باڈیز کے حکام نے اپنے مسلمان ملازموں پر ناجائز دباؤ ڈالا کہ وہ کانگرس کے رکن بننے پر مجبور ہو جائیں۔

۱۹۔ بہت سے مقامات پر مویشیوں کی خرید و فروخت اور ذبیحہ پر ٹیکس یا فیس لگا دی گئی۔ جن میونسپل کمیٹیوں نے گائے کی قربانی کی بہت بھاری فیسیں عاید کیں اور مویشیوں کی فروخت پر پابندیاں لگانے کی غرض سے ذیلی قوانین وضع کئے، ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں: کھام گاؤں۔ نندورہ۔ چکلا۔ بلدانہ۔ اکولہ۔ کرنجا۔ مرتضٰی پور۔ ارکاٹ۔ دھمن گاؤں۔ یوت محل۔ امراؤتی۔ گھٹنلجی۔ ڈن۔

۲۰۔ کھام گاؤں میں میونسپل کمیٹی نے مسلم ہائی سکول کو گرانٹ دینے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ اس سے پہلے سکول کو ہمیشہ گرانٹ ملا کرتی تھی۔

۲۱۔ آر جمانی بی۔ جی تلک اور مسٹر گاندھی کے یوم ولادت کو عام چھٹی کے دن قرار دے دیا گیا۔ مہاتما کا لقب سرکاری طور پر تسلیم کر لیا گیا اور مسلمانوں سے کہا گیا کہ وہ مہاتما کہا کریں۔

۲۲۔ کئی مقامی بورڈوں نے اردو سکولوں کو تحریری احکام جاری کئے کہ وہ گاندھی کا یوم پیدائش منائیں اور مسٹر گاندھی کی مورتی کی پوجا کریں۔

۲۳۔ بیتگن ہاٹ کی میونسپلٹی نے سوڈا واٹر کے کاروبار پر، جو زیادہ تر مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا، لائسنس کی بھاری فیس عائد کر دی۔ اٹارسی کی میونسپلٹی نے بقر عید کے موقع پر گائے کی قربانی ممنوع قرار دے دی۔

۲۴۔ صوبے کے ۸۳ مقامی بورڈوں کے پندرہ سو منتخب شدہ ممبروں میں مسلمان ممبر نصف درجن بھی نہیں اور مسلمان ملازموں کی تعداد صرف بارہ کے لگ بھگ ہے۔

۲۵۔ وزیروں اور سرکاری افسروں نے لوگوں سے علی الاعلان کہا کہ وہ مسلم لیگ کی سرگرمیوں میں حصہ نہ لیں ورنہ حکومت ان کی کوئی مدد نہ کرے گی۔

۲۶۔ کھام گاؤں کی میونسپل کمیٹی نے اردو کے ثانوی اسکولوں کو اس بناء پر گرانٹ دینے سے انکار کر دیا کہ اردو کی تعلیم کی مدد کرنا "فرقہ پرستی کی مدد کرنے" کے مترادف ہے۔

۲۷۔ تمام سرکاری اور لوکل باڈیز کے اسکولوں میں مسلمان لڑکوں کو حکم دیا گیا کہ وہ بندے ماترم گایا کریں یا گانے کے دوران میں ہندوؤں کی طرح جھک جایا کریں۔

۲۸۔ بہت سے ہندو افسروں نے اپنے مسلمان ماتحتوں کو ذلیل اور تنگ کیا۔ یہ بات جبل پور۔ ساگر اور دھوٹ کے فرقہ وارانہ فسادات کے بعد خاص طور پر محسوس کی گئی۔

۲۹۔ کھام گاؤں میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک تحریری معاہدہ موجود تھا جس کی رُو سے باجے گاجے والا کوئی جلوس جبل پوری مسجد کے سامنے سے گزرنے کا مجاز نہ تھا۔ رمضان کے مہینے میں مسٹر ساورکر کے جلوس کو اس مسجد کے سامنے سے گزرنے کی اجازت دے کر تحریری معاہدے کی خلاف ورزی کی گئی۔ جب حکومت سے اس بارے میں استفسار کیا گیا تو کوئی جواب نہ ملا۔

۳۰۔ کئی بار ایسا ہوا کہ قصائیوں سے زبردستی مویشی چھین لئے گئے۔ لیکن نہ تو کبھی ملزموں سے احتساب کیا گیا اور نہ کبھی نقصان اٹھانے والوں کو معاوضہ دیا گیا۔

۳۱۔ بارہا ایسا ہوا کہ پٹیلوں اور پٹواریوں نے مسلمان کاشت کاروں کو تنگ کیا۔ مثال کے طور پر بدنیرا میں مسلمان زمینداروں کے خلاف بالکل ناروا عدالتی کارروائی کی گئی۔

۳۲۔ سکولوں کے ان استادوں کو تنگ کیا گیا جو مسلم لیگ سے ہمدردی رکھتے تھے۔

۳۳۔ پولیس کے ایک مسلمان سٹی انسپکٹر اور مسلمان ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کو اس لئے پریشان کیا گیا کہ انہوں نے ایک مسلمان لڑکی کی شکایت پر تفتیش کی تھی۔ لڑکی نے ایک بہت بڑے آدمی پر دست درازی کا الزام لگایا تھا۔ یہ معاملہ رفع دفع کر دیا گیا اور بعد میں اس بڑے آدمی کے موٹر ڈرائیور سے لڑکی کی شادی کر دی گئی۔

۳۴۔ ایک مسلمان سپرنٹنڈنٹ پولیس کو جس نے لیجسلیٹو اسمبلی کے ایک کانگرسی رکن کے بھائی کے خلاف میونسپل فنڈ غبن کرنے کے الزام میں قانونی کارروائی کی تھی، اسی طرح ستایا گیا۔

۳۵۔ ان تمام مسلمان آنریری مجسٹریٹوں کو جو مسلم لیگ سے تعلق یا ہمدردی رکھتے تھے. عہدوں سے ہٹا دیا گیا۔

۳۶۔ وزارت نے حکم دیا کہ جبل پور کی کوتوالی مسجد سے متعلق زمین سرکاری قبضے میں لے لی جائے۔

۳۷۔ قصبہ ماہکر کی کانگرس کمیٹی کے حکم پر وہاں کی میونسپل کمیٹی نے انتخابی فہرست میں مسلمان گواہوں کو ہندو لکھوایا۔

۳۸۔ کانگرسی حکومت نے ہندو جولاہوں کی مدد کرنے کے لئے ہزاروں روپے خرچ کئے۔ لیکن مسلمان جولاہوں کی کوئی مدد نہ کی۔

۳۹۔ ہندوؤں کو کھلم کھلا موقع دیا گیا کہ وہ منڈیوں میں مسلمان قصائیوں کے ہاتھ مویشی فروخت نہ ہونے دیں۔

۴۰۔ جبل پور کے انجمن اسلامیہ پریس کو اس سے قبل حکومت کی طرف سے چھپائی کا کام ملتا رہتا تھا. اس کام سے جو آمدنی ہوتی تھی اس سے وہاں کے واحد اردو ہائی سکول کا خرچ پورا کیا جاتا تھا۔ کانگرسی حکومت نے اس پریس کو چھپائی کا کام دینا بند کر دیا جس کی وجہ سے اردو ہائی سکول کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

۴۱۔ اگرچہ جبل پور میں مسلمانوں کی آبادی پچیس فیصد کے قریب ہے، لیکن وہاں کے ڈسٹرکٹ

آفس میں مسلمان ملازموں کی تعداد بتدریج کم ہوتی جا رہی ہے۔

۴۲۔ ساگر میں میونسپل کمیٹی کے صدر نے میونسپل ہائی سکول کے مسلمان طالب علموں کو حکم دیا کہ وہ بندے ماترم گائیں یا سکول سے نکل جائیں۔

۴۳۔ بعض مقامات پر، مثلاً مانڈلہ میں گائے کی قربانی بالکل ممنوع قرار دے دی گئی۔

## اختتامیہ

میرے اس بیان کو فی الحال یہاں ختم سمجھئے۔ واقعات کی جو تفصیل مجھے ملی تھی میں نے جوں کی توں درج کر دی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ میں نے جو واقعات بیان کئے ہیں ان میں سے بعض میں مجرموں کے خلاف کارروائی کی گئی ہو جس کی خبر مجھ تک نہیں پہنچی۔ اس بات سے کانگرس کے خلاف مسلمانوں کے اس دعویٰ پر مطلق کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اس حقیقت سے کوئی آدمی انکار نہیں کر سکتا کہ مسلمان بڑی شدید اور خوفناک زیادتیوں کا شکار ہوئے۔ وہ بے بس تھے اور قلیل التعداد ہونے کے علاوہ چاروں طرف سے ہندوؤں میں گھرے ہوئے تھے۔ انہیں یقیناً بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ ظاہر ہے قاتل کو پھانسی دینے سے مقتول زندہ نہیں ہو جاتا۔ اس لئے جو لوگ اس ظلم و طغیان کے شکار ہوئے جس کی مثالیں اوپر درج کی گئی ہیں۔ انہیں یہ معلوم کر کے تسلی تو ہونے سے رہی کہ ظلم کرنے والے سنگ دلوں کو سزا مل گئی ہے۔ مسلمانوں کا یہ دعویٰ بدستور قائم ہے کہ کانگرسی راج میں انہیں ہر وقت جان اور مال کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ انہیں مظالم سہنے پڑے اور اس دوران میں قانون نے ان کی کوئی دادرسی نہ کی۔ اور اگر کبھی کی بھی تو اس وقت جب پانی سر سے گزر چکا تھا۔

# APPENDIX



From Malik Barkat Ali, M.L.A., Member, Working Committee and Member, Council All-India Muslim League

To

Mr. M.A. Jinnah, Little Gibbs Road, Malabar Hill, Bombay

19, Temple Road,
Lahore,
October 26th, 1939

Dear Mr. Jinnah,

I have read the directions that have been issued to the Muslim League Parties in the various Congress Governed Provinces in regard to the attitude that they should adopt when the Congress resolution on the War is moved in those Legislatures. In the counter resolution that has been circulated to the League Parties it is stated "the democratic parliamentary system of Government under the present Constitution has failed and is utterly unsuited to the condition and genius of the people." It is also stated that

"the British Government should not make any commitment in principle or otherwise without the approval and consent of the All-India Muslim League which alone represents and can speak on behalf of the Musalmans of India." The Punjab Ministry have also given notice of a resolution which is to be moved next week.

This resolution is as follows:-

> "This Assembly approves of the Policy of the Punjab Government towards the present international crisis in condemning Fascist and Nazi aggression and declares its determination to resist this aggression and to protect the security and honour of the Punjab and India with all the available resources of the Province.
>
> It further desires that it should forthwith be made absolutely clear that the Constitution of India shall be examined de novo at the end of the war with a view to the immediate attainment of the objective of Dominion Status with effective protection of the due rights of the minorities and other sections in consultation and with the agreement of all the parties concerned."

You will notice that this resolution begins with an approval of the policy of the Punjab Government towards the present international crisis. You will further find that in this resolution the Government is asked to examine de novo the constitution of India "with a view to the immediate attainment of the objective of Dominion Status with effective protection of the due rights of the minorities and other sections in consultation and with the agreement of all the parties concerned." To my mind the mention of the"immediate attainment of the objective of Dominion Status" does amount to a commitment in principle on the part of the British Government regarding the India Constitution. The Muslim League in its directions to the Muslim League Parties in the Congress Governed Provinces has clearly stated that the British Government should not make any commitment in principle or otherwise: I want to know your directions on the following points:—

1. Should I or Should I not object to this commitment which

the Punjab Government resolution desire the British Government to take up, namely, the immediate objective of Dominion status.

2. Should I or should I not support that part of the resolution which approves of the policy hitherto followed by the Punjab Government in regard to the question of cooperation in War. Obviously this approval means the approval of the statement issued by the Punjab Premier on the 25th August, 1939, and his previous statements which formed the subject matter of a warning in the meeting of the All-India Muslim League Council.

3. Should I or Should I not support that part of the resolution in which the agreement of all the parties concerned is mentioned without refering to the Organisations which represent those parties. In other word whether or not a mention of the All-India Muslim League as a representative Organisation of the Musalmans should be insisted on or not, so far as the question of agreement of Muslim India is concerned.

An answer by return of post will be helpful and if return of post be found too late then a telegraphic reply may be made. The exact date on which this resolution will be moved has not yet been fixed but it is probably coming up next week. Any amendment that is to be moved on behalf of the Muslim League Party must be moved two clear days before the date fixed for the discussion of these resolutions and in the light of that information you may decide to reply by post or by telegram.

With all regards.

Yours sincerely,
Sd. M. Barkat Ali

File AT1.txt "iii"

From Malik Barkat Ali, M.L.A., Member Working Committee

and Member Council, All—India Muslim League

to

Mr.M.A. Jinnah, Little Gibbs Road, Malabar Hill Bombay

19,Temple Road

Lahore,

12th December, 1939

Dear Mr.Jinnah.

1. You will remember that in the meeting of the Council of the All-India Muslim League held in Delhi on the 27th August 1939, it was decided that if the Punjab Provincial Muslim League was not established by the 15th November 1939, the Punjab Provincial Muslim League Organising Committee (which was appointed at Calcutta on the 15th April, 1938) shall stand automatically dissolved.The 15th of November, 1939, has passed away, but no Provincial Muslim League was established by that date by the Organising Committee. It follows therefore that the Organization Committee stands automatically dissolved. Apart from this, the following matters merit your close consideration:—

Under the new Constitution of the All-India Muslim League there have to be Primary Leagues and District Leagues. Primary Leagues elect members for the Provincial Muslim League. The constitution adopted by the Punjab Provincial Muslim League Organising Committee runs directly counter on this matter to the constitution of the All-India Muslim League. Rule 38 of the Constitution of the All-India Muslim League requires that "there shall be in every district in British India a District Muslim League with its branches".Section 37 and 38 of the Constitution and Rules passed by the Punjab Organising Comittee provide (i) for the formation of City and District League, (ii) Lay down that the said District Leagues and City League Shall be two distinct and un-connected entities separated from each other, and while the City Leagues are formed in towns with a population of twenty thousand or over, the district leagues are to consist of and cover areas

excluding the towns, and (ii) that the District and City League so formed shall be directly affiliated to the Punjab Provincial Muslim league and given representation on the Provincial Muslim League in a certain proportion laid down in Schedules A (i) and A (ii). These rules thus make it clear that the Odwyerian policy of separating Rural and Urban areas has been followed most faithfully by Sir Sikander's Organising Committee in direct violation of the Constitution of the All-India Muslim League as laid down in rule 38 thereof. Rule 38 of the All-India Muslim league, as already stated, provides for a District Muslim League only for every district. Towns which fall in any district fall within the area of a district Muslim League and cannot have a separate Organisation of their own directly affiliated to the Provincial Muslim League. City Leagues can certainly be established, but their affiliation must be to the district Muslim League and it is the District Muslim League alone which can be affiliated to the Provincial Muslim League. No City League can be directly affiliated to the Provincial Muslim League, and no city League can be separated from the District Muslim League. The object of the policy followed by Sir Sikander's Committee is obviously to keep the Rural areas untouched by the political activities of the towns and thus disrupt the Muslim Community.for a District Muslim League only for every district. Towns which fall in any district fall within the area of a district Muslim Leagues and cannot have a separate Organisation of their own directly affiliated to the Provincial Muslim League. No City League can be directly affiliated to the Provincial Muslim League,and no city League can be separated from the District Muslim League. The object of the policy followed by Sir Sikander's Committee is obviously to keep the Rural areas untouched by the political activities of the towns and thus disrupt the Muslim Community.

A look at Schedule A(i)and A (ii) of the Constitution and Rules of the Punjab Provincial Muslim League will show

that the constitution has provided for the establishment of 29 City Leagues and 29 District Leagues. You will be amused to learn from me that while 38 seats have been allotted to City Leagues, 98 seats have been allotted to District Leagues, and this has been done not on the basis of membership of the League, but ostensibly on the basis of population including Hindu population. Rural areas may not have a single league member. and yet they can return 98 members to the Provincial Muslim League, as against 38 members returned by city Leagues, although the City Leagues may have lacs and lacs of league members on their roll.

3. Although Rule 37 (c) lays down that a membership of five hundred at least shall qualify for a seat on the Provincial Council, yet this rule was subsequently abrogated and it was laid down that City Leagues and District Leagues, can be affiliated with any membership less than five hundred provided that within a year of the affiliation they secure a membership of at least five hundred. The object of this relaxation of the constitution was to complete on paper the organisation of the Punjab Provincial League, without any regard to the number of primary members behind any branch.

4. Although the consititution passed by the Organising Committee provides for 58 City and District League yet the position up to the 15th November 1939,was(i)that only 20 leagues without any regard to the primary members constitution those leagues were affiliated, (ii) about five leagues in addition to these twenty were affiliated under the order of Sir Sikander without any meeting of the Organising Committee or of the affiliating Sub Committee, and (iii) two leagues are said to have been affiliated on the 25th November 1939, after the Organising Committee had under the resolution of the Council of the All—India Muslim League, dated 27th August 1939, become constitutionally dead. Obviously the bulk of affiliations are all paper affiliation. With

the exception of 4 or 5 branches,(and those branches have taken the position that the Organising Committee has ceased to be after the 15th November 1939,) the rest have no primary members worth the name and their member have not at all been elected by any Primary members. This is throwing the new Constitution absolutely to the winds.

5. A resolution of the Council of the All—India Muslim League, down that on Provincial Muslim League shall be affiliated unless District Leagues are formed in at least 2/3rd of the districts in a Province. In the present case only 12 District Leagues have been ostensibly formed in a Province. In a province which has 29 Districts.

6. Up to the 15th November,1939, not a single affiliated league, city or district, had been asked to elect its quota of representatives for the Provincial Muslim League. To get over the difficulty created by the resolution of the Council of the All—India Muslim League passed on 27th August 1939. Notice of this meeting was issued on the 27th August 1939, a meeting of the Organising Committee was called for the 8th November,1939. Notice of this meeting was issued on the 7th November 1939, and this notice was issued to about 20 members of the Organising Committee out of a total of about 40. In this meeting a resolution was passed that the Punjab Provincial Muslim League be established. Surely this resolution cannot establish any Provincial Muslim League. It was also resolved in this meeting of the 8th November 1939, that city and district Muslim Leagues be requested to elect their representatives by the 5th December 1939, and that a meeting of the memebers so elected be called for the 15th December 1939. Copy of this resolution was sent to the All-India Muslim League Secretariat with a letter by Sir Sikandar in which it was requested that the time may be extended if it was necessary. The meeting of the 15th December 1939, has now been postponed to the 10th January, 1940. One of the reasons among others for this postponement is that the Punjab Legislative Assembly

which was originally to continue till after the 15th December, 1939, has now been adjourned to the 8th January. 1940. The meeting for the 15th December 1939. has therefore, been postponed because some of the Unionist members of the Punjab Legislative Assembly whom Sir Sikander corries in his pocket, would not be available in Lahore on 15th December, 1939. Besides these members, there are no other members of the League and if at all, perhaps a few between five and ten retuned by the few bogus leagues formed by a few individuals on paper under orders received from Lahore.The result of this adjournment is that no meeting of the elected representatives of the Leagues can possibly take place before 10th January, 1940. The object of fixing the 10th January,1940, is to swamp the meeting with his Unionist Legislative Assembly followers and thus have things his own way. Another object is to conceal the institutions may have returned.

I masil leagues have

really responded to Sir Sikander's call for electing their representatives. Many believe rightly that the Organisation of Sir Sikander is utterly bogus and that he cannot be excpected to do justice to the League Organisation. He wants to be the master of the League Organisation and to keep it under his complete control so that the Unionist Organisation may thrive and prosper. Some believe that the Organising Committee stands already dissolved and that it has no right of constitutionally functioning after 15th November, 1939. Many of the city and district Leagues affiliated are purely bogus institutions formed on paper by one or two persons under orders of Sir Sikander and without any Primary membership.

8. In view of the above, is it not fair to the Mussalmans of this Province that they should be told where matters stand. No Provincial Muslim Leagues, has so far been established and under the Resolution of the Council of the All—India Muslim League, the Organising Committee stands automat-

ically dissolved. With a view to escape from this consequence, Sir Sikander called a fictitious meeting on 8th November, 1939, at one day's notice and decided that the so called affiliated Leagues be asked to elect their representatives. This letter was issued on the 16th November, by which date the Organising Committee stood dissolved. The response is ingnominiously poor. A few individuals have written to say that representative from their district have been elected. It is obvious that even these representatives cannot meet before the 10th of January, 1940, and unless these representatives actually meet there is no Provincial League formed according to the constitution of the All-India Muslim League, and there being no Provincial League no elected Office bearers, President, Secretary etc, of the Provincial League exist.

The Mussalmans of this Province are suffering very badly from the present postition. Under the Resolution of the Council of the All-India Muslim League, as the Organising Committee stands dissolved, it is for you to state how you will form the Punjab Provincial Muslim League. The authority vests in you. I request that you may kindly let me know whether the Organising Committee stands dissolved or not and what your plans for the future are? May I respectfully point out that a halt should be called to the policy of pandering to Sir Sikander. It is not for prepared to follow the All—India Muslim League, the All-India Muslim League should not continue to run after him in the fond hope that Sir Sikander's nominal association with the League is a source of strenght to the League. The organisation of the League in the Punjab stands completly stranded. We are now in a much worse position than we were at the time of the elections in 1936. Personally I feel that it is impossible to stands this situation any longer.

As an instance of the impossibility of the present position, I should like to draw your attention to a

statement made on the floor of the House by the Honourable Malik Khizar Hayat Khan, Minister for Public Works. A Bill for providing a Corproation for the City of Lahore is on the anvil of the Punjab Legislative Assembly. Mussalmans were previously for over 40 years enjoying separate electorates on the Lahore Municiple Committee. There is no provision for separate electorates in the proposed City of Lahore Corporation Bill. In the course of my speech I requested the Government to follow the example of the Honourable Mr. Fazal ul Haq and to provide in the statute itself for separate electrorates for the Mussalmans. Replying to this request of mine the Honourable Minister stated on the floor of the House that "Malik Barkat Ali had the other day speaking on the war Resolution opposed Dominion Status and did not think Democracy even as a suitable form of Government. Such a gentleman suddenly mentioning separate electorates in the same breath, should know that independence and separate electorates are incompatible terms."

I have hitherto lent my support to the present Government because of the fact that Sir Sikander had promised to support the cause of the Muslim League and to form a real Muslim League Party in the Legislature. No Muslim League Party exist in the Legislature and it has now become impossible for me to lend my support to the present Unionist Government which is acting in all essential matters contrary to the established policy of the All—India Muslim League. The Musslamans of Simla and many other persons have asked for separate electorates but this Government to please the Hindus continues to preach joint electorates. How is it fair that I should be compelled against my conscience to lend my support to such a Government.

I therefore request that you may kindly clarify the present position and let me know whether the Organising Committee stands disolved or not? The position has become intolerable now and I have taken the liberty of addressing

this long communication solely in the interests of the League.

If you wish to give further rope to the present Organising Committee, then you may take it from me that the League stands completly killed in this Province. If you have the fear that the dissolution of the present Organising Committee will give an opportunity to Sir Sikander to break away from the League, then I should like to tell you frankly that in the first instance Sir Sinkander will not at the present moment resort to this step. And if he does resort to it he will be digging his own grave, because it is a fact that his connection with the League does bring him a good deal of public support. The best course would be to declare the dissolution of the Organising Committee so that Sir Sikander may realise that you mean business and that you cannot be a party to what has long continued a mockery and a simulacrum . I append herewith a copy of the Constitution and Rules of the Punjab Provincial Muslim League as passed by Sir Sikander's Organising Committee. I invite your particular attention to Rule 37 and the Schedules at the end. I expect a very early at your convenience

With all regards.

Yours sincerly,
M.Barkat Ali

جلد سوم

# ہماری قومی جدّوجہد

جنوری ۱۹۴۰ سے دسمبر ۱۹۴۲ تک

## مقدمہ

اس کتاب کے ابتدائی دو باب لکھے جا چکے تھے کہ بنگلہ دیش کے سقوط کا واقعہ پیش آیا اور میں نے قلم روک لیا۔ چند روز بعد ایک عزیز کا خط لاہور سے آیا کہ "کہاں کی تاریخ نویسی اور کیسی قومی جدوجہد۔ اب تو ہر بات کا رخ بدل گیا ہے۔ اور ہر واقعہ کی نئی تفسیر کرنی پڑے گی۔ چھوڑیئے اس داستان سرائی کو اور واپس لاہور آ جایئے۔ اور پاکستان کا جو کچھ بچ گیا ہے اسے دیکھئے کہ نئے حالات جو پیدا ہوئے ہیں وہ ہماری ہمت یا کم ہمتی کو کس شدت سے للکار رہے ہیں۔"

چھ مہینے کامل تعطل اور ناقابل بیان افسردگی میں گزر گئے۔ قلم اٹھانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ پھر سوچا کہ جو ہونا تھا ہو گیا۔ لیکن قومی جدوجہد کے دوران میں جو حالات میں نے دیکھے تھے اور جن واقعات کی تشکیل میں بحدِّ استعداد حصہ لیا تھا، انہیں ضبطِ تحریر میں لانا بھی ضروری ہے۔ کیا عجب کہ پچاس ساٹھ سال بعد کوئی مورخ پاکستان کی تعمیر و تخریب اور اس کے بننے اور بگڑنے پر کتاب لکھے تو جہاں تک چشم دید واقعات کا تعلق ہے، میری یہ تحریر اس کے لئے کچھ مواد مہیا کر سکے۔

تاریخ واقعاتِ شہاں نانوشتہ ماند
افسانہ کہ گفت نظیری کتاب شُد!

ضمناً ایک بات کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں نے اس کتاب میں بنگال کا قطعاً ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ اب یہ ذکر بے محل ہی نہیں بے سود بھی ہے۔ پاکستان کے چاروں صوبوں میں ہماری قومی جدوجہد جس طرح جاری تھی ان میں سے سندھ کے حالات بیان کرنا محمد ایوب کھوڑو۔ پیرزادہ عبدالستار، پیر علی محمد راشدی اور شیخ عبدالمجید کا فرض ہے۔ صوبہ سرحد میں اس جدوجہد کے دوران میں جو واقعات پیش آتے رہے ان سے پردہ اٹھانا خان عبدالقیوم خان کا فرض ہے، جو ۱۹۴۶ء کی الیکشن سے صرف دو ہفتے پہلے لیگ کا ٹکٹ حاصل کرنے کے لئے مسلم لیگ میں شامل ہوئے تھے۔ اور آج اپنے آپ کو سب سے بڑا محب وطن پاکستان کہتے ہیں۔ اور باقی ہر شخص ان کی نگاہ میں غدار ہے۔ بلوچستان کے

حالات بیان کرنا قاضی محمد عیسیٰ صاحب کا کام ہے جو بلوچستان میں تحریک پاکستان کے سب سے ممتاز اور سربرآوردہ لیڈر تھے۔

میں نے اس کتاب کی روئداد کو صرف پنجاب تک محدود رکھا ہے۔ لیکن یہ روئداد بیان کرنے کا بھی فائق حق میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ۔ سردار شوکت حیات۔ چودھری نذیر احمد خاں۔ میاں امیر الدین۔ سید امجد علی۔ علامہ علاؤ الدین صدیقی۔ مسز سلمیٰ تصدق حسین۔ بدیع الزمان کیکاؤس۔ محمود علی قصوری۔ سید شمیم حسین قادری وغیرہ کا ہے۔ کیونکہ پنجاب میں تحریک پاکستان کی قیادت انہی بزرگوں کے ہاتھ میں تھی۔ افسوس ہے ان بلند پایہ اور نامور قومی لیڈروں نے بعض نامعلوم مصلحتوں یا مجبوریوں کے باعث اس ضروری کام کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔

جو کچھ میں نے اس کتاب میں لکھا ہے اپنے ذاتی مشاہدات و تجربات کی بناء پر لکھا ہے۔ اگر کوئی صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ یہ واقعات غلط ہیں تو گزارش ہے کو جو واقعات ان کے علم کے مطابق صحیح ہیں وہ لکھ دیں۔

عاشق حسین بٹالوی

پہلا باب

# آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس لاہور

آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے ۲۔ جولائی ۱۹۳۹ء کے اجلاس بمبئی میں فیصلہ کیا تھا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا آئندہ سالانہ اجلاس ۲۸، ۲۹، ۳۰۔ دسمبر ۱۹۳۹ء کو لاہور میں ہو گا۔ پنجاب میں اس وقت کوئی صوبہ مسلم لیگ نہیں تھی۔ آرگنائزنگ کمیٹی موجود تھی جس کا فرض یہ تھا کہ جلد از جلد پنجاب میں ایک پراونشل لیگ قائم کرے۔ عام حالات میں قاعدہ یہ تھا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کا بندوبست صوبہ مسلم لیگ کرتی تھی۔ ظاہر ہے جہاں لیگ کی صوبائی شاخ سرے سے موجود نہ ہو وہاں اس قسم کا بندوبست آرگنائزنگ کمیٹی ہی کو کرنا چاہئے تھا۔

آرگنائزنگ کمیٹی کا ایک جلسہ ۱۱۔ اگست ۱۹۳۹ء کو نواب شاہ نواز خاں ممدوٹ کے دولت کدے پر ہوا۔ جس کی صدارت سر سکندر حیات خاں نے فرمائی۔ اس جلسے کا دعوت نامہ عمداً ملک برکت علی۔ غلام رسول خاں۔ مولانا ظفر علی خاں۔ ملک زمان مہدی خاں۔ میاں عبدالمجید۔ پیر تاج الدین۔ میاں عبدالعزیز۔ خلیفہ شجاع الدین۔ عاشق حسین بٹالوی کو نہ بھیجا گیا۔ حالانکہ یہ نو اصحاب آرگنائزنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔ اس کے برعکس بعض ایسے اصحاب کو مدعو کیا گیا جو آرگنائزنگ کمیٹی کے ممبر نہیں تھے۔ لیکن سر سکندر حیات خاں کے منظور نظر یقیناً تھے۔ مثلاً خان بہادر میاں امیرالدین۔ خان بہادر شیخ عنایت اللہ (سوداگر قالین) خان بہادر میاں رمضان علی۔ ریٹائرڈ پوسٹ ماسٹر جنرل۔ مولانا عبدالمجید سالک ایڈیٹر روزنامہ انقلاب۔ چودھری فتح محمد آنریری مجسٹریٹ۔ سید محمد علی جعفری۔ سید حمید علی مالک دارالاشاعت پنجاب۔ نواب زادہ رشید علی خاں خلف الرشید نواب سر ذوالفقار علی خاں۔ میاں بشیر احمد ایڈیٹر ہمایوں۔ شیخ فیاض الدین خلف الرشید خان بہادر شیخ محمد نقی۔ یہ صریحاً خلاف آئین اور خلاف قاعدہ فعل تھا۔

اس جلسے میں مجلس استقبالیہ کے قیام کا اعلان کر کے پچیس روپے رکنیت کا چندہ مقرر کیا گیا۔

میاں بشیراحمد مجلس استقبالیہ کے سیکرٹری۔ خان بہادر میاں امیرالدین اور نوابزادہ رشید علی خاں جائنٹ سیکرٹری اور شیخ محبوب احمد پروپیگنڈا سیکرٹری مقرر کئے گئے۔ یہ خبر شائع ہوئی تو میاں عبدالعزیز۔ ملک برکت علی۔ عاشق حسین بٹالوی۔ غلام رسول خاں اور ملک زمان مہدی خاں نے مشترکہ بیان اخباروں کو دے کر آرگنائزنگ کمیٹی کے اس فیصلے سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دیا۔ اور ساتھ یہ بھی کہا کہ آرگنائزنگ کمیٹی نے جو کچھ کیا ہے سراسر ضابطے اور آئین کی خلاف ورزی ہے۔

میں اپنی کتاب "ہماری قومی جدوجہد ۱۹۳۹ء" میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں کہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے ایک قرارداد منظور کی تھی کہ اگر ۱۵۔ نومبر ۱۹۳۹ء تک پنجاب میں لیگ کی صوبائی شاخ قائم نہ ہوئی تو آرگنائزنگ کمیٹی خود بخود ختم ہو جائے گی۔ ۱۵۔ نومبر کی تاریخ گزر گئی اور پنجاب میں صوبائی شاخ قائم نہ ہو سکی۔ لہٰذا اس قرارداد کے مطابق آرگنائزنگ کمیٹی کا وجود باقی نہیں تھا۔ سر سکندر حیات خاں نے ۱۰۔ جنوری ۱۹۴۰ء کو اپنے مکان پر ایک جلسہ کیا جس میں صرف پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کی یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبر شریک ہوئے۔ اور اگلے روز اخباروں میں اعلان کر دیا گیا کہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کی باضابطہ شاخ قائم ہو گئی ہے۔ حالاں کہ اصولاً کسی صوبے میں لیگ کی پراونشل شاخ قائم کرنے کے لئے ابتدائی شاخوں اور ان کے اوپر ڈسٹرکٹ برانچوں کا جال بچھانا ضروری ہوتا ہے۔

۲۵۔ فروری ۱۹۴۰ء کو دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہو رہا تھا۔ جہاں بعض صوبائی شاخوں کے الحاق کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔ ملک برکت علی۔ پیر تاج الدین اور راقم السطور وہاں گئے۔ سر سکندر کی نمائندگی کے لئے نواب شاہ نواز خاں ممدوٹ نے شرکت فرمائی۔ پنجاب کا معاملہ پیش ہوا تو ملک صاحب نے الحاق کی تجویز کی سخت مخالفت کی اور اعداد و شمار سے ثابت کر دیا کہ جو صوبائی شاخ سر سکندر اور نواب شاہ نواز خاں ممدوٹ کی مشترکہ کوشش سے قائم کی گئی ہے، سراسر خلاف آئین ہونے کے علاوہ دراصل یونینسٹ پارٹی ہی کا ایک شعبہ ہے۔ نواب صاحب ممدوٹ نے جواب میں کچھ دلائل پیش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن بات نہ بنی۔ بالآخر کونسل نے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی جو نواب محمد اسماعیل خاں۔ چودھری خلیق الزماں۔ راجہ محمود آباد پر مشتمل تھی۔ اس کمیٹی کا فرض تھا کہ لاہور جا کر تحقیق کرے کہ سر سکندر حیات خاں نے جو پراونشل لیگ قائم کی ہے، ازروئے آئین ٹھیک ہے یا غلط۔ کونسل کا یہ فیصلہ ہماری بہت بڑی فتح تھی۔ جس سے یونینسٹ پارٹی کے ہمدردوں اور خیرخواہوں کے حلقے میں سخت تشویش پھیلی۔ دہلی سے واپس آ کر میں نے ایک طویل بیان اخباروں کو دیا اور ملک صاحب نے جس جرأت اور قابلیت سے کونسل

کے اجلاس میں پنجاب کی نمائندگی فرمائی تھی اس کی تعریف کی۔ اس پر روزنامہ انقلاب نے ذیل کا دلچسپ ادارتی نوٹ لکھا:۔

"مسٹر عاشق حسین بٹالوی نے ملک برکت علی کی لیاقت و قابلیت کی مدح و ستائش میں ایک منثور قصیدہ فرمایا ہے۔ ہمیں اس قصیدے سے اختلاف کی نہ ضرورت ہے اور نہ خواہش لیکن افسوس کہ یہ لیاقت اور قابلیت بالکل بے جا اور بے محل صرف ہوئی۔ یعنی اس سے مسلمانان پنجاب میں تفرقہ اور کشاکش کی آگ بھڑکانے کا کام لیا گیا۔ کوئی غیور و باحمیت مسلمان موجودہ نازک حالات میں اپنی لیاقت و قابلیت کو تفرقہ افزائی میں صرف کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔ اور کوئی غیور و باحمیت مسلمان اس آگ کو ہوا دینے کے لئے اپنا دامن علم و فضل حرکت میں لانا پسند نہیں کرتا۔ لیکن ملک برکت علی اور مسٹر عاشق حسین بٹالوی نے پسند سے آگے بڑھ کر اس پر عمل کیا۔ یہ دونوں اصحاب دہلی پہنچے۔ اور ملک صاحب نے قانونی موشگافیوں اور دقائق طرازیوں کے جوہروں کی بڑی ہنگامہ خیز نمائش کی۔ لیکن کس لئے؟ محض اس لئے کہ پنجاب پروانشل مسلم لیگ کا الحاق منظور نہ کیا جائے۔ ان لوگوں کی بنائی ہوئی لیگ کو تسلیم نہ کیا جائے جو نمائندگیٔ عامہ کے عام اصول کی بناء پر ہندوستان کے تمام صوبوں میں لیگ کے ساتھ وابستگی کی سب سے بڑی اور عزیز ترین متاع ہیں۔ بلکہ اس گروہ کی آواز بھی سنی جائے جس کی نمائندگی اسمبلی میں تنہا ملک برکت علی صاحب فرما رہے ہیں اور اسمبلی سے باہر مسٹر عاشق حسین بٹالوی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے از راہ اصول پروری اس صدا کو سنا۔ اور تحقیق احوال کے لئے ایک کمیٹی بٹھا دی۔ ہمیں کسی تحقیق سے خوف نہیں۔ لیکن مجلس عاملہ سے یہ ضرور کہنا چاہتے ہیں کہ اگر لیگ کے مقاصد کو تقویت پہنچانے کا اس کے نزدیک یہی صحیح طریقہ ہے تو یقیناً وہ غلطی میں مبتلا ہے۔ اگر مجلس عاملہ ایسی لیگ بنانا چاہتی ہے جو ملک برکت علی کی قانونی نکتہ سنجیوں کے ترازو میں پوری اترے تو یہ لیگ پہلے سے موجود چلی آتی ہے۔ مسٹر جناح

جس وقت چاہیں لاہور تشریف لا کر مسٹر غلام رسول خاں[1] کے مکان کے سامنے اِس کا بورڈ ملاحظہ فرما سکتے ہیں لیکن اب بورڈوں سے کام نہیں چل سکتا۔ بلکہ رائے عامہ کی دستاویز فراہم کرنا ضروری ہے۔ اور اس دستاویز کے مالک آج وہی ہیں جو اسمبلی میں بڑی سے بڑی اکثریت کے مالک ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ مجلس عاملہ نے پنجاب میں کشمکش کو جاری رکھنا پسند فرمایا۔ تحقیقاتی کمیٹی مقرر کرنے سے اِس کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔"

تحقیقاتی کمیٹی ۱۰ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور پہنچی۔ اور اُس کے تینوں ارکان ایمپرس روڈ پر نواب نثار علی خاں قزلباش کے دولت کدے پر ٹھہرے۔ وہیں فریقین کی شہادتیں ہوئیں۔ ملک برکت علی۔ پیر تاج الدین۔ غلام رسول خاں اور راقم الحروف کی شہادت بیک وقت ہوئی ملک رب نواز خاں فیروز پُور۔ سیّد میراحمد شاہ کیمبل پُور۔ نواب زادہ ولایت علی خاں کرنال سے آئے تھے۔ جنہوں نے ہمارے حق میں شہادت دی۔ ملک برکت علی کی علیحدہ شہادت بھی ہوئی جو مسلسل چھ گھنٹے جاری رہی۔ نواب شاہنواز خاں ممدوٹ۔ میاں رمضان علی، راجہ غضنفر علی خاں۔ میاں مشتاق احمد گورمانی۔ سیّد امجد علی وغیرہ سر سکندر کے سب سے بڑے اور سب سے مقتدر گواہ تھے۔

میری شہادت کے دوران میں نواب اسماعیل خاں صاحب نے پوچھا کہ اگر پنجاب مسلم لیگ کو سر سکندر حیات خاں کے حوالے کر دیا جائے تو آخر آپ کو اعتراض کیا ہے۔ میں نے عرض کیا۔ حضور! اعتراض کیا ہو سکتا ہے۔ اگر آپ کا یہی فیصلہ ہے تو ہمیں بسر و چشم منظور ہے۔ لے

ہم نے بھی ہزل و بزلہ گوارا کیا کہ "اب

فخر فضیلت و شرف دودماں نہیں!

نواب صاحب مُسکرائے۔ پھر چودھری خلیق الزماں صاحب نے فرمایا "سنئے بٹالوی صاحب! ہم مانتے ہیں کہ آپ لوگوں نے پنجاب میں مُسلم لیگ کی بڑی خدمت کی ہے۔ تکلیفیں بھی بہت اٹھائی ہیں۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ ہمیں آپ کی نہیں سر سکندر حیات خاں کی ضرورت ہے۔ ان کے وقار سے لیگ کا وقار قائم ہے۔"

---

[1] علامہ اقبال کے زیر صدارت ۱۹۳۶ء میں جو پنجاب پراونشل مسلم لیگ قائم ہوئی۔ غلام رسول خاں مرحوم اس کے سیکرٹری تھے۔ اور ٹمپل روڈ پر نمبر ۱۲ کوٹھی میں رہتے تھے۔ صوبائی لیگ کا دفتر بھی وہیں تھا۔

میں نے عرض کیا۔ چودھری صاحب! آپ تو لکھنؤ کے رہنے والے ہیں۔ یقیناً سخن فہمی سے محروم نہیں ہوں گے۔ شیفتہ کے دو شعر اور سُن لیجئے۔

شیفتہ وہ کہ جس نے ساری عمر ........ دین داری و پارسائی کی!
آخر کار مے پرست ہوا ........ شان ہے اُس کی کبریائی کی۔

راجہ محمود آباد نے ہنس کر فرمایا: "بٹالوی صاحب۔ یہ کیا بات ہے کہ پہلا شعر بھی آپ نے شیفتہ کا پڑھا اور یہ دو شعر بھی آپ نے شیفتہ ہی کے سُنائے۔ کسی اور شاعر کا کلام آپ کو یاد نہیں"؟ عرض کیا۔ حضور! جس تحقیقاتی کمیٹی کے صدر نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کے پوتے نواب اسماعیل خاں صاحب ہوں۔ وہاں مجھے اپنا مقدمہ جیتنے کے لئے شیفتہ ہی کے کلام سے سند لینی پڑے گی۔ نواب صاحب نے بھی مسکرا کر داد دی۔

ہماری شہادت اور واقعات سے قطعی ثابت ہو گیا تھا کہ سر سکندر حیات خاں نے جو پراونشل مُسلم لیگ پنجاب میں قائم کی ہے وہ فرضی ہونے کے علاوہ سراسر غیر آئینی بھی ہے۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا ہائی کمان سر سکندر کو خوش کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ تحقیقاتی کمیٹی کی سفارش پر سر سکندر حیات خاں کی یہ لیگ باضابطہ سرکاری طور پر منظور کر لی گئی۔ پنجاب میں مسلم لیگ کو یونینیسٹ پارٹی کے اثرِ بد سے بچانے کی یہ آخری کوشش تھی جو ہم کر سکے۔ افسوس قدرت نے ہمارے مقدر میں ناکامی لکھی تھی۔

اِنگلستان میں مُسلم لیگ کا پراپیگنڈا بہت کمزور تھا۔ اور اُس کی متعدد وجوہ تھیں۔ لیگ کے حامی اخباروں کا فقدان۔ ایسے نوجوانوں کا فقدان جو تحریر و تقریر سے عوام اور خواص کو ہندوستان کے مسلمانوں کے مسائل سے آگاہ کر سکیں۔ ایسی انجمنوں کا فقدان جو اجتماعی طریق سے کام کر کے رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ ان حالات میں لندن کے کسی اخبار میں مسلم لیگ کے نقطۂ نگاہ کی وضاحت کے لئے کوئی اچھا معقول اور مدلل مضمون شائع ہونا قومی لحاظ سے بہت بڑی تقویت کا موجب تھا۔

۱۹ جنوری ۱۹۴۰ء کو لندن کے مشہور ہفت روزہ اخبار "ٹائم اینڈ ٹائیڈ" میں قائدِ اعظمؒ کا ایک مفصل مضمون شائع ہوا۔ جس میں انہوں نے بتایا کہ جمہوری قسم کا پارلیمنٹری نظامِ حکومت ہندوستان میں نہیں چل سکتا۔ کیونکہ جس ملک میں دو قومیں۔ ہندو اور مسلمان آباد ہوں۔ ایک کی دائمی۔ مستقل اور ناقابل تبدیل اکثریت اور دوسری کی دائمی۔ مستقل اور ناقابلِ تبدیل اقلیت ہو۔ وہاں اس قسم کی حکومت اصولاً قائم نہیں ہونی چاہئے۔ اس کے بعد انہوں نے اس مرض کا مداوا تلاش کرتے ہوئے ذیل کی تجویزیں پیش کیں۔

ا۔ ہندوستان میں ایک پارٹی کی حکومت نہیں ہونی چاہئے۔ مرکز اور صوبوں میں جو حکومتیں قائم ہوں، اُن میں تمام طبقوں کے نمائندوں کو شریک کرنا ضروری ہے۔

ب۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نفاذ کے بعد صوبائی خود مختاری کے جو نتائج ہمیں برداشت کرنا پڑے ہیں۔ اور جس قسم کی صُورتِ حال پیش آئی ہے۔ اس کی روشنی میں ہندوستان کے آئندہ آئین کے بارے میں نئے سرے سے غور کرنا ضروری ہے۔

ج۔ مُسلم لیگ ہندوستان کی آزادی کی حامی ہے۔ لیکن ایسے فیڈریشن کے قطعی خلاف ہے جس میں جمہوری اور پارلیمنٹری نظام کی آڑ میں اکثریت کی ناقابل تبدیل حکومت قائم ہو۔

د۔ مسلم لیگ کی منظوری کے بغیر ہندوستان کا آئندہ آئین یا دستور ملکِ معظم کی حکومت کو ہرگز نہیں بنانا چاہئے۔ اور نہ اس ضمن میں کسی قسم کی آئینی اور دستوری تبدیلی کرنا چاہئے۔

ہ۔ ہندوستان میں دو قومیں آباد ہیں۔ ہندو اور مُسلمان۔ دونوں کو اس ملک کی حکومت میں مشترک حصہ ملنا ضروری ہے۔ اس نوع کا آئین وضع کرنے کے لئے ہم حکومت۔ کانگرس اور دیگر جماعتوں کے ساتھ اشتراک و تعاون کرنے کو تیار ہیں۔

چند روز بعد کانگرس نے حسبِ معمول ۲۶ جنوری ۱۹۴۰ء کو یوم آزادی منانے کا اعلان کیا تو قائداعظمؒ نے پھر ایک اخباری بیان دے کر مُسلمانوں کو متنبہ کیا کہ ہرگز اس میں شریک نہ ہوں۔ اور آخر میں فرمایا کہ گاندھی جی وقتاً فوقتاً آزادی کی جو تعریف کرتے ہیں اس میں ہر آن تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

لندن کے اخبار ڈیلی میل کو بھی قائداعظمؒ نے ایک بیان دیا۔ اور کم و بیش وہی باتیں دہرائیں جو ٹائم اینڈ ٹائڈ میں چھپ چکی تھیں۔

۲۵۔ فروری ۱۹۴۰ء کو دہلی میں آل انڈیا مُسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا تو وہاں بھی قائداعظم نے سیاسی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے ایک ولولہ انگیز تقریر کی اور فرمایا:

"لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ مسلم لیگ کا مطمح نظر کیا ہے۔ اگر آپ کو اب تک یہ معلوم نہیں ہوا تو غالباً آئندہ بھی معلوم نہیں ہو سکے گا۔ بہر حال سُن لیجئے۔ معاملہ بالکل صاف ہے۔ برطانیہ ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتا ہے مسٹر گاندھی اور کانگرس ہندوستان اور مسلمانوں دونوں پر حکومت کرنے کے خواہاں ہیں۔ ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ برطانیہ اور گاندھی میں سے کسی کو بھی مسلمانوں پر حکومت نہیں کرنے دیں گے۔ ہم آزادی

چاہتے ہیں۔ میں مسلمانوں سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنے آپ کو منظم کریں۔ اور لیگ کونسل کے ممبروں سے کہتا ہوں کہ جاؤ، مسلم لیگ کا پیغام بچے بچے کو پہنچادو"

۶۔ مارچ ۱۹۴۰ء کو اسی قسم کی پُر جوش تقریر قائداعظمؒ نے مُسلم یونیورسٹی یونین علیگڑھ میں کی۔

ابتداء میں فیصلہ یہی ہوا تھا کہ آل اِنڈیا مُسلم لیگ کا سالانہ اِجلاس دسمبر ۱۹۳۹ء کی آخری تاریخوں میں ہو گا۔ لیکن بعد کو تبدیلی کر کے ۲۲-۲۳-۲۴- مارچ ۱۹۴۰ء کی تاریخیں مقرر کی گئیں۔ منٹو پارک کے وسیع میدان میں اجلاس کا انتظام کیا گیا تھا۔ عام طور سے طریقہ یہ تھا۔ کہ پنڈال کے گرد ایک پختہ دیوار بنائی جاتی تھی۔ ہندوستان میں جہاں جہاں مجھے آل اِنڈیا مُسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کا موقع ملا تھا، ہمیشہ پنڈال کے گرد اِس قسم کی دیوار میں نے دیکھی تھی۔ لاہور میں ہماری مجلسِ استقبالیہ نے دیوار بنانے کی زحمت گوارا نہ کی۔ اور قناتیں لگا دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اِجلاس کے دوران میں بار بار یہ قناتیں گریں۔ اور لوگ بے تحاشا اندر گھُس آئے۔

دوسری عالمگیر جنگ شروع ہونے کے باعث حالات معمول پر نہیں رہے تھے۔ حکومتِ پنجاب نے نیم فوجی جماعتوں پر پابندی لگادی تھی کہ ان کے رضا کار اپنی مخصوص وردی پہن کر برسرِ عام قواعد نہیں کر سکتے۔ اِس پابندی کی زد ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں پر یکساں پڑتی تھی۔ ہندوؤں اور سکھوں نے خاموشی سے یہ حکم مان لیا۔ خاکساروں نے البتہ قانون شکنی کا ارادہ کیا۔ علامہ مشرقی دہلی میں تھے۔ ان کے اخبار الاصلاح میں جو لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ کئی روز سے سخت اشتعال انگیز مضامین چھپ رہے تھے۔ جن میں بار بار لکھا جاتا تھا کہ خاکساروں کو چاہئے کہ سر سکندر حیات خاں کے گرد لاشوں کا انبار لگا دیں۔ اِسی نوع کی اور بھی غیر ذمہ دارانہ تحریریں شائع کی جا رہی تھیں۔

۱۹۔ مارچ کی صبح کو یکایک خاکساروں کے جتھے قواعد کرتے ہوئے بھاٹی دروازہ کے اندر نمودار ہوئے۔ پولیس نے روکنا چاہا۔ لیکن خاکساروں نے اپنے صیقل شدہ بیلچوں سے پولیس کے سپاہیوں اور افسروں پر حملہ کر دیا۔ پولیس والوں کی تعداد تھوڑی تھی۔ خاکسار دائیں بائیں مارتے ہوئے آگے نکل گئے۔ پولیس کے چند افسر بُری طرح زخمی ہوئے۔ اور ایک انگریز افسر جان سے مارا گیا۔ تھوڑی دیر بعد بہت سی مسلح پولیس لاریوں میں سوار ہو کر آ گئی۔ اور خاکساروں کا سخت بے دردی سے قتلِ عام شروع ہوا۔ شام تک لاہور میں چاروں طرف غم اندوہ کے بادل چھا گئے۔

اب ہر شخص کی زبان پر یہ بات تھی کہ ایسی رنج دہ اور اشتعال انگیز فضا میں اجلاس ہو بھی سکے گا یا نہیں۔ میرے مرحوم دوست جسٹس نذیر احمد محمود اُس وقت پریکٹس کرتے اور راوی روڈ پر رہتے تھے۔ اور لاہور سٹی مسلم لیگ کے صدر بھی تھے۔ وہ خراماں خراماں منٹو پارک تشریف لے گئے کہ دیکھوں پنڈال کی تعمیر مکمل ہوئی ہے یا نہیں۔ وہاں میاں امیرالدّین، نواب شاہنواز خاں ممدوٹ۔ میاں بشیراحمد اور میاں فیروزالدین احمد سراسیمگی کی حالت میں کھڑے تھے۔ اُنہوں نے بتایا کہ ہم نے اجلاس ملتوی کر دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ محمود صاحب نے اُنہیں سمجھایا کہ اس حالت میں اجلاس ملتوی کرنے سے عوام اور قومی تحریک پر سخت بُرا اثر پڑے گا۔ خاکساروں کا حادثہ بلا شبہ افسوسناک ہے۔ لیکن اجلاس لازماً مقررہ تاریخ کو ہونا ضروری ہے۔ ردّ و کد کے بعد صرف فیروز الدّین احمد ان کے ہم خیال بن سکے۔ بالآخر فیصلہ ہوا کہ سرسکندر حیات خاں کے دولت کدے پر چل کر حتمی گفتگو کرنی چاہیئے۔ سرسکندر بھی اجلاس کے التواء کے حق میں تھے۔ لیکن نذیر احمد صاحب محمود اور میاں فیروزالدّین احمد کی بروقت وکالت نے معاملہ سنبھال لیا۔ اور اجلاس ملتوی نہ ہو سکا۔ تعجب ہے جو لوگ اُس وقت اجلاس ملتوی کرنے کے پرزور حامی تھے۔ آج وہی لوگ مجاہد بن کر بآواز بلند یہ کہتے پھرتے ہیں کہ ہم نے اجلاس مُعیّنہ تاریخ کو مقرر وقت پر کرا کے دم لیا۔ اور اس کے برعکس التواءِ اجلاس کی تجویز کا الزام صرف سرسکندر مرحوم پر تھوپتے ہیں۔

۲۱۔ مارچ کی صبح قائداعظم تشریف لائے۔ اُن کے اعزاز میں بہت بڑا جلوس نکالنے کا تمام سامان مکمّل ہو چکا تھا لیکن خاکساروں کے حادثے کی وجہ سے فضا سوگوار ہو رہی تھی، اس لئے اُنہوں نے جلوس سے انکار کر دیا۔ سٹیشن سے باہر رضاکاروں کا مجمع تھا۔ اور بہت سے نوجوان کھڑے اصرار کر رہے تھے کہ قائداعظم موٹر میں سوار نہ ہوں بلکہ فٹن میں بیٹھیں۔ وہ ان کی گاڑی کھینچ کر ڈیوس روڈ تک لے جائیں گے۔ قائداعظم نے شکریئے کے ساتھ یہ پیشکش رَد کر دی۔

ہندوستان کے گوشے گوشے سے لوگ شرکت کے لئے آئے تھے لیکن حد درجہ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مجلس استقبالیہ نے ان کے قیام و طعام کا کوئی معقول بندوبست نہیں کیا تھا۔ قاعدہ یہ تھا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کے تمام ممبر سالانہ اِجلاس پر مجلس استقبالیہ کے سرکاری مہمان ہوتے تھے۔ اور اجلاس کے دوران میں اُن کے قیام و طعام کی ذمہ داری مجلس استقبالیہ پر ہوتی تھی۔ پنڈال سے قریب میدان میں دو دو آدمیوں کے لئے ایک خیمہ نصب کر دیا جاتا تھا۔ اندر پلنگ۔ میز۔ کرسیاں رکھ دی جاتی تھیں۔ فرش پر دری بچھا دی جاتی تھی برابر میں غسل خانہ ہوتا تھا۔ بہت بڑا مطبخ گرم رہتا تھا۔ کھانے کا انتظام علیحدہ شامیانے کے اندر نہایت سلیقے سے کیا جاتا

تھا۔ صبح ناشتہ، دوپہر کو کھانا، سہ پہر کو چائے اور رات کو پھر کھانا ملتا تھا۔ لکھنؤ۔ کلکتہ۔ پٹنہ غرضیکہ جہاں جہاں لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا۔ میں نے یہی طور طریقے اور قاعدے دیکھے تھے۔ لاہور کے اس اجلاس میں قطعی کوئی سلیقہ نہیں تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کے جملہ ارکان کو مجبوراً شہر میں نجی طور پر اپنی رہائش کا انتظام کرنا پڑا۔ اکثر لوگ ہوٹلوں میں ٹھہرے۔ بعض نے اپنے دوستوں اور ملنے والوں کے ہاں قیام کیا۔ پھر دقت یہ پیش آئی کہ ان غریبوں کو جن میں سے بیشتر لاہور پہلی مرتبہ آئے تھے اور شہر کی سڑکوں اور بازاروں سے واقف نہیں تھے. صبح جلسہ گاہ میں پہنچنے کے لئے ذاتی خرچ سے سواری کا انتظام کرنا پڑتا تھا۔

چند سال ہوئے. میں نے اُردو کے کسی اخبار میں ایک مضمون دیکھا. جس میں مضمون نگار صاحب نے. جو غالباً ۱۹۴۰ء میں چار پانچ سال کے بچے ہوں گے. لکھا تھا کہ اجلاس لاہور کا انتظام قابلِ رشک تھا۔ چاروں طرف مہمانوں کے خیمے ہی خیمے تھے. جنہیں پر تکلف سامان سے سجایا گیا تھا۔ مطبخ میں زیر بریانی۔ مُرغ کا قورمہ۔ مُزعفر۔ کباب۔ شیرمالیں ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ پختہ غسل خانے تھے۔ قسم قسم کی دُکانوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔

ظاہر ہے یہ سارا نقشہ مضمون نگار صاحب کے شاعرانہ تخیّل کی پیداوار ہے۔ اجلاس لاہور جیسی بدانتظامی اور بدسلیقگی میں نے کہیں نہیں دیکھی تھی۔ حد یہ ہے کہ سائیکل سٹینڈ کا ٹھیکہ خود پراپیگنڈا سیکرٹری صاحب نے لے رکھا تھا۔

۲۱۔ مارچ کی شام کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا۔ جس میں سیکرٹری کی رسمی رپورٹ کے بعد. ضابطے کے مطابق. مجلسِ انتخاب مضامین ( سبجکٹس کمیٹی ) کے چند مزید ارکان نامزد کئے گئے۔ ان میں پنجاب سے ڈاکٹر محمدؐ عالم اور میاں فیروز الدین احمد کو جگہ ملی۔ قاعدہ یہ تھا کہ سالانہ اجلاس سے ایک دن قبل آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کو سبجکٹس کمیٹی میں تبدیل کر دیا جاتا تھا۔ چنانچہ اسی قاعدے کے مطابق کونسل کو سبجکٹس کمیٹی کی صُورت دے دی گئی تھی۔

۲۲۔ مارچ کی سہ پہر کو لیگ کا کُھلا اجلاس ہوا۔ نواب شاہنواز خاں ممدوٹ نے خطبۂ استقبالیہ ارشاد فرمایا۔ لوگ اطمینان اور سکون سے سنتے رہے۔ آخر میں انہوں نے لاہور کی بادشاہی مسجد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اس مسجد کی حالت بہت سقیم ہو گئی ہے۔ اندیشہ ہے کہ کہیں ہماری غفلت کی وجہ سے عالمگیر اعظم کی اس تاریخی یادگار کو نقصان نہ پہنچے۔ پھر اُنہوں نے سر سکندر کی اُن کوششوں کا ذکر کیا۔ جو وہ مسجد کی مرمت کے سلسلہ میں کر رہے تھے۔ جونہی سر سکندر کا نام آیا۔ پنڈال میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک کُہرام مچ گیا۔ چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں "ہم نہیں سنتے" "سر سکندر کا نام مت لو" "بیٹھ جاؤ" پھر "شرم

شرم " کے نعرے بلند ہونے لگے۔ نواب صاحب بچارے متحیر و پریشان کھڑے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ جب شور ہر لحہ بڑھنے لگا تو وہ چپکے سے اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ سرسکندر خود بھی نواب صاحب کے پیچھے صوفے پر بیٹھے تھے انہوں نے اپنی آنکھوں سے عوام کے غم و غصہ کا یہ مظاہرہ دیکھا تو اٹھ کر پنڈال کے عقبی دروازے سے باہر چلے گئے۔ پھر دوبارہ لیگ کے کھلے اجلاس میں تشریف نہیں لائے۔ قائداعظم صدارتی تقریر کے لئے کھڑے ہوئے تو ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ انہوں نے کچھ دیر اُردو میں خیالات کا اظہار فرمایا۔ پھر انگریزی میں بولنے لگے۔ گذشتہ دو سال کے واقعات کا خلاصہ بیان کیا۔ برطانوی حکومت، کانگرس اور دیگر مختلف عناصر میں سے ایک ایک کا تجزیہ کیا۔ پھر جنگِ یورپ کے متعلق لیگ کی پالیسی کی وضاحت کی اور آخر میں دو قوموں کا نظریہ پیش کرتے ہوئے لالہ لاجپت رائے کا ایک خط پڑھ کر سنایا جو موصوف نے ۱۹۲۴ء میں، بنگال کے مشہور لیڈر سی۔ آر۔ داس کو لکھا تھا کہ مُسلمان اور ہندو دو الگ الگ قومیں ہیں۔ جنہیں ایک دوسرے میں مدغم کر کے ایک قوم بنانا ممکن نہیں۔ لالہ لاجپت رائے چونکہ ہندو قوم کی ذہنیت کے صحیح عَلَم بردار سمجھے جاتے تھے۔ ان کے اس خط نے لوگوں کو ششدر کر دیا۔ ملک برکت علی سٹیج پر بیٹھے تھے۔ ان کے منہ سے نکل گیا کہ لالہ لاجپت رائے نیشنلسٹ ہندو تھے۔ قائداعظم نے زور سے کہا کہ کوئی ہندو نیشنلسٹ نہیں ہو سکتا۔ ہر ہندو اوّل و آخر ہندو ہے۔ اس پر پنڈال میں خوب تالیاں بجیں۔

دوسرا باب

# قرار دادِ پاکستان

۲۲۔ مارچ کو شام کے آٹھ بجے کے قریب، مجلس انتخابِ مضامین (سبجکٹس کمیٹی) کا اجلاس ہوا۔ خاکساروں کے حادثے سے متعلق غم و غصہ کا اظہار کرنے کے لئے اکثر ارکان نے مختلف قرار دادیں پیش کرنے کا نوٹس دے رکھا تھا۔ خیال تھا کہ اِس نشست میں اُن پر بحث ہو گی۔ لیکن قائداعظم نے شروع ہی میں کہہ دیا کہ خاکساروں کے مسئلے کو سردست ملتوی کیا جاتا ہے۔ پھر نواب زادہ لیاقت علی خان نے ذیل کی قرار داد پیش کی۔

"آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اور ورکنگ کمیٹی نے ۲۷۔ اگست، ۱۷، ۱۸۔ ستمبر۔ ۲۲۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء اور ۳۔ فروری ۱۹۴۰ء کو آئینی امور کے بارے میں جو قرار دادیں منظور کی تھیں، آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اِجلاس اُن کی تائید و تصدیق کرتے ہوئے نہایت پُرزور طریقے سے واضح کرتا ہے کہ گورنمنٹ آف اِنڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں جس فیڈریشن کی سکیم پیش کی گئی ہے وہ موجودہ حالات میں قطعی بے سُود اور ناقابلِ عمل ہونے کے باعث مسلمانانِ ہند کے لئے بالکل ناقابلِ عمل ہے۔ یہ اجلاس مزید پُرزور اعلان کرتا ہے کہ وہ اعلان تسلی بخش ہے جو ملکِ معظم کی حکومت کی طرف سے وائسرائے نے ۱۸۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو کیا تھا۔ اور جس میں اعلان کیا گیا تھا کہ ہندوستان کی مختلف جماعتوں، فرقوں اور مفادات سے مشورہ کرنے کے بعد گورنمنٹ آف اِنڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء پر غور کیا جائے گا۔ بایں ہمہ مُسلم انڈیا اُس وقت تک مطمئن نہیں ہو گا جب تک تمام دستوری خاکے پر از سرِ نو غور نہیں کیا جاتا۔ مسلمان کسی دستوری خاکے کو، جو ان کی رضامندی اور مرضی کے بغیر مُرتّب کیا جائے گا منظور نہیں

کریں گے۔

قرار دیا جاتا ہے کہ آل انڈیا مُسلم لیگ کے اس اجلاس کی یہ سوچی سمجھی ہوئی رائے ہے کہ مسلمانان ہند صرف اُس دستوری خاکے کو قبول کریں گے جو ذیل کے بنیادی اصولوں پر مرتب کیا جائے گا۔

جغرافیائی طور پر متصلّہ وحدتوں (یونٹ) کے منطقے اِس طرح وضع کئے جائیں گے کہ ضروری علاقائی ردّ و بدل کے ساتھ جن خطوں میں مُسلمانوں کی عددی اکثریت ہے۔ مثلاً ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی زون، اُن کو باہم مِلا کر خود مختار مملکتیں بنا دی جائیں۔ جن کے ترکیبی یونٹ آزاد اور خود مختار ہوں گے۔

وحدتوں (یونٹ) اور منطقوں میں رہنے والی اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی اقتصادی، سیاسی اور اِنتظامی حقوق اور دیگر مفادات کے لئے ان اقلیتوں کے مشورے سے دستور میں مناسب قانون اور پُر زور تحفظات رکھے جائیں گے۔

یہ اِجلاس ورکنگ کمیٹی کو اختیار دیتا ہے کہ اِن بنیادی اُمور کے مطابق ایک دستور کی سکیم مُرتب کرے جس کی رُو سے انجامِ کار یہ جُملہ منطقے اُن تمام اختیارات کو اپنے قبضے میں لے لیں جن کا تعلّق دفاع، اُمورِ خارجہ، مواصلات، کسٹم اور دیگر ضروری محکموں سے ہے۔"

قائدِاعظم چاہتے تھے کہ اُسی وقت مناسب بحث کے بعد یہ قرار داد منظور کر لی جائے۔ لیکن حاضرین کی رائے تھی کہ مسئلہ چونکہ بے حد اہم ہے انہیں اُس کے مختلف پہلوؤں پر سوچنے کا مزید موقع دیا جائے۔ اس کے علاوہ قرار داد کا متن انگریزی میں تھا۔ اور بعض لوگ انگریزی نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ مولانا ظفر علی خاں نے وہیں قرار داد کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ اور مفصّل بحث دوسرے دِن پر ملتوی کر دی گئی۔

اِس واقعہ کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ جب مولانا ظفر علی خاں قرار داد کا ترجمہ کرنے لگے تو سر سکندر حیات خاں، جو بہت پیچھے بیٹھے تھے، اپنی جگہ سے اُٹھ کر مولانا کے پاس آکر بیٹھ گئے اور جب تک مولانا ترجمے میں مصروف رہے۔ سر سکندر برابر قرار داد کے انگریزی متن اور اُردو ترجمے کے ایک ایک لفظ پر غور فرماتے رہے۔ یہ صحیح ہے کہ سر سکندر مرحوم لفظ پاکستان سے ہمیشہ گھبراتے اور اس کے بجائے قرار دادِ لاہور کا لفظ اِستعمال کرتے تھے۔ لیکن اس رات ان کا یکایک

پچھلی صفوں سے اٹھ کر مولانا ظفر علی خاں کے پاس آ کر بیٹھ جاتا۔ اور ترجمے کے ایک ایک لفظ پر کڑی نگاہ رکھتا کہ آیا اُردو الفاظ انگریزی متن کا صحیح مفہوم ادا کرتے ہیں یا نہیں، اس بات کا ثبوت تھا کہ اُنہیں قرار داد کی ترتیب و تدوین میں خاصا دخل تھا۔

رات کے بارہ بجے سبجکٹس کمیٹی کا اجلاس ختم ہوا تو ملک برکت علی مرحوم اور مَیں ایک ہی موٹر میں واپس آئے۔ میں ان دنوں ٹیمپل روڈ پر ملک صاحب کے پڑوس میں رہتا تھا۔ راستے میں مَیں نے اُن سے کہا کہ قرار داد کے الفاظ میں کچھ نقص ہے۔ آپ رفع کرا دیجئے۔ انہوں نے پوچھا کیا نقص ہے۔ میں نے عرض کیا "پہلے یہ بتایئے کہ ہندوستان کے شمال مغربی علاقے سے جس کو آپ اپنی مجوّزہ مملکت میں شامل کرنا چاہتے ہیں، آپ کی "مراد کیا ہے" ؟

کہنے لگے "یہی پنجاب۔ سرحد بلوچستان اور سندھ"۔

میں نے کہا "تو پھر آپ قرار داد میں واضح طور سے اِن صُوبوں کے نام کیوں نہیں لیتے؟"

بولے "اس سے کیا فائدہ ہو گا" ؟

میں نے عرض کیا "آپ کو معلوم ہے پورے پنجاب میں ہماری اکثریت نہیں۔ دس گیارہ ضلع ایسے ہیں۔ جہاں ہم اقلیت میں ہیں۔ اگر آپ نے علاقائی ردّ و بدل کے ساتھ مُسلمانوں کی اکثریت کے حصّے کو باقی مُلک سے علیحدہ کیا تو نصف کے قریب پنجاب کٹ جائے گا، حالانکہ قرار داد مرتّب کرتے وقت پُورا پنجاب آپ کے ذہن میں تھا۔ اوّل یہ کیجئے کہ جہاں آپ نے شمال مغربی ہند کا ذکر کیا ہے وہاں پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحد کے نام صراحت سے لینا چاہئیں۔ اور دوسرا یہ کہ علاقائی ردّ و بدل کے الفاظ حذف کر دیجئے"۔

ملک صاحب آل انڈیا مُسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے رُکن تھے۔ اور قرار داد کی ترتیب و تدوین میں اُن کا بھی ہاتھ تھا۔ اس لئے ضابطے کے مطابق وہ قرار داد پر اعتراض نہیں کر سکتے تھے تاہم انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ دوسرے روز اسی مضمون کی ترمیم پیش کر دُوں۔

دوسرے روز بحث شروع ہوئی تو میں نے ترمیم پیش کی۔ اور تفصیل سے اپنا نقطۂ نگاہ بیان کرتے ہوئے عرض کیا کہ اگر آپ لوگ پنجاب اور بنگال کے صوبوں کو مجوزہ مملکتوں میں شامل کرنا چاہتے ہیں تو جہاں آپ نے ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی منطقوں کا ذکر کیا ہے وہاں صاف لفظوں میں اِن صُوبوں کے نام لیجئے۔ تاکہ ہمارے مخاطب اور مخالف دونوں ہمارے مطالبے کی حقیقت ابھی سمجھ جائیں ورنہ علاقائی ردّ و بدل کے تحت پنجاب اور بنگال کا قریباً نصف حِصّہ کٹ جائے گا۔

میری اِس ترمیم کا جواب نواب زادہ لیاقت علی خاں نے دیا اور فرمایا کہ ہم نے ایک مصلحت کی وجہ سے صوبوں کے نام نہیں لئے۔ اگر ہم پنجاب کا نام لے دیں تو اِس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہماری مملکت کی سرحد گوڑ گانوں تک ہو گی۔ حالانکہ ہم علاقائی ردّو بدل کے تحت دہلی اور علی گڑھ کو، جو ہماری تہذیب اور تعلیم کے مرکز ہیں مجوزّہ مملکت میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ آپ مطمئن رہیے علاقائی ردّو بدل کا یہ مطلب نہیں کہ پنجاب کا کوئی حِصّہ ہاتھ سے دینا پڑے گا۔

نواب زادہ صاحب کے اِس جواب پر ایوان میں خُوب تالیاں بجیں۔

قائدِاعظم نے تقریر شروع کی تو باہر بہت شور اُٹھا۔ انہوں نے پُوچھا یہ شور کیسا ہے۔ ایک شخص اٹھ کر باہر گیا اور واپس آکر انگریزی میں کہنے لگا کہ شیرِ بنگال آئے ہیں۔ اتنے میں مولوی فضلُ الحق جھومتے ہوئے پنڈال میں داخل ہوئے۔ کلکتہ سے لاہور تک کے سفر کی کوفت چہرے سے عیاں تھی۔ سٹیشن سے سیدھے یہاں چلے آرہے تھے۔ شیو نہ بنانے کی وجہ سے ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی اور بغیر پُھندنے کے ترکی ٹوپی پر حسبِ معمول ایک ایک انچ میل چڑھا ہوا تھا۔ چہرے کی سیاہ رنگت کے ساتھ سپید انگرکھا عجیب بہار دکھا رہا تھا۔ قائدِاعظم نے اُن کو اِس شان سے آتے دیکھا تو کہنے لگے کہ "شیر آجائے تو میمنے کو چُھپ جانا چاہئے"۔ یہ کہہ کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ جب مولوی صاحب کو جگہ مِل گئی اور اطمینان سے بیٹھ گئے تو قائدِاعظم یہ کہہ کر پھر کھڑے ہو گئے کہ اب شیر کو زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہے میمنا پھر باہر آگیا ہے۔ حاضرین ہنسنے لگے۔

میرٹھ کے سر محمد یامین خاں اور مدراس کے عبدالحمید خاں نے قرار داد کی مخالفت کی پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کے ارکان میں سے میر مقبول محمود نے قرار داد کی حمایت میں بہت اچھی تقریر کی تھی۔ بریلی کے مولوی عزیز احمد خاں نے بھی حمایت کی تھی۔ لیکن اُن کا نقطۂ نگاہ بالکل مختلف تھا۔

اُسی روز تین بجے لیگ کا کھلا اجلاس ہوا۔ مولوی فضل الحق نے قرار دادِ پاکستان پیش کی اور تقریر اُردو میں کی۔ مولوی صاحب کو عربی۔ فارسی۔ اُردو کا نہایت اچھا مذاق تھا۔ تقریر کے دوران میں مسلمانوں کی تکلیفوں کا ذکر کیا تو انوری کے یہ دو شعر بھی پڑھے۔

ہر بلائے کز آسماں آید، گرچہ بر دیگرے قضا باشد!

برزمیں نا رسیدہ می پرسد خانۂ انوری کُجا باشد ! !

مولوی صاحب کی تائید میں چودھری خلیق الزماں نے خلافِ معمول بہت پُرجوش اور جذبات سے مرصّع تقریر کی۔ چودھری صاحب نے اپنی کتاب پاتھ وے ٹو پاکستان میں فرمایا ہے کہ مُسلم لیگ کی تمام قرار دادیں وہی لکھا کرتے تھے۔ یہی ایک قرار دادِ پاکستان تھی جو بدقسمتی سے وہ نہ

لکھ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قرار داد بالکل غلط الفاظ میں مرتب کی گئی۔ اور کسی نے نہ سوچا کہ اِن الفاظ سے قرار داد کا مفہوم یکسر بدل ہی نہیں بگڑ کر رہ جائے گا۔ ساتھ ہی چودھری صاحب نے ماتم کیا ہے کہ کاش ورکنگ کمیٹی کے ارکان اُن کی آمد کا انتظار کرتے کہ وہ اپنے وسیع سیاسی تجربے کی بناء پر قرار داد صحیح الفاظ میں مرتب کر سکتے۔

یہ درست ہے کہ چودھری صاحب ۲۱۔ مارچ کو نہیں ۲۲۔ مارچ کو لاہور تشریف لائے تھے (کم سے کم میں نے انہیں ۲۲۔ ہی کو دیکھا تھا) اور قرار داد کا مسودہ ۲۱۔ مارچ کی رات کو نواب صاحب ممدوٹ کے مکان پر لکھا گیا تھا۔ قرار داد کی ترتیب و تدوین و تصنیف میں چار آدمیوں نے حصہ لیا تھا۔ قائداعظم۔ نواب محمد اسماعیل خاں۔ سر سکندر حیات خاں اور ملک برکت علی۔ سر سکندر حیات خاں ایک بنی بنائی قرار داد کا مسودہ اپنے ساتھ ورکنگ کمیٹی میں لائے تھے جو کم و بیش ان کی زونل سکیم کے خاکے پر مرتب کیا گیا تھا۔ ورکنگ کمیٹی نے اُسے منظور نہ کیا۔

قرار دادِ پاکستان کے الفاظ واقعی سخت اُلجھے ہوئے اور افسوناک ہیں جنہوں نے آگے چل کر طرح طرح کی غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پیدا کر کے تاویلات کا دروازہ کھول دیا۔ لیکن گزارش یہ ہے کہ اگر چودھری صاحب کے نزدیک قرار داد غلط مرتب ہوئی تھی تو انہوں نے ۲۲۔ مارچ کو لاہور پہنچ کر جب قرار داد کا مسودہ دیکھا تو کیوں اعتراض نہ کیا۔ اور اپنے محکم دلائل کی بناء پر، جن کا اِظہار انہوں نے اپنی گراں قدر تصنیف پاتھ وے ٹو پاکستان میں کیا ہے، کیوں اپنے رفقاء کار سے نہ کہا کہ قرار داد اجلاس میں پیش کرنے سے پہلے اُس کے الفاظ درست کر لو۔ چودھری صاحب نے ایک غلط قرار داد کو بطیب خاطر قبول کیا اور اسے غلط سمجھتے ہوئے بھی کُھلے اجلاس میں ایک لاکھ آدمیوں کے سامنے اُس کی تائید کی۔ لامحالہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر چودھری صاحب واقعی سمجھتے تھے کہ قرار داد غلط ہے تو اس کی تائید اُنہوں نے کیوں کی۔

اس کا جواب چودھری صاحب نے ۱۹۷۰ء میں ٹیلی ویژن کی ایک تقریر میں دیا تھا فرمایا تھا کہ میرا ارادہ قرار داد کی تائید کرنے کا بالکل نہیں تھا۔ ہُوا یوں کہ مولوی فضل الحق صاحب نے نہایت مہمل اور بے ربط تقریر کی۔ جسے سُن کر قائداعظمؒ سخت غصے میں آئے اور مجھے آنکھ سے اشارہ کیا کہ اُٹھ کر ایک اچھی سی تقریر کرو تاکہ مولوی صاحب نے جو ژولیدگی پیدا کر دی ہے اس کا ازالہ ہو سکے۔

چودھری صاحب ایک منجھے ہوئے سیاست دان کی طرح تاویلوں کے بادشاہ ہیں لیکن یہ انوکھی تاویل ایسی ہے کہ ہنسی روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ چودھری صاحب سے زیادہ کون اِس سے واقف ہو سکتا ہے کہ اجلاس شروع ہونے سے پہلے یہ فیصلہ کر لیا گیا تھا کہ قرار داد مولوی صاحب

پیش کریں گے۔ تائید آپ فرمائیں گے اور تائیدِ مزید پنجاب سے مولانا ظفر علی خاں سرحد سے سردار اورنگ زیب خاں۔ سندھ سے سر عبداللہ ہارون۔ مدراس سے عبدالحمید خاں۔ سی پی سے عبدالرؤف شاہ۔ بمبئی سے اسمٰعیل ابراہیم چندریگر۔ اور بہار سے نواب محمد اسمٰعیل خاں کریں گے۔ چنانچہ اس طے شدہ پروگرام کے مطابق آپ نے تائید کی اور دیگر متذکرہ صدر اصحاب نے تائیدِ مزید فرمائی۔ رہی مولوی فضل الحق کی تقریر۔ وہ نہایت اچھی۔ سلجھی ہوئی اور برمحل تھی اور اس میں قطعی کوئی بے ربطی اور ژولیدگی نہیں تھی۔

قرار داد لاہور میں شمال مغرب اور شمال مشرق کے مسلم اکثریت کے علاقوں میں دو خود مختار مملکتیں قائم کرنے کا صریح اور واضح ذکر ہے۔ کسی قسم کی غلط فہمی یا ابہام سے بچنے کے لئے میں انگریزی کی اصل عبارت نیچے حاشیے میں نقل کرتا ہوں[1]

بعض اصحاب کہتے ہیں کہ اصل لفظ تو "سٹیٹ" تھا "ایس" کا اضافہ ٹائپ کی غلطی سے ہو کر "سٹیٹس" بن گیا۔ یہ محض افسانہ طرازی ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاسِ مدراس میں جو اپریل ۱۹۴۱ء میں ہوا تھا، قرار دادِ لاہور کو من و عن اسی طرح مسلم لیگ کا نصبُ العین قرار دے کر باقاعدہ آئین میں درج کیا گیا تھا۔ وہ آئین آج بھی موجود ہے۔ اِجلاسِ مدراس سے پہلے مسلم لیگ کا مطمحِ نظر ہندوستان میں ایک ایسے فیڈریشن کا قیام تھا جہاں مُسلمانوں کے مذہبی سیاسی۔ تمدّنی حقوق کو خاص تحفظات کے ذریعہ سے محفوظ کیا جائے۔

اِس سلسلے میں اُس "لیجسلیٹر ز کنونشن" کا بھی ذکر کیا جاتا ہے جو کیبنٹ مشن کے وُرُود سے قبل ۹-اپریل ۱۹۴۶ء کو دہلی میں منعقد کی گئی تھی۔ اور جس میں یہ قرار داد منظور کی گئی تھی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا نصبُ العین پاکستان ہے جو پنجاب۔ سندھ۔ بلوچستان۔ سرحد۔ بنگال اور آسام کے صوبوں پر مشتمل ایک "سٹیٹ" میں تبدیل کر دیا جائے۔ بعض حلقوں کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ دہلی کی اس کنونشن نے قرار دادِ لاہور کو بنیادی طور پر باطل کر دیا تھا۔

میری گذارش یہ ہے کہ دہلی کی کنونشن قرار دادِ لاہور کا ایک شوشہ بھی تبدیل کرنے کی مجاز نہ تھی۔ آئینی لحاظ سے اسے قطعاً یہ حق حاصل نہ تھا کہ قرار دادِ لاہور میں کسی قسم کی

---

[1] That geographically contiguous units are demarcated into regions which should be so constituted with such territoral readjustments as may be necessary that the areas in which the Muslims are numerically in a majo-rity as in the North-Weatren Zones of India should be grouped to consitute "Independent States.. in which the constituent units should be autonomous and sovereign.

تبدیلی کرے۔ یہ نکتہ سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے آل انڈیا مسلم لیگ کی ہیئت ترکیبی پر غور کیا جائے۔

آل انڈیا مُسلم لیگ کا بنیادی ادارہ ورکنگ کمیٹی تھی، جس کے اکیس ممبر تھے۔ جنہیں آل انڈیا مُسلم لیگ کا صدر اپنی صوابدید سے نامزد کرتا تھا۔ ورکنگ کمیٹی کے اوپر آل انڈیا مُسلم لیگ کونسل تھی جس کے پانچ سو کے قریب ممبر تھے۔ جو ہندوستان کے مختلف صُوبوں سے منتخب ہو کر آتے تھے۔ ہر صُوبے کے لئے اُس کی مُسلم آبادی کی بناء پر ممبروں کی خاص تعداد معیّن تھی مثلاً پنجاب کے ممبروں کی تعداد غالباً نوّے تھی۔ کونسل کے اُوپر آل انڈیا مُسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے ڈیلی گیٹ تھے۔ جن کی تعداد غالباً پانچ ہزار کے لگ بھگ تھی۔

قاعدہ یہ تھا کہ مُسلم لیگ کا ہر سرکاری ریزولیوشن آل انڈیا مُسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی مرتب کرتی تھی۔ جسے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ کونسل کو حق حاصل تھا کہ چاہے تو مسترد کر دے۔ چاہے من و عن قبول کرلے اور چاہے تو اس میں ترمیم و تبدیلی کرے۔ آل انڈیا مُسلم لیگ کے سالانہ اجلاس پر آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کو مجلس انتخاب مضامین ( سبجکٹس کمیٹی ) میں تبدیل کر دیا جاتا تھا۔ اور ورکنگ کمیٹی کا مُرتب کیا ہوا ریزولیوشن اسی سبجکٹس کمیٹی کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ جس پر باقاعدہ بحث ہوتی تھی۔ یہاں سے منظوری حاصل کرنے کے بعد ریزولیوشن کھلے اجلاس میں پیش کیا جاتا تھا۔ جس کی باقاعدہ تائید اور تائید مزید ہو چکنے کے بعد اُسے ڈیلی گیٹوں کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ ڈیلی گیٹ رائے دیتے تھے۔ آئینی لحاظ سے انہیں حق تھا کہ چاہیں تو ریزولیوشن منظور کریں چاہیں تو مُسترد کر دیں۔ اجلاس میں خواہ ایک یا دو لاکھ آدمیوں کا مجمع ہو۔ رائے دینے کا حق صرف ڈیلی گیٹوں کو تھا۔ اس طرح جو قرار داد پاس ہوتی تھی وہ اٹل اور ناقابل تبدیل بن جاتی تھی۔ آگے چل کر اگر اس قرار داد میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو پھر اُسے ورکنگ کمیٹی نئے سرے سے مرتب کر کے سبجکٹس کمیٹی میں پیش کرتی تھی۔ اور وہاں پاس ہو جانے کے بعد، لیگ کے سالانہ اجلاس پر، ڈیلی گیٹوں کے سامنے باقاعدہ پیش کر کے آخری منظوری حاصل کی جاتی تھی۔ ظاہر ہے ۲۴-اپریل ۱۹۴۰ء کو جو قرار داد پاکستان ان تین آئینی مرحلوں سے گذر کر پاس ہوئی تھی، اس میں اگر کسی قسم کی ترمیم کرنا ضروری تھا تو ترمیم شدہ قرار داد کو دوبارہ انہی تین مرحلوں سے گزارنا چاہئے تھا۔ چھ سال کا طویل عرصہ لیگ کے ذمے دار لیڈر خاموش بیٹھے رہے اور یکایک ۹-اپریل ۱۹۴۶ء کو جاگے تو ایک "لیجسلیٹرز کونشن" منعقد کر ڈالی۔ جس کا آل انڈیا مسلم لیگ کے آئین میں ذکر

تک نہیں۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا مطبوعہ آئین آج بھی موجود ہے۔ ملاحظہ فرمالیجئے۔ اس میں لیگ کی صرف تین منزلیں بیان کی گئی ہیں۔ ورکنگ کمیٹی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل۔ اور آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے نقطہ نظر سے "لیجسلیٹرز کنونشن" کا وجود سراسر غیر آئینی تھا۔ اس کنونشن کی ہیئت ترکیبی یہ بنائی گئی تھی کہ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی اور تمام صوبائی اسمبلیوں کے مسلم لیگی ممبر ایک شامیانے کے نیچے جمع ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کنونشن کی صدارت قائداعظم نے کی تھی۔ لیکن قائداعظم نے تو آل انڈیا مسلم لیگ سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاسوں کی بھی صدارت کی تھی۔ کیا آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن کو، قائداعظم کی صدارت میں، یہ حق حاصل تھا کہ آل انڈیا **مسلم لیگ** کے سالانہ اجلاس کی منظور شدہ قرار داد کا متن تبدیل کر سکے؟

۱۹۵۳ء میں چودھری خلیق الزمان صاحب مشرقی بنگال کے گورنر تھے۔ وہاں اکثر لوگوں نے اُن سے یہ سوال کیا تھا کہ جب قرار دادِ لاہور میں لفظ "سٹیٹس" موجود ہے تو اپریل ۱۹۴۶ء کی کنونشن نے اُسے "سٹیٹ" کیوں بنا دیا اور کیا کنونشن کو اصل قرار داد کے متن میں یہ بنیادی تبدیلی کرنے کا آئینی حق تھا؟ چودھری صاحب نے نواب اسمٰعیل خاں صاحب کو میرٹھ خط لکھ کر یہی استفسار کیا تو نواب صاحب نے جواب دیا:۔

"از بس کہ قرار دادِ لاہور، آل اِنڈیا مُسلم لیگ کا بنیادی عقیدہ بن چکا تھا۔ لیگ کوئی ذیلی ادارہ اُس میں ترمیم کرنے کا مجاز نہیں تھا۔ اگر اُس وقت (کنونشن میں) کوئی شخص اُٹھ کر اعتراض کرتا تو یہ ترمیم کبھی منظور نہیں ہو سکتی تھی۔ اس قسم کی ترمیم صرف آل اِنڈیا مُسلم لیگ کے کُھلے اِجلاس میں کی جا سکتی تھی اور ظاہر ہے ایسا اِجلاس کبھی منعقد نہیں کیا گیا"۔

دوسرے خط میں نواب صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"مجھے یہ سُن کر بڑی حیرت ہوئی ہے کہ مسٹر جناح نے رولنگ دیا تھا کہ لفظ "سٹیٹس" ٹائپ کی غلطی سے چھپ گیا ہے۔ یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ خود صدر کانسٹی ٹیوشن کے الفاظ کو نظر انداز کر کے اِس قسم کا رولنگ دے۔ اگر لفظ "سٹیٹس" چھاپے کی غلطی تھی: جیسا کہ بیان کیا جا رہا ہے، تو اُس وقت کیوں درست نہ کی گئی جب اِس قرار داد کو مُسلم لیگ

کا نصب العین بنایا گیا تھا۔ یقیناً اُس وقت اوّلین فرض تھا کہ الفاظ ایسے صاف اور واضح استعمال کئے جاتے، جن سے کسی غلط فہمی کا احتمال باقی نہ رہتا۔ مُسلم لیگ کے آئین کے بہت سے ایڈیشن بعد ازاں نواب زادہ لیاقت علی خاں کی براہ راست نگرانی میں شائع ہوتے رہے۔ ان میں سے ہر ایڈیشن میں لفظ "سٹیٹس" درج ہے۔ میرے پاس کانسٹی ٹیوشن کا جو نسخہ ہے وہ تقسیم ملک سے کچھ ہی پہلے کا ہے۔ اس میں بھی سٹیٹس چھپا ہوا ہے"[1]

خود چودھری صاحب نے اپنی کتاب "پاتھ وے ٹو پاکستان" کے صفحہ نمبر ۲۵۲ پر لکھا ہے کہ ۱۵ اپریل ۱۹۴۱ء کو آل انڈیا مُسلم لیگ کے اجلاس مدراس کے موقع پر قرار دادِ لاہور کو مُسلم لیگ کے آئین میں شامل کر لیا گیا تھا۔ اس کے بعد یہ قرار داد مسلم لیگ کا نصب العین بن گئی تھی جس کے متن کا ایک شوشہ بھی اُس وقت تک تبدیل نہیں کیا جا سکتا تھا جب تک آل انڈیا مسلم لیگ کا مکمل اجلاس نہ منعقد کیا جاتا۔

ملک برکت علی مرحوم قرار دادِ لاہور کے مصنفوں میں شامل تھے۔ اُنہوں نے اجلاسِ لاہور کے سوا سال بعد ۲۶۔ جولائی کو لائل پُور میں پاکستان کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے جو خُطبۂ صدارت پڑھا تھا۔ اُس میں اِس قرار داد کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

"مُسلم لیگ کے سامنے جس پاکستان کا نصب العین ہے، اُس کا خاکہ آل اِنڈیا مُسلم لیگ کی اُس قرار داد میں درج ہے۔ جو ۲۳۔ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں منظور ہوئی تھی۔ اور جس کی رو سے ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں دو مُسلم مملکتیں وجود میں لائی جائیں گی۔ اِس کے بعد یہ نکتہ ہر شخص پر واضح ہو جانا چاہئے کہ ہندوستان کے مُسلمان جس پاکستان کی تعمیر و تشکیل میں کوشاں ہیں۔ وہ کوئی مشتبہ یا متنازع شے نہیں بلکہ ایک معیّن حقیقت ہے جس کی وضاحت مسلم لیگ کی مذکورہ بالا قرار داد میں کی جا چکی ہے"۔

خود قائدِاعظمؒ نے متعدد موقعوں پر قرار دادِ لاہور کی وضاحت کرتے ہوئے "سٹیٹس" کا لفظ اِستعمال کیا۔ مثلاً اجلاس لاہور کے صرف دو مہینے بعد انہوں نے احاطہ بمبئی کی پراونشل مسلم لیگ کانفرنس کو جو ۲۶۔ مئی ۱۹۴۰ء کو منعقد ہوئی تھی۔ پیغام بھیجا تھا۔ اُس میں ایک جگہ فرمایا:

---

۱۔ پاتھ وے ٹو پاکستان، مصنف چودھری خلیق الزمان۔ صفحہ نمبر ۳۳۲

"مجھ سے پُوچھا جاتا ہے کہ کیا برطانیہ قرار دادِ لاہور کے بنیادی اور اہم ترین اصول مان لے گا؟ یعنی ہندوستان کے شمال مغربی زون اور شمال مشرقی زون میں دو خود مختار سٹیٹس قائم کرے گا؟"

یکم جولائی ۱۹۴۰ء کو اُنہوں نے وائسرائے لارڈ لنلتھگو کو ایک خط میں لکھا۔

"ملکِ معظم کی حکومت کو چاہئے کہ اِس قسم کا اعلان کرنے یا بیان دینے سے احتراز کرے جس سے قرار دادِ لاہور کے بنیادی مقاصد اور اصولوں کو گزند پہنچنے کا احتمال ہو یعنی ہندوستان کو اِس طرح تقسیم کیا جائے کہ شمال مغرب اور شمال مشرق کے منطقوں میں دو مُسلم سٹیٹس وجود میں لائی جائیں۔ مَیں یہ بھی عرض کر دوں کہ ریزولیوشن مسلمانانِ ہند کا متفقہ نصبُ العین بن چکا ہے"۔

۹ر نومبر ۱۹۴۲ء کو اُنہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس دہلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اِس میں قطعاً کوئی شبہ نہیں کہ مُسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں۔ ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی خطوں میں اُن کی سات کروڑ آبادی ہے۔

ہماری تجویز یہ ہے کہ اِن منطقوں میں دو خود مختار سٹیٹس قائم کی جائیں۔ ہم ہندوستان میں اس قسم کی مرکزی حکومت کبھی برداشت نہیں کریں گے جو جمہوری اصولوں پر بنائی جائے ایک قوم کی حیثیت سے ہمیں حقِ خود ارادی حاصل ہے۔ اور ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ جن منطقوں میں ہماری اکثریت ہے وہاں دو خود مختار سٹیٹس بنائی جائیں"۔

اِسی طرح قائدِاعظمؒ کی بہت سی تقریروں کے اقتباس پیش کئے جا سکتے ہیں۔ جہاں اُنہوں نے "سٹیٹس" کا لفظ استعمال کیا ہے۔

اُنہیں پہلی مرتبہ اس وقت قرار دادِ لاہور کے بنیادی نقص کا احساس ہوا جب ۱۹۴۴ء میں راج گوپال اچاریہ کے فارمولے پر گاندھی جی سے اُن کی گفتگو ہوئی تھی۔ گاندھی جی نے "علاقائی ردّ و بدل" کے الفاظ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا مطالبہ کیا تو قائدِاعظم نے ۲۴-ستمبر ۱۹۴۴ء کے خط میں لکھا تھا۔

"اگر یہ شرط مان کر اِس پر عمل کیا گیا تو اِن صُوبوں کی حدود کی اِس بُری

طرح کاٹ چھانٹ ہو جائے گی کہ ہمارے ہاتھ کچھ بھی نہیں آئے گا۔ آپ
کی یہ تاویل قرار دادِ لاہور کے منافی ہے"۔

۲۵۔ ستمبر کے خط میں پھر قائداعظمؒ گاندھی جی کو لکھتے ہیں کہ:

"آپ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ پاکستان دو منطقوں پر مشتمل ہے۔ شمال مغربی
منطقے میں پنجاب۔ سندھ۔ بلوچستان اور سرحد شامل ہیں اور شمال مشرقی
منطقے میں بنگال اور آسام ہیں۔ اِن میں قرار دادِ لاہور کے مطابق علاقائی
ردّ و بدل کیا جاسکتا ہے"۔

گاندھی جی نے ۱۹۔ ستمبر ۱۹۴۴ء کو قائداعظمؒ کو لکھا تھا کہ کانگرس کی پالیسی یہ ہے کہ اگر
ہندوستان کے کسی خاص علاقے کے باشندے اپنے لئے حقِ خود ارادی مانگتے ہیں تو کانگرس مخالفت
نہیں کرے گی۔ اسی اصول کے مطابق اگر شمال مغربی اور شمال مشرقی ہندوستان کے حصے اپنے لئے
حقِ خود ارادی کے طلب گار ہیں تو کانگرس مزاحمت نہیں کر سکتی۔ جواب میں قائداعظم نے ۲۱۔
ستمبر کو لکھا تھا۔

"ہم کسی خطۂ ارضی کے لئے حقِ خود ارادی نہیں مانگتے۔ ہمارا مطالبہ یہ
ہے کہ مُسلمان ایک مستقل اور جداگانہ قوم ہیں جو اپنا حقِ خود ارادی منوانا
چاہتے ہیں۔ اور یہ ہمارا پیدائشی حق ہے۔ آپ اِس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ
یہ حقِ خود ارادی کسی زمین کے ٹکڑے کے لئے مخصوص ہے۔ ہمارا نقطۂ
نظر یہ نہیں کہ ہندوستان کا کوئی حصّہ ہندوستان سے علیحدہ ہونا چاہتا ہے
ہے بلکہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں۔ جو اپنا حقِ خود
ارادی مانگ رہے ہیں تاکہ ہندوستان تقسیم کر کے اپنے لئے دو خود مختار اور
"ساورن سٹیٹس" وضع کی جائیں"۔

بات یہ ہے کہ مُسلم لیگ کے لیڈروں کا خیال تھا کہ علاقائی ردّ و بدل کے الفاظ سے فائدہ
اٹھا کر اپنی مجوزہ مملکتوں کی حدود ایک طرف دہلی تک لے جائیں گے اور دوسری طرف بنگال کے
ساتھ آسام بھی شامل کر لیا جائے گا۔ یہ نقطۂ نگاہ غلط فہمی پر مبنی تھا۔ اور جغرافیائی اور تاریخی
حقائق سے بے خبری کا ثبوت۔ جب ایک مرتبہ واضح الفاظ میں یہ کہہ دیا گیا تھا کہ شمالی مغربی اور
شمال مشرقی ہندوستان کے جن علاقوں میں مُسلمانوں کی عددی اکثریت ہے اُن کو ملا کر خود مختار
مملکتیں بنادی جائیں۔ تو پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا اصول لفظاً نہ سہی معناً تسلیم کر لیا گیا تھا۔

راج گوپال اچاری فارمولا تقسیم پنجاب اور تقسیمِ بنگال کی بنیادوں پر مرتب کیا گیا تھا۔ اور قائداعظم نے اسے مسترد کر دیا تھا۔ اُس وقت اگر قائداعظم یہ فارمولا منظور کر لیتے تو مسلم لیگ کے اندر پھوٹ پڑ جاتی۔ اور پنجاب اور بنگال کے مُسلمان کبھی اپنے صُوبوں کی تقسیم پر آمادہ نہ ہوتے۔

پڑھے لکھے تعلیم یافتہ اور جغرافیائی اور تاریخی حقائق سے باخبر لوگ بھی "علاقائی ردّو بدل" کے الفاظ کا شکار ہو کر عجیب عجیب خوش فہمیوں میں مبتلا تھے۔ بیگم شائستہ اِکرام اللہ اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہونے کے علاوہ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں جس میں علم و ادب کے ساتھ سیاست کا بھی عمل دخل رہا ہے۔ ان کے والد سر حسان سہروردی وزیر ہند کی کونسل کے ممبر اور عم محترم سر عبداللہ المامون سہروردی بنگال کے وزیر تھے۔ حسین شہید سہروردی جو پاکستان بننے سے پہلے بنگال کے وزیراعظم تھے، اور آگے چل کر پاکستان کے بھی وزیراعظم بن گئے تھے بیگم اِکرام اللہ کی پُھوپھی کے بیٹے تھے۔ بیگم صاحب کے نامور شوہر پاکستان کے سب سے پہلے فارن سیکرٹری تھے. مختلف ملکوں میں پاکستان کے سفیر بھی رہے۔ ۱۹۴۲ء میں وہ حکومتِ ہند کے ڈپٹی سیکرٹری تھے بیگم اکرام اللہ نے انگریزی میں اپنی خود نوشت سوانح عمری لکھی ہے جس کے صفحہ نمبر ۱۳۵ پر رقم طراز ہیں۔

"پاکستان کے حدود کی وضاحت کبھی نہیں کی گئی تھی۔ لیکن یہ بات تو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ دہلی پاکستان میں شامل نہیں ہو گی۔ ہمیں یقین تھا کہ دہلی ضرور پاکستان کے حصّے میں آئے گی۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان کرتی ہوں۔ ایک سہ پہر ہم سیر و تفریح کے لئے ہمایوں کے مقبرے گئے۔ جب ہم اُس کی چھت پر کھڑے تھے تو میری نند نے پوچھا کہ اگر پاکستان بن گیا تو کیا دہلی آپ کے حصے میں آئے گی۔ میرے شوہر نے اُنگلی سے سامنے اشارہ کیا جہاں دہلی کی قدیم شاہی عمارتوں کے گنبد اور مینار نظر آرہے تھے اور کہا کہ دیکھو ان کی طرف۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ یہ پاکستان کا حصہ نہیں ہیں۔ میری نند نے جواب دیا بے شک یہ عمارتیں اِسلامی طرزِ تعمیر کا نمونہ ہیں۔ اور اِس لحاظ سے دہلی مسلمانوں ہی کو ملنی چاہئے ........ لیکن افسوس پنجاب کی تقسیم سے دہلی ہمارے ہاتھ سے نکل گئی" [1]

---

"From purdah to Parliament "by Begum Ikramulla. P1

غور فرمائیے ۔ یہ واقعہ ۱۹۴۲ء کا ہے۔ مسٹر اکرام اللہ اس وقت حکومت ہند کے ڈپٹی سیکرٹری تھے اور دہلی میں مقیم تھے۔ اگر انڈین سول سروس کا ایک سینئر مسلمان افسر محض لال قلعہ کی دیواروں اور جامع مسجد کے میناروں کو دیکھ کر یہ حکم لگا سکتا ہے کہ دہلی پاکستان کے حصے میں آئے گی تو اُن لوگوں کا ذکر بے کار ہے جنہوں نے آج تک قرار دادِ لاہور کا متن نہیں پڑھا۔ اور نہ کبھی سنجیدگی سے اُس کے مضمرات سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

بیگم اکرام اللہ نے اپنی کتاب میں ایک اور واقعہ بھی لکھا ہے کہ "اکثر مُسلمانوں کے نزدیک پاکستان ایک تصوّر تھا، حقیقت نہ تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ پاکستان گویا اُن کا ناقابلِ تردید حق ہے، جسے اب تک اُنھوں نے استعمال نہیں کیا مُسلمانوں کے بڑے بڑے لیڈروں کا بدستور یہ خیال تھا کہ کسی قسم کا باہمی سمجھوتہ ہو جائے گا اور وہ متحدہ ہندوستان کے اندر اپنی جُداگانہ کلچرل ہستی برقرار رکھ سکیں گے۔ قائداعظم" کا بھی یہی خیال تھا۔ مجھے بخوبی یاد ہے، جب میں پہلی بار اُن سے ملی تھی[1] تو اُنھوں نے کہا تھا کہ کینیڈا کا آئین ہمارے مسائل کا بہترین حل ہے۔ قرار دادِ پاکستان کے بعد وہ سات سال تک ایک طرف برطانوی حکومت اور دوسری طرف کانگرس سے باہمی سمجھوتے کی بات چیت کرتے رہے۔ اور اس دوران میں ایک سے زائد بار تقریباً سمجھوتہ ہو بھی گیا تھا۔ جو اِس بات کا ثبوت ہے کہ وہ دوٹوک بٹوارہ نہیں چاہتے تھے۔ باہمی سمجھوتے میں ناکامی ہوئی تو اُس کی ذمہ داری قائداعظم پر نہیں کانگرسی لیڈروں کی تنگ دلی اور تعصب پر تھی"۔[1]

اِس سلسلے میں ایک اور سوال بار بار ہمارے سامنے آرہا ہے کہ قائداعظم نے حقیقتاً ہندوستان کے دوٹوک بٹوارے کا فیصلہ کب کیا تھا۔ سر جارج کننگھم نے، جو صوبۂ سرحد کے گورنر تھے، ڈاکٹر خالد بن سعید کی ایک کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے کہ "تاریخی نقطۂ نگاہ سے یہ خیال بے حد دِلچسپ ہے کہ قائداعظم نے یہ فیصلہ کب کیا تھا کہ نیم فیڈرل طرز کی حکومت کا تصور بالکل ترک کر کے ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ کیا جائے۔ غور کرنا چاہئے کہ وہ خاص گھڑی چاقو کی دھار کی طرح تیز ہو گی۔"

---

۱۔ قائداعظم سے بیگم اکرام اللہ کی پہلی ملاقات اکتوبر ۱۹۴۱ء میں ہوئی تھی۔

"From purdah to Parliament "by Bugum Ikramula. Page 100-۱

مُدّت ہوئی سید زاہد حسین صاحب مرحوم (گورنر سٹیٹ بنک آف پاکستان) کا مضمون کراچی کے کسی اخبار میں چھپا تھا کہ نومبر ۱۹۴۶ء میں قائداعظم حیدر آباد دکن گئے تو زاہد حسین صاحب نے، جو اُس وقت وہاں وزیر خزانہ تھے، پوچھا کہ آئندہ آپ کیا فیصلہ کریں گے قائداعظم نے جواب دیا کہ کیبنٹ مشن کی سکیم بہت اچھی تھی۔ لیکن کانگرس نے اسے خراب کر دیا ہے اب ہندوستان کی تقسیم کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ کم و بیش اِسی قسم کی گفتگو قائداعظم نے اُنہی دنوں چودھری ظفراللہ خاں صاحب سے دہلی میں کی تھی۔ حالات و واقعات کو دیکھ کر یہی نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ قرار دادِ لاہور پاس کرنے کے باوجود قائداعظم نے ہندوستان کی تقسیم کے مسئلے پر سنجیدگی سے اُس وقت غور کرنا شروع کیا تھا جب کیبنٹ مشن سکیم ناکام ہو چکی تھی۔ یعنی اکتوبر یا نومبر ۱۹۴۶ء کے لگ بھگ۔

مسٹر اکرام اللہ، جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، انگلستان میں پاکستان کے ہائی کمشنر تھے اُنہوں نے ۵ جنوری ۱۹۶۲ء کو، لندن کے اوور سیز لیگ ہال میں تقریر کرتے ہوئے، قائداعظم کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کیے تھے۔ تقریر کے دوران میں کہنے لگے کہ "مَیں نے قائداعظم سے پُوچھا کہ اگر آپ ہندوستان کا واقعی بٹوارہ چاہتے تھے تو کیبنٹ مشن کی سکیم آپ نے کیوں منظور کی تھی"؟

قائداعظم نے جواب دیا "واقعی یہ دلچسپ سوال ہے۔ سُنو، میرا ہمیشہ پاکستان پر اعتقاد تھا لیکن مَیں خون خرابہ پسند نہیں کرتا۔ مَیں نے سوچا کہ اگر آئینی طریق سے کیبنٹ مشن سکیم کے تحت ایک طرح خود مختاری (اٹانومی) مِل رہی ہے تو اُسے قبول کر لینا چاہئے۔ مَیں چاہتا یہ تھا کہ دس سال تک ہندوؤں کو آزمایا جائے۔ اگر وہ سیدھے راستے پر نہ چلے تو ہم اُن سے قطع تعلّق کر لیں گے۔ لیکن بعد میں جو واقعات پیش آئے اُن کا تمہیں علم ہے۔ کانگرس نے جس طرح کیبنٹ مشن سکیم کا حُلیہ بگاڑا۔ اُس نے مجھے اِس قدر برگشتہ خاطر کیا کہ مَیں نے ہندوستان کے دو ٹوک بٹوارے کا فیصلہ کر لیا۔ تم پنجاب اور بنگال کی تقسیم کو روتے ہو۔ مجھے صرف آدھا سندھ دے دیا جاتا تو مَیں اسے بھی قبول کر لیتا"[1]۔

اسی طرح اور بھی متعدد شواہد پیش کیے جا سکتے ہیں کہ قرار دادِ لاہور پاس کرنے کے باوجود مُسلم لیگی لیڈروں کے پیش نظر ہندوستان کی دو ٹوک تقسیم نہ تھی۔ اِس نوع کی تقسیم اُس وقت سامنے آئی جب کیبنٹ مشن سکیم ناکام ہوئی۔ اور ہمارے لئے آگے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے کے راستے

---

1-The Pakistan Society, London, Bulletin Number 17,1962,Page 20

بند ہو گئے۔

محمد ہاشم صاحب گزدر مرحوم کا ایک مضمون مدت ہوئی کراچی کے اخبار جنگ میں شائع ہوا تھا کہ قائداعظم نے ۳ جون ۱۹۴۷ء کا منصوبہ قبول کر لیا تو میں نے دہلی میں اُن سے پوچھا تھا کہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم پر آپ کیوں رضامند ہو گئے، تو انھوں نے جواب دیا کہ قراردادِ لاہور کا یہی مفہوم ہے۔

سر محمد یامین خان بیرسٹرایٹ لاء ہندوستان کی مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی کے نائب صدر اور قائداعظم کی مسلم لیگ پارٹی کے سیکرٹری تھے۔ ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو جب قرار داد پاکستان آل انڈیا مسلم لیگ کی سبجکٹس کمیٹی میں پیش ہوئی تھی تو وہ سبجکٹس کمیٹی کے ممبر تھے۔ انہوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری نامہ اعمال' کے صفحہ ۷۷۹ پر اس قرار داد کے بارے میں اپنے تاثرات کا جو اظہار کیا ہے پڑھنے کے قابل ہے۔ لکھتے ہیں۔

ڈنر کے بعد سبجکٹ کمیٹی کی میٹنگ تھی جس میں کل ممبران آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل شریک ہوئے۔ میرے ایک طرف سر سکندر حیات خاں بیٹھے تھے اور دوسری طرف خاں صاحب شیخ رشید احمد آرمی کنٹریکٹر۔ مسٹر جناح نے کہا کہ ریزولیشن بن گیا ہے۔ وہ صاف ہو رہا ہے اور ٹائپ ہو کر آئے گا۔ اتنے میں ریزولیوشن ٹائپ ہو کر آ گیا۔ اور رات کے دو بج گئے۔ میں جناح صاحب کے قریب جا بیٹھا اور لمبے ریزولیوشن کو سنا لیکن اس کی اہمیت کو ٹھیک نہ سمجھ سکا۔ ہر صُوبے کو ایک ایک کاپی دی گئی کہ وہ آپس میں مشورہ کر لیں ہمارے صوبے کی کاپی نواب صاحب چھتاری لے گئے کہ وہ پڑھ کر صبح کو نو بجے پنڈال میں لے آئیں گے۔ چونکہ مسٹر جناح نے کہا کہ وہ صبح کو ساڑھے نو بجے پھر سبجکٹ کمیٹی کریں گے میں نو بجے گیا لیکن نواب صاحب چھتاری ساڑھے نو بجے پھر سبجکٹ کمیٹی کو اٹنڈ کرنے آئے اور نواب سر محمد یوسف سے مشورہ کے بعد چند ترمیمات ریزولیوشن میں مجھ کو دکھائیں۔ میں اُن کو یا ریزولیوشن کے الفاظ کو ٹھیک نہ سمجھ سکا کہ مسٹر جناح آ گئے اور کارروائی شروع ہوئی نواب صاحب چھتاری نے اپنی ترمیمات پیش کیں۔ مسٹر جناح نے کہا کہ کوئی ان کی تائید کرتا ہے نواب چھتاری نے کہا کہ سر یامین خاں تائید کریں گے مسٹر جناح نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا آپ تائید کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں ابھی تک

ریزولیوشن کے الفاظ کو صحیح نہیں سمجھ سکا چونکہ یہ ابھی لائے ہیں اس لئے میں تائید نہیں کرتا۔ چونکہ ترمیم کی تائید نہیں ہوئی سبجکٹ کمیٹی نے اصل ریزولیوشن پاس کر دیا۔ شام کو کھلے اجلاس میں پیش ہوا جس میں تقریباً" پچاس ہزار آدمی تھے۔ اگرچہ بعض کا خیال ایک لاکھ ہے۔ مولوی فضل الحق سے ریزولیوشن عام جلسے میں پیش کرایا گیا۔ سب صُوبوں کے لوگوں سے تائید کرائی گئی"۔

سر محمد یامین خاں ایک پختہ کار سیاست دان تھے۔ اُن کے مذکورہ بالا بیان سے صاف ظاہر ہے کہ اُنھوں نے قراردادِ پاکستان کا متن تین مرتبہ سُنا۔ اور تینوں بار اُن کی سمجھ میں نہ آیا۔ جب سر محمد یامین خاں صاحب جیسے تجربہ کار لیڈر کے عجزِ فہم کا یہ حال تھا تو پچاس ہزار کے مجمع میں کتنے آدمیوں نے قرارداد کا اصل مفہوم سمجھا ہو گا۔

رہا یہ سوال کہ جب قراردادِ لاہور کی رُو سے شمال مغرب اور شمال مشرق میں دو خود مختار مملکتوں کا مطالبہ کیا گیا تھا، تو برطانوی پارلیمینٹ نے پاکستان کے نام سے ایک مملکت کیوں بنائی۔ بات یہ ہے کہ جہاں تک پاکستان کے حدود کا تعلق ہے پارلیمینٹ نے قراردادِ لاہور کی پابندی کی ہے۔ اور جہاں تک مملکت کے ایک ہونے کا سوال ہے پارلیمینٹ نے اپریل ۱۹۴۶ء کی کنونشن کی قرارداد کو ملحوظ رکھا ہے۔

آج اِس مسئلے کا محاکمہ بے کار ہے۔ لندن میں اکثر بنگالی نوجوان مجُھ سے قراردادِ لاہور کا ذکر کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ اِس قرارداد کی رُو سے مشرقی بنگال کو جداگانہ مملکت کی صورت دینی چاہیئے۔ میں جواب میں ہمیشہ یہ عرض کرتا تھا کہ آپ کے اِس مطالبے کی پذیرائی کا بہترین موقع وہ تھا جب ۱۵ جولائی ۱۹۴۷ء کو قانون آزادیٔ ہند کا مسودہ برطانیہ کے وزیرِ اعظم نے پارلیمینٹ میں پیش کیا تھا۔ آپ کا فرض تھا کہ اس وقت لندن آکر پارلیمینٹ کے روبرو احتجاج کرتے کہ قراردادِ لاہور کے مطابق ہندوستان تقسیم کرو۔ اور شمال مشرق میں ہمارے لئے ایک علیحدہ مملکت قائم کرو۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ پاکستان، پارلیمینٹ کے ایکٹ کی رُو سے وجود میں آیا ہے اگر پاکستان کے دو ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اُس ایکٹ کو منسوخ کروایئے۔ جب تک وہ ایکٹ کارفرما ہے آئینی لحاظ سے شمال مشرق میں جداگانہ مملکت نہیں بن سکتی۔

میرے اِن دلائل کے جواب میں وہ بنگالی نوجوان یہ کہتے تھے ہم اُس ایکٹ کو تو منسوخ نہیں کر سکتے اور نہ کرنا چاہتے ہیں۔ البتہ اپنے بازو کی قوت سے الگ ضرور ہوں گے۔ بالآخر یہی کچھ ہوا

جو ملک برطانوی پارلیمینٹ کے ایکٹ کی رو سے وجود میں آیا تھا اُسے ڈھاکہ کے پلٹن میدان کی شورش نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔[1]

---

۱۔ پاکستان ۱۹۴۷ء میں بن گیا تھا۔ لیکن مشرقی بنگال میں اسی وقت یہ تحریک شروع ہو گئی تھی کہ قرار داد لاہور کی رُو سے مشرقی بنگال کو ایک الگ خود مختار مملکت ملنی چاہئے۔ مارچ ۱۹۵۴ء میں وہاں انتخاب ہوئے تو اپوزیشن نے، جس میں مولوی فضل الحق مسٹر حسین شہید سہروردی اور مولانا بھاشانی شامل تھے۔ اکیس ۲۱ نکات کا الیکشن مینی فسٹو شائع کیا تھا۔ جس کا اہم ترین نکتہ یہ تھا کہ ۱۹۴۰ء کی قرار داد لاہور کے مطابق مشرقی بنگال کو ایک آزاد اور خود مختار مملکت تسلیم کیا جائے۔

تیسرا باب

# پنجاب مسلم لیگ پارلیمنٹری پارٹی

قرار داد لاہور کی منظوری کے بعد، آل انڈیا مسلم لیگ کا فرض تھا کہ اپنی توجہ کا بیشتر حصہ مُسلم اکثریت کے صُوبوں، بالخصوص پنجاب اور بنگال کی طرف منعطف کرتی کیونکہ انجامِ کار یہی صوبے پاکستان کی بنیاد بننے والے تھے۔ لیکن اس ضمن میں آل انڈیا مسلم لیگ نے جس غفلت کا ثبوت دیا وہ حد درجہ افسوس ناک ہے۔ پنجاب مسلم لیگ کو سر سکندر کے حوالے کر کے گویا لیگ کو یونینسٹ پارٹی کی ایک شاخ بنا دیا گیا تھا۔ پنجاب اسمبلی میں اب تک کوئی مسلم لیگ پارلیمنٹری پارٹی قائم نہیں کی گئی تھی۔ سر سکندر حیات خاں اور نواب شاہنواز خان ممدوٹ نے ملک برکت علی۔ میاں عبدالعزیز۔ عاشق حسین بٹالوی۔ خلیفہ شجاع الدین۔ میاں عبدالمجید۔ پیر تاج الدین اور زمان مہدی خاں کو لیگ سے خارج کر کے انہیں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کی رکنیت سے بھی محروم کر دیا تھا۔ اندریں حالات پنجاب میں سر سکندر کا کوئی حریف باقی نہیں رہا تھا۔ اور اُنہیں کھلی چھٹی تھی کہ جو چاہیں اور جس طرح چاہیں کریں آل انڈیا مُسلم لیگ اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔

سب سے مقدّم فرض یہ تھا کہ پنجاب اسمبلی میں جلد از جلد ایک مسلم لیگ پارٹی قائم کی جاتی۔ لیکن نواب ممدوٹ۔ راجہ غضنفر علی خاں۔ مشتاق احمد گورمانی۔ شیخ کرامت علی، سید امجد علی وغیرہ مسلم لیگ پارٹی کا نام سننے کے روادار نہ تھے۔ نواب شاہنوا خاں ممدوٹ نے، پنجاب مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے اخباروں میں اعلان کر دیا تھا کہ یونینسٹ پارٹی نہایت اچھا کام کر رہی ہے۔ لہٰذا پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی بنانے کی ضرورت نہیں۔

مجبوراً یہ بار بھی ہمیں اٹھانا پڑا۔ چنانچہ ہم نے ذاتی کوشش سے میاں عبدالعزیز۔ ملک برکت علی۔ میاں نور اللہ۔ سیّد محمد رضا۔ سیّد ولایت حسین۔ سردار محمد حسین وغیرہ کو ملا کر پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کی بنیاد رکھ دی۔ جب تک کسی پارٹی کے ممبروں کی تعداد بارہ نہ ہو اُسے اسمبلی کے قواعد کی رو سے سرکاری منظوری حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ بہر حال کام کرنے کے لئے

ہم نے ابتدا کر دی تھی ۔ ملک برکت علی اور میاں عبدالعزیز کے اصرار پر مجھے اِس پارٹی کا سیکرٹری مقرر کیا گیا تھا ۔ میں نے ہر چند عذر پیش کیا کہ میں اسمبلی کا ممبر نہیں لیکن اُن دونوں بزرگوں کی خواہش تھی کہ میں سیکرٹری کا کام کروں ۔

اسمبلی میں مُسلم لیگ پارلیمنٹری پارٹی کے قیام کے لئے ضروری تھا کہ سرکاری طور پر آنریبل سپیکر سے تسلیم کروایا جاتا، کہ پنجاب اسمبلی میں پہلے سے اِس نام کی کوئی پارٹی موجود نہیں ۔ چنانچہ ۹ ستمبر ۱۹۴۰ء کو ملک برکت علی نے سپیکر کو خط لکھا کہ اُنہیں وزارتی پارٹی سے علیحدہ کسی اور بنچ پر سیٹ دی جائے۔ جواب میں ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۰ء کو اسمبلی کے سیکرٹری سردار ابناشا سنگھ نے ذیل کا خط ملک صاحب کو لکھا ۔

"ڈیر ملک صاحب ۔ آپ نے ۹ ستمبر کو آنریبل سپیکر کو اسمبلی کے ایوان میں اپنی سیٹ کے بارے میں جو خط لکھا تھا ۔ اس سلسلہ میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ جس پارٹی کے ممبر ہیں اُس کا نام کیا ہے ۔ تاکہ آنریبل سپیکر آپ کو اُس پارٹی کے بلاک میں سیٹ عطا کر سکیں ۔

۴۔ نومبر کو ملک صاحب نے سردار ابناشا سنگھ کو ذیل کا جواب دیا :۔

"ڈیر سردار صاحب ۔ آپ کا نوازش نامہ محررہ ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۰ء مجھے وقت پر مل گیا تھا ۔ میں مسلم لیگ پارٹی کا ممبر ہوں لیکن چونکہ اسمبلی کے ایوان میں اس نام کی کوئی پارٹی موجود نہیں ۔ لہٰذا مجھے انڈی پنڈنٹ بنچوں پر جہاں میاں عبدالعزیز بیٹھتے ہیں، جگہ دی جائے ۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مَیں انڈی پنڈنٹ پارٹی کا ممبر ہوں ۔ مقصد صرف یہ ہے کہ میں ایسی جگہ بیٹھنا چاہتا ہوں کہ مجھے اسمبلی کی کسی اور پارٹی سے وابستہ نہ سمجھ لیا جائے ۔ اور میں اپنی آزادی برقرار رکھ سکوں ۔

افسوس ہے کہ آپ کے نوازش نامے کے جواب میں تاخیر ہوئی ۔ وجہ یہ تھی کہ مَیں اپنے والد صاحب کی علالت کی وجہ سے بہت پریشان تھا ۔

مخلص

ملک برکت علی"

اِس خط کا جواب اسمبلی کے ڈپٹی سیکرٹری حکیم احمد شجاع صاحب نے ۱۵ نومبر کو دیا :

"ڈیر ملک صاحب. بحوالہ آپ کے اُس خط کے جو آپ نے ۴ انومبر ۱۹۴۰ء کو سیکرٹری کو لکھا تھا۔ اور جس میں آپ نے اپنی سیٹ کا ذکر کیا تھا۔ آنریبل سپیکر نے مجھ کو ہدایت کی ہے آپ کو مطلع کر دوں کہ انہوں نے پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے قواعد کے تحت، رول نمبر ۵۰ کے مطابق آپ کو سیٹ نمبر ۱۲۰ عطا کی ہے۔

نقشے کی ایک نقل اِس خط کے ہمراہ ملفوف کر رہا ہوں۔

مخلص

حکیم احمد شجاع"

جواب میں ۱۸ انومبر ۱۹۴۰ء کو ذیل کا خط ملک صاحب نے حکیم احمد شجاع کو لکھا:

"ڈیر حکیم صاحب. آپ کے ڈی او نمبر ۱۰۷۷ مورخہ ۱۵ انومبر ۱۹۴۰ء کا شکریہ، جس میں آپ نے اسمبلی کی سیٹوں کا نقشہ ملفوف کیا ہے۔ اور مجھے مطلع کیا ہے آنریبل سپیکر نے پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے قواعد کے تحت رول نمبر ۵۰ کے مطابق ۱۲۰ نمبر کی سیٹ مجھے عطا کی ہے۔ مہربانی فرما کر آنریبل سپیکر کی خدمت میں میرا اظہار تشکر پہنچا دیجئے گا۔ جو سیٹ مجھے دی گئی ہے وہ پچھلی بنچوں پر بلاک نمبر ۴ میں ہے۔

آپ کو یاد ہو گا۔ جب ۹ نومبر کی رات کو نواب مظفر خاں صاحب کے مکان پر اُن کی صاحب زادی کی شادی کی تقریب میں آپ سے ملاقات ہوئی تھی تو آپ نے مجھے بتایا تھا کہ اسمبلی میں کوئی سرکاری طور پر منظور شدہ مسلم لیگ پارٹی نہیں ہے۔ اور میں چونکہ ایک ایسے ممبر کی حیثیت سے ایوان میں بیٹھنا چاہتا ہوں جس کا کانگریس پارٹی اور انڈی پنڈنٹ پارٹی سے کوئی تعلق نہیں (یہی دو منظور شدہ پارٹیاں ہیں) اس لئے آنریبل سپیکر مجھے قاعدہ نمبر ۵۰ کی رو سے صرف پچھلی بنچوں پر جگہ دے سکتے ہیں۔ آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اس ضمن میں باضابطہ سرکاری طور پر جواب دینا مناسب ہے۔

سر دست آپ یہ اطلاع مجھے زبانی دے رہے ہیں۔ میں نے اس وقت آپ سے عرض کیا تھا کہ مجھے صرف ایوان میں سیٹ درکار ہے۔ پچھلی بنچوں پر ہو یا اگلی بنچوں پر اس سے قطعاً فرق نہیں پڑتا۔ میں اپنی موجودہ سیٹ پر،

جو اگلی بنچوں پر ہے، پچھلی بنچوں کی سیٹ کو ترجیح دوں گا۔

آخر میں میری گزارش یہ ہے کہ آنریبل سپیکر اپنی ذمہ داری پر مجھے اطلاع دیں کہ کیا یہ صحیح ہے کہ اسمبلی کے ایوان میں کوئی باضابطہ سرکاری طور پر منظور شدہ مسلم لیگ پارٹی نہیں ہے اور کیا اب تک انہیں پنجاب اسمبلی میں ایسی پارٹی کے قیام کے کوئی اطلاع نہیں ملی۔

اگر ایوان میں کوئی باضابطہ سرکاری طور پر منظور شدہ مسلم لیگ پارٹی نہیں تو جیسا میں نے اپنے پہلے خط میں عرض کیا تھا، میں ایک غیر متعلق ممبر کی حیثیت سے علیحدہ بیٹھنا پسند کروں گا۔ ہر چند کہ اس غرض کے لئے مجھے پچھلی بنچ ہی پر کیوں نہ جگہ دی جائے۔

آپ کا مخلص

ملک برکت علی"

۶ جنوری ۱۹۴۱ء کو ملک صاحب نے پنجاب اسمبلی کے سپیکر چودھری سر شہاب الدین کو ذیل کا خط لکھا۔

"جناب والا۔ اِس عریضے کے ہمراہ اپنے اُس خط کی نقل ملفوف کر رہا ہوں جو میں نے آپ کے ڈپٹی سیکرٹری صاحب کو اُن کے ڈی او نمبر ۱۷۰۷ مورخہ ۱۵ نومبر ۱۹۴۰ء کے جواب میں بھیجا تھا۔ آپ کے ڈپٹی سیکرٹری صاحب سے میں نے عرض کیا تھا کہ میرا خط آپ کے ملاحظہ کے لئے پیش کر دیا جائے۔ امید ہے انہوں نے ایسا ہی کیا ہوگا۔ ابھی تک اُن کا جواب موصول نہیں ہوا لہٰذا اُس خط کی جو میں نے اُن کو لکھا تھا ایک نقل آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ گزارش ہے کہ ازراہ کرم مجھے مطلع فرمایئے گا کہ کیا پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی میں کوئی باضابطہ سرکاری طور پر منظور شدہ مسلم لیگ پارٹی موجود ہے۔ یہ میں اِس لئے پوچھ رہا ہوں کہ مجھے حکیم احمد شجاع صاحب ڈپٹی سیکرٹری نے بتایا تھا کہ پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی میں کوئی باضابطہ سرکاری طور پر منظور شدہ مُسلم لیگ پارٹی موجود نہیں۔ آپ کے خط سے اِس کی تصدیق ہو جانی چاہئے۔ امید ہے آپ مہربانی فرما کر اس استفسار کا جواب اپنی اولین فرصت میں عطا کریں گے۔

مخلص

ملک برکت علی،،

آنریبل سپیکر کی طرف سے حکیم احمد شجاع نے ۱۶ جنوری ۱۹۴۰ء کو ذیل کا جواب ملک صاحب کو بھیجا۔

"ڈیئر ملک صاحب۔ مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ آپ کے اُس خط کی رسید آپ کو بھیجوں جو آپ نے ۶ جنوری ۱۹۴۱ء کو آنریبل سپیکر کی خدمت میں ارسال کیا تھا۔ اور آپ کو مطلع کروں کہ ضابطے کے مطابق یہ ضروری نہیں کہ پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کی سیاسی پارٹیوں کو سرکاری طور پر منظور کیا جائے۔ آپ نے یہ بھی دریافت فرمایا ہے کہ کم سے کم کتنے ممبر ہوں تو ایک پارٹی کو اسمبلی کے ایوان میں علیحدہ بلاک مل سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں گزارش ہے کہ ہمارا طریق کار یہ ہے کہ بارہ ممبروں سے کم کسی کو علیحدہ بلاک کی یہ رعایت نہیں دی جا سکتی۔

مخلص

حکیم احمد شجاع"

۱۷۔ جنوری ۱۹۴۱ء کو ملک صاحب نے ذیل کا جواب دیا۔

"ڈیئر حکیم صاحب۔ آپ کا ڈی او نمبر ۱۰۰ مورخہ ۱۶۔ جنوری ۱۹۴۱ء ملا۔ میں نے جس استفسار کا جواب آپ سے طلب کیا تھا افسوس وہ بدستور جواب طلب ہے۔

آپ کو یاد ہو گا میں نے اپنے خط محررہ ۱۸ - نومبر ۱۹۴۰ء میں لکھا تھا کہ مطلع فرمایئے کہ مجھ کو اسمبلی کے ایوان میں پچھلی بنچوں پر سیٹ دینے سے پہلے آنریبل سپیکر نے قائد ایوان سے تو یقیناً مشورہ کیا ہو گا۔ کیا اس سلسلے میں انہوں نے دیگر پارٹیوں کے لیڈروں سے بھی مشورہ کیا تھا یا نہیں۔ کیونکہ پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے ضابطے کے رول نمبر ۵۰ کے مطابق اِس قسم کا مشورہ کرنا ضروری ہے۔ اِس کا جواب اَب تک مجھے نہیں ملا۔ حالانکہ مَیں نے اپنے دونوں خطوں میں جو ۲۔ دسمبر ۱۹۴۰ء اور ۶۔ جنوری ۱۹۴۱ء کو لکھے تھے۔ اِس سوال کا جواب مانگا تھا۔ گزارش ہے کہ اِس استفسار کا جواب مہربانی فرما کر جلد عنایت کیجئے۔

رہا دوسرا سوال کہ کیا اسمبلی کے ایوان میں باضابطہ سرکاری طور پر منظور

شُدہ مسلم لیگ پارٹی ہے یا نہیں۔ اور کیا آنریبل سپیکر کو اب تک یہ اطلاع ملی ہے کہ ایوان میں اس نام کی پارٹی ہے؟ جواب میں آپ لکھتے ہیں کہ ضابطے کے مطابق یہ ضروری نہیں کہ پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کی سیاسی پارٹیوں کو سرکاری طور پر منظور کیا جائے۔

معاف فرمائیے۔ آپ کے اِس بیان سے قطعی صورت حال واضح نہیں ہوتی۔ جب مَیں نے "باضابطہ سرکاری طور پر منظور شدہ پارٹی" کی اصطلاح استعمال کی تھی تو دراصل یہ وہی اصطلاح ہے جو آپ نے ۹۔ نومبر ۱۹۴۰ء کو اُس وقت استعمال کی تھی جب آپ مجھ سے نواب مظفر خاں صاحب کے مکان پر ملے تھے اور آپ نے کہا تھا کہ جس مسلم لیگ پارٹی کے بنچوں پر میں اپنے لئے سیٹ مانگتا ہوں اُس کا باضابطہ سرکاری طور پر منظور شدہ وجود نہیں ہے، مجھے صرف ایک غیر متعلق ممبر کی حیثیت سے سیٹ دی جا سکتی ہے۔

رول نمبر ۵۰ میں جس کے تحت آنریبل سپیکر نے مجھے سیٹ عطا کی ہے واضح طور پر "پارٹیوں کے لیڈر" کی اصطلاح موجود ہے۔ آپ اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ جب تک کسی گروپ کے بارہ ممبر نہ ہوں اُسے اسمبلی میں علیحدہ بلاک نہیں دیا جا سکتا۔ اِس سے صاف ظاہر ہے کہ جہاں تک بلاک معین کرنے کا تعلق ہے، اسمبلی کے قواعد اسمبلی کے ایوان میں مختلف پارٹیوں کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں۔ بالکل اِنہی معنوں میں مَیں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آیا اسمبلی کے ایوان میں مسلم لیگ پارٹی کے نام کی کوئی پارٹی موجود ہے اور کیا اُسے علیحدہ بلاک دیا گیا ہے۔

اگر مسلم لیگ پارٹی کے لئے کوئی علیحدہ بلاک مخصوص نہیں کیا گیا تو ظاہر ہے کہ کم سے کم بارہ ممبروں پر مشتمل اِس نام کی کوئی پارٹی ظہور میں نہیں آئی۔ آنریبل سپیکر صرف اُسی صورت میں اُن پارٹیوں کے ممبروں کو ایوان میں سیٹیں عطا کر سکتے ہیں جب انہیں پارٹی کے وجود سے مطلع کر کے یہ مطالبہ کیا جائے کہ پارٹی کے لئے علیحدہ بلاک متعین کیا جائے۔ مَیں فی الحال اِس بحث میں نہیں پڑتا کہ "باضابطہ سرکاری طور پر منظور شدہ پارٹی" کی اصطلاح غلط ہے یا صحیح۔ میں تو صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی موجود ہے جس کے لئے سیٹوں کا علیحدہ

بلاک مخصوص کیا جا چکا ہے۔ بالکل اُنہی معنوں میں جن میں لیجسلیٹو اسمبلی میں کانگرس پارٹی یا ہندو انڈی پنڈنٹ پارٹی موجود ہیں۔ اور اُن کے پاس اِن سیٹوں کے علیحدہ بلاک ہیں۔ میری درخواست ہے کہ میرا یہ خط آنریبل سپیکر کی خدمت میں پیش کر دیا جائے تاکہ دریافت طلب امور کا جواب مرحمت فرمائیں۔

مخلص

ملک برکت علی"

اِس مراسلت کا آخری خط حکیم احمد شجاع صاحب نے ۲۴- جنوری ۱۹۴۱ء کو ملک صاحب کو لکھا:-

"ڈیر ملک صاحب. آپ کا مکتوب محررہ ۱۷- جنوری ملا۔ جہاں تک آپ کے اِستفسار کا تعلق ہے کہ کیا مسلم لیگ پارٹی کے نام کی کوئی پارٹی لیجسلیٹو اسمبلی میں موجود ہے جس کے لئے سیٹوں کا علیحدہ بلاک مخصوص کیا جا چکا ہے۔ میری گزارش ہے کہ اِس وقت اسمبلی کے ایوان میں صرف ذیل کی پارٹیوں کو اُن کے علیحدہ علیحدہ بلاک دیئے جا چکے ہیں:

۱) وزارتی پارٹی

۲) کانگریس پارٹی

۳) انڈی پنڈنٹ پارٹی

آنریبل سپیکر کو کچھ معلوم نہیں کہ مندرجہ بالا بلاکوں میں ممبروں کے کون کون سے اندرونی گروپ ہیں اور اِن گروپوں کے سیاسی معتقدات کیا ہیں.....[1]

مخلص

حکیم احمد شجاع

ڈپٹی سیکرٹری"

اِس خط و کتابت سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ سر سکندر حیات خان کی زندگی میں پنجاب اسمبلی کے اندر کوئی مسلم لیگ پارٹی نہیں بنائی گئی تھی۔ میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ نے جنہیں قدرت کی غلط بخشیوں نے یکایک جون ۱۹۴۴ء میں بغیر کسی قومی خدمت اور قومی استحقاق کے، پنجاب پروانشل مسلم لیگ کا سیکرٹری بنا دیا تھا. اس منصب جلیلہ پر فائز ہوتے ہی

---

[1] انگریزی کی اصل خط و کتابت اس کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ درج کی گئی ہے۔

ایک پمفلٹ شائع کیا تھا۔ جس کا عنوان تھا: "پنجاب کی کہانی قائداعظم کی زبانی۔"
قطع نظر اِس سے کہ اِس پمفلٹ کی زبان و بیان کی ژولیدگی۔ طرز تحریر کی آشفتگی اور اظہار خیال کی پریشانی بے مثال ہے۔ میاں صاحب کے چند ارشادات ملاحظہ فرمایئے:۔

۱۔ دسمبر ۱۹۴۲ء میں سر سکندر کا انتقال ہو گیا تو ۱۹۴۳ء میں سوال اٹھا کہ کیا پنجاب اسمبلی میں کوئی مُسلم لیگ پارٹی موجود ہے؟

۲۔ قائداعظم نے ۴۔ اپریل ۱۹۴۴ء کو لاہور سے رُخصت ہوتے وقت ایک بیان دیا کہ میرے پاس حال ہی میں اطلاعات پہنچی ہیں کہ پنجاب اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی منظم نہیں اور نہ درست طور پر کام کر رہی ہے۔

۳۔ آیا مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے وہ رکن جو یونینسٹ پارٹی کے مسلک اور پروگرام کے پابند ہیں، مُسلم لیگ پارٹی کے رکن رہ سکتے ہیں یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی وفاداری تقسیم نہیں ہو سکتی۔ ایک شخص ایک ہی وقت میں دو سیاسی پارٹیوں کا تابع نہیں ہو سکتا۔

۴۔ پارٹی کے نام یا لیبل کا یعنی یونینسٹ پارٹی کے نام کا سوال اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ اِس نام سے لوگوں کو گمراہ کیا جا سکتا ہے۔ اور امر واقع یہ ہے کہ انہیں گمراہ کیا گیا ہے۔ اور اِسی نام کی وجہ سے یہ حق جتایا جاتا ہے کہ مسلم لیگ پارٹی کے ممبر اولاً یونینسٹ ہیں اور یونینسٹ پارٹی کی پالیسی اور پروگرام کے پابند ہیں۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ مسلم لیگ پارٹی کے ہر رکن کی خودداری اور اُس کا ضمیر متقاضی ہے کہ وہ کُھلے لفظوں میں کہہ دے کہ میں اِس پارٹی کا پیرو ہوں یا اُس کا؟

میاں ممتاز دولتانہ صاحب ۱۹۴۰ء میں بیرسٹر بن کر انگلستان سے واپس وطن تشریف لائے تھے۔ مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں قرار داد پاکستان منظور ہوئی لیکن میاں صاحب عالی مقام نے الممتاز کے مرمریں ایوانوں سے باہر قدم رکھنا گوارا نہ کیا۔ ۱۹۴۱ء کا پورا سال گزر گیا۔ دو مرتبہ مُسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے زیر اہتمام پاکستان کانفرنس ہوئی۔ پہلی بار مارچ کے مہینے میں لاہور میں اور دوسری بار جولائی ۱۹۴۱ء میں لائل پُور میں۔ لیکن میاں صاحب نے الممتاز کے مرمریں ایوانوں سے باہر قدم رکھنا گوارا نہ کیا۔ ۱۹۴۲ء کا پورا سال گزر گیا۔ ہندوستان بھر میں پاکستان کا نعرہ گونجا اور ہر شخص نے بحدِ استعداد قومی تحریک میں حصہ لینا شروع کیا۔ لیکن میاں صاحب عالی مقام نے الممتاز کے مرمریں ایوانوں سے باہر قدم رکھنا گوارا نہ کیا۔ یہی کیفیت ۱۹۴۳ء میں

رہی۔ لیکن میاں صاحب بدستور الممتاز کے مرمریں ایوانوں میں محوِ استراحت رہے۔ یکایک مئی ۱۹۴۴ء میں میاں ممتاز دولتانہ صاحب کو گویا آسمان سے ندائے غیب سنائی دی کہ یہ کیا اندھیر ہے کہ پنجاب میں اب تک مسلم لیگ پارٹی نہیں بنی اور یونینسٹ پارٹی مسلمانوں کے مفاد کو تباہ کر رہی ہے۔ لہٰذا اُنہیں مجاہد ملت بن کر الممتاز کے مرمریں ایوانوں سے نکلنا اور میدان جنگ میں کودنا چاہئے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب تک سر سکندر حیات خاں زندہ تھے۔ میاں ممتاز دولتانہ۔ نواب ممدوٹ۔ راجہ غضنفر علی خاں۔ میاں مشتاق احمد گورمانی۔ سید امجد علی وغیرہ مسلم لیگ اور پاکستان کے الفاظ اپنی زبانوں پر لاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ اور سر سکندر کی ایک خشمگیں نگاہ کے سامنے بید مجنوں کی طرح لرزتے تھے۔ سر سکندر فوت ہو گئے اور ان کی جگہ ملک خضر حیات ٹوانہ وزیراعظم بنے تو ان لوگوں کو بھی ہوش آیا کہ پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی موجود نہیں۔

ملک خضر حیات کا ہماری قومی جدوجہد پر کوئی اور احسان ہو یا نہ ہو لیکن بالواسطہ یہ بہت بڑا احسان ہے کہ اُن کے وزیراعظم بنتے ہی بڑے بڑے گنہگار "یونینسٹ" مشرف بہ مسلم لیگ ہو گئے۔ کیوں ہو گئے؟ اس کا جواب سیاسیات کے کسی ذہین طالب علم کو تلاش کرنا چاہئے۔

میاں ممتاز دولتانہ صاحب نے پچھلے دنوں پشاور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ مسلم لیگ میری ماں ہے۔ حضور والا! یہ ماں تو ۱۹۳۶ء سے پنجاب میں موجود تھی اور اپنے بچوں کو تلاش کر رہی تھی۔ کیا اِس ماں نے آپ کو نہ پہچانا یا آپ اُسے نہ پہچان سکے؟ سر سکندر کے انتقال کے بعد جو کچھ پنجاب میں ہوا وہ مسلم لیگ کی محبت کی وجہ سے نہیں ہوا تھا بلکہ خضر حیات کو وزارت عظمیٰ سے ہٹانے کے لئے ہوا تھا ملک برکت علی نے جولائی ۱۹۴۳ء میں لکھا تھا۔

"The Unionist Party is itself experiencing inner tension. Major Shaukat Hayat whose head has been a bit turned by his success in the by election and who fought the election on the League ticket without which he had not the least chance of success, but who is now pretending that he owed his success to his family influence, has formed a party of his own which is engaged in vigorous propaganda against the Premier. A clash will come some day resulting in the burial of Sir some Once's ghost".

ملک صاحب نے جس تصادم کی طرف اشارہ کیا ہے وہ شاہ پور کے ٹوانوں اور اٹک کے کھٹڑوں کی پرانی قبائلی دشمنی کی شکل میں نمودار ہوا۔ جس نے پنجاب کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اور جسے آگے چل کر مفاد پرست لوگوں نے مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کی جنگ کا نام دے کر گویا کفر و اسلام کی جنگ بنا دیا تھا۔ کھٹڑ کہتے تھے کہ پنجاب کی وزارتِ عظمٰی پر ہمارا موروثی حق ہے۔ یہ ٹوانے گویا غاصب ہیں۔ ادھر ٹوانوں کا دعویٰ تھا کہ پنجاب کے مالک تو ہم ہیں کیا — کھٹڑوں کی ہمارے سامنے کیا حیثیت ہے۔ پنجاب کی بدقسمتی ہے کہ اس صوبے کی لیڈر شپ ہمیشہ اسی قبائلی عصبیت کا شکار ہوئی۔ اور عوام کو روشن خیالی، توانائی اور صحیح فکر کی نعمت بخشنے والی قیادت یہاں پیدا نہ ہو سکی۔

ملک برکت علی اور پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے سپیکر کی باہمی خط و کتابت جو اوپر درج کی جا چکی ہے اُس کی ایک نقل ملک صاحب نے قائداعظم کی خدمت میں بمبئی بھیج دی اور ساتھ ذیل کا خط لکھا:

"لاہور

۲۵۔ جنوری ۱۹۴۱ء

ڈیئر مسٹر جناح۔ میں اِس عریضے کے ہمراہ اپنی اُس خط و کتابت کی نقل آپ کو بھیج رہا ہوں جو پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے سپیکر کے ساتھ اِس مسئلے پر ہوئی تھی کہ اسمبلی کے ایوان میں مجھے علیحدہ سیٹ دی جائے۔ اِن خطوط کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہو جائے گا کہ پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی میں کوئی مُسلم لیگ پارٹی نہیں ہے۔ اسمبلی میں اِس وقت صرف تین پارٹیاں ہیں۔ ایک یونینسٹ پارٹی دوسری انڈی پنڈنٹ ہندو پارٹی اور تیسری کانگریس پارٹی۔ یہ واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سر سکندر کس ہوشیاری سے بیرون پنجاب کے لوگوں کو فریب دیتے رہے ہیں کہ پنجاب اسمبلی کے ایوان میں مُسلم لیگ پارٹی موجود ہے۔ میں آپ کو اطلاع دے چکا ہوں کہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کونسل نے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے لئے جن پنجابی ممبروں کی فہرست آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر دفتر کو بھیجی ہے وہ فہرست سر سکندر نے خود تیار کی تھی۔ اور ۱۰۔ جنوری ۱۹۴۰ء کو صوبائی لیگ کونسل نے جو سر سکندر کی ساختہ و پرداختہ جماعت ہے۔ اِسے منظور کیا تھا۔ سر سکندر حیات خاں نے اس فہرست میں میرا نام عمداً شامل نہیں

کیا۔ صرف میں ہی نہیں پنجاب کے ہر مخلص مسلم لیگی کا نام اِس فہرست سے خارج کر دیا گیا ہے۔ مثلاً مسٹر غلام رسول خاں، میاں عبدالعزیز، خلیفہ شجاع الدین، پیر تاج الدین اور مسٹر عاشق حسین بٹالوی کے نام بھی درج نہیں کیے گئے۔ یہ فہرست بیشتر آنریری مجسٹریٹوں، سرکاری ٹھیکیداروں اور سَب رجسٹراروں پر مشتمل ہے۔ جو سر سکندر کے احکام کی بلاچوں وچرا تعمیل کرتے ہیں۔ مَیں یہ گزارش کیے بغیر رہ نہیں سکتا کہ پنجاب مسلم لیگ پر جس طرح یونینسٹ پارٹی نے قبضہ کر لیا ہے۔ اُس سے مسلم لیگ کے مفاد کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ سر سکندر کا مدعا غالباً یہ ہے کہ اِس طرح وہ میری زبان بند کر سکیں گے۔ لیکن یہ حقیقت وہ فراموش کر رہے ہیں کہ میری وفاداری ان کی ذات سے نہیں بلکہ مسلم لیگ سے ہے۔

کل کا ذکر ہے، سر سکندر کے ایک حاشیہ بردار نے مجھ کو بتایا کہ میرا نام فہرست سے خارج کر دینے کا مقصد یہ ہے کہ اس طرح آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر نہیں بن سکوں گا۔ اور آپ چاہیں بھی تو مجھے ورکنگ کمیٹی میں شامل نہیں کر سکیں گے۔ پنجاب کی صورت حال سے آپ کو باخبر کرنے میں مَیں نے کوتاہی نہیں کی۔ آخری فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے تاہم مَیں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ایسی بوگس لیگ کا الحاق جو سراسر جی حضوریوں پر مشتمل ہو، خطرناک غلطی تھی۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ سر سکندر کو مسلم لیگ کا مالک اور کرتا دھرتا بدستور رہنا چاہیئے تو پھر سمجھ لیجئے کہ لیگ کا گویا خاتمہ ہے۔ لیکن اِس سلسلہ میں میں بصد ادب یہ عرض کروں گا، کہ آپ بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کر رہے ہیں۔

مَیں نے ابھی ابھی آل انڈیا مسلم لیگ کے آئین اور قواعد و ضوابط کے رول نمبر ۱۴ کا مطالعہ کیا ہے جس میں لکھا ہے کہ ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کا انتخاب صدر کو آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کے ممبروں میں سے کرنا ہو گا۔ ظاہر ہے سر سکندر کو اپنے مقصد میں کامیابی ہو گی یعنی اس طرح وہ مجھے آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کی رکنیت سے محروم رکھ سکیں گے۔ اس کے ازالے کی صرف یہی صورت ہے کہ آپ اس نام نہاد پنجاب

پروانشل مسلم لیگ کی مرسلہ فہرست قبول کرنے سے انکار کر دیں یا یوں کیجئے کہ جب آل انڈیا مسلم لیگ کونسل میں کوئی ممبر شپ خالی ہو تو مجھے اُس جگہ نامزد کر دیں۔

یہ بھی عرض کر دوں کہ سر سکندر نے جو فہرست آل انڈیا مسلم لیگ کے دفتر کو بھیجی ہے، اُس میں بیشتر نام اُن لوگوں کے ہیں جنہوں نے وارڈ کمیٹیوں میں شریک ہو کر آل انڈیا مسلم لیگ کے احکام کی خلاف ورزی کی ہے۔ پنجاب پراونشل مسلم لیگ نے اُن نافرمان ممبروں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ وجہ ظاہر ہے۔ اِن لوگوں نے جو کچھ کیا سر سکندر کے احکام کی تعمیل میں کیا۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کی تھی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے جن ممبروں نے لیگ کے احکام کی خلاف ورزی کر کے وارڈ کمیٹیوں میں شرکت کی ہے اُن سے جواب طلبی کی جائے۔ لیکن پنجاب پراونشل مسلم لیگ نے ایسے نافرمان ممبروں سے جواب طلب کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس کے برعکس جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے وہ ملاحظہ فرمایئے۔ جب نواب زادہ لیاقت علی خاں کا خط آیا کہ حکم عدولی کرنے والے ممبروں سے جواب طلب کیا جائے تو سر سکندر کے پارلیمنٹری پرائیوٹ سیکرٹری سید امجد علی نے ان تمام نافرمان ممبروں کو لکھا کہ فرداً فرداً پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے سیکرٹری کو لکھ دو کہ اِس مسئلے کے متعلق پراونشل مسلم لیگ کے صدر سے دریافت کیا جائے۔ چنانچہ کونسل آل انڈیا مسلم لیگ کے پنجابی ممبروں نے فرداً فرداً پراونشل مسلم لیگ کے سیکرٹری کو لکھ دیا کہ صدر سے دریافت کیجئے۔

پنجاب مسلم لیگ کے صدر نواب شاہنواز خاں ممدوٹ تو گویا سر سکندر کے غلام ہیں۔ ہرچند کہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے نافرمان ممبروں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نواب صاحب نے خود ہی اُن کی طرف سے ایک جواب گھڑ کے بھیج دیا ہے۔ یہ عجیب مذاق ہے۔ نواب صاحب نے ابھی تک آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر دفتر کو نافرمان ممبروں کے نام بھی نہیں بتائے۔ لطف یہ ہے کہ نواب صاحب موصوف نے اخباروں کو بیان دیا ہے کہ

یونینسٹ پارٹی بہت اچھا کام کر رہی ہے۔ لہذا پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ایک الحاق شدہ صوبائی مسلم لیگ کے صدر کی طرف سے اِس قسم کا بیان بھی ایک مذاق سے کم نہیں۔

گزارش ہے کہ آپ مہربانی فرما کر نواب زادہ لیاقت علی خاں سے کہئے کہ وہ پنجاب کے نافرمان ممبروں سے براہ راست جواب طلب فرمائیں۔ محض نواب شاہنواز خاں یا ان کے آرگنائزنگ سیکرٹری کے خط کو ان نافرمان ممبروں کا جواب قرار دینا صحیح نہیں۔ نواب ممدوٹ نے توان ممبروں کے ناموں سے بھی نواب زادہ لیاقت علی خاں کو مطلع نہیں کیا تھا۔ نواب زادہ صاحب کو کسی اور ذریعہ سے یہ نام معلوم ہوئے ہیں۔

یہ بھی عرض کر دوں کہ پنجاب کے جن ممبروں کے نام آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کی رکنیت کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ اُن میں سے بیشتر کسی ابتدائی لیگ کے ممبر بھی نہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ پنجاب کے موجودہ حالات پر خصوصیت سے توجہ فرمائیں گے۔ زیادہ نیاز

آپ کا مخلص

ملک برکت علی" [۱]

سر سکندر حیات خاں کا انتقال ۲۶۔ دسمبر ۱۹۴۲ء کو ہوا تھا۔ اُن کی زندگی میں پنجاب اسمبلی کے اندر کوئی مسلم لیگ پارٹی نہیں بنائی گئی تھی ۔ اور سکندر جناح پیکٹ کی کار فرمائی بدستور جاری تھی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر دفتر نے اِس انتظام کو بخوشی منظور کر لیا تھا۔ سر سکندر فوت ہو گئے تو ملک خضر حیات ٹوانہ کو وزارت عظمیٰ ملی۔ خضر حیات کے وزیر اعظم بنتے ہی یونینسٹ پارٹی میں پھوٹ پڑی۔ اور اُن کو وزارت عظمیٰ سے علیحدہ کرنے کی سازشیں ہونے لگیں۔ یونینسٹ پارٹی کے اس باغی عنصر کو اس وقت یاد آیا کہ سکندر جناح پیکٹ نے پنجاب میں مسلم لیگ کو یونینسٹ پارٹی کی ایک شاخ بنا کر رکھ دیا ہے۔ اور پنجاب اسمبلی میں اب تک مسلم لیگ پارلیمنٹری پارٹی نہیں بنائی گئی۔ حالانکہ غور کیا جاتا تو یونینسٹ پارٹی کا یہ باغی عنصر اوّل سے آخر تک اِن دونوں "قومی جرائم" کا ذمہ دار تھا۔ سر سکندر حیات خاں خوش نصیب تھے کہ اپنی زور دار

---

۱۔ انگریزی کا اصل خط اس کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ درج ہے۔

شخصیت کے باعث یونینسٹ پارٹی کو قابو میں رکھ سکے۔ اُن کی لغزشوں اور کوتاہیوں کا خمیازہ خضر حیات کو بھگتنا پڑا۔ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

اگر آپ اِن واقعات کی مزید تحریف اور ان حقائق کی مزید تنسیخ کی اور مثالیں دیکھنا چاہتے ہیں تو سید نور احمد صاحب مرحوم کی کتاب "مارشل لاء سے مارشل لاءؔ تک ملاحظہ فرمائیے جس میں صفحہ نمبر ۲۲۲ پر موصوف رقمطراز ہیں:۔

"فی الحقیقت ۱۹۳۷ء کے بعد ۱۹۴۰ء تک مُسلم لیگ کی پالیسی کا کوئی ایسا خاص پہلو نہ تھا جس کی خاطر پنجاب اسمبلی کی مُسلم لیگ پارٹی اپنی علیحدہ پارلیمنٹری حیثیت پر اصرار کرنا ضروری سمجھتی۔ قرارداد لاہور کے بعد حالات میں ایک اصولی تبدیلی آئی جس کے مضمرات مطالبۂ پاکستان کی بڑھتی ہوئی قوت اور شدت کے ساتھ ساتھ نمایاں ہوتے رہے۔ اب مسلم لیگ کا اصل مقصد صوبائی وزارتیں چلانا نہ تھا بلکہ پاکستان حاصل کرنا تھا۔ اور مطالبۂ پاکستان کے لئے سیاسی جنگ اِس بات کا تقاضا کرتی تھی کہ صوبائی اسمبلیوں کی مسلم لیگ پارٹیاں بھی مطالبۂ پاکستان کی تائید میں مثبت کردار ادا کریں۔ اور جو وزارتیں مُسلم لیگ پارٹیوں کی حمایت اور پشت پناہی پر بھروسہ کرتی تھیں وہ بھی مُسلم لیگ کی مرکزی قیادت کے ساتھ اپنے آپ کو عملاً اور زیادہ مضبوطی کے ساتھ وابستہ کریں"۔

گزارش یہ ہے کہ قرار دادِ لاہور کی منظوری کے بعد کم و بیش تین سال سر سکندر حیات خاں زندہ رہے۔ اس وقت کیوں کسی کو خیال نہ آیا کہ مسلم لیگ پارٹی اپنی علیحدہ پارلیمنٹری حیثیت پر اصرار کرے؟ اُس تین سال کے عرصے میں کیوں کسی کو خیال نہ آیا۔ کہ مطالبۂ پاکستان کے لئے سیاسی جنگ اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ صوبائی اسمبلیوں کی مسلم لیگ پارٹیاں بھی مطالبۂ پاکستان کی تائید میں مثبت کردار ادا کریں؟ کیوں یہ تمام صداقتیں اور حقیقتیں سر سکندر کے انتقال کے بعد یکایک منکشف ہوئیں؟

آگے چل کر سید نور احمد صاحب لکھتے ہیں:۔

"۱۹۴۳ء میں نواب افتخار حسین ممدوٹ کے گرد اسمبلی کے مسلمان ممبروں کا ایک مختصر گروہ جمع ہو گیا جو مختلف طریقوں سے اس بات کے خلاف احتجاج کرنے لگا کہ اسمبلی میں مُسلم لیگ پارٹی ایک زندہ اور فعال

جماعت کی حیثیت سے کام نہیں کرتی۔ وزیراعظم ہر تبدیلی سے گریز کرتے تھے۔ لہذا اُن کے اور اُس گروپ کے درمیان رسّہ کشی شروع ہو گئی۔ اور قائداعظم کو شکایتیں پہنچنے لگیں"۔

سیّد صاحب فوت ہو چکے ہیں۔ اور ہمیں بھی آخر ایک روز اس دنیا سے رخصت ہونا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ قائداعظم کو یہ شکائتیں ۱۹۴۳ء میں نہیں پہنچنے لگی تھیں۔ بلکہ سکندر جناح پیکٹ کے بعد ہی پہنچنی شروع ہو گئی تھیں۔ اور یہ شکایتیں بھیجنے والے تھے کون؟ علامہ اقبال۔ ملک برکت علی۔ غلام رسول خاں۔ راقم التحریر۔

نواب افتخار حسین ممدوٹ کے گرد ۱۹۴۳ء میں جو مختصر سا گروہ جمع ہو گیا تھا۔ آپ جانتے ہیں اُس میں کون لوگ شامل تھے؟ میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ۔ راجہ غضنفر علی خاں۔ سردار شوکت حیات۔ شیخ کرامت علی۔ میر مقبول محمود وغیرہ۔ مقصد صرف یہ تھا کہ خضر حیات ٹوانہ کو گرایا جائے۔ اور اِس کام کے لئے سب سے مؤثر اور آسان حربہ اُس گروہ کو یہ نظر آیا کہ شور مچانا شروع کرو کہ ہائے یہ کیا ظلم ہے۔ کہ اب تک پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی میں مُسلم لیگ پارلیمنٹری پارٹی نہیں بنائی گئی۔

چوتھا باب

# جنگی سرگرمیاں

آل انڈیا مُسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے ۱۷۔ جون ۱۹۴۰ء کو بمبئی کے اِجلاس میں دو اہم ریزولیوشن پاس کئے تھے۔ ایک یہ کہ حکومت نے جنگی سرگرمیاں تیز کرنے کے لئے مختلف صوبوں میں وآر کمیٹیاں اور وآر بورڈ بنائے ہیں۔ اُن میں مسلم لیگ کے ممبر شامل نہیں ہو سکتے۔ دوسرا ریزولیوشن یہ تھا کہ ہر پروانشل مُسلم لیگ اپنے صوبے میں رضاکاروں کے جیش تیار کرے جنہیں مسلم لیگ نیشنل گارڈ کا نام دیا جائے گا۔ رضاکاروں کا انتخاب، ترتیب اور کارکردگی ہر صُوبائی مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے ذمے ہوگی۔ جو بالآخر اِس ضمن میں آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے سامنے جواب دہ ہو گی۔ رضاکاروں کو بھرتی ہوتے وقت ذیل کا حلف اٹھانا پڑے گا۔

> "اللہ تعالیٰ، قرآن مجید اور اپنے ایمان کے روبرو میں حلف اٹھاتا ہوں کہ مَیں اپنے آپ کو مسلم لیگ نیشنل گارڈ کی تنظیم کے حوالے کرتا ہوں۔ میں ہمیشہ دل و جان سے اپنے افسروں کی اطاعت کروں گا۔ اور اِس تنظیم اور اِس کے اغراض و مقاصد کا وفادار رہوں گا۔ خدا میری مدد کرے"۔

ورکنگ کمیٹی کے جس جلسے میں یہ قرار دادیں منظور کی گئی تھیں، سر سکندر حیات خاں موجود تھے۔ جب وہ جلسے سے فارغ ہو کر لاہور تشریف لائے تو آتے ہی اُنہوں نے پنجاب وار بورڈ کے افتتاحی اجلاس میں شرکت فرمائی جو گورنر نے قائم کیا تھا۔ اِس بورڈ کے تحت ہر ضلع میں وار کمیٹیاں قائم کرنے کی تجویز بھی منظور کی گئی۔ پنجاب وار بورڈ کے اِس افتتاحی جلسے میں نواب شاہنواز خاں ممدوٹ صدر صوبہ مسلم لیگ کے علاوہ راجہ غضنفر علی خاں۔ میاں مشتاق احمد گورمانی۔ سیّد امجد علی۔ میاں امیرالدین وغیرہ بھی شریک تھے۔

اخبار نویسوں نے سر سکندر سے پوچھا کہ بمبئی میں تو آپ یہ فیصلہ کر آئے ہیں کہ وآر بورڈ میں

مسلم لیگ کے ممبر شامل نہیں ہو سکتے۔ اور یہاں آتے ہی آپ نے وار بورڈ قائم کر دیا ہے۔ سر سکندر نے جواب دیا کہ پنجاب اور بنگال کے مسلم لیگی وزراء کو مسٹر جناح نے اس ریزولیوشن کی پابندی سے مستثنٰی کر دیا ہے۔ جونہی یہ خبر اخباروں میں چھپی مسٹر جناح نے بمبئی سے ذیل کا تردیدی بیان دیا:۔

"سر سکندر حیات خاں نے ایسوسی ایٹڈ پریس کو ایک بیان دیا ہے۔ جسے ریڈیو نے بھی نشر کیا ہے۔ سر سکندر نے اِس بیان میں کہا ہے کہ پنجاب اور بنگال کے وزراء اعظم کو اِس ریزولیوشن کی پابندی سے مستثنٰی کر دیا گیا ہے کہ مسلمان وار کمیٹیوں میں شرکت نہ کریں۔ میرے نزدیک یہ قطعاً ناقابل فہم اور ناقابل اعتبار ہے کہ سر سکندر نے اِس قسم کا بیان اخباروں کو دیا ہو گا۔ تاہم اِس فتنے کا سدِباب کرنے کے لئے جو اِس اخباری رپورٹ سے پیدا ہونے کا احتمال ہے میں واضح الفاظ میں اعلان کرتا ہوں کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ ریزولیوشن کسی شخص کو مستثنٰی قرار نہیں دیتا۔ ریزولیوشن نے غیر مشتبہ لفظوں میں مسلمانوں سے درخواست کی ہے کہ وار کمیٹیوں میں شامل نہ ہوں۔ یہ پابندی اُس وقت تک قائم رہے گی، جب تک وائسرائے سے ہمارے مذاکرات جاری ہیں۔ اور جب تک آل انڈیا مسلم لیگ کا صدر اِس ضمن میں کسی قسم کی مزید ہدایات نہیں دیتا۔ مجھے امید ہے کہ مسلم لیگ کے ممبر بالخصوص اور عام مسلمان بالعموم اِس اپیل کی پابندی کریں گے"۔

قائداعظم کے اِس بیان کے باوجود پنجاب کا ایک وفد بمبئی جا کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وفد کے لیڈر نواب شاہنواز خاں ممدوٹ اور ممبر راجہ غضنفر علی خاں اور سید محمد علی جعفری تھے۔ وفد نے قائداعظم سے درخواست کی کہ مہربانی فرما کر پنجاب پروانشل مسلم لیگ کو اس ریزولیوشن کی پابندی سے مستثنٰی قرار دے دیجئے۔ قائداعظم نے اِنکار کیا۔ اور ذیل کا بیان شائع کیا۔

"پنجاب پروانشل مسلم لیگ کا ایک وفد مجھ سے ملاقات کے لئے آیا ہے۔ جس کے لیڈر نواب شاہنواز خاں ممدوٹ اور ممبر راجہ غضنفر علی خاں اور سید محمد علی جعفری ہیں۔ اُن کی معروضات میں نے بغور سنی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پنجاب کو اس ریزولیوشن کی پابندی سے مستثنٰی قرار دے دیا جائے

جس نے مسلم لیگ کے ممبروں کو اُس وقت تک وار کمیٹیوں میں شریک ہونے سے منع کیا ہے، جب تک وائسرائے سے میرے مذاکرات کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلتا۔

اس وفد کے لیڈر نواب صاحب ممدوٹ ہے۔ جو پنجاب میں صوبہ مسلم لیگ کے صدر بھی ہیں، میں درخواست کرتا ہوں کہ ورکنگ کمیٹی کے ریزولیوشن کی پابندی کریں اور وار کمیٹی سے فی الفور مستعفی ہو جائیں۔ اُنہیں چاہئے کہ پنجاب مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کو میرا جواب پہنچا دیں اور ہر مسلم لیگی سے درخواست کریں کہ جب تک وائسرائے سے میرے مذاکرات کا نتیجہ بر آمد نہیں ہوتا وار کمیٹیوں میں شریک نہ ہوں"۔ [۱]

نواب صاحب ممدوٹ تو اِس بیان کے بعد لاہور آکر خاموش ہو گئے۔ لیکن راجہ غضنفر علی، جنہیں مسلم لیگ سے کہیں زیادہ اپنا پارلیمنٹری سیکرٹری کا عہدہ اور سر سکندر کی خوشنودی عزیز تھی، خاموش نہ رہ سکے۔ انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے اِس ریزولیوشن کے خلاف ایک طویل مضمون "سول اینڈ ملٹری گزٹ" میں لکھا۔ وار کمیٹیوں میں اپنی شرکت کا جواز پیش کرنے کے بعد اُنہوں نے مجوزہ مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے خلاف یوں زہر چکانی فرمائی۔

"مسلم لیگ کی اِس تجویز سے کہ مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے نام سے رضاکاروں کے جیش مرتب کئے جائیں، ہم قطعی متفق نہیں۔ ایسی نوع کی ایک نیم فوجی جماعت یعنی خاکساروں نے حال ہی میں جو کشت و خون برپا کیا ہے۔ اُس کے بعد مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے وجود کو کیونکر برداشت کیا جا سکتا ہے۔ مسلم لیگ کے یہ رضاکار بالآخر ایک پرائیویٹ فوج بن جائیں گے۔ قبل ازیں حکومت پنجاب اِس قسم کی پرائیویٹ فوجوں کی تشکیل بالکل بند کر چکی ہے۔ حکومت پنجاب نے اِس صوبے کی تمام قوموں سے سول گارڈ بھرتی کرنے کی سکیم پچھلے دنوں منظور کی ہے۔ یہ سول گارڈ ایک بالکل غیر سیاسی اور غیر فرقہ وارانہ جماعت ہوگی۔ جو ہر ضلع میں وہاں کے سپرنٹنڈنٹ پولیس کے تحت کام کرے گی۔ لیکن اُن کی بھرتی اور نظم و نسق ضلع کے ڈپٹی کمشنر کے تحت ہو گا۔ حال ہی میں حکومت نے اِس

---

۱۔ روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" لاہور۔ مورخہ ۱۱ اگست ۱۹۴۰ء

سلسلہ میں جو اعلان کیا ہے، اس کے مطابق یہ سول گارڈ باقاعدہ پولیس کے ساتھ مل کر کام کریں گے۔ اور انہیں قانونی اختیارات بھی عطا کئے جائیں گے۔ حکومت کا ارادہ ہے کہ پولیس ایکٹ ۱۸۶۱ء میں کچھ ترمیم کر کے سول گارڈ کے آدمیوں کو پولیس افسروں کے زمرے میں بھرتی کیا جا سکے گا۔ انہیں پولیس کے بعض اختیارات بھی مل جائیں گے۔ مثلاً گرفتاری وغیرہ۔

اندریں حالات اگر مسلم لیگ نیشنل گارڈ پنجاب میں مرتب کی گئی تو ہر گھڑی اُس کا سرکاری سول گارڈ اور پولیس سے تصادم کا اندیشہ ہے۔ اِس طرح صوبے کا نظم و نسق بالکل تہہ و بالا ہو جائے گا۔ مسلم لیگ کے اس ریزو لیوشن کی ایک شق یہ بھی ہے کہ مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے ممبر کسی اور جماعت کے رضا کار نہیں بن سکتے۔ ظاہر ہے عام مسلمان نوجوان سرکاری سول گارڈ میں بھرتی ہونا پسند کریں گے۔ اس طرح بالآخر مسلم لیگ نیشنل گارڈ کی تنظیم یقیناً ناکام ہو جائے گی۔ بہتر یہی ہو گا کہ مسلم لیگ کو چاہئے کہ پنجاب میں مسلم لیگ نیشنل گارڈ قائم کرنے کی تجویز ترک کر دے۔ ورنہ مسٹر جناح کو پھر یہ شکایت ہوگی کہ اہلِ پنجاب مسلم لیگ کے ڈسپلن کی خلاف ورزی کر رہے ہیں"۔[1]

اہلِ پنجاب جس تحریک کو تحریک پاکستان کا نام دیتے ہیں وہ ۲۸۔ جنوری ۱۹۴۷ء کو ملک خضر حیات ٹوانہ کے خلاف سول نافرمانی کی صورت میں شروع ہوئی اور تین ہفتے بعد ۲۰۔ فروری ۱۹۴۷ء کو ختم ہو گئی تھی۔ اس تحریک کی بنیاد یہ تھی کہ حکومت پنجاب نے روز افزوں فرقہ وارانہ کشیدگی کے پیشِ نظر مسلم لیگ نیشنل گارڈ اور راشٹریہ سیوک سنگ کی والنٹیر کور کو خلاف قانون جماعتیں قرار دے دیا تھا۔ راشٹریہ سیوک سنگ والوں نے تو اس حکم کی تعمیل میں کوئی پس و پیش نہیں کی۔ لیکن مسلم لیگی لیڈروں نے مزاحمت کی۔ حکومت نے انہیں گرفتار کر لیا۔ اور یوں تحریک پاکستان کا آغاز ہو گیا۔ راجہ غضنفر علی خاں اِس تحریک کو نئی زندگی بخشنے کے لئے دہلی سے چل کر لاہور تشریف لائے تھے۔

اب یہ کام سوچنے والوں کا ہے کہ بتائیں کہ راجہ صاحب نے سر سکندر حیات خان کی زندگی میں حق نمک ادا کرنے کے لئے مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے مجوزہ قیام کے خلاف جو کچھ سول

---

۱۔ روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" لاہور۔ ۶ جولائی ۱۹۴۰ء

اینڈ ملٹری گزٹ میں لکھا تھا کیا وہ صحیح تھا یا بدقسمت ملک خضر حیات ٹوانہ کے دور وزارت میں اسی مسلم لیگ نیشنل گارڈ کو قائم رکھنے کے لئے جو سول نافرمانی شروع کی تھی وہ صحیح تھی؟ سرسکندر کو خدا نے یقیناً بخت سکندری عطا کیا تھا کہ اُن کی حیات میں تمام فتنے سوئے رہے۔ یہ نہیں کہ فتنے موجود نہیں تھے، موجود تھے بلکہ روزِ اوّل سے موجود تھے۔ لیکن اُن کے مداحوں۔ نیازمندوں۔ ہواخواہوں۔ درباری داروں۔ عقیدت کشوں نے عمداً آنکھیں بند کر لی تھیں۔ سرسکندر فوت ہو گئے تو یہ لوگ بھی جاگ اٹھے اور اُنہیں پنجاب کے گوشے گوشے سے مسلم لیگ کی مظلومیت اور یونینسٹ پارٹی کی چیرہ دستی کے خوفناک بھوت نظر آنے لگے۔

جب مسلم لیگ کے مذکورہ بالا ریزولیوشن کے خلاف پنجاب میں سرگرمیاں شروع ہوئیں تو ملک برکت علی نے نکتہ چینیوں کو راہِ راست پر لانے کے لئے ذیل کا بیان شائع کیا۔

"پنجاب پراونشل مسلم لیگ کا باوا آدم ہی نرالا ہے کہ اس کے صدر نواب شاہنواز خاں ممدوٹ اور ورکنگ کمیٹی کے بہت سے ذمہ دار ممبر صوبائی وار بورڈ کے رُکن ہیں۔ جب اُن سے کہا گیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کی قرار داد کی پیروی کرو تو اُنہوں نے اِس قرار داد کو قابلِ التفات ہی نہیں گردانا۔ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے ایک ریزولیوشن منظور کر کے مسٹر جناح کو بھیجا تھا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے وار کمیٹیوں میں مسلم لیگیوں کی شرکت پر جو پابندی عائد کی ہے اس سے پنجاب کو مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ مسٹر جناح نے اِس درخواست کا جو جواب دیا تھا۔ وہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے صدر نے صوبائی لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں ممبروں کو پڑھ کر سنانے ہی سے انکار کر دیا۔ حالاں کہ مُتعدد بار اُن سے عرض کیا گیا کہ وہ جواب پڑھ کر سنائیے۔ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے صدر پنجاب مسلم لیگ کی منظوری سے جو آخری ریزولیوشن پاس کیا ہے۔ اُس کی رُو سے نواب شاہنواز خاں ممدوٹ اور ان کے ہمراہ صوبائی لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے دو ممبر مسٹر جناح کی خدمت میں بمبئی حاضر ہو کر پنجاب کے خاص حالات بیان کریں گے۔ اور یہ درخواست کریں گے کہ پنجاب کو مستثنیٰ قرار دیا جائے۔

یقیناً وقت آ گیا ہے کہ پنجاب مسلم لیگ کو راہ راست پر لایا

جائے۔ اور حکم عدولی اور نافرمانی کرنے والے ممبروں کو سیدھا کر کے ایسا سبق سکھایا جائے جسے وہ کبھی فراموش نہ کر سکیں"۔[۱]

ملک صاحب کے اِس بیان پر لاہور کے اینگلو انڈین اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ نے جو ادارتی نوٹ لکھا تھا وہ بھی پڑھنے کے قابل ہے۔

"ملک برکت علی نے آل انڈیا مسلم لیگ اور پنجاب پروانشل مسلم لیگ کے باہمی تعلقات پر جس حیرت کا اظہار کیا ہے۔ ہم اس میں ملک صاحب کے شریک ہیں۔ لیکن ہماری یہ حیرت اُن کی طرح غیظ و غضب سے مرکب نہیں بلکہ اِس میں مزاح کا عنصر بھی موجود ہے۔ ملک صاحب نے کہا ہے کہ وقت آگیا ہے کہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کو ایسا سبق سکھایا جائے کہ اگر وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے احکام کی پیروی نہیں کر سکتی تو اسے بالکل معطل کر دینا چاہئے تاکہ لیگ کی عمارت شکست و ریخت سے بچ جائے۔

ملک صاحب کی اس مجوزہ تادیب و تعزیر سے ہم متفق نہیں کیونکہ پرائے شگون کے لئے اپنی ناک کٹوا دینا کوئی اچھا کام نہیں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا مفاد یہی ہے کہ پنجاب پروانشل مسلم لیگ اس سے وابستہ رہے نہ یہ کہ آل انڈیا مسلم لیگ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کو ایک ماتحت ادارہ سمجھ کر ہر وقت اسے دباتی رہے۔ اگر مسٹر جناح نے پنجاب صوبہ لیگ کے خلاف ضابطے کی کارروائی کی تو اس کا نقصان آل انڈیا مسلم لیگ کو ہو گا۔ بہتر یہی ہے کہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کو اس کی خامیوں اور فروگزاشتوں سمیت اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ موجودہ عالمگیر جنگ میں برطانوی حکومت کی مدد کرنا پنجاب کے لئے نسبتاً زیادہ مفید ہے۔ بجائے اس کے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی یک جہتی برقرار رکھنے کی کوشش کی جائے۔ اس وقت جو لوگ مسلمانانِ پنجاب کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ وہ پنجابی پہلے ہیں اور مسلم لیگی بعد میں"[۲]

سول اینڈ ملٹری گزٹ کا یہ ادارتی نوٹ پنجاب کے ان نام نہاد مسلم لیگی لیڈروں کی جو یونینسٹ پہلے تھے اور مسلم لیگی بعد میں، صحیح تصویر پیش کرتا ہے۔

---

۱۔ روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ"۔ لاہور۔ ۲۵ جولائی ۱۹۴۰ء

۲۔ روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ"۔ لاہور۔ ۲۷ جولائی ۱۹۴۰ء

سر سکندر حیات خاں ۸۔ ستمبر ۱۹۴۰ء کو شملہ تشریف لے جا رہے تھے تو لاہور کے انگریزی اخبار ٹریبون کے نامہ نگار نے ان سے انٹرویو لیا، اور پاکستان کی سکیم کے بارے میں چند سوال کئے۔ سر سکندر نے جواب میں فرمایا:۔

"میں آج بھی فرقہ وارانہ بنیادوں پر ہندوستان کی تقسیم کے خلاف ہوں۔ پنجاب پر کسی خاص فرقے کی حکومت نہیں چل سکتی۔ پنجاب پر صرف پنجابیوں کی حکومت ہو گی"۔

جب ٹریبون کے نامہ نگار نے سر سکندر کی توجہ ملک برکت علی کے اس بیان کی طرف منعطف کی جس میں ملک صاحب نے کہا تھا کہ سر سکندر حیات خاں پاکستان کی سکیم کے حامی ہیں تو سر سکندر نے جواب دیا کہ میری پوزیشن آج بھی وہی ہے جو اس وقت تھی جب مسلم لیگ نے قرار داد لاہور منظور کی تھی۔ قرار دادِ لاہور کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ ہندوستان تقسیم کیا جائے۔

روزنامہ ٹریبون نے ۱۲۔ ستمبر ۱۹۴۰ء کو ایک مقالۂ افتتاحیہ لکھا جس کا عنوان تھا "وزیر اعظم پنجاب اور پاکستان"۔

اس مقالے میں ٹریبون کے ایڈیٹر نے سر سکندر حیات خاں کا بیان نقل کرنے کے بعد لکھا۔

"اگر ہمارے نامہ نگار نے سر سکندر کے بیان کو غلط نہیں سمجھا اور ظاہر ہے غلط سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں، تو پھر ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ یا ہم پاگل ہیں یا سر سکندر کا دماغ خراب ہو گیا ہے"۔

آگے چل کر ٹریبون نے قرار داد لاہور نقل کرنے کے بعد مسٹر جناح کی تقریر کے یہ الفاظ بھی درج کئے ہیں:۔

"مجھے پختہ یقین ہے کہ ایک متحدہ ہندوستان محض خواب ہے۔ اگر خیر سگالی اور دوستانہ مفاہمت کے جذبات قائم رہیں تو مسلم انڈیا اور ہندو انڈیا نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ پر امن ہمسایوں کی طرح رہ سکتے ہیں۔ جن کے درمیان کسی تصادم یا کشیدگی کا خطرہ نہیں۔ یہ دونوں ملک اپنے اپنے خطے میں اپنے اپنے مزاج کے مطابق اپنی حکومتیں مرتب کریں گے"۔

اس کے بعد ٹریبون لکھتا ہے:۔

"کیا سر سکندر کا اب بھی یہ خیال ہے کہ ان کا اور پاکستان کے حامیوں کا نقطۂ نگاہ ایک ہے اور پیش نظر مقصد بھی ایک ہے؟ اگر ایک ہے تو انہیں چاہیئے کہ جو زبان وہ اب تک استعمال کرتے رہے ہیں اس سے واضح اور

غیر مبہم زبان استعمال کریں تاکہ اس صوبے کی پبلک، بالخصوص اس کے غیر مسلم عنصر کو معلوم ہو جائے کہ وہ کہاں کھڑے ہیں۔ اگر وہ سمجھتے ہیں کہ بیک وقت یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ کی دو کشتیوں میں سوار ہو کر اپنا سیاسی سفر طے کر سکیں گے تو سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں"۔

سر سکندر حیات خاں خوش نصیب تھے کہ بیک وقت یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ کی دو مخالف سمت جانے والی کشتیوں میں سوار ہو کر اپنا سیاسی سفر کامیابی سے طے کر گئے۔ قائداعظم کے عتاب سے بھی محفوظ رہے۔ ہندوستان بھر میں اپنا بھرم بھی قائم رکھ سکے۔ اور یونینسٹ پارٹی میں کوئی شخص ان کے سامنے آنکھیں تک نہ اٹھا سکا۔

پنجاب کے بلند پایہ لیڈر، جو آج تحریک پاکستان کے سب سے بڑے مجاہدوں میں شمار ہوتے ہیں۔ میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ۔ سردار شوکت حیات۔ چودھری نذیر احمد خاں۔ میاں امیرالدین۔ محمود علی قصوری۔ محمد انور (ایم۔ انور) جسٹس بدیع الزمان کیکاؤس۔ میاں مشتاق احمد گورمانی۔ علامہ علاؤالدین صدیقی۔ سید شمیم حسین قادری۔ سید امجد علی۔ ایس ایم اکرام۔ چودھری محمد علی وغیرہ ہیں۔ کیا یہ اصحاب ازراہ کرم بتائیں گے کہ وہ تحریک پاکستان کے کس مرحلے پر اس تحریک میں شامل ہوئے تھے؟

اس سوال کا جواب لازماً یہی ملے گا کہ یہ لوگ اس وقت تحریک پاکستان میں شریک ہوئے تھے جب مسلم لیگ نیشنل گارڈ کو خلاف قانون جماعت قرار دیئے جانے کے سلسلہ میں ملک خضر حیات ٹوانہ کے خلاف سول نافرمانی شروع ہوئی تھی اور تین ہفتے بعد وہ سول نافرمانی ختم ہو گئی تھی۔ گویا یوں کہنا چاہئے کہ ملک خضر حیات اگر مسلم لیگ نیشنل گارڈ کو خلاف قانون جماعت قرار نہ دیتے تو کم سے کم پنجاب میں تحریک پاکستان بھی شروع نہ ہوتی۔

سر سکندر حیات خاں کی وزارت عظمیٰ کے زمانے میں حکومت پنجاب نے ایک رفاقت کمیٹی قائم کی تھی۔ بظاہر دعویٰ یہ کیا گیا تھا کہ رفاقت کمیٹی کے ذریعہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں فرقہ وارانہ اتحاد پیدا کیا جائے گا۔ لیکن اصل مقصد یہ تھا کہ مسلم لیگ اور پاکستان کے خلاف شکر میں لپٹا ہوا پروپیگنڈا کیا جائے۔ چند تعلیم یافتہ مسلمان اور ہندو اس کمیٹی میں ملازم ہو گئے تھے۔ علامہ علاؤالدین صدیقی۔ مولوی ابراہیم علی چشتی۔ جگن ناتھ آزاد وغیرہ۔ ان کا طریق کار یہ تھا کہ عید۔ بقرعید۔ ہولی۔ جنم اشٹمی۔ دسہرہ وغیرہ تہواروں پر مختلف شہروں. قصبوں اور دیہات میں جا کر تقریریں کرتے تھے کہ ہندو اور مسلمان ایک ہی ملک میں رہتے ہیں۔ ایک ہی زبان بولتے ہیں۔ کلچر دونوں کا ایک ہے۔ نسل بھی ایک ہے۔ اور تبدیل مذہب سے

قومیت نہیں بدل جاتی۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بَیر رکھنا
ہندی ہیں ہم ، وطن ہے ہندوستان ہمارا

جب سر سکندر حیات خاں فوت ہو گئے۔ اور یونینسٹ پارٹی میں ملک خضر حیات ٹوانہ کے خلاف بغاوت ہوئی۔ اور مُسلم لیگ کے ذریعہ سے اپنا کیریئر بنانے کا سنہری موقع نظر آیا تو یہی رفاقت کمیٹی کے تنخواہ دار مُسلمان ملازم جھٹ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ اور جگہ جگہ جا کر دو قوموں کے نظریئے کی تلقین و تبلیغ کرنے لگے کہ ہندو اور مسلمان اکٹھے نہیں رہ سکتے۔
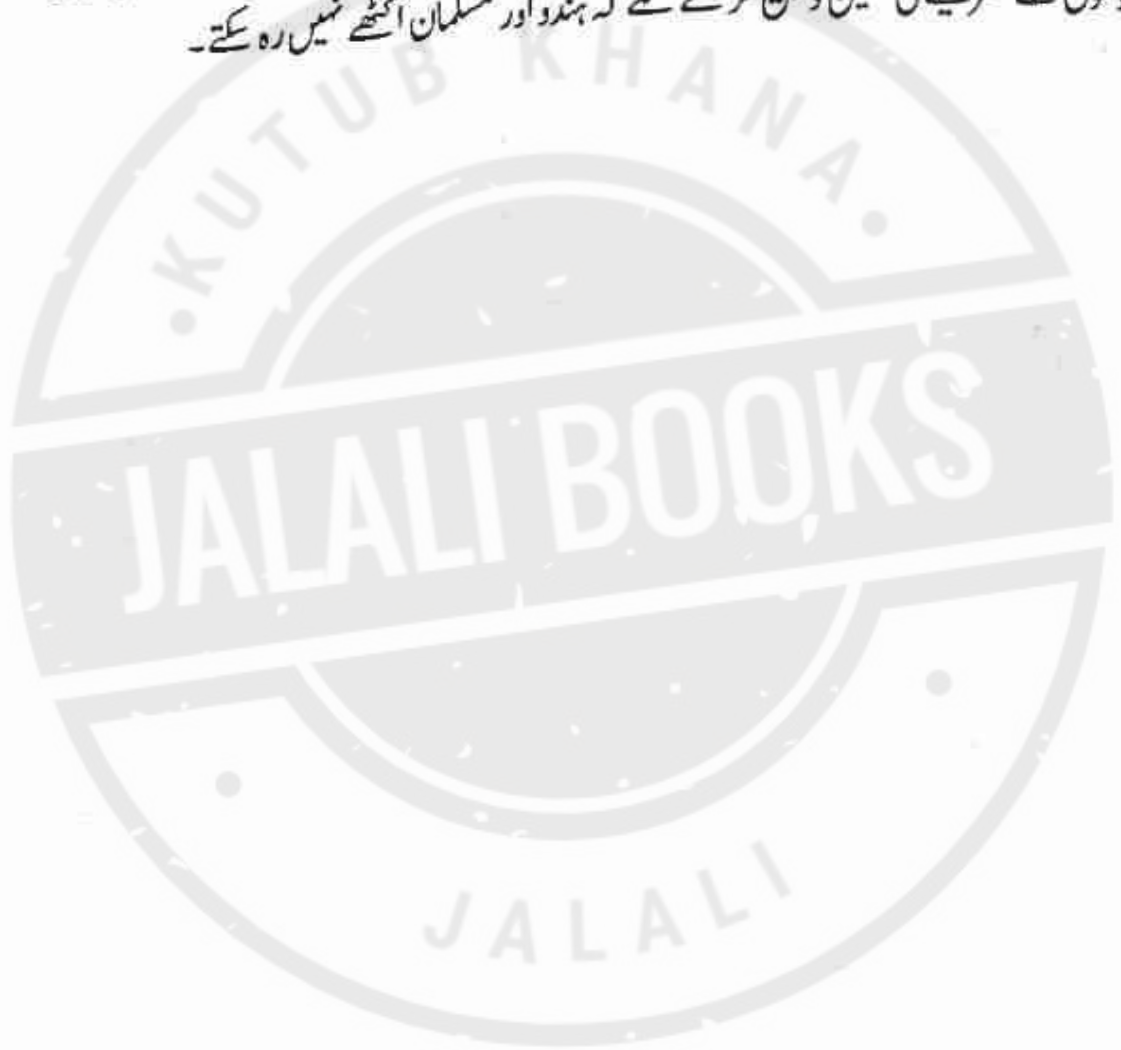
پانچواں باب

# نیشنل ڈِیفنس کونسل

جولائی ۱۹۴۰ء میں وائسرائے نے اپنی ایگزیکٹو کونسل کے ممبروں کی تعداد میں اضافہ کرنا چاہا۔ اور ساتھ جنگی سرگرمیاں تیز کرنے کے لئے ایک وار ڈِیفنس کونسل قائم کرنے کا بھی فیصلہ کیا۔ مقصد یہ تھا کہ ایگزیکٹو کونسل میں چند ایسے ہندوستانی ممبروں کو جگہ دی جائے۔ اور ڈیفنس کونسل میں بھی ایسے ہندو اور مسلمان ممبر شامل کیے جائیں جن کا عوام میں کچھ اثر و رسوخ ہو۔ اس سلسلہ میں انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر کو بھی دعوت دی۔ قائداعظم نے اپنی ورکنگ کمیٹی کے مشورے سے ذیل کی شرطیں پیش کیں۔

الف۔۔وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کی مجوزہ توسیع موجودہ "فریم ورک" کے حدود کے اندر ہونی چاہئے۔ اگر کانگرس ایگزیکٹو کونسل میں شرکت پر آمادہ ہو تو مسلمان ممبروں کی تعداد ہندو ممبروں کے مُساوی ہونی ضروری ہے ورنہ مُسلمان ممبروں کو اکثریت ملنی چاہئے کیونکہ نظم و نسق کا زیادہ بار انہی کو اٹھانا پڑے گا۔

ب۔ جن صُوبوں میں دفعہ نمبر ۹۳ نافذ ہے وہاں گورنروں کی مدد کے لئے غیر سرکاری مشیر مقرر کئے جائیں جن کی تعداد باہمی مشورے سے معین کی جا سکتی ہے اُن غیر سرکاری مشیروں کی اکثریّت مسلمانوں کے نمائندوں پر مشتمل ہونی چاہئے۔ اگر بعض صوبوں میں حکومت چلانے کے لئے مختلف پارٹیوں کی مخلوط وزارتیں یعنی کولیشن بن سکیں تو اِس قسم کی کولیشن کی ترتیب و تشکیل کا کام انہی پارٹیوں کے ذمے ہونا چاہئے۔

ج۔ جنگی سرگرمیاں تیز کرنے کے لئے ایک ڈیفنس کونسل کی تشکیل ضروری ہے جس کے ممبروں کی تعداد پندرہ ہوگی اور جس کا صدر وائسرائے ہوگا۔ والیان ریاست کے نمائندوں کو بھی اس میں شریک کیا جا سکتا ہے۔ اگر کانگرس اِس کونسل میں شریک ہونا منظور کرے تو مسلمان ممبروں کی تعداد ہندو ممبروں کی تعداد کے مساوی ہونی ضروری ہے۔ ورنہ بصورت دیگر مسلمان

ممبروں کو اکثریت ملنی چاہئے۔ مجوزہ وار کونسل وقتاً فوقتاً حالات و کوائف پر غور کر کے جنگی سرگرمیاں تیز کرنے کی تجویزیں اختیار کرے گی۔

د۔ مجوزہ وار کونسل اور ایگزیکٹو کونسل میں جو مسلمان ممبر شامل کیے جائیں گے اور دفعہ نمبر ۹۳ والے صوبے میں جو غیر سرکاری مسلمان مشیر نامزد ہوں گے اُن کے انتخاب کلیتہً آل انڈیا مسلم لیگ اپنی صوابدید سے کرے گی۔

وائسرائے نے اِن شرطوں کے جواب میں دو قابل ذکر باتیں کیں۔ ایک یہ کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر کو اختیار ہو گا کہ مجوزہ ایگزیکٹو کونسل کے ممبروں کے ناموں کی ایک فہرست وائسرائے کو بھیج دیں۔ جن میں سے وائسرائے اپنی مرضی کے مطابق دو نام منتخب کرلے گا۔ دوسری یہ کہ اگر بعد ازاں کسی مرحلے پر کانگرس بھی ایگزیکٹو کونسل میں شرکت پر آمادہ ہو گئی تو وائسرائے اِس قسم کی کوئی گارنٹی نہیں دے سکتا کہ کانگرسی اور مسلم لیگی ممبروں کی تعداد مساوی ہوگی۔

مسٹر جناح مُصر تھے کہ جن دو اصحاب کے نام وہ تجویز کریں گے صرف انہی کو ایگزیکٹو کونسل میں لیا جانا چاہئے۔ اور کانگرسی اور مسلم لیگی ممبروں کی تعداد بہر صورت مساوی ہوگی۔ وائسرائے نے یہ دو شرطیں ماننے سے معذوری کا اظہار کیا تو یہ گفت و شنید ٹوٹ گئی۔

سال بھر کے بعد وائسرائے نے فیصلہ کیا کہ ایگزیکٹو کونسل کی توسیع اور ڈیفنس کونسل کے قیام میں مزید التواء نہیں ہونا چاہئے۔ چنانچہ ایگزیکٹو کونسل میں سر سلطان احمد سر اکبر حیدری اور سر فیروز خاں نون کو شامل کیا گیا۔ ڈیفنس کونسل میں سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب مولوی فضل الحق وزیر اعظم بنگال سر محمد سعد اللہ وزیر اعظم آسام خان اللہ بخش وزیر اعظم سندھ۔ نواب چھتاری۔ بیگم شاہنواز۔ سر محمد عثمان اور ملک خدا بخش لئے گئے۔

بمبئی کے گورنر سر راجر لملے نے اپنے گرمائی صدر مقام گنیش کھنڈ سے ۲۰ جولائی ۱۹۴۱ء کو مسٹر جناح کی خدمت میں ذیل کا خط لکھا۔

> "ڈیر مسٹر جناح ہز ایکسے لینسی وائسرائے نے مجھ سے کہا ہے کہ آپ کو ذیل کے امور کے بارے میں اُن کے ارادے سے مطلع کروں۔ میرا خیال تھا کہ خود آپ سے مل کر زبانی یہ پیغام پہنچاؤں کیونکہ وائسرائے کی یہی خواہش تھی لیکن افسوس ہے میری طبیعت کچھ خراب ہو گئی۔ اِس لئے حاضر نہیں ہو سکتا۔ ایک خاص قاصد کے ہاتھ یہ خط آپ کو بھیج رہا ہوں۔

وائسرائے بدستور اِس مسئلے پر غور کرتے رہے ہیں کہ جنگی سرگرمیاں تیز کرنے کے لئے غیر سرکاری افراد کی اعانت کیونکر حاصل کی جا سکتی ہے۔گذشتہ اگست میں جس پیش کش کی بنیاد پر سمجھوتے کی کوشش کی گئی تھی اُس میں چند رکاوٹیں حائل ہو گئیں۔ اور وہ رکاوٹیں فی الحال موجود ہیں۔ وزیر ہند نے ٢٢ اپریل کو دارالعوام میں جو بیان دیا تھا۔ اور اُس کا جو ردِ عمل یہاں ہوا ہے اُس نے اُن رکاوٹوں کو مزید نمایاں کر دیا ہے۔

اندریں حالات ظاہر ہے کہ وائسرائے حسبِ خواہش، ہندوستان کی بڑی بڑی سیاسی پارٹیوں سے اگست کی پیش کردہ تجاویز میں اشتراک و تعاون کی توقع نہیں رکھ سکتے جنگ جاری رکھنے کا بار مرکزی حکومت پر بہت بڑھ گیا ہے اور انتظامی اُمور کو سرانجام دینے کے لئے ضروری ہے کہ اگست کی پیش کش کی شرائط کے تحت وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبروں کی تعداد میں کچھ اضافہ کیا جائے چنانچہ وائسرائے آپ کو اطلاع دینا چاہتے ہیں کہ اُنہوں نے ملکِ معظم کی حکومت کی منظوری سے پانچ نئے محکمے وضع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

اِن محکموں کے نام اور اِن اصحاب کے نام جنہوں نے اِن محکموں کی سربراہی قبول کی ہے حسب ذیل ہیں۔ سر ہومی مودی (سپلائی) سر اکبر حیدری (انفرمیشن) مسٹر رگھوندر اراؤ (سول ڈیفنس) مسٹر اینے (سمندر پار رہنے والے ہندوستانی) سر فیروز خاں نون (لیبر)

وائسرائے آپ کو یہ بھی بتانا چاہتے ہیں کہ جب سر ظفراللہ خاں فیڈرل کورٹ کی ججی اور سر گرجا شنکر باجپائی سمندر پار اپنی نئی ملازمت پر چلے جائیں گے تو سر سلطان احمد کو سر ظفراللہ خاں اور مسٹر سرکار کو سر گرجا شنکر باجپائی کی جگہ مقرر کیا جائے گا۔

وائسرائے یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ اگر بڑی بڑی سیاسی پارٹیوں کی امداد و اعانت حاصل نہیں ہو سکتی تو اِس کا یہ مطلب نہیں کہ جنگی سرگرمیاں تیز کرنے کے لئے غیر سرکاری ہندوستانیوں کے اشتراک و تعاون کے حصول میں مزید تاخیر روا رکھی جائے۔ چنانچہ اُنہوں نے ملک

معظم کی حکومت کی منظوری سے ایک نیشنل ڈیفنس کونسل قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اِس کونسل کے تیس ۳۰ ممبر ہوں گے جن میں سے نو ممبر ریاستوں سے لئے جائیں گے۔

وائسرائے چاہتے ہیں کہ عظیم مسلمان قوم کی نمائندگی اس کونسل میں وہ اصحاب کریں جو اپنی صلاحیت و اہمیت کے لحاظ سے مسلّم حیثیت کے مالک ہیں۔ لہٰذا اُنہوں نے آسام۔ بنگال۔ پنجاب اور سندھ کے وزراء اعظم کو اِس کونسل کے ممبر بننے کی دعوت دی ہے! اِس کے علاوہ اُنہوں نے چند اور نمایاں حیثیت کے مسلمان اصحاب کو بھی مدعو کیا ہے۔ مثلاً سر محمد عثمان۔

وائسرائے کا یہ بھی خیال تھا کہ اس کونسل کے ممبروں کے بارے میں آپ سے بھی مشورہ کیا جائے۔ لیکن ازبسکہ وہ اِس ضمن میں آپ کے خیالات سے واقف ہیں۔ اُنہوں نے آپ کو زحمت دینا پسند نہیں کیا۔

ارادہ یہ ہے کہ ۲۲ جولائی منگل کی صبح اُن ناموں کا اعلان کر دیا جائے گا۔ وائسرائے کی خواہش کے مطابق میں قبل از وقت آپ کو اُن امور کی اطلاع کر رہا ہوں۔ میری دلی خواہش تھی کہ یہ تمام باتیں زبانی کہتا۔ بہر حال اس خط میں اُن کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے۔ امید ہے آپ کے مزاج کی ناسازی رفع ہو چکی ہو گی۔

مخلص

راجر لملے

مسٹر جناح نے اس خط کا حسب ذیل جواب دیا۔

ڈیر سر راجر۔ آپ کا خط محررہ ۲۰ جولائی ۱۹۴۱ء جس میں ہز ایکسی لینسی وائسرائے کا پیغام بھی شامل تھا۔ مجھے ملا۔ وائسرائے نے ملک معظم کی حکومت کے مشورے سے جو قدم اٹھایا ہے وہ حد درجہ افسوسناک ہے۔ اِس ضمن میں اُنہیں صرف میرے خیالات ہی نہیں بلکہ آل انڈیا مسلم لیگ کے فیصلوں کا بھی علم ہے۔

میں یہ بات پسند نہیں کرتا کہ اُنہوں نے اپنی توسیع شدہ ایگزیکٹو کونسل اور نیشنل ڈیفنس کونسل میں شرکت کے لئے مسلم لیگی وزراء اعظم اور دیگر مسلم لیگیوں کو مدعو کیا ہے۔ ظاہر ہے اُن کے اس

فعل سے مسلم لیگ میں انتشار پھیلے گا۔ مجھے اُمید ہے کہ ہز ایکسی لینسی ایسی صورت حال پیدا کرنے سے اجتناب کریں گے۔ علاوہ ازیں یہ قطعی نامناسب ہے کہ ہز ایکسی لینسی اُن لوگوں کو آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر اور اُس کی ورکنگ کمیٹی سے بالا بالا براہِ راست مدعو کریں حالانکہ انہیں اس سلسلہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کی پوزیشن اور اُس کے طریق کار کا بخوبی علم ہے۔

وائسرائے کے پیغام میں یہ بھی درج ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ عظیم مسلّم قوم کی نمائندگی ایسے افراد کریں جو اپنی صلاحیت کے لحاظ سے مسلّم حیثیت کے مالک ہیں۔ کیا یہ مناسب ہے کہ اس قسم کی مسلّم صلاحیت اور اہمیت کے مالک مسلمان جو مسلم لیگ کے ممبر ہیں لیگ کی پالیسی کی خلاف ورزی کرکے اس دعوت کو قبول کریں؟ اور کیا حکومت کے نزدیک اس کا یہ فعل مستحسن ہے کہ اُن لوگوں کو ورغلا اور بہکا کر ان کی قومی جماعت سے منحرف کیا جائے تاکہ وہ اس وائسرائے کی دعوت منظور کر سکیں؟

میرا دعویٰ ہے کہ عظیم مسلمان قوم کی نمائندگی صرف آل انڈیا مسلم لیگ کرتی ہے۔ حکومت نے اگر اپنے موجودہ رویئے پر اصرار کیا تو حالات سُدھرنے کی بجائے اور زیادہ خراب ہوں گے جس سے مسلم لیگ میں تلخی پیدا ہوگی۔ مجھے آپ کی طبیعت کی خرابی کا حال پڑھ کر افسوس ہوا۔ امید ہے آپ جلد اچھے ہو جائیں گے۔ آپ نے میری صحت کے بارے میں جو استفسار فرمایا ہے۔ اس کے لئے ممنون ہوں۔ اب میں بہتر ہوں۔

مخلص

ایم اے جناح

سر راجر لملے نے ۲۲ جولائی کو ذیل کا جواب دیا۔

"ڈیئر مسٹر جناح آپ کے ۲۱ جولائی کے خط کا شکریہ میں نے اس کے مندرجات وائسرائے کی خدمت میں بھیج دیئے ہیں۔ آپ کے صحت یاب ہونے کی خبر سے خوشی ہوئی۔ آپ کی مزاج پرسی کا ممنون ہوں۔ اب مَیں پہلے سے بہتر ہوں۔

مخلص

راجر لملے

مسٹر جناح نے ۲۲ جولائی کو بمبئی سے ایک اخباری بیان دیا کہ مسلم لیگ کے جو ممبر وائسرائے کی توسیع شدہ ایگزیکٹو کونسل اور ڈیفنس کونسل میں شامل ہوئے ہیں، اُنہوں نے مسلم لیگ کے ضابطے کی خلاف ورزی کی ہے۔ لہٰذا عنقریب ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں اس مسئلے پر غور کیا جائے گا۔

اِس بیان پر اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہوا۔ سر سلطان احمد نے اپنی صفائی میں یہ دلیل پیش کی کہ اُنہیں ایگزیکٹو کونسل میں سر ظفراللہ خاں کی جگہ لاء ممبر مقرر کیا گیا ہے اور یہ لاء ممبری توسیع شدہ ایگزیکٹو کونسل کی کوئی نئی اسامی نہیں بلکہ پچھلے چالیس سال سے ایک مستقل عہدے کی صورت میں چلی آ رہی ہے۔ جس پر مختلف اوقات میں سر سنکرن نائر۔ سر محمد شفیع۔ سر علی امام اور سر محمد ظفر اللہ خاں کام کر چکے ہیں۔ اِس لئے اُن کے خلاف آل انڈیا مسلم لیگ کی نافرمانی کا جرم عائد نہیں کیا جا سکتا۔

بیگم شاہنواز نے یہ دلیل دی کہ اُنہیں عورتوں کی نمائندگی کے لئے ڈیفنس کونسل میں شامل کیا گیا ہے۔ بیگم صاحب نے قائد اعظم پر الزام بھی لگایا کہ اُنہوں نے اب تک مسلمان عورتوں کی بہتری کے لئے کچھ نہیں کیا۔ اب وہ کس منہ سے عورتوں کی فلاح و بہبود کے مدّعی بنتے ہیں۔[1]

سر سکندر حیات خاں مولوی فضل الحق اور سر محمد سعداللہ خاموش تھے۔ البتہ راجہ غضنفر علی خاں نے جو اُس زمانے میں گویا سر سکندر کے نفس ناطقہ کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ ۱۹۔اگست کو ایک طویل بیان سول اینڈ ملٹری گزٹ میں چھپوایا جس میں مِن جملہ دیگر باتوں کے یہ بھی لکھا کہ

"پنجاب اسمبلی کی وزارتی پارٹی کے مسلمان ارکان سکندر جناح پیکٹ کی رُو سے مُسلم لیگ میں شامل ہوئے تھے۔ اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے سر سکندر حیات خاں نے، دوسری پارٹیوں کے اشتراک سے جن کے اغراض و مقاصد مسلم لیگ سے ملتے ہیں ایک کولیشن وزارت بنائی ہے۔ اس طرح سر سکندر کے پنجاب کے وزیر اعظم ہونے کی وجہ یہ نہیں کہ اُنہیں صرف مسلمان ممبروں کی اعانت حاصل ہے بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ ہندوؤں اور سکھوں کا ایک طاقت ور عنصر ان کی پشت پر موجود ہے۔ کولیشن وزارت کے اِن عناصر ترکیبی کی وجہ سے موجودہ وزارتی پارٹی کا نام

---

۱۔ بیگم شاہنواز نے اپنی خود نوشت سوانح عمری کے صفحہ ۱۷۵ پر یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے جو تفصیل درج فرمائی افسوس اس کا حقیقت اور صداقت سے کوئی تعلق نہیں۔ عالمگیر جنگ کے خاتمے پر جب ڈیفنس کونسل توڑ دی گئی تو بیگم صاحب کی ممبری بھی ختم ہو گئی۔ پھر انہوں نے قائد اعظمؒ کی خدمت میں معافی نامہ لکھا کہ ڈیفنس کونسل کی ممبری انہوں نے محض اپنی اور اپنے کنبے کی مالی مشکلات رفع کرنے کے لئے منظور کی تھی۔ اب ان کی خطاؤں سے درگزر کر کے انہیں پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے الیکشن میں مسلم لیگ کا ٹکٹ عطا کیا جائے۔ قائد اعظمؒ نے یہ معافی نامہ قبول کر لیا اور انہیں پنجاب اسمبلی کے الیکشن میں مسلم لیگ کا ٹکٹ عطا کیا۔

یونینسٹ پارٹی ہے۔ اور یہ پارٹی پنجاب کی اُن فوجی اقوام کی نمائندگی کرتی ہے جن کا مسلمانوں سمیت ہندوستان کی فوج میں اسّی فیصد حصّہ ہے۔ سرسکندر حیات خاں نے ڈیفنس کونسل کی ممبری قبول کی ہے تو کولیشن وزارت کے سربراہ کی حیثیت سے قبول کی ہے۔ لہٰذا اُنہیں مورد الزام نہیں گردانا جاسکتا۔

جو لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر مسٹر جناح نے سرسکندر کے خلاف ضابطے کی کارروائی کی تو یونینسٹ پارٹی کے مسلم لیگی ممبروں کا روّیہ کیا ہو گا۔ وہ اس پس منظر سے ناواقف ہیں جس کی روشنی میں ۱۹۳۷ء کا سکندر جناح پیکٹ وجود میں آیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ سوائے دو آدمیوں کے. جن میں سے ایک مَیں بھی تھا۔ باقی تمام مسلمان ممبر یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے۔ اُس کے بعد اکتوبر ۱۹۳۷ء میں سرسکندر برضا و رغبت لکھنؤ گئے۔ جہاں انھوں نے مُسلم لیگ سے اپنی وفاداری کا اعلان کیا۔ اِن حالات میں کیا کوئی ذی ہوش انسان یہ سوچ سکتا ہے کہ سرسکندر یا مسٹر جناح محض ایک غلط فہمی کی بناء پر مسلمانوں کا اتحاد توڑ دیں گے؟"

راجہ صاحب نے اس بیان میں چند باتیں نہایت وضاحت سے بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ سکندر جناح پیکٹ اور اُس کی عملداری بدستور قائم ہے۔ دوسری یہ کہ پنجاب اسمبلی کے مسلمان ممبر. جو یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے۔ صرف سکندر جناح پیکٹ کی وجہ سے مسلم لیگ کے ممبر بنے تھے۔ تیسری یہ کہ پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی موجود ہے جس کے لیڈر سرسکندر حیات خاں ہیں۔ چوتھی یہ کہ یونینسٹ پارٹی اُس کولیشن کا نام ہے جو اُس مسلم لیگ پارٹی نے چودھری چھوٹو رام، راجہ نرندر ناتھ اور سر سندر سنگھ مجیٹھیہ کی پارٹیوں سے مل کر قائم کی ہے۔

سوال یہ ہے کہ سرسکندر حیات خاں کے انتقال کے بعد راجہ صاحب نے ان مسلمہ اور مصدقہ حقائق سے کیوں رُوگردانی اختیار کی اور کیوں ان سے انکار کیا؟ سرسکندر کے فوت ہونے کے بعد جب راجہ صاحب مسلم لیگ کے سب سے بڑے علم بردار، مسلمانوں کے جداگانہ حقوق کے سب سے بڑے محافظ اور تحریک پاکستان کے سب سے نامور مجاہد بن کر میدان میں کودے تھے، تو اُن کی زبان پر یہ تین نعرے تھے۔

اول ــــ سکندر جناح پیکٹ کا کوئی وجود نہیں۔

دوم ــــ پنجاب اسمبلی میں اَب تک کوئی مسلم لیگ پارٹی نہیں بنائی گئی۔

سوم ــــ جب تک یونینسٹ پارٹی کو توڑا نہیں جاتا، پنجاب کے مسلمانوں کی نجات نہیں ہو سکتی اور نہ پاکستان حاصل ہو سکے گا۔

مَیں اِس کتاب کے تیسرے باب بعنوان "پنجاب مسلم لیگ پارلیمنٹری پارٹی" میں ملک برکت علی اور پنجاب اسمبلی کے سپیکر کی باہمی خط و کتابت نقل کر کے یہ ثابت کر چکا ہوں کہ ۱۹۴۰ء میں پنجاب اسمبلی میں کوئی مسلم لیگ پارٹی نہیں تھی۔ راجہ غضنفر علی خاں سے یہ حقیقت مخفی نہیں تھی۔ لیکن سر سکندر کی یونینسٹ وزارت میں اُنہیں پارلیمنٹری سیکرٹری کا جو عہدہ حاصل تھا، اس کے خُمار نے اُن کی آنکھوں پر گویا پٹی باندھ رکھی تھی۔ اور وہ صاف اور بدیہی حقائق دیکھنے سے محض اس لئے انکار کر رہے تھے کہ سر سکندر سے اُن کی نیاز مندی کا یہی تقاضا تھا۔

۲۴۔ اگست ۱۹۴۱ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بمبئی میں ہوا۔ سر سکندر حیات خاں موجود تھے۔ لیکن مولوی فضل الحق تشریف نہیں لائے تھے۔ قائدِاعظمؒ نے ڈیفنس کونسل اور توسیع شدہ ایگزیکٹو کونسل کا مسئلہ چھیڑا تو سر سکندر نے کہا کہ وہ پنجاب کے وزیرِاعظم کی حیثیت سے اپنے صوبے کی تمام قوموں کی نمائندگی کرتے ہیں اور اسی لحاظ سے انہیں وائسرائے نے ڈیفنس کونسل میں شامل کیا ہے۔ لیکن جب مسٹر جناح نے بمبئی کے گورنر سر راجر لملے کا خط نکال کر دکھایا جس میں لکھا تھا کہ سر سکندر کو عظیم مسلمان قوم کے نمائندے کی حیثیت سے ڈیفنس کونسل میں لیا گیا ہے تو سر سکندر نے فوراً کہا کہ وائسرائے نے ان سے فریب کیا ہے۔ وہ مسلمانوں کی نمائندگی کے دعوے دار نہیں۔ لہٰذا وہ ڈیفنس کونسل سے مستعفی ہوتے ہیں۔

سر سکندر حیات خاں اس موقع پر پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے پچھتر مسلمان ممبروں کے تحریری اقرار نامے اپنی جیب میں ڈال کر بمبئی گئے تھے کہ اگر سر سکندر اور مسٹر جناح کا جھگڑا ہوا۔ اور اس جھگڑے کی بناء پر سر سکندر نے مسلم لیگ سے استعفاء دیا تو اسمبلی کے یہ پچھتر مسلمان ممبر بھی فوراً مسلم لیگ سے مستعفی ہو جائیں گے۔[۱]

اِسی ایک واقعہ سے اندازہ کر لیجئے کہ پنجاب کے اِن نام نہاد مسلم لیگیوں کی وفاداری مسلم لیگ کے ساتھ تھی یا سر سکندر حیات خان کے ساتھ۔

مولوی فضل الحق وزیرِاعظم بنگال کو ورکنگ کمیٹی نے نوٹس دیا کے دس دن کے اندر اپنی پوزیشن صاف کریں اور بتائیں کہ وہ ڈیفنس کونسل سے مستعفی ہونے کو تیار ہیں یا نہیں۔ مولوی صاحب نے ۸ ستمبر کو نوابزادہ لیاقت علی خان کو لکھا کہ وہ بطور احتجاج آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ

---

۱۔ چودھری خلیق الزمان صاحب نے بھی اس واقعہ کا ذکر اپنی کتاب "پاتھ وے ٹو پاکستان" کے صفحہ ۲۵۵ پر کیا ہے۔

کمیٹی اور کونسل دونوں سے مستعفی ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی اُنھوں نے مسلم لیگ کے خلاف ذیل کی فرد قرار داد جرم بھی مرتب کی۔

۱۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر کا رویہ حد درجہ غیر آئینی ہے۔

۲۔ ورکنگ کمیٹی کو صدر کے فیصلے کی تائید کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اگر ورکنگ کمیٹی تائید نہ کرتی تو اِس کا مطلب یہ تھا کہ صدر کے خلاف گویا عدم اعتماد کا ریزولیشن پاس ہو جاتا اور ظاہر ہے ورکنگ کمیٹی اِس اقدام کے لئے تیار نہ تھی۔

۳۔ ورکنگ کمیٹی میں اکثریت اُن مسلمانوں کی ہے جو اقلیتی صوبوں کے رہنے والے ہیں انھیں بنگال اور پنجاب کے حالات کا علم نہیں۔ لہٰذا یہ لوگ بنگال اور پنجاب کے مفاد تباہ کر رہے ہیں۔

۴۔ جمہوریت اور اٹانومی کے اصولوں کو ایک فرد واحد کی بے لگام مرضی کے تحت رکھ دیا گیا ہے۔ اور یہ فرد واحد ایک مطلق العنان فرماں روا کی طرح بنگال کے سوا تین کروڑ مسلمانوں کا مالک بن بیٹھا ہے۔

میں مولوی فضل الحق صاحب کو خوب جانتا تھا۔ وہ مسلمانوں کے بے حد خیر خواہ اور ہمدرد بزرگ تھے۔ لیکن سراسر جذباتی آدمی ہونے کی وجہ سے بعض اوقات غلط فیصلے کر بیٹھتے تھے مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اگر اُن کو نرم اور ملائم الفاظ میں سمجھایا جائے تو بات اُن کی سمجھ میں آ جائے گی۔ میں نے اُن کو انگریزی میں خط لکھا جس میں اُن کی قومی خدمات کی بہت تعریف کی۔ اور عرض کیا کہ خدارا اپنا استعفاء واپس لے لیجئے۔

مولوی صاحب نے میرے عریضے کا جواب اپنے دست مبارک سے اُردو میں دیا جس کا بلاک نیچے درج کر رہا ہوں۔ تعجب ہے یہی مولوی فضل حق صاحب تھے، جنہوں نے پاکستان بننے کے بعد ڈھاکے میں اُردو کے خلاف ایجی ٹیشن کی۔ اور بنگلہ زبان کی حمایت میں وہ شور مچایا کہ بالآخر اِسی نزاع نے بنگلہ دیش کو پاکستان سے علیحدہ کر دیا۔ یہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ جب مذہب اور زبان کو سیاسی نعروں سے آلودہ کیا جائے گا تو مذہب کا تقدس اور زبان کی افادیت دونوں ختم ہو جائیں گے۔

از کلکتہ

محترمی زاد عنایتہ۔ سلام علیکم

آپکا عنایت نامہ موصول ہوا جسکو پڑھکر میں بھی کہہ سکتا ہوں إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔ مجھے جناب کی تحریر پڑھکر افسوس بھی ہوا اور حیرت بھی۔ شاید جناب نے میرے بیان کو بغور پڑھنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ سنیئے۔ میں مسلم لیگ کا ساہی ہوں جیسا کہ پہلے تھا آج بھی ہوں مگر مسلم لیگ کے رکن ہونے کہ یہ معنی نہیں ہیں کہ میری شخصی حیثیت باقی نہیں۔ مسلم لیگ میں رہنے سے یہ کبھی لازم نہیں آتا کہ کوئی اپنی ذاتی رائے کو بالکل قربان کر دے۔ بلکہ ملک ملت کی بہبودی کیلیئے اگر کوئی تجویز کسی کے ذہن میں آئے تو اسکو پیش کر دینا اسکیلیئے نہایت ضروری ہے اور فرض بھی ہے۔

آپ اُن مشکلات اور بربادیوں کا اندازہ ہرگز نہیں کر سکتے جو روز افزوں ھندو مسلم کشمکش کی وجہ سے ہمیں بنگال میں پیش آرہی ہیں۔ جسکا نتیجہ یہ ہے کہ ہم جو کچھ بھی بنگال کے مسلمانوں کیلیئے کرنا چاہتے ہیں نہیں کر سکتے۔ ہماری مشکلات اور دشواریوں کا صحیح احساس قائد اعظم مسٹر جناح کو بھی نہیں ہے۔ میں ۴ چار سال سے مسلم حقوق کیلیئے برابر لڑ رہا ہوں مگر اب تھک گیا ہوں۔ دوسرے یہ کہ مسلم لیگ اور ھندوؤں کی لامتناہی جنگ سے بجائے اسکے کہ ہمیں مسلمانوں کے جائز حقوق کا تحفظ کرنے میں کوئی مدد ملے اسکے برعکس ہماری مشکلات بڑھتی جاتی ہیں۔ مسلمانوں کی تنظیم کرنے میں مسلم لیگ کی خدمات قابل ستائش ہوسکتی ہیں لیکن آئے دن کے ھندو مسلم فسادات کا سدباب کرنے میں مسلم لیگ بالکل ناکامیاب رہی ہے۔ یہ کشمکش برابر بڑھتی ہی جاتی ہے اور گذشتہ چار سال میں مجھے یہ تجربہ ہوا ہے کہ اس جنگ سے بنگال کے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں ہو رہا ہے اور نہ آئندہ امید ہے بلکہ نقصان پہونچنے کا زیادہ احتمال ہے۔ اگر یہ احتمال خدا نخواستہ درست ہوا کہ تازہ مردم شماری میں بنگال کے مسلمان بجائے

اکثریت کے اقلیت میں رہ گئے ہیں (جسکا نہایت قوی اندیشہ ہے) تو جناب بنگال کے مسلمانوں کا مستقبل۔ تو قائد اعظم ہی سنوار سکینگے اور نہ فضل الحق۔

مجھے نہایت افسوس کیساتھ یہ لکھنا پڑتا ہے کہ ہمیں مردم شماری کے کام میں مسلم لیگ سے کچھ بھی مدد نہیں ملی۔ میں نے تن تنہا ھندوؤں کی نہایت منظم کوششوں کا مقابلہ کیا۔ اور اب بھی جسطرح بن پڑتا ہے کر رہا ہوں۔

مسٹر جناح قائد اعظم ہیں۔ مگر میں یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ انکے سوا کسی مسلمان کے دلمیں مسلمانوں کا درد نہیں ہے یا انکے سوا کسی کو قومی اور ملکی معاملات میں اپنی رائے کے اظہار کرنے کا حق نہیں ہے۔ بہرحال چار پانچ سال کی مسلسل اور بے نتیجہ جنگ کے بعد اب ہمارا یہ فرض ہے وہ طریقہ اختیار کریں جس سے اشتی کا قائم بھی ہو اور مسلمانوں کے واجبی حقوق کا تحفظ بھی ہو سکے۔ چونکہ ظاہر ہے کہ اس خانہ جنگی کیوجہ سے ہم مسلمانان ھند کی فلاح اور بہبود کیلئے کوئی تعمیری کام نہیں کر سکتے۔ زیادہ آداب۔

آپکا نیازمند

فضل الحق

Yours sincerely

A.K. Fazlul Huq

چھٹا باب

# لاہور کا ضمنی انتخاب

۱۹۳۷ء کے الیکشن میں شہر لاہور سے خالد لطیف گابا پنجاب اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۴۱ء میں انہیں بعض قانونی وجوہ سے، جن کا ذکر اِس وقت کرنا ضروری نہیں، پنجاب اسمبلی کی رُکنیت سے برطرف کر دیا گیا۔ اور لاہور کی سیٹ خالی ہو گئی۔ اب سوال یہ تھا کہ پنجاب کے دارُالسلطنت سے، جو صوبے بھر میں مسلمانوں کا سب سے بڑا مرکز تھا، کس کو کھڑا کیا جائے۔ ۱۹۳۷ء کے الیکشن میں خالد لطیف گابا کے مقابلے میں دو امیدوار تھے۔ ایک خلیفہ شجاع الدین جو مُسلم لیگ اور دوسرے خاں بہادر میاں امیر الدین جو یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تھے۔ سر سکندر حیات خاں اور نواب صاحب ممدوٹ کی خواہش تھی کہ اس مرتبہ بھی میاں امیر الدین کو ٹکٹ دیا جائے۔ میاں صاحب کا بظاہر سب سے بڑا استحقاق یہ تھا کہ وہ شہر کے رئیسوں میں شمار ہوتے تھے۔ لیکن دقّت یہ تھی کہ سیاسی جماعتوں میں کسی امیدوار کو ٹکٹ دیتے وقت یہ نہیں دیکھا جاتا کہ رئیس کون ہے اور غریب کون۔ دیکھا صرف یہ جاتا ہے کہ جماعت کے ساتھ کس کی وابستگی نسبتاً زیادہ مُحکم ہے۔ میاں صاحب لاہور کے سب رجسٹرار تھے۔ اور آپ اِس نیم سرکاری عہدے کی بناء پر سراسر حکومت ہی کے آدمی تھے۔ یوں بھی اُن کی پوری زندگی حکومت ہی کی خوشنودی، رضاجوئی اور متابعت میں گزری تھی۔

گزشتہ ایک سال سے پنجاب مُسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے جواں ہمت و جواں سال طلبہ نے صوبے بھر میں مسلم لیگ کا پیغام پھیلانے میں جس مستعدی و سرگرمی کا ثبوت دیا تھا، اُس کا احساس خود قائداعظم کو بھی تھا۔ اپریل ۱۹۴۱ء اور جولائی ۱۹۴۱ء میں دوبار یہ طلبہ اپنی کوشش سے پاکستان کانفرنس منعقد کر چکے تھے۔ پہلی بار لاہور اور دوسری بار لائل پور میں۔ حقیقت یہ ہے کہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ تو بالکل ایک مُردہ جماعت بن گئی تھی۔ لیگ کا سارا کام یہ سٹوڈنٹس فیڈریشن کر رہی تھی۔ مولوی عبدالستار نیازی اِس فیڈریشن کے بڑے باہمت اور پرجوش کارکن تھے۔ اُن کا

وطنِ مالوف میانوالی تھا۔ لیکن مقیم لاہور میں تھے۔ اگرچہ شہرلاہور میں اُن کے خاندانی تعلقات اور مراسم بالکل نہیں تھے۔ تاہم مسلم لیگ کو اب شہری مسلمانوں میں اتنی مقبولیت حاصل ہو چکی تھی کہ اُس کے ٹکٹ پر جس شخص کو کھڑا کر دیا جاتا کامیابی کا پختہ امکان تھا۔ ہماری خواہش تھی کہ خان بہادر میاں امیرالدین کے مقابلے میں نیازی صاحب کو مسلم لیگ کا ٹکٹ دیا جائے۔

معاملہ قائداعظم تک پہنچا، جنہوں نے میاں امیرالدین کے بارے میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اور تار کے ذریعہ سے جواب دیا کہ میں نے الیکشن میں دخل دینے سے انکار کر دیا ہے لیکن امیرالدین کو میں منظور نہیں کرتا[1] غرضیکہ یہ الیکشن بھی دونوں فریقوں میں باہمی نزاع کا باعث بن گئی۔ ایک طرف سر سکندر۔ نواب ممدوٹ، اور یونینسٹ پارٹی کے رہنما تھے۔ دوسری طرف پنجاب کے پرانے مسلم لیگی کارکن تھے۔ اس سلسلہ میں ملک برکت علی نے ۱۱۔ ستمبر ۱۹۴۱ء کو ذیل کا بیان لاہور کے انگریزی روزنامہ ٹربیون میں چھپوایا۔ جس سے صورت حال پر مکمل روشنی پڑتی ہے۔

"میں کل رات ڈلہوزی سے واپس آیا ہوں۔ اور میری توجہ نواب صاحب ممدوٹ کے اِس بیان کی طرف مبذول کرائی گئی ہے جو ۳۔ ستمبر کو ٹربیون میں شائع ہوا تھا۔ نواب صاحب نے اِس بیان میں شکایت کی ہے کہ اُن کی درخواست کے باوجود میں نے اُن کو مسٹر جناح کا وہ تار نہیں دکھایا جو ۳۰۔ اگست ۱۹۴۱ء کو مجھے موصول ہوا تھا۔ اور جس میں مسٹر جناح نے لکھا تھا کہ وہ میاں امیرالدین کو منظور نہیں کرتے۔ نواب صاحب کے بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ میں نے اس طرح گویا اُن کی شان میں گستاخی کا ارتکاب کیا ہے۔ یہ تأثر رفع کرنے کے لئے میں اصل واقعات بیان کرتا ہوں۔

میں ۱۷۔ اگست کو ڈلہوزی میں تھا جب نواب صاحب ممدوٹ نے پنجاب مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس اپنے دولت کدے پر واقع ڈیوس روڈ پر کیا تاکہ شہرلاہور کے ضمنی انتخاب کے لئے مسلم لیگ کا امیدوار نامزد کیا جا سکے۔ ۱۹۔ اگست کو میں ڈلہوزی سے واپس آیا۔ ۲۰۔ اگست کو مولوی، عبدالستار نیازی مجھ سے ملے جنہوں نے مسلم لیگ کی بڑی خدمت کی

[1] 'sed to interfere. I do not approve Amiruddin

ہے۔ نیازی صاحب نے مُجھ کو مسٹر جناح کا تار دکھایا کہ ازبسکہ شہر لاہور سے امیدوار کھڑا کرنے کا معاملہ بدستور زیرِ غور ہے۔ اور ابھی تک کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہوا۔ آپ چاہیں تو اپنے کاغذات نامزدگی داخل کر سکتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ اپنے کاغذات نامزدگی داخل کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ پنجاب مسلم لیگ نے اگرچہ میاں امیرالدین کو اپنا امیدوار نامزد کر لیا ہے، لیکن نواب صاحب کو مسٹر جناح کا ایک تار موصول ہوا ہے کہ اس ضمن میں فی الحال کوئی فیصلہ نہ کیا جائے۔ اور نہ کسی قسم کا اعلان ہونا چاہئے۔ نیازی صاحب نے مجھ سے امداد کی درخواست کی تو مَیں نے صاف عرض کیا کہ اصولاً مَیں یہ پسند نہیں کرتا کہ لیگ کا ٹکٹ ایک ایسے شخص کو دیا جائے جو سب رجسٹرار کی حیثیت سے نیم سرکاری ملازم ہے۔ مَیں بمبئی جارہا ہوں۔ اور مسٹر جناح سے مل کر آپ کی سفارش کروں گا۔

اگلے روز مَیں بمبئی روانہ ہو گیا۔ اور ۲۳۔ اگست کی شام کو مسٹر جناح سے ملاقات ہوئی تو مَیں نے مولوی عبدالستار نیازی کی پُرزور سفارش کی۔ اور اُن کی خدمات کا بھی ذکر کیا۔ مسٹر جناح نے بتایا کہ اسی صبح نواب ممدوٹ بھی اُن سے ملنے آئے تھے۔ اور میاں امیرالدین کی زبردست سفارش کرتے تھے۔ مسٹر جناح چونکہ ۲۴۔ اگست کو سخت مصروف تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ ۲۵۔ اگست کو اِس مسئلے پر غور کریں گے۔ ۲۵۔ اگست کو نواب ممدوٹ اور مَیں دونوں مسٹر جناح سے ملے۔ مسٹر جناح نے نواب صاحب سے کہا کہ وہ ہرگز پسند نہیں کرتے کہ ایک سب رجسٹرار کو مسلم لیگ کا ٹکٹ دیا جائے۔ یہ ٹکٹ مولوی عبدالستار نیازی کو ملنا چاہئے۔ جنہوں نے مُسلم لیگ کی بہت خدمت کی ہے۔ اور جو نہایت مخلص نوجوان ہیں۔ نواب صاحب نے مسٹر نیازی کے چال چلن (کیریکٹر) کے بارے میں کچھ شکوک و شبہات ظاہر کئے تو مسٹر جناح نے فرمایا کہ آپ واپس لاہور جا کر مزید تحقیق کیجئے۔ اور اگر مسٹر نیازی کا دامن ہر قسم کے الزام سے پاک ہے تو انہیں لیگ کا امیدوار نامزد کر دیجئے۔ اور اگر اُن کا دامن پاک نہیں اور جن شکوک کا اظہار آپ نے کیا ہے وہ صحیح ہے تو پھر آپ جو

چاہیں کریں۔ مَیں دخل نہیں دوں گا۔ اگرچہ ذاتی طور پر میں میاں امیرالدین کو منظور نہیں کرتا۔

میرا خیال تھا کہ قائداعظم کے اِس حتمی اور غیر مشتبہ مشورے کے بعد نواب صاحب واپس لاہور جاکر مسٹر نیازی کے چال چلن (کیریکٹر) کے بارے میں مزید تحقیقات کریں گے۔ اور پنجاب مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بلاکر مسٹر جناح کی مذکورہ بالارائے کی روشنی میں کوئی قدم اٹھائیں گے۔ لیکن اُنھوں نے اِس ضمن میں کچھ نہیں کیا۔ سوائے اس کے کہ ۳۰۔اگست ۱۹۴۱ء کے ٹریبون میں ایک بیان داغ دیا کہ مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ نے مسٹر جناح کی منظوری سے میاں امیرالدین کو ضمنی انتخاب کا ٹکٹ دے دیا ہے۔

نواب صاحب کا یہ بیان پڑھ کر میں دم بخود رہ گیا۔ کیونکہ مسٹر جناح نے ہرگز کوئی منظوری نہیں دی تھی۔ چنانچہ میں نے اسی وقت مسٹر جناح کو ذیل کا تار دیا:۔

"نواب ممدوٹ نے آج اعلان کیا ہے کہ آپ کی منظوری سے امیرالدین کو مسلم لیگ کا ٹکٹ دے دیا گیا ہے۔ بمبئی سے واپس آکر مَیں نے عبدالستار نیازی کو بتایا تھا کہ آپ نے نواب صاحب سے کہا ہے کہ نیازی کے کیریکٹر کے بارے میں مزید تحقیق کریں۔ اور اگر کوئی بات قابل اعتراض ثابت نہ ہو تو انہیں ٹکٹ عطا کیا جائے ورنہ آپ الیکشن میں دخل نہیں دیں گے۔ نواب صاحب کا یہ بیان نیازی کے لئے سخت نقصان کا باعث ہے۔ مہربانی فرماکر وضاحت کیجئے کہ آپ نے امیرالدین کو منظوری عطا کی ہے"۔

اسی دن مسٹر جناح نے تار کا جواب دیا جو آدھی رات کو مجھے ملا۔ تار میں مسٹر جناح نے لکھا کہ میں نے دخل دینے سے انکار کر دیا ہے۔ میں امیرالدین کو منظور نہیں کرتا۔ یہ تار مَیں نے متعدد اصحاب کو دکھایا۔ یکم ستمبر کو روزنامہ ٹریبون میں اس تار کا یہ فقرہ کہ مَیں امیرالدین کو منظور نہیں کرتا چھپ گیا تھا۔ جونہی یہ الفاظ شائع ہوئے۔ نواب صاحب ممدوٹ نے ساڑھے نو بجے صبح مجھ سے ٹیلی فون پر استفسار کیا کہ آیا کہ اس مضمون

کا تار آپ کو موصول ہوا ہے۔ میں نے اثبات میں جواب دیا تو نواب
صاحب نے فرمایا کہ وہ تار مجھ کو بھیج دیجئے۔ میں چونکہ ہائی کورٹ جانے
کے لئے اپنی کار میں سوار ہو رہا تھا۔ نواب صاحب سے میں نے عرض کیا
کہ اس وقت میں آپ کی خدمت میں تار نہیں بھیج سکتا۔ پھر کسی وقت منگوا
لیجئے گا۔ نواب صاحب نے کہا کہ وہ چار بجے اپنا ملازم بھیجیں گے۔ میں
نے عرض کیا کہ میں اصل تار آپ کے ملازم کو دے دوں گا۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے نواب صاحب کا کوئی ملازم اس دن میرے مکان پر
نہیں آیا۔ اور شام کو میں ڈلہوزی چلا گیا۔ آج وہاں سے واپس آیا ہوں تو میرے منشی
نے بتایا ہے کہ میری غیر حاضری میں نواب صاحب کا ملازم ایک بند لفافہ میرے
خانساماں کو دے گیا تھا۔ اور خانساماں وہ لفافہ مجھے دینا بھول گیا تھا۔ رات کو جب میں
موٹر میں سوار ہو کر ریلوے سٹیشن جا چکا تھا تو نواب صاحب کا ملازم پھر آیا اور وہ بند
لفافہ واپس لے گیا۔ یہ ہے اصل سرگزشت کہ نواب صاحب کو مسٹر جناح کا تار کیم
ستمبر کو کیوں نہ مل سکا۔ اگر نواب صاحب نجی طور پر مجھ سے پوچھتے کہ میں نے تار ان
کو کیوں نہیں بھیجا تو میں پورا واقعہ عرض کر دیتا۔ لیکن از بسکہ انہوں نے اخبار میں شکوہ
و شکایت کا دفتر کھولنا پسند فرمایا ہے۔ میں نے جواب اخبار ہی میں شائع کرنا مناسب
خیال کیا۔ میں نواب صاحب کو یقین دلاتا ہوں کہ جو کچھ ہوا ہے اس سے حاشا و کلا ان
کی توہین یا کسی قسم کا سوءِ ادب مقصود نہیں۔ میں نے تو ٹیلی فون ہی پر ان سے عرض
کر دیا تھا کہ جس طرح اور احباب مسٹر جناح کا تار دیکھ چکے ہیں۔ آپ کو بھی یہ تار
دکھانے میں مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے"۔

بالآخر پنجاب مسلم لیگ نے شہر لاہور کے اس ضمنی انتخاب میں میاں امیرالدین کو ٹکٹ دے
دیا۔ اور وہ بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔ ظاہر ہے اس مسلم لیگ سے جس کی سرپرستی سر سکندر حیات
خاں کر رہے تھے۔ سوائے اس کے اور کیا توقع ہو سکتی تھی کہ ایک ایک کر کے تمام پرانے
یونینسٹوں کو چور دروازے سے مسلم لیگ میں داخل کرنا شروع کر دے۔ اور یوں اس قومی
تحریک کو تباہ کر دے۔ جس کی بنیادیں عوام کی بیداری پر رکھی گئی تھیں۔

فروری ۱۹۴۲ء میں پھلور۔ ضلع جالندھر کے مسلمانوں نے اپنے ہاں ایک پاکستان کانفرنس
منعقد کرنے کا اہتمام کیا اور ملک برکت علی سے صدارت کی درخواست کی۔ ملک صاحب نے

ازراہ کرم اِس اعزاز کے لئے میرا نام تجویز کر دیا۔ چنانچہ کانفرنس کے منتظمین میرے پاس آئے اور مجھے حامی بھرنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ ۲۰۔ فروری کی تاریخ کانفرنس کے انعقاد کے لئے مقرر ہو گئی۔

میں ۲۰۔ فروری کی صبح کو پھلور پہنچا۔ بہت بڑا شامیانہ لگایا جا چکا تھا۔ اور ہزاروں کی تعداد میں لوگ کھنچے چلے آرہے تھے۔ افتتاح نماز مغرب کے بعد کیا جانے والا تھا۔ صدر کا جلوس نکالنے کی بھی تیاری کی گئی تھی۔ لیکن مَیں نے جلوس سے انکار کر دیا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد یکایک جالندھر کے ڈپٹی کمشنر صاحب تشریف لائے اور فرمایا کہ حکومت پنجاب کے خاص احکام کے تحت جو ۱۹۔ فروری ۱۹۴۲ء کو دِن کے دو بجے موصول ہوئے ہیں۔ آپ لوگ کانفرنس نہیں کر سکتے۔ مَیں نے عرض کیا کہ پنجاب کے وزیرِاعظم صاحب آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر ہیں اور ۲۳۔ مارچ ۱۹۴۰ء کو قرار دادِ پاکستان ان کی موجودگی میں لیگ کے سالانہ اجلاس نے منظور کی تھی۔ وہ اصولاً اور اخلاقاً کانفرنس کا اجلاس روک نہیں سکتے۔ لیکن ڈپٹی کمشنر صاحب چونکہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بھی تھے۔ وہ کوئی بات سننے کو تیار نہ تھے۔ بالآخر ردّ و کد کے بعد وہ ذیل کی شرائط کے تحت کانفرنس کے انعقاد پر رضا مند ہوئے۔

۱) پاکستان کے موضوع پر بحث نہیں ہوگی۔

۲) آل انڈیا مسلم لیگ کی قرار دادِ لاہور کا ذکر نہیں کیا جائے گا۔

۳) اس بات کا ذکر نہیں کیا جائے گا کہ ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں۔ لہٰذا جن صوبوں میں مُسلمانوں کی اکثریّت ہے اُنہیں ہندوستان کے مرکز سے علیحدگی کا حق حاصل ہے۔

ظاہر ہے اِن شرائط کے تحت کانفرنس کا انعقاد بالکل بے معنی بات تھی۔ چنانچہ کانفرنس نہ ہو سکی۔ ڈپٹی کمشنر صاحب نے یہ بھی بتایا کہ پچھلے مہینے رفاقت کمیٹی کے لیڈر علامہ علاء الدین صدیقی لاہور سے تشریف لائے تھے۔ جنہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ قومیت اور یگانگت پر نہایت اچھی تقریریں کی تھیں۔ جو فضا وہ اپنی خوش بیانی سے پیدا کر گئے ہیں، مَیں اُس کو آپ کی پاکستان کانفرنس سے خراب نہیں کرنا چاہتا۔

لاہور آکر مَیں نے یہ واقعہ ملک صاحب کو سنایا تو اُنہوں نے فرمایا کہ قائداعظم کو خط لکھو۔ چنانچہ مَیں نے یکم مارچ ۱۹۴۲ء کو ذیل کا خط قائداعظم کی خدمت میں لکھا۔

”ڈیئر قائداعظم۔ یہ عریضہ آپ کو صرف اِس امر سے آگاہ کرنے کے لئے لکھ رہا ہوں کہ مُسئلہ پاکستان کی وجہ سے پنجاب میں بہت نازک

صورت پیدا ہو گئی ہے۔ پھلور، ضلع جالندھر کے مسلمانوں نے ۲۰۔ فروری ۱۹۴۲ء کو پاکستان کانفرنس منعقد کرنے کا اہتمام کیا تھا۔ اور مجھے اُس کا صدر منتخب کیا گیا تھا۔ اس تاریخ یعنی ۲۰۔ فروری کو جالندھر کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پھلور تشریف لائے اور مجھے اور مجلس استقبالیہ کے ارکان کو حکم دیا کہ حکومت پنجاب کی خاص ہدایات کے تحت جو ۱۹۔ فروری کو دن کے دو بجے موصول ہوئی ہیں۔ کانفرنس کا انعقاد روک دیا گیا ہے۔ یہ بھی کہا کہ صرف ذیل کی شرائط کے تحت کانفرنس ہو سکتی ہے۔

۱) پاکستان کے موضوع پر بحث نہیں ہو گی۔

۲) آل انڈیا مسلم لیگ کی قراردادِ لاہور کا ذکر نہیں کیا جائے گا۔

۳) اِس بات کا ذکر نہیں کیا جائے گا کہ ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں۔ لہٰذا جن صوبوں میں مُسلمانوں کی اکثریت ہے اُنہیں ہندوستان کے مرکز سے علیحدگی کا حق حاصل ہے۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا یہ حکم حد درجہ قابل اعتراض ہے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ یہ حکم ایک ایسی حکومت نے صادر کیا ہے جس کے سربراہ صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی ہیں۔ ہم متعدد بار آپ کی خدمت میں عرض کر چکے ہیں کہ سر سکندر کا واحد مقصد مسلم لیگ میں شریک ہونے سے یہ تھا کہ پنجاب مسلم لیگ کو کلیتہً اپنے قبضے میں لے کر کچل دیں۔ چنانچہ وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے اور لیگ اِس صوبے میں معطل ہو کر رہ گئی۔ لیکن جس تحریک کے برگ و بار پیدا ہو چکے تھے، اور جو آندھی کی سی تیزی سے پھیلتی جا رہی تھی، اُس کو دبانا سر سکندر کے بس میں نہیں تھا۔ چنانچہ صوبائی لیگ کے تعطل کے باوجود عوام نے اِس پیغام کو بڑی گرم جوشی سے خوش آمدید کہا جو آپ نے قوم کو دیا تھا۔

سر سکندر حیات خاں نے حال ہی میں اکالی پارٹی سے سمجھوتہ کیا ہے۔ جس کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ پاکستان کی حمایت اور مخالفت میں ہر قسم کے جلسے بند کر دیئے جائیں گے۔ اِس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ روایت کہاں تک درست ہے۔ تاہم پھلور میں جو کچھ ہوا ہے اس سے تو

یہی ظاہر ہے کہ یہ بیان صحیح ہے۔
ہم نے محض اس خیال سے اب تک پنجاب مسلم لیگ کے معاملات میں دخل دینے سے اجتناب کیا ہے کہ لیگ سر سکندر کے اُن حاشیہ برداروں کے قبضے میں ہے۔ جو سر سکندر کی ایک خشمگیں نگاہ کی تاب لانے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ لیکن پھلور کا واقعہ تو ناقابل برداشت ہے۔ سوال یہ ہے کہ اسمبلی کے وہ مسلمان ممبر جنہیں سر سکندر نے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر شہری حلقوں سے منتخب کروایا تھا۔ اگرچہ اس ٹکٹ کے بغیر اُن کا منتخب ہونا بالکل ناممکن تھا، کیا حکومت پنجاب کے اِس حکم پر احتجاج کریں گے؟

یہاں لوگ غصے سے بے تاب ہو رہے ہیں۔ غالباً اِس واقعہ کی تفصیلات بہت سے لوگوں نے آپ کو لکھ کر بھیجی بھی ہیں۔ امید ہے آپ جلد توجہ فرمائیں گے۔ اِس قسم کے واقعات کا سدِباب کرنے کے لئے ہم کوئی تجویز پیش نہیں کر سکتے۔ بجز اس کے کہ جو قدم آپ مناسب خیال فرماتے ہیں اٹھایئے۔ بظاہر سر سکندر کا مسلم لیگ میں رہنے کا اب کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ پنجاب اسمبلی کے جو مسلمان ممبر اپنے آپ کو مسلم لیگی کہتے ہیں، اُنہیں حکم دیجئے کہ فوراً مسلم لیگ پارٹی قائم کریں۔ مصیبت یہ ہے کہ اگر آپ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے صدر سے دریافت فرمائیں گے تو وہ یقیناً یہی کہیں گے کہ اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی موجود ہے۔ حالانکہ یہ قطعاً غلط ہے۔ اگر پنجاب میں کسی مسلم لیگ کا وجود ہوتا تو پھلور کے حالیہ واقعات کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوتی اور متعدد قرار دادیں منظور کی جاتیں۔ صورت حال یہ ہے کہ آپ حکم بھی دیں گے تو پراونشل مسلم لیگ اس نوع کی قرار داد منظور کرنے کو تیار نہیں۔ ہم لوگ تو آپ کے خادم ہیں اور آپ کے ہر ارشاد کو واجب التعمیل سمجھتے ہیں۔ لیکن خدارا یونینسٹ پارٹی کا یہ ڈھونگ ختم کیجئے۔ کچھ عرصہ ہوا پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے چند مسلمان ممبروں نے اس قسم کی تحریک کی تھی کہ اسمبلی کے ایوان میں مسلم لیگ پارٹی قائم کی جائے۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ وجہ یہ ہے کہ لوگوں کا عام خیال ہے کہ سر سکندر کو آپ کی امداد و اعانت

حاصل ہے۔ اور جب تک آپ کوشش نہیں کرتے مسلم لیگ کا قیام محال ہے۔ پروانشل مسلم لیگ پر سر سکندر کا قبضہ ہے ظاہر ہے وہ اِس نوع کی مسلم لیگ پارٹی کو خلاف آئین قرار دے کر اُسی وقت ختم کر دیں گے۔ چنانچہ انہی خیالات کے پیش نظر یہ تجویز منڈھے نہ چڑھ سکی۔

اس عریضے کا مقصد صرف یہ ہے کہ آپ کو حالات سے باخبر کیا جائے۔ مسلمانوں کو آپ پر مکمل اعتماد ہے۔ اور اُنہیں یقین ہے کہ جس چیز کو آپ مناسب اور صحیح سمجھتے ہیں وہی کریں گے۔ یہاں کے مقامی احباب سے ہم نے کہہ دیا ہے کہ ہم اپنے طور پر کچھ نہیں کر سکتے جو حکم آپ دیں گے اُس کی تعمیل کی جائے گی۔

آپ کا نیاز مند

عاشق حسین بٹالوی [1]

---

۱۔ انگریزی کا اصل خط کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ درج ہے۔

ساتواں باب

# کرپس کی تجاویز

سر سٹیفرڈ کرپس ۲۴۔مارچ ۱۹۴۲ء کو لندن سے ہندوستان پہنچے اور اپنے ساتھ برطانوی کیبنٹ کا ایک نیا فارمولا لائے. جس کے مطابق جنگ ختم ہونے پر ہندوستان کو ڈومینین سٹیٹس مل سکتا تھا۔ اس فارمولے کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(الف) جنگ ختم ہونے کے بعد ایک دستور ساز اسمبلی منتخب کی جائے گی. جس کا فرض ہو گا کہ ہندوستان کے لئے نیا آئین وضع کرے۔

(ب) ریاستوں کو اس دستور ساز اسمبلی میں شریک کرنے کے لئے بعض قواعد مرتب کئے جائیں گے۔

(ج) ملک معظم کی حکومت اس بات کا ذمہ لیتی ہے کہ جو آئین دستور ساز اسمبلی وضع کرے گی اُسے فی الفور منظور کر لیا جائے گا۔

شرائط

۱. اگر برطانوی ہند کا کوئی صوبہ یہ نیا آئین قبول کرنے سے انکار کرے تو اسے اپنی موجودہ آئینی حیثیت برقرار رکھنے کا حق حاصل ہے۔ بعدازاں کسی وقت اگر یہی صوبہ ڈومینین میں شامل ہونے کی خواہش کرے تو شامل ہو سکتا ہے۔

اگر ایک سے زیادہ صوبے مجوزہ ڈومینین میں شامل ہونے سے انکار کریں تو ملکِ معظم کی حکومت انہیں مجموعی طور پر الگ ڈومینین تسلیم کرنے کو تیار ہو گی اور طریق کار وہی ہو گا جو پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

۲. ملکِ معظم کی حکومت اور دستور ساز اسمبلی میں جس معاہدے پر فریقین کے دستخط ہوں گے وہ اُن تمام امور پر حاوی ہو گا جو برطانوی حکومت سے ہندوستان کو اقتدار منتقل کرنے پر پیدا ہوں

گے۔ ازاں جملہ ملکِ معظم کی حکومت نے ہندوستان کی مذہبی اور نسلی اقلیتوں کی حفاظت کا جو وعدہ کر رکھا ہے حکومت اس کی پاسداری کرے گی، تاہم ہندوستان کو اِس بات کی مستقبل میں پوری آزادی ہو گی کہ برطانوی دولت مشترکہ کے دیگر ممالک سے جس قسم کے تعلقات چاہے قائم کرے۔ برطانیہ کوئی مداخلت نہیں کرے گا۔

۳. دستور ساز اسمبلی ذیل کے طریقے سے مرتب کی جائے گی۔

جنگ ختم ہونے کے بعد جب تمام صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے نتائج بر آمد ہوں گے تو ان اسمبلیوں کے ممبر دستور ساز اسمبلی کے ممبر منتخب کریں گے جن کی مجموعی تعداد تمام اسمبلیوں کے ممبروں کی $\frac{1}{10}$ سے زیادہ نہیں ہو گی۔ ریاستوں کے نمائندے ریاستوں کی آبادی کے تناسب سے منتخب کئے جائیں گے۔

۴. جب تک نیا آئین وضع نہیں ہوتا موجودہ نازک حالات کے پیش نظر ملک معظم کی حکومت کا یہ فرض ہے کہ ہندوستان کی حفاظت کرے کیونکہ اس کا تعلق بھی عالمگیر جنگ سے ہے لیکن ہندوستان کے عسکری، اخلاقی اور مادی وسائل کو مرتب و منظم کرنا حکومت ہند کا فرض ہے. جسے وہ اہل ہند کے اشتراک و تعاون سے پورا کرے گی۔ ملکِ معظم کی حکومت چاہتی ہے کہ ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں کے لیڈر اپنے ملک، دولت مشترکہ اور اقوام متحدہ کے مشوروں میں شرکت کریں۔ اِس طرح وہ اُس کام کی تکمیل میں جو ہندوستان کی آئندہ آزادی کے لئے بے حد ضروری ہے. تعمیری حصہ لے سکیں گے۔

مُسلم لیگی نقطہ نگاہ سے سر سٹیفرڈ کرپس کی یہ تجاویز نہایت مناسب اور بر محل تھیں۔ جن میں پاکستان کا مجمل سا خاکہ بھی موجود تھا۔ مثلاً جو صوبے ہندوستان کے ڈومینین میں شامل ہونے سے انکار کریں، انہیں ایک علیحدہ ڈومینین کی شکل دے دی جائے۔ مسلم لیگ کے اکثر لیڈر کرپس کی تجاویز کے حامی تھے لیکن دقت یہ تھی کہ کانگرس ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت ہونے کے باعث اگر اِنہیں مسترد کر دیتی تو ہمارا قبول کرنا کس کام آ سکتا تھا۔ اِس صورت میں وہی اُلجھن پیش آتی جو ۱۹۴۶ء میں کیبنٹ مشن کی قلیل المیعاد سکیم کے سلسلے میں رونما ہوئی تھی۔ مسلم لیگ نے یہ سکیم منظور کر لی تھی لیکن کانگرس نے مسترد کر دی تھی۔ ظاہر ہے جس حکومت میں ہندوستان کی پچہتر فیصد آبادی کے نمائندے شامل نہ ہوں، وہ کتنے دن قائم رہ سکتی تھی۔ چنانچہ وائسرائے نے مسلم لیگ کی آمادگی کے باوجود عبوری دور کے لئے اپنی کابینہ مرتب کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

کانگرس نے ۱۱- اپریل کو کرپس کا یہ نیا فارمولا مُسترد کر دیا۔ عُذر یہ پیش کیا کہ:

(الف) ہندوستان کی آزادی فوراً تسلیم نہیں کی گئی۔ ڈومینین کا درجہ فوراً عطا کر دینا چاہئے۔ وزیر ہند (سیکرٹری آف سٹیٹ) کا عہدہ منسوخ کر دیا جائے۔ وائسرائے کا منصب ایک آئینی حکمران کا ہونا چاہئے جہاں وہ اپنی کابینہ کی رائے کا پابند ہو۔

(ب) ریاستوں کے نو کروڑ باشندوں کو اُن کے جائز حقوق دینے کی بجائے اُن کی نمائندگی والیان ریاست پر ڈال دی گئی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دستور ساز اسمبلی میں ریاستوں کے باشندے شریک کئے جائیں گے لیکن انہیں اپنے نمائندے منتخب کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی بلکہ والیان ریاست کو نامزدگی کا اختیار عطا کیا گیا ہے جو سراسر جمہوری اصولوں کے خلاف ہے۔

(ج) بعض صوبوں کو یہ قابل اعتراض حق دیا گیا ہے کہ وہ ہندوستان کی مجوزہ یونین سے علیحدہ ہو سکتے ہیں۔ یہ فعل ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔

(د) ڈیفنس کا محکمہ یوں بھی حکومت کا بہت اہم صیغہ سمجھا جاتا ہے لیکن جنگ کی موجودہ حالت میں تو یہ ایک ایسا ہمہ گیر محکمہ ہے جس کے تحت حکومت کا ہر شعبہ آ جاتا ہے۔ کرپس کی تجاویز میں اس محکمے کو ہمارے حیطۂ اختیار سے باہر رکھ کر گویا عوامی حکومت کو بے جان کر دیا گیا ہے۔

اگلے روز یعنی ۱۱۔اپریل کو مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے بھی کرپس کی تجاویز مسترد کر دیں اور وجہ یہ بیان کی کہ:-

(الف) اگرچہ بعض صوبوں کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ چاہیں تو مجوزہ یونین میں شریک ہونے سے انکار کر دیں لیکن پورے ہندوستان کی واحد یونین تسلیم کر کے قیامِ پاکستان کو منظور نہیں کیا گیا۔

(ب) مُسلم لیگ اس قسم کی دستور ساز اسمبلی کو قبول نہیں کرے گی جس کے نمائندے جداگانہ انتخاب کے تحت منتخب نہیں کئے جاتے اور جہاں ہر فیصلہ اکثریت کی رائے سے ہو گا۔

عالمگیر جنگ اب ایک ایسے نازک مرحلے پر پہنچ گئی تھی کہ عین اس وقت جب دہلی میں سر سٹیفرڈ کرپس اپنی تجاویز پر مسلم لیگ اور کانگرس کے لیڈروں سے گفت و شنید کر رہے تھے۔ کولمبو، مدراس اور جزائر انڈمان پر جاپان کے ہوائی جہاز بم گرا رہے تھے۔ جب سے برطانیہ کا ہندوستان پر قبضہ ہوا تھا، یہ پہلا موقع تھا کہ کسی بیرونی غنیم نے اس ملک کے ساحل پر زبردست گولہ باری کی تھی۔ سنگاپور اور برما پر جاپان کا قبضہ ہو گیا تھا۔ بنگال کے دروازے پر جاپانی فوجیں دستک دے رہی تھیں اور عام خیال یہ تھا کہ ہندوستان پر عنقریب جاپان قابض ہو جائے گا۔ اس حالت میں کانگرسی لیڈروں کا خیال تھا کہ برطانوی سلطنت کا جنازہ نکل رہا ہے۔ ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ایک ایسے فریق کے ساتھ سمجھوتہ کریں جس کا اپنا دیوالہ پٹنے والا ہے۔ چنانچہ گاندھی جی نے

اس صورت حال کو اپنے اِس مشہور فقرے میں بیان کیا تھا کہ کرپس کی تجاویز ایک ایسا چیک ہے جس پر مُستقبل کی تاریخ درج ہے اور اُس بنک کے نام جاری کیا گیا ہے جس کا دیوالیہ نکل رہا ہے۔

سر سٹیفرڈ کرپس اور کانگرس کے مذاکرات جاری تھے کہ امریکی صدر روز ویلٹ نے پنڈت نہرو کو امریکہ آنے کی دعوت دی کہ اُن سے تبادلۂ خیال کر کے اور اپنے اثر و رسوخ سے ہندوستان میں نیشنل گورنمنٹ کے قیام کی کوشش کریں لیکن نہرو نہ جا سکے۔

کانگرس میں صرف راج گوپال اچاری کرپس کی تجاویز کے حامی تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ بلا توقف ہندوستان میں ایک ایسی نیشنل گورنمنٹ قائم ہونی چاہئے جس میں بڑی بڑی سیاسی پارٹیوں کے نمائندے شریک ہوں۔ انہوں نے کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے ریزولیوشن سے اختلاف بھی کیا تھا لیکن شنوائی نہ ہو سکی۔

سکھوں نے جب دیکھا کہ کرپس نے بعض صوبوں کو اختیار دے دیا ہے کہ چاہیں تو ہندوستان کی یونین میں شریک ہونے سے انکار کر دیں تو انہیں سب سے زیادہ فکر پنجاب کی ہوئی۔ چنانچہ سکھ نیشنل لیگ نے اِس ضمن میں جو قرار داد منظور کی اُس کے الفاظ یہ تھے۔

"اگر پنجاب نے ہندوستان کی یونین سے الگ ہونے کی کوشش کی تو ہم اِس اقدام کی اِنتہائی مخالفت کریں گے۔ کسی صوبے کو اگر محض اکثریت تعداد رکھنے والی قوم کے ووٹ سے علیحدگی کا حق دیا جا سکتا ہے تو پھر اس صوبے کے ایسے حصے کو جہاں اقلیت رکھنے والے فرقے کی تعداد زیادہ ہے، کیوں یہ حق نہ دیا جائے کہ اُس حصے کو خود مختار مملکت بنا لیا جائے"۔

غور کیا جائے تو سکھ نیشنل لیگ کا یہ ریزولیوشن تقسیم پنجاب کی بنیادی اینٹ تھی۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم پنجاب کا مطالبہ سکھوں نے کیا تھا اور اِسی مطالبے کے باعث پنجاب تقسیم ہوا تھا۔ مسلم لیگ تو پنجاب کو متحد رکھنے اور پاکستان میں شامل کرنے پر مصر تھی۔ لیکن سکھ رضامند نہیں تھے۔ چنانچہ جس اصول پر ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی اُس کے مطابق پنجاب بھی تقسیم ہوا۔

بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ پنجاب کی تقسیم بہت بڑی غلطی تھی اور مسلم لیگ کو یہ تقسیم نہیں ماننی چاہئے تھی۔ یہ اعتراض اِس پس منظر سے ناواقفیت کی بنا پر کیا جا رہا ہے جو تقسیم پنجاب کا موجب بنا۔ مئی ۱۹۴۷ء میں مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان ایک ڈیڈلاک پیدا ہو گیا تھا جس کا کوئی حل نظر نہیں آتا تھا۔ ادھر کیبنٹ مشن سکیم کو زندہ کرنے کا خیال قطعاً ترک کیا جا چکا تھا۔ ان حالات میں ولبھ بھائی پٹیل کے سیکرٹری وی پی مینن نے ۲۳۔ مارچ ۱۹۴۷ء

کی قرار دادِ لاہور کے مطابق تقسیم ہند کا نیا فارمولا تیار کر کے پٹیل کو دکھایا۔ عجیب اتفاق ہے کہ پٹیل نے اس وقت تک قرار دادِ لاہور کا متن نہیں پڑھا تھا۔ مینن نے نقشہ سامنے رکھ کر اُسے بتایا کہ شمال مغربی ہندوستان کی مُسلم اکثریّت کا صرف یہ زون ہے جسے علاقائی ردّ و بدل کے ساتھ باقی ہندوستان سے قطع کیا جا سکتا ہے۔ پٹیل نے کسی قدر تعجب سے کہا کہ مسٹر جناح تو پُورا پنجاب مانگتے ہیں۔ مینن نے جواب دیا کہ قرار داد لاہور کے مطابق وہ پنجاب کا نصف سے کچھ اوپر حصہ لے سکتے ہیں۔ مکمل صوبہ انہیں نہیں ملے گا۔

پٹیل یہ فارمولا اور قرار داد لاہور کا متن لے کر وائسرائے کے پاس گیا اور کہا کہ ہم آدھا پنجاب مسٹر جناح کو دینے کو تیار ہیں۔ وائسرائے نے پوچھا کہ کیا مسٹر جناح تقسیم پنجاب پر راضی ہو جائیں گے۔ پٹیل کا جواب بہرصورت یہ تھا کہ قرار دادِ لاہور کے مطابق پورا پنجاب انہیں نہیں مل سکتا۔

شام کو مسٹر جناح وائسرائے سے ملنے آئے تو وائسرائے نے یہ فارمولا انہیں دکھایا اور کہا کہ میں اس فارمولے کے مطابق ہندوستان تقسیم کرنے پر آمادہ ہوں۔ مسٹر جناح نے فرمایا کہ پنجاب ناقابلِ تقسیم ہے اِس کے دو ٹکڑے نہیں کئے جا سکتے۔ وائسرائے نے کہا آپ بجا فرماتے ہیں لیکن اس طرح ہندوستان بھی ناقابلِ تقسیم ہے اس کے بھی دو ٹکڑے نہیں کئے جا سکتے۔ بالآخر اس گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ قائد اعظمؒ کو تقسیم پنجاب پر رضامند ہونا اور وہ "کٹا پھٹا کرم خوردہ" پاکستان قبول کرنا پڑا جسے وہ چند مہینے قبل رَد کر چکے تھے۔

کانگرس کے اُونچے لیڈروں میں صرف راج گوپال اچاری حقیقت پسند سیاست دان تھے۔ اُنہیں معلوم تھا کہ ہندوستان کی بہبود کا تقاضا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں جلد مفاہمت ہونی چاہئے۔ وہ کرپس کی تجاویز منظور کرنے کے حامی تھے لیکن کانگرس نے محض ایک مفروضے کی بنا پر یہ تجاویز مسترد کر دیں۔ راج گوپال اچاری دہلی سے سیدھے مدراس گئے اور وہاں مدراس لیجسلیٹو اسمبلی کی کانگرس پارٹی کا جلسہ کر کے باضابطہ ایک قرار داد منظور کی کہ جنگ کی موجودہ تشویش ناک حالت میں غیر جانبداری یا امن پرستی کی آڑ لے کر حقائق سے چشم پوشی کرنا عقلمندی نہیں۔ لہٰذا:

"ملک کے وسیع مفاد کے پیش نظر اشد ضروری ہے کہ موجودہ خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک نیشنل گورنمنٹ قائم کی جائے۔ از بسکہ مسلم لیگ اس بات کا تقاضا کر رہی ہے کہ بعض علاقوں کو وہاں کے باشندوں کے استصواب کے بعد، متحدہ ہندوستان سے علیحدہ ہونے کا حق دیا جائے۔ نیز

جب تک مسلم لیگ کا یہ مطالبہ تقسیم نہیں کیا جاتا وہ کسی نیشنل گورنمنٹ
میں شامل ہونے کو تیار نہیں۔ مدراس لیجسلیٹو اسمبلی کی کانگرس پارٹی کا
یہ اجلاس آل انڈیا کانگرس کمیٹی سے سفارش کرتا ہے کہ موجودہ نازک
وقت میں نیشنل گورنمنٹ کا قیام بے حد ضروری ہے اور اس بلند پایہ مقصد
کے حصول کی خاطر ہندوستان کو متحد رکھنے کے موہوم فوائد قربان کرنے
میں کوئی حرج نہیں۔ دو قباحتوں میں سے ہمیں چھوٹی قباحت قبول کر لینی
چاہئے یعنی مسلم لیگ کا علیحدگی کا مطالبہ مان لیا جائے"۔

راج گوپال اچاری کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔ صدر کانگرس مولانا ابوالکلام آزاد نے اُنہیں تنبیہہ کی کہ اسمبلی نے یہ قرار داد منظور کر کے کانگرس کے ضابطے کی خلاف ورزی کی ہے۔ انہیں ورکنگ کمیٹی سے مستعفی ہو جانا چاہئے۔ راج گوپال اچاری خاص اصول کے آدمی تھے۔ وہ قرار داد پر قائم رہے اور ورکنگ کمیٹی کی رُکنیت سے استعفا دے دیا۔

۱۲۔ مئی ۱۹۴۲ء کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا اجلاس الہ آباد میں ہوا۔ جہاں راج گوپال اچاری نے باقاعدہ قرار داد پیش کی کہ ہندوستان کے جن خطوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں اُنہیں قرار دادِ لاہور کے مطابق الگ خود مختار مملکتیں بنانے کا مطالبہ منظور کر لینا چاہئے۔ ایوان کے پندرہ ممبروں نے اس تجویز کی حمایت اور ۱۲۰ نے مخالفت کی اور قرار داد ناکام رہی۔ جواب میں جگت نارائن لال نے ذیل کا ریزولیوشن پیش کیا جو کثرت آراء سے منظور کر لیا گیا۔

"آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی رائے ہے کہ ایسی کوئی تجویز جس سے
ہندوستان کے کسی صوبے یا کسی خطے کو ہندوستانی یونین یا ہندوستانی
فیڈریشن سے الگ ہونے کا اختیار دیا جائے۔ ہندوستان کے ٹکڑے
ٹکڑے کرنے کے مترادف ہو گا اور ایسی تجویز بحیثیت مجموعی ہندوستان اور
ہندوستان کے تمام باشندوں کے لئے سخت نقصان رساں ہے لہٰذا کانگرس
اِس قسم کی تجویز سے اتفاق نہیں کر سکتی"۔

جگت نارائن لال کے اِس ریزولیوشن نے گویا مسلم لیگ اور کانگرس کی باہمی مفاہمت کا دروازہ عملاً بند کر دیا۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ جنگ کے غیر معمولی حالات کے باوجود مرکز میں کوئی نیشنل گورنمنٹ قائم نہیں ہو سکتی تھی اور ہندو مسلم مناقشہ جاری رہا۔

۱۲۔ اکتوبر ۱۹۴۲ء کو عیدالفطر کی تقریب پر قائداعظم نے پہلی مرتبہ اپنی قوم کے نام عید کا پیغام نشر کیا جو بے انتہا ہمت افزا ثابت ہوا۔ یہ پیغام خاص طویل تھا۔ اس کے ایک ٹکڑے کا ترجمہ

درج ذیل کرتا ہوں۔

"ہندوستان میں دس کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ مجموعی طور پر مسلمانوں کی اتنی تعداد کسی اور ملک میں ایک جگہ آباد نہیں۔ ان کا اپنا کلچر اور اپنی تہذیب ہے۔ وہ تمام قوموں کی مکمل آزادی اور مساوات کے حامی ہیں۔ اس وقت جو عالمگیر جنگ جاری ہے اس میں اسلامیان ہند ایک طاقتور عنصر کی طرح حصہ لے رہے ہیں اور جنگ کے بعد جب نظام عالم کی از سر نو تشکیل ہوگی اس میں بھی مسلمانان ہند شریک ہوں گے۔

بایں ہمہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی آزادی کے حصول کا پختہ عزم کر لیا ہے جس کی واحد صورت یہ ہے کہ اس برعظیم کے شمال مغربی اور مشرقی علاقوں میں مسلمانوں کی آزاد، خود مختار مملکتیں قائم کی جائیں۔ ان علاقوں میں ہماری مجموعی تعداد سات کروڑ ہے اور آبادی کے لحاظ سے ہم اکثریت میں ہیں"۔

جولائی ۱۹۴۲ء میں بادشاہ جارج ششم کے چھوٹے بھائی ڈیوک آف گلاسٹر ہندوستان تشریف لائے اور ایک ہفتہ پنجاب میں بھی گزارا۔ واپس جا کر انہوں نے ذیل کا پیغام سر سکندر حیات خاں کو بھیجا۔

"آپ اور آپ کے کابینہ کے دیگر ارکان سے مل کر مجھے بے انتہا خوشی ہوئی۔ افسوس صرف اس بات کا ہے کہ میں پنجاب میں زیادہ دن نہ ٹھہر سکا۔ ہندوستان، مشرق وسطیٰ اور لنکا کے دورے میں ہر جگہ میں نے پنجابی سپاہیوں کو دیکھا جو بہترین فوجی صلاحیت کے مالک ہیں۔ رائل انڈین نیوی، انڈین ایئر فورس، جنگی سامان بنانے والے کارخانوں اور بندر گاہوں میں جہاں جہاں ہندوستانی سپاہی کام کر رہے ہیں پنجاب کی بہمہ وجوہ نمائندگی موجود ہے جو ثبوت ہے اس بات کا کہ پنجاب تندہی سے جنگی سرگرمیوں میں حصہ لے رہا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے کہ پنجاب کو ہندوستان بھر میں خاص شہرت حاصل ہے۔ بحالتِ جنگ اور بحالت امن دونوں حالتوں میں آپ کے صوبے نے وفادارانہ خدمت اور حسن انتظام سے ہندوستان کے نام کو روشن کیا ہے۔ موجودہ نازک وقت میں پنجاب نے جو خدمات ادا کی ہیں۔ ان کے

پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنے سابقہ ریکارڈ کو بھی مات کر دیا ہے۔

آپ اور آپ کے کابینہ کے دیگر ارکان عوام کے لیڈر ہیں جب سے جنگ شروع ہوئی ہے آپ نے انتہائی جوش، انہماک اور بہادری سے عسکری امداد فراہم کرنے میں حصہ لیا ہے جس کے لئے میں آپ کا اور آپ کے توسل سے اہل پنجاب کا شکریہ ادا کرتا ہوں"۔

سر سکندر حیات خاں نے جواب میں ذیل کا تار دیا:

"میں اور میرے کابینہ کے ارکان یور رائل ہائی نس کے مربیانہ و مشفقانہ پیغام کے بے حد ممنون ہیں۔ ہمیں بھی افسوس ہے کہ یور رائل ہائی نس کا قیام پنجاب میں بے حد مختصر تھا۔ تاہم اس بات کی خوشی ہے کہ آپ کو مختلف ممالک اور میدان جنگ کے دورے میں جگہ جگہ پنجابی سپاہیوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ آپ نے پنجابی سپاہیوں کی عسکری قابلیت کے بارے میں جو تحسین آمیز کلمات استعمال فرمائے ہیں ان سے پنجاب کے سپاہی کا سر افتخار اور اونچا ہو گیا ہے۔ یور رائل ہائی نس نے اہل پنجاب کی جنگی مساعی کا ذکر جن خوبصورت الفاظ میں کیا ہے ان سے ہماری کوششیں اس ضمن میں اور تیز ہو جائیں گی اور ہم ان عسکری روایات کو خوش اسلوبی کے ساتھ برقرار رکھ سکیں گے۔ جن کے لئے پنجاب مشہور ہے"۔[۱]

سر سٹیفرڈ کرپس کے ورود ہند سے کچھ پہلے چین کے سربراہ مارشل چیانگ کائی شیک بھی ہندوستان آئے تھے اور وائسرائے کے مہمان ہوئے تھے۔ کانگرسی لیڈروں، بالخصوص پنڈت نہرو سے ان کا ربط و ضبط نسبتاً زیادہ رہا۔ غیر کانگرسی ہندوؤں سے بھی ملے۔ اکثر مسلمان رہنماؤں سے بھی ملاقاتیں کیں۔ جن میں قائداعظم محمد علی جناح، مولانا ابوالکلام آزاد، مولوی فضل الحق، سر سکندر حیات خاں وغیرہ شامل تھے۔

چیانگ کائی شیک نے ہندوستان سے رخصت ہوتے وقت ایک اخباری بیان میں کہا کہ برطانوی حکومت کو چاہئے کہ ہندوستان کو فوراً آزادی عطا کرے ورنہ سیاسی صورت حال اور زیادہ خراب ہو جائے گی اس پر قائداعظم نے ذیل کا اخباری بیان دیا:۔

"مارشل چیانگ کائی شیک سے مجھے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔

---

۱۔ روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ لاہور۔ ۱۷۔ جولائی ۱۹۴۲ء

انہوں نے اعتراف کیا تھا کہ ہندوستان کے سیاسی معاملات کے بارے میں انہیں کچھ معلوم نہیں۔ بالخصوص یہاں کے دستوری مسائل کے بارے میں تو ان کی معلومات بمنزلہ صفر ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے رخصت ہوتے وقت ایک اخباری بیان میں برطانوی حکومت کو مشورہ دیا ہے کہ ہندوستان کو فوراً آزادی اور خود مختاری عطا کر دینی چاہئے. ہندوستان کے مسلمان حصول آزادی کے لئے اتنے ہی بے تاب ہیں جتنے اور لوگ۔ لیکن ہندوستان میں صرف ایک قوم نہیں بستی۔ یہاں ہندو اور مسلمان دو بڑی قومیں آباد ہیں۔ اس کے علاوہ ملک کا تہائی حصہ ریاستوں پر مشتمل ہے جو برٹش انڈیا سے بالکل باہر ہے۔

اندریں حالات یہ امر انتہائی افسوسناک ہے کہ سیاسی حالات و واقعات اور دستوری معاملات کو اچھی طرح سمجھے بغیر مارشل موصوف نے ایک بیان داغ دیا ہے. معلوم ہوتا ہے جن چند لوگوں نے ان کو یہاں گھیرا ہوا تھا. انہی کے خیالات کی ترجمانی انہوں نے کی ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ان کے اس بیان کو جو سراسر حالات سے بے خبری کی بنا پر دیا گیا ہے مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا جائے گا"۔[1]

۸۔ مارچ ۱۹۴۲ء کو پنجاب صوبہ مسلم لیگ کے صدر نواب سر شاہنواز خاں ممدوٹ کا حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ سر سکندر کی تجویز اور قائداعظم کی منظوری سے مرحوم کے فرزند اکبر نواب افتخار حسین خاں کو پنجاب پراونشل مسلم لیگ کا صدر بنا دیا گیا۔ نواب افتخار حسین خاں نہایت شریف. مرنجاں مرنج اور دوست پرور انسان تھے لیکن اس پر آشوب زمانے میں کسی سیاسی اور عوامی جماعت کی صدارت کو رئیسوں اور نوابوں کی موروثی جاگیر بنا دینا کوئی اچھی مثال نہیں تھی۔

پنجاب پراونشل کانگرس کی صدارت پر لالہ لاجپت رائے. ڈاکٹر ستیہ پال. مولوی عبدالقادر قصوری، ڈاکٹر سیف الدین کچلو وغیرہ متمکن رہے. ان میں سے کوئی بھی رئیس، نواب یا راجہ نہیں تھا۔ کیا لاجپت رائے اور کیا سیف الدین کچلو ہر شخص نے سالہا سال کانگرس کی بے لوث خدمت کی تھی۔ قید و بند کے شدائد برداشت کئے تھے۔ ہر نوع کے مصائب جھیلے تھے۔ جائدادیں ضبط کرائی تھیں اور قوم نے جب دیکھ لیا کہ یہ سونا بھٹی میں پڑ کر کندن ہو گیا ہے تو اظہار

---

۱۔ روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور ۲۴ فروری ۱۹۴۲ء

قدر دانی کے طور پر ان لوگوں کو صوبائی کانگرس کی صدارت کا اعزاز بخشا۔

پنجاب میں مجلس احرار کی صدارت مولوی حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے پاس تھی جو ایک مخلص، ایثار پیشہ اور ملک وملت کے پرانے خادم تھے۔

پنجاب صوبہ مسلم لیگ بھی جب تک سر سکندر حیات خاں کی خانہ زاد کنیز نہیں بنی تھی، ایک عوامی جماعت تھی۔ جس کی صدارت علامہ اقبال اور میاں عبدالعزیز جیسے بزرگوں کے پاس تھی۔ قومی روایات کا تقاضا تھا کہ مسلم لیگ کی صدارت کے لئے اس شخص کو منتخب کیا جاتا جس نے اس جماعت کی سب سے زیادہ خدمت کی تھی اور جس نے ہر ابتلاء اور آزمائش کے وقت اس جماعت کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔ اگر یہ معیار پیش نظر رکھا جاتا تو نواب سر شاہنواز خاں کے انتقال کے بعد کرسیٔ صدارت پر سب سے زیادہ حق ملک برکت علی، غلام رسول خاں، میاں عبدالعزیز، خلیفہ شجاع الدین وغیرہ کا تھا۔

کرم کہ رندوں نے عمریں گذار دیں ساقی
مزاج دانیٔ پیمانہ و سبو کرتے

لیکن نواب افتخار حسین خاں کو، جو گذشتہ دس سال سے اپنی جاگیر پر زمینداری کے کام میں مصروف تھے اور جن کا مسلم لیگ سے کوئی تعلق نہیں تھا، یکایک گوشۂ عافیت سے نکال کر ۱۹۴۲ء جیسے ہنگامہ خیز دور میں جب

طوفانِ چہار موجہ داری
کشتیٔ ہزار لنگر آور

کی سی کیفیت طاری تھی۔ مسلمانان پنجاب کی سب سے بڑی انقلابی جماعت کا صدر بنا دینا سیاسی روایات کی توہین تھی۔ مشکل یہ تھی کہ حالات نے ہمیں ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کیا تھا جہاں پنجاب پراونشل مسلم لیگ کا صدر صرف وہی شخص بن سکتا تھا جسے سر سکندر حیات خاں پسند فرمائیں۔

۶۔ اگست ۱۹۴۰ء کو وزارت پنجاب کے چیف پارلیمنٹری سیکرٹری، خاں بہادر میاں احمد یار خاں دولتانہ کا انتقال ہو گیا اور ان کی جگہ ان کے نامور فرزند میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ کو تحصیل میلسی کے حلقے سے یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کا ممبر منتخب کر لیا گیا۔ یہ راز اب تک سمجھ میں نہیں آیا کہ میاں ممتاز دولتانہ صاحب نے جو یونینسٹ پارٹی کے سب سے بڑے حریف اور مسلم لیگ کے سب سے بلند پایہ لیڈر ہیں، یونینسٹ پارٹی جیسی معتوب اور بدنام جماعت کے ٹکٹ پر ممبر بننا کیوں کر گوارا کیا اور ضمیر کی کسی خلش کے بغیر بدستور ۱۹۴۴ء تک اسمبلی کے ایوان میں اسی پارٹی کے بنچوں پر بیٹھنے کی توہین کیوں کر گوارا کی۔ بعض دانشوروں کا خیال ہے کہ میاں

صاحب عالی مقام کو اس وقت معلوم نہیں تھا کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور مسلم لیگ کی منظور کردہ قرار دادِ پاکستان اسلامیان ہند کے دستوری مسائل کا واحد حل۔ بہر حال ہم منتظر ہیں کہ جب میاں صاحب کے مداحوں میں سے کسی نے ان کی سوانح عمری مرتب کی تو ان کی قومی خدمات اور ایثار اور قربانی اور جاں نثاری کا ذکر کرتے وقت اس راز سے بھی پردہ اٹھایا جائے گا۔

۸۔ اپریل ۱۹۴۱ء کو پنجاب کے گورنر سرہنری کریک ریٹائر ہو کر انگلستان تشریف لے گئے۔ اور ان کی جگہ سر برٹرنڈ گلینسی آئے۔ سرہنری کریک بے حد شریف آدمی تھے۔ ان کی ملازمت کا سارا عرصہ پنجاب میں گذرا تھا۔ سوائے ان پانچ برسوں کے جب وہ حکومت ہند میں ہوم ممبر کے منصب پر فائز تھے۔ پنجاب کے ہر قابل ذکر خاندان سے ان کی براہ راست واقفیت تھی اور اردو کے علاوہ پنجابی پر بھی خاصا عبور رکھتے تھے۔

یکم اپریل کو پنجاب کے وزیر مال سر سندر سنگھ مجیٹھیہ کا انتقال ہو گیا جو اسمبلی میں سکھ نیشنل پارٹی کے لیڈر تھے۔ یہ پارٹی گذشتہ چار سال سے سر سکندر حیات خاں کی وزارت میں شامل تھی۔ سر سندر سنگھ مجیٹھیہ کی وفات سے اس پارٹی کی پالیسی میں کوئی فرق نہ آیا۔ اور سر سکندر حیات خاں نے ان کی جگہ سردار دسوندا سنگھ کو وزیر مال بنا دیا۔

۲۷۔ جنوری ۱۹۴۱ء کو سوبھاش چندر بوس نہایت پر اسرار طریقے سے کلکتہ سے غائب ہو گئے۔ مدت تک ان کے متعلق قسم قسم کی قیاس آرائیاں ہوتی رہیں۔ آخر کار یہ راز کھلا کہ وہ جرمنی پہنچ گئے ہیں اور برطانیہ کے خلاف پروپیگنڈا کرنے میں مصروف ہیں۔

آٹھواں باب

# سپرو — گاندھی — جناح

سرتیج بہادر سپرو ہندوستان کی لبرل پارٹی کے لیڈر تھے۔ یہ دیکھ کر کہ جنگ کی وجہ سے حالات روز بروز خراب ہو رہے ہیں اور غنیم کلکتہ اور مدراس تک بم باری کر رہا ہے۔ انہوں نے ۱۰/اپریل ۱۹۴۱ء کو بمبئی میں ایک نان پارٹی کانفرنس کا انعقاد کیا۔ جس میں ہندو اور سکھ نسبتاً کثیر اور مسلمان بہت قلیل تعداد میں شریک ہوئے۔ ریزولیوشن یہ پاس کیا گیا کہ مرکز میں فوراً ایک نیشنل گورنمنٹ قائم کی جائے جو وزیر ہند کی بجائے کراؤن کے سامنے جواب دہ ہو۔

قائداعظم نے سپرو کانفرنس کے بارے میں ۵/مئی ۱۹۴۱ء کو بنگلور سے ایک طویل اخباری بیان دیا۔ جس کے تمہیدی الفاظ یہ تھے۔

پہلے تو میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کانفرنس کی ابتداء کیوں کر ہوئی۔ میرے پاس خاص شہادت اور ثبوت اس بات کا ہے کہ اس کانفرنس کے پیچھے کانگرس اور ہندو مہاسبھا کے ایجنٹوں کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ اگرچہ بڑے بڑے کانگرسی لیڈر پس پردہ چھپے بیٹھے تھے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر سرتیج بہادر سپرو نے اس گہری چال کے ساتھ اپنا نام وابستہ کرنے کی اجازت دے دی۔ مقصد یہ تھا کہ ایسٹر کی تعطیل کے بعد برطانوی پارلیمنٹ میں ہندوستان کے مسئلے پر جو بحث ہونے والی ہے اس کو متاثر کیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ کانگرس نے پونا میں جو قرارداد منظور کی تھی کہ مرکز میں جلد از جلد نیشنل گورنمنٹ قائم ہونی چاہئے۔ سپرو کانفرنس نے اسی کی تائید کی ہے تاکہ مسٹر گاندھی جلد از جلد اپنا ستیہ گرہ ترک کر کے دوبارہ

سیاست میں آ سکیں۔ اس قرار داد کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے مطالبۂ پاکستان کو نقصان پہنچایا جائے[1]

اس سے قبل فروری ۱۹۴۱ء میں سر تیج بہادر کی مسٹر جناح اور گاندھی جی سے خط و کتابت ہوئی تھی۔ سپرو نے کوشش کی تھی کہ گاندھی جی اور قائداعظمؒ کی آپس میں ملاقات ہو سکے لیکن افسوس بعض وجوہ سے یہ ملاقات نہ ہو سکی۔ قائداعظمؒ کے اس بیان کے بعد سپرو نے وہ تمام خط و کتابت اخباروں میں شائع کر دی جس سے سیاسی الجھنوں، فریقین کے نقطہ نظر کے تضاد اور طبائع کے اختلاف پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ سب سے پہلا خط گاندھی جی کا ہے جو انہوں نے ۲۵۔ جنوری ۱۹۴۱ء کو سر تیج بہادر سپرو کو لکھا۔

ڈیئر سر تیج بہادر ۔۔ میں نے ابھی ابھی "ٹوئنٹیتھ سنچری" میں آپ کا مضمون پڑھا۔ اس بارے میں آپ سے مجھے کُلی اتفاق ہے کہ باہمی جھگڑوں کا نمٹانا ہمارا اپنا فرض ہے۔ قطع نظر اس سے کہ حکومت ہمارا متحدہ مطالبہ مانے گی یا نہیں۔ آپ کو معلوم ہو گا اسی خیال کے پیش نظر میں بمبئی میں مسٹر جناح سے ملنے گیا تھا اور ان کے مکان پر متعدد بار گفتگو ہوئی تھی۔ سوبھاش بابو بھی گئے تھے لیکن کوئی نتیجہ بر آمد نہ ہو سکا۔ وجہ بھی غالباً آپ کو معلوم ہو گی۔

پھر جب وائسرائے سے ملنے کا وقت آیا تو پہلے میں مسٹر جناح کے مکان پر گیا تاکہ ہم اکٹھے وائسرائے سے ملاقات کریں چنانچہ انہی کی گاڑی میں بیٹھ کر ہم وائسرائے کے مکان پر گئے لیکن وہاں سوائے اس کے کہ ہم اپنے باہمی جھگڑوں کی نمائش کریں اور کچھ نہ کر سکے۔ میں تو بار بار مسٹر جناح کے پاس جانے کو تیار ہوں بشرطیکہ میرا اس طرح جانا ان کے لئے بار خاطر نہ ہو۔

میرا اندازہ یہ ہے کہ مسٹر جناح فی الحال کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں چاہتے۔ وہ چاہتے یہ ہیں کہ مسلم لیگ کو پہلے اتنا مضبوط کریں کہ جملہ فریقوں سے جن میں حکومت بھی شامل ہے اپنی شرطیں منوانے کے قابل ہو سکیں۔ اس بارے میں انہیں قابل الزام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن جب میرا یہ تاثر ہے تو پھر میں کیونکر ان سے ملنے جا سکتا ہوں۔ میرا جی تو اکثر چاہتا ہے کہ انہیں خط لکھوں لیکن جب قلم اور کاغذ لے کر بیٹھتا ہوں تو ہمت جواب دے دیتی ہے۔

---

[1] روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" لاہور ۷ مئی ۱۹۴۱ء

آپ میں تو حوصلہ خوب ہے۔ آپ کیوں ان سے ملنے نہیں جاتے؟

مخلص

گاندھی

## سپرو

۲۸۔ جنوری ۱۹۴۱ء

ڈیئر مہاتماجی! آپ کے ۲۵ جنوری کے گرامی نامے کا جو مجھے کل ملا ہے۔ بہت بہت شکریہ۔ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ میرا مضمون جو "ٹونٹیتھ سنچری" میں شائع ہوا تھا، آپ کے مطالعہ سے گزرا ہے۔

میں نے اخباروں میں پڑھا تھا کہ آپ مسٹر جناح سے ملنے بمبئی گئے تھے لیکن یہ بالکل معلوم نہیں کہ وہاں کیا کیا باتیں ہوئیں۔ گزشتہ اگست کی چھٹی تاریخ کو مسٹر جناح سے میری بالکل اتفاقیہ ملاقات بمبئی میں ڈاکٹر بر گر کے شفاخانے میں ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو اٹھ کر میرے پاس آئے اور اپنے ہاں چائے کی دعوت دی۔ دوسرے روز میں ان کے دولت کدے پر حاضر ہوا تو ڈیڑھ گھنٹہ باتیں ہوتی رہیں۔ انہوں نے بتایا کہ دہلی میں آپ سے ان کی کیا گفتگو ہوئی تھی اور پھر وائسرائے کے سامنے کن امور پر اختلاف ہوا تھا۔ میرا تاثر یہ ہے کہ آپ دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی بیشتر کانگریس کے سیاسی مطالبات کے بارے میں تھی۔ فرقہ وارانہ امور زیر بحث نہیں آئے۔

آپ بالکل بجا فرماتے ہیں کہ ہمیں اپنے گھر کے جھگڑوں کو خود ہی نمٹانا چاہئے۔ قطع نظر اس سے کہ برطانیہ ہمارا متحدہ مطالبہ منظور کرتا ہے یا نہیں۔ فرقہ وارانہ قضیہ اس قدر طول کھینچ گیا ہے کہ اس کا تصفیہ ہمارا اوّلین فرض ہے۔ بالخصوص آپ کو اپنے وسیع اثر ورسوخ کے باعث اس طرف متوجہ ہونا چاہئے جب تک یہ قضیہ جاری ہے ہم حقیقی حکومت خود اختیاری حاصل نہیں کر سکتے اور حاصل کر بھی لی تو برقرار رکھنا مشکل ہو گا۔

کرسمس کے دنوں میں نواب محمد اسماعیل خاں اور نواب زادہ لیاقت علی

خاں صوبہ مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لئے الہ آباد آئے تھے. نواب اسماعیل خاں جو میرے پرانے دوست ہیں مجھ سے ملنے میرے ہاں تشریف لائے اور لیاقت علی خاں سے ایک مشترک دوست کے ہاں ملاقات ہوئی تھی۔ نہایت بے تکلفی سے ہم نے باتیں کیں۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ فرقہ وارانہ مصلحت کے راستے میں مشکلات ضرور حائل ہیں لیکن ایسی نہیں کہ ان پر قابو نہ پایا جاسکے۔

مسٹر جناح سے پاکستان پر میری کوئی بات نہیں ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ لفظ پاکستان کو مسلم لیگ نے ایک نعرے کے طور پر اختیار کیا ہے۔ اصل مقصد بعض سیاسی اور دستوری مسائل ہیں۔ اگر یہ مراد ہے کہ ہندوستان تقسیم کرایا جائے تو میں اس تجویز کا سخت مخالف ہوں اور اگر پیش نظر محض چند سیاسی اور دستوری تحفظات ہیں تو ان پر بحث کرنے میں کوئی حرج نہیں. بہرحال اگر ہم فرقہ وارانہ مفاہمت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو مذاکرات شروع کرنے سے پہلے کسی فریق کو دوسرے فریق پر شرطیں مسلط نہیں کرنی چاہ

میرا خیال ہے کہ مسٹر جناح آپ سے ملنے سے انکار نہیں کریں گے اگر انہوں نے انکار کیا تو یہ اخلاق سے گری ہوئی بات ہونے کے علاوہ خود ان کے مفاد کے خلاف بھی ہو گا۔

آپ اپنے خط میں فرماتے ہیں کہ "مسٹر جناح فی الحال کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں چاہتے وہ چاہتے ہیں کہ مسلم لیگ کو پہلے اتنا مضبوط کرلیں کہ جملہ فریقوں سے جن میں حکومت بھی شامل ہے، اپنی شرطیں منوانے کے قابل ہو سکیں" اور "میرا جی تو اکثر چاہتا ہے کہ انہیں خط لکھوں، لیکن جب قلم اور کاغذ لے کر بیٹھتا ہوں تو ہمت جواب دے دیتی ہے۔"

آپ تو بے پایاں ہمت کے مالک ہیں اور خدا نے آپ کو اتنا بلند مرتبہ عطا کیا ہے کہ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتوں کی آپ کو پروا بھی نہیں کرنی چاہئے۔ آپ انہیں نہایت نرمی اور ملائمت کے ساتھ خط لکھیں آپ کا ہر خط نرمی اور

ملامت کا نمونہ ہوتا ہے کہ ملک کے وسیع مفاد کے پیش نظر آپ ان سے مل کر فرقہ وارانہ مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں تاکہ فریقین میں کوئی تسلی بخش اور آبرومندانہ مفاہمت ہو سکے۔

اگر ان کا تسلی بخش جواب آیا تو آپ ایک قدم اور آگے بڑھائیں۔ اس طرح آپ اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کے علاوہ کانگرس اور عام ہندوؤں کی پوزیشن کو بھی مضبوط کر سکیں گے۔ اگر انہوں نے آپ کی درخواست کا کوئی جواب نہ دیا یا ضد اور دھرمی کا رویہ اختیار کیا تو اس سے خود ان کو اور ان کی جماعت کو نقصان پہنچے گا۔

میرا خیال ہے فریقین میں جس قدر مغائرت اور بعد پیدا ہوتا جائے گا اتنا ہی غلط فہمیاں بڑھتی اور مصالحت کے امکانات کم ہوتے جائیں گے۔

آپ نے اپنے خط میں یہ بھی لکھا ہے کہ "اگر آپ میں حوصلہ ہے تو بغیر کسی شخص کے کہے آپ خود کیوں جا کر ان سے نہیں ملتے؟"

ایک پرائیویٹ فرد کی حیثیت سے مجھے ان سے یا کسی اور شخص سے ملنے میں کوئی اعتراض نہیں لیکن دقت یہ ہے کہ نہ کانگرس کی نمائندگی کر سکتا ہوں نہ عام ہندوؤں کی۔ مسٹر جناح کو میں خط لکھنے کو تیار ہوں کہ آپ سے ملاقات کریں اور اگر آپ انہیں لکھیں کہ آپ ملنا چاہتے ہیں تو میں بھی انہیں لکھ دوں گا کہ مہربانی فرما کر آپ سے ملیں اور باہمی تبادلہ خیال کریں۔

آپ اس بارے میں اطمینان رکھیے میں مسٹر جناح یا نواب اسماعیل خاں کو خط لکھوں گا تو آپ کو یا کسی کو کسی قول یا فعل کا پابند نہیں بناؤں گا بلکہ صرف یہ تجویز پیش کروں گا کہ آپ میں باہمی مذاکرات ہو جائیں۔

اس موضوع پر میں نے اب تک مسٹر جناح یا کسی اور مسلمان دوست کو خط نہیں لکھا۔ گزشتہ ڈیڑھ سال میں میں نے والسرائے کو بھی کوئی خط نہیں لکھا۔

ان سے میری آخری ملاقات ستمبر ۱۹۳۹ء میں ہوئی تھی۔ میرے خیالات، میرے خیالات ہیں۔ ان کی موجودگی میں یہ قطعاً بے سود ہے کہ میں

وائسرائے سے ملنے یا انہیں خط لکھنے کی کوشش کروں۔ بالخصوص باہمی اختلافات کی موجودہ خلفشار میں جب ایک پارٹی دوسری پارٹی اور سیاستدانوں کا ایک گروہ دوسرے گروہ کے خلاف شمشیر بے نیام تانے کھڑا ہے۔ انہی خیالات کی بناء پر اپنے اس اخباری بیان میں جو گزشتہ مہینے شائع ہوا تھا اور رسالہ "ٹونٹیتھ سنچری" کے مضمون میں میں نے فرقہ وارانہ مفاہمت پر زور دیا تھا کہ آپ اور مسٹر جناح کی ملاقات ضروری ہے۔

برطانیہ کی اس پالیسی پر اعتراض کیا جارہا ہے کہ وزیر ہند اور وائسرائے نے اقلیتوں کو گویا ویٹو کا اختیار دے دیا ہے۔ ذاتی طور پر میں اس اعتراض کو چنداں اہمت نہیں دیتا۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ اپنے باہمی اختلافات رفع کر کے متحدہ محاذ قائم کریں۔ ایک مرتبہ یہ محاذ قائم ہو گیا تو کیا دہلی کیا شملہ کیا وائٹ ہال کوئی طاقت ہمارے سامنے نہیں ٹھہر سکے گی۔

بدقسمتی سے میرے بعض سیاسی خیالات اکثر اہل وطن سے مختلف ہیں لیکن میں مجبور ہوں۔ یہ سیاسی عقائد محکم ہو گئے ہیں تاہم میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی فرقہ وارانہ مفاہمت کو مقدم درجہ دیتا ہوں۔ یہ نظری بحث میرے نزدیک چنداں قابل اعتناء نہیں کہ طرز حکومت کس نوع کا ہونا چاہیئے۔

مختصر یہ کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں مسٹر جناح اور بعض مسلمان دوستوں کو خط لکھنے کو تیار ہوں۔ بہتر تو یہی ہو گا کہ کسی مناسب موقع پر آپ ایک کانفرنس منعقد کریں۔ بجائے اس کے کہ کوئی اور شخص ہر چند کہ کتنا ہی نیک نیت کیوں نہ ہو اس باب میں پیش قدمی کرے بعض احباب نے مجھے لکھا ہے کہ میں اس قسم کی کانفرنس کے انعقاد کی کوشش کروں۔ لیکن فی الحال اس بارے میں میرا ارادہ پختہ نہیں ہوا۔ یہ اقدام آپ اور مسٹر جناح کو کرنا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے اس بارے میں رہنمائی کی تو نتائج خوشگوار ہوں گے۔"

مخلص

تیج بہادر سپرو

## گاندھی

یکم فروری ۱۹۴۱ء

ڈیئر سر تیج بہادر آپ کے خط کا شکریہ۔ مسٹر جناح کہتے ہیں کہ میں ایک ہندو کی حیثیت سے صرف ہندوؤں کا لیڈر بن کر ان سے گفت و شنید کروں، جس کے لئے میں تیار نہیں۔ اگر میں انہیں خط لکھوں کہ میں ملنا چاہتا ہوں تو وہ انکار نہیں کریں گے۔ لیکن اس ملاقات کا جو نتیجہ نکلے گا میں خوب جانتا ہوں۔ وہ فوراً ہماری ملاقات کو غلط رنگ دے دیں گے۔ ان کے نزدیک میں راستے کا سب سے بڑا کانٹا ہوں۔ مجبوراً میں خاموش ہوں۔ جونہی کوئی روشنی کی کرن نظر آئی میں انہیں خط لکھوں گا۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہو گا کہ حال ہی میں انہوں نے کانگرس کے ریزولیوشن کو غلط معنی پہنا کر اسے مسلمانوں کے مفاد کے خلاف بنا دیا ہے۔ آپ اپنے طور پر اس باب میں جو کوشش کر سکتے ہیں کیجئے۔

مخلص

گاندھی

## سپرو

۶ فروری ۱۹۴۱ء

ڈیئر مہاتما جی! آپ کے گرامی نامہ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کے نقطہ نگاہ کو بنظر تحسین دیکھتا ہوں۔ بہت غور و فکر کے بعد میں نے مسٹر جناح کو خط لکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور آج خط بھیج رہا ہوں۔ اس بات کی میں نے احتیاط کی ہے کہ آپ کو یا کسی اور شخص کو یا کسی پارٹی کو کسی خاص پوزیشن یا سوال کا پابند نہ بناؤں۔ میں نے صرف یہ تجویز پیش کی ہے کہ اگر آپ انہیں ملاقات کے لئے لکھیں تو وہ بمبئی یا کسی اور جگہ آپ سے مل کر گفتگو کریں۔ اس کے بعد وہ دوسرے لیڈروں سے بھی ملاقات کر سکتے ہیں۔ بعد ازاں اگر آپ سب لوگوں کا یہ خیال ہو کہ فرقہ وارانہ مسائل کے تصفیے کے لئے کسی کانفرنس کی ضرورت ہے تو اس قسم کی کانفرنس کا بندوبست بھی کیا جا سکتا ہے۔ مسٹر جناح کو میں نے لکھ دیا ہے کہ متعلقہ مسائل کے

بارے میں خود میں کوئی رائے ظاہر کرنے کا مجاز نہیں۔ یہ کام آپ کا اور ان کا اور دیگر لیڈروں کا ہے کہ وہ باہمی مشورے سے کوئی حل تلاش کریں۔ جونہی ان کا جواب آیا آپ کو مطلع کروں گا۔ اسی قسم کا پیغام میں نے ایک اور مسلمان دوست کو بھی بھیجا ہے جو اپنی قوم میں خاصا اثر ورسوخ رکھتے ہیں۔

مخلص

تیج بہادر سپرو

## گاندھی

### ۹فروری ۱۹۴۱ء

ڈیئر سر تیج بہادر! آپ کا خط ابھی ابھی ملا، جس سے مجھے کچھ پریشانی بھی ہوئی۔ میرا خیال ہے میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ جب تک مجھے یہ معلوم نہ ہو کہ مسٹر جناح واقعی کسی سمجھوتے پر آمادہ ہیں میں ان کو خط نہیں لکھنا چاہتا۔ جو کچھ اب تک میرے علم میں آیا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سمجھوتہ نہیں چاہتے۔ مسٹر جناح کو آپ نے جو خط لکھا ہے اس کی ایک نقل مجھے بھیج دیجئے۔ جو کچھ آپ کر چکے ہیں میں نہیں چاہتا کہ اس سے آگے آپ جائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ غلط فہمیاں پیدا ہوں۔

مخلص

گاندھی

## سپرو

۱۲فروری ۱۹۴۱ء

ڈیئر مہاتما جی! آپ کا ۹فروری کا مکتوب مجھے کل ملا۔ تعجب ہے میرے ۶فروری کے خط سے آپ کو کچھ پریشانی ہوئی۔ جس کی کوئی وجہ مجھے نظر نہیں آتی۔ آپ لکھتے ہیں کہ "جب تک مجھے یہ معلوم نہ ہو کہ مسٹر جناح واقعی سمجھوتے پر آمادہ ہیں۔ میں ان کو خط نہیں لکھنا چاہتا۔"

اس سے پہلے آپ نے کسی خط میں یہ بات نہیں کہی۔ آپ کے اطمینان کی خاطر آپ کے گزشتہ خطوں کی نقلیں ملفوف کر رہا ہوں، جو ۲۵جنوری اور یکم فروری کو

آپ نے لکھے تھے۔

پہلے خط میں آپ نے یہ لکھا تھا کہ "میرا اندازہ یہ ہے کہ مسٹر جناح فی الحال کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں چاہتے۔ وہ چاہتے یہ ہیں کہ مسلم لیگ کو پہلے اتنا مضبوط کر لیں کہ جملہ فریقوں سے جن میں حکومت بھی شامل ہے اپنی شرطیں منوانے کے قابل ہو سکیں" پھر آپ نے یہ بھی لکھا "میرا جی تو اکثر چاہتا ہے کہ انہیں خط لکھوں لیکن جب قلم اور کاغذ لے کر بیٹھتا ہوں تو ہمت جواب دے دیتی ہے" پھر آپ نے لکھا "آپ میں تو حوصلہ خوب ہے۔ آپ کیوں ان سے ملنے نہیں جاتے؟"

میں نے ۲۸ جنوری کے مکتوب میں آپ کو لکھا تھا" آپ انہیں نہایت نرمی اور ملائمت کے ساتھ خط لکھیں آپ کا ہر خط نرمی اور ملائمت کا نمونہ ہوتا ہے کہ ملک کے وسیع تر مفاد کے پیش نظر آپ ان سے مل کر فرقہ وارانہ مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں تاکہ فریقین میں کوئی تسلی بخش اور آبرومندانہ مفاہمت ہو سکے۔"

میں نے اپنے بارے میں لکھا تھا کہ ایک پرائیویٹ فرد کی حیثیت سے مجھے ان سے یا کسی اور شخص سے ملنے میں کوئی اعتراض نہیں لیکن دقت یہ ہے کہ میں کانگرس کی نمائندگی کر سکتا ہوں نہ عام ہندوؤں کی۔ مسٹر جناح کو میں خط لکھ سکتا ہوں کہ آپ سے ملاقات کریں اور اگر آپ انہیں لکھیں کہ آپ ملنا چاہتے ہیں تو میں بھی انہیں لکھوں گا کہ مہربانی فرما کر آپ سے ملیں اور باہمی تبادلۂ خیال کریں۔"

یکم فروری کے خط میں آپ نے لکھا کہ "مسٹر جناح کہتے ہیں کہ میں ایک ہندو کی حیثیت سے صرف ہندوؤں کا لیڈر بن کر ان سے گفت و شنید کروں جس کے لئے میں تیار نہیں۔ اگر میں انہیں خط لکھوں کہ میں ملنا چاہتا ہوں تو وہ انکار نہیں کریں گے لیکن اس ملاقات کا نتیجہ جو نکلے گا میں خوب جانتا ہوں۔"

جذبات کی یہ کیفیت ہو تو یہ بات بالکل قابل فہم ہے کہ مسٹر جناح آپ کو راستے کا سب سے بڑا کانٹا سمجھتے ہیں۔ خط کے آخر میں آپ نے لکھا ہے "اپنے طور پر اس باب میں جو کوشش آپ کر سکتے ہیں کیجئے۔"

اس فقرے سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ مجھے اجازت ہے کہ مسٹر جناح کو لکھ کر یہ تجویز پیش کروں کہ آپ کی اور ان کی ملاقات ہو جائے۔ مسٹر جناح کو جو خط میں نے لکھا ہے اس کی نقل ملفوف کر رہا ہوں جس کے مطالعہ سے آپ کو معلوم ہو

گا کہ من جملہ دیگر باتوں کے یہ بھی میں نے لکھا ہے کہ نہ میں ایک فریق کا نمائندہ ہوں نہ دوسرے کا۔ نہ شرطیں پیش کرتا ہوں نہ منظور کر سکتا ہوں۔ میں صرف اپنی ذاتی حیثیت سے آپ سے درخواست کر سکتا ہوں۔ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ مسلمان ہندوستان کی آبادی کا ایک جزوِلاینفک ہیں۔ جب تک دوسری قوموں کے ساتھ ان کا خوش دلانہ تعاون حاصل نہیں کیا جاتا اس ملک کی ترقی نہیں ہو سکتی۔

(ب) ۔ باہمی گفتگو سے ممکن ہے کوئی تسلی بخش حل نکل آئے۔"

اس سلسلہ میں جو تجویزیں مسٹر جناح کو میں نے پیش کی تھیں۔ یہ ہیں "کسی اور شخص یا فریق کو اپنے خیالات کا پابند بنائے بغیر یہ عرض کرتا ہوں۔

(۱) پہلے آپ مسٹر گاندھی سے ملنے پر رضا مند ہو جائیں۔ پھر دوسرے لیڈروں سے بھی گفتگو کا سلسلہ جاری کیا جا سکتا ہے۔

(۲) اس کے بعد اگر آپ اور دوسرے لیڈر یہ خیال کریں کہ ملک کے وسیع مفاد کا تقاضا ہے کہ ایک مشترکہ کانفرنس منعقد کی جائے تو آپ اور دوسرے لیڈر یہ قدم اٹھائیں۔

(۳) ان تجویزوں کے جواب میں اگر آپ نے مسٹر گاندھی سے ملنے پر آمادگی کا اظہار کیا تو میں ان کو خط لکھوں گا کہ آپ سے بمبئی یا کسی اور مناسب جگہ ملیں۔ مجھے پختہ امید ہے کہ وہ آپ سے بمبئی یا کسی اور مناسب مقام پر ملنے کو بالکل تیار ہو جائیں گے۔"

تمام پوزیشن پر غور کرنے کے بعد مجھے قطعاً افسوس نہیں کہ میں نے مسٹر جناح کو خط لکھا اس بات کی گارنٹی میں ان سے کیونکر لے سکتا تھا کہ جب وہ آپ سے ملیں گے تو ضرور ہی باہمی سمجھوتہ ہو جائے گا۔ اس قسم کے سمجھوتے کی بنیاد کا فیصلہ کرنا آپ مسٹر جناح اور دوسرے لیڈروں کا فرض ہے۔ تاہم میں یہ پسند نہیں کرتا کہ گفتگو کے آغاز سے قبل ہی ایک فریق دوسرے فریق پر کسی قسم کی پابندی عائد کر دے۔

اس دوران میں اگر فریقین کوئی طریق کار اختیار کر چکے ہیں یا کوئی طریق کار ان کے زیر غور ہے تو میں نہیں چاہتا کہ میرا خط جو میں نے مسٹر جناح کو لکھا ہے۔ اس میں خلل انداز ہو۔ لہٰذا میں نے یہ معاملہ بالکل ترک کر دیا ہے۔ مسٹر

جناح کا جواب اگر آیا اور وہ تسلی بخش ہوا تو میں آپ کو بھیج دوں گا۔ جو فیصلہ آپ چاہیں کریں لیکن آپ کے گزشتہ خط کے پیشِ نظر جو مجھے موصول ہوا ہے میں اس بات کو آگے بڑھانا نہیں چاہتا۔

مخلص

تیج بہادر سپرو

## سپرو

۱۴ فروری ۱۹۴۱ء

ڈیئر مہاتماجی! کل صبح ایک رجسٹرڈ خط آپ کی خدمت میں روانہ کیا تھا۔ کل شام مسٹر جناح کا جواب موصول ہوا جس کی ایک نقل ملفوف کر رہا ہوں۔ میں نے فی الحال ان کو جواب نہیں دیا۔ اگلا قدم اٹھانا اب آپ کا کام ہے۔ آپ کے گزشتہ خط کے پیش نظر جو آپ نے مجھے لکھا تھا میں کسی قسم کا اقدام نہیں کرنا چاہتا۔

مخلص

تیج بہادر سپرو

## گاندھی

۱۶ فروری ۱۹۴۱ء

ڈیئر سر تیج بہادر سپرو! آپ کے دونوں خط ملے۔ شکریہ! جو نکتے آپ نے اپنے خط میں اٹھائے ہیں ان پر اب بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ مسٹر جناح کے خط نے میرے اندیشوں پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ وہ مجھے صرف اس شرط پر شرفِ ملاقات بخشنے کو آمادہ ہیں کہ میں ہندو قوم کا نمائندہ بن کر ان سے ملوں۔ جس کے لئے میں تیار نہیں۔ میں ہندو قوم کی نمائندگی نہیں کرتا میں تو ہندو سبھا کا ممبر بھی نہیں۔ آپ اس صورت حال سے نکل نہیں سکتے اگر آپ اتفاق کریں تو میری تجویز ہے کہ آپ مسٹر جناح کو خط لکھیں کہ ان کی پوزیشن صائب نہیں ورنہ پھر آپ مجھے اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کیجئے کہ میں ہندو قوم کے نمائندے کی حیثیت سے ان سے ملوں۔

مخلص

گاندھی

سپرو

۱۹ فروری ۱۹۴۱ء

ڈیئر مہاتماجی! آپ کا ۱۶ فروری کا خط کل مسٹر شوناتھ کاٹجو نے مجھے لاکر دیا۔ شکریہ قبول فرمائیے۔ میں ۱۵ فروری سے بہت تیز بخار میں مبتلا ہوں۔ آج حالت کچھ بہتر ہے لیکن کام کرنے کے قابل بالکل نہیں ہوں۔

میں نے ابھی ابھی مسٹر جناح کے خط کی رسید انہیں بھیج دی ہے۔ تندرست ہونے پر انہیں تفصیل سے خط لکھوں گا۔ ذاتی طور پر میں مایوس ہو گیا ہوں۔ آپ کو میں اس بات پر آمادہ نہیں کر سکتا کہ آپ ہندو قوم کے نمائندے بن کر ان سے ملیں، نہ مسٹر جناح کو ان کا نقطہ نگاہ ترک کرنے پر مجبور کر سکتا ہوں تاہم سوچوں گا، اگر کوئی معقول راستہ نظر آیا تو اس پر عمل بھی کروں گا ورنہ خاموشی۔

مخلص

تج بہادر سپرو

سپرو

۲ مارچ ۱۹۴۱ء

ڈیئر مہاتماجی! آج مجھے بخار نہیں لیکن کہہ نہیں سکتا کہ دن کے کسی حصے میں پھر حرارت ہو جائے۔

آپ سے مل کر اور باتیں کر کے مجھے بے انتہا خوشی ہوئی۔ ایک گزارش پیش کرتا ہوں۔ اپنی رائے سے مطلع فرمائیے گا۔ میں اس تجویز پر جبھی عمل کروں گا کہ آپ اسے پسند فرمائیں۔

تجویز یہ ہے کہ ہم لوگ جو ۱۳ مارچ کو بمبئی میں مشاورت کے لئے جمع ہو رہے ہیں یہ فیصلہ کریں کہ اس کانفرنس میں، جو مجلس مشاورت کے بعد کسی مناسب تاریخ کو منعقد ہو گی آپ اور مسٹر جناح اور بعض دوسرے لیڈروں کو مدعو کیا جائے تاکہ ان نزاعی امور پر غور کریں جنہوں نے ہندوستان کی مختلف قوموں میں اختلاف پیدا کر رکھا ہے تو کیا آپ تشریف لانا پسند کریں گے؟ آپ نے اگر حامی بھری تو میں مسٹر جناح سے مل کر اور زبانی گفتگو کر کے ان کی منظوری حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔

یہ تجویز اگر ناکام رہی تو بلاشبہ ہماری ناکامیوں میں مزید اضافہ ہو گا لیکن صورتِ حال بد سے بدتر نہیں ہونے پائے گی۔ ہمارا ضمیر مطمئن ہو گا اور دنیا بھی دیکھ لے گی کہ فرقہ وارانہ مصالحت کے لئے جو کچھ ہم سے ممکن حد تک ہو سکتا تھا ہم نے دریغ نہیں کیا اور آپ نے بھی دستِ تعاون دراز کرنے سے کوتاہی نہیں کی۔ یہ تجویز ابھی پختہ نہیں ہوئی تاہم اپنی رائے سے مجھے ضرور مطلع فرمایئے گا۔ ذمہ داری آپ کی نہیں دوسروں کی ہو گی۔

مخلص

تیج بہادر سپرو

## گاندھی

۷ مارچ ۱۹۴۱ء

ڈیئر سر تیج بہادر! امید ہے آپ کا بخار اتر گیا ہو گا۔ اگر آپ قائداعظم اور مجھے مدعو کریں گے تو میں حاضر ہو جاؤں گا لیکن صرف اپنی ذات کی نمائندگی کروں گا۔ تاہم آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ دعوت نامے جاری کرنے سے پہلے پچاس مرتبہ سوچ لیجئے گا۔ ناکامی کا اثر بہت بُرا پڑے گا۔ جس چیز کا مجھے اندیشہ ہے کہ فرقہ وارانہ مفاہمت کے لئے موجودہ وقت موزوں نہیں بہرحال آپ میری اس رائے کے پابند نہیں ہیں۔

مخلص

گاندھی

## سپرو

۱۳ مارچ ۱۹۴۱ء

ڈیئر مہاتما جی! آپ کے ۷ مارچ کے خط کا شکریہ۔ میں آج ہی کلکتہ سے واپس آیا ہوں اور پرسوں بمبئی جا رہا ہوں۔ اطمینان رکھیے آپ اور مسٹر جناح کو کانفرنس میں مدعو کرنے کی کچھ ایسی عجلت نہیں۔ آپ سے مشورہ کئے بغیر میں دعوت نامہ جاری نہیں کروں گا۔ پرسوں تک کلکتہ میں مجھے بخار تھا لیکن کل سے ٹھیک ہوں۔ [1]

مخلص

تیج بہادر سپرو

---

[1] یہ مکمل خط و کتابت ۶ مئی ۱۹۴۱ء کو ہندوستان کے تمام انگریزی روزناموں میں چھپ گئی تھی میں نے ٹائمز آف انڈیا بمبئی سے نقل کی ہے۔

## نواں باب

# ہندوستان چھوڑ دو

قرار داد پاکستان کی منظوری کے سال بھر بعد ۱۱ مارچ ۱۹۴۱ء کو سر سکندر حیات خاں نے پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی میں ہندوستان کے مستقبل کے آئین کے بارے میں ایک ایسی تجویز پیش کی جو قرار داد لاہور کے برعکس تھی۔ انہوں نے فرمایا کہ ہندوستان کی حکومت فیڈرل طرز پر قائم کی جائے۔ جہاں ہر یونٹ کو مکمل حکومت خود اختیاری حاصل ہو۔ البتہ مرکز کو ایک قسم کا ایجنسی سنٹر بنا دینا چاہئے فیڈریشن کے مختلف یونٹ اپنی اپنی نمائندگی کے لئے کچھ اختیارات عطا کر دیں۔

تعجب ہے آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر جس نے ۲۱ مارچ ۱۹۴۰ء کو قرار داد پاکستان مرتب کی تھی سال بھر کے اندر اس قرار داد سے منحرف ہو کر ایک نئی تجویز پیش کر رہا تھا۔ لاہور کے مسلمان اخباروں، زمیندار، انقلاب۔ شہباز۔ احسان وغیرہ نے اس تجویز کے خلاف ایک لفظ نہ لکھا۔ پنجاب پروانشل مسلم لیگ قطعی خاموش تھی۔ گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ سر سکندر نے یہ سکیم پیش کرتے وقت یہ بھی کہا تھا کہ پنجاب مسلم لیگ کو چاہئے کہ میری اس تجویز کے مطابق قرار داد لاہور میں ترمیم کرانے کی کوشش کرے۔ چنانچہ نواب شاہنواز خاں ممدوٹ نے وہیں ایوان میں اعلان کیا کہ انہوں نے اس قسم کی ترمیم کا مسودہ قائداعظم کو بمبئی بھیج دیا ہے۔ روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" نے ۱۳ مارچ ۱۹۴۱ء کو ایک مقالہ افتتاحیہ لکھا جس کا عنوان تھا "نیا پاکستان" اور سر سکندر کی اس تجویز پر تنقید بھی کی اور تعریف بھی کی لیکن ساتھ یہ بھی کہا کہ سر سکندر حیات خاں کو چاہئے کہ اپنے لئے ایک مستقل مقام معین کر لیں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی قرار داد لاہور کی تائید کریں یا آئندہ آئین کے بارے میں کوئی اور محکم سکیم مرتب کر کے اس کی پابندی فرمائیں۔ یہ بار بار پہلو بدلنا اور روز نئی نئی سکیمیں پیش کرنا مناسب نہیں۔

ملک برکت علی نے بھی ۱۳ مارچ کو اس تجویز کے خلاف اخباری بیان دیا اور تجویز کے متعدد پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے بعد کہا۔

"آل انڈیا مسلم لیگ کی قرار داد پاکستان کی ترتیب و تدوین اور منظوری میں وزیر اعظم پنجاب شریک تھے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ انہوں نے کس بے رُخی اور آسانی سے اس قرار داد کو اٹھا کر پرے پھینک دیا۔ انہوں نے ٹھیک کہا ہے کہ پہلا ریزولیوشن انہوں نے مرتب کیا تھا جس میں ایجنسی سنٹر کا ذکر موجود تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ مسلم لیگ نے اس ایجنسی سنٹر کو مسترد کر دیا تھا۔ اور انجام کار قرار داد لاہور مرتب کی گئی تھی۔ جس سے سر سکندر نے اتفاق فرمایا تھا۔ میری درخواست ہے کہ انہیں چاہئے کہ مسلم لیگ کے اس ریزولیوشن کی جو قرار داد لاہور سے موسوم ہے پابندی کریں اور اس میں مین میخ نکالنے کی کوشش نہ کریں۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ سر سکندر نے اپنی تقریر میں پنجاب مسلم لیگ سے کہا ہے کہ ان کی موجودہ تجویز کی روشنی میں قرار داد لاہور میں ترمیم کرانے کی کوشش کی جائے تعجب ہے۔ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے صدر نے وہیں ایوان میں اعلان کر دیا کہ انہوں نے سر سکندر کی تجویز کے مطابق ترمیم مرتب کر کے بالائی حلقوں میں بھیج دی ہے۔ میرا فرض ہے کہ لوگوں کو بتاؤں کہ اس قسم کی ترمیم کے منظور ہونے کا قطعی امکان کوئی نہیں۔ مسلم لیگ کیا معنی کوئی سیاسی جماعت بھی اپنی منظور شدہ قرار دادوں کو اس طرح نہیں بدلا کرتی۔ مسلم لیگ سر سکندر کے مجوزہ ایجنسی سنٹر کی تجویز اچھی طرح غور کر کے اسے مسترد کر چکی ہے۔ اب اس مُردے کو قبر سے نکالنے کا کچھ فائدہ نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ چودھری سر چھوٹو رام یونینسٹ پارٹی کے سب سے طاقتور لیڈر تھے۔ میاں فضل حسین اور چودھری صاحب ہی یونینسٹ پارٹی کے بانیوں میں شمار ہوتے تھے۔ چھوٹو رام کے بغیر یہ پارٹی ایک دن زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔ پنجاب کے وزیر اعظم بلاشبہ سر سکندر حیات خاں تھے۔ لیکن جو اثر و رسوخ حکومت میں چھوٹو رام کو حاصل تھا کسی اور کا نصیب نہ تھا۔

جب سر سکندر نے بار بار سیاسی قلابازیاں شروع کیں اور [1]

کعبے کی ہے ہوس کبھی کوئے بتاں کی ہے!
مجھ کو خبر نہیں مری مٹی کہاں کی ہے!

کے مصداق بیک وقت یونینسٹ اور مسلم لیگ میں پناہ لینے لگے تو اخباری نمائندوں نے چودھری چھوٹو رام سے پوچھا کہ آپ تو بہت بڑے نیشنلسٹ ہیں۔ اور فرقہ پرستی کے نزدیک جانا بھی گناہ سمجھتے ہیں۔ پھر آپ کا اور سر سکندر نباہ کیوں کر ہو رہا ہے۔ جواب میں چودھری صاحب نے فرمایا:۔

"میرے ہم مذہب حیران ہیں کہ سر سکندر حیات خاں بیک وقت بھارت ماتا کے سپوت اور مسلم لیگ کے فرزند عزیز ہونے کا دعویٰ کس طرح کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ اس قسم کا اعتراض کرتے وقت بھول جاتے ہیں کہ پنڈت مدن موہن مالوی، ڈاکٹر مونجے اور ماسٹر تارا سنگھ بھی بیک وقت دو گھوڑوں پر سوار تھے۔ ایک گھوڑے کا نام انڈین نیشنل کانگرس اور دوسرے کا نام ہندو مہاسبھا اور اکالی پارٹی تھا۔ آج بھی سردار ایشر سنگھ مجھیل اور سردار منگل سنگھ بیک وقت دو گھوڑوں پر سوار ہیں۔ سر سکندر مسلم لیگ کے ممبر ہیں لیکن تقسیم ہند کے معاملے میں وہ مسٹر جناح کے ساتھ متفق نہیں۔ جمہوری جماعتوں میں جو فرق آج اقلیت میں ہے کل اکثریت میں بھی ہو سکتا ہے۔ اور ممکن ہے ساری جماعت کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو جائے۔ میں گزشتہ بیس سال سے سر سکندر حیات خاں کے خیالات و عقائد سے نہایت اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ پہلے نیشنلسٹ ہیں۔ گاہے گاہے مسلم لیگی بن ضرور جاتے ہیں لیکن اس سے ان کا "نیشنلزم" کمزور ہونے کی بجائے اور زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔[2]

یہ تو تھی ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۲ء میں پنجاب کے مسلمانوں کی حالت یعنی ۔

بر کفے جامِ شریعت بر کفے سندانِ عشق!!

---

۱۔ روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ لاہور۔ ۱۳ مارچ ۱۹۴۱ء

۲۔ روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ ۱۱ نومبر ۱۹۴۲ء

اب آیئے دیکھیں ہندوستان کے وسیع محاذ پر اس وقت کیا ہو رہا تھا۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں عالمگیر جنگ شروع ہونے کے بعد کانگرس نے یوپی۔ سی پی۔ بہار۔ مدارس۔ اڑیسہ کی وزارتوں سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ جب دیکھا کہ برطانوی حکومت پر استعفے کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ اور وہ کانگرس کی شرطیں ماننے کو تیار نہیں تو "انفرادی سول نافرمانی" جاری کی گئی۔ کانگرسی لیڈر ایک ایک کر کے سڑک یا بازار یا چوک میں کھڑے ہو کر نعرے لگاتے کہ "جنگ میں شریک نہیں ہونا چاہیئے۔" حکومت فوراً گرفتار کر لیتی تھی۔ اس مہم کا افتتاح ونو بھاوے نے کیا تھا۔ جو گاندھی جی کے آشرم میں کام کرتے تھے۔ اور وضع قطع میں بالکل انہی کا نمونہ تھے۔ اس پر مولانا عبدالمجید سالک مرحوم نے یہ پھبتی کہی تھی۔

گاندھی از گجرات و بھاوے از دکن
ننگے پاؤں ننگے سر ننگے بدن!

یہ انفرادی سول نافرمانی بھی آہستہ آہستہ اپنا زور کھو بیٹھی۔ کانگرسی لیڈر حیران تھے اب کیا کریں۔ کرپس کی تجاویز مسترد کر دینا بہت بڑی غلطی تھی۔ اس کے بعد تو ملک بھر میں ایک سیاسی بحران پیدا ہو گیا تھا کہ کسی کو کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ گاندھی جی نے اپنے ترکش کا آخری تیر چلا دیا اور "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک کا آغاز کیا۔ جس کا مطلب تھا تخت یا تختہ۔

جاپانی فوجیں برما کو عبور کر کے ادھر کلکتہ اور ادھر مدارس پر دستک دے رہی تھیں۔ اور ہر شخص کو یقین تھا کہ اب ہندوستان سے برطانیہ کا جنازہ اٹھنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ اس حالت میں گاندھی جی نے ایک بیان دیا کہ برطانیہ کو چاہیئے کہ فوراً ہندوستان سے نکل جائے کیونکہ جاپان کی اہل ہند سے کوئی دشمنی نہیں۔ وہ صرف انگریزوں کا دشمن ہے۔ جونہی انگریز ہندوستان سے رخصت ہوئے جاپانی فوجیں اپنے ملک کو چلی جائیں گی۔ اور ہندوستان فتح کرنے کا ارادہ ترک کر دیں گی۔

گاندھی جی کے اس بیان پر بہت ہاؤ ہو مچی۔

قائداعظم نے کہا "گاندھی جی دھمکی اور دھونس سے انگریزوں کو مرعوب کر کے مسلمانوں کے مطالبہ پاکستان کو کھٹائی میں ڈالنا چاہتے ہیں۔" حقیقت یہ ہے کہ برطانوی حکومت کے خاتمے اور ہندوستان کی آزادی سے کسی ہندوستانی کو اختلاف یا انکار نہیں ہو سکتا تھا۔ سوال صرف یہ تھا کہ آیا اس نازک موقع پر جب چاروں طرف انتشار پھیل رہا تھا۔ انگریزوں کا یکایک

ہندوستان سے رخصت ہو جانا قرین مصلحت تھا۔ دوسرا سوال یہ تھا کہ انگریز یہاں سے رخصت ہوتے وقت ایک منظم و مربوط حکومت کس کے حوالے کر کے جائیں گے۔ محض ایک خلاء پیدا کر دینے سے تو نظام سلطنت نہیں چل سکتا۔ راج گوپال اچاری نے گاندھی جی کے اس بیان سے کھلم کھلا اختلاف کیا۔

کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے ۱۴ جولائی ۱۹۴۲ء کو گاندھی جی کے اس مطالبے کی پوری تائید کرتے ہوئے ایک طویل قرارداد منظور کی، جس کے اہم حصے ہیں۔

۱۔ جب سے جنگ شروع ہوئی ہے، کانگرس نے برطانوی حکومت کو پریشان کرنے سے گریز کیا ہے۔ انفرادی سول نافرمانی اور وزارتوں سے استعفاء محض احتجاج کی ایک علامت تھی۔ مقصد یہ تھا کہ برطانوی حکومت کو احساس کرا دیا جائے کہ وہ اہل ہند پر اعتماد کر کے انہیں اپنے ملک کے نظم و نسق میں مساوی حصہ عطا کرے۔ افسوس ہے برطانیہ کے متکبرانہ اور غیر مصالحانہ رویّے نے تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

۲۔ کرپس کی تجاویز پر بحث کے دوران میں بھی برطانیہ نے ہمارے ساتھ یہی غیر مصالحانہ سلوک کیا تھا جس کے نتائج افسوسناک نکلے اس گفت و شنید کی ناکامی کے بعد چاروطرف مایوسی۔ بددلی، بے اطمینانی۔ پریشانی اور ناامیدی پھیل گئی ہے۔ اور کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ برطانیہ کے خلاف عام دشمنی بڑھتی جا رہی ہے۔

۳۔ ملایا۔ سنگاپور۔ برما وغیرہ کو جاپانی فوجوں نے جس طرح ختم کیا ہے، اس کا اعادہ ہم ہندوستان میں نہیں کرنا چاہتے۔ غنیم کے جارحانہ اقدام کا مقابلہ بہرحال ضروری ہے۔ جس کی واحد صورت یہ ہے کہ ہندوستان کی حکومت اہل ہند کے ہاتھ میں ہو ورنہ یہاں وسیع پیمانے پر خون خرابہ ہو گا۔ فرقہ ورانہ مسئلے کا حل بھی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک بدیشی حکومت یہاں موجود ہے۔

۴۔ جونہی ہندوستان سے برطانوی حکومت کا خاتمہ ہوا، یہاں کے ذمے دار اصحاب باہم مل کر ایک عبوری حکومت قائم کریں گے۔ بعد ازاں مختلف طبقوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی قائم کی جائے گی جو مستقبل کا دستور وضع کرے گی۔

۵۔ اگر برطانیہ نے بدستور ہندوستان پر اپنا قبضہ جمائے رکھا تو کانگرس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہو گا کہ وہ مہاتما گاندھی کی قیادت اور عدم تشدد کے اصول کی پیروی میں برطانوی

حکومت کے خلاف ایک وسیع عوامی تحریک چلائے۔

اس ریزولیوشن کی منظوری کے بعد گاندھی جی نے اخباری نمائندوں سے کہا کہ اب باہمی گفت و شنید کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ برطانیہ کو چاہئے کہ ہندوستان سے رخصت ہو جائے یا رخصت ہونے سے انکار کرے۔ تیسرا راستہ اور کوئی نہیں۔

جب پوچھا گیا کہ کس نوع کی تحریک آپ کے پیش نظر ہے تو گاندھی جی نے جواب دیا کہ یہ بہت بڑے پیمانے پر عوام کی تحریک ہوگی جو عدم تشدد کے اصولوں کے مطابق چلائی جائے گی۔ قید و بند کا معاملہ چنداں اہم نہیں۔ میں تو اس مرتبہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

قائد اعظم نے ۱۲ جون کو بمبئی کے ایک اخباری بیان میں کہا:

۱۔ اگر برطانوی حکومت نے گاندھی جی کی دھمکیوں سے مرعوب ہو کر کانگرس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہندوستان کے مسلمان کو مستقل طور پر ہندو اکثریت کے حوالے کر دیا جائے گا۔

۲۔ گاندھی جی بیس سال سے شور مچا رہے ہیں کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر سوراج حاصل نہیں ہو سکتا۔ لیکن اب انہوں نے اعتراف کر لیا ہے کہ سوراج کے حصول کے لئے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت نہیں۔

۳۔ مسلم لیگ ایک لحہ کے لئے ہندوستان پر برطانوی قبضہ قائم رکھنے کی حامی نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اگر گاندھی جی کی دھمکی کے تحت انگریزی اقتدار یکایک ہندوستان سے اٹھ گیا تو انگریز اس ملک کی حکومت کس کے حوالے کر کے جائیں گے؟

۷۔ اگست ۱۹۴۲ء کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے اجلاس بمبئی میں ورکنگ کمیٹی کے ریزولیوشن کی تصدیق و تائید کر کے اہل ہند سے کہا کہ ہندوستان کی آزادی کی یہ آخری جنگ ہے۔ بے دریغ اس میں کود پڑو۔ اور جو سامنے آئے اسے سیلاب کی طرح بہا کر لے جاؤ۔

۸۔ اگست کو ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبران اور گاندھی جی گرفتار کر لئے گئے۔ گاندھی جی کو آغا خاں کے محل واقع پونا اور ورکنگ کمیٹی کے ممبروں اور صدر کانگرس مولانا ابوالکلام آزاد کو قلعہ احمد نگر میں بند کر دیا گیا۔ یوپی کے مشرقی اضلاع اور بہار میں یکایک فسادات پھوٹ پڑے۔ پولیس افسر قتل کر دیئے گئے۔ سرکاری خزانہ لوٹ لیا گیا۔ بعض شہروں اور قصبوں پر کانگرسی رضاکاروں کا مکمل قبضہ ہو گیا۔ بعد میں حکومت نے کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے بہت

سے خفیہ کاغذات شائع کئے جن میں لوگوں کو یہ ہدایات دی گئی تھیں کہ ریل کی پٹریاں اکھاڑ دو۔ تار کاٹ دو۔ تھانے جلا دو۔ اور سرکاری افسروں کو قتل کر دو۔

لاہور میں ہر سال سرونٹس آف پیپل سوسائٹی لالا لاجپت رائے کی برسی منائی جاتی تھی۔ لاجپت رائے پنجاب کے ہندوؤں کے سب سے بڑے لیڈر تھے۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۲۷ء کو سائمن کمیشن کا لاہور میں وُرود ہوا تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے ایک جلوس نے ریلوے سٹیشن سے باہر اس کمیشن کے ممبروں کے خلاف بہت بڑا مظاہرہ کیا تھا۔ لالا لاجپت رائے جلوس کی رہنمائی کر رہے تھے۔ پولیس نے بے دریغ لاٹھیاں برسائیں۔ ۶۵ پینسٹھ سال کی عمر تھی۔ دمے کے مریض تھے۔ لاٹھیاں برداشت نہ کر سکے۔ اور گر پڑے۔ لوگ اٹھا کر باہر لے آئے۔ اسی رات انہوں نے شاہ عالمی دروازے سے باہر ایک بہت بڑے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ آج مجھ پر لاٹھیاں برسائی گئی ہیں، ان میں ہر لاٹھی کی ہر ضرب برطانوی ملوکیت کے تابوت کی میخ ثابت ہوگی۔ اس حادثے کے بعد لالا لاجپت رائے بہت دن زندہ نہ رہے اور ۱۷ نومبر ۱۹۲۷ء کو فوت ہو گئے۔

لالا لاجپت رائے گاندھی سے بہت پہلے ہندوستان کی پبلک لائف میں داخل ہوئے تھے۔ ۱۹۰۷ء میں انہیں بغاوت کے جرم میں گرفتار کر کے مانڈلے بھیج دیا گیا تھا۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۹ء تک امریکہ میں جلاوطن رہے۔ ستمبر ۱۹۲۰ء میں وہ انڈین نیشنل کانگرس کے اس اجلاس کے صدر تھے جہاں گاندھی جی نے ترک موالات کا ریزولیوشن پیش کیا تھا۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے کے حالات و واقعات پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ لالا لاجپت رائے ہال سرونٹس آف پیپل سوسائٹی اگروال آشرم گلاب دیوی ہسپتال۔ روزنامہ بندے ماترم۔ ہفت روزہ پیپل۔ پروانشل کانگرس کمیٹی۔ آریہ سماج لکشمی انشورنس کمپنی۔ راوی کے کنارے لاجپت رائے نگر۔ یہ تمام ادارے ان کے ممنون احسان تھے۔

۱۹۴۱ء میں لاجپت رائے کی برسی کے موقع پر سرونٹس آف پیپل سوسائٹی نے لاجپت رائے ہال میں پاکستان پر ایک مباحثے کا اہتمام کیا جس میں ہندو۔ مسلمان مسیحی اور سکھ نمائندوں کو شرکت کی دعوت دی۔ سکھوں کی طرف سے سردار ہرنام سنگھ ایڈووکیٹ ہندوؤں کی طرف سے پروفیسر گلشن رائے اور پرنسپل چھبیل داس اور مسیحیوں کی طرف سے بی ایل رلیا رام نے شریک ہونے کا وعدہ کیا۔ مسلمانوں میں سے البتہ کوئی شخص آگے آنے کو تیار نہ تھا۔

سرونٹس آف پیپل سوسائٹی کے سیکرٹری لالاموہن لال نے سرسکندر حیات خاں سے ملنے کی کوشش کی۔ لیکن کامیابی نہ ہوسکی پھر نواب صاحب ممدوٹ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ پنجاب مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے وہی پاکستان کے بارے میں مسلم لیگ کا نقطہ نگاہ پیش کرنے کے اہل تھے لیکن نواب صاحب نے معذرت کی۔ اس کے بعد لالاموہن لال پنجاب کے کم سے کم آٹھ دس سربر آوردہ مسلم لیگی لیڈروں کے پاس گئے۔ لیکن ہر جگہ انکار ہی ملا۔ وہ ملک برکت علی کے پاس تشریف لے گئے۔ ملک صاحب ان دنوں ایک اپیل میں مصروف تھے۔ انہوں نے میرے پاس بھیج دیا۔ لالاموہن لال نے بڑی حسرت کے ساتھ کہا کہ یہ کیا اندھیر ہے کہ چاروں طرف پاکستان کا غلغلہ بلند ہورہا ہے لیکن پڑھے لکھے لوگوں کی مجلس میں آکر کوئی مسلم لیگی پاکستان کے متعلق لیگ کا نقطہ نگاہ پیش کرنے کو تیار نہیں۔

میں نے وعدہ کر لیا کہ ضرور آؤں گا۔ چنانچہ ۱۰ نومبر ۱۹۴۱ء کو لاہور میں پہلی مرتبہ پاکستان کے موضوع پر مباحثہ ہوا جس میں مختلف قوموں کے نمائندے شریک ہوئے۔ بصد کوشش میں نے ملک برکت علی اور پیر تاج الدین کو اپنے ہمراہ چلنے پر آمادہ کیا۔ لاجپت رائے ہال کچھا کچھ بھرا ہوا تھا۔ گیلریوں میں بھی لوگ بیٹھے تھے۔ مسلمان تو پانچ دس سے زیادہ نہ ہوں گے۔ چاروں طرف ہندو اور سکھ تھے۔ روزنامہ ٹریبون کے اسسٹنٹ ایڈیٹر جنگ بہادر سنگھ نے صدارت کی۔ اور سب سے پہلے مجھے طلب کیا کہ پاکستان کے پس منظر، تھیوری اور اس کی عملی صورت پر مسلم لیگ کا نقطہ نگاہ پیش کروں۔ میں نے پون گھنٹہ تقریر کی۔ درمیان میں ڈی اے وی کالج کے نوجوان طلبہ نے شور مچایا لیکن صدر جلسہ نے انہیں خاموش کر دیا۔

تقریر ختم ہوئی تو سوالوں کی بوچھاڑ شروع ہوگئی کہ ہندوستان کے دو حصوں کو جن میں ایک ہزار میل کا فاصلہ ہے، آپ ایک ملک کیونکر بنا سکیں گے۔ میں نے قرار داد لاہور کا متن پڑھ کر سنایا کہ یہ دو حصے الگ الگ مملکتیں ہوں گی۔ دوسرا سوال یہ تھا کہ جب پورے پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت نہیں تو آپ مکمل صوبے کو کیونکر پاکستان میں شامل کر سکیں گے۔ میں نے قرار داد لاہور کا متن پڑھ کر سنایا کہ علاقائی ردّ و بدل کے تحت صوبے کے حدود میں قطع و برید کی جاسکتی ہے۔ تیسرا سوال یہ تھا کہ جو غیر مسلم پاکستان میں اور جو مسلمان ہندوستان میں رہ جائیں گے ان کی حیثیت کیا ہوگی۔ غرضیکہ اسی قسم کے بہت سے سوال کیے گئے جن کے جواب میں نے اپنے فہم و ادراک کے مطابق دیئے۔ آخر میں ایک ہندو خاتون اٹھیں اور کچھ گھبرائے ہوئے لہجے میں

بولیں کہ آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ پاکستان چیز کیا ہے۔ میں حیران تھا جواب کیا دوں۔ ناچار یہ شعر پڑھ کر واپس اپنی جگہ آ بیٹھا۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا!

جب ہندو سکھ اور مسیحی اپنا نقطہ نگاہ پیش کر چکے تو آخری جواب مجھے دینا تھا۔ لیکن حاضرین ملک برکت علی کی تقریر سننے کے خواہشمند تھے۔ ملک صاحب سے میں نے عرض کیا کہ آخری جواب آپ دیجئے۔ وہ تو مصدقہ و مسلمہ لیڈر تھے۔ ان کی تقریر ختم ہوئی تو پہلے سے بھی زیادہ شدّت کے ساتھ سوالوں کی بوچھاڑ شروع ہوئی۔

اس جلسے کی مکمل روئداد ۱۸۔ نومبر کے روزنامہ ٹیبون میں چھپ گئی تھی۔ افسوس یہ پرچہ کوشش کے باوجود نہ ہندوستان میں مل سکا نہ انگلستان میں۔ ورنہ یہاں اس کا دلچسپ اقتباس درج کرتا۔

۱۹۴۲ء کے نومبر میں ملک برکت علی نے قائداعظم کو لکھا کہ اگر واقعی مسلم لیگ کی قرار دادِ لاہور کے مطابق ہندوستان کی تقسیم ہمارے پیش نظر ہے تو ہمیں چاہئے کہ ابھی سے ایک کمیٹی بنالیں جس میں بعض مسلم لیگی لیڈروں کے علاوہ چند جغرافیہ دان۔ مؤرخ۔ قانون دان۔ ماہرِ اقتصادیات۔ زبان دان۔ انجینئر۔ ریٹائرڈ مسلمان فوجی افسر وغیرہ شامل ہوں تاکہ ہندوستان کا ہر پہلو سامنے رکھ کر غور کیا جائے کہ تقسیم کی نوبت آئی تو حد بندی کی لائن کہاں پڑنی چاہئے۔ ملک صاحب کا یہ خط میں نے پڑھا ضرور تھا۔ لیکن کچھ معلوم نہیں قائداعظم نے اس کا جواب کیوں نہ دیا تھا۔ یہ احساس مجھے اب تک پریشان کر رہا ہے کہ ہم نے سات سال میں تقسیم ہند کا کوئی نقشہ، کوئی فارمولا کوئی "بلو پرنٹ" تیار نہ کیا۔ سات سال مسلسل نعروں۔ تقریروں اور بیان بازیوں میں صرف کر دیئے۔ بالآخر جب قرار داد لاہور کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آیا تو چودھری ظفراللہ خاں کو صرف تین دن کی مہلت دی گئی کہ اس قلیل عرصے میں تن تنہا بیٹھ کر کیس بھی تیار کریں اور گزشتہ ایک سو سال کا تاریخی مواد بھی فراہم کریں۔

۲۶ دسمبر ۱۹۴۲ء کو رات کے ساڑھے بارہ بجے سر سکندر حیات خاں یکایک حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے فوت ہو گئے۔ اسی دن ان کے دو صاحبزادوں اور ایک صاحبزادی کی شادی کی تقریب پر بہت پر تکلف دعوت ہوئی تھی۔ جس میں ایک ہزار کے قریب مہمانوں نے

شرکت کی تھی۔ سر سکندر بالکل تندرست اور شاداں و فرحاں دکھائی دیتے تھے۔ بالا بلند۔ خوبصورت خوش پوشاک جامہ زیب انسان تھے۔ رات کے ساڑھے نو بجے انہیں معدے میں درد محسوس ہوا تو فروٹ سالٹ کا ایک گلاس پیا، جس سے طبیعت بحال ہو گئی۔ اور اپنی خواب گاہ میں جا کر سو گئے اور رات ساڑھے بارہ بجے نیند کی حالت میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔
انا للہ وانا الیہ راجعون۔

صبح ہوتے ہی یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ میں مال روڈ پر ملکہ کے بت کے قریب ان کے جنازے میں شریک ہوا۔ ہجوم لحہ بہ لحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ہندو۔ مسلمان۔ سکھ۔ مسیحی۔ بلا امتیاز مذہب و ملت سوگوار اور غم گسار تھے۔ لوگوں کی کثرت کے باعث جنازے کو کندھا نہ دے سکا۔ لیکن میرا دماغ مختلف خیالات و احساسات کا محشرستان بن گیا تھا۔ کل تک یہ شخص اپنے عروج پر تھا۔ اور لوگ اس کی نظر کرم کے محتاج تھے۔ آج ہم اس کے جسد خاکی اور اپنے کندھے پر اٹھا کر قبرستان لئے جا رہے تھے۔۔

اے ہوس خوں رو کہ ہے یہ زندگی بے اعتبار
یہ شرارے کا تبسم یہ خسِ آتش سوار!

مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے جھگڑے۔ سر سکندر سے چپقلش۔ ان کا غصہ۔ ان کی رنجشیں ان کا پیار۔ ان کا انتقام۔ یہ سب چیزیں ایک ایک کر کے ماضی کے دھندلکوں سے نکل نکل کر میرے حافظے میں تازہ ہو رہی تھیں۔ میں نے ان کے خلاف بہت کچھ لکھا اور کہا۔ جو کم سے کم میرے خیال کے مطابق اس وقت میرا فرض تھا۔ انہوں نے بھی مجھے اور میرے اعزہ کو پریشان کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا جو ان کے نزدیک یقیناً ان کا فرض تھا۔

۱۸ جنوری ۱۹۴۲ء کو میرے والد مرحوم و مغفور کا انتقال ہوا تو سر سکندر نے اخبار میں یہ خبر پڑھتے ہی مجھے شفقت اور ہمدردی سے بھرا ہوا خط بٹالہ لکھا۔ اور تاکید کی لاہور آؤ تو مجھ سے ضرور ملو۔

ملاقات ہوئی تو بے تکلفی سے کہنے لگے کہ آج میں وزیر اعظم ہوں۔ جو کچھ تمہیں درکار ہے مجھ سے لے لو ملازمت۔ درآمد و برآمد کا تجارتی پرمٹ، جنگی مال سپلائی کرنے کا ٹھیکہ؟ گھر بیٹھے لکھ پتی بن جاؤ گے میں نے معذرت کی۔ میں قلم کا مزدور ہوں اور اسی مزدوری میں خوش ہوں۔ مجھے پرمٹوں اور ٹھیکوں سے کیا واسطہ۔ ہنس کر کہنے لگے ایک بات بتاؤ۔ کہ عرض کیا

فرمایئے۔ کہنے لگے۔ تم اور ملک برکت علی پانچ سال سے میرے ساتھ لڑ رہے ہو۔ تمہاری اور ملک صاحب کی لڑائی کیوں نہیں ہوتی؟ میں نے عرض کیا کہ یہ ملک صاحب کی شرافت ہے کہ وہ نہیں لڑتے ورنہ میں نے تو لڑنے کی بارہا کوشش کی ہے۔

سر سکندر کی سیاست ہمیشہ زیرِ بحث اور زیرِ تنقید آتی رہے گی۔ لیکن ان کے کردار کی ایک خوبی کا دوست دشمن سبھی کو اعتراف ہے۔ اور وہ ہے ان کی دیانتداری۔ ان کا دامن روپے پیسے کے داغ سے ہمیشہ پاک رہا۔ ۱۹۲۹ء سے لے کر ۱۹۴۲ء تک وہ اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ جن میں کسی عہدے کی تنخواہ بھی پانچ ہزار روپے ماہوار سے کم نہ تھی (اس زمانے کا پانچ ہزار روپیہ آج کل کے پچاس ہزار کے برابر ہے) لیکن ہمیشہ کرائے کے مکان میں رہے۔ لاہور میں اپنا ذاتی مکان تک نہ بنوا سکے۔ وفات کے وقت بھی ایک لاکھ روپے کے مقروض تھے۔

سر سکندر کے انتقال پر دو ہزار کے قریب تعزیت نامے موصول ہوئے جن میں برطانیہ کے وزیر اعظم سر ونسٹن چرچل اور وزیر ہند ایمری کے پیغام بھی شامل تھے۔

اگر سکندر کی زندگی وفا کرتی اور ۱۹۴۷ء تک حیات رہتے تو کیا ہوتا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب محض قیاسات پر مبنی ہے۔ لیکن ایک بات یقینی ہے۔ وہ یہ کہ یونینسٹ پارٹی میں بغاوت نہ ہوتی۔ سردار شوکت حیات فوج کی ملازمت سے استعفا دے کر وزارت کی کرسی پر نہ آ بیٹھتے۔ اور ان کی ہوسِ زر اور حُبِ دنیا کے سینکڑوں دروازے نہ کھلتے۔ سکندر جناح پیکٹ بدستور قائم رہتا۔ راجہ غضنفر علی خاں۔ میاں ممتاز محمد دولتانہ۔ نواب ممدوٹ۔ چودھری نذیر احمد خاں۔ میاں امیرالدین۔ محمود علی قصوری وغیرہ جو آج سرفروشانِ ملت. جاں نثارانِ حریت اور معماران پاکستان میں شمار ہوتے ہیں، خاموشی سے اپنے اپنے دھندوں میں مصروف رہتے۔ رفاقت کمیٹی کا کام بھی جاری رہتا۔ اور علامہ علاؤالدین صدیقی بدستور اس سے وابستہ رہتے۔ سکندر بلدیو پیکٹ کی کار فرمائی میں بھی خلل نہ پڑتا۔ اور سکھوں سے ہمارے تعلقات کشیدہ نہ ہوتے۔ ۱۹۴۶ء کا الیکشن یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر لڑا جاتا۔ اور سوائے چند سرپھرے مسلم لیگیوں کے باقی سب لوگ ۱۹۳۷ء کے الیکشن کی طرح سر سکندر کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے۔ مارچ ۱۹۴۷ء میں پنجاب میں فسادات کی آگ نہ بھڑکتی۔ اور سکھ تقسیم پنجاب کا مطالبہ نہ کرتے۔ اس ضمن میں اور بھی بہت سی باتیں ہیں جو واشگاف نہیں کہی جا سکتیں۔

آں راز کہ در سینہ نہاں ست نہ وعظ است
بر دار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت!

سر سکندر کے انتقال کے بعد پنجاب کی وزارت عظمیٰ کا تاج، جو حقیقتاً کانٹوں کا تاج تھا ملک خضر حیات کو پہننا پڑا۔ اعتراض کیا جاتا ہے کہ خضر حیات کو وزارت عظمیٰ قبول کرنے سے پہلے پنجاب اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی نے اپنا لیڈر منتخب نہیں کیا تھا۔ گزارش یہ ہے کہ اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی تھی کہاں جس کے وہ لیڈر منتخب ہوتے۔ سب سے سینئر وزیر چودھری چھوٹو رام تھے، جنہوں نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ وزارت عظمیٰ کے امیدوار نہیں۔ روزنامہ ڈان نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ سر فیروز خاں نون کو چاہئے کہ مرکزی حکومت سے مستعفی ہو کر پنجاب کے وزیر اعظم بن جائیں۔ لیکن کسی شخص کو بھی یہ تجویز پسند نہ آئی۔ بالآخر گورنر سر برٹرنڈ گلینسی نے جب اپنی تسلی کر لی کہ ملک خضر حیات کو یونینسٹ پارٹی کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہو جائے گا تو انہوں نے ملک صاحب کو بلا کر وزارت مرتب کرنے کی دعوت دی۔ ملک خضر حیات نے اس کے بعد باقاعدہ پارٹی کا اجلاس کیا جہاں انہیں لیڈر منتخب کیا گیا۔ یہ جو کچھ ہوا بالکل پارلیمنٹری اصول کے مطابق تھا۔

انگلستان میں جو پارلیمنٹری نظام کا گھر ہے۔ اس قسم کے دو واقعے میرے سامنے ہوئے ہیں۔ انیتھنی ایڈن خرابی صحت کی بناء پر وزارت عظمیٰ سے سبکدوش ہوئے تو دار العوام کی ٹوری پارٹی نے کسی شخص کو اپنا لیڈر منتخب نہیں کیا تھا۔ ملکہ نے اپنے طور پر نجی ذرائع سے معلوم کیا کہ کون شخص پارٹی کا لیڈر بن سکے گا تو معلوم ہوا کہ ہیرلڈ میکمن کی لیڈری پر غالباً پارٹی رضامند ہو جائے گی۔ چنانچہ ملکہ نے میکمن کو طلب کر کے وزارت سازی پر مامور کیا۔ اس کے بعد پارٹی نے میکمن کو باضابطہ اپنا لیڈر منتخب کیا۔

ہیرلڈ میکمن بیمار ہو کر وزارت عظمیٰ سے مستعفی ہوئے تو انہوں نے خود جا کر ملکہ سے عرض کیا کہ ایلک ڈگلس ہیوم کو طلب فرما کر وزارت بنانے کا حکم دیجئے۔ حالانکہ ڈگلس ہیوم پارٹی کے لیڈر نہیں تھے۔

اس پر لیبر پارٹی نے شور مچایا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے خلاف قاعدہ ہے۔ اور ملکہ معظمہ کو خواہ مخواہ سیاست میں ملوث نہ کیا جائے۔ ٹوریوں نے جواب دیا کہ کوئی نئی بات نہیں۔ ۱۹۴۰ء میں

نیول چیمبرلین نے وزارت عظمیٰ سے استعفا دے دیا تھا تو بادشاہ جارج ششم نے محض اپنی ذاتی صوابدید کی بناء پر ونسٹن چرچل کو بلا کر وزارت بنانے کی دعوت دی تھی۔ حالانکہ چرچل اس وقت ٹوری پارٹی کے لیڈر نہ تھے۔

سچ یہ ہے کہ خدا نے ملک خضر حیات ٹوانہ کو کسی حد تک عمر خضر تو ضرور عطا کی۔ لیکن بختِ سکندر سے محروم رکھا۔ ان کے وزیر اعظم بنتے ہی وہ فتنے یک بارگی جاگ اٹھے جو ان کے پیش رو کی زندگی میں محض مجبوریوں، مصلحتوں، رعایتوں اور پردہ پوشیوں کی بناء پر دبے ہوئے تھے۔

یہ فتنے کیوں یک بارگی جاگ اٹھے اور کس نے انہیں جگایا؟ اس کا جواب میاں ممتاز دولتانہ۔ سردار شوکت حیات۔ راجہ غضنفر علی خاں۔ علامہ علاؤ الدین صدیقی۔ میاں امیر الدین۔ محمود علی قصوری۔ بیگم سلمیٰ تصدق حسین وغیرہ کو دینا چاہئے کہ یہی لوگ پنجاب کے سب سے بڑے قومی ہیرو اور تحریک پاکستان کے سب سے نامور لیڈر ہیں۔[۱]

---

۱۔ خروشچیوف جب روس کے وزیر اعظم بنے تو انہوں نے خدا جانے ذاتی وقار میں اضافہ کرنے کے خیال سے یا کسی اور سبب سے سٹالین کو اس کے منصب سے گرانے کی کوشش کی۔ پے بہ پے مختلف جلسوں میں انہوں نے سٹالین کے خلاف دھواں دھار تقریروں کا سلسلہ شروع کیا کہ وہ بزدل تھا۔ کام چور تھا۔ بددیانت تھا۔ کیمونزم کا دشمن تھا۔ محسن کش تھا۔ قاتل تھا۔ نابکار تھا۔ غرضیکہ کوئی عیب نہ تھا جو سٹالین کی ذات پر نہ تھوپا گیا ہو۔ ۱۹۵۶ء میں کیمونسٹ پارٹی کی کانفرنس میں بھی وہ حسب معمول سٹالین کے خلاف غصے سے بھری ہوئی تقریر کر رہے تھے کہ حاضرین میں سے کسی نے بلند آواز سے پکارا کہ "آپ تو سٹالین کے نائب تھے۔ اس وقت آپ کیوں خاموش رہے"؟

خروشچیوف نے کہا جس شخص نے اعتراض کیا ہے کھڑا ہو جائے۔ مجمع پر خاموشی چھائی اور کوئی شخص کھڑا نہ ہوا خروشچیوف نے اطمینان سے جواب دیا کہ میں بھی سٹالین کی زندگی میں اسی طرح ڈر کے مارے خاموش رہتا تھا اور کھڑا نہیں ہوتا تھا۔

سر سکندر حیات خاں کی زندگی میں، سکندر جناح پیکٹ کی آڑ میں مسلم لیگ کا پنجاب میں خاتمہ کیا گیا۔ پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ پارلیمنٹری پارٹی کے قیام میں قسم قسم کی رکاوٹیں کھڑی کی گئیں۔ مسلمانوں کے حلقوں میں اسمبلی کے ضمنی انتخاب یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر لڑے جاتے تھے۔ اور اسی پارٹی کا ہر جگہ بول بالا ہوتا تھا۔ مسلم لیگ کے کارکنوں کو ذلیل کیا جاتا تھا۔ پاکستان کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ لیکن تحریک پاکستان کے یہ مذکورہ بالا مجاہدین اس وقت سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے اور خروشچیوف کی طرح خاموش بیٹھے رہے۔

## APPENDIX

(1) Correspondence between Malik Barkat Ali and the Speaker of the Punjab Legislative Assembly.

September 9, 1940.

(2) Letter of Malik Barkat Ali to Mr. M.A. Jinnah.

January 25, 1941.

(3) Letter of Mr. Ashiq Hussain Batalvi to
Quaid-i-Azam Jinnah.

March 25, 1941.

(4) Press Statement of Malik Khizar Hayat Khan Premier of the Punjab on his expulsion from the All India Muslim League.

June 6, 1944.



## IS THERE A MUSLIM LEAGUE PARTY IN PUNJAB ASSEMBLY ?

### Interesting Correspondence

On the 9th September, 1940 Malik Barkat Ali, M.L.A., wrote a letter both to the Premier and to the Speaker of the Punjab Legislative Assembly saying that he could no longer sit on the Ministerial benches and that another seat be allotted to him. In reply to this letter the Secretary of the Punjab Legislative Assembly wrote him as follows:—

D.O.N. 1490

Lahore:
Dated: 25-10-1940

Dear Malik Sahib,

With reference to your letter dated the 9th September 1940 addressed to the Hon'ble the Speaker regarding your seat in the Assembly Chamber I am directed to enquire from you the name of the party to which you belong to enable the Hon'ble the Speaker to allot you a seat in the block of that party.

## REQUEST FOR INDEPENDENT SEAT

To this Malik Barkat Ali replied as follows:

Lahore:
Dated: 4-11-1940

My dear Sardar Sahib,

I duly received your kind letter dated the 25th October 1940. I belong to the Muslim League Party, but as no such party by name has been allotted any seats in the Assembly Chamber, I request that I may be allotted a seat for the present on the Independent Benches next to Mian Abdul Aziz if possible. Not that I belong to the Independent Party but I should like to have a seat where I may not be deemed as belonging to any party recognised at present in the Assembly and in a position to preserve my freedom. The delay in reply is very much regretted as I was preoccupied with the serious illness of my father.

The following correspondence then ensued:—

D.O. 1707

Assembly Chamber, Lahore:
November 15, 1940

Dear Malik Sahib,

With reference to your letter dated the 4th November, 1940 addressed to the Secretary regarding your seat in the Assembly Chamber, I am directed to inform you that the Hon'ble the Speaker has allotted you seat No.120 under rule 50 of the Punjab Legislative Assembly Rules.

I enclose herewith a copy of the plan.

Yours sincerely,
(Sd.) H. Ahmad Shuja

## RELEGATED TO BACK BENCH

Lahore: 18-11-1940

Dear Hakeen Sahib,

I thank you for your D.O. No. 1707 dated the 15th November, 1940 enclosing a copy of the plan of seats in the Assembly, and informing me that the Hon'ble Speaker has allotted me seat No. 120 under Rule 50 of the Punjab Legislative Assembly Rules. Kindly

communicate my thanks to the Hon'ble Speaker for having thus accommodated me. I notice that the seat that has been allotted to me is on the back benches in Block No. 4

You will remember that when you met on the 9th night at the house of Nawab Muzaffar Khan on the occasion of the marriage of his daughter. you very kindly explaind to me that as there was no officially recognised Muslim League Party in the Assembly and as I wanted to sit as an unattached member belonging neither to the Congress nor to the independent Party (the only other recognised Parties in the Assembly). the Hon'ble Speaker could only allot me a seat on the last benches under Rule 50 of the Punjab Legislative Assembly Rule. You had also stated that as an official reply to this effect was considered proper. hence you were giving me the information orally. My reply to you on this occasion was that a seat in the House was enough for me. and that under the circumstances I would prefer this back Bench seat to the Front Bench seat that I was occupying.

Finally I desire to know on the authority of the Hon'ble Speaker himself whether it is true that no officially recognised Muslim League Party exists in the House and whether he has never yet been informed of the existence of such a party in the Punjab Legislative Assembly.

If there is no officially recognised Muslim League Party in the House then obviously I must sit as an unattached member. as stated by me in my first letter. even though for this prurose I have to sit on a Back Bench.

Yours sincerely.
Malik Barkat Ali

## LETTER TO SPEAKER

Lahore: Dated: 2-12-1940

To: The Hon'ble Ch. Sir Shahab-ud-Din.
Speaker. Punjab Legislative Assembly.
Lahore.
Sir.

I enclose herewith a copy of a letter that I wrote to your Deputy

Secretary in reply to his D.O. 1707, dated the 15th November, 1940. I had requested your Deputy Secretary to lay this letter before you. I trust that he has done so. I have not so far received any reply from him and I am accordingly sending a copy of my letter addressed to him, direct to you. I request that you may kindly let me know whether there is any officially recognized Muslim League Party in the Punjab Legislative Assembly.I want this information from you in confirmation of the information given to me by Hakeem Ahmad Shuja;Deputy Secretary,to the effect that there is no officially recognised Muslim League Party in the Punjab at your earliest convenience.

Yours etc.,
Malik Barkat Ali

## SPEAKER'S REPLY

D.O. No. 100

Charing Cross, Lahore
16th January, 1941

Dear Malik Sahib,

I am directed to acknowledge the receipt of your letter of the 6th Jan. 1941, addressed to the Hon'ble the Speaker and to say that the rules of procedure do not require "official recognition" of political parties in the Punjab Legislative Assembly.

Regarding your enquiry about the minimum number of members required to form a group for the purpose of allotting a separate block, I am to inform that groups of less than 12 members are not taken into account for the purpose according to our practice.

Yours sincerely,
(Sd) H. Ahmad Shuja

## WANTED : DEFINITE INFORMATION

Lahore: Dated: 17-1-1941

Dear Hakeem Sahib,

I am in receipt of your kind D.O. No. 100 dated the 16th of the January 1941. I am afraid the questions to which I wanted an

answer remain unanswered.

You will remember that in my letter to you dated 18-11-1940, I had requested to be informed whether before allotting me a seat on the back benches the Hon'ble Speaker who had undoubtedly consulted the Leader of the House, had also consulted the Leaders of other parties, as required by rule 50 of the Punjab Legislative Assembly Rules. This question remains unanswered, although I repeatedly asked for this information in my letter dated 2-12-1940. I request that an answer to this question may kindly be vouchsafed to me.

## Still in the Dark

As regards the other question, namely, whether "any officially recognised Muslim League Party" exists in the House and whether he (the Hon'ble Speaker) has ever yet been informed of the existence of such a pary in the Punjab Legislative Assembly, you write "that the rules of procedure do not require Official recognition of political parties in the Punjab Legislative Assembly". I am afraid, this statement leaves me as much in the dark as before. When using the expression "officially recognised Muslim League party" in the Punjab Legislative Assembly, I had merely used the very expression that you had used when you met me on the evening of 9th Novemeber, 1940, at the house of Nawab Muzaffar Khan and told me that as the Muslim League party on the benches of whin the Punjab Legislative Assembly, I
could only be allotted a seat as an unattached member.

The very Rule 50 under which the Hon'ble Speaker allotted me a seat speaks of "Leaders of Parties". In your letter under reply, you say that before any group can be allotted a separate block, it must consist of at least 12 members. It is,thus obvious that the Rules do recognise the existence of parties in the Punjab Legislative Assembly for the purpose of sitting as one block. It was only in this sense that I wanted to know whether any Muslim League party existed in the Punjab Legislative Assembly and whether any block of seats had been set apart for it.

If no block for the Muslim League Party has been set apart, it is obvious that no Muslim League Party of the minimum strength has been formed. The Hon'ble Speaker can only allot seats to such a party when its existence is communicated to him and he is asked to allot a separate block to it. Without therefore entering into the question as to whether the use of the expression "Officially recognised" party is correct or not. I only want information on the simple point whether any Muslim League Party occupying a separate block of seats exists in the Punjab Legislative Assembly, in the same manner in which the Congress party or the independent Hindu party occupying separate block of seats exists in the Punjab Legislative Assembly.

I request that this letter of mine may be laid before the Hon'ble Speaker for replies on the points I have mentioned.

Yours sincerely,
Malik Barkat Ali

## LIGHT AT LAST

D.O. No 176

Lahore: Dated: 24-1-1941

Dear Malik Sahib,

Your letter of the 17th instant.

In regard to the other point, namely, whether any Muslim League Party with a separate block of seats exists. I am to say that the blocks that exist in the Assembly at present are:—

1. The Ministerial:
2. The Congress and
3. The Independent.

The Hon'ble Speaker is not aware of the internal grouping of the members in each of the above-mentioned blocks on the basis of any political alliance or party allegiance.

Yours sincerely,
H. Ahmad Shuja
(Deputy Secretary).

From, Malik Barkat Ali (Member, Working Committee, All India Muslim League)
To: Mr. M.A. Jinnah,
Mount Pleasant Road,
Malabar Hill,
Bombay.

19, Temple Road,
Lahore,
25-1-1941

Dear Mr. Jinnah,

I enclose herewith a copy of the correspondence that passed between me and the Speaker of the Punjab Legislative Assembly regarding my seat in the Assembly Chamber. From a perusal of this correspondence you will find that there is no Muslim League Party in the Punjab Legislative Assembly. The only parties in the Assembly are (i) the Unionist Party, (ii) the Independent Hindu Party, and (iii) the Congress Party. This shows how successfully Sir Sikander has been deceiving others outside the Punjab into thinking that there is a Muslim League Party in the Punjab Assembly Chamber.

I have already intimated to you that the list of names communicated to the office of the All India Muslim League as members of the Council on behalf of the Punjab Provincial Muslim League was prepared by Sir Sikander Hayat Khan and was passed in the meeting of the old Council of the League as formed by him on the 10th of January, 1940. He has deliberately not put my name amongst the members of the Council of the All India Muslim League on behalf of the Punjab. It is not me alone whom he has left out. He has left out every true Muslim Leaguer including Mr. Ghulam Rasul Khan, Khalifa Shuja-ud-Din, Pir Tajud Din and Mr. Ashiq Hussain Batalvi. His list mostly consists of Hony. Magistrat es, Contra-

ctors, and sub Registrars who will merely obey his orders. I must say that by capturing the League organisation he has done the greatest damage to the cause of the Muslim League. He thought that in this way he would be able to control me, but he forgot that my allegiance is not to him but to the Muslim League. Yesterday, one of his minions reported to me that the reason why my name has been omitted from the list, is that Sir Sikander is keen on excluding me from the Working Comittee of the All India Muslim League and that now even in spite of you I cannot become a member of the Working Comittee. I have done my best to apprise you of the situation here. The final action rests with you I must say that the affiliation of the bogus League consisting of jee hazurees was the greatest blunder ever commited. If you think that Sir Sikander should remain the master of the League Organisation then naturally there is an end of the matter, but let me respectfully point out that this would be a great blunder. I have just looked up rule 14 of the Constitution and Rules of the All India Muslim League and I find that the members of the Working Committee are to be nominated by the President from amongst the members of the Council. This means that Sir Sikander has fully achieved his object namely of keeping me out of the Committee, unless you foil Sir Sikander's attempt by either refusing to accept the list sent by the so called affiliated Punjab Provincial Muslim League or include me amongst the Council members by filling any vacancy that might arise. I may inform you that most of the members in his list are persons who defied the ban of the League in matter of War Committees. The Punjab Leagues has taken no action whatever against those members of the League who defied the ban, for the obvious reason that the defiance was under the orders of Sir Sikander. The Punjab League has even refused to call for explanations from those members of the Council of the All India Muslim League from whom the Enquiry Comittee had called for explanatioms. The method adopted was as

follows.

When the letter of Nawabzada asking for explanation came. Sir Sikander's Parliamentary Private Secretary, Syed Amjad Ali wrote to the defiant members that they should simply send the following reply to the Secretary of the Punjab Provincial Muslim League: ''refer to President''. Accordingly the defying members of the Council of the All India Muslim League wrote to the Secretary of the Punjab League, saying: ''refer to President''.

The President Nawab Mohammad Shahnawaz Khan Mamdot is but a slave of the Premier and although there were no explanation sent by the members of the Council of the All India Muslim League, he has sent an explanation on their behalf himself. This is really strange. The Nawab has not so far even communicated the names of the defiant members to the All India Muslim League Head-quarters. This is how the League Organisation is being run here. The Nawab has also sent a letter to the Press saying ''that in view of the working of the Unionist Party, it is unnecessary to from a Muslim League Party in the Punjab Legislative Assembly''. This is remarkable, coming from the President of an affiliated Provincial Muslim League. I would request that you may kindly ask Nawabzada Liaqat Ali Khan to call for explanations from the defiant members themselves and not treat the letter from Nawab Mohammad Shahnawaz Khan or his organising secretary as the explanation of the defiant members. The names of these apparently reached Nawabzada Liaqat Ali Khan somehow as Nawab Mohammad Shahnawaz Khan never communicated even the names of names of the defying members to Nawabzada Liaqat Ali Khan. Trusting that the affairs of the Punjab will receive due attention at your hands and with all regards.

Your sincerely,

M. Barkat Ali

Note: I may however inform you that the majority of the persons whose names are now sent for inclusion as members of the Council of the All India Muslim League are not even members of any primary League in the Province.

From: Ashiq Hussain Batalvi, Lahore,
1.3.1942
To: Qaid-i-Azam M.A. Jinnah.
Mount Pleasant Road,
Malabar Hill,
Bombay.

Dear Qaid-i-Azam,

I am writing this letter to inform you of the grave situation that has been created in the Punjab in connection with the Pakistan issue. The Mussalmans of Phillaur, district Jullundur, arranged a Pakistan Conference for the 20th of February, 1942 and elected me as its President. On that very date viz: the 20th of February, 1942, the district Magistrate Jullundur visited Phillaur and informed the members of the Reception Committee and me that under the special orders of the Punjab Government received on the 19th of February, 1942, after two p.m. the holding of the Conference must be prohibited. He further stated that the holding of the Conference could only be allowed on the following conditions:

(a) that the question of Pakistan is not discussed:

(b) that the Lahore resolution of the All India Muslim League is not discussed or commented upon, and

(c) that it should not be mentioned that the Mussalmans and the Hindus were two separate nations and that therefore the Mussalmans of those provinces where they were in a majority had a right to secede from the Centre.

This order is as obnoxious as any order can be, and it is a misfo-

rtune that this order should have been issued by a Government which is headed by a Mussalman who is further a member of the Working Committee of the All India Muslim League. As we have repeatedly brought to your notice Sir Sikander agreed to join the Muslim League in order that he might completely control the activities of the Muslim League in this province and thus be in a position to completely suppress the movement. He did his utmost to prevent the organisation of the League through his control which he possessed over the Provincial Organisation. But the movement was beyond his control and in spite of the deadness of the Provincial Organisation the masses caught your inspiration and the cause of the League progressed from strength to strength. He has recently entered according to the press reports into a coalition with the Akali party and one of the conditions of the coalition is that all Pakistan and Anti-Pakistan Conferences shall be prohibited. How far this is true, I cannot say. But the prohibition of the Pakistan conference at Phillaur, and the conditions imposed tell their own tale. We have, through out not interfered with the Provincial Organisation for the obvious reason that the Provincial Organisation was in the hands of men who were Yesmen to Sir Sikander and who could not possibly displease him. The present order of the Punjab Government is really the climax and the question arises whether those M.L.As. whom Sir Sikander got elected on the League ticket from Urban areas, as otherwise their election was impossible, will do anything to oppose this order. I am suie that you must have received complete details of this situation as people here are boiling with indignation. Surely this matter now calls for your special attention. We deliberately refrain from suggesting any concrete course of action. It will be for you in your wisdom to give the necessary orders. After this conduct Sir Sikander is not entitled to the support of the League and it is time that you order the so called members of the Muslim League in the Provincial Legislature to form a Muslim League Party. If you

call a report from the Official President, he will undoubtedly say that there is a Muslim League party in the Assembly. But this is entirely a wholly untruth. If there is a Muslim League, surely there should be some protest against this order, and the obvious protest is to pass a resolution condemning this order and henceforth deciding not to support Sir Sikander's Government. Nobody here will do this, even if you order action on these lines. We are, of course, at your disposal and will do anything that you order. But this fraud of the Unionist party deserves to be exposed. There was sometime ago a movement among some muslim members of the Punjab Legislative Assembly to form a Muslim League party but the proposal came to nothing as it was felt that Sir Sikander enjoyed your support and that unless and until you blessed the movement of these Muslim members it was useless to start a Muslim League party. The Provincial Organisation, being in Sir Sikander's hand, would at once proceed to disown this party. Hence these members after discussing the position disbursed.

My object in writing this letter is merely to apprise you of the situation. The mussalmans owe you so much that they can only depend on you and will do what you in your wisdom consider best. We have told the local friends that we can not take any action without specific orders from above.

With profound regards,

Yours sincerely,
A.H. Batalvi.

ضمیمہ نمبر۴

# سکندر جناح پیکٹ اور ملک خضر حیات ٹوانہ

۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک پنجاب کی سیاست سکندر جناح پیکٹ کے گرد گھومتی رہی ہے۔ جب تک اس پیکٹ کے مالہ وماعلیہ پر بخوبی غور نہ کرلیا جائے. پنجاب کی اس دور کی سیاسی الجھنیں سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ اسی پیکٹ کی آڑ لے کر ملک خضر حیات ٹوانہ نے اپریل ۱۹۴۴ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے ہائی کمان کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اسی پیکٹ کی آڑ لے کر آل انڈیا مسلم لیگ کے ہائی کمان نے ملک خضر حیات ٹوانہ کو مسلم لیگ سے خارج کر دیا تھا۔عجیب بات ہے کہ یہ دونوں فریق ایک ہی پیکٹ کو اپنے اپنے طرز عمل کے جواز میں بطور سند پیش کرتے تھے۔

یہ پیکٹ ۱۴-اکتوبر ۱۹۳۷ء کو بمقام لکھنؤ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس پر سر سکندر حیات خاں اور قائداعظم جناح کے درمیان ہوا تھا۔ اس پیکٹ یا میثاق کی عبارت یہ تھی۔

(ا) ”سر سکندر حیات خاں واپس پنجاب جاکر اپنی پارٹی کا ایک خاص اجلاس منعقد کریں گے۔ جس میں پارٹی کے ان تمام مسلمان ممبروں کو. جو ابھی تک مسلم لیگ کے ممبر نہیں بنے. ہدایت کریں گے کہ وہ سب مسلم لیگ کے حلف نامے پر دستخط کر کے لیگ میں شامل ہوجائیں.اندریں حالات وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی اور صوبائی بورڈوں کے قواعد وضوابط کی پابندی کریں گے۔ لیکن یہ معاہدہ یونینسٹ پارٹی کی موجودہ کولیشن پر اثر انداز نہیں ہو گا۔

(ب) یہ معاہدہ قبول کرنے کے بعد آئندہ پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے عام اور ضمنی انتخابات میں وہ متعدد فریق جو موجودہ یونینسٹ پارٹی کے اجزائے ترکیبی ہیں. متحدہ طور پر ایک دوسرے کے امیدواروں کی حمایت کریں گے۔

(ج) پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے وہ مسلم ارکان جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے

ہیں یا اب لیگ کی رکنیت قبول کرتے ہیں' اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی متصور ہوں گے۔ ایسی مسلم لیگ پارٹی کو اجازت ہوگی کہ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کی سیاسی پالیسی اور پروگرام کے بنیادی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی دوسری پارٹی سے تعاون یا اتحاد کرے۔ اس قسم کا تعاون انتخابات سے ماقبل یا مابعد دونوں صورتوں میں کیا جاسکتا ہے۔ نیز پنجاب کی موجودہ متحدہ جماعت اپنا نام یونینسٹ پارٹی برقرار رکھے گی۔

(د) مذکورہ بالا معاہدے کو مدنظر رکھتے ہوئے پروانشل مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کی تشکیل از سرنو عمل میں لائی جائے گی۔"

آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ میں سرسکندر کے علاوہ بنگال کے وزیر اعظم مولوی فضل الحق اور آسام کے وزیر اعظم سر محمد سعد اللہ نے بھی مسلم لیگ میں شرکت کا اعلان کیا تھا۔ لیکن تعجب ہے کہ قائداعظم نے مولوی فضل الحق یا سر محمد سعد اللہ سے کسی قسم کا معاہدہ کرنا ضروری خیال نہ کیا۔ صرف سرسکندر حیات خاں سے معاہدہ کیا گیا۔ اس کی وجہ کیا تھی اور سرسکندر کے ساتھ یہ خاص سلوک کیوں روا رکھا گیا تھا یہ راز سمجھ میں نہیں آسکا۔

بادی النظر میں اس پیکٹ کا مفہوم یہ تھا کہ آئندہ یونینسٹ پارٹی ایک مستقل اور قائم بالذات پارٹی نہیں رہے گی بلکہ دو مختلف گروہوں پر مشتمل ہوگی۔ ایک گروہ مسلمان ممبروں کا ہوگا اور دوسرا گروہ چودھری سرچھوٹو رام کا ہندو جاٹوں کا ہوگا۔ ان دونوں گروہوں کی کولیشن کا نام یونینسٹ پارٹی ہوگا۔

اس پیکٹ کے بعد سرسکندر حیات خاں پانچ سال زندہ رہے۔ اس عرصے میں انہوں نے پنجاب اسمبلی میں کوئی مسلم لیگ پارٹی نہ بنائی۔ مسلمانوں کے حلقوں میں اسمبلی کے تمام ضمنی انتخابات یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر لڑے جاتے تھے۔ نواب سر شاہنواز خاں ممدوٹ نے اعلان کر دیا تھا کہ یونینسٹ پارٹی بہت اچھا کام کر رہی ہے لہٰذا پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی بنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے ہائی کمان اور قائداعظم کو یہ تمام باتیں معلوم تھیں۔ راجہ غضنفر علی خاں نے، جو سرسکندر کی وزارت میں پارلیمنٹری سیکرٹری تھے، سکندر جناح پیکٹ کے فوراً بعد ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو ایک اخباری بیان میں اس پیکٹ کی تشریح کرتے ہوئے کہا تھا۔

"سکندر جناح پیکٹ کی رُو سے یونینسٹ پارٹی کے رویّے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ اور یونینسٹ پارٹی اور موجودہ وزارت کے دوسرے فریقوں کے باہمی تعلقات میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔"

خود سر سکندر نے، لکھنؤ سے واپس آتے ہی، ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" لاہور میں لکھا تھا:۔

"جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے یہ پیکٹ مختلف جماعتوں پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ اور ان جماعتوں کی موجودہ حیثیت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ البتہ یونینسٹ پارٹی کے ان مسلمان ممبروں کو جو مسلم لیگ کے ممبر نہیں ہیں، مشورہ دیا جائے گا کہ وہ لیگ کی رکنیت بھی قبول کرلیں۔"

جہاں تک عام یا ضمنی انتخابات کا تعلق ہے۔ اس پیکٹ کا یہ نتیجہ ہوگا کہ وہ مسلمان امیدوار جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوں گے، انہیں الیکشن سے پہلے اقرار کرنا پڑے گا کہ کامیاب ہونے کے فوراً بعد یونینسٹ پارٹی میں شریک ہوجائیں گے۔ اس طرح انہیں الیکشن میں یونینسٹ پارٹی کی مدد بھی حاصل ہوگی۔

ان باتوں سے صاف عیاں ہے کہ پنجاب میں اس وقت جو جماعتیں جس جس طرح کام کررہی ہیں، ان میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔"

علامہ اقبالؒ نے پنجاب پروانشل مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے اپنے انتقال سے دو مہینے قبل، فروری ۱۹۳۸ء میں جو بیان سکندر جناح پیکٹ کے بارے میں دیا تھا اور جو افسوس ہے کہ بعض وجوہ سے اس وقت اخباروں میں شائع نہ ہوسکا، اس میں یہ عبارت بھی موجود تھی کہ

"ملک برکت علی نے مجھے اطلاع دی کہ ۳۰ جنوری ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس دہلی میں یہ مسئلہ زیرِ بحث آیا تھا اور وہاں یونینسٹ پارٹی کے ایک ذمہ دار رکن نے یہ بیان کیا تھا کہ رکنیت کی درخواستوں پر مسلم ارکان کے دستخط حاصل کرلئے گئے ہیں۔ اور دستخط کرنے والوں نے یہ عہد کیا ہے کہ وہ سکندر جناح پیکٹ کے مطابق لیگ

کے رکن بننے پر آمادہ ہیں۔ اس مقام پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصل صورت حال واضح کر دی جائے۔ سر سکندر کا دعویٰ ہے کہ تحریری معاہدے کے علاوہ ان کے اور مسٹر جناح کے درمیان زبانی افہام و تفہیم بھی ہوئی تھی۔ ملک برکت علی ایم۔ ایل۔ اے نے مجھے بتایا کہ جب آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں بحث ہوئی تھی تو مسٹر جناح کی توجہ سر سکندر کے اس دعویٰ کی طرف بھی منعطف کی گئی تھی۔ مسٹر جناح نے صاف کہا تھا کہ سکندر جناح پیکٹ کے متن کے علاوہ سر سکندر سے ان کی کوئی زبانی افہام و تفہیم نہیں ہوئی۔ "

سر سکندر کے انتقال کے بعد جب یونینسٹ پارٹی کے بعض مسلمان ممبروں نے جن میں راجہ غضنفر علی خاں پیش پیش تھے، ملک خضر حیات ٹوانہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو ملک صاحب موصوف سے مطالبہ کیا گیا کہ یونینسٹ پارٹی توڑ دو اور اس کی جگہ مسلم لیگ پارٹی قائم کرو۔ اس موقع پر پھر سکندر جناح پیکٹ سامنے آیا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا ہائی کمان اس پیکٹ کے وجود ہی سے انکار کرتا تھا۔ ادھر ملک خضر حیات اپنی صفائی میں اسی پیکٹ کو بطور دلیل پیش کرتے تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے ہائی کمان نے ۲۷ مئی ۱۹۴۴ء کو ملک خضر حیات ٹوانہ کو حکم عدولی، نافرمانی، غداری اور مسلمانوں کے قومی مفاد سے چشم پوشی کے جرم میں مسلم لیگ سے نکال دیا۔ ملک صاحب نے اپنی پوزیشن واضح کرنے کے لئے ایک طویل بیان دیا جو ۶ جون ۱۹۴۴ء کو ہندوستان کے تمام بڑے بڑے اخباروں میں شائع ہوا تھا۔ میں نے یہ بیان روزنامہ "ایسٹرن ٹائمز" سے نقل کیا ہے۔ انشراح صدر کے خیال سے اور کچھ اس خیال سے کہ واقعات کا ان کے صحیح پس منظر میں دیکھا جانا ضروری ہے۔ ملک صاحب کا مکمل انگریزی بیان نیچے درج کیا جاتا ہے۔

یہاں ضمناً اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ۱۴۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو سکندر جناح پیکٹ کی ترتیب و تحریر کے وقت۔ غلام رسول خاں مرحوم سیکرٹری پنجاب پروانشل مسلم لیگ اور راقم التحریر (جائنٹ سیکرٹری پنجاب پروانشل مسلم لیگ) لکھنؤ میں موجود تھے اور یہ پیکٹ ہمارے سامنے لکھا گیا تھا۔

———— ○ ————

Simla: June 6, 1944 — The Hon'ble Nawabzada Malik Khizar Hayat Khan, Premier of the Punjab has issued the following statement

"My fears have been realised and the Committee of Action has decided to expel me from the Muslim League without giving me an opportunity to clear my position. I cannot say that I am surprised. When Mr. Jinnah had his last conversation with me on the telephone on the night of April 27-28th he informed me angrily that he would expel me from the League. This threat was made before I had issued my statement. Later, he thought better of this and referred the matter to the Committee of Action. It was, however, hardly to be expected that the Committee of Action, which after all consists of his nominees, would fail to carry out his orders. Specious reasons have been advanced for my expulsion but it is obvious that I have been expelled because I refused to accept Mr. Jinnah's demands which sought to end a state of affairs accepted by Mr. Jinnah and the League for more than six years.

Case "Prejudged"

"My case was prejudged and decided before the Committee of Action ever professed to give me an opportunity to explain certain passages in my statement of April 28. By refusing to clarify its attitude in regard to the Pact it prevented me from clearing my position. While striving to maintain an appearance of judicial impartiality, the Committee soon showed that in fact the matter had been prejudged. In its resolution dated May 14th, 1944, there occurs the following passage:

"The Committee once again desire to draw Malik Sahib's attention to the passages quoted in the previous communication from his statement of April the 28th which in their opinion constitute a deliberate and grave violation of the basic principles, rules, policy and programme of the All India Muslim League".

"I feared from this explicit expression of opinion that the Committee had decided on its course of action, but, in my anxiety to

preserve Muslim solidarity and to avoid precipitating a breach. I deliberately refrained in my letter dated May 20th from protesting against the Committee's attitude and merely repeated my request for a reply to my questions. The Committee saw that I would not fall into the trap laid for me and announced its intention of making known its pre-determined decision on May 27th in Lahore. Then and then only did I protest against the inequity of condemning me unheard.

``The Committee of Action has made much of my alleged refusal to go to Delhi and discuss the matter face to face with it. It has misquoted my second reply (dated May 20th) I said `no useful purpose would be served by my going to Delhi in the present circumstances'. In referring to this sentence, the Committee has omitted the words `in the present circumstances' and so has altered its sense. I was prepared to dicuss the matter with the Committee, but my doing so was useless until the Committee had clarified its attitude to the Sikander-Jinnah Pact. Had it done so, I would have been glad to meet it.

## Sikander-Jinnah Pact

``Although the Committee of Action previously refused to answer my questions about its attitude to the Sikander-Jinnah Pact, it has now made its attitudes clear. The amount of space which the Committee has devoted to the Pact in its statement shows how little truth there was in the allegation that I had introduced an irrelevant and confusing issue by referring to the Pact.

``The Committee of Action holds that, there was no Pact and that there was `at the most an undertaking or assurance given by him (Sir Sikander Hayat Khan) to the All-India Muslim League Council that he will himself become a member and also induce other Muslim members of his party to sign the Muslim League creed and join it. It goes on to say that when the Muslim members of the Unionist Party joined the Muslim League, the Unionist Party cea-

sed to exist though there was no bar to the continuation of the coalition between the Hindu and Sikh groups and the Muslim League Party. The Committee of action says that the Muslim League never adopted a resolution accepting the Pact that no person can join the League subject to 'mental reservations and self-imposed Conditions, and the Committee has examined the constitution of the Unionist Party and found it so different from that of the League that no honest man could belong to both.

"It may be that there was no formal resolution of the Muslim League accepting the Pact, but there is no doubt that it was regarded by Sir Sikander as a gentleman's agreement between him and Mr. Jinnah equally binding upon Sir Sikander's followers and the Muslim League of which Mr. Jinnah was the leader. That the Pact was accepted by the All India Muslim League is shown by a statement issued to the press on October 20, 1937, by the Secretary of the Punjab Provincial Muslim League. After referring to Sir Sikander's statement at the meeting of the Council of the All-India Muslim League held on October 14th, the Secretary says: 'After Sir Sikander had made the statement, the drafting of the agreement was entrusted to Sir Sikander and Malik Barkat Ali, M.L.A. The agreement so drafted was accepted by the Council of the All-India Muslim League.'

### Mr.Jinnah's "Admission"

"It is quite untrue that there was no pact. Its existence can be proved from Mr. Jinnah's introduction to the publication by Sheikh Mohammad Ashraf of Allama Iqbal's letters to Mr. Jinnah. Mr. Jinnah says:

........ 'Sir Mohammad Iqbal played a very conspicous part, though at the time not revealed to public, in bringing about this consummation. He had his own doubts about the Sikander-Jinnah Pact being carried out and he was anxious to see it translated into some tangible results without delay so as to dispel popular misappr-

chensions about it.'

"Moreover. Sir Mohammad Iqbal himself refers to this Pact in his letters to Mr. Jinnah. In a letter dated November, 1,1937, he says:

'........ Statements have been issued to the press by both sides, each side putting its own interpretation on the terms of the Jinnah--Sikander agreement ......... This as far as I know does not appear in the Jinnah-Sikander agreement.'

"In another letter dated November 10, 1937, the following passage occurs:

'........ In your pact with him (Sir Sikander) it is mentioned that the Parliamentary Board will be reconstituted and that the Unionists will have majority in the board Sir Sikander tells that you agreed to their majority in the Board.......

"It is noteworthy that Mr. Jinnah did not then declare that there was no pact, but only a unilateral declaration made by Sir Sikandar. How could Sir Sikander reconstitute the Muslim League Parliamentary Board? This was to be done by Mr. Jinnah and the League, so clearly there were two parties to the agreement.

"The evidence of Mr. Jinnah and Sir Mohammad Iqbal should be enough to establish beyond all question the existence of the Pact. Circumstantial evidence can also be accrued in abundance. Sir Sikander Hayat Khan made many public speeches and statements in which he made clear that his Government was a Unionist Government and not a Muslim League Government. None of these statements called forth any protest from Mr. Jinnah and the League. Lack of space presents my quoting from all these statements but I quote one made by Sir Sikander at Kasur on October 14, 1938, as reported by the Associated Press of India:

'The Young men's Muslim Association referred in the course of its address to Sir Sikander Hayat Khan's association with the Muslim League and said that "it would not be improper to describe

the Punjab Ministry a Muslim League Ministry...

Replying to this address, the Premier emphasised that it would be not only improper but unfair to this Government to describe it as a Muslim League Ministry. He was a member of the Muslim League on the distinct understanding that the Unionist complexion of his Ministry would in no way be affected.

"I myself referred explicitly to the Pact on two occasions in 1943 at Delhi in March and after my visit to Bombay some time later. On neither occasion did Mr. Jinnah contradict me or allege that there was no Pact.

"Even if, as the Committee of Action contends, there was only statement made by Sir Sikander before the Council of the All--India Muslim League, is it not also true that for nearly seven years that statement has been acted upon and is it not this sufficient to establish the existence of a Pact? The Committee of Action has not denied that the membership forms signed by the Muslim members of the Unionst Party. when joining the League specific name of the Sikander--Jinnah Pacr

If the League never recognised the pact, why did it accept as members Muslims who specifically said that they joined in Pursuance of it? If there was no pact, the Committee, of action has no jurisdiction over me

Unionist Party Has Not Ceased to Exist.

"It is said that the Unionist Party ceased to exist when its Muslim members joined the Muslim League but this is not so. Its nature was altered. but it continued to exist as a colition to exist as a coalition partys under its old name as guarnteed by the terms of the Sikander--Jinnah Pact. Without any protest from the league the majority party in the Punjab assembly and has continued to be referred to as the Unionst Party both un—officially and in the officially and in the official. Publications of the Department of Document of the

Government of India The Muslim members of the Unionist Party continued, under the Sikander—Jinnah Pact, to be its members and also to be members of the Muslim League."

"That this was clearly understood is shown by the fact that when, in November 1943, the Rules of the Punjab Muslim League Assembely Party were being framed, the existence of the Pact (which province for this) was unanimously acccepted though its inclusion in the Rules was disputeis This dispute was the cause of an appeal which is still penaing bef re a Committee of the All—India Muslim League. Incidentally the result of that appeal has also been prejudged by Committee of Action.

Dishonest Both

"For over six years the League has not discoverd any such divergence between its aims, objects and constitution of those of the Unionists. Partylas to necessitate the severance of the Punjab Muslim League Assembly party from the Unionist Party. It is incomprehensible how the Committee of Action has now discoverd that 'it is quite impossible for any honest man to owe allegiance at one and the same time to two parties with such differ creeds

"If however, members of the Punjab Muslim League Assembly Party are to be describled as dishonest because of their allegiance to these two parties under the Jinnah—Sikander Pact, I am afraid, the description will also apply to those who accepted this arrangement for over six years.

"As the Committee has announced its predetermined decision it is not strictly necessary for me to clear the misunderstanding deliberately created by the Committee itself in its search for material on which it is might allege that I had been forsworn the aims and objects of the League. It professes to have been in full possession of my case. This is manifestly untrue and so I take this opportunity of laying before the Muslim public my case in regard to the allegations made in the Committee's letter of May 3rd.

Background and circumstances

"The Committee of Action has professed to be unable to understand my reference to the background against which and the circumstances in which I made my statement of April 28th. The background is the Sikander—Jinnah Pact politics. The circumstances are my negotiations with Mr. Jinnah pact and the situation created by this attempt to impose his dicatatorship on the Punjab Muslim League Assembly Party to induce me to break faith with my colleagues in the Punjab Ministry and to terminate the Sikander—Jinnah Pact which he felt had outlived its utility to him.

"In the first passage quoted from my statement of April 28th I am held by the Committee to have expressed my opposition to all communal parties forgetting that the Muslim League is a purely communal organisation. By so doing I am said to have violated the basic principle of the Muslim League. The Committee could nothhave arrived at this interpretation ofthis passage except by wrenching it from its context and considering it in isolation from the rest of my statement and from the back ground of the Sikander—Jinnah Pact.

No General Objection to Communal Parties

"My reference to communal parties must be read in relation to Punjab politics and the Pact. The Unionist Party as formed by Sir Fazl i—Hussain was non—communal party on ecnomic basis. He was not prepared to convert it into a communal party though ready to help the Muslim League. The Unionist party was thus altered from a non—communal composite party whose existence was guaantee by the Pact and of which the communal composite party whoes reistence was guaranteed by the pact and of which the comegmunal Punjab Muslim League assembly party was an iteral cannot do better them to quoto here th eactual words of the pact. part. 'This will not affect the continuance of the present coalition of the Unionist Party, and again. The existing combination shall maintain

its present time. "The Unionst Party'. Further, all Unionist M L As Muslim and others, owed to their constituent the duty ofpreserving this combination as members of which they had been elected. For the reasons given in my statement of which they had been elected. For the reasons given in my statement I object to the change of this combination to a loose coalition with a communal lable. I have no general objection to communal parties and have shown this by joining the All—India Muslim League and the Punjab Muslim League Assembley Party (whcih I recognised) both of which are purely communal.

Meaning "Distorted"

"In the latter portion of the first passage from my statement quoted by the Committee of Action'the Muslim of this province should refuse to be dicided among themselves or to accepet outside interference to their detriment' And in the second passage quoted by it, I am alleged to have denied the Athourity of the League and to have acted in contravention of its constitution and rules. Here again, the Committee of Action has distorted my meaning and overlooked the background of the Pact, to which I had referred in the second passage, and to the circumstances in which my statement had been made. I entirely fail to see in what way I have offended against the League, I had called on the Muslims of the Punjab to remain united and it is clear from the passages quoted that I wsished them to remain united in and it is clear from the pessages quotoed that wished them to remain united accordance with the Sikander—Jinnah Pact and behind the Punjab Muslim League Assembly Party

"I had object to unjustified outside interfernce in the inner affairs of the Party formed under the Pact. Mr.Jinnah neither had nor has the authority to change the designation and constitution of the Unionist Party. Under the Pact only the Punjab Muslims League Assembly Party could change the designation and constitution of.

the Ministerial party and I was not even allowed to call together my colleagues of the Muslin: League Assdsembly Party and consult them.

## Primary Allegiance to League

"Finally, the Committee of Action drew from my statement of April 28th the conclusion that my primary allegiance was to the Unionist Party and my secondary allegiance was to the League This is an astounding allegation, as the Committee has said clearly that the Unionist Party ceased to exit when its Muslim members joined the Muslim League. The allegation itself exposes the speciousness

of the Committee.s arguments. But the allegation is easily answere. Under the Sikander—Jinnah Pact in pursuance of which I joined the League, I concerveied that my primary allegiance was to the League but subject to the terms of the Pact.

## Muslim Position Under Unionist Ministry

"I have answered the specific charges on which, according to the Committee of Action, I have been expelled from the Muslim League. In its statement the Committee has also alleged that "The Unionist label in the Punjab was a pretence for keeping down the Mussalmans and making them subservient to the dominant Hindu group which in and out of season exploited it for its own purposes." This is absurd.

"Mr. Jinnah has taunted the Hindu members of the Ministerial Party with having no following worth mentioning and the whole world knows of the consistent and bitter oppo: Unionist label was an exeeuse for the domination of the Punjab Hindus over the Punjab Muslims? The position of the Punjab Muslim has improved beyond all recognition under the Unionits Ministry. The League itself and Mr. Jinnah have found no cause for complaint from 1937 to 1944.I challenge the Committee of Action to produce any eveidence in support of this wild allegation.

"In my statement of April 28, I said clearly and explicitly that I was a firm believer in and a supporter of the aims and objects of the Muslim League, I stood loyally by its creed and policy subject only to my insitance on the following two points:

(I) In general the Muslim League in the Punjab Assembly should be free to choose its own allies. Determine the basis of its alliance and to conduct its parliamentary work in accordance with theerms or the Sikander—Jinnah Pact.
(II) In particular, it should not be compelled to commit a breach of faith with its non—Muslim co—workers in the Assembly respect of the undertaking formally embodied in the Jinnah—Sikander Pact.

Special Problems

"I maintain that I was within my rights and acting in the best interests of the Punjab Muslim in declining to yield on these two points. Every province has its own peculiar problems and its own background of economic and social conditions and party politics. It is only rights and proper that within the general framework of All India politics every province should be free to conduct its affairs in the light of its own condition and experience. There is no doubt that in the Punjab the parliamentary alliance and the parliamentary and the parliamentary programme represented by the Unionist party are best suited to the interests of the Muslims and the best guarantee from their point of view and the fact that the acceptance of the demand would have amounted to a breach offaith with our non-Muslim allies and coworkder in the legislature left me no choice but to reist it firmly. I have little doubt that the Muslims of the Punjab and their elected representatices in the legislature will reunder stand the issues involved and support me in the stane which I have taken for the vidication of their pledged word and their constitution rights and for the protection of their best interests which would be seriously affected if the stability of their Ministry were

allowed to be underminend by unjustified outside interfrence.

Pakistan Ideal

In conclusion i should like to make it clear that as far as the Muslim ideal of self deremination as emb odied in the Lahore Resoulution, popularly known as the Pakistan Resolution, is concerned the Committee of Action.s present decision does not affect in any way my whole—hearted support for it. Wether I remain in the Muslim League or not, I shall do all I can in help my community.s efforts to realise this ideal.
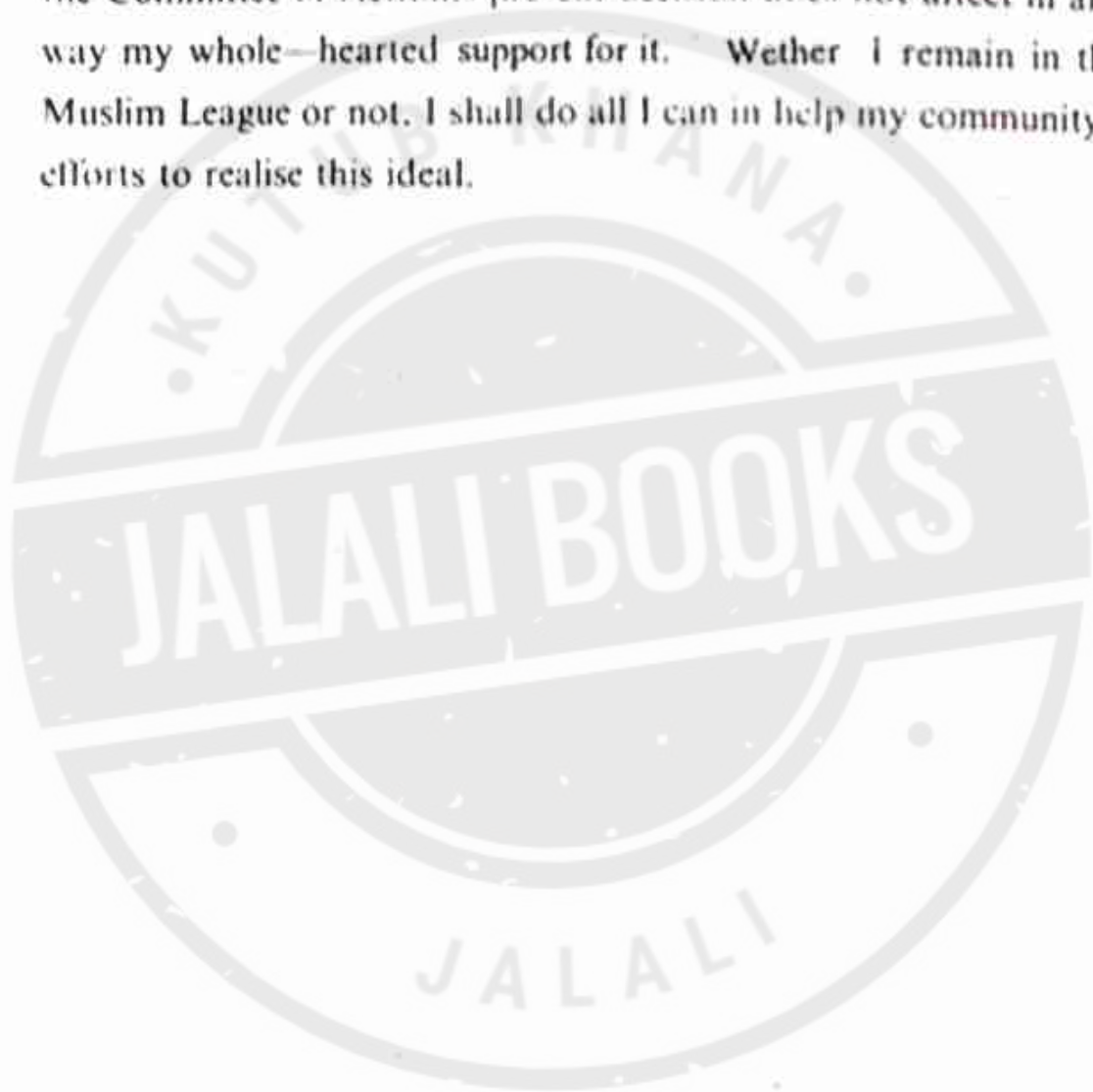
## جلد چہارم

# ہماری قومی جدّوجہد

۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۴ء

پہلا باب

# سر سکندر حیات خان کا تقسیمِ پنجاب کا فارمولہ
# اور سر سکندر کی جانشینی کا مسئلہ

سر سکندر حیات خاں کا انتقال ۲۶ دسمبر ۱۹۴۲ء کو، رات کے ساڑھے بارہ بجے ہوا تھا۔ اپنی وفات سے چھ مہینے پہلے، انہوں نے پنجاب کی فرقہ وارانہ کشیدگی دور کرنے کا ایک فارمولا مرتب کیا تھا۔ جسے آئندہ صفحات میں درج کیا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ پنجاب کی تقسیم کے بغیر پاکستان بن نہیں سکتا تھا۔ اور پنجاب کی تقسیم مسلم اکثریت اور غیر مسلم اکثریت کے متصل علاقوں کی بنیاد پر کی گئی تھی۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو جو قرار داد پاکستان منظور کی گئی تھی۔ اس میں واضح الفاظ میں درج تھا کہ ہندوستان کے شمال مغربی حصے کے مسلم اکثریت والے متصل خطوں کو "علاقائی ردو بدل کے ساتھ" علیحدہ کر دیا جائے۔ اس قرار داد کی رُو سے سندھ۔ بلوچستان۔ اور صوبہ سرحد یقیناً پاکستان میں آتے۔ جھگڑا صرف پنجاب کا تھا۔ پورا پنجاب کسی صورت میں مسلم لیگ کو مل نہیں سکتا تھا۔ اب سوال صرف یہ تھا کہ پنجاب کی تقسیم کس طرح اور کن خطوط پر ہو۔

سر سکندر نے جو فارمولا مرتب کیا تھا۔ انجام کار ۱۹۴۷ء میں انہیں خطوط پر پنجاب تقسیم ہوا۔ اگر سر سکندر کا یہ مجوزہ فارمولا اس وقت منظور کر لیا جاتا تو مسلم لیگ میں پھوٹ پڑ جاتی۔ اور پنجاب کے مسلمان اپنے صوبے کی تقسیم پر کبھی راضی نہ ہوتے۔ اگست ۱۹۴۷ء میں حالات یکسر مختلف ہو گئے تھے۔ اور تقسیم پنجاب ناگریز ہو گئی تھی۔ سر سکندر حیات خاں

نے تقسیم پنجاب کے لئے ضلع نہیں بلکہ تحصیل کو یونٹ قرار دیا تھا۔ چوہدری ظفر اللہ خاں صاحب نے بھی جب جولائی ۱۹۴۷ء میں بونڈری کمیشن کے سامنے مسلم لیگ کا کیس پیش کیا تھا, تو تحصیل ہی کو یونٹ قرار دیا گیا تھا۔

میرے مرحوم و محترم دوست مولانا غلام رسول مہر۔ اس امر پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے ایک مکتوب گرامی میں مجھ کو لکھتے ہیں :

"اگر پنجاب و بنگال کی تقسیم ہی منظور تھی، تو اس کے لئے حد بندی کا کمیشن مقرر کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟ یہ طے ہو چکی تھی کہ مسلم اکثریت والے علاقے پاک پنجاب میں شامل ہوں۔ اور ایسے علاقے ہر واقف کار کو معلوم تھے۔ کیوں انہیں الگ نہ کر لیا گیا؟ اس کا کوئی جواب میرے ذہن میں نہیں۔ اگر ایسا کیا جاتا تو ضلع فیروز پور سے تحصیل زیرہ۔ ضلع جالندھر سے تحصیل نکودر اور تحصیل جالندھر۔ ضلع امرتسر سے تحصیل اجنالہ۔ اور ضلع گورداسپور میں سے تحصیل بٹالہ اور تحصیل گورداسپور یقیناً پاک پنجاب میں آجاتیں۔ ریاست کپورتھلہ جہاں اسلامی اکثریت تھی، محصور ہو جاتی۔ یوں پاک پنجاب کی حد دریائے ستلج پر پہنچ جاتی۔ اور سکھوں نے جو ہنگامہ بپا کیا اس کے لئے کوئی امکان باقی نہ رہتا"۔

پنجاب کے گورنر، سر برٹرنڈ گلینسی نے جب سر سکندر کا فارمولا، وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو کو بھیجا تھا۔ تو اس کے ساتھ ایک خط بھی انہوں نے وائسرائے کو لکھا تھا۔ اب وہ خط اور اس کے ساتھ وہ فارمولا ملاحظہ فرمایئے۔

از جانب سر برٹرنڈ گلینسی ۔ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ سی۔ آئی ای گورنر پنجاب

بخدمت لارڈ لنلتھگو ، وائسرائے ہند۔

بصیغہ راز — گورنمنٹ ہاؤس۔ لاہور

ڈی۔ او۔ نمبر ۱،۴ — ۱۰ جولائی ۱۹۴۲ء

ڈیئر لارڈ لنلتھگو ۔ شملہ سے رخصت ہونے سے کچھ پہلے۔ سر سکندر نے یہ مسودہ مجھے

دیا تھا۔ جس میں انہوں نے اپنے خیال کے مطابق فرقہ وارانہ مسئلے کا ایک حل تجویز کیا ہے۔ وہ مسودہ اس عریضہ کے ہمراہ آپ کو بھیج رہا ہوں۔ جس کے مطالعہ سے آپ محظوظ ہوں گے۔ آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ ایسی صورت میں کہ اگر پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے پچھتر فی صد ممبروں کی اکثریت سے کم تعداد ایک آل انڈیا فیڈریشن کے ساتھ اپنے صوبے کا الحاق کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرے تو پھر پنجاب کے مسلمانوں کو بھی اس بات کا حق ملنا چاہئے کہ از روئے ریفرنڈم اس بات کا فیصلہ کریں کہ وہ صوبہ پنجاب کی موجودہ حدود سے اپنا تعلق منقطع کر کے آل انڈیا فیڈریشن میں شریک ہونے پر راضی نہیں۔ اگر صورت حال یہاں تک پہنچ جائے کہ غیر مسلم باشندے صوبے کی حدود سے اپنا تعلق توڑنے پر آمادہ ہو جائیں تو پھر پنجاب کی ضلع وار کاٹ چھانٹ اس طرح ہوگی کہ قسمت انبالہ تمام تر اور قسمت جالندھر کا ایک خاصا بڑا حصہ اور امرتسر کا ضلع صوبہ پنجاب سے الگ ہو جائیں گے۔ اگر تقسیم کی بنیاد ضلع کی بجائے تحصیل قرار دی جائے جیسا کہ میرے خیال میں سر سکندر کے پیش نظر ہے، تو پھر ان تمام علاقوں کے علاوہ جن علاقوں کا ذکر میں نے کیا ہے، اور بھی کچھ حصہ پنجاب سے کٹ جائے گا۔ دونوں صورتوں میں پنجاب کا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا یقینی ہے۔ اس سکیم کے پیچھے جو خیال کار فرما ہے وہ یہ ہے کہ صوبے کے صحیح الفکر لوگوں کو احساس کرا دیا جائے کہ اگر کبھی پاکستان بنا تو پنجاب کا کیا حشر ہوگا۔ اور اس کے کیونکہ حصے بخرے کر دیئے جائیں گے۔

سکندر کی موجودہ پوزیشن یہ ہے کہ وہ سکھوں کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ سیل ٹیکس۔ (بکری ٹیکس) وغیرہ میں مزید مراعات عطا کر کے وہ شہری ہندوؤں کو بھی اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ البتہ یہ فکر باقی ہے کہ اس وقت پاکستان کی حمایت اور مخالفت میں جو تحریکیں چل رہی ہیں۔ انہیں کم سے کم جنگ کے خاتمے تک کسی نہ کسی طرح دبا دینا چاہئے۔

اس پیکٹ کے بارے میں، پنجاب کے گورنر سر برٹرنڈ گلینسی نے، ۱۳ نومبر ۱۹۴۲ء کو وائسرائے لارڈ لنلتھگو کو ایک خط میں لکھا تھا۔

---

ا۔ سکندر۔ بلدیو پیکٹ

"اس میں کوئی شک نہیں کہ سکندر۔ بلدیو پیکٹ کا اثر صوبہ پنجاب پر بہت خوش گوار ہوا ہے۔ اور اس سے سکھوں کو بڑا اطمینان ہو گیا ہے۔ سکندر۔ بلدیو پیکٹ کا پبلک اعلان ۱۵ جون ۱۹۴۲ء کو ہوا تھا۔ وزیر اعظم (سر سکندر) نے سکھوں کو اس پیکٹ کی رُو سے چند مراعات عطا کی ہیں۔ جن کے بدلے میں پنجاب کے نئے سکھ وزیر بلدیو سنگھ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ یونینسٹ وزارت کو مستحکم اور مضبوط کرنے کی پوری کوشش کریں گے تاکہ ایک طرف فرقہ وارانہ اتحاد قائم ہو سکے اور دوسری طرف ملک کی ڈیفنس کا مسئلہ خاطر خواہ طور پر طے کیا جا سکے۔"

اس فارمولے کا مقصد یہ ہے جب تک ہندوستان کی مرکزی حکومت کا دستوری خاکہ حتمی طور پر طے نہ ہو جائے یہ فارمولا معرض عمل میں نہیں آ سکے گا۔ سکندر دراصل یہ چاہتے ہیں کہ آئندہ چند سال کے لئے پاکستان کے مسئلے کو کھٹائی میں ڈال دیا جائے انہوں نے خصوصیت کے ساتھ اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ اگر آپ کو اس فارمولے پر کوئی اعتراض نہیں تو وہ سب سے پہلے اپنی پارٹی (یونینسٹ پارٹی) کے مسلمان ممبروں سے مشورہ کریں گے۔ اس کے بعد ہی اپنی پارٹی کے سکھ ممبروں کے سامنے یہی مسئلہ رکھیں گے۔ پھر مجموعی طور پر اپنی پارٹی کے تمام ممبروں سے اس بارے میں مشورہ کیا جائے گا۔ اگر اس ساری کارروائی کا ردِ عمل حوصلہ افزا ہوا تو آخر کار پنجاب پراونشل اسمبلی کے سامنے یہ فارمولا رکھ کر اس کی حمایت اور تائید میں باقاعدہ ایک قرار داد منظور کرائی جائے گی۔

جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے میں نے سکندر کی اس سکیم پر خوشنودی کا اظہار کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ روشن خیال اور سمجھدار لوگوں کے نزدیک یہ فارمولا یقیناً پسندیدہ اور قابل قبول ہو گا۔ بدقسمتی یہ ہے کہ موجودہ حالات میں روشن خیال اور سمجھدار لوگوں کا ہمارے ہاں بالکل قحط ہے۔ مجھے اس بارے میں کچھ شک ہے کہ خود جناح پر اس سکیم کا کیا اثر ہو گا۔ مجھے اس سلسلے میں سکندر سے اتفاق ہے جناح یقیناً سخت ناراض ہوں گے۔ اور ان کی ناراضی کی وجہ بظاہر یہ ہو گی کہ وہ سمجھتے ہیں کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے یہ ان کا کام ہے کہ آئندہ آئین اور دستور کی ترتیب کے متعلق

ہر قسم کی تجویز صرف وہی پیش کرنے کے مجاز ہیں۔

قطع نظر اس سے کہ اس بارے میں جناح کی ذاتی پسند اور ناپسند کا معاملہ کیا ہے۔ جناح کو پاکستان کی مجوزہ سکیم کی بنیادی کمزوری کا بخوبی احساس ہو جائے گا۔ کیا جناح واقعی پاکستان چاہتے ہیں یا یہ محض نعرہ بازی ہے؟ یہ مسئلہ، ما بہ النزاع ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے اب تک پاکستان کی جغرافیائی حدود اور اس کی ہیت ترکیبی کا کوئی نقشہ پیش نہیں کیا۔ معلوم یوں ہوتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ پاکستان کا لفظ اس طرح مقدس اور ماوراء بن گیا ہے کہ اس کا تجزیہ کرنا یا اس کے حدود اور نتائج پر بحث کرنا گویا گناہ سمجھا جاتا ہے۔

سکندر کا خیال ہے کہ جناح اس سکیم کی مخالفت نہیں کریں گے۔ کیونکہ وہ حق خود ارادی کے اصول کے حامی ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر اس بات سے اختلاف ہے۔ کیونکہ حق خود ارادی ایک ایسی اصطلاح ہے جس کے مختلف اور متضاد معانی بھی لئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً جنوبی آئر لینڈ کے باشندے جن معنوں میں حق خود ارادی کو تسلیم کرتے ہیں وہ دوسرے کسی ملک کے باشندوں کو منظور نہیں۔ سکندر کا یہ خیال بھی ہے کہ جب جناح نے محسوس کیا کہ پاکستان عملی طور پر قابل قبول چیز ہے تو وہ اس حربے کے زور سے ہندوستان کی مرکزی حکومت میں مسلمانوں کا عنصر بڑھانے کی کوشش کریں گے۔ مجھے اس مفروضے سے بھی اختلاف ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جناح پاکستان کا ہتوا دکھا کر کانگرس اور برطانوی حکومت دونوں کو خوف زدہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس بات کا امکان بھی ہو سکتا ہے کہ جناح یہ اعلان کر دیں کہ سکندر کے فارمولے سے گویا اسلام خطرے میں پڑ گیا ہے۔ اس طرح حالات مزید خراب ہوں گے۔ اور مزید الجھنیں پیدا ہوں گی۔ تاہم مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی تکلف نہیں کہ سکندر جناح کو مجھ سے کہیں زیادہ جانتے ہیں۔ اور میں تو جناح کے باطن کی گہرائیوں سے قطعاً ناواقف ہوں۔ مجھے یہ بھی خطرہ ہے کہ اگر سکندر نے یہ مہم جاری رکھی اور یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبروں سے اپنے فارمولے کے بارے میں استفسار کیا تو پنجاب مسلم لیگ کے صدر نواب ممدوٹ جناح کو اس کارروائی سے باخبر کریں گے۔ اندریں حالات یہ کہنا مشکل ہے کہ سکندر کب تک اپنی پوزیشن برقرار رکھ

سکیں گے۔

میں جناب کا شکر گزار ہوں گا اگر جناب بوقت فرصت مجھے اطلاع بخشیں کہ سکندر کی اس سکیم کے متعلق جناب کی کیا رائے ہے۔ اور کیا سکندر یہ کارروائی جاری رکھیں یا بند کر دیں۔

جناب کا مخلص

بی۔ جے۔ گلینسی

## فرقہ وارانہ کشیدگی رفع کرنے کی ایک مشروط تجویز

(ا) اگر پنجاب لیجسلیٹو کے انتخاب شدہ ممبروں کی کم سے کم پچھتر فی صد تعداد ایک قرار داد کے ذریعہ سے، آل انڈیا فیڈریشن کے ساتھ الحاق یا عدم الحاق کا فیصلہ کرے تو اس فیصلے کی پابندی حتمی طور پر پنجاب کی تمام قوموں پر عائد ہوگی۔

(ب) اگر اس قسم کی قرار داد پیش نہ کی گئی کہ آل انڈیا فیڈریشن کے ساتھ پنجاب کا الحاق ہو یا نہ ہو یا بصورت دیگر اگر قرار داد پیش کی گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کم سے کم پچھتر فی صد ممبروں کی تعداد کی تائید حاصل نہ ہو سکی۔ لیکن اس کے باوجود آل انڈیا فیڈریشن کے ساتھ الحاق نہ کرنے کا مطالبہ بدستور قائم رہا تو پھر عام مسلمانوں کا عندیہ، اس مسئلے پر ریفرنڈم کے ذریعہ سے معلوم کیا جائے گا۔ اس مجوزہ ریفرنڈم کا طریق کار یہ ہوگا کہ پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے تمام مسلمان ووٹروں سے کہا جائے گا کہ وہ اس مسئلے پر اپنا ووٹ ڈالیں۔ یا اس ریفرنڈم کا طریقہ کار یہ ہوگا کہ پہلے پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبروں سے کہا جائے گا کہ اگر وہ ریفرنڈم کرانا چاہتے ہیں تو کم سے کم ساٹھ فی صد ممبر اس مجوزہ ریفرنڈم کے حق میں ووٹ ڈالیں۔ اگر ممبروں کی اس تعداد نے عدم الحاق کا فیصلہ کیا تو مسلمان ہندوستان سے الحاق نہیں کریں گے۔

ہندوستان سے الحاق کے خواہش مند غیر مسلم ممبروں کو بھی یہ اختیار دیا جائے گا وہ چاہیں تو انہی خطوط پر پنجاب اسمبلی سے ایک ریزولیوشن منظور کروا کے ریفرنڈم کرائیں۔ اگر ان غیر مسلم ممبروں کی ساٹھ فی صد تعداد نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ ہندوستان کے ساتھ اپنا الحاق

کرنا چاہتے ہیں۔ تو پھر انہیں اس بات کا اختیار دیا جائے گا چاہیں تو ہندوستان سے ملحق ہو جائیں۔ اور چاہیں تو اپنا الگ خود مختار صوبہ بنالیں۔ اور چاہیں تو الگ خود مختار صوبے کے ساتھ متصل علاقوں کو بھی شامل کرلیں۔

## سر سکندر کی جانشینی

پنجاب کے دور حاضر کی سیاسی تاریخ کا ایک نہایت اہم اور نتائج کے اعتبار سے بڑا دور رس واقعہ سر سکندر کا ناگہانی انتقال اور اس کے بعد ان کی جانشینی کا مسئلہ ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے۔ سر سکندر ۲۶ دسمبر ۱۹۴۲ء کو رات کے ساڑھے بارہ بجے، حرکت قلب بند ہو جانے سے فوت ہو گئے۔ ان کی وفات کے اگلے روز گورنر پنجاب اس الجھن میں گرفتار ہو گئے کہ وزارت عظمیٰ کا تاج کس کے سر پر رکھا جائے۔ سازشوں کا بازار تو اسی روز گرم ہو گیا تھا اور وزارت اعلیٰ کا ہر امیدوار اپنے اپنے حامیوں کی تعداد تلاش کرنے میں مصروف ہو گیا تھا۔

اس موضوع پر پنجاب کے گورنر سر برٹرنڈ گلینسی نے وائسرائے لارڈ لنلتھگو کو جو مفصل خط لکھا تھا اس سے بہتر اور مستند اور مفصل دستاویز ہمارے پاس اور کوئی نہیں۔ وہ خط ملاحظہ فرمایئے:

از سر برٹرنڈ گلینسی ۔ گورنر پنجاب۔ بخدمت لارڈ لنلتھگو والسرائے ہند

بصیغہ راز

گورنمنٹ ہاؤس۔ لاہور

ڈی۔ او۔ نمبر ۴۲۵

۲ جنوری ۱۹۴۳ء

ڈیر لارڈ لنلتھگو امید ہے میرا ۳۰ دسمبر ۱۹۴۲ء کا تار ملاحظہ فرمایا ہو گا۔ جس میں میں نے اس بات کا اظہار خیال کیا تھا کہ سر سکندر کے انتقال کے بعد ان کا جانشین تلاش کرنے کی مجھے ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ اس ضمن میں جو کچھ ہوا اس کی تفصیل نیچے درج کرتا ہوں۔

ابتداء ہی سے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ صحیح معنوں میں صرف دو امیدوار ایسے ہیں جن کے دعووں پر غور کیا جاسکتا ہے۔ ایک خضر دوسرا فیروز [1]۔ یہ صحیح ہے کہ اور لوگوں نے بھی

[1] ملک خضر حیات خان اور سر فیروز خان نون

بہت ہاتھ پیر مارے اور جوں جوں وقت گزرنے لگا سازشوں کی گرم بازاری میں شدت پیدا ہونے لگی۔ کھٹڑوں کا دعویٰ یہ تھا کہ سر سکندر چونکہ کھٹڑ[1] قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے ان کا جانشین بھی کھٹڑ ہی ہونا چاہئے۔ اس سلسلے میں وہ سر سکندر کے بڑے بھائی لیاقت[2] حیات اور ان کے ایک قریبی رشتہ دار مظفر خاں کا نام پیش کرتے تھے۔

سب سے پہلے میرے پاس وزیر خزانہ سر منوہر لال آئے اور کہنے لگے کہ میری اور میاں عبدالحیٔ اور سردار بلدیو سنگھ کی متفقہ یہ رائے ہے کہ خضر حیات سے بہتر آدمی کوئی نہیں۔ انہیں وزارت عظمیٰ کا منصب سونپ دینا چاہئے۔ وزیر مال چوہدری چھوٹو رام دورے پر گئے ہوئے تھے۔ اس لئے ان سے فی الحال گفتگو نہیں ہو سکی۔ سر منوہر لال کا خیال تھا کہ سوائے خضر حیات کے باقی تمام امیدوار نہایت ادنیٰ صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ اور جس قدر جلد اس مسئلے کا تصفیہ کر دیا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ ورنہ سازشوں کا جال پھیلتا چلا جائے گا۔ یہ سب کچھ پیر کے روز ۲۸ دسمبر کو ہوا۔ یعنی سر سکندر کی تجہیز و تکفین سے اگلے روز میں نے کہا کہ میں خضر حیات کی قابلیت کا بڑا معترف ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ چند روز انتظار کر لینا چاہئے تاکہ ہم معلوم کر سکیں کہ خضر کو اپنی پارٹی کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہو سکے گا یا نہیں۔ فیروز سے میری ایک خاصی طویل ملاقات ہوئی۔ انہوں نے صاف کہا کہ وہ وزارت عظمیٰ کے امیدوار نہیں ہیں۔ اس وقت وہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے کمیٹی کے ممبر ہیں۔ اور وہاں سے ان کا الگ ہونا محال ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر وہ پنجاب کے وزیر اعظم بن جائیں تو خضر حیات کو یقیناً وزارت سے محروم ہونا پڑے گا۔ کیونکہ فیروز اور خضر دونوں سرگودھا کے ایک ہی قبیلے کی دو مختلف شاخوں سے تعلق

---

۱۔ شمال مغربی پنجاب کی گکھڑ قوم کے ایک قبیلے کا نام کھٹڑ ہے۔

۲۔ نواب سر لیاقت حیات اس وقت ریاست بھوپال میں وزیر تھے۔ اس سے پہلے وہ ریاست پٹیالہ میں وزیر اعظم رہ چکے تھے۔ نواب مظفر خاں ۱۹۴۲ء میں پنجاب پبلک سروس کمیشن کے ممبر تھے۔

۳۔ میاں عبدالحیٔ اور سردار بلدیو سنگھ دونوں حکومت پنجاب کے وزیر تھے۔

رکھتے ہیں۔ جن کی آپس میں رشتہ داری بھی ہے۔ یوں بھی خضر حیات فیروز کے بڑے عزیز دوست بھی ہیں اور وہ ان کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہتے۔ خضر نے ابھی تک اپنے حامیوں کا الگ جتھا بنانے سے گریز کیا ہے۔ اور اگر انہوں نے اس قسم کا جتھا بنانے کی کوشش کی تو لوگ صبح و شام سودے بازی میں مصروف ہو جائیں گے کہ بتاؤ کیا دیتے ہو اور کیا لیتے ہو۔

چوہدری چھوٹو رام دورے سے واپس آئے تو میں ان سے ۳۰ دسمبر کو ملا۔ انہوں نے اپنے گزشتہ اخباری بیان کی تائید کی کہ وہ وزارت عظمیٰ کے امیدوار نہیں ہیں۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ سکندر نے ماضی میں دو ایک مرتبہ تجویز پیش کی تھی اور ان کے بعد انہیں (چھوٹو رام کو) پنجاب کا وزیر اعظم بننا چاہئے۔ لیکن میں نے جبھی کہہ دیا تھا کہ پنجاب کا وزیر اعظم صرف مسلمان ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ مسلم اکثریت کا صوبہ ہے۔ چھوٹو رام کے خیال میں خضر حیات بہترین امیدوار ہیں۔ اور انہیں فوراً وزیر اعظم بنا دینا چاہئے۔ پنجاب اسمبلی میں چھوٹو رام کا بلاک خضر کی پوری مدد کرے گا تاکہ یونینسٹ پارٹی قائم اور بحال رہے۔

آخر میں میں نے خضر سے ملاقات کی۔ انہوں نے کسی قسم کی زور رعایت اور بے جا تکلف سے کام نہیں لیا۔ اور بالمشافہ کہا کہ اگر انہیں اس منصب جلیلہ کے لئے منتخب کر لیا گیا تو وہ پوری تن دہی سے کام کریں گے۔ ان کی رائے میں میاں فضل حسین کے بعد پنجاب کی وزارت عظمیٰ کے صحیح معنوں میں صرف دو امیدوار تھے۔ ایک فیروز اور دوسرا سکندر۔ فیروز نے انگلستان میں ہائی کمشنر کا عہدہ قبول کر کے میدان خالی کر دیا۔ اس کے بعد میں نے سر سکندر کی پوری نیک نیتی سے خدمت کی۔ اور انہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔

یہ صحیح ہے کہ مجھے ہرگز یہ امید نہیں تھی کہ سر سکندر کے ناگہانی انتقال سے مجھے یکایک ان کی کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا جائے گا۔ لیکن اب اس قسم کا موقع پیدا ہو گیا ہے۔ تو مجھے قبول کرنے سے انکار نہیں۔ ہاں اگر آپ میرے علاوہ کسی اور مسلمان کو یہ منصب عطا کر دیں تو میں پورے خلوص سے اس کی خدمت کروں گا۔ صرف میں ہی نہیں پوری یونینسٹ پارٹی اس کی خدمت کرنے کو تیار ہے۔

اسی روز شام کو میں مظفر سے ملا میں نے مختلف ذرائع سے سنا تھا کہ اگرچہ مظفر نے بعض لوگوں سے کہا ہے کہ وہ پنجاب کی وزارت عظمیٰ کے امیدوار نہیں لیکن در پردہ ان کی خواہش ضرور ہے۔ اور چاہتے ہیں کہ اگر اس کے ایک رشتے دار لیاقت کا کانٹا نکل جائے تو وہ یقیناً آگے بڑھ کر اپنا دعویٰ پیش کریں گے. بظاہر وہ یہی کہتے تھے کہ یونینسٹ پارٹی کو ہر صورت میں قائم و دائم رہنا چاہئے۔ اور بحیثیت مجموعی ان کے خیال میں لیاقت بہترین امیدوار ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ میں حال ہی میں پبلک سروس کمیشن کا ممبر مقرر ہوا ہوں۔ اور اپنے اس عہدے سے مطمئن و مسرور ہوں۔ اس سے زیادہ کی مجھے ہوس نہیں۔ با ایں ہمہ میں نے محسوس کیا کہ اگر میں زیادہ زور دیتا تو وہ یقیناً مان جاتے۔ لیکن میں نے ایسا کرنا مناسب خیال نہیں کیا۔

یوں بھی ان کی عمر تریسٹھ سال ہو چکی ہے اور میرے خیال میں وہ چند دن کامیاب بھی نہ ہوں گے۔ ماضی میں ان سے بعض ایسی حرکات سرزد ہو چکی ہیں جن سے ان کی پارٹی کے بہت سے ممبر ان سے ناراض ہیں۔ اور ان کی قیادت میں کام کرنے کو قطعاً تیار نہیں۔ مظفر نے مجھے یقین دلایا کہ وہ یونینسٹ پارٹی کو قائم رکھنے کی پوری کوشش کریں گے۔ اور جس شخص کو بھی میں لیڈر کی کرسی پر بٹھا دوں گا۔ پارٹی اسی کی اطاعت قبول کر لے گی۔ لیاقت سے میں نہیں ملا۔ انہیں پنجاب سے نکلے بیس سال ہو گئے ہیں۔ وہ پنجاب اسمبلی کے ممبر بھی نہیں۔ اور میرا اندازہ ہے کہ اسمبلی میں کوئی شخص ان کی پشت پر بھی نہیں۔ لیاقت کی تائید اور حمایت میں جو شخص زیادہ سرگرمی دکھا رہا ہے' وہ اس کا پرانا دوست مقبول محمود ہے۔ جنرل سر سکندر کی اہلیہ کے بھائی ہیں۔ اور ان کی بیٹی کی شادی حال ہی میں سکندر کے بڑے بیٹے سے ہوئی ہے۔ مقبول کی عام شہرت سخت خراب ہے۔ اور انہیں پنجاب کا سب سے بڑا سازشی شخص سمجھا جاتا ہے۔ چاروں طرف سے لوگ مجھے ہوشیار رہنے اور اس شخص کے ہتھکنڈوں سے بچنے کی تاکید کر رہے تھے۔ کیونکہ لیاقت کی آڑ میں وہ اپنے آپ کو آگے بڑھانے کی کوشش کر رہا ہے۔

اسی روز شام کو میں نے خضر کو بلایا اور کہا کہ میں نے آپ کو وزیر اعظم مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ پارٹی کی اکثریت آپ کے ساتھ ہے۔ کیا آپ موجودہ کیبنٹ کو

برقرار رکھنا چاہتے ہیں یا اس میں کچھ تبدیلی کے خواہاں ہیں؟ خضر نے صرف ایک شخص کے بارے میں کچھ شک و شبہ کا اظہار کیا۔ اور وہ شک صحیح تھا۔ چنانچہ شخص مذکور کے علاوہ کیبنٹ کے باقی تمام ممبر گورنمنٹ ہاؤس میں آئے۔ انہوں نے خضر کے تقرر پر خوشنودی کا اظہار کیا۔ اور ان کے تحت کام کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔

میں نے کیبنٹ کے جملہ ارکان سے کہا کہ اگر وہ پسند کریں اور مناسب سمجھیں تو اپنی وزارت سے مستعفی ہو جائیں۔ اس طرح وہ یہ ثابت کر سکیں گے کہ انہیں خضر حیات پر مکمل اعتماد ہے۔ چنانچہ انہوں نے استعفے لکھ کر میرے حوالے کر دیئے۔ اس کے فوراً بعد ان کا دوبارہ تقرر کیا گیا۔ جیسا کہ جناب کو معلوم ہے اسی رات اخباروں میں اس امر کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ جو اگلے روز یعنی ۳۱ دسمبر کی صبح کو تمام اخباروں میں چھپ گیا۔ اس اعلان کا بڑا خوش گوار اثر ہوا۔ جو امید ہے قائم رہے گا۔ جو وزارت خالی ہوئی ہے۔ اس کے لئے آج کل بڑے زوروں سے رسہ کشی ہو رہی ہے۔ پارلیمنٹری سیکریٹری کی خالی اسامیاں پر کرنے کے لئے بھی سفارشوں اور سازشوں کے جال بچھائے جا رہے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ خضر اچھی طرح کام کرے گا۔ وہ ایک مضبوط دل و دماغ کا مالک آدمی ہے اور محنت کرنے سے نہیں گھبراتا۔ سر سکندر کی اور بات تھی۔ خضر میں اگرچہ اپنے پیش رو جیسا رکھ رکھاؤ تو نہیں۔ لیکن اس کی تربیت بڑے معقول طریقے سے ہوئی ہے۔ اور خوبیاں بھی اس میں بہت سی ہیں۔ اس بات کا بھی اسے احساس ہے کہ کیبنٹ کے دوسرے ارکان جو عمر میں اس سے بڑے ہیں۔ ان کا احترام اس پر واجب ہے۔ میں نے پبلک میں اسے تقریر کرتے ہوئے کبھی نہیں سنا لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اچھا خاصا بول لیتا ہے۔ آہستہ آہستہ ترقی کرے گا۔ اسمبلی میں جب وہ بولتا ہے تو اس کی تقریر میں خاصی روانی ہوتی ہے۔

گورنر پنجاب کا یہ خط پڑھنے کے بعد چند اہم امور ہمارے سامنے آتے ہیں:

(اول) پنجاب کی لیڈر شپ شروع سے لے کر اب تک قبائلی عصبیت کا شکار رہی ہے۔ اور اس لیڈر شپ پر ہمیشہ چند خاندان قابض رہے۔ یہی چند خاندان بار بار اپنی پیشانی پر نیا

لیبل لگا کر آگے بڑھتے رہے۔ انگریز کے زمانے میں بھی۔ یونینسٹ پارٹی کے دور میں بھی۔ مسلم لیگ کے عہد میں اور آج بھی یہی کیفیت جاری ہے۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

قائداعظم کو بھی مجبوراً انہی چند خاندانوں کے ساتھ بالآخر مفاہمت کرنا پڑی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پنجاب میں اپنی کوئی مستقل اور جداگانہ اور پائیدار لیڈر شپ پیدا نہ کر سکے۔ گاندھی کا معاملہ اس بارے میں مختلف ہے۔ وہ ہندوستان میں اپنے پیچھے ایک زندہ متحرک اور پائیدار لیڈر شپ چھوڑ گئے۔

(دوم) سر برٹرینڈ گلینسی کا مذکورہ بالا خط پڑھ کر سوچئے کہ کیا پنجاب کی وزارت عظمیٰ کا جھگڑا محض دو خاندانوں کا باہمی جھگڑا نہیں تھا؟ ایک طرف شاہ پور کے ٹوانے اور نون تھے۔ اور دوسری طرف اٹک کے کھٹڑ۔ اسی جھگڑے نے آگے چل کر مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کی جنگ کا نام اختیار کر کے اسے گویا کفر اور اسلام کی جنگ بنا دیا تھا۔ کھٹڑ کہتے تھے کہ پنجاب کی وزارت عظمیٰ ہماری موروثی جاگیر ہے۔ اور یہ ٹوانے گویا غاصب ہیں۔ ادھر ٹوانوں کا دعویٰ تھا کہ پنجاب کے مالک تو ہم ہیں۔ ان کھٹڑوں کی ہمارے سامنے کیا حیثیت ہے۔ افسوس ہے کہ پنجاب میں ایسی کوئی لیڈر شپ پیدا نہ ہو سکی جو قوم کو روشن خیالی، کردار کی مضبوطی اور فکر و نظر کی بلندی عطا کر سکتی۔ اس نقصان کا خمیازہ ہم آج تک بھگت رہے ہیں۔

(سوم) گورنر کے مذکورہ بالا خط میں کہیں مسلم لیگ کا نام نہیں آتا۔ سر منوہر لال اور چوہدری چھوٹو رام سے لے کر لیاقت حیات، مظفر خاں اور خضر حیات تک ہر شخص یونینسٹ پارٹی کو مضبوط اور مستحکم بنانے کا وعدہ کرتا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سر سکندر کی زندگی میں پنجاب اسمبلی میں کوئی مسلم لیگ پارٹی نہیں تھی۔ صرف یونینسٹ پارٹی تھی۔ اور یہ لوگ اسی کے حلقہ بگوش تھے۔

(چہارم) جہاں تک پنجاب کے اس طبقے کا تعلق ہے جسے انگریزی میں مڈل کلاس کہتے

ہیں۔ گزارش یہ ہے کہ اس طبقے کا سرکار دوبار کے اونچے ایوانوں میں کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ علامہ اقبال نے جب ۱۹۳۶ء میں پنجاب مسلم لیگ کی صدارت قبول کی تھی تو انہوں نے اپنی عظیم الشان شخصیت کو بروئے کار لاکر اس مڈل کلاس کو آگے بڑھانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ایک طرف سکندر جناح پیکٹ نے اور دوسری طرف اقبال کی بے وقت وفات نے اس کوشش کا بھی گویا خاتمہ کر دیا۔

اقبال کے فرزند جسٹس جاوید اقبال نے اپنے والد محترم کی سوانح عمری میں ایک جگہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تعجب کی بات یہ ہے کہ پاکستان کے بعد انہی یونینسٹ لیڈروں کی اولاد پھر پنجاب پر قابض ہو گئی۔ جاوید اقبال صاحب کی حیرت بجا ہے۔ لیکن میں یہاں ان کے نامور والد ہی کا ایک مصرع دُہرا کر اس حیرت کا ازالہ کئے دیتا ہوں۔ یونینسٹ پارٹی بظاہر مرگئی تو کیا ہوا۔ اس کی روح قبائلی عصبیت کی صورت میں آج بھی زندہ ہے ع

مرد جعفر روح او زندہ ہنوز

# راج گوپال فارمولا

## راج گوپال اچاریہ کا خط بنام مسٹر جناح

نئی دہلی۔
۸اپریل ۱۹۴۴ء

ڈیئر مسٹر جناح میں نیچے وہ فارمولا درج کرتا ہوں جس کے بارے میں مَیں نے مہاتما گاندھی سے تبادلہ خیال کیا تھا، اور جس سے انہوں نے پورا اتفاق کیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے اس امر کی اجازت دی تھی کہ میں آپ کو یقین دلاؤں کہ جو شرائط اس فارمولا میں پیش کی گئی ہیں وہ تمام متعلقہ افراد کے لئے مناسب اور مبنی بر انصاف ہوں گی۔

ازبسکہ گاندھی جی فی الحال ان پابندیوں میں گرفتار ہیں جو حکومت ہند نے ان پر عائد کر رکھی ہیں۔ وہ براہ راست آپ سے ملنے یا اس فارمولے پر گفت و شنید کرنے سے معذور ہیں۔ ان کی طرف سے میں یہ عریضہ آپ کو بھیج رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ جو شرائط اس فارمولے میں درج ہیں۔ وہ اس افسوس ناک "ڈیڈ لاک" کو رفع کرنے کے لئے کافی ہوں گی جو بدقسمتی سے اس وقت ہمارے ملک پر مسلط ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں فرقہ وارانہ مفاہمت کا کس شدت سے خواہاں ہوں۔ چنانچہ اسی بناء پر میں نے گاندھی جی سے زیر نظر شرائط کی منظوری حاصل کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ ان تجاویز پر اچھی طرح غور فرمائیں گے۔ اور یہ دیکھیں گے کہ ان کو بروئے کار لاکر ہمارے ملک کی موجودہ تاریک رات میں روشنی کی کرن ضرور نمودار ہو سکتی ہے۔

آپ کا مخلص
سی۔ راج گوپال اچاریہ

## فرقہ وارانہ مفاہمت کی بنیاد

ذیل میں وہ شرائط درج کی جاتی ہیں، جو انڈین نیشنل کانگرس اور آل انڈیا مسلم لیگ میں باہمی مفاہمت کی بنیاد بن سکتی ہیں۔ اور جس سے گاندھی اور مسٹر جناح اتفاق فرماتے ہیں اور یہ دونوں اصحاب اپنی کوشش سے ان دونوں نمائندہ جماعتوں سے منظوری حاصل کر سکیں گے۔

(۱) جب ہندوستان آزاد ہو جائے گا۔ اور اس وقت ملک کا جو آئین بنے گا۔ اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے مسلم لیگ ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ کی حمایت کرتی ہے۔ اور اس عبوری دور کے لئے وہ کانگرس کے ساتھ مل کر ایک عارضی حکومت قائم کرے گی۔

(۲) موجودہ جنگ کے خاتمے پر ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا جو ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں متصلہ اضلاع کی حد بندی کرے گا۔ اور پھر بالغ رائے دہندگی کی بنا پر یا کسی اور قابل عمل طریقے سے وہاں رہنے والے تمام باشندوں سے استصواب کرا کے، اس امر کا فیصلہ کرے گا کہ ان علاقوں کو ہندوستان سے علیحدہ ہونے کا حق حاصل ہے۔ اگر اکثریت اس بات کی حامی ہو کہ ان علاقوں کو ہندوستان سے الگ کر کے ایک خود مختار مملکت (ساورن سٹیٹ) کی حیثیت دینا ضروری ہے تو اس مسئلے پر عمل در آمد کیا جائے گا۔ لیکن اس قسم کی حد بندی کرتے وقت یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ جو اضلاع عین سرحد (بارڈر) پر واقع ہیں، انہیں اختیار دیا جائے گا کہ ان دونوں مملکتوں میں سے جس کے ساتھ چاہیں اپنا الحاق کر لیں۔

(۳) تمام جماعتوں کو حق حاصل ہو گا کہ اس قسم کے استصواب سے پہلے اپنا اپنا نقطہ نگاہ قوم کے سامنے پیش کر سکیں۔

(۴) اگر فیصلہ علیحدگی کے حق میں ہوا تو دونوں مملکتوں میں کامرس۔ ڈیفنس اور مواصلات کے بارے میں ایک باہمی معاہدہ ہو جانا ضروری ہے۔

(۵) آبادیوں کا تبادلہ سراسر باہمی رضامندی سے ہو گا۔

(۶) مذکورہ بالا شرائط پر عملدر آمد صرف اسی صورت میں ہو گا، جب برطانیہ ہندوستان کو

حکمرانی کے جملہ حقوق عطا کرے گا۔

## راجہ جی اور مسٹر جناح کی باہمی مراسلت

راج گوپال اچاریہ نے ۱۷اپریل ۱۹۴۴ء کو ذیل کا خط مسٹر جناح کو لکھا:

"ڈیئر مسٹر جناح۔ جب پچھلی مرتبہ دہلی میں ہماری ملاقات ہوئی تو میں نے چند تجاویز ضبط تحریر میں لاکر آپ کو دیں تھیں۔ وہ تجاویز غالباً اب بھی آپ کے پاس ہوں گی۔ اور آپ نے ان کا بخوبی مطالعہ کر لیا ہو گا۔ مجھے یہ جان کر سخت مایوسی ہوئی کہ آپ نے ان تجاویز کو منظور نہیں کیا۔ تاہم مجھے امید ہے کہ آپ اس مسئلے پر دوبارہ غور فرمائیں گے۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ تجاویز ہمارے درمیان ایک تسلی بخش اور آبرو مندانہ مفاہمت کی بنیاد بن سکتی ہیں۔ ازراہ کرم مجھے اطلاع دیجئے گا کہ آپ نے دوبارہ غور فرمایا ہے یا نہیں۔

آپ کا مخلص

سی۔ راج گوپال اچاریہ

جب اس خط کا جواب نہ آیا تو راجہ جی نے ۳۰ جون ۱۹۴۴ء کو ذیل کا تار مسٹر جناح کو گیسٹ ہاؤس سری نگر۔ کشمیر کے پتے سے دیا:

"آپ نے میرے اس خط کا جواب نہیں دیا جو میں نے ۱۷اپریل کو آپ کو بھیجا تھا۔ اور جس میں ان امور کا تذکرہ کیا گیا تھا جس پر ہم نے ۸اپریل کو آپس میں گفتگو کی تھی۔ میں گاندھی جی سے مل چکا ہوں اور وہ بدستور اس فارمولے کے حامی ہیں جو میں نے آپ کو دیا تھا۔ میں اپنا فارمولا اور آپ کا انکار اخبار میں شائع کرنا چاہتا ہوں۔ یہ تار گاندھی جی کی منظوری سے دیا جارہا ہے۔ اس نازک وقت پر میری آپ سے درخواست ہے کہ دوبارہ غور فرمایئے۔"

سی۔ آر

مسٹر جناح نے ۲ جولائی ۱۹۴۴ء کو ذیل کا تار راج گوپال اچاریہ کو دیا:

"آپ اپنا فارمولا اخباروں میں شائع کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے افسوس اور تعجب بھی ہے

کہ آپ نے مجھ پر یہ الزام لگایا ہے کہ میں نے یہ فارمولا مسترد کر دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں یہ فارمولا آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ لیکن آپ نے اس کی اجازت نہیں دی۔ چنانچہ اس جانب قدم نہ اٹھایا جاسکا۔ ذاتی طور پر میں اس فارمولے کو رد کرنے یا منظور کرنے کا مجاز نہ تھا۔ اب بھی میری پوزیشن وہی ہے۔ اگر مسٹر گاندھی براہ راست یہ تجاویز میرے پاس بھیج دیں تو میں انہیں باضابطہ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے سامنے رکھنے کو تیار ہوں۔"

جناح

جواب میں راج گوپال اچاریہ نے ۴ جولائی ۱۹۴۴ء کو ذیل کا تار دیا۔

"تار کا شکریہ قبول فرمائیے۔ میرے خط محررہ ۱۷اپریل سے یہی تاثر ملتا تھا کہ آپ نے میرا فارمولا مسترد کر دیا تھا۔ بہرحال مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نے ذاتی طور پر اسے رد نہیں کیا تھا۔ گاندھی جی کو اس ضمن میں کوئی خاص اتھارٹی یا کوئی نمائندہ پوزیشن حاصل نہیں۔ تاہم انہوں نے مجھے اس امر کی اجازت عطا کی تھی کہ میں آپ سے مل کر زیر بحث معاملہ پر گفت و شنید کروں۔ وہ بدستور اسی بات کے حامی ہیں۔ ان کو جو وقعت اور وقار حاصل ہے۔ امید ہے کہ اس کے پیش نظر وہ کانگرس سے یہ فارمولا منظور کرا سکیں گے۔ آپ لیگ کونسل میں پیش نہیں کرنا چاہتے۔ چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ جب تک اس فارمولے کو آپ کی ذاتی پسندیدگی نہ ہو۔ اس موضوع پر ہماری مزید مراسلت بے کار ہے۔"

سی۔ آر

مسٹر جناح نے ۵ جولائی ۱۹۴۴ء کو اس تار کا جواب راج گوپال اچاریہ کو دیا:

"مجھے افسوس ہے کہ جو تار میں نے ۲ جولائی ۱۹۴۴ء کو دیا تھا۔ اس کے علاوہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

راج گوپال اچاریہ نے ۸ جولائی ۱۹۴۴ء کو ذیل کا تار مسٹر جناح کو سری نگر کے پتے سے دیا۔

آپ کا ۵ جولائی کا تار آج ۸ جولائی کو ملا۔ اس کے ساتھ ہماری نجی (پرائیویٹ)

مراسلت اختتام کو پہنچی۔ اب ضروری ہے کہ پبلک کو اصل صورت حال سے آگاہ کیا جائے۔ لہٰذا میں آپ کی ۵ جولائی تک کی تمام خط و کتابت اخباروں کو اشاعت کے لئے دے رہا ہوں"

## گاندھی - جناح ملاقات

راج گوپال اچاریہ اور مسٹر جناح کی اس باہمی مراسلت کے بعد بظاہر معاملہ ختم ہو گیا۔ لیکن گاندھی جی اس فارمولے کو بنائے اتحاد قرار دے کر ۹ ستمبر ۱۹۴۴ء کو قائداعظم سے بمبئی ان کے مکان پر جا کر ملے۔ اور ملاقاتوں کا سلسلہ ۲۹ ستمبر تک جاری رہا۔ اس دوران میں ہوتا یہ تھا کہ جو کچھ بالمشافہ ان ملاقاتوں میں طے پاتا تھا وہ دونوں اصحاب خطوط کی صورت میں قلم بند کر لیتے تھے تاکہ آئندہ کے لئے سند رہے۔ ان خطوط کی تفصیل تاریخ وار درج ذیل ہے

قائداعظم بنام گاندھی جی۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۴۴ء
گاندھی جی بنام قائداعظم۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۴ء
قائداعظم بنام گاندھی جی۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۴۴ء
قائداعظم بنام گاندھی جی۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۴۴ء
گاندھی جی بنام قائداعظم۔ ۱۴ ستمبر ۱۹۴۴ء
قائداعظم بنام گاندھی جی۔ ۱۴ ستمبر ۱۹۴۴ء
گاندھی جی بنام قائداعظم۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۴ء
قائداعظم بنام گاندھی جی۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۴۴ء
گاندھی جی بنام قائداعظم۔ ۱۹ ستمبر ۱۹۴۴ء
قائداعظم بنام گاندھی جی۔ ۲۱ ستمبر ۱۹۴۴ء
گاندھی جی بنام قائداعظم۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۴۴ء
قائداعظم بنام گاندھی جی۔ ۲۳ ستمبر ۱۹۴۴ء
گاندھی جی بنام قائداعظم۔ ۲۳ ستمبر ۱۹۴۴ء
قائداعظم بنام گاندھی جی۔ ۲۵ ستمبر ۱۹۴۴ء

گاندھی جی بنام قائداعظم۔ ۲۵ ستمبر ۱۹۴۴ء
قائداعظم بنام گاندھی جی۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۴۴ء
گاندھی جی بنام قائداعظم۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۴۴ء

## قراردادِ پاکستان کا صحیح مفہوم

صورت حالات میں یہ عجیب الجھن پیدا ہو گئی تھی کہ فریقین نے راج گوپال اچاریہ فارمولے کے جملہ محاسن و معائب پر تو بحث ترک کر دی تھی اور سارا زور قلم اس بات پر صرف ہونے لگا تھا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی اس قرار داد کا صحیح مفہوم کیا ہے جو ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو منظور ہوئی تھی۔ اور جسے عرف عام میں قرار داد پاکستان کہا جاتا ہے۔

گاندھی جی نے اس قرار داد کی وضاحت کرتے ہوئے ذیل کے استفسارات کئے:

(۱) اس قرار داد کے متن میں لفظ پاکستان استعمال نہیں کیا گیا۔ کیا اس لفظ کا صحیح مفہوم یہی ہے کہ پ سے مراد پنجاب، ا سے مراد افغان یعنی صوبہ سرحد، ک سے مراد کشمیر، س سے مراد سندھ۔ تان سے مراد بلوچستان ہے۔

(۲) کیا پاکستان کی آخری منزل پان اسلام ازم ہے؟

(۳) مذہب کے علاوہ اور کون سی چیز ہے جو ہندوستان میں رہنے والے مسلمان کو دوسرے ہندوستانی سے علیحدہ کرتی ہے کیا ہندوستانی مسلمان ایک ترک یا عرب یا ایرانی سے مختلف ہے؟

(۴) زیر بحث قرار داد پاکستان میں جو لفظ مسلم استعمال ہوا ہے اس کا مفہوم کیا ہے؟ کیا یہ لفظ ہندوستان میں رہنے والے مسلم کے بارے میں استعمال ہوا ہے یا اس مسلم کے متعلق استعمال ہوا ہے کو آئندہ کبھی پاکستان بننے پر وہاں رہائش پذیر ہو گا؟

(۵) کیا یہ قرار داد پاکستان مسلمانوں کے لئے ایک مطمح نظر کے طور پر منظور کی گئی ہے یا اس سے پورے ہندوستان کے مسلمانوں کو مخاطب کیا گیا ہے۔ یا اس سے برطانوی حکومت کو الٹی میٹم دیا گیا ہے؟

(٦) مغرب و مشرق کے دو منطقوں (زون) میں جو خود مختار مملکتیں قائم کی جائیں گی ان کی تعداد کتنی ہوگی؟ دو یا تین یا چار یا پانچ؟

(۷) کیا اس کی حد بندی برطانوی حکومت کے زمانے میں ہوگی؟

(۸) اگر آخری سوال کا جواب اثبات میں ہے تو پھر ضروری ہے کہ پہلے اسے برطانوی حکومت منظور کرے اور پھر اسے بزور ہندوستان پر مسلط کرے۔ یہ نہیں ہوگا کہ اندر سے یہ تحریک برضا و رغبت پیدا ہو۔

(۹) کیا آپ نے اس بات کی تسلّی کر لی ہے کہ یہ "خود مختار مملکتیں" کہیں ٹکڑوں میں تقسیم نہ ہو جائیں؟

(۱۰) کیا یہ متعدد خود مختار اور "ساورن" مملکتیں اپنے لئے پورے ہندوستان کے لئے نقصان کا باعث نہ ہوں گی؟

(۱۱) مہربانی فرما کر مجھے اعداد و شمار سے یا کسی اور طریقے سے بتائیے کہ یہ قرار داد پاکستان کس طرح ہندوستان کی آزادی اور اس کی فلاح و بہبود میں معاون ہو سکتی ہے؟

(۱۲) ہندوستان کی ریاستوں میں جو مسلمان آباد ہیں ان کی تقسیم کیوں کر ہوگی؟

(۱۳) اقلیتوں کی تعریف آپ کے نزدیک کیا ہے؟

(۱۴) اس قرار داد کے آخری حصے میں اقلیتوں کے لئے جن مناسب، ہمہ گیر اور آئینی تحفظات* کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کی تعریف کیا ہے؟

(۱۵) کیا یہ صحیح نہیں کہ قرار داد لاہور میں چند پیش نظر مقاصد کا سرسری ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ ان مقاصد اور ان کے ضمنی تقاضوں کا حصول کس طرح ہوگا۔ مثلاً:

(ا) جو باشندے قرار داد پاکستان کی مجوزہ حدود میں رہتے ہیں، کیا ان کو یہ حق حاصل ہے یا نہیں کہ وہ ہندوستان سے علیحدگی کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کر سکیں؟ اگر انہیں اس قسم کا حق ہے تو اس کا فیصلہ کیونکر کیا جائے گا۔

(ب) قرار داد لاہور میں ڈیفنس اور اسی نوع کے دیگر مشترکہ دلچسپی کے تصور کے

---

* Adequate, effective and madatory safguards

بارے میں جو ذکر کیا گیا ہے ان کا حصول کس طرح ہو گا؟

(ج) یہ واقعہ ہے کہ بہت سے مسلمان ایسے بھی ہیں جنہیں مسلم لیگ کی پالیسی سے اختلاف ہے۔ اور جنہوں نے اکثر اس اختلاف کا علی الاعلان اظہار بھی کیا ہے۔ ذاتی طور پر مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی تردد نہیں کہ مسلم لیگ کا ہندوستان میں بہت اثر و رسوخ ہے۔ اور لیگ کی اسی اہمیت کے پیش نظر میں نے آپ سے مراسلت شروع کی ہے۔ باایں ہمہ کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ جو مسلمان لیگ سے متفق نہیں ہم ان کے جملہ شکوک و شبہات رفع کر کے انہیں اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کریں تاکہ انہیں یہ نہ محسوس ہو کہ وہ گویا دھارے سے کٹ کر الگ کر دیئے گئے ہیں؟

(د) بات پھر وہیں آ ٹھہرتی ہے کہ کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ ہم قرار داد پاکستان کو دونوں منطقوں (زون) کے تمام باشندوں کے سامنے پیش کر کے استصواب کریں کہ انہیں یہ قرار داد منظور ہے یا نہیں؟

گاندھی جی کے ان استفسارات کا جواب قائداعظم جناح نے ۱۷۔ ستمبر کو یوں دیا۔

(۱) یہ صحیح ہے کہ لفظ پاکستان اس قرار داد میں استعمال نہیں کیا گیا۔ اور یہ بھی درست ہے کہ اس لفظ کے پانچ حروف کے ساتھ جو معانی وابستہ کیے گئے ہیں وہ اس مفہوم میں یہاں استعمال نہیں کیے گئے۔ تاہم قرار داد لاہور کو اب قرار داد پاکستان کہا جاتا ہے۔

(۲) اس سوال کا زیر بحث مسئلے سے کوئی تعلق نہیں۔ تاہم جواب میں صرف اتنا کہوں گا کہ یہ محض ہوّا ہے۔

(۳) ہندوستان کے مسلمان ایک قوم ہیں۔ سوال کے آخری حصے کا قرار داد پاکستان کی وضاحت سے کوئی تعلق نہیں۔

(۴) یقیناً آپ لفظ مسلم کے مفہوم سے واقف ہیں۔

(۵) قرار داد لاہور کے متن کی وضاحت کے لئے یہ نکتہ قطعاً غیر متعلق ہے۔

(٦) یہ تمام منطقے (زون) پاکستان ہی کے حصے ہوں گے۔

(۷) جونہی قرار داد لاہور کی بنیاد اور اس کے اصول تسلیم کر لیے گئے حد بندی کا معاملہ طے کر لیا جائے گا۔

(۸) آپ کے سوال نمبر ۷ کی روشنی میں آپ کے سوال نمبر ۸ کا جواب میں دے چکا ہوں۔

(۹) قرار داد لاہور کی وضاحت سے اس سوال کا کوئی تعلق نہیں۔

(۱۰) آپ کے سوال نمبر ۹ کے جواب میں اس کا جواب دے چکا ہوں۔

(۱۱) قرار داد لاہور کی وضاحت سے اس سوال کا کوئی تعلق نہیں۔ میں اپنی متعدد تقریروں اور آل انڈیا مسلم لیگ اپنی متعدد منظور شدہ قرار دادوں میں یہ امر واضح کر چکی ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے حصول اور ہندوستان کے جملہ مسائل کے حل کا یہی واحد طریقہ ہے۔

(۱۲) قرار داد لاہور کا تعلق صرف برطانوی ہند سے ہے۔ ہندوستانی ریاستوں کے مسلمانوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

(۱۳) اقلیتوں کے بارے میں میرا جواب یہ ہے کہ آپ خود بارہا کہہ چکے ہیں کہ اقلیتوں سے مراد تسلیم شدہ اقلیتیں ہیں۔

(۱۵) قرار داد لاہور میں چند بنیادی اصولوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جونہی یہ اصول تسلیم کر لیے گئے جزئیات و تفصیلات کا فیصلہ فریقین کے باہمی مشورے سے کر لیا جائے گا۔

(ا) قرار داد لاہور کی وضاحت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

(ب) قرار داد لاہور کی وضاحت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

(ج) مسلم لیگ مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔

(د) اس کا جواب شق ج میں دے چکا ہوں۔

## گاندھی بنام جناح

گاندھی جی نے ۲۳ ستمبر ۱۹۴۴ء کو ایک خط میں مسٹر جناح کو لکھا۔

"میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ ہندوستان میں دو یا تین یا چار قومیں آباد ہیں۔ اس کے برعکس میں یہ مانتا ہوں کہ ہندوستان میں رہنے والے تمام باشندے گویا ایک

خاندان کے افراد ہیں۔ جن میں سے مسلمانوں کا وہ عنصر جو شمال مغربی علاقے یعنی، بلوچستان۔ سندھ۔ شمال مغربی صوبہ سرحد اور پنجاب کے ان اضلاع میں جہاں مسلمانوں کی آبادی دیگر عناصر سے زیادہ ہے۔ اور بنگال اور آسام کے ان علاقوں کو جہاں مسلمانوں کی آبادی دیگر عناصر سے قطعی زیادہ ہے۔ ہندوستان سے علیحدہ ہو کر اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق رہنے کا حق حاصل ہے۔

ہر چند کہ مجھے آپ کے اس زاویہ نظر کے تسلیم کرنے میں تامل ہے۔ میں کانگرس اور باقی ملک سے درخواست کروں گا کہ وہ مسلم لیگ کی قرار داد لاہور (۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء) کے مطابق تقسیم ہند کے مطالبے کی ذیل کی شرائط کے تحت قبول کریں:

کانگرس اور مسلم لیگ کی باہمی رضامندی سے حد بندی کا ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا. جو ان علاقوں کی حدود کا تعین کر کے وہاں رہنے والی تمام بالغ آبادی کی رائے معلوم کرے گا۔ اگر یہ فیصلہ علیحدگی کے حق میں ہوا تو جونہی ہندوستان سے برطانوی حکومت ختم ہوئی ان علاقوں پر مشتمل دو آزاد و خود مختار مملکتیں وجود میں لائی جائیں گی۔

علیحدگی کے بعد ان دونوں مملکتوں میں ایک باہمی معاہدہ ہو گا تاکہ امور خارجہ۔ ڈیفنس۔ مواصلات۔ کسٹم۔ کامرس وغیرہ مشترکہ نوعیت کے امور کو خوش اسلوبی سے چلایا جا سکے۔ یہ معاہدہ اس بات کا بھی ذمہ لے گا کہ دونوں مملکتوں میں رہنے والی اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کی جائے۔

اس معاہدے کی تکمیل کے فوراً بعد کانگرس اور مسلم لیگ ہندوستان کی آزادی کے حصول میں کوشاں ہوں گی۔ اس سلسلے میں اگر کانگرس نے حصول آزادی کے لئے کسی نوع کا "ڈائرکٹ ایکشن" شروع کیا تو یہ مسلم لیگ کی صوابدید پر منحصر ہو گا کہ چاہے تو اس "ڈائرکٹ ایکشن" میں شریک ہو اور چاہے تو نہ ہو۔

اگر آپ کو یہ مذکورہ بالا شرائط منظور نہیں تو براہ کرم مجھے بتائیے کہ قرار داد لاہور کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ اور اس ضمن میں آپ مجھے کیا مشورہ دیتے ہیں کہ میں کانگرس کو کن امور کا پابند کروں۔

# جناح بنام گاندھی

گاندھی جی کے اس خط کا جواب قائداعظم جناح نے ۲۵ ستمبر کو دیا:

" آپ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں۔ اور اس حیثیت سے انہیں خود ارادی حاصل ہے۔ آپ یہ بھی تسلیم نہیں کرتے کہ تنہا مسلمانوں کو اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنا حق خود ارادی استعمال کر سکیں۔

آپ یہ بھی تسلیم نہیں کرتے کہ پاکستان دو منطقوں پر مشتمل ہو گا یعنی شمال مغربی اور شمال مشرقی منطقے جن میں چھ صوبے شامل ہوں گے یعنی سندھ۔ بلوچستان۔ شمال مغربی صوبہ سرحد۔ پنجاب۔ بنگال۔ اور آسام۔ قرار داد لاہور کے متن میں "علاقائی ردو وبدل" کے الفاظ درج کیے گئے ہیں۔ ان کا آپ نے غلط مفہوم اخذ کیا ہے۔

جہاں تک ان خطوں کی حد بندی کا تعلق ہے وہ اسی صورت میں بروئے کار لائی جا سکتی ہے کہ آپ مندرجہ بالا حقائق کو تسلیم کر لیں۔

قرار داد لاہور میں اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کا جو سامان مہیا کیا گیا ہے۔ آپ اسے تسلیم نہیں کرتے۔ اب میں قدرے تفصیل سے آپ کے مندرجات پر بحث کرتا ہوں۔ آپ لکھتے ہیں کہ:

"میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ ہندوستان میں دو یا تین یا چار قومیں آباد ہیں۔ اس کے برعکس میں یہ مانتا ہوں کہ ہندوستان میں رہنے والے تمام باشندے گویا ایک خاندان کے افراد ہیں۔ جن میں سے مسلمانوں کا وہ عنصر جو شمال مغربی علاقے یعنی بلوچستان۔ سندھ، شمال مغربی صوبہ سرحد اور پنجاب کے ان اضلاع میں جہاں مسلمانوں کی آبادی دیگر عناصر سے قطعی زیادہ ہے۔ اور بنگال اور آسام کے ان علاقوں کو جہاں مسلمانوں کی آبادی دیگر عناصر سے قطعی زیادہ ہے۔ ہندوستان سے علیحدہ ہو کر اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق رہنے کا حق حاصل ہے۔"

آپ کی یہ جملہ شرائط اگر تسلیم کر لی جائیں تو ان صوبوں کی حدود میں اس بری طرح کاٹ چھانٹ اور قطع و برید ہو گی کہ ہم ان کا حلیہ بھی نہیں پہچان سکیں گے۔ آپ کی یہ تاویل و تعبیر

قرار داد لاہور کے منافی ہے۔ پھر آپ فرماتے ہیں کہ ان علاقوں میں بھی علیحدگی کے حق کا فیصلہ کرنے کا اختیار صرف مسلمانوں کو نہیں بلکہ وہاں رہنے والے تمام باشندوں کا ہو گا۔ آپ کا یہ نقطہ نگاہ بھی قرار داد لاہور کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے۔ علاوہ ازیں آپ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اگر اس ووٹ کا فیصلہ علیحدگی کے حق میں ہوا تو جونہی ہندوستان سے برطانوی حکومت ختم ہوگی، ان علاقوں پر مشتمل دو آزاد و خود مختار مملکتیں وجود میں لائیں جائیں گی۔

اس کے برعکس ہمارا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ ہمیں فی الفور ایک باہمی معاہدہ کر لینا چاہئے تاکہ ہم اپنی متحدہ اور مشترکہ کوشش سے ہندوستان اور پاکستان کو آزاد کرا سکیں۔

قبل اس کے کہ ہم اس مسئلے پر اپنی رائے کا اظہار کریں۔ مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہ بتایا جائے کہ بعض غیر جانب دار اور بعض جانب دار اصحاب کی اس بارے میں کیا رائے تھی۔

''گاندھی۔ جناح کی باہمی گفت و شنید کی ناکامی نے ہندوستان کی اقلیتوں کے مسئلے کو پھر سے کھٹائی میں ڈال دیا ہے۔ اگر ملک کی ان دو بڑی سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں کی باہمی گفتگو کامیاب ہو جاتی تو یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ ہم ہندوستان کے کانسٹی ٹیوشن کی تشکیل و تعمیر کی جانب ایک اچھا خاصا قدم آگے اٹھا سکتے تھے۔ کیونکہ آئین سازی کا مسئلہ آج سب سے اہم مسئلہ ہے۔ اگر چند بڑے بڑے اصولوں پر ان دونوں لیڈروں میں باہمی مفاہمت ہو جاتی تو لارڈ ویول کا کام نسبتاً آسان ہو جاتا۔ کیونکہ لارڈ موصوف اس عبوری دور کے لئے ایک متفقہ آئین بنانے کے بڑے خواہاں ہیں۔ ظاہر ہے ہندوستان کا موجودہ سیاسی بحران (ڈیڈ لاک) حل کرنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے۔ اس کے علاوہ مسٹر گاندھی اور ان کی وجہ سے کانگرس بھی اپنے اس دعویٰ سے دستبردار ہو جاتی کہ تنہا وہی پورے ہندوستان کی نمائندہ جماعت ہے۔''

پنجاب کے گورنر، سر برٹرنڈ گلینسی نے ۲۳۔ اگست ۱۹۴۴ء کو ذیل کا خط وائسرائے لارڈ

ویول کو لکھا:

"اگر راج گوپال فارمولا مسٹر جناح قبول کر لیتے تو پنجاب کے بارہ اضلاع (جن میں پوری انبالہ ڈویژن اور پوری جالندھر ڈویژن کے علاوہ امرتسر کا ضلع بھی شامل ہے) پاکستان سے کٹ جاتے۔ میرا خیال ہے کہ پنجاب کے بہت کم مسلمان اپنے صوبے کی اس طرح شکست و ریخت کو بخوشی منظور کرتے۔ پنجاب کے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں آہستہ آہستہ یہ خیال پھیل رہا ہے کہ اگر ہندوستان کی مرکزی حکومت میں مسلمانوں کی نمائندگی میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا جائے تو وہ ایک متحدہ ہندوستان قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ میرے نزدیک کٹے پھٹے پاکستان سے تو یہ سکیم کہیں زیادہ مستحکم ہے۔ ورنہ پنجاب میں ایک خوف ناک خانہ جنگی برپا ہونے کا خطرہ ہے۔ دقت یہ ہے کہ مسٹر جناح نے مسلسل و پیہم پاکستان کا نعرہ لگا کر مسلمانوں کے جذبات میں اس قسم کا ہیجان پیدا کر دیا ہے کہ اب وہ پاکستان سے کم تر کوئی چیز قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ ایک عام مسلمان کے نزدیک پاکستان کا مطلب یہ ہے کہ انہیں ایک ایسا خطہ مل جائے جہاں انہیں اپنی دنیاوی ترقیوں کے لیے ہندوؤں سے مقابلہ نہ کرنا پڑے۔"

سری نواس شاستری نے جو جنوبی ہند کے ایک بڑے قابل احترام لبرل لیڈر تھے۔ گاندھی۔ جناح مذاکرات شروع ہوتے ہی ۱۲ اگست ۱۹۴۴ء کو ایک پبلک جلسے سے تقریر کرتے ہوئے کہا:

"قرارداد پاکستان کا مطالعہ کرنے سے اور راج گوپال فارمولا پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مسلم لیگ کی ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی قرارداد کے مطابق ایک متحدہ پاکستان وجود میں نہیں آ سکتا۔ کیونکہ قرارداد کے الفاظ میں صیغہ جمع کا استعمال کیا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ شمال مغربی ہند میں ایک علیحدہ "ساورن سٹیٹ" قائم کی جائے گی۔ اور شمال مشرقی ہند میں

ایک الگ مملکت کا قیام عمل میں آئے گا۔ قرار داد پاکستان کے الفاظ سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں خود مختار مملکتیں ایک واحد مملکت کی صورت اختیار نہیں کر سکتیں اور ان دونوں مملکتوں کو ایک دوسرے سے ملحق کرنے کے لئے کسی قسم کا کاریڈور بھی قائم نہیں کیا جا سکتا۔ نیز قرار داد کے الفاظ سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ دو سے زیادہ مسلم مملکتیں بھی وجود میں آسکتی ہیں۔"

گاندھی۔ جناح مذاکرات کی ناکامی پر راجہ مہشور دیال سیٹھ نے جو ۱۹۴۲ء میں آل انڈیا ہندو مہاسبھا کے سکرٹری تھے، ذیل کا بیان روزنامہ پائینیر (لکھنو) کو دیا:

"ہندو مسلم مسئلہ طے کرنے کے لئے جو تجاویز راج گوپال اچاریہ نے، گاندھی جی کے مشورے سے، مسٹر جناح کو پیش کی ہیں۔ من وعن وہی تجاویز ہیں جو خود مسٹر جناح نے ایک دفعہ ہمیں پیش کی تھیں۔ اور جو اس قرار داد پاکستان کے عین مطابق ہیں جو ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ نے اجلاس لاہور میں منظور کی تھی۔

میرا فرض ہے کہ میں پبلک کو آگاہ کرنے کے لئے یہ واقعہ بیان کروں کہ آل انڈیا ہندو مہاسبھا نے اگست ۱۹۴۲ء میں، ایک سپیشل کمیٹی اس غرض سے مقرر کی تھی کو وہ ملک کی بڑی بڑی سیاسی جماعتوں کے لیڈروں سے مشورہ کر کے قومی مطالبات کی پذیرائی کے لئے کوئی متحدہ پروگرام وضع کرے۔ میں اس وقت آل انڈیا ہندو مہاسبھا کا جنرل سیکریٹری تھا۔ اور اس حیثیت سے میں نے مسٹر جناح سے مذاکرات کی ابتداء کی تھی۔ ہمارے ایک مشترکہ دوست کے توسل سے، جو مسلم لیگ میں بھی ایک بڑی اہم حیثیت کے مالک تھے، مسٹر جناح نے ذیل کی شرائط ہمیں پیش کی تھیں۔

(۱) آل انڈیا مسلم لیگ کا صدر آل انڈیا ہندو مہاسبھا کے اس ریزولیوشن کی تائید کرتے ہوئے جو ۳۰ اگست ۱۹۴۲ء کو پاس کیا گیا تھا، آزادئ ہند کے حصول کے لئے قومی مطالبے کی حمایت کرتا ہے نیز اس بات کی بھی حمایت کرتا ہے کہ مسلم لیگ کی دیگر قومی جماعتوں سے اشتراک عمل کر کے ہندوستان کی آزادی حاصل کرنے کی کوشش کرے گی۔ بشرطیکہ مسلم لیگ کے چند بنیادی مطالبے منظور کر لئے جائیں۔ جونہی یہ مطالبے منظور کر لیے گئے۔

مسلم لیگ ہندوستان کے تمام صوبوں میں کولیشن وزارتیں بنانے پر رضامند ہو جائے گی۔

جن بنیادی مطالبات کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہیں:

(ا) عالمگیر جنگ ختم ہوتے ہی ایک کمیشن مقرر کیا جائے جو ہندوستان کے ان شمال مغربی اور شمال مشرقی متصلہ علاقوں کی حد بندی کرے گا جہاں مسلمانوں کی آبادی کی اکثریت ہے۔

نوٹ:۔ مسٹر جناح نے خود ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی سے جو اس سپیشل کمیٹی کے صدر تھے، یہ کہا تھا کہ اکثریت سے مراد صرف اکیاون فیصد اکثریت نہیں بلکہ پچپن فیصد اکثریت سے کم نہیں ہونی چاہئے۔

(ب) ان متصلہ مسلم اکثریت کے علاقوں میں بلا امتیاز مذہب و ملت، تمام باشندوں سے استصواب کیا جائے گا۔ اگر رائے دہندگان کا فیصلہ علیحدگی کے حق میں ہوا تو ایک خود مختار (ساورن) مملکت قائم کی جائے گی۔

(ج) علیحدگی کی صورت میں مسلمانوں کو اس بات کا کوئی حق نہیں ہوگا کہ وہ ہندوستان میں رہنے والی مسلم اقلیت کے لئے کسی قسم کے جداگانہ تحفظات کا مطالبہ کریں۔ ہاں ہندوستان اور پاکستان دونوں مملکتیں اگر پسند کریں تو اپنے اپنے ملک میں رہنے والی مذہبی اقلیتوں کی حفاظت کا کوئی باہمی معاہدہ کر سکتی ہیں۔

(د) ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی خطوں کے درمیان کوئی کاریڈور نہیں ہوگا۔ البتہ یہ دونوں خطے ایک ہی مملکت کے حصے تصور کئے جائیں گے۔

(ھ) ہندوستان کی ریاستوں پر اس فارمولے کا اطلاق نہیں ہوگا۔

(و) آبادیوں کا باہمی تبادلہ سراسر ان کی مرضی سے ہوگا۔ اور اس کام کو بخیر و خوبی انجام دینے کے لئے حکومت ایک ادارہ قائم کرے گی۔

مندرجہ بالا تحریر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو تجاویز راجہ جی نے پیش کی ہیں۔ ان میں اور مسٹر جناح کی ان پیش کردہ تجاویز میں عملاً کوئی فرق نہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ اس وقت نہ میں اور نہ ہندو مہاسبھا مسٹر جناح کی ان تجاویز کو قبول کرنے پر راضی ہو سکتے تھے۔ کیونکہ ہم ہندوستان کی تقسیم کے قطعی خلاف تھے۔

دسمبر ۱۹۴۲ء میں سرتیج بہادر کے الہ آباد والے مکان پر جو جلسہ ہوا تھا۔ اس میں اور لوگوں کے علاوہ راج گوپال اچاریہ بھی شامل تھے۔ میں نے اس موقع پر مسٹر جناح کی مذکورہ بالا تجاویز پڑھ کر سنائی تھیں۔ اور ان کی ایک نقل راجہ جی کو بھی دی تھی۔ انہوں نے وہی نقل مہاتما گاندھی کو بھی دکھائی۔ جنھوں نے مارچ ۱۹۴۳ء میں اکیس دن کا برت رکھا ہوا تھا۔ اس طرح انہوں نے گاندھی جی سے منظوری حاصل کرلی۔

راجہ جی نے ۲٦ مارچ ۱۹۴۳ء کو مجھے دہلی بلایا۔ میں نے اس موقع پر دوبارہ اپنے اس مشترکہ دوست کے توسل سے، جنھیں مسلم لیگ میں ایک بڑی اہم حیثیت حاصل ہے، مسٹر جناح کو پیغام بھیجا۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا کہ انہوں نے اپنی تجاویز سے رُوگردانی اختیار کرلی۔ جو خود انہوں نے ستمبر ۱۹۴۲ء میں پیش کی تھیں" [1]

## ڈاکٹر سید عبداللطیف

حیدر آباد کے ڈاکٹر سید عبداللطیف ایک زمانے میں مسلم لیگ کے بڑے سرگرم معاون تھے۔ ان کے بارے میں صرف اتنا عرض کرنا کافی ہوگا کہ جب ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا کی کانسٹی ٹیوشن سب کمیٹی نے ہندوستان کے آئندہ آئین کے بارے میں مختلف سکیمیں طلب کی تھیں تو ڈاکٹر سید عبداللطیف نے بھی ایک مفصل سکیم پیش کی تھی۔ راج گوپال فارمولا کے بارے میں انہوں نے جو اخباری بیان دیا تھا۔ اس کا ایک حصہ نیچے درج کرتا ہوں۔

"مسلم لیگ اپنی غلط پالیسی کی وجہ سے اب ایک ایسے مخمصے میں گرفتار ہوگئی ہے جس سے نکلنے کا راستہ اسے نظر نہیں آتا۔ حالات کو مزید خراب کرنے کے لئے راج گوپال اچاریہ نے ایک نیا تکنیک اختیار کیا ہے۔ انہوں نے مسٹر جناح سے کہا ہے "ایک پونڈ گوشت لے لو۔ اور چھٹی کرو۔ لاہور سے مغربی جانب ایک ٹکڑا لے لو۔ اور دوسری طرف ڈھاکہ اور میمن سنگھ کے گردونواح میں ایک افلاس اور غربت کا مارا ہوا قطعہ لے لو اور ہماری جان چھوڑو۔ زیادہ سے زیادہ یہی رقبہ اس پاکستان کا جو آپ کی مشہور عالم قرارداد پاکستان کے طفیل آپ کو مل سکتا ہے۔ رہے ہندو، باقی ہندوستان کے لئے، مرکزی پارلیمنٹری ایگزیکٹو بنا

---

[1] انڈین اینوئل رجسٹر ۱۹۴۴ء۔ حصہ دوم جولائی تا دسمبر۔ صفحہ ۲۱۵

کر ایک پارٹی کی وحدانی حکومت قائم کریں گے۔ جس کے تحت مسلمان اقلیت کو طوعاً نہیں کرہاً رہنا پڑے گا۔"

میں نے ۱۹۵۴ء میں، جب میں لندن میں مقیم تھا، اپنے محترم دوست مولانا غلام رسول مہر مرحوم سے استفسار کیا تھا کہ قائداعظم نے راج گوپال اچاریہ فارمولا ۱۹۴۴ء میں کیوں مسترد کر دیا تھا حالانکہ ہمیں اس وقت وہ سب کچھ مل رہا تھا جو ہم نے بالآخر ہزار کشت وخون کے بعد حاصل کیا۔ مہر صاحب نے میرے استفسار کے جواب میں ایک بہت طویل خط لکھا۔ جس کے بعض ضروری اجزاء نیچے درج کرتا ہوں:

"راج گوپال اچاریہ کا فارمولا قبول نہ کرنے کے وجوہ بالکل واضح تھے۔ مثلاً (ا) اس زمانے میں پنجاب و بنگال کو تقسیم سے بچانے کی امید۔ اگرچہ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ ہمارے دوائر میں تقسیم کی خوف ناک منزلوں کا صحیح احساس کسی عہد میں بھی موجود نہ تھا۔

(ب) ۱۹۴۴ء میں اکثر مسلمان پنجاب و بنگال پر قطعاً راضی نہ ہوسکتے تھے اور اس فارمولے کو مسلمانوں کی اکثریت رد کر دیتی۔ اغلب ہے یہ فارمولا بنانے والے کی غرض یہ بھی ہو کہ مسلمان دو ٹکڑوں میں بٹ جائیں گے اور اصل مطالبۂ تقسیم کھٹائی میں پڑ جائے گا۔

(۳) یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ تقسیم ملک انگریزوں سے کرانا منظور تھا۔ اس لئے کہ اگر کانگرس و لیگ میں باہم اتفاق ہوجاتا تو یہ فارمولا انگریزوں سے منظور کرایا جاسکتا تھا۔ اور ہندو مہاسبھا کی مخالفت کانگرس کے مقابلے میں کارگر نہ ہوسکتی۔

(۴) ایک اعتراض یہ ہوسکتا ہے کہ اگر پنجاب و بنگال کی تقسیم ہی منظور تھی تو اس کے لئے حد بندی کا کمیشن مقرر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ اصل طے ہوچکی تھی کہ مسلم اکثریت والے علاقے پاک پنجاب میں شامل ہوں اور ایسے علاقے ہر واقف کار کو معلوم تھے۔ کیوں انہیں الگ نہ کر لیا گیا؟ اس کا کوئی جواب میرے ذہن میں نہیں۔ اگر ایسا کیا جاتا تو ضلع فیروز پور سے تحصیل فیروز پور اور تحصیل زیرہ۔ ضلع جالندھر میں سے تحصیل نکودر

اور تحصیل جالندھر۔ ضلع امرتسر میں سے تحصیل اجنالہ اور ضلع گورداسپور میں سے تحصیل بٹالہ اور تحصیل گورداسپور یقیناً پاک پنجاب میں آجاتیں۔ ریاست کپورتھلہ، جہاں اسلامی اکثریت تھی، محصور ہوجاتی یوں پاک پنجاب کی حد دریائے ستلج پر پہنچ جاتی۔ اور سکھوں نے جو ہنگامہ بپا کیا۔ اس کے لئے کوئی امکان باقی نہ رہتا۔

(۵) آپ کے دوسرے سوال یعنی راج گوپال اچاریہ فارمولا قبول کر لینے کے نتائج کا سلسلہ زیر بحث لانے کی ضرورت نہیں اوپر کی تصریحات میں اس کے اکثر پہلو سامنے آگئے ہیں۔ میرے نزدیک مسلمانوں میں پھوٹ پڑجاتی اور لیگ کی پوزیشن کمزور ہوجاتی۔ لیکن اصل سوال یہ نہیں کہ لیگ مستحکم رہتی یا نہ رہتی۔ اصل سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کو فائدہ پہنچتا یا نقصان۔ دونوں قسم کے امکانات تھے۔ یقین و وثوق سے کسی ایک پہلو کو صحیح قرار دینا مناسب نہیں۔ موجودہ تقسیم بالاتفاق منظور ہوئی تھی۔ اور انگریز کا قدم بیچ میں تھا۔ بایں ہمہ خون خرابہ ہوا۔ اس کے اسباب دوسرے تھے جو راج گوپال اچاریہ فارمولا قبول کر لینے میں ہوسکتے تھے۔ البتہ یہ درست ہے کہ راج گوپال اچاریہ فارمولا کے مطابق مسلمانوں کی پوزیشن مقابلتہً بہتر ہوتی۔"

گزشتہ صفحات میں ہم نے راج گوپال اچاریہ فارمولے کے بارے میں تفصیل سے تمام حالات درج کر دیئے ہیں۔ ہر شخص کو ان واقعات سے نتائج اخذ کرنے کا حق ہے۔

قائداعظم پورا بنگال اور پورا پنجاب مانگتے تھے، جو ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی قرار داد کے قطعی منافی تھا۔ قائداعظم کا مطالبہ گاندھی جی سے یہ تھا کہ پہلے یہ تسلیم کرو کہ ہندوستان کے مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ اور اس حیثیت سے انہیں حق خود ارادی (Right of Self-determination) حاصل ہے۔ اگر یہ مطالبہ من و عن تسلیم کر لیا جاتا تو ان مسلمانوں کا کیا حشر ہوتا جو ہندوستان میں رہ گئے تھے۔ کیا اس طرح وہ "مسلمان" "ایلین" بن کر نہ رہ جاتے، جن کا ہندوستان کی سرزمین پر بطور ان کے آبائی وطن کے، کوئی حق نہ تھا۔

قائداعظم نے پاکستان بننے سے صرف تین روز پہلے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو، مجلس دستور ساز اسمبلی میں جو تقریر کی تھی، اس میں انہوں نے صاف الفاظ میں کہا تھا کہ قوم کی بنیاد مذہب نہیں بلکہ وطن کا اشتراک ہے۔ ہم نے بالآخر راج گوپال فارمولے کے مطابق ذیل کی پیش

کردہ شرائط قبول کیں:

(۱) تقسیم پنجاب کے لئے حد بندی کا کمیشن مقرر کرایا گیا۔

(۲) پنجاب کی ضلع وار تقسیم کے لئے رائے دینے کا حق صرف مسلمانوں تک محدود نہیں رکھا گیا۔ بلکہ اس میں ان تمام غیر مسلموں کو بھی شامل کیا گیا جو پنجاب میں آباد تھے۔

(۳) برعظیم ہند کے مسلمانوں کے حق خود ارادی کو ہم نے، جغرافیائی تقسیم کے بعد۔ صرف ان علاقوں تک محدود کر دیا جو نصف پنجاب، صوبہ سرحد۔ سندھ اور بلوچستان میں آباد تھے۔

## کانجی دوار کا داس

کانجی دوار کا داس، بمبئی کے ایک لبرل لیڈر تھے، جو قائداعظم کے، مدت العمر کے پرانے دوست تھے۔ راج گوپال فارمولے کے مذاکرات کی ناکامی کے بعد وہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۴۴ء کو مسٹر جناح سے ملے، توانہوں نے ذیل کے تاثرات اپنی کتاب میں درج کئے۔

"مسٹر جناح نے باتوں کا آغاز کیا۔ اب ان میں ایک نئی عادت یہ بھی پیدا ہو گئی ہے کہ اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دباتے رہتے ہیں۔ یہ عادت ان کی تنہائی اور اعصابی تناؤ کی نشانی ہے۔ میں ان سے بمشکل دو فٹ کے فاصلے پر بیٹھا تھا۔ لیکن وہ اس قدر آہستہ اور مدھم آواز میں بول رہے تھے کہ مجھے کان لگا کر سننے میں بھی خاصی تکلیف ہو رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ گویا اپنے آپ سے، سرگوشیوں میں باتیں کر رہے ہیں۔ میری جانب دیکھنے کی بجائے وہ سامنے دیوار کی طرف دیکھ رہے تھے"۔

"ماحول میں جو اداسی اور تکرار چھایا ہوا تھا۔ اور غم گینی کے جو آثار ان کے چہرے سے عیاں تھے، ان سے معلوم ہوتا تھا کہ مسٹر جناح کو گاندھی۔ جناح مذاکرات کی ناکامی سے کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ وہ حال ہی میں انفلوائنزا کے حملے سے صحت یاب ہوئے ہیں۔ لیکن سخت کمزور دکھائی دیتے تھے۔ اس ملاقات میں ان سے میں نے بہت سے سوال کئے۔ ظاہر ہے میں ان پر وکیلوں کی طرح جرح تو نہیں کر سکتا تھا۔ ہرچند میری کوشش یہی تھی کہ میرے سوالات سے ان کے جذبات کو ٹھیس نہ لگے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں گنتی کے ان چند افراد

میں سے ہوں جو آج بھی مسٹر جناح سے دوستانہ بے تکلفی اور برابری کی حیثیت سے ملتے ہیں۔ ان کے بیشتر دوست باہمی اختلافات کی بناء پر یا تو ان کو چھوڑ گئے ہیں یا ان سے خفا ہو گئے ہیں۔ "

---

"TEN YEARS TO FREEDOM, 1935-1947"

By - KANJI DWARKA DAS (1968)

تیسرا باب

# سردار شوکت حیات کا وزارتِ پنجاب پر تقرر

سر سکندر حیات کا یکایک ناگہانی انتقال ہوا تو ملک خضر حیات ٹوانہ کو ان کی جگہ پنجاب کا وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ لیکن وزارت کی ایک اسامی جو خالی ہوئی تھی، اس کو پُر کرنا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ اس جگہ سردار شوکت حیات کا تقرر کر دیا گیا۔

سردار شوکت حیات، اس وقت ہندوستانی فوج میں میجر تھے۔ باپ کے بعد بیٹے کو وزیر بنا دینا۔ کوئی خاندانی وراثت تو نہیں تھی جو باپ کی وفات پر بیٹے کو لازماً ملتی۔ اس دلچسپ تقرر پر گورنر پنجاب کے سیکرٹری جی۔ اے۔ ایبل نے ۱۵۔ فروری ۱۹۴۳ء کو وائسرائے ہند کے پرائیوٹ سیکرٹری سر گلبرٹ لیتھ ویٹ کو جو خط لکھا اس کا ترجمہ نیچے درج کرتا ہوں،

کانفیڈ نشل

۱۵۔ فروری ۱۹۴۳۔ "مائی ڈیئر گلبرٹ

گزشتہ رپورٹ جو میں نے آپ کو ارسال کی تھی ۔ اس کے بعد سر سکندر کا یکایک انتقال ہوگیا۔ وزارت کی جو اسامی خالی ہوئی تھی، اس پر میجر شوکت حیات کا تقرر ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں پنجاب کے گورنر نے سردار شوکت حیات کے متعلق جو نوٹ لکھا ہے، وہ بجنسہ ارسال ہے۔ "

کانفیڈ نشل

"سر سکندر کے انتقال پر، پنجاب کے کابینہ میں جو جگہ خالی ہوئی تھی، اس پر شوکت

حیات کا تقرر کر دیا گیا ہے۔ ان کی عمر صرف اٹھائیس سال ہے۔ انہیں سیاست کا کوئی تجربہ بھی نہیں۔ انہوں نے آرمی میں اچھا کام کیا ہے۔ اریٹریا میں وہ زخمی ہو گئے تھے۔ اور غنیم کے ہاتھوں گرفتار بھی ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ مشرق الاوسط کی ہندوستانی ڈویژن کے سٹاف پر بھی تھے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ان کا موجودہ تقرر سراسر جذباتی وجوہ سے ہوا ہے۔ جن لوگوں کو سر سکندر کی ذات سے عقیدت و محبت تھی، ان کا اصرار تھا کہ یہ اسامی شوکت حیات کو ملنی چاہئے۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ پنجاب اسمبلی میں کسی اور شخص پر اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ وزارت کا منصب برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ شوکت حیات کو آئندہ چھ مہینے کے اندر، پنجاب اسمبلی کا ممبر منتخب کیا جائے۔"

اسی مضمون پر جو خط ۲۴۔جنوری ۱۹۴۳ء کو، گورنر پنجاب، سر برٹرنڈ گلینسی نے وائسرائے ہند کو لکھا، اس کا ترجمہ بھی ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"ڈیئر لارڈ لنلتھگو، یہ صحیح ہے کہ بظاہر شوکت حیات کے تقرر پر چند اعتراض کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ان کی عمر اٹھائیس سال ہے۔ سیاست کا انھیں کوئی تجربہ نہیں۔ باپ کی جگہ بیٹے کے تقرر سے وراثت کی روایت قائم کی جا رہی ہے۔ بایں ہمہ وزیر اعظم (جو کہ خضر حیات) کی شدید خواہش ہے کہ شوکت کو ضرور وزیر بنانا چاہئے۔ میں بھی اس بارے میں ان کا ہم خیال ہوں۔ علاوہ ازیں، اس منصب کے لئے جو دیگر امیدوار، ممبران اسمبلی موجود تھے، ان کی اہلیت و صلاحیت کو مدنظر رکھتے ہوئے، میں سمجھتا ہوں کہ شوکت حیات کا تقرر بہترین ہے۔

ایک یہ خیال بھی پیش نظر ہے کہ سینٹ میں، ایک ایسے شخص کی شمولیت ہے جو، ابھی کل تک فوج میں ملازم تھا، پنجاب میں فوجی بھرتی کو زیادہ تقویت ملے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض حلقوں میں شوکت حیات کے تقرر پر خوشنودی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ سراسر جذباتی ہے۔ کھڑ قبیلے کے تمام افراد نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ ہر قسم کے خاندانی تنازعوں کو بھلا کر، متفقہ طور پر، شوکت حیات کی مدد کریں گے۔ شوکت فوج کی ملازمت سے دست بردار ہونے کو پسند نہیں کرتا۔ لیکن چونکہ اب وہ اپنے قبیلے کا سربراہ بن گیا ہے۔ اس لئے اس کا ارادہ ہے کہ موجودہ جنگ کے اختتام پر وہ فوج سے مستعفی ہو کر کلیتہً

وزارت کی ذمہ داریوں سے عہدہ بر آ ہونے کی کوشش کرے گا. بشرطیکہ کمانڈرانچیف نے اسے فوج سے مستعفی ہونے کی اجازت عطا کر دی۔

"یہ ہے ہماری موجودہ پوزیشن۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان حالات میں وزیرِاعظم (خضر حیات) کو اپنے فیصلے پر عمل در آمد کی اجازت ملنی چاہئے۔"

آپ کا نیاز مند

برٹرنڈ گلینسی

گورنر برٹرنڈ گلینسی نے ۱۷۔اپریل ۱۹۴۳ء کو ذیل کا خط وائسرائے لارڈ لنلتھگو کو لکھا

"گورنمنٹ ہاؤس۔ لاہور

۱۷۔اپریل ۱۹۴۳ء

"ڈیئر لارڈ لنلتھگو ۔ شوکت حیات نے مجھے بتایا کہ جب وہ جناح سے ملنے کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے ازراہ کرم اس سے بڑی شفقت کا اظہار کیا۔ وہ آپ کے حسن سلوک کا بے حد ممنون ہے۔ جناح کا رویہ اس قدر سخت اور متکبرانہ تھا۔ اور اس نے شوکت سے ملاقات کے دوران میں بہت نخوت کا اظہار بھی کیا۔ اس نے شوکت سے کہا کہ بہتر یہی ہے کہ تم فوراً واپس فوج میں چلے جاؤ۔ اور تمہیں ہرگز پنجاب اسمبلی کے لئے مسلم لیگ کا ٹکٹ نہیں مل سکتا۔ اگر تم نے یہ ٹکٹ حاصل کر بھی لیا تو خوشامد سازش اور اسی قسم کے دیگر قابل اعتراض طریقوں سے حاصل کر سکو گے۔ جناح نے یہ بھی کہا کہ شوکت کو وزارت کا منصب عطا کرنا جمہوریت کے اصولوں کی سخت توہین ہے۔

جناح نے ایک بڑی دلچسپ بات یہ بھی کہی کہ گورنر تو شوکت کے تقرر کا مسئلہ مسلم لیگ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے۔ لیکن وزیر اعلیٰ (ملک خضر حیات) اور اس کے دوستوں نے ایسا نہیں کرنے دیا۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ شوکت کے غبارے سے ہوا نکالنے کے لئے کہا گیا تھا۔ لیکن شوکت نے مجھے بتایا کہ وہ جناح کی اس تمام زجر و توبیخ کے جواب میں خاموش رہا۔ بہرحال شوکت پر جناح کی اس ملاقات کا کچھ اچھا اثر نہیں پڑا۔

شوکت نے اپنے ضلع اٹک کی اس سیٹ سے کھڑا ہونے کا فیصلہ کیا ہے، جو اس کے

ایک قریبی عزیز نواب مظفر خاں نے خالی کی ہے۔ کیونکہ نواب مظفر خاں حال ہی میں پنجاب پبلک سروس کمیشن کے ممبر مقرر ہوئے ہیں۔

شوکت نے سکندر۔ جناح۔ ۱؎ پیکٹ کی شرائط کے مطابق، پارلیمنٹری بورڈ کو درخواست دی ہے۔ میں نے پہلے بھی اپنے ایک خط میں عرض کیا تھا کہ سکندر۔ جناح پیکٹ ایک ایسا میثاق ہے جس کے الفاظ سخت الجھے ہوئے ہیں۔ میں اس پیکٹ کا مطالعہ کرتا ہوں تو مجھے گوناں کوفت ہوتی ہے"۔

آپ کا مخلص

برٹرنڈ گلینسی

بالآخر سردار شوکت حیات کو پنجاب اسمبلی کی ممبری کے لئے، مسلم لیگ کا ٹکٹ مل گیا، اور وہ سکندر۔ جناح پیکٹ کی پابندی کا عہد کرتے ہوئے، اسمبلی کے ممبر بن گئے۔ لیکن ممبر بننے کے بعد، انہوں نے یکے بعد دیگرے دونوں تقریروں میں اعلان کیا کہ ان کی کامیابی سراسر ان کے خاندانی رسوخ اور وقار کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اور اس کامیابی میں مسلم لیگ کا قطعاً کوئی حصہ نہیں۔ اس پر ملک خضر حیات نے اعلان کیا کہ شوکت حیات کا یہ دعویٰ بالکل غلط ہے۔ ان کو یہ کامیابی کلیتہً" مسلم لیگ کی اعانت سے

---

۱؎ جو لوگ سکندر۔ جناح پیکٹ کے وجود سے انکار کرتے ہیں۔ وہ بتائیں کہ "شوکت پنجاب" نے ۱۹۴۲ء کے ضمنی انتخاب میں اس پیکٹ کے مطابق پارلیمنٹری بورڈ کو کیوں درخواست دی تھی۔ اس پیکٹ کے وجود سے انکار کرنے والوں میں سب سے آگے وہ شخص ہے جو سکندر کی وزارت کے زمانے میں، حکومت پنجاب کے تنخواہ دار جاسوس، مخبر اور "انفارمر" کی حیثیت سے پہلے علامہ اقبال کے مکان پر مقیم رہا۔ وہاں سے نکل گیا تو ملک برکت علی کے مکان پر چلا گیا۔ چنانچہ ملک صاحب کے بہت سے اہم کاغذات اس شخص نے چرا لئے۔ قائداعظم کے خطوط کا بھرا ہوا بکس بھی اس نے چرا لیا۔ بالآخر ملک صاحب نے بھی اسے نکال دیا تو حد یہ ہے کہ سامنے ٹمپل روڈ پر غلام رسول خاں صاحب کے مکان پر چلا گیا۔ دھندا یہاں بھی اس نے جاسوسی اور مخبری کا رکھا۔ جب سر سکندر نے دیکھ لیا کہ جتنا کام اس شخص سے لینا تھا وہ لے لیا ہے۔ اور اب کا کوئی مصرف باقی نہیں رہا، تو اسے روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ میں رپورٹر کی اسامی دلوا دی۔ اور یوں قوم کو اس شخص کی جاسوسی اور مخبری سے نجات ملی۔

ہوئی ہے۔ چنانچہ خضر حیات کے کہنے سے سردار شوکت حیات نے ۱۱۔ جون ۱۹۴۳ء کو ذیل کا بیان، لاہور کے مشہور انگیرزی اخبار ٹربیون میں شائع کیا۔

"میں نے روزنامہ ٹربیون کا وہ نوٹ پڑھا ہے، جو ۹۔ جون کو شائع ہوا ہے۔ اور جس میں میرے الیکشن کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس نوٹ میں سراسر خلاف حقیقت واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ سب نے یہ الیکشن مسلم لیگ کے ٹکٹ اور سکندر۔ جناح پیکٹ کے تحت لڑا ہے۔[۱] اور میری موجودہ کامیابی سراسر مسلم لیگ کی مرہون منت ہے۔ میں پنجاب اسمبلی کے اس پروگرام کی پابندی کا عہد کرتا ہوں۔ جو مسلم لیگ پارٹی اس وقت چلا رہی ہے۔[۱]۔ میرا فرض ہے کہ میں ان تمام احباب اور اخبارات کا شکریہ ادا کروں، جنھوں نے اس الیکشن میں میری مدد کی ہے۔ بالخصوص پنجاب کا وزیر اعظم اور دیگر شرکائے کار کا بے حد ممنون ہوں"[۲]۔

چار ہفتے بعد، سردار شوکت حیات نے پھر ایک پبلک جلسے میں، اسی قسم کی قابل اعتراض تقریر کی کہ ان کی کامیابی کی وجہ صرف ان کا خاندانی رسوخ اور وقار ہے۔ خضر حیات نے پھر انہیں ڈانٹا تو انھوں نے دوبارہ ۳۰۔ جون ۱۹۴۳ء کو ذیل کا اخباری بیان شائع کیا:

"میں نے حال ہی میں دورہ کرتے وقت، مختلف مقامات پر جو تقریریں بھی کی ہیں۔ ان کی غلط رپوٹ اخباروں میں شائع ہوئی ہے۔ میں اپنے تمام نکتہ چینوں اور معترضوں پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنی ہر تقریر میں یہ کہا تھا کہ میں ہر صورت میں سکندر، جناح پیکٹ کی پابندی کروں گا۔ اور اس بیان کی بھی پابندی

---

۱۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سردار شوکت حیات جب پنجاب اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تھے تو پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی موجود تھی۔ اپنا اور کام بھی کر رہی تھی تو ان پر یہ حقیقت کب منکشف ہوئی کہ پنجاب اسمبلی میں کوئی مسلم لیگ پارٹی نہیں ہے۔

۲۔ انڈین اینوئل رجسٹر ۱۹۴۳ء

کروں گا، جو وزیر اعظم ملک خضر حیات ٹوانہ نے ۷۔ مارچ ۱۹۴۳ء کو
دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں کیا تھا۔ مجھ سے
صرف یہ فروگذاشت ہوئی کہ میں اپنی تقریر میں اس پس منظر کا ذکر
کرنا بھول گیا تھا، جس کے تحت سکندر۔ جناح پیکٹ وجود میں آیا تھا۔
میں یہ صمیم قلب سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں بدستور اس پالیسی کی
پیروی کرتا رہوں گا۔ جس کی پیروی میرے والد مرحوم کرتے
تھے۔ اور جس کی پیروری موجودہ وزیر اعظم ملک خضر حیات ٹوانہ
کرتے ہیں ۱۔"

گورنر پنجاب، سر برٹرنڈ گلینسی نے ۲۱۔ جولائی ۱۹۴۳ء کو ذیل کا خط وائسرائے کو لکھا

شملہ۔ ۲۱۔ جولائی ۱۹۴۳

"ڈیئر لارڈ لنلتھگو۔ شوکت کی موجودہ پوزیشن کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ پنجاب کا ایک سابق وزیر اعظم سر سکندر کا بیٹا ہے۔ سوء اتفاق کہہ لیجئے یا کچھ اور جب پبلک ورکس کی وزارت خالی ہوئی تو کوئی اچھا قابل امیدوار میدان میں نہیں تھا۔ سر سکندر کے انتقال کے بعد جب خضر حیات وزیر اعظم بنا تو ہم نے یہی سوچا کہ شوکت کو وزیر بنا دیا جائے۔ کیونکہ سکندر کا فرزند ہونے کے باعث، یونینسٹ پارٹی کی حیثیت بدستور مضبوط رہے گی۔ لیکن افسوس ہے کہ شوکت نے اب تک اپنی کارکردگی کا کوئی اچھا ثبوت نہیں دیا۔ وہ بے وقوف ہے۔ مغرور بھی ہے۔ اور سب سے بُری عادت اس کی یہ ہے کہ بات بات پر جھوٹ بولتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اس کی عمر صرف اٹھائیس سال ہے۔ اور اسے وزیر بنے ہوئے چند مہینے ہوئے ہیں۔ لیکن امید نہیں کہ وہ کبھی کامیاب ثابت ہو گا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کے موجودہ طور طریقوں کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ مقبول محمود کا بھانجا بھی ہے۔ اور داماد بھی۔ مقبول محمود ایک سیانا بازی گر ہے۔ اور شمالی ہند میں شاید ہی کسی شخص کو اس پر

---

۱۔ انڈین اینوئل رجسٹر ۱۹۴۳ء

اعتبار ہو"۔

آپ کا مخلص
برٹرنڈ گلینسی

۱۲۔جولائی ۱۹۴۳ء کو وائسرائے لارڈ لنلتھگو نے ذیل کا خط گورنر پنجاب سر برٹرنڈ گلینسی کو لکھا:

وائسرائے ہاؤس۔ نئی دہلی
۱۲۔جولائی

مائی ڈیئر گلینسی - چند روز ہوئے، میجر شوکت حیات کا ایک خط مجھے موصول ہوا تھا۔ جس میں انہوں نے مجھ سے ایک انٹرویو کی درخواست کی تھی۔ چنانچہ آج صبح سب نے ان سے ملاقات کی۔ معلوم ہوا کہ وہ دو امور کا مجھ سے ذکر کرنا چاہتے تھے۔ پہلا امر تو یہ ہے کہ وہ اپنے والد مرحوم، سر سکندر کی یاد میں ایک آل انڈیا میموریل قائم کرنے کے خواہش مند ہیں۔ جس کے لئے ان کی سکیم یہ ہے کہ نصف کروڑ روپیہ جمع کیا جائے گا۔ دوسرا امر بڑا عجیب و غریب ہے۔ شوکت کا ایک بہنوئی، عبدالسلیم خان ہے، جو پنجاب میں ای۔ اے۔ سی ہے۔ اور آج کل لاہور ہی میں، سول سپلائی کے محکمے میں، کسی قسم کی سپیشل ڈیوٹی پر کام کر رہا ہے۔ شوکت نے کہا کہ میں اس عبدالسلیم خاں کا تبادلہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں کرا دوں۔

جہاں تک پہلی تجویز یعنی نصف کروڑ جمع کرنے کا تعلق ہے۔ شوکت نے مجھے بتایا ہے کہ وہ آپ سے اس کا ذکر کر چکا ہے۔ اور آپ ہی کے مشورے سے مجھ سے ملنے آیا ہے۔

۲۔ اب میں شوکت کی ان دونوں درخواستوں پر قدرے تفصیل سے اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں۔ شوکت نے چند ہفتے ہوئے لیتھ ویٹ سے بھی سرسری طور پر نصف کروڑ روپے جمع کرنے کی تجویز کا ذکر کیا تھا۔ مجھے حیرت اس بات پر ہوئی کہ آپ نے اس بارے میں مجھے قبل ازیں کوئی اطلاع نہیں دی۔

مجھے کسی صوبائی وزیر سے ملنے میں کوئی عار نہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ وزیر پہلے اپنے صوبے کے گورنر کی اجازت سے مجھ سے ملاقات کرنے آئے۔ موجودہ طرز عمل خصوصیات سے قابل اعتراض ہے۔ شوکت نے انٹرویو سے قبل مجھے قطعاً نہیں بتایا تھا کہ وہ کس موضوع پر مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ اصولاً اسے ایسا کرنا چاہئے تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ عام سیاسی حالات کے بارے میں کچھ معروضات پیش کرنا چاہتا ہے۔ جب تک مجھے ملاقات کا پس منظر معلوم نہ ہو۔ میں بے خبری کا شکار ہو جاؤں گا۔ اب میں شوکت کے پیش کردہ دونوں امور پر کسی قدر تفصیل سے بحث کرنا چاہتا ہوں۔

تعجب ہے کہ ایک صوبائی وزیر نے کس طرح اتنی جرأت کی کہ مجھ سے آکر کہے کہ عبدالسلیم کا تبادلہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں کرا دوں۔ یہ تو ایک قسم کی محکمانہ کارروائی ہے، جس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اگر شوکت اپنے بہنوئی کا تبادلہ کرانا چاہتا ہے تو اسے صوبائی سطح پر متعلقہ حکام سے مل کر کوشش کرنی چاہئے تھی۔ آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں نے آج تک کبھی کسی محکمے میں کسی شخص کی سفارش نہیں کی۔ یہ کام صرف ان لوگوں کا ہے جو اپنے اپنے محکمے کے نظم و نسق کے انچارج ہیں شوکت قطعی ناتجربہ کار شخص ہے۔ اور اس کی اس حرکت کی وجہ بھی سراسر یہی ناتجربہ کاری ہے۔ اگر شوکت آئندہ کسی موقع پر آپ سے اس کام کا ذکر کرے تو آپ اسے سمجھا دیجئے گا کہ موزوں طریق کار کیا ہے۔

۴۔ جہاں تک شوکت کی پہلی تجویز یعنی پچاس لاکھ روپے جمع کرنے کا تعلق ہے۔ مہربانی کر کے مجھے اس بارے میں اپنی رائے سے مطلع کیجئے گا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ میں ذاتی طور پر ایسی تجویز کو قطعاً پسند نہیں کرتا کہ روپیہ جمع کرنے کی کسی سکیم کا نگران بنوں یا ایسی سکیم کو اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے پروان چڑھاؤں۔ ہاں، یہ تو ہو سکتا ہے اگر مطلوبہ رقم کی اچھی خاصی مقدار جمع ہو چکی ہے تو میں بھی سراسر اپنی ذاتی حیثیت سے کچھ روپیہ اس میں دے دوں۔ اور وہ بھی صرف اسی نقطہ نگاہ سے کہ جس شخص کی یاد میں یہ میموریل قائم کیا جا رہا ہے، اس سے میرے دوستانہ مراسم تھے۔

شوکت نے واضح طور پر یہ بھی نہیں بتایا کہ یہ روپیہ کس کی تحویل میں رہے گا۔ حساب کتاب کون رکھے گا۔ شرائط کیا ہوں گی۔ اور خرچ کس طرح ہو گا۔ اس نے صرف اتنا بتایا

تھا کہ اگر پچاس لاکھ کی مطلوبہ رقم جمع ہو گئی تو اسے رفاہ عامہ کے کاموں پر صرف کیا جائے گیا۔ معلوم نہیں رفاہ عامہ سے اس کی کیا مراد ہے۔ میرے لئے یہ قطعاً ممکن نہیں کہ بحیثیت گورنر جنرل کے میں کسی قسم کا فنڈ اکٹھا کرنے کی کسی نوع کی سکیم کی سرپرستی کروں۔ اور وہ بھی ایسے شخص کے لئے کہ جس کی یاد میں میموریل تعمیر کیا جارہا ہے، وہ ایک سیاسی لیڈر تھا۔ میں نے میجر شوکت سے یہ بھی کہا تھا کہ اگر ایک مرتبہ میں نے اس قسم کے کاموں کی سرپرستی قبول کرنے کی ہامی بھرلی تو پھر یہ سلسلہ ایسا چل نکلے گا کہ آئندہ میرے لئے انکار کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ جہاں تک اصول کا تعلق ہے، میں تو یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ کسی صوبے کے گورنر کو اس قسم کے کاموں کی سرپرستی کے لئے کہا جائے۔

بہرحال، میں منتظر ہوں کہ آپ ان امور کے بارے میں اپنی رائے لکھ کر مجھے بھیجیں۔ آپ کا خط ملنے اور آپ کے خیالات سے آگاہ ہونے کے بعد میں میجر شوکت حیات خاں کو جواب دوں گا۔ مجھے اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ شوکت ابھی ناتجربہ کار نوجوان ہے۔ اور اسی احساس کے پیش نظر میں اسے کسی قسم کا نامناسب یا تلخ جواب دینا پسند نہیں کرتا۔ سکندر کے بارے میں رائے ہے کہ اگرچہ اکثر موقعوں پر ان کا رویّہ ہمارے حسب خواہش نہیں ہوتا تھا۔ تاہم ذاتی طور پر میں انہیں پسند کرتا تھا۔ اور وہ اپنے صوبے اور ہندوستان کے یقیناً بہی خواہ تھے۔

آپ اطمینان رکھیے رئیس شوکت کو جو جواب دوں گا، اس کے الفاظ بڑے نرم اور لہجہ بڑا ملائم ہوگا۔ شوکت کو چونکہ اس قسم کے کاموں کا ابھی تجربہ نہیں۔ اسی لئے اس سے یہ بھول ہو گئی ہے۔

آپ کا مخلص

لنلتھگو

اس خط کا جواب ہربرٹ گلینسی نے ۱۶ جولائی ۱۹۴۳ء کو دیا:

ڈیئر لارڈ لنلتھگو۔ آپ نے اپنے گرامی نامہ محررہ ۱۲ جولائی میں لکھا ہے کہ چند روز ہوئے، آپ نے شوکت کو انٹرویو دیا تھا۔ اس سلسلے میں شوکت سے جو حرکت سرزد ہوئی

ہے۔ اس کے لئے میں صمیم قلب سے معذرت خواہ ہوں۔ شوکت کو ہرگز زیبا نہیں تھا کہ وہ اس طرح آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کے تکدر طبع کا باعث بنتا۔ یقیناً جس انداز سے اس نے آل انڈیا سکندر میموریل کا ذکر آپ سے کیا ہے، اور وہ بھی ایسی حالت میں جب کہ مجوزہ میموریل کی ابتداء تک بھی ہنوز نہیں ہوئی۔ قابل درگزر نہیں۔ ایک طرف یہ کہ اس نے اپنے بہنوئی عبدالسلیم خاں کا تبادلہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں کرانے کی بابت جو کچھ آپ سے عرض کیا اسے پڑھ کر تو میرا سر شرم و ندامت سے جھک گیا ہے۔ دروغ گوئی کی انتہا یہ ہے کہ اس نے آپ سے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ راقم سے ان امور کے بارے میں مشورہ کر کے اور راقم کی اجازت سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہے۔ حاشا و کلّا نہ مجھے اور نہ پنجاب کے وزیر اعظم (ملک خضر حیات) کو شوکت کی اس حرکت کا پہلے سے کوئی علم تھا۔ ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس نے آپ سے انٹرویو کی درخواست کی ہے۔ مجھے افسوس کے ساتھ عرض کرنا ہے کہ شوکت میں روز بروز جھوٹ بولنے کی عادت بڑھتی جا رہی ہے۔ اپنے روزمرہ کاموں میں وہ جس بے احتیاطی کا ثبوت دے رہا ہے، اس سے ہمیں اکثر سخت تکلیف ہوتی ہے۔ وہ ابھی شملہ آیا ہے اور میں پہلا کام یہ کروں گا کہ اس کے اچھی طرح کان کھینچوں گا۔

اس بارے میں مجھے جناب سے پورا اتفاق ہے کہ سکندر میموریل کی موجودہ تجویز کی وائسرائے کو، بصورت حال، قطعاً سرپرستی نہیں کرنی چاہئے۔ نہ مجھے اور نہ وزیر اعظم (ملک خضر حیات) کو اس تجویز کے مالہ و ماعلیہ کا کوئی علم ہے۔ رہا شوکت کے بہنوئی عبدالسلیم خاں کا معاملہ، میں نے اس بارے میں دریافت کیا تو صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ عبدالسلیم خاں شمال مغربی صوبہ سرحد میں ای۔ اے۔ سی ہے۔ یہ کس قدر بے ہودگی ہے کہ شوکت نے جناب سے اس معاملہ کا ذکر اس پیرائے میں کیا ہے۔

آپ کا مخلص

برٹرنڈ گلینسی

وائسرائے لارڈ لنلتھگو نے ۲۰ جولائی ۱۹۴۳ء کو ذیل کا جواب گورنر پنجاب کا بھیجا۔

مائی ڈیئر گلینسی۔ آپ کے خط محررہ ۱۶۔ جولائی کا شکریہ۔ آپ نے شوکت کی

عادتوں کا جو حال بیان کیا ہے، مجھے پڑھ کر افسوس ہوا۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ تمام معاملے پر غور کرنے کے بعد میں نے یہی فیصلہ کیا ہے کو شوکت کو تحریری جواب نہیں دوں گا۔ جو دو تجویزیں اس نے انٹرویو کے دوران میں پیش کی تھیں، میں فی الحال ان میں سے کسی پر کچھ نہیں کرنا چاہتا۔ آپ شوکت سے کہہ دیجئے کہ اگر آئندہ اس نے کبھی سکندر میموریل کے بارے میں کوئی عرض داشت پیش کی تو آپ کے توسل سے پیش کرنی ہوگی۔

آپ کا مخلص

لنلتھگو

۲۳ جولائی ۱۹۴۳ء کو گ۔ ر پنجاب نے ذیل کا خط وائسرائے کو لکھا:

ڈیئر لارڈ گلینسی ۔ آپ کے ۲۰۔ جولائی کے خط کا شکریہ۔ جس میں آپ نے شوکت کے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔ میں نے اور وزیر اعظم (ملک خضر حیات) نے شوکت کو سخت تنبیہ کی ہے کہ اس نے کیوں آپ سے اس قسم کی لغو گفتگو کی۔ اس نے جواب دیا ہے کہ اس نے (شوکت نے) خود مجھ سے (راقم سے) ذکر کیا تھا کہ وہ وائسرائے سے انٹرویو کی درخواست کرنے والا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ مجھ سے اس نے قطعاً کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ شوکت یہ بھی کہتا ہے کہ سکندر میموریل کی تجویز کے متعلق آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس نے تو صرف یہ کہا تھا کہ آپ اپنی پرائیویٹ حیثیت سے اس فنڈ میں کچھ رقم عنائیت فرمائیں۔ اس کی ان باتوں سے صاف عیاں ہے کہ وہ غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔ شوکت کے متعلق، خضر حیات نے یہ دلچسپ بات بیان کی ہے کہ شوکت کو سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ ہر شخص کو، جس سے وہ بات کرتا ہے، غلط فہمی ہوتی ہے۔

سکندر میموریل کے متعلق میں نے اس سے تفصیل پوچھی تھی تو وہ یہ بھی نہیں بتا سکا کہ کل کتنی رقم جمع کی جائے گی۔ ایک کروڑ پچاس لاکھ؟ رہا یہ سوال کہ یہ روپیہ خرچ کیونکر کیا جائے گا۔ شوکت اس بارے میں کہتا ہے کہ اس رقم سے جو سود بنک سے ملے گا۔ اس سے معذور فوجیوں اور ان کے اہل و عیال کی مدد کی جائے گی۔ میری رائے میں جب تک یہ حتمی طور پر معلوم نہ ہو جائے کہ اس روپے کا نظم و نسق کس کے پاس ہوگا۔ کس کس مد پر صرف ہوگا۔ اور کس کس کے مشورے سے خرچ ہوگا، جناب کو اس سکیم کی سرپرستی قبول نہیں

کرنی چاہیئے۔

جہاں تک دوسرے امر کا تعلق ہے، یعنی شوکت کے بہنوئی عبدالسلیم خاں کا تبادلہ پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ میں کرادیا جائے۔ میں نے اس سے استفسار کیا تو اس نے جواب دیا کہ اس کے والد مرحوم سر سکندر نے ایک مرتبہ آپ سے اس بات کا ذکر کیا تھا۔ مجھے قطعاً یاد نہیں کہ سکندر نے کبھی آپ سے اس بات کا ذکر کیا ہوگا۔ میں نے شوکت کو سخت ڈانٹ ڈپٹ کی ہے کہ اس نے اپنے انٹرویو میں کیوں جناب سے ایسی بے سروپا باتیں کیں۔ میری رائے میں آپ اسے ہرگز کوئی جواب نہ دیں۔

آپ کا مخلص

برٹرنڈ گلینسی

لارڈ لنلتھگو نے ۲۶ جولائی ۱۹۴۳ء کو ذیل کا خط گورنر پنجاب کو لکھا:

مائی ڈیئر گلینسی ۔ آپ کے خط محررہ ۲۳۔ جولائی ۱۹۴۳ء کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے شوکت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھ کر افسوس ہوا۔ اس تمام کارروائی میں شوکت کا رویّہ ہر لحاظ سے قابل اعتراض ثابت ہوا ہے۔ مجھے اس بارے میں آپ سے پوری ہمدردی ہے۔ شوکت نے قطعی اور یقینی طور پر مجھ سے سکندر میموریل کا ذکر کیا تھا۔ اور یہ درخواست بھی کی تھی کہ میں اپنے نام سے چندے کی اپیل شائع کروں۔ جب میں نے انکار کیا تو اس نے دوسری تجویز پیش کی کہ میں اپنی طرف سے کچھ رقم اس فنڈ میں دوں۔ اس موضوع پر میری آپ سے جو خط و کتابت ہوئی ہے' اس روشنی میں میں نے قطعی فیصلہ کیا ہے کہ شوکت کی ان دونوں درخواستوں کا جواب نہیں دوں گا۔ مجھے افسوس ہے کہ ان باتوں میں آپ کو اتنی کوفت برداشت کرنا پڑی۔

آپ کا مخلص

لنلتھگو

۶اگست ۱۹۴۳ء کو سر برٹرنڈ گلینسی گورنر پنجاب نے ذیل کا خط وائسرائے لارڈ لنلتھگو کو لکھا:

شملہ ۶اگست ۱۹۴۳ء۔ ڈیئر لارڈ لنلتھگو۔ آپ کیپٹن شوکت حیات کی مسلسل غلط

بیانیوں اور بے راہ روی سے بخوبی آگاہ ہو چکے ہیں۔ لیکن اب تو ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔ اس کی حرکتوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ اسے اپنے لیڈر سے کسی قسم کی خیر خواہی یا وفاداری نہیں۔ وہ ہنوز فیصلہ بھی نہیں کر سکا کہ اسے ایک شرمسار گناہ گار کے زمرے سے شمار کیا جائے یا ایک شکست خوردہ معصوم کی حیثیت دی جائے[1]۔ ایک شکست خوردہ معصوم کا درجہ تو اسے قطعاً نہیں دیا جا سکتا۔

آپ کا مخلص
ہربرٹ ڈ گلینسی

سردار شوکت حیات کو وزارت کی گدی پر بیٹھے ہوئے ابھی مشکل سے ڈیڑھ سال ہوا تھا کہ اس قسم کے افسوس ناک حالات پیدا ہو گئے۔ بالآخر پنجاب کے دیگر وزراء نے جن میں چوہدری چھوٹو رام۔ سر منوہر لال۔ میاں عبدالحئ۔ اور سردار بلدیو سنگھ شامل تھے، شوکت حیات کے ساتھ کام کرنے سے انکار کر دیا۔ گورنر گلینسی نے سردار شوکت حیات سے کہا کہ بہتر ہے کہ آپ مستعفی ہو جائیں۔ لیکن انہوں نے استعفاء دینے سے انکار کر دیا۔ ناچار گورنر نے انہیں برخاست کر دیا۔

---

He has not entirely made up his mind wheter to prove as the Repetent Sinner or the Injured innocent in the latter role he is sadly unconvincing

چوتھا باب

# ملک خضر حیات ٹوانہ اور مسلم لیگ

۷۔ مارچ ۱۹۴۳ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس دہلی میں ہوا۔ جہاں مولانا عبدالحامد بدایونی نے ایک قرار داد پیش کی کہ پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی میں جلد از جلد مسلم لیگ پارٹی قائم ہونی چاہئے۔ جواب میں پنجاب کے وزیر اعظم، ملک خضر حیات ٹوانہ نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "جہاں تک پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کا تعلق ہے۔ وہاں سکندر۔ جناح پیکٹ کی جملہ شرائط کے تحت مسلم لیگ پارٹی پہلے سے موجود ہے۔ اس لئے یہ نئی قرار داد یہاں پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ رہا یہ سوال کہ کیا یہ پارٹی بخوبی اور اچھی طرح کام کر رہی ہے یا نہیں۔ میں فی الحال اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ لیکن میں آپ حضرات کو یقین دلاتا ہوں کہ میں پوری تن دہی سے مسلم لیگ پارٹی میں نئی روح پھونکنے اور اسے مزید مستحکم کرنے کی کوشش کروں گا تاکہ وہ آل انڈیا مسلم لیگ جیسی عظیم جماعت کی صحیح نمائندگی کر سکے۔ اور اپنی اس حیثیت سے مسلمانان پنجاب کی خدمت بھی کر سکے۔ آپ کو مجھ پر اور میرے رفقاء کار پر پورا بھروسہ رکھنا چاہئے۔ کہ ہم ہمیشہ آل انڈیا مسلم لیگ کے وفادار خادم رہیں گے۔ اور اس کے مجوزہ پروگرام سے ذرہ بھر انحراف نہیں کریں گے۔

" سر سکندر نے ۷ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ کے موقع پر یہ طے کیا تھا کہ وہ واپس پنجاب جا کر یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبروں کا جلسہ کریں گے۔ اور انہیں مسلم لیگ کی ممبر شپ بھی قبول کرنے کا مشورہ دیں گے۔ اس طرح جو مسلم لیگ پارٹی وجود میں آئے گی وہ مسلم لیگ کے صوبائی اور مرکزی پارلیمنٹری بورڈوں کے تابع ہوگی۔ لیکن اس کولیشن کا نام بدستور یونینسٹ پارٹی ہوگا۔

"باقی رہا یہ معاملہ کہ سر سکندر کے ناگہانی انتقال کے بعد گورنر پنجاب نے مجھے وزارتِ اعلیٰ کا منصب کیوں پیش کیا۔ گذارش یہ ہے کہ میں نے یہ منصب قبول کرنے سے پہلے پنجاب اسمبلی کے مسلمان ممبروں سے مشورہ کیا تھا کہ مجھے گورنر کی دعوت کے جواب میں کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے۔ چنانچہ اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی نے جنوری ۱۹۴۳ء کے پہلے ہفتے میں مجھ پر مکمل اعتماد کا اظہار کر کے مجھے یہ مشورہ دیا کہ میں گورنر کی دعوت کو قبول کرلوں۔ اسی بناء پر میں نے گورنر کی دعوت قبول کی۔ میں نے مسلم لیگ پارٹی کے جملہ ارکان سے عرض کیا تھا کہ اگر وہ چاہیں تو کسی اور کو اپنا لیڈر منتخب کرلیں۔ میں پوری وفاداری اور نیازمندی سے اس کی پیروی کروں گا۔ پارٹی نے متفقہ طور پر مجھے اپنا لیڈر انتخاب کر لیا۔ بعدازاں اسی فیصلے کی تائید اور تصدیق یونینسٹ پارٹی اور کولیشن وزارت نے بھی کی۔ اب بتائیے اس میں کون سی چیز ہے جو ضابطے کے خلاف ہے۔

"اس وقت میرے پاس Instrument of Instruction کی جلد ہے۔ جس میں درج ہے کہ گورنر کو اپنے وزراء منتخب کرنے کا کیا اختیار ہے۔ انہی اختیارات کے تحت اور اسی آئین اور ضابطے کے مطابق مجھے وزیر اعلیٰ نامزد کیا گیا تھا۔ پھر پنجاب اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی نے بلا انتشار اس فیصلے کی تصدیق اور تائید کی۔

"اب آئیے اس طرف کہ میں نے پنجاب کیبنٹ کے چھٹے وزیر کا انتخاب کیوں کر کیا۔ میں نے اس ضمن میں غیر رسمی طور پر پنجاب اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کے تمام ممبروں سے مشورہ کیا۔ بہت بڑی اکثریت کی رائے تھی کہ سردار شوکت حیات کو وزیر بنا دیا جائے۔ چنانچہ میں نے سردار شوکت حیات سے کہا کہ وہ مسلم لیگ پارٹی میں شامل ہو جائیں۔ اور جب انہوں نے مسلم لیگ کی ممبر شپ قبول کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا تو میں نے گورنر کو مشورہ دیا کہ وہ سردار شوکت حیات کو وزیر نامزد کریں۔"

## قائد اعظم کی تصریحات

مسٹر جناح نے ملک خضر حیات کی اس تقریر کے بعد فرمایا "آپ نے ملک خضر حیات کی تقریر سن لی ہے۔ مولانا عبدالحامد بدایونی نے جو ریزولیشن پیش کیا ہے، اس کا مقصد یہ ہے

کہ پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی قائم کی جائے۔ ملک خضر حیات نے کہا ہے کہ پنجاب اسمبلی میں پہلے سے مسلم لیگ پارٹی موجود ہے۔ رہا یہ امر کہ وہ پارٹی پوری طرح کام کر رہی ہے یا نہیں۔ ملک خضر حیات نے ہمیں یقین دلایا ہے کہ وہ اس پارٹی کو پہلے سے زیادہ فعال اور مضبوط بنائیں گے تاکہ وہ مسلمانان پنجاب کی نمائندہ جماعت یعنی مسلم لیگ کی صحیح ترجمانی کر سکے۔"

"سکندر۔ جناح پیکٹ کا مقصد اور غرض و غایت یہ تھی کہ یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ممبر ایک علیحدہ جماعت کی حیثیت سے کام کریں۔ یوں کہنا چاہئے کہ آئینی طور پر تو مسلم لیگ پارٹی کا وجود، پنجاب اسمبلی میں پہلے سے موجود ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ پارٹی اچھی طرح کام کر رہی ہے یا نہیں۔"

قائداعظم کی ان تصریحات کے بعد مولانا عبدالحامد بدایوانی نے اپنا ریزولیوشن واپس لے لیا۔

جب ملک خضر حیات آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس سے فارغ ہو کر واپس لاہور آئے تو ان کے غیر مسلم ساتھیوں نے ان کی تقریر پر اعتراض کیا کہ انہوں نے مسٹر جناح کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں۔ لیکن خضر حیات نے اپنے رویئے کو حق بجانب ثابت کرتے ہوئے جواب میں کہا کہ "پنجاب اسمبلی کے مسلمان ممبروں کا مسلم لیگ پارٹی کی حیثیت سے قائم رہنا ضروری ہے کیونکہ میرے پیش رو وزیر اعظم سر سکندر اس قسم کا وعدہ کر چکے ہیں۔"

ملک برکت علی، پنجاب اسمبلی میں واحد مسلم لیگی ممبر تھے جو اب تک اپوزیشن کی بنچوں پر بیٹھتے تھے۔ ملک خضر حیات کی تقریر کے بعد انہوں نے اعلان کیا کہ اب وہ مسلم لیگ پارٹی کی سیٹ پر بیٹھیں گے۔ پنجاب اسمبلی کے ایک ممبر چوہدری سمیر سنگھ نے ان سے

---

ا۔ اس قسم کی قرار داد کہ "ہم کسی قسم کا فیڈریشن قبول نہیں کریں گے"۔ محض زیب داستان کے طور پر ہر سال منظور کی جاتی تھی۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے بخوشی ۱۹۳۶ء میں فیڈریشن قبول کر لیا تھا۔ اس فیڈریشن کو مسلم لیگ نے ناکام نہیں بنایا تھا بلکہ اس کو پاش پاش جواہرلال نہرو نے اور آسام کے وزیر اعظم گوپی ناتھ باردولائی نے کیا تھا۔

سوال کیا کہ آپ اب تک اپوزیشن کی بینچوں پر کیوں بیٹھتے رہے ہیں۔ ملک صاحب نے جواب دیا کہ چونکہ پنجاب اسمبلی میں کوئی مسلم لیگ پارٹی موجود نہیں تھی۔ اس لئے میں اپوزیشن کی بینچوں پر بیٹھتا تھا۔ اب مسلم لیگ پارٹی قائم ہو رہی ہے۔ اس لئے میں اپنی سیٹ تبدیل کروں گا۔ [۱]"

آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کی جس کارروائی کی مصدقہ رپورٹ اوپر نقل کی گئی ہے۔ اس کا اجلاس ۷ مارچ ۱۹۴۳ء کو دہلی میں ہوا تھا۔ دو ہفتے بعد ۲۴۔ مارچ ۱۹۴۲ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس بھی دہلی میں ہوا۔ جہاں حسب معمول سب سے اہم قرار داد یہ منظور کی گئی تھی کہ ہندوستان کے مسلمان کسی قسم کا فیڈریشن منظور نہیں کریں گے۔ [۲]

سر سکندر کے انتقال کے بعد ملک خضر حیات ٹوانہ نے پہلی بار پنجاب کے وزیر اعظم کی حیثیت سے اس اجلاس میں شرکت کی تھی۔ اس لئے حاضرین کا اصرار تھا کہ پنجاب کا وزیر اعظم بھی اس قرار داد کی تائید کرے ملک خضر حیات نے مختصری تقریر میں تائید کی۔ اجلاس میں بعض لوگوں نے سوال کیا کہ آپ کس طرح فیڈریشن کی مخالفت کریں گے۔ خضر حیات نے جواب دیا کہ جو فیصلہ مسلم لیگ کرے گی۔ پنجاب اس کی پابندی کرے گا۔ خضر حیات نے بھی یہ کہا کہ آپ حضرات کو یاد رکھنا چاہئے کہ قرار داد پاکستان لاہور ہی میں منظور کی گئی تھی [۳]

---

۱۔ انڈین اینوئل رجسٹر۔ ۱۹۴۳ء۔ جلد اول۔ صفحہ ۲۷۷

۲۔ انڈین اینوئل رجسٹر۔ ۱۹۴۳ء۔ جلد اول۔ صفحہ ۲۷۷

۳۔ مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ بمبئی کے روزنامہ "ٹائمز آف انڈیا" نے خضر حیات کی تقریر کی جو رپورٹ ۲۷ اپریل ۱۹۴۳ء کے پرچے میں درج کی تھی، اسے یہاں لفظ بہ لفظ نقل کرایا جائے۔

"The audience now demaded a speech from a Punjab spokesman Khizar Hyat Khan respended amidst cheers. He supported the resolution. When a voice asked whether he would make sacrifices the Premier retorted that it was at Lahore that the Pakis-

آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اور آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی روئداد مارچ ۱۹۴۳ء کے سرکاری ریکارڈ میں درج ہے۔ سال بھر کے بعد۔ اپریل ۱۹۴۴ء میں ملک خضر حیات کو مسلم لیگ سے نکال دیا گیا سوال یہ ہے کہ اس ایک سال کے عرصے میں کون سی قیامت آئی۔ کون سی افتاد آئی اور حالات میں کون سی تبدیلی آئی، جس کی خضر حیات کو یہ عبرت ناک سزا دی گئی۔

خضر حیات نے غیر مشتبہ الفاظ میں مسلم لیگ سے اپنی وفاداری کا اظہار کیا تھا۔

خضر حیات نے پنجاب اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی میں نئی روح پھونکنے اور اسے ایک زندہ اور فعال جماعت بنانے کا اعلان کیا تھا۔

خضر حیات نے وزارت اعلیٰ کا منصب قبول کرنے سے پہلے مسلم لیگ پارٹی سے باضابطہ مینڈیٹ لینے کا اعلان کیا تھا۔

خضر حیات نے سکندر۔ جناح پیکٹ کا پس منظر بیان کیا۔ اور قائداعظم نے اسے حق بجانب ٹھہرایا تھا۔

خضر حیات کی یہ تمام تقریریں، قائداعظم کی موجودگی میں ہوئیں۔ اور انہوں نے اس وقت خضر حیات کی ان تصریحات سے اختلاف نہیں کیا۔ اب یہ سوال بار بار ہمارے سامنے آتا ہے کہ سال بھر کے اندر، یعنی اپریل ۱۹۴۴ء میں کون سا حادثہ ایسا پیش آیا تھا جس کی بناء پر خضر حیات کو ذلیل و خوار کر کے مسلم لیگ سے نکال دیا گیا۔ اس سوال کا جواب دینے اور اس مسئلے پر روشنی ڈالنے کے لئے دو آدمیوں کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔ ایک عالی جناب میاں ممتاز محمد دولتانہ۔ دوسرے والد مرتبت سردار شوکت حیات۔ کیا یہ دونوں اصحاب اس مابہ النزاع مسئلے پر کچھ روشنی ڈال سکیں گے کہ خضر حیات کو کیوں آل انڈیا مسلم لیگ سے نکال دیا گیا تھا؟

---

tan resolution was passed. He spoke briefly and his was the only speech which did not indulge in heroics."

(The times of India, Bombay)

(27 April, 1943)

## پانچواں باب

### تم خیر خواہِ دولتِ برطانیہ رہو

ہم یہاں ایک بات کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ "ہماری قومی جدوجہد" کے اکثر پہلو، عجیب و غریب اور پر اسرار طریقے سے انگریز کے زیر سایہ پرورش پاتے تھے۔ قائداعظم یقیناً ان باتوں سے بے خبر تھے۔ لیکن ان کے بیشتر کارکن انگریزی حکومت کے اشاروں پر حرکت کرتے رہے۔ اسی چیز نے آگے چل کر ہمارے لئے بے شمار الجھنیں پیدا کر دی تھیں۔

خوش قسمتی کہئے یا بدقسمتی ہم ابتداء سے انگریز کو اپنا ہمدرد اور خیر خواہ سمجھتے آ رہے تھے۔ لیکن ہم اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کر یہ بھول گئے کہ اگر کل کو انگریز ہندو سے مل گیا تو ہمارا ٹھکانہ کہاں ہو گا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ۲۶، ۲۷ دسمبر ۱۹۳۸ء کو پٹنہ (صوبہ بہار) میں ہوا تھا. وہاں ایک سب کمیٹی بنائی گئی تھی کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تجویز کردہ فیڈریشن کے جواب میں ایک ایسا کانسٹی ٹیوشن وضع کیا جائے، جس سے ہندوستان کے مسلمانوں کے جملہ حقوق بہتر طریقہ سے محفوظ ہو سکیں۔ چار یا پانچ مختلف سکیمیں مختلف اصحاب نے اس سب کمیٹی کے سامنے پیش کی تھیں۔

ایک سکیم سر سکندر حیات خاں نے بنائی تھی، جس کا نام اس وقت زونل سکیم مشہور ہوا تھا۔ اس زونل سکیم کے بارے میں، پنجاب کے گورنر، سر ہنری کریک نے ذیل کا خط وائسرائے کو لکھا.

گورنمنٹ ہاؤس۔ لاہور

۲۰، مارچ ۱۹۳۹ء

ڈیئر لارڈ لنلتھگو ۔ آپ نے ۱۸، مارچ کو جو ذاتی خط بصیغہ راز مجھ کو لکھا تھا۔ اور جو مشورہ اس خط میں آپ نے مجھے دیا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں۔ آج سکندر سے گفتگو کی ہے۔ آپ نے لکھا تھا کہ وقت آگیا ہے کہ سکندر اپنی فیڈریشن کی سکیم کا اعلان کر دیں۔

سکندر، آپ کے اس پیغام کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ ابھی تک وہ سکیم اس طرح ضبط تحریر میں نہیں آئی کہ پبلک کے سامنے پیش کی جاسکے۔ اس کام کے لئے انہیں کم از کم ایک ہفتہ اور درکار ہوگا۔ آج کل اسمبلی کا اجلاس ہو رہا ہے، جو اپریل کے وسط میں ختم ہوگا۔ اس کے بعد انہیں فرصت ملے گی۔ تاہم انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ یہ سکیم شائع کرنے سے پہلے اس کا ایک نسخہ مجھے دیں گے۔ اور ایک نسخہ آپ کو بھیجیں گے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ اس بات کا پورا خیال رکھیں گے کہ یہ سکیم کب اور کس موقع پر اور کس طریقے سے شائع کی جائے۔

سکندر ۲۶، مارچ کو، مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے لئے میرٹھ جا رہے ہیں۔ اس اجلاس کے ایجنڈا میں سب سے اہم چیز سر عبداللہ ہارون کی وہ سکیم ہے جو انہوں نے فیڈریشن کے متعلق وضع کی ہے۔ سکندر کو امید ہے کہ یہ سکیم بے حد فرقہ پرستانہ ہے، جس کی ہندو سخت مخالفت کریں گے۔ اور غالباً والیان ریاست بھی ناراض ہو جائیں گے۔ سب نے سکندر سے کہا کہ اگر ورکنگ کمیٹی میں آپ نے ہارون سکیم کی شدت سے مخالفت کی تو بہت ممکن ہے کہ آپ سے وہاں یہ پوچھا جائے گا کہ کیا آپ کے پاس کوئی متبادل سکیم ہے۔ اگر ہے تو اس کی تفصیل بتائیے۔ تو پھر آپ کیا جواب دیں گے۔

سکندر نے کہا کہ اگر اس قسم کی صورت پیش آئی تو یقیناً یہ جواب دیں گے کہ ہاں میرے پاس ایک متبادل سکیم ہے۔ لیکن میں اس کی تفصیل نہیں بتاؤں گا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے کہیں ہارون سکیم پڑھی ہے یا اس کا ذکر سنا ہے۔

دوران گفتگو میں سکندر نے یہ بھی بتایا کہ حیدر آباد کے کسی مسلمان نے بھی فیڈریشن کی سکیم مرتب کی ہے۔[1] میں نے بھی اس سکیم کا ذکر کہیں اخباروں میں پڑھا ہے۔ لیکن اس سکیم کی رو سے آبادیوں کا تبادلہ ضروری قرار دیا گیا ہے۔ جو موجودہ حالات میں قطعی ناقابل عمل ہے۔

آپ کا مخلص

ایچ۔ ڈی کریک

اس اجلاس پٹنہ (۲۶، ۲۷ دسمبر ۱۹۳۸ء) کے موقع پر ایک اور سب کمیٹی بھی بنائی گئی تھی۔ جس کا نام تھا فارن سب کمیٹی۔ سر عبداللہ ہارون اس کے صدر اور پیر علی محمد راشدی سیکرٹری تھے۔ اس سب کمیٹی کے سپرد یہ کام کیا تھا کہ وہ بیرونی ممالک میں آل انڈیا مسلم لیگ کے پروگرام اور اغراض و مقاصد کا پروپیگنڈا کرے۔ لیکن حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ یہ ادارہ بھی بالآخر اپنی بقا کے لئے انگریز کی سرپرستی کا محتاج ہو کر رہ گیا۔ اقبال کا یہ شعر اس موقع پر یاد آرہا ہے۔

وائے نادانی کہ تو محتاج ساقی ہو گیا
مے بھی تو، مینا بھی تو، ساغر بھی تو، محفل بھی تو

اس اجمال کی تفصیل سمجھنے کے لئے ذیل کی مراسلت ملاحظہ فرمایئے:

گورنمنٹ ہاؤس۔ لاہور (پرائیویٹ اور پرسنل)

۲۸۔ نومبر ۱۹۳۹ء (ڈی۔ او نمبر ۱۹۷)

ڈیئر لارڈ لنلتھگو

آپ نے ۱۸ نومبر کو، جو پرائیویٹ اور پرسنل خط مجھ کو لکھا تھا، وہ مجھے مل گیا تھا۔ آپ کے اس خط میں اس مراسلت کا انگریزی ترجمہ بھی ملفوف تھا جو سر عبداللہ ہارون اور ایک ہندوستانی مسلمان، شیخ عبدالرحمٰن مقیم دمشق کے درمیان ہوتی رہی ہے۔ آپ کے اس مکتوب گرامی میں برطانوی قونصل کا وہ خط بھی شامل تھا، جو انہوں نے، ازراہ شکایت آپ کو تحریر

[1]۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف کی سکیم

کیا تھا۔

میں نے سکندر کو نہایت راز داری سے آپ کا پیغام پہنچا دیا تھا۔ سکندر نے آج ہی مجھے بتایا ہے کہ وہ سر عبداللہ ہارون سے اس وقت ملے تھے جب وہ ۲۶۔ نومبر کو کراچی جاتے ہوئے لاہور سے گزر رہے تھے۔ سکندر نے سر عبداللہ ہارون کو تاکید کی ہے کہ وہ مختلف اسلامی ممالک میں مسلم لیگ کے نمائندے مقرر کرنے سے پہلے حکومت ہند کے ہوم ڈیپارٹمنٹ سے اجازت حاصل کر لیا کریں۔ سر عبداللہ ہارون نے بخوشی یہ مشورہ قبول کر لیا ہے۔ اور وعدہ کیا ہے کہ آئندہ جب وہ مشرق قریب کے ملکوں میں مسلم لیگ کے نمائندے مقرر کریں گے تو پہلے حکومت ہند کی ہوم ڈیپارٹمنٹ کی خوشنودی حاصل کر لی جائے گی۔

میری مودبانہ گذارش ہے کہ آپ حکومت ہند کے ہوم ڈیپارٹمنٹ کے افسروں کو تاکید کر دیں کہ آئندہ جب کبھی مسلم لیگ اپنے نمائندے اسلامی ممالک میں مقرر کرے تو ان کا انتخاب ہوم ڈیپارٹمنٹ کی منظوری سے ہونا چاہئے۔ سر عبداللہ ہارون آپ سے ملیں گے تو انہیں بھی اس معاملے میں تاکید کر دیجئے گا کہ یہی طریقہ مستحسن ہے۔

آپ کا مخلص

ہنری کریک

## از لارڈ لنلتھگو، وائسرائے ہند

## بنام سر ہنری کریک گورنر پنجاب

نئی دہلی۔ وائسرائے ہاؤس

۱۸، نومبر ۱۹۳۹ء (پرائیوٹ اور پرسنل)

ڈیئر کریک۔ میں اس خط کے ہمراہ تین ملفوفات آپ کو بھیج رہا ہوں۔ پہلے دو ملفوفات انگریزی ترجمہ ہیں اس مراسلت کا جو سر عبداللہ ہارون اور ایک ہندوستانی مسلمان، شیخ عبدالرحمن مقیم دمشق کے درمیان ہوتی رہی ہے۔ تیسرا خط وہ ہے جو برطانوی قونصل معینہ دمشق مسٹر میک رتھ نے اسی موضوع پر مجھ کو لکھا ہے۔

اس سے قبل بھی ہمیں ایسی شکایات موصول ہوتی رہی ہیں کہ بدقسمتی سے مسلم لیگ مشرق قریب اور مشرق الاوسط میں ایسے نمائندے مقرر کر رہی ہے جن کا رویہ حد درجہ قابل اعتراض ہے مثلاً شام۔ فلسطین۔ مصر اور عراق میں اس نے ایسے نمائندوں کا تقرر کیا ہے جو برطانوی حکومت کے سخت خلاف ہیں۔ اس وبا کو روکنا چاہئے۔

افسوس ناک بات یہ ہے کہ جوں جوں موجودہ جنگ طویل ہوتی جا رہی ہے۔ اسی نسبت سے مشرق قریب اور مشرق الاوسط کے ملکوں کی عام پبلک برطانوی حکومت ہی کے خلاف نہیں بلکہ تمام اتحادیوں کے خلاف ہوتی جا رہی ہے۔ میں اس بات سے بہت متفکر ہوں، اور سوچ رہا ہوں کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ سر سکندر اس بارے میں ہماری کچھ مدد کر سکیں۔ ہرچند کہ میں اس راز سے خوب واقف ہوں کہ انہیں (سر سکندر کو) یہاں پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑے گا۔ کیونکہ جناح یقیناً اس بارے میں ہمارے ہم خیال نہیں ہو سکتے۔

سکندر کو چاہئے کہ اپنے اثر و رسوخ کو کام میں لاکر مسلم لیگ کو مشورہ دیں کہ وہ ان اسلامی ممالک میں اپنے نمائندے مقرر کرے جو برطانوی حکومت کے خیر خواہ ہوں۔ اور اس تاثر کا ازالہ کر سکیں کہ ہندوستان کے مسلمان برطانیہ کے وفادار "نہیں ہیں"۔

## سر عبداللہ ہارون بنام شیخ عبدالرحمٰن ہندی مقیم دمشق

آل انڈیا مسلم لیگ، فارن سب کمیٹی (ملفوف نمبر ا)

کراچی۔ ۱۱۔ جولائی ۱۹۳۹ء

اخویم مکرم۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ و برکاتہٗ۔ گزارش ہے کہ جب مولانا حسرت موہانی انگلستان اور اسلامی ممالک کے دورے سے واپس ہندوستان تشریف لائے تھے۔ تو انہوں نے کہا تھا کہ بیرونی ممالک میں جو مسلمان آباد ہیں ان کو یہاں کے قومی مطالبات سے آگاہ کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ آپ نے مہربانی فرما کر اس سلسلے میں ہمیں ضروری اجازت عطا کی ہے۔

یہ ہمارا قومی فرض ہے اور اسلامی اخوت کے جذبے کا تقاضا بھی یہی ہے۔ ہم

وقتاً فوقتاً آپ کو ایسا تحریری مواد بھیجتے رہیں گے جو آپ وہاں عربی اخبارات ورسائل میں شائع کرا سکیں۔ مہربانی فرما کر ہمیں اطلاع دیجئے گا کہ آپ ایسا کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر ہمیں کوئی اچھا عربی دان یہاں مل گیا تو ہم اس قسم کا تحریری مواد عربی زبان میں مرتب کر کے ارسال کریں گے۔

یہ خط عربی میں لکھا جا رہا ہے۔ اگر آپ کو انگریزی زبان سمجھنے میں کچھ دقت پیش آتی ہے تو ہم عربی ہی کو ذریعہ اظہار بنائیں گے۔ ازراہ کرم عرب ممالک کے ان اخبارات و جرائد کی فہرست ہمیں بھیج دیجئے گا جو ہمارا مواد شائع کرنے پر آمادہ ہیں"۔

اخوتِ اسلامی سے سرشار، آپ کا دینی بھائی

عبداللہ ہارون۔ صدر فارن سب کمیٹی۔ آل انڈیا مسلم لیگ

## از شیخ عبدالرحمٰن مقیم دمشق بخدمت حاجی سر عبداللہ ہارون

دمشق

۳۔جولائی ۱۹۳۹ء (ملفوف نمبر ۲)

جناب محترم۔ تمام تعریف اللہ تعالیٰ کے لئے، جس نے ارض و سما اور جن و انساں پیدا کئے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں۔ جنہوں نے ہمیں گمراہی سے نجات دی۔ اور ہمیں سیدھا راستہ دکھایا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحابہ کرام پر خدا کی برکتیں نازل ہوں۔

آپ کا ۱۱۔جولائی کا مکتوب مجھے موصول ہوا۔ جس سے آپ کی خیر و برکت کی خبر ملی۔ اور مولانا حسرت موہانی کا حال بھی معلوم ہوا۔ آپ نے یہ خط لکھ کر حقیقتاً میری عزت افزائی کی ہے اور میں آپ کا بہت شکر گذار ہوں۔

آپ مسلم لیگ کی فارن سب کمیٹی کے صدر ہیں۔ اور اس حیثیت سے آپ نے مجھ پر جو اعتماد فرمایا ہے، اس کے لئے میں تہ دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ خدا مجھے آپ کے اس اعتماد کا اہل ثابت کرے۔

میں آپ کے ادارے کی حتی الامکان پوری خدمت کروں گا۔ بشرطیکہ ہم برطانوی حکومت کی خوشنودی اور اس کے حصول کے لئے اس نیک نام حکومت کے احکام کی پابندی کریں۔ اور اس کے پرچم کے نیچے اپنی جدو جہد جاری رکھیں۔

اگر آپ اردو میں خط لکھیں تو میں بڑی آسانی سے پڑھ سکوں گا۔ اور ان کا عربی میں ترجمہ بھی بہت سہولت سے ہو جائے گا۔ مولانا حسرت موہانی کی خدمت میں میرا سلام عرض کیجئے، اور دیگر پرسان حال کے بھی آداب کہہ دیجئے گا۔

آپ کا مخلص

شیخ عبدالرحمٰن ہندی

برطانوی قونصل خانہ۔ دمشق

۱۰، اکتوبر ۱۹۳۹ء (ملفوف نمبر ۳)

بخدمت جناب ڈپٹی سیکرٹری صاحب بہادر دفتر خارجہ (فارن افسر)

حکومت ہند، دہلی

جناب والا۔ آپ کے اس مکتوب گرامی کے جواب میں جو آپ نے ۲۰۔ ستمبر ۱۹۳۹ء کو مجھ کو لکھا تھا، اور جس میں آپ نے اس موضوع پر اظہار خیال فرمایا تھا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کو، بیرونی ممالک میں کس قسم کے نمائندے مقرر کرنا چاہئیں۔ میری گزارش حسب ذیل ہے۔

میں نے ۵ اگست کو سر آبرے مٹکاف کو جو خط لکھا تھا۔ اس میں، میں نے وضاحت سے عرض کیا تھا کہ شیخ عبدالرحمٰن نے دمشق سے، سر عبداللہ ہارون کو جو خط ۳۰۔ جولائی کو لکھا تھا، اس میں شیخ مذکور نے وضاحت سے تحریر کیا تھا کہ:

"میں اس وقت تک مسلم لیگ کی نمائندگی کر سکتا ہوں، جب تک ہم حکومت برطانیہ کے خیر خواہ رہیں گے۔ اور اس کے احکام کی پابندی کریں گے۔ اور اس کے پرچم کے نیچے امن و عافیت کی زندگی بسر کریں گے۔"

میرے نزدیک آل انڈیا مسلم لیگ سیدھے راستے سے بھٹک گئی ہے۔ کیونکہ اس نے ایسے لوگوں کو اپنا نمائندہ بنایا ہے جو برطانوی حکومت کے سخت خلاف ہیں۔ مثلاً عمر داؤد کو بیروت میں اور علی حیدر حسینی کو بیت المقدس (یروشلم) میں۔ جہاں تک برطانوی حکومت کا تعلق ہے۔ ان دونوں کا رویّہ حد درجہ قابل اعتراض ہے عمر داؤد تو بیروت میں اس کمیٹی کا صدر ہے جو ۱۹۳۸ء میں فلسطین کی تحریک آزادی میں انگریزی حکومت کے خلاف چندہ فراہم کرتی رہی ہے۔ علی حیدر حسینی کا بھی یہی حال ہے۔ وہ پچھلے دو سال سے بیروت۔ دمشق اور فلسطین میں شدت سے برطانوی حکومت کے خلاف پروپیگنڈا کر رہا ہے میں سمجھتا ہوں کہ آل انڈیا مسلم لیگ، بیک وقت دو کشتیوں میں سفر نہیں کر سکتی۔ ایک طرف وہ برطانوی حکومت کی خیر خواہی کا دم بھرتی ہے۔ اور دوسری طرف ان لوگوں کو اپنی

---

نوٹ:۔ سرپینڈرل مون آئی۔ سی۔ ایس۔ پنجاب کے گورنر سرہنری کریک کے سیکرٹری تھے۔ جب سرسکندر نے اپنی زونل سکیم کو ضبط تحریر میں لانے کا ارادہ کیا۔ تو انہوں نے اس کام کے لئے پینڈرل مون کو منتخب کیا۔ مون نے سکیم کا خاکہ دیکھ کر سرسکندر سے کہا کہ آپ ایسی گنجلک اور تضادات سے بھری ہوئی سکیم کیوں اپنی قوم کے سامنے پیش کررہے ہیں، جسے خود آپ کی قوم بھی اچھی طرح سمجھ نہیں سکے گی۔ سرسکندر نے ایک پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ سنو! اگر میں نے یہ سکیم پیش نہ کی تو بعض لوگ اس سے بدتر سکیمیں لے کر آگے آجائیں گے۔ بدتر سکیم سے ان کی مراد پاکستان کی سکیم تھی۔

اس واقعہ کے چند مہینے بعد پینڈرل مون نے سرسکندر سے کہا کہ میرے خیال میں پاکستان کی سکیم موجودہ حالات میں بہترین سکیم ہے۔ سرسکندر نے نہایت غضب ناک لہجے اور غصے سے بھری ہوئی آواز میں کہا "تعجب ہے آپ ایسی باتیں کرتے ہیں۔ آپ کو مغربی پنجاب میں رہتے ہوئے خاصا عرصہ گذر چکا ہے، اور آپ یہاں کے مسلمانوں کے مزاج سے واقف ہوگئے ہیں۔ پاکستان کا مطلب لازماً یہ ہوگا کہ ہندوؤں میں سے ایک ایک بنئے کا گلا کاٹ دیا جائے۔ خدارا ایسی بات آئندہ کبھی نہ کیجئے گا۔ پاکسان کا مطلب سوائے

نمائندگی کا پروانہ عطا کرتی ہے، جو اس حکومت کے خیر خواہ نہیں ہیں. آل انڈیا مسلم لیگ کو چاہئے کہ صرف ان مسلمانوں کو اپنا نمائندہ مقرر کرے، جنہوں نے گذشتہ تین سال میں ہماری مشکلات میں ہمارا ساتھ دیا ہے۔ اور فلسطین جیسے پیچیدہ مسائل میں بھی ہمارے رفیقِ کار رہے ہیں۔

میں اس عریضے کی نقلیں برطانوی قونصل جنرل متعینہ بیروت، برطانوی ہائی کمشنر متعینہ یروشلم (بیت المقدس) اور حکومت ہند کے فارن آفس برائے امور مشرق کو بھیج رہا ہوں۔

آپ کا مخلص

جی۔ میک رتھ

---

قتل عام کے اور کچھ نہیں۔"

نو سال بعد پاکستان بنا تو واقعی پنجاب کی زمین انسانی خون سے سرخ ہو گئی۔ لیکن سر سکندر اس وقت فوت ہو چکے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ سکندر نے مسلم لیگ کی ۲۳۔ مارچ ۱۹۴۰ء کی قرار داد پاکستان کی تائید کی تھی۔ لیکن اس تائید سے ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ ان کی پارٹی کے مسلمان ممبروں میں کہیں پھوٹ نہ پڑ جائے۔

(ایچ۔ وی ہوڈسن کی کتاب گریٹ ڈیوائڈ صفحہ ۸۳)

(بحوالہ ڈیوائڈ اینڈ کوئٹ۔ مصنفہ پینڈرل مون صفحہ ۲۰۵)

چھٹا باب

# سکندر - جناح پیکٹ کے متعلق پنجاب کے غیر مسلم وزراء کا طرزِ عمل اور زاویۂ نگاہ

مسٹر جناح اور ملک خضر حیات ٹوانہ کے درمیان جو گفت وشنید، اپریل ۱۹۴۴ء کے اخیر میں لاہور میں ہوئی تھی، اس کے بارے میں چوہدری چھوٹو رام، سر منوہر لال اور سردار بلدیو سنگھ نے یکم مئی ۱۹۴۴ء کو مشترکہ دستخطوں سے یہ بیان شائع کیا:

"مسٹر جناح نے ۲۷. اپریل ۱۹۴۴ء کو جو خط پنجاب کے وزیر اعظم (ملک خضر حیات ٹوانہ) کو لکھا تھا، اس میں بعض ایسی تجاویز کا بھی ذکر موجود تھا، جس کے بارے میں مسٹر جناح کی خواہش تھی کہ پنجاب کیبنٹ کے غیر مسلم وزراء بھی اپنے نقطہ نگاہ کی وضاحت کریں۔ لہٰذا ہم ذیل میں صورت حالات کے مکمل پس منظر کا ذکر کرتے ہیں۔

مسٹر جناح نے ہمارے وزیر اعظم سے استفسار کیا تھا کہ اگر پنجاب کی موجودہ وزارت کو مسلم لیگ وزارت قرار دیا جائے یا اسے مسلم لیگ کولیشن وزارت کے نام سے موسوم کیا جائے تو ہمیں کیا اعتراض ہے۔ اس استفسار کے جواب میں ہم نے ذیل کا تحریری بیان وزیر اعظم (ملک خضر حیات ٹوانہ) کے حوالے کیا تھا۔

"ہم سمجھتے ہیں کہ اصولاً صرف پنجاب ہی نہیں ہندوستان کے کسی صوبے کی وزارت کو بھی مسلم لیگ یا مسلم لیگ کولیشن وزارت کہنا یا اسے کسی اور رنگ میں فرقہ وارانہ نام دینا جائز نہیں۔ کیا اخلاقی کیا آئینی اور کیا سیاسی لحاظ سے۔ غرض کہ کسی لحاظ سے بھی اسے فرقہ وارانہ نام نہیں دیا جاسکتا۔

فی الحال ہم ان امور پر مزید بحث کو ملتوی کرتے ہوئے صرف اس سوال کا جواب دیتے ہیں۔

اول:۔ موجودہ حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے ہمارا کسی ایسی وزارت میں شریک ہونا جسے عرف عام میں مسلم لیگ کولیشن وزارت کہا جائے گا، صرف اس صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب آل انڈیا پیمانے پر، پارٹیوں میں کوئی مفاہمت ہو جائے اور فی الحال یعنی جنگ کے دوران میں پاکستان کے مسئلے کو نظرانداز کر دیا جائے۔

دوم:۔ پاکستان کی سکیم کے بارے میں تمام متعلقہ افراد اور متعلقہ فرقوں کو بتایا جائے کہ اس سکیم کی سیاسی اور آئینی غرض و غایت کیا ہے۔ پاکستان کے حدود کیا ہوں گے۔ اس کی جغرافیائی حیثیت کیا ہوگی۔ مسلم لیگ کا فرض ہے کہ باقاعدہ ریزولیوشن منظور کر کے ان تمام امور کی وضاحت کرے۔ اور اس امر کا یقین دلائے کہ جب تک موجودہ جنگ کامیابی سے ہم کنار نہیں ہوتی کیا مسلم لیگ غیر مشروط طور پر جنگی امداد دینے میں شریک رہے گی؟

قائداعظم نے جواب میں فرمایا کہ پنجاب کی یہ کولیشن موجودہ آئین کے تحت قائم کی جا رہی ہے۔ اس لئے آل انڈیا مسلم لیگ پنجاب پراونشل اسمبلی کے دو گروہوں سے آل انڈیا مسائل طے نہیں کر سکتی۔ رہا جنگی امداد کا سوال۔ اس ضمن میں آل انڈیا مسلم لیگ کی پالیسی واضح ہے جسے مسلم لیگ نے اپنی متعدد قراردادوں میں بیان کر دیا ہے۔ لہذا پنجاب پراونشل اسمبلی کے دو گروہوں میں اس امر کا تصفیہ نہیں کیا جا سکتا۔ کولیشن کے متعدد فریقوں کو اپنے سیاسی اور قومی نقطہ نگاہ پر قائم رہنے کا حق ہے۔"

اس پر تینوں غیر مسلم وزراء نے ذیل کا بیان شائع کیا:

ہمیں افسوس اور حیرت ہے کہ مسٹر جناح کے جواب سے یہ قطعاً واضح نہیں ہوتا کہ وہ ہمارے ساتھ کوئی سمجھوتہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے چند شرائط پیش کی تھیں۔ جنہیں اگر قبول کر لیا جاتا تو پنجاب میں کولیشن وزارت قائم ہو سکتی تھی خوش اسلوبی سے اسے چلایا بھی جا سکتا تھا۔

مسٹر جناح نے خود ایک مرتبہ پاکستان کی مجوزہ سکیم کا ذکر کرتے ہوئے پنجاب کے متعلق فرمایا تھا کہ اس صوبے کو پاکستانی عمارت کے کونے کے پتھر (کارنر سٹون) کی حیثیت

حاصل ہوگی۔ اس بناء پر اگر ہم نے یہ دریافت کرنے کی کوشش کی تھی کہ پاکستان کے قیام کے بعد پنجاب کی کیا پوزیشن ہوگی تو ہم اپنی اس خواہش کے اظہار میں بالکل حق بجانب تھے۔ پنجاب کی غیر مسلم اقلیتوں کے نزدیک اہم ترین مسئلہ یہی ہے کہ اگر پاکستان بن گیا تو ان اقلیتوں کی حیثیت کیا ہوگی۔ اس بارے میں مسٹر جناح نے جو کچھ کہا ہے اس سے کسی کی بھی تشفی نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس انہوں نے حقائق سے چشم پوشی کرنے کی کوشش کی ہے۔ مسٹر جناح کا یہ کہنا کہ پاکستان ایک آل انڈیا مسئلہ ہے۔ اور اس مسئلے کے تسلی بخش حل کے لئے وہ پنجاب کی غیر مسلم اقلیتوں کے نمائندوں سے باہمی گفت و شنید کرنے اور ان کے شکوک و شبہات رفع کرنے پر آمادہ نہیں. گویا ایک بنیادی حقیقت سے اعراض کرنے کے مترادف ہے۔ مسٹر جناح کو معلوم ہونا چاہئے کہ آل انڈیا پارٹیوں کے درمیان یہ اصول طے ہوچکا ہے کہ ہندوستان کے کسی صوبے کی اقلیتوں کی فلاح و بہبود یا ان کے مستقبل سے تعلق رکھنے والے امور کے بارے میں کسی قسم کا تصفیہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس صوبے کی اقلیتوں کی رضامندی اور خوش دلی حاصل نہ کرلی جائے۔

پنجاب کے بارے میں دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہمیں دیکھنا ہے کہ جنگی امداد کے متعلق کسی سیاسی پارٹی کی پالیسی یا اس کا طرز عمل کیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ مسئلہ پنجاب کا اہم ترین مسئلہ ہے جسے کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ تنہا پنجاب نے پورے ہندوستان سے زیادہ جنگی امداد مہیا کی ہے۔ اس وقت تک پنجاب دس لاکھ کے قریب جوان بھرتی کرا چکا ہے۔

اب غور کیجئے کہ اگر ہم ایسی سیاسی پارٹی کے ساتھ کولیشن بنانے پر آمادہ ہوگئے جس کی پالیسی جنگ کے بارے میں سراسر غیر یقینی، مشکوک اور گومگو ہے، جس نے ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کیا کہ وہ جنگی امداد مہیا کرے گی بھی یا نہیں کرے گی، تو پنجاب کی یک جہتی کس طرح قائم رہ سکتی ہے۔ اور ہمارا باہمی اتحاد کیوں کر برقرار رہ سکے گا۔ ”

# سردار بلدیو سنگھ کا بیان

سردار بلدیو سنگھ، جو ۱۹۴۱ء میں سکندر، بلدیو پیکٹ کے تحت یونینسٹ پارٹی کی وزارت میں شامل ہوئے تھے، اپنا علیحدہ بیان شائع کیا، جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"بظاہر دیکھا جائے تو مسٹر جناح نے جو بحث شروع کی ہے، اس کا تعلق یونینسٹ پارٹی سے ہے۔ مسٹر جناح کہتے ہیں کہ یونینسٹ پارٹی کا کوئی وجود باقی نہیں رہا۔ ان کا اصرار ہے کہ پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی موجودہ وزارت کو مسلم لیگ کولیشن منسٹری کا نام دیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمیں بالواسطہ طور پر پاکستان ایسی سکیم سے مربُوط کیا جائے گا جس کے حدود اور جس کی آئینی و دستوری حیثیت کا ہمیں قطعاً کوئی علم نہیں۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، میں یونینسٹ پارٹی کا ممبر نہیں ہوں۔ لیکن میں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ اگر مسٹر جناح کے خیال کے مطابق یونینسٹ پارٹی کو توڑ دیا جائے تو اس سے جو نتائج پیدا ہوں گے، ان سے ہم کس طرح آنکھیں بند کر سکتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ میں نے سر سکندر حیات خاں کے ساتھ باقاعدہ ایک معاہدہ (پیکٹ) کر کے موجودہ وزارت میں شرکت کی تھی۔ میرا یہ معاہدہ سر سکندر کے ساتھ ان کی ذاتی حیثیت سے نہیں ہوا تھا بلکہ یونینسٹ پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے ہوا تھا۔ اور یونینسٹ پارٹی ایک غیر فرقہ وارانہ جماعت تھی۔

سر سکندر چاہتے تھے کہ پنجاب سے فرقہ وارانہ لعنت کا خاتمہ کیا جائے۔ اسی مقصد کے لئے انہوں نے مجھ سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ میں ان کی وزارت میں شامل ہو جاؤں۔ سر سکندر جب تک زندہ رہے انہوں نے ہمیشہ یونینسٹ پارٹی اور اپنی حکومت کی غیر فرقہ وارانہ حیثیت کو قائم رکھنے پر اصرار کیا۔ سر سکندر کی زندگی میں کئی بار کوشش کی گئی تھی کہ ان کی ضرورت کو مسلم لیگی وزارت کا نام دیا جائے۔ لیکن سر سکندر نے ہمیشہ اس قسم کی کوششوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

سر سکندر کی وفات کے بعد جب ملک خضر حیات ٹوانہ وزیر اعظم بنے تو انہوں نے بھی موجودہ صورت حال کو بحال رکھنے کی کوشش کی (سٹیٹس کو) جب وہ گذشتہ سال۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں شرکت کرنے کے بعد واپس لاہور آئے تو انہوں نے مجھے اور اپنی کیبنٹ کے دیگر ارکان کو حتمی طور پر یقین دلایا تھا کہ مسٹر جناح نے وعدہ کیا ہے کہ وہ سکندر۔ جناح پیکٹ کی لفظاً و معناً پابندی کریں گے۔ ملک خضر حیات نے یہ بھی ہمیں بتایا تھا کہ جب انہوں نے سکندر، جناح پیکٹ کو برقرار رکھنے کے متعلق آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس دہلی میں تقریر کی تھی تو مسٹر جناح نے اسے پسند کیا تھا۔ اور پورے ایوان نے بڑی گرم جوشی سے اس کی تائید کی تھی۔

مسٹر جناح نے حال ہی میں جس طرح یونینسٹ پارٹی پر تابڑ توڑ حملے کیے ہیں اور جس شدّت سے اس بات پر اصرار کیا ہے کہ پنجاب کی موجودہ وزارت کو مسلم لیگ کولیشن وزارت کا نام دیا جائے۔ اس سے ہمارے صوبے میں ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا ہے۔

دیگر امور سے قطع نظر صرف اس بات پر غور کیجئے کہ مسٹر جناح چاہتے ہیں کہ یونینسٹ پارٹی کو ختم کر دیا جائے۔ مسٹر جناح کا یہ اصرار اس باہمی مفاہمت کے قطعی خلاف ہے جو ان کے اور یونینسٹ پارٹی کے لیڈر (سر سکندر) کے درمیان ہوئی تھی۔ مسٹر جناح کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ میں نے پنجاب کیبنٹ میں شامل ہوتے وقت یونینسٹ پارٹی سے پیکٹ کیا تھا، مسلم لیگ سے پیکٹ نہیں کیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ یونینسٹ پارٹی میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ لیکن اگر مسٹر جناح نے اس اکثریت کو اشتعال دلا کر اس پیکٹ کو فسخ کرا دیا جو یونینسٹ پارٹی اور ہمارے درمیان ہوا تھا۔ تو سکھوں کو اپنے طرز عمل کے بارے میں از سر نو غور کرنا پڑے گا کہ وہ آئندہ مسلمانوں کے کسی وعدے پر اعتبار کریں یا نہ کریں۔

میں یہاں دوبارہ اس امر کا اعادہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ امن و عافیت کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ اور اسی غرض سے میں نے اپنے سکھ دوستوں کے مشورے سے کوشش کی تھی کہ مسٹر جناح ہمیں بتائیں کہ پاکستان کی سکیم سے ان کا کیا مراد ہے۔ لیکن مسٹر جناح نے اس بارے میں کوئی جواب نہیں دیا۔

ہمیں کسی منصب یا عہدے کا لالچ نہیں۔ ہمارے لئے سب سے اہم مسئلہ حقِ خود ارادی (Right of self-determination) کا ہے۔ دنیا بھر میں ہر جگہ یہ حق تسلیم کیا جا چکا ہے۔ سکھ بھی اس حقِ خود ارادی کو اپنے حسب منشاء تسلیم کروانا چاہتے ہیں۔ افسوس ہے۔ مسٹر جناح نے اس بارے میں کوئی واضح اور تسلی بخش جواب نہیں دیا۔ نہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ پاکستان کی سکیم سے ان کی مراد کیا ہے [1]"



---

۱۔ انڈین اینوئل رجسٹر ۱۹۴۴ء صفحہ ۲۲۴

ساتواں باب

# قائداعظم اور علامہ مشرقی
# اور قائداعظم اور سید علی ظہیر کی باہمی مراسلت

جب ۱۹۴۴ء میں، پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس پر قائداعظم چند روز کے لئے لاہور تشریف لائے تو علامہ مشرقی نے ۱۸۔ مارچ ۱۹۴۴ء کو۔ ذیل کا خط قائداعظم کو لکھا۔

"ڈیئر مسٹر جناح۔ پچھلے چند ماہ کے واقعات نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ آپ نے مسلم لیگ اور خاکساروں کے درمیان کشیدگی پیدا کر دی ہے۔ کیا اس کشیدگی کے لئے میں قابل الزام ہوں؟ میرا حتمی یقین ہے کہ اس نازک موقع پر ہندوؤں اور مسلمانوں کو مل کر، حصول پاکستان کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی آزادی کے حصول کی کوشش کرنی چاہئے۔ لیکن آپ طیش میں آکر اور ایک طرف حزن وملال اور دوسری طرف بے عملی کا شکار ہو کر، اس قیمتی موقع کو ہاتھ سے کھو دیں گے۔ اگر میرا یہ اندازہ غلط ہے تو آپ بخوشی مجھے قائل کر سکتے ہیں۔ آپ نے کوئٹہ میں خاکساروں سے کہا تھا کہ اگر مشرقی صاحب سمجھتے ہیں کہ میرا رویّہ غلط ہے تو انہیں چاہئے تھا کہ مجھ سے ملتے یا براہ راست مجھے خط لکھتے۔ میں نے بار بار آپ کو خط لکھے۔ اور اب پھر لکھ رہا ہوں اگر آپ اچھرے تشریف لائیں تو چشم ما روشن دل ماشاد۔ اور اگر میرا غریب خانہ اس قابل نہیں کہ آپ قدم رنجہ فرمائیں تو آپ جہاں چاہیں میں حاضر ہونے کو تیار ہوں۔ بہر حال ہمارا ایک دوسرے سے ملنا بے حد ضروری ہے۔

آپ کا مخلص

عنایت اللہ خاں مشرقی"

# قائداعظم کا جواب

۱۹۔ مارچ ۱۹۴۴ء

ڈیئر مسٹر مشرقی، آپ کا ۱۸۔ مارچ کا مکتوب مجھے گذشتہ رات خاصی دیر میں ملا۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ آپ نے مجھ پر الزام لگایا ہے کہ میں نے مسلم لیگ اور خاکساروں کے درمیان کشیدگی پیدا کی ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے مجھ پر یہ الزام بھی عائد کیا ہے کہ میں نے طیش میں آکر ہندو۔ مسلم اتحاد کے قیام میں رخنہ ڈالا جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اس میں قطعاً کوئی صداقت نہیں۔ اور نہ ان جملہ الزامات کا کوئی جواز آپ کے پاس موجود ہے۔ اس کے برعکس آپ نے اپنی تقریروں اور اخباری بیانوں کے ذریعہ سے اپنی پوزیشن واضح کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

بہرحال، جیسا کہ آپ نے خود کہا ہے کہ ”اگر میرا یہ اندازہ غلط ہے تو آپ مجھے قائل کر سکتے ہیں“ میں اس ضمن میں اتنا کروں گا کہ آل انڈیا مسلم لیگ نے حال ہی میں ایک مجلس عمل [۱] (کمیٹی آف ایکشن) قائم کی ہے۔ جس کے صدر نواب محمد اسمٰعیل خاں اور کنویز نواب زادہ لیاقت علی خاں ہیں۔ اس مجلس عمل کے سپرد مسلم لیگ کو منظم کرنے کا کام کیا گیا ہے۔ آپ چاہیں تو نواب محمد اسمٰعیل خاں۔ مصطفیٰ کاسل میرٹھ اور نواب زادہ لیاقت علی خاں۔ ۸۰۔ بی ہارڈنگ ایونیو۔ دہلی کے پتے سے خط و کتابت کر کے جملہ حالات معلوم

---

۱۔ مجلس عمل (کمیٹی آف ایکشن) آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کراچی کے موقع پر خود قائداعظم نے ۲۷۔ دسمبر ۱۹۴۳ء کو اپنے اختیار خاص سے قائم کی تھی۔ اس کمیٹی کے صدر نواب محمد اسمٰعیل خاں اور کنویز نواب زادہ لیاقت علی خاں تھے۔ ممبروں میں جی ایم سید۔ (سندھ) حاجی ستار اسحٰق سیٹھ (مدراس) نواب افتخار حسین خاں ممدوٹ (پنجاب) قاضی محمد یحییٰ (بلوچستان) شامل تھے۔ خدا کی شان ہے وہی جی۔ ایم۔ سید جو ۱۹۴۵ء تک قائداعظم کے سب سے بڑے جاں نثاروں میں شمار ہوتے تھے۔ ۱۹۴۹ء میں ان پر غداری کا الزام عائد کیا گیا۔ اور آج وہ کشتنی اور گردن زدنی قرار دیئے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سید صاحب نہ اس وقت غدار تھے نہ آج غدار ہیں۔ صرف بعض معاملات میں رائے کا اختلاف تھا۔ جسے جی۔ ایم۔ سید کے بعض حریفوں اور بدخواہوں نے بڑھا چڑھا کر اس حد تک پہنچا دیا۔

کر سکتے ہیں۔ کم سے کم اس طرح آپ کو اطمینان ہو جائے گا کہ یہ دونوں اصحاب ان اتہامات اور الزامات سے پاک ہیں جو آپ نے مجھ پر اس خط میں عائد کیے ہیں۔ اور جن کا اعادہ آپ پہلے بھی کئی بار اپنے اخباری بیانوں میں کر چکے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ آپ کو یہ دونوں اصحاب اس بارے میں مطمئن کر سکیں گے کہ بحالاتِ موجودہ مسلم لیگ کا پروگرام ہی ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بہترین اور مکمل ترین پروگرام ہے۔ مسلم لیگ کی مجلس عمل (کمیٹی آف ایکشن) کا اجلاس ۲۵۔ ماہ حال کو دہلی میں ہو رہا ہے۔

میں یہ خط اشاعت کے لئے اخباروں کو دے رہا ہوں۔ کیونکہ آپ نے بھی اپنا گذشتہ خط میرے جواب کا انتظار کئے بغیر اخباروں میں چھپوا دیا ہے۔ آپ کا مخلص

ایم۔ اے جناح

## علامہ مشرقی بنام قائداعظم

۱۹۔ مارچ ۱۹۴۴ء

ڈیئر مسٹر جناح، مسلسل سولہ گھنٹے انتظار کرنے کے بعد آپ نے میرے خط کا جواب مرحمت فرمایا ہے۔ اس سے ایک بات یقیناً واضح ہو گئی ہے۔ یعنی آپ مجھ سے ملنا نہیں چاہتے۔ نہ آپ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد قائم کرنے کے خواہاں ہیں۔ اور نہ آپ مسلم لیگ اور خاکساروں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے خواہش مند ہیں۔ اندریں حالات میں اس نتیجے پر پہنچنے میں بالکل حق بجانب ہوں کہ خاکساروں اور مسلم لیگ میں کشیدگی پیدا کرنے کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے۔ آپ نے ہماری باہمی ملاقات سے انکار کر کے جو صورت حال پیدا کر دی ہے۔ اور جس میں آپ خود بھی ملوث ہو گئے ہیں، مہربانی فرما کر اس پر نظر ثانی کیجئے۔ خاکسار یقیناً مسلم لیگ کے خلاف نہیں ہیں۔ حصنی ماحصنی

آپ نے لکھا ہے کہ مجلس عمل (کمیٹی آف ایکشن) مسلم لیگ کو منظم کرنے کے لئے قائم کی گئی ہے۔ یہ کتنی معنی خیز بات ہے کہ اس قدر شور و غوغا کے باوجود ابھی تک مسلم لیگ

کی تنظیم مکمل نہیں ہو سکی۔ اس بے عملی اور انتشار کے ذمہ دار آپ اور صرف آپ ہیں۔ یہی کہنا کافی نہیں، بلکہ اس انتشار کی وجہ یہ ہے آپ جس طرح جلسوں میں نعرہ بازی کر کے عوام کے جذبات کو برانگیختہ کرتے ہیں۔ اور پھر صحیح راستہ دکھائے بغیر محض بلند بانگ تقریروں کے طلسم میں گرفتار کر لیتے ہیں، یقین کیجئے مسلمان آپ کے اس طرز عمل سے تنگ آ چکے ہیں۔

آپ نے مجھ سے ملنے سے انکار کر دیا ہے۔ بہرحال، آپ کی مرضی۔ اس کے باوجود میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ نے واقعی اس جانب کوئی عملی قدم اٹھایا تو سب سے پہلے میں آپ کے پیچھے پیچھے چلوں گا۔ رہا آپ کی مجلس عمل (کمیٹی آف ایکشن) کا معاملہ۔ میں یقیناً اس سے مراسلت کروں گا۔ اور اگر یہ مجلس عمل محض نام کی مجلس عمل ثابت ہوئی تو پھر اس سے کسی قسم کے استفادے کی توقع بے کار ہے۔

اور آخر میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اگر آپ نے ہندوستان کے مسلمانوں کے قائداعظم کی حیثیت سے اس جانب کوئی قدم نہ اٹھایا اور نہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی مفاہمت پیدا کی اور نہ حصول آزادی کی کوئی عملی راہ دکھائی تو پھر لامحالہ مجھے اسی نتیجے پر پہنچنا پڑے گا کہ ہندوستان کے مسلمان آپ کی لیڈر شپ ترک کر کے کسی اور کو اپنا رہنما بنائیں۔

آپ کے جواب کا منتظر ہوں۔

آپ کا مخلص

عنایت اللہ خاں المشرقی

# اشاریہ

ہماری قومی جدوجہد

## آ

## ا

## ب

## پ

## ت

ٹ



ج

## چ

## ح



## خ

ڈ



ذ



ر

## ز

## س

## ش

## ص



## ض



## ظ

## ع

## غ



## ف

## ق

## ک

## گ

# ل

مسلم لیگ نیشنل گارڈز: 641، 643، 644، 645، 648

## ن

# ہماری قومی جدّوجُہد

اوّل - دوم - سوم - چہارم

عاشق حسین بٹالوی